سلسلہ احیاء منہج السلف ۱۱

انتاج : مکتبہ عبداللہ بن سلام لترجمۃ کتب الاسلام، فرع (۱)

رئیس المکتبۃ : فضیلۃ الشیخ/ علی بن عبداللہ النمی حفظہ اللہ تعالیٰ

مدیر المکتبۃ : فضیلۃ الشیخ/ عبداللہ ناصر الرحمانی حفظہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ عبداللہ بن سلام لترجمۃ کتب الاسلام

ہیڈ آفس : 103 ۔ ڈی ، ایم ، اے ، سی ، ایچ ، ایس ، فیز II ایکسٹینشن کراچی۔

سیل پوائنٹ : جامع مسجد ... کراچی ۔ فون: 32511932

برائے رابطہ : حسن عبدالعزیز موبائل: 0300-2310189



توحید الٰہ العالمین

توحید کے انتہائی اہم مسائل جن کی معرفت ہر بندے پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے



اعداد و تقدیم

عبداللہ ناصر الرحمانی

مکتبہ عبداللہ بن سلام لترجمۃ کتب الاسلام

انتساب

والدِ گرامی قدر عبدالرشید رحمانی رحمہ اللہ کے نام

جو اخلاصِ عمل ، راست گوئی ، تصلّبِ عقیدہ ، غیرت وحمیتِ مسلکِ اہلحدیث اور التزام بالسنۃ میں ہمیشہ میرے آئیڈیل رہے ہیں۔ میرا توحید وسنت کے موضوع پر چند کلمات ادا کر لینا درحقیقت انہی کی مخلصانہ تربیت و توجہ کی ایک جھلک ہے۔ اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه وأدخله جنة الفردوس.

فہرست مضامین

باب......توحید کی فضیلت کا بیان اور یہ کہ توحید تمام گناہوں کو مٹا دیتی ہے

باب......توحید خالص کو کما حقہ اپنانے والا بلا حساب جنت میں داخل ہوگا

باب......شرک سے ڈرتے رہنے کا بیان

باب...... "لا الٰہ الا اللہ" کی گواہی کی دعوت دینے کا بیان

باب......عقیدہ توحید اور کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کی شہادت کا صحیح مطلب ومفہوم

باب......رفعِ بلاء اور دفعِ مصائب کیلئے چھلّا یا دھاگا پہننا شرک ہے

باب......دم اور تعویذوں کے حکم کا بیان

باب...... کسی درخت یا پتھر وغیرہ سے برکت طلب کرنے والے کا حکم

باب...... غیر اللہ کے نام ذبح کرنے کا بیان

باب...... جس جگہ غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کیے جاتے ہوں وہاں اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کرنا جائز نہیں ہے

باب...... غیر اللہ کے نام کی نذر شرک ہے...... 193

باب ...... غیر اللہ سے استعاذہ شرک ہے

باب ...... غیر اللہ سے فریاد رسی یا دعا کرنا شرک ہے

باب ...... تمام معبودانِ باطلہ بے اختیار و بے بس ہیں

باب ...... فرشتوں کے عجز وخوف سے استدلال توحید

باب...... شفاعت کا بیان

باب...... ہدایت صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے

باب...... بنی آدم کا کفر و شرک میں مبتلا ہونے اور صحیح دین سے منحرف ہونے کا سبب بزرگوں کے معاملہ میں غلو کرنا ہے

باب.....اس شخص کے متعلق وعیدِ شدید کا بیان جو کسی صالح بزرگ کی قبر کے پاس کھڑا ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے، تو جو اس صالح بزرگ ہی کی عبادت کرنے لگے تو اس کے متعلق وعید کا کیا عالم ہوگا؟

باب.....صالحین کی قبروں میں غلو کا مظاہرہ انہیں وہ اوثان (بت) بنا دیتا ہے جن کی اللہ کے سوا عبادت کی جاتی ہے

باب..... نبی ﷺ کا شرک کے ہر راستے کو بند کر دینے کا بیان 306

باب...... اُمت محمدیہ کے کچھ افراد شرک میں مبتلا ہو جائیں گے

باب...... جادو کا بیان

باب...... جادو کی اقسام کا بیان......346

باب...... کاہنوں کا بیان

باب...... جادواتارنے کابیان...... 366

باب...... بدشگونی لینے کابیان

باب...... علمِ نجوم کابیان

باب...... پچھتر یعنی ستاروں کی منازل سے بارش طلب کرنے کاحکم

باب...... اللہ تعالیٰ کی محبت دین کی بنیاد ہے

باب...... خوفِ الٰہی کی حقیقت 430

باب...... اللہ تعالیٰ پر توکل کا بیان

باب ......خوف ورجاء کا بیان...... 455

باب ......ایمان باللہ کا ایک اہم شعبہ اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر پر صبر کرنا ہے

باب ......ریاء کاری پر وعید کا بیان

باب......اللہ تعالیٰ کے کسی نام یا صفت کا انکار کرنے والے کا حکم 524

باب......اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کفر ہے...... 534

باب......شرک کی بعض مخفی صورتیں

باب......جو شخص اللہ تعالیٰ کی قسم کے بعد بھی راضی نہ ہو

باب...... جو اللہ تعالیٰ چاہے اور تو (ﷺ) چاہے، کہنے کا حکم

باب......زمانے کو برا کہنے والا اللہ تعالیٰ کو اذیت پہنچاتا ہے......558

باب...... "قاضی القضاۃ" یا اس قسم کے دیگر القاب کا حکم

باب......اللہ تعالیٰ کے ناموں کے احترام کا بیان اور اس احترام کی خاطر ناموں کو تبدیل کرنے کا بیان......565

باب......اللہ تعالیٰ کے ذکر یا قرآن پاک یا رسول اللہ ﷺ کا مضحکہ اڑانے والے کا حکم

باب......اللہ تعالیٰ کے شکر کی حقیقت......572

باب..... نام رکھنے یا اولاد نہ ملنے پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا

باب..... اسماءِ حسنیٰ کا بیان

باب..... ''اَلسَّلَامُ عَلَى اللّٰه'' کہنے کی ممانعت

باب..... دعا کرتے ہوئے ''اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے معاف کر دے'' نہیں کہنا چاہیے

باب..... اپنے غلام کو ''عَبْدِیْ'' یا ''اَمَتِیْ'' نہیں کہنا چاہیے

باب...... اللہ تعالیٰ کے نام پر سوال کرنے والے کو خالی ہاتھ نہ لوٹایا جائے

باب...... اللہ تعالیٰ کی صفتِ ''الوجہ'' (چہرہ) کے واسطے سے صرف جنت ہی کا سوال کرنا چاہیے

باب...... ''لو'' (اگر) کہنے کا بیان

باب...... ہوا کو گالی دینے کی ممانعت

باب...... اللہ تعالیٰ کے بارہ میں بدگمانی کی ممانعت 618

باب...... منکرینِ قدر کے متعلق وعید کا بیان

باب...... تصویر کشی کرنے والوں کا انجام

باب...... زیادہ قسمیں کھانے کی ممانعت اور وعید

باب...... اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے ذمہ کا بیان 652

باب......اللہ تعالیٰ پر قسمیں کھانے کا بیان

باب......اللہ تعالیٰ کو اس کی خلق پر شافع نہ بنایا جائے

باب......رسول اللہ ﷺ کا توحید کی حفاظت فرمانا نیز شرک کے تمام راستے بند فرما دینا......665

باب......اللہ تعالیٰ کی قدر و منزلت کا بیان......669

مقدمہ طبع ثانی

الحمد للہ والصلوۃ والسلام علی رسول اللہ وبعد،

زیرِ نظر کتاب موسوم بہ ''توحید الٰہ العالمین'' جو اس سے قبل دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی اور جسے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بہت زیادہ قبولِ عام حاصل ہوا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ کتاب کے ہزاروں نسخے چند ماہ کے اندر ہی ختم ہوگئے، حتی کہ اس وقت میرے پاس میرا ذاتی نسخہ بھی موجود نہیں ہے۔

ملک و بیرونِ ملک سے ساتھیوں نے دوبارہ طباعت کیلئے رابطہ شروع کردیا اور آہستہ آہستہ یہ رابطہ اصرار بالتکرار کی شکل اختیار کرگیا، جن میں ایک قابلِ ذکر نام برادرِ عزیز ثاقب ادریس ﷾ مقیم کراچی کا ہے جنہیں اپنی کاروباری مصروفیات کے سلسلہ میں مختلف ممالک کے دوروں اور وہاں کے جماعتی احباب سے ملاقات کرنے اور اسی سلسلے میں ان کے خیالات جاننے کا موقع ملتا رہتا ہے موصوف خود بھی حسنِ عقیدہ اور منہجِ سلف صالحین سے محبت کی نعمت سے مالا مال ہیں۔ اللھم زد فزد.

دوسرا نام برادرِ محترم عتیق صاحب مقیم امریکہ کا ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے فہمِ توحید کے تعلق سے بڑا نفیس ذہن عطا فرمایا ہے اور وہ توحید کے انتہائی پرجوش داعی بھی ہیں۔ فجزاہ اللہ خیرا وأسعدہ فی الدارین.

مجھ ناکارہ کو اس قدر پذیرائی کی توقع نہ تھی، اسی دوران ایک اور خبر میرے لئے بہت حوصلہ افزائی کا باعث بنی، جب برادرِ عزیز شیخ توصیف الرحمٰن زیدی ﷾ نے بتلایا کہ انہوں نے ریاض میں اپنے مکتبِ جالیات میں کتابِ ھذا کے سبقاً سبقاً دروس دیئے ہیں، جس کے نتیجے میں دوسو کے قریب ساتھی دائرۂ سلفیت میں داخل ہوئے، وللہ الحمد والمنة.

یہ خبر میرے لئے مزید تشجیع وتحریض کا باعث بنی، ساتھیوں نے رائے دی کہ طباعتِ ثانیہ میں کتاب کو دو کی بجائے ایک جلد میں پیش کیا جائے، دوسری بات یہ تھی کہ بہت سے ساتھیوں نے ہماری کتاب کے کچھ الفاظ اور تراکیب کے مشکل ہونے کا شکوہ کیا اور بتایا کہ بہت سے مقامات پر مشکل جملوں کا استعمال، مفہوم ومراد کے فہم میں مخل ثابت ہوتا ہے، بلکہ ایک دوست کا جملہ مجھے اب تک یاد ہے کہ آپ کی کتاب پڑھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں اردو بھی نہیں آتی۔

یہ واقعۃً ایک ایسی کمی کی نشاندہی ہوئی جو ہماری تشویش کا باعث بن گئی، ایک سوال تو یہ اُٹھا کہ ان مشکل الفاظ وجمل کو آسان فہم کیسے بنایا جائے نیز یہ کہ ان مشکل مقامات کا تعین کیسے ہو؟ دوسرا سوال یہ کہ ہجومِ مشاغل کے اس دور میں اس اہم کام کیلئے وقت کیسے نکالا جائے؟ اللہ تعالیٰ اجرِ جزیل عطا فرمائے ہمارے

فاضل دوست اور عزیز القدر بھائی حافظ حامد محمود ﷾ کو جنہوں نے کتاب کی افادیت کے پیش نظر اس اصلاح کا بیڑہ اُٹھایا اور بہت سے مشکل الفاظ کی جگہ متبادل آسان الفاظ اور بہت سی مشکل تراکیب کی جگہ آسان اور قابلِ فہم ترکیبیں ڈال دیں، ان کے اس مبارک عمل سے کتاب کافی حد تک آسان اور قابلِ فہم بن گئی ہے، ضاعف الله أجره وأجزل مثوبته ووفقه لمزيد مافيه حبه ورضاه.

ہمیں پوری اُمید ہے کہ اس طباعت میں قارئین کا مذکورہ شکوہ کافی حد تک دور ہو چکا ہوگا، اس کے علاوہ قارئین کو کتاب کی ترتیب وتنسیق میں بھی بہت سے نئے محاسن نظر آئیں گے، جن کی وجہ سے افادیت میں خاصہ اضافہ ہوا ہے۔ اللہ رب العزت اس کے نفع کو عام کردے اور اس کوشش کو قبول فرما کر اپنی محبت ورضا سے ہماری جھولیاں بھردے، چونکہ ہم نے اس کتاب کی تیاری واشاعت سے عقیدۂ توحید کی خدمت کی ہے، لہذا اللہ تعالیٰ سے التجاء ہے کہ وہ اس متواضع سی خدمت کو ہمارے اور ہمارے والدین، اساتذہ اور تمام قارئین کی میزانِ حسنات کا ذخیرہ بنادے اور بفحوائے قولہ تعالیٰ: ﴿ يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ﴾ جس سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ قولِ ثابت یعنی کلمہ ''لا إلٰہ الا اللہ'' ہی ہر مقام پر ثابت قدمی کی بنیاد ہے، یہ کتاب ہم سب کیلئے دنیا، قبر، حشر اور پلِ صراط پر ثابت قدمی کی انتہائی قوی اساس بن جائے؛ کیونکہ ہماری اس پوری کتاب کا محور ومدار یہی قولِ ثابت یعنی کلمہ ''لا إلٰہ الا اللہ'' ہے۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں تادمِ حیات توحید پر قائم رکھے اور موت کے وقت ہماری زبانوں پر ''لا إلٰہ الا اللہ'' ہو، ان تمام متقاضیات کے ساتھ جو حدیثِ رسول "من كان آخر كلامه لاإله الا الله دخل الجنة" اور حدیثِ رسول "من مات وهو يعلم انه لاإله الا الله دخل الجنة" میں مطلوب ہیں۔ والله تعالىٰ ولي التوفيق وصلى الله على نبينا محمد وعلى آله وصحبه وأهل طاعته أجمعين.

کتبہ/ عبداللہ ناصر الرحمانی

۷ شعبان عام ۱۴۳۰ھ

تقریظ

فضیلۃ الشیخ خلیل الرحمٰن لکھوی حفظہ اللہ

خريج "الجامعة الاسلامية" بالمدينة المنورة

مدير "معهد القرآن الكريم" گلستان جوهر، کراچی

الحمد لله رب العالمين، قيوم السموات والارضين، والصلاة والسلام على نبينا ورسولنا محمد قدوة الموحدين، وآله واصحابه اجمعين، ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين، أما بعد۔

مُجدّ ددعوۃ التوحید والسنۃ، شیخ الاسلام، امام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ أجزل الله له الاجر والثواب کی معروف تألیف ''کتاب التوحید'' اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک عدیم النظیر کتاب ہے۔ حضرت الشیخ کی توحید سے محبت اور اخلاص کی برکت سے اس کو جو قبولیت اور شہرت ملی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ حضرت الشیخ رحمہ اللہ نے امیر المحدثین امام محمد بن اسماعیل البخاری رحمہ اللہ کے طریق پر بڑے مدلل، مستند اور فقہی انداز میں مسائلِ توحید کو واضح کیا ہے۔

''کتاب التوحید'' کی اہمیت کے پیش نظر کئی کبار علماءِ کرام نے حواشی وتعلیقات اور شروح وتراجم کی شکل میں اس کی منفعت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ اور یقیناً یہ کام آئندہ بھی جاری رہے گا۔ میرے خیال میں کتاب ھذا کی متعدد مختصر ومبسوط شروح میں سے حضرت الامام کے پوتے الشیخ سلیمان بن عبداللہ رحمہ اللہ کی شرح ''تیسیر العزیز الحمید'' سب سے زیادہ مرتب، سھل اور طلبۃ العلم کے لئے مفید ہے۔

میرے علم کے مطابق شیخ سلیمان رحمہ اللہ نے "باب من لم يؤمن بالقدر خيره وشره.... الخ" تک شرح لکھی تھی بعد میں انکے چچازاد بھائی، الشیخ عبدالرحمٰن بن حسن رحمہ اللہ نے ''فتح المجید'' کے نام سے جو شرح لکھی ہے، دراصل وہ '' تیسیر العزیز الحمید'' کی تہذیب وتقریب اور تکمیل ہی ہے۔

کتاب کی افادیت کے پیش نظر راقم عرصہ سے دل میں یہ عزم چھپائے بیٹھا تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ کرے گا۔ لیکن " سبقك بها عكاشة "

یقین جانیئے کہ میرے لئے یہ بات بہت زیادہ باعثِ مسرت واطمینان ہے کہ یہ کام میرے انتہائی قابل احترام بھائی، دوست اور تحریک احیائے کتاب وسنت کے سپہ سالار فضیلۃ الشیخ علامہ عبداللہ ناصر الرحمانی (حفظه الله تعالىٰ ومتعنا بطول حياته) نے سرانجام دیا۔ وهو مني أليق به وأحق۔

یہ کتاب علماءِ کرام، طلباء اور عوام اردو دان حضرات کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ ان شاء اللہ

فضیلۃ الشیخ کے ارشاد کی تعمیل اپنے لئے سعادت سمجھتے ہوئے یہ چند سطور لکھ دی ہیں، وگرنہ مجھے اپنی علمی بے بضاعتی اور اردو زبان میں عدمِ مہارت کا پوری شدت سے احساس ہے۔ پھر یہ بات بھی پیشِ نظر رہی کہ نشر التوحید میں کچھ حصہ میں بھی ڈال دوں، اگر چہ نام کی حد تک ہی سہی، کیونکہ توحید ہی کیلئے اللہ تعالیٰ نے جن وانس کو پیدا فرمایا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ اور قرآن کریم میں جگہ جگہ تمام انبیاء ورسل علیہم السلام کی بعثت کا بنیادی مقصد بھی یہی بیان کیا گیا ہے۔ اور دنیاوی فلاح، اخروی نجات اور تمام دیگر اعمال کی قبولیت کا دارومدار بھی توحید پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توحید پر زندہ رکھے اور اسی کی اشاعت کرتے ہوئے موت آئے۔

آخر میں دعا گو ہوں کہ ربّ العالمین حضرت الشیخ کی عمر، صحت، علم وفضل اور عمل میں مزید برکات عطا فرمائے اور اس کاوش کو ان کے لئے اور ان کے بزرگوں کے لئے بہترین صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه محمد وآله وصحبه وسلم



تقریظ

فضیلۃ الشیخ ابو عمار عمر فاروق السعیدی حفظہ اللہ

خریج "الجامعة الاسلامية" بالمدينة المنورة

مدير التعليم بجامعة ابی بكر الاسلامية، كراتشی

الحمد لله رب العالمين، وصلى الله على النبی محمد وعلىٰ آله وصحبه اجمعين، وبعد.

''توحید رب العالمین'' ایسا عظیم الشان موضوع ہے جو کسی بھی سلیم الفطرت زندہ دل انسان کی روح کی غذا اور اسکے دل کا سکون وقرار ہے، اسکے بغیر اسے کہیں اور کسی طور تسکین وراحت نہیں ملتی..... ﴿ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴾..... مگر بہت کم ہیں جنہیں اس حقیقت کا ادراک ہو!

سعادت مند ہیں وہ لوگ جو اس نعمت سے بہرہ ور اور پھر بھولے بھالے عوام الناس یا بھولے بھٹکے لوگوں کے لئے اس راہِ حق کی نشاندہی اور اس کو سمجھانے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ عالمِ عرب منبعِ اسلام ہے، مگر اللہ کی حکمت کہ اطرافِ عالم تو کجا خود ملتِ عرب میں خیر القرون کے بعد دورِ نبوت سے دوری کے باعث دینِ اسلام حتی کہ توحیدِ الٰہ لعالمین پر بھی گرد آنے لگی۔ یہ قوم اس حقیقت سے نا آشنا ہوتے ہوتے قبروں، قبوں، مشائخ، جنوں اور ستاروں وغیرہ کی اثر آفرینی کی اسیر ہونے لگی، تو اللہ تعالی نے امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ اور انکے تلمیذِ رشید امام ابنِ قیم رحمہ اللہ سے تجدیدِ دین کا کام لیا۔ انہوں نے تاتاری فتنے کے خلاف زبان وقلم اور پھر سیف وسنان سے وہ جہاد کیا جو رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔ بالخصوص عوام وخواص میں توحید وشرک اور سنت وبدعت جو گڈمڈ ہو رہی تھی اس کو نکھار کر واضح کیا۔ اس بارے میں ساری امت ان کی زیر بارِ احسان ہے۔ اور بلاشبہ مجدّدین امت میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ تاہم جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے یا بیماری وہ آج تک ان کی عداوت میں جَل بُھن رہے ہیں۔

انکے بعد جزیرۃ العرب میں امام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ نے اپنے عنفوان شباب میں جب دیکھا کہ لوگ پیروں، فقیروں، قبروں اور قُبوں پر گرے جارہے ہیں، جنّوں، بھوتوں اور جادو ٹونے پر عقیدہ رکھنے لگے ہیں، توحید وسنت سے ان کا رشتہ ٹوٹ رہا ہے، تو انہوں نے دعوتِ توحید وسنت اور رجوع الی الکتاب والسنۃ کا علم بلند کیا۔ انہوں نے خطاب وکتاب سے کام لیا... جہاں رکاوٹ محسوس ہوئی سیف وسنان اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کیا، تو اللہ تعالی نے انکی مساعی میں برکت کی اور بھٹکی ہوئی قوم راہِ مستقیم پر قائم ہوگئی۔

(والحمد لله على ذلك)

ان کی اس تحریک کے اثرات صرف عالمِ عرب ہی میں محدود نہ رہے، بلکہ اکنافِ عالم میں بھی محسوس کئے گئے بلکہ متحرک کر گئے۔ ہمارے ہندوستان میں مولانا اسماعیل شہید اور سید احمد شہید ﷭ کی تحریکِ جہاد جہاں فرنگیوں اور سکھوں کے خلاف تھی، وہاں سادہ لوح اور نام کے مسلمانوں میں عقیدہ وعمل کی بیماریوں کا علاج بھی تھی۔ ان کی اس تحریک اور دعوت سے ایک عالَم نے ہدایت پائی۔ ان کی زندۂ جاوید تصنیف ''تقویۃ الایمان'' آج بھی امت کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ پاک وہند میں دعوتِ توحید کا جو غلغلہ آج نظر آرہا ہے اس کی تخم ریزی مولانا اسماعیل شہید ﷫ ہی نے فرمائی ہے۔

مسلکِ کتاب وسنت کے حاملین اپنے معاشرے میں بحمد اللہ تعالیٰ اپنے نظریہ اور عمل کے باعث ہمیشہ منفرد اور نمایاں رہے ہیں اور انکے علماء نے جو فریضہ سرانجام دیا ہے اور دے رہے ہیں وہ ان شاء اللہ اظہارِ دین کا ایک اہم حصہ ہے، اللہ قبول فرمائے اور مزید توفیق دے۔

توحیدِ الٰہ العالمین ...... کہنے کو تو سادہ سا کلمہ اور مختصر سی دعوت ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ انتہائی حساس مسئلہ ہے جسے اہلِ سعادت ہی حاصل کر پاتے ہیں۔ اس کی حساسیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے، دار الحدیث رحمانیہ کراچی میں ہمارے شیخ اجل، جامع المعقولات والمنقولات، المحدّث حاکم علی صاحب ﷫ ہمارے تربیتی خطابات کی اصلاح بھی فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے راقم کا ایک جملہ..''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں''.... قبول نہ کیا، بلکہ اس کی اصلاح کی کہ...''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے''... کیونکہ جمع کا صیغہ ''موہمِ شرک'' ہے۔ شیخ ﷫ کی یہ اصلاح بحمد اللہ راقم کے دل پر آج بھی نقش ہے اور ان کے لئے دعا گوہوں کہ ہمارے سلفِ صالحین، اللہ رب العزت کی شانِ توحید میں کسی معمولی سے وہم وایہام تک کو گوارا نہیں فرماتے تھے۔ بعدازاں مزید مطالعے سے شیخ مکرم ﷫ کا مذہب اور بھی واضح ہوا۔

ان کے علاوہ ہمارے مخدوم اپنے وقت کے عظیم مفسر ومحدث، سید بدیع الدین شاہ راشدی ﷫ کے خطاباتِ عالیہ کا اکثر موضوع توحیدِ الٰہ العالمین ہی ہوا کرتا تھا۔ وہ ان میں علمی اور دقیق نکات اور عوام وخواص کی اُن بیماریوں کی نشاندہی کیا کرتے تھے جو عام سطحی قسم کے علماء کے حاشیۂ خیال تک میں نہ آتی تھی، اور میرے جیسے ناقص العلم انہیں عوام کے لئے غیر ضروری اور ثقیل سمجھتے تھے مگر بعد میں انشراح ہوا کہ نہیں، عوام وخواص کو شرک وبدعت کی گمراہی سے کھلم کھلا دوٹوک الفاظ میں ڈرانا، متنبہ کرنا اور بچانا اہلِ حق کا بنیادی فریضہ ہے۔ شاہ صاحب ﷫ کی عظیم تالیف ''توحیدِ خالص'' کا مسودہ طباعت کے لئے راقم ہی کے ہاتھوں مبیضہ میں منتقل ہوا تھا۔ یہ کتاب طلبۂ علم سے بڑھ کر علماءِ راسخین کے لئے علمِ توحید میں شاندار مرجع اور نسخۂ کیمیا ہے۔ راقم اپنے قارئین کو اس کے مطالعہ کی تلقین کرنا اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہے۔

عربی زبان میں مجددّ دِ ملت الامام محمد بن عبدالوہاب ﷫ کے قلم سے ''کتاب التوحید'' کے نام سے جو صحیفہ امت کے سامنے آیا ہے نا معلوم کن مبارک جذبات اور ساعات میں لکھا گیا تھا کہ یہ تا حال اپنے موضوع میں ایک زندۂ جاوید حقیقت ہے۔ دنیا کی اکثر زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے، شروح لکھی گئیں اور ایک بڑی مخلوق کے لئے ہدایت کا باعث بنا ہے۔ عربی زبان میں اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے ایک معتبر شرح امام صاحب کے پوتے جناب سلیمان بن عبداللہ کے قلم سے ''تیسیر العزیز الحمید'' کے نام سے تالیف ہوئی ہے۔ یہ اپنی جامعیت اور تسہیل میں ایک عمدہ مرجع ہے۔ اصل کتاب اور اسکی اس شرح میں دین کی بدعی تقسیم، طریقت وشریعت یا توحیدِ عوام وتوحیدِ خواص یا وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود وغیرہ کی لطیف تردید ہے۔ اور حقیقت واضح کی گئی ہے کہ عرب کے ساتھ، باوجود ان کے حنفاء اور ابراھیمی ہونے کے قتال کیوں کیا گیا؟ جسے یہ حقیقت سمجھ آجائے اسے دین سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

پیش نظر کتاب نصوصِ کتاب وسنت کے علاوہ سیرتِ صحابہ وتابعین اور فقہ الحدیث کا شاندار مجموعہ ہے جس میں توحیدی نکات کو بڑی خوبی کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔ علماء وفقہاءِ امت کے افکار ونظریات اور ان کے اقوال مختلف کتابوں سے جمع کردیئے ہیں جن کا حاصل کرنا عام حالات میں بہت مشکل ہے۔ دینی مدارس کے طلبہ اس کتاب سے مستفید ہو ہی رہے ہیں مگر بجا طور پر ضرورت تھی کہ عوام الناس جو عقیدۂ توحید وسنت کی تفصیلات سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں یا جو طلبہ عربی زبان میں گرانی محسوس کرتے ہیں ان کیلئے اس کتاب کی اردو میں تلخیص وتفہیم ہو جائے ...... تو یہ فریضہ بحمد اللہ ہمارے برادرِ گرامی فضیلۃ الشیخ عبداللہ ناصر الرحمانی ﷾ نے بخیر وخوبی سرانجام دیا ہے، جو محض مترجم ہی نہیں بلکہ علماءِ بارزین جیسے کہ پہلے ذکر ہوا شیخ المعقول والمنقول المحدث حاکم علی ﷫ اور المفسر، المحدث السید بدیع الدین شاہ راشدی ﷫ وغیرہم کے علوم کا شناور اور بفضل اللہ دعوتِ توحید وسنت میں ...... جیسے کہ میں سمجھتا ہوں، ولا ازکی علی اللہ احدا ...... مجتہدانہ صلاحیات سے بہرور ہے ...... اللہ عزوجل مزید درمزید توفیق عنایت فرمائے ...... قلم میں زور اور بیان میں سلاست ہے۔ اگر کہیں قارئین کرام عربی تراکیب پائیں تو وہ کلام کے ربط سے قابلِ فہم ہیں، دراصل صاحب علم کی یہ مجبوری ہوتی ہے اس کے لئے قارئین کو اپنا علمی ذوق بلند کرنا چاہئے۔

الغرض دعوتِ توحید وسنت کا یہ اہم تالیفی پہلو فضیلۃ الأخ نے ادا کردیا ہے۔ اللہ عزوجل قبول فرمائے اور بجا طور پر امید ہے کہ انکی طرف سے مزید علمی جواہر منظر پر آئیں گے اور فریضہ دعوت کے ساتھ ساتھ تشنگانِ علم کی سیرابی کا سامان ہوتا رہے گا۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔

تقریظ

فضیلۃ الشیخ ابوعبدالمجید محمد حسین محمد البلتستانی ﷾

خریج "الجامعة الاسلامية" بالمدينة المنورة

مدرس" بجامعة ابى بكر الاسلامية "كراتشى

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على النبى الأمين، وعلى آله وصحبه اجمعين، ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين، وبعد۔

عَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارِ الْمُجَاشِعِيِّ ﷛ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ ذَاتَ يَوْمٍ فِىْ خُطْبَتِهٖ: اَلَا اِنَّ رَبِّىْ اَمَرَنِىْ اَنْ اُعَلِّمَكُمْ مَا جَهِلْتُمْ ...... وَاِنِّىْ خَلَقْتُ عِبَادِىْ حُنَفَاءَ كُلَّهُمْ، وَاِنَّهُمْ اَتَتْهُمُ الشَّيَاطِيْنُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِيْنِهِمْ وَحَرَّمَتْ عَلَيْهِمْ مَا اَحْلَلْتُ لَهُمْ وَاَمَرَتْهُمْ اَنْ يُّشْرِكُوْا بِهٖ مَالَمْ اُنْزِلْ بِهٖ سُلْطَانًا وَاِنَّ اللّٰهَ نَظَرَ اِلَى اَهْلِ الْاَرْضِ، فَمَقَتَهُمْ عَرَبَهُمْ وَعَجَمَهُمْ، اِلَّا بَقَايَا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ ...... الحديث ①

سیدنا عیاض بن حمار المجاشعی ﷛ (ایک لمبی حدیث) میں بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز خطبہ میں ارشاد فرمایا: میرے رب نے مجھے تمہارے سامنے ہر بات واضح کرنے کا حکم دیا ہے......اور فرمایا: میں نے اپنے بندوں کو توحید پر یکطرفہ پیدا کیا، لیکن شیطان نے انہیں دین سے بہکا دیا، میرے حلال کردہ کو ان پر حرام کر دیا، اور بے جا انہیں شرک میں مبتلا کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اہلِ ارض کو دیکھا تو سب عربیوں، عجمیوں سے ناراض ہو گیا صرف چند لوگ اس ناراضگی سے محفوظ رہے جو چند اہلِ کتاب گرجوں میں تھے۔

عقیدۂ توحید کے فقدان کی وجہ سے رب العالمین پوری خلقت سے ناراض ہوا، محمد رسول ﷺ کی دعوت کی بدولت عقیدۂ توحید عام ہوا، زمین پر رب کی رحمتیں نازل ہوئیں۔ اور جب دوبارہ سے لوگوں نے عقیدہ توحید ترک کر دیا تو پھر رب العالمین کی ناراضگی لوٹ آئی۔

امام الدعوۃ، شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب اور امیر محمد بن سعود ﷭ کی محنتِ شاقہ سے رب العالمین نے جزیرۂ عرب میں عقیدۂ توحید کو پختہ کیا اور ﴿ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ﴾ کے مصداق بڑی برکتیں اور رحمتیں نازل ہوئیں۔ بنوتمیم، جس قبیلے سے یہ نفوس تھے کے متعلق صحیح بخاری و مسلم میں سیدنا ابوھریرۃ ﷛ کی روایت ہے، فرماتے ہیں: لَا اَزَالُ اُحِبُّ بَنِىْ تَمِيْمٍ مِنْ ثَلَاثٍ سَمِعْتُهُنَّ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: هُمْ اَشَدُّ اُمَّتِىْ عَلَى الدَّجَّالِ، وَجَاءَتْ صَدَقَاتُهُمْ فَقَالَ ﷺ هٰذِهٖ صَدَقَاتُ قَوْمِنَا. قَالَ: وَكَانَتْ سَبِيَّةٌ مِنْهُمْ عِنْدَ عَائِشَةَ فَقَالَ ﷺ :اَعْتِقِيْهَا فَاِنَّهَا مِنْ وُلْدِ اِسْمٰعِيْلَ .

سیدنا ابوھریرۃ ﷛ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے تین باتیں سنی ہیں لہذا میں بنوتمیم سے محبت کرتا رہوں گا، فرمایا: دجال پر سب سے سخت لوگ بنوتمیم ہیں۔ بنوتمیم کے ہاں سے زکوٰۃ آنے پر فرمایا یہ ہماری

① (صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب فی الصفات التی یعرف بها اهل الجنة واهل النار)

برادری کی زکوٰۃ ہے۔سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک لونڈی تھی جو بنوتمیم قبیلہ کے قیدیوں میں سے تھی تو فرمایا:
یہ اولاد اسماعیل علیہ السلام میں سے ہے اسے آزاد کردیجئے۔

اس عظیم منقبت وفضیلت اور محمد رسول ﷺ کی پیش گوئی کے مصداق یہ سعادت رب العالمین نے مذکورہ نفوس کوعطا فرمائی۔ (غفرالله لهم وجعل الجنة مثواهم وحشرنا معهم)

صاحبِ ''تیسیر العزیز الحمید'' الشیخ الامام سلیمان بن عبداللہ بن محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ جن کی ولادت ۱۲۰۰ھ میں ہوئی اپنے متعلق کہا کرتے تھے ''انا برجال الحديث اعرف منی برجال الدرعية'' یعنی میں رجالِ حدیث کی جتنی معرفت رکھتا ہوں اپنے گاؤں درعیہ کے لوگوں کی اتنی معرفت و پہچان نہیں ہے۔

کتاب ''تیسیر العزیز الحمید شرح کتاب التوحید'' پڑھ کر پتا چلتا ہے انہیں علومِ قرآن وحدیث وغیرہ پر کتنا عبور تھا۔علماء کہتے ہیں '' صنف شرح كتاب التوحيد لجده فمن بعده عيال عليه فيه لكنه لم يكمله '' یعنی شرح کتاب التوحید تمام بعد کی شروحات کیلئے مرجع ہے لیکن خود اسے مکمل نہ کرسکے تھے (جسے بعد میں فتح المجید سے مکمل کیا گیا)۔

موصوف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، کسی بڑے سے بڑے کی پرواہ نہیں کرتے تھے، اسی لئے رب العالمین نے آپ کو شہادت کی سعادت سے نوازا۔ ۱۲۳۳ھ میں ابراھیم بن محمد علی پاشا نے پہلے آپ کے سامنے ڈھول ڈھمکے اور دیگر عیاشی کے آلات جمع کرکے، انہیں آپ کے سامنے بجا کر آپ کو ذہنی اذیت پہنچائی پھر گولیاں چلوا کر قتل کردیا۔ (غفر الله له وأدخله فسيح جنانه وجزاه الله عنا خيرا)

کچھ صاحبِ ''توحید الٰہ العالمین'' کے متعلق:

فضیلۃ الشیخ عبداللہ ناصر الرحمانی حفظہ اللہ، امیر ''جمعیت اہلحدیث سندھ'' ورئیس ''المعهد السلفی للتعليم والتربية كراچی'' عقیدۂ کتاب وسنت ''علیٰ منہج السلف'' کی دعوت وارشاد کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ اندرونِ ملک، یورپ اور دنیا کے مختلف ملکوں میں کانفرنسوں میں نصوصِ کتاب وسنتِ صحیحہ کا خاص التزام کرتے ہیں۔ ''المنهج الأسعد فی تخريج احاديث مسند الامام احمد'' بہترین بین ثبوت ہے، کہ آپ کو علمِ حدیث سے کتنا شغف ہے ''تیسیر العزیز الحمید'' کی اردو زبان میں تہذیب وتفہیم ایک عظیم کارنامہ ہے اور اردو دان طبقہ پر آپ کا عظیم احسان ہے۔ تقبل الله منه و نفعنابه

تاریخ عقیدۂ توحید اور امام الدعوۃ رحمہ اللہ کے سوانحِ حیات کیلئے ھدایۃ المستفید اردو ترجمہ ''فتح المجید شرح کتاب التوحید'' میں مقدمہ از فضیلۃ الشیخ ابو محمد بدیع الدین شاہ الراشدی رحمہ اللہ کا مطالعہ کیا جائے، موصوف رحمہ اللہ نے مفصل مقدمہ لکھا ہے اور بہت مفید ہے۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم. وصلى وسلم الله على خير خلقه محمد وآله وصحبه اجمعين.

تقریظ

فضیلۃ الشیخ محمد ابراھیم بھٹی حفظہ اللہ

مدیر "المعهد السلفی للتعليم والتربية "کراچی
وامين العام "جمعیت اهلحديث سنده" (کراچی ڈویژن)

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على خاتم الانبياء والمرسلين، وعلى آله وأصحابه الطيبين الطاهرين، وعلى من تبعهم باحسان الى يوم الدين، أما بعد:

انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی بعثت کا بنیادی مقصد صرف ایک ہی تھا، جس کی وضاحت قرآن کریم میں بایں الفاظ موجود ہے:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴾ ①

''ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو، اور اس کے سوا تمام معبودوں سے بچو، پس بعض لوگوں کو تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی، اور بعض پر گمراہی ثابت ہوگئی، پس تم خود زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔''

''عبادت'' اصل میں مخلوق کا خالق کے ساتھ براہِ راست تعلق و رابطے کا نام ہے، جس کی روح تقویٰ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانعام کی تین آیتوں میں بالترتیب "تَعْقِلُونَ، تَذَكَّرُونَ اور تَتَّقُونَ" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس میں یہ لطیف نکتہ ہے کہ انسان سب سے پہلے سوچتا ہے، غور و فکر کرتا ہے اور جب وہ غور و فکر اور تدبر سے کام لیتا ہے تو اسے بتوفیق اللہ نصیحت حاصل ہو جاتی ہے اور جب نصیحت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ تقویٰ کی راہ پر چل پڑتا ہے۔ اور یہی اساس ہے اور یہ ایک ایسی عظیم نعمت ہے جو کہ ایک مؤمن کے دل میں عملِ صالح کی ترغیب اور گناہوں کی ترہیب پیدا کرتی ہے، اور اگر درمیان میں واسطے آ جائیں تو پھر خوفِ الٰہی سے زیادہ اس واسطے کا خوف، احترام اور تقدس پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی بدبو ہے جو پورے عقیدے کو برباد کر دیتی ہے۔ اسی نکتہ کو واضح کرنے کے لئے سیدنا نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال دعوتی زندگی کے شب و روز صرف کر دیئے۔

سیدنا نوح علیہ السلام کی قوم اللہ تعالیٰ کو مانتی تھی اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کی قائل تھی۔ مگر انہوں نے عبادت اور تعلق کیلئے درمیان میں پانچ بزرگوں کو وسیلہ بنایا ہوا تھا، جن کے نام قرآنِ کریم نے ود، سواع، یغوث،

① (النحل: ٣٦)

یعوق اور نسر بتائے ہیں ۔سیدنا ابن عباس ﷠ فرماتے ہیں یہ پانچوں بزرگ اس قوم کے انتہائی نیک اور صالح افراد تھے۔①

چونکہ وہ حد درجہ نیک وصالح افراد تھے، اوران کی دینی خدمات کی وجہ سے قوم کے دل ودماغ میں ان کا احترام ومقام سمایا ہوا تھا، اس لئے ان کی وفات کے بعد قوم نے ان بزرگوں کے ناموں کے واسطے دیکر اللہ تعالیٰ کو پکارنا اور دعائیں مانگنا شروع کردیا۔قوم کے اس قبیح عقیدہ کی بیخ کنی کیلئے اللہ تعالیٰ نے سیدنا نوح ؑ کا انتخاب کیا۔سیدنا نوح ؑ نے اس مذموم ورذیل عقیدہ کے قلع قمع کیلئے نہ دن دیکھا نہ رات دیکھی، مگر قوم کے دل ودماغ میں یہ ناپاک عقیدہ اس قدر راسخ ہو چکا تھا کہ اس کے خلاف کچھ بھی سننا گوارا نہ کرتے تھے بلکہ اپنے کانوں میں انگلیاں دے کر دور بھاگ جاتے کہ کہیں کوئی جملہ سنائی نہ دے سکے، اور یہ اول درجے کی جہالت ہے کہ کسی کی بات کو نہ تو سنا جائے اور نہ اس پر غور وفکر کیا جائے۔

نتیجہ کیا نکلا! ساڑھے نوسو سال کی محنت کے باوجود ایک سوافراد بھی اپنے عقیدے کی اصلاح نہ کر سکے، آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر عقیدۂ توحید میں لچک پیدا کر کے قوم کو قریب لانا جائز ہوتا اور اس میں کوئی گنجائش ہوتی تو کیا اس نرمی سے سیدنا نوح ؑ فائدہ نہ اٹھاتے ؟ ہرگز نہیں ۔کوئی اپنی اصلاح کرے یا نہ کرے تعلق باللہ کے اس عقیدے میں جھول پیدا نہیں ہوسکتا۔

آپ غور کریں کہ سیدنا موسیٰ ؑ حالت سفر میں تھے، فرعون اور آلِ فرعون کے ستائے ہوئے، سفر کی صعوبتیں آزمائش در آزمائش، مگر اس کے باوجود جب قوم کے بعض ان پڑھ لوگوں نے دورانِ سفر ایک علاقے کے مشرکین کو بتوں کے آگے جھکتے ہوئے دیکھا تو اس انداز کو محض جہالت کی بناء پر اچھا سمجھتے ہوئے کہنے لگے:﴿ يَا مُوسَى اجْعَل لَّنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ ﴾

’’اے موسیٰ (ؑ) ہمارے لئے بھی ایسا ایک معبود مقرر کردیجئے جیسے ان کے یہ معبود ہیں۔‘‘

یہ درخواست پیش کرنے والے کون لوگ ہیں؟ کوئی کافر نہیں بلکہ اللہ پر ایمان لانے والے، سیدنا موسیٰ ؑ کو نبی تسلیم کرنے والے، تورات کو آسمانی کتاب ماننے والے، فرشتوں اور روزِ محشر پر یقین رکھنے والے۔

مگر قربان جائیں کہ سیدنا موسیٰ ؑ نے یہ نہیں سوچا کہ پردیس میں ہیں، ساتھیوں سے اس موڑ پر اختلاف مناسب نہیں، ابھی خاموشی ہی اختیاری کی جائے، آگے چل کر حالات کی مناسبت سے اصلاح کردی جائے گی، یا یہ آہستہ آہستہ ہمارے توحید کے ماحول میں رہ کر اپنے عقیدے کی بھی اصلاح کرلیں گے، ابھی انہیں انکے حال پر چھوڑ دو ورنہ متنفر ہو جائیں گے، ٹوٹ جائیں گے، قوت تقسیم ہو جائے گی۔نہیں، ہرگز نہیں۔

---

① (صحیح بخاری)

اللہ کی نازل کردہ ترتیب کو اپنی آراء وقیاسات کے ذریعہ بدل کر نہ تو قوم کی اصلاح ممکن ہے، اور نہ ہی انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جاسکتا ہے۔ اسلیے سیدنا موسی علیہ السلام نے ان تمام تر خدشات کو بالائے طاق رکھ کر دوٹوک لفظوں میں فرمادیا﴿ قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴾ واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے۔

بالکل اسی طرح کا واقعہ غزوۂ حنین کے موقع پر پیش آیا (حدیث جامع ترمذی میں موجود ہے)، رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ایک درخت کے نیچے سے گزرے جسے مشرکین ''ذاتِ انواط'' کہتے تھے، حصولِ برکت اور نصرت کے استجلاب کی غرض سے اپنے ہتھیار تھوڑی دیر کیلئے اس درخت کے ساتھ لٹکا دیتے تھے۔ جب آپ ﷺ کا اس درخت سے گزر ہوا تو بعض نومسلم افراد نے آپ ﷺ کے آگے درخواست پیش کردی کہ "یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اِجْعَلْ لَّنَا ذَاتَ اَنْوَاطٍ کَمَا لَهُمْ ذَاتُ اَنْوَاطٍ" یعنی ہمارے لئے بھی کوئی ''ذاتِ انواط'' ہونا چاہئے جس طرح مشرکین کیلئے ''ذاتِ انواط'' ہے۔ آپ غور کریں! کہ یہ مطالبہ نومسلم افراد نے کس کٹھن موڑ پر کیا کہ جس وقت دنیا پر روم اور فارس کا غلبہ تھا، عالم کفر باوجود آپس کے شدید اختلاف کے اسلام کے مقابلہ میں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو چکا تھا، یہودی احبار اور عیسائی رھبان مل کر اسلام کے خلاف یہودیت اور عیسائیت کی عمومی دعوت پیش کر رہے تھے۔ بالخصوص جزیرۂ عرب دشمنانِ اسلام کے ساتھ بھرا ہوا نظر آرہا تھا، ایسے حالات میں ایک ایک ساتھی کو قریب لانے اور انہیں آپس میں جوڑنے کی شدید ضرورت تھی، منطقی طور پر حالات کا تقاضا یہی تھا کہ ان کی درخواست کو سنی ان سنی کردیا جائے، آہستہ آہستہ یہ لوگ ڈھل جائیں گے۔ اگر عقیدۂ توحید میں کسی مصلحت کی گنجائش ہوتی یا پھر دعوتی ترتیب میں قدرے تغیر وتبدل کی کوئی صورت شرعاً جائز ودرست ہوتی تو آپ ﷺ حالات کی نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے حالاتِ حضر کے لئے اس نکتہ کی وضاحت کو موقوف کردیتے۔ مگر نہیں، ایسا نہیں کیا گیا۔ اسی وقت اس شرکیہ قول کی یہ فرما کر تردید کردی۔ "اَللّٰہُ اَکْبَرُ! وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ قُلْتُمْ کَمَا قَالَتْ بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ لِمُوْسٰی اجْعَلْ لَّنَا اِلٰهاً کَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ" "اللہ سب سے بڑا ہے! مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم نے تو وہی بات کہی جو بنی اسرائیل نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی کہ ہمارے لئے بھی کوئی اس طرح کا معبود بنادے جس طرح ان مشرکین کے معبود ہیں۔''

آپ ﷺ نے ان نومسلم افراد کو فوراً ڈانٹ دیا کیونکہ عقیدۂ توحید کی معمولی سی لچک زندگی کے تمام اعمالِ خیر کو برباد کردیتی ہے۔ عبداللہ بن جدعان کتنا بڑا سخی تھا، مگر تقرب الی اللہ کیلئے انہی بزرگوں کے واسطوں نے اس کی سخاوت کا صفایا کردیا، حالانکہ وہ اللہ کو مانتا تھا مگر اس کا ایک ذہن تھا کہ کسی بزرگ کے واسطے سے جو

درخواست اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوگی اس میں وزن زیادہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ اسے رد نہیں کرے گا۔ جبکہ یہ پیمانہ تو ظالم حکمرانوں کے لئے ہے کہ جن کے دربار میں ان کے مقربین کے بغیر درخواست پیش ہو ہی نہیں سکتی، اور اللہ تعالیٰ کا دربار تو ہر خاص وعام، دیندار و بے دین، مسلم وغیر مسلم سب کے لئے ہر وقت کھلا ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴾ ①

یہ آیت بلا واسطہ اللہ کے ساتھ تعلق کا درس دیتی ہے، کیونکہ اصل چیز سوال کی نوعیت نہیں کہ وہ کیا ہے، چھوٹا ہے یا بڑا، قول ہے یا فعل اور نہ ہی سائل کی کیفیت سے کوئی غرض ہے کہ وہ نبی ہے یا اُمّتی، امام ہے یا مقتدی، استاد ہے یا شاگرد؟ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے ہر مسئلہ میں براہِ راست تعلق کا ہے۔ اگر کوئی شخص بھی اس تعلق میں کسی کو بھی شامل وشریک کرتا ہے اور درمیان میں لاتا ہے تو اِس سے عقیدۂ توحید کی روح بگڑ جاتی ہے اور ساری زندگی کی محنت کا ستیا ناس ہوجاتا ہے، اسکی تمام دینی خدمات کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر مشرکین کی فہرست میں شامل کردیا جاتا ہے

عقیدۂ توحید کی اہمیت صرف اس قدر نہیں کہ اسے خود اپنالیا جائے، بلکہ زندگی بھر اس کی بالادستی وترویج کیلئے ہر اعتبار سے کوشاں رہنا چاہئے۔ قرآن وحدیث کے مبارک اوراق اس پاکیزہ عقیدۂ کی وضاحت اور اسی طرح مختلف ادوار میں اس کے غلبہ وترویج کیلئے دی جانے والی جانی ومالی قربانیوں کے واقعات سے پُر ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن وحدیث کا ایک ایک لفظ صراحتاً یا کنایۃً عقیدۂ توحید کا درس دے رہا ہے۔

انہی دروس کو عام فہم پیرائے میں بیان کرنے کیلئے بارہویں صدی کے عظیم مجددِ دعوتِ اسلامیہ، الشیخ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ نے ایک ایسے پرفتن دور میں ''کتاب التوحید'' تصنیف فرمائی جس وقت اُمتِ مسلمہ کی ایک بہت بڑی تعداد قبروں، پتھروں، درختوں اور پتوں کی پجاری بن چکی تھی، اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے مختلف مزاروں اور درگاہوں پر رکوع اور سجود ہو رہے تھے۔

بلاشبہ یہ کتاب اپنے موضوع میں جامع ومانع حیثیت کی حامل ہے کیونکہ اس کتاب میں توحید وشرک کے درمیان ایک فکری فرق کو قرآن وحدیث کے دلائل سے واضح کیا گیا ہے، نہایت ہی پرمغز علمی تحریر کے ذریعہ صرف شرکیہ اڈے ہی نہیں بلکہ شرکیہ نشانات تک مٹا دیئے ہیں۔

اس کتاب کی بعض اہم رموز کو سھل وآسان عبارات میں لانے کیلئے کئی شروحات لکھی گئی ہیں، انہیں میں سے

---

① (البقرۃ: ١٨٦)

ایک شرح ''تیسیر العزیز الحمید'' ہے۔ جو کہ مصنف کے پوتے الشیخ سلیمان بن عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ نے تالیف فرمائی ہے۔ اس شرح نے ''کتاب التوحید'' کو چار چاند لگا دیئے، اس کے حسنِ اسلوب کو دوبالا کردیا۔ اللہ تعالیٰ اسلاف کی ان محنتوں کو قبول فرمائے۔ (آمین)

معزز قارئین کرام! میرے ناقص فہم کے مطابق زمانہ بتدریج علمی و عملی بحران کا شکار ہوتا جارہا ہے، ہر فن میں قحط الرجال ہے، ایک وقت تھا کہ ایک طبیب جملہ امراض کا معالج ہوا کرتا تھا، کسی ایک مرض کا اسپیشلسٹ ہونا علمی ترقی نہیں بلکہ تنزلی کی دلیل ہے۔ یہی حالت زار علوم شرعیہ کی ہے کہ ایک وقت تھا کہ اہلِ علم ''شیخ الاسلام'' اور ''شیخ الکل فی الکل'' جیسے القاب سے ملقب تھے۔ اب تو ''شیخ الجزء فی الجزء'' بھی نایاب ہیں۔ اسلاف تو ایک نقطہ پڑھ کر پوری عبارت کو سمجھ لیا کرتے تھے، اب تو پوری عبارت پڑھ کر بھی ایک نقطہ سمجھنا مشکل ہوگیا ہے۔

اسی لئے اس کتاب ''تیسیر العزیز الحمید'' کو علماء وطلباء کے لئے سہل بنانے اور اردودان طبقہ کے افادہ کے لئے دورِ حاضر کے ناصر التوحید والسنۃ، الشیخ عبداللہ ناصر الرحمانی حفظہ اللہ أمیر ''جمعیت اہلحدیث سندھ'' ورئیس المعہد السلفی للتعلیم والتربیۃ کراچی نے ''توحیدالہ العالمین'' کے نام سے یہ کتاب تألیف فرمائی ہے، یہ کتاب مذکورہ کتاب کی تلخیص، تہذیب، تفہیم اور ترجمانی ہے۔

میں نے کتاب ھذا کا جو حصہ پڑھا ہے اور جو اہم نکات میری سمجھ میں آئے ہیں ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

(۱) دورِ حاضر میں پوری انسانیت کے لئے بالعموم اور امتِ مسلمہ کے لئے بالخصوص عقیدۂ توحید کے حوالے سے جن عبارتوں کی ضرورت تھی انہیں قلمی شکل دی گئی ہے۔ حد درجہ آسان اسلوب اور ایک ایسے واضح ومثبت وسنجیدہ انداز میں عقیدۂ سلفِ صالحین کو دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، کہ ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والا شخص پڑھ یا سن کر یہی سمجھے کہ واقعی میرا ایک مربیّ، صرف میری ہی اصلاح کررہا ہے۔

(۲) موجودہ زمانہ میں امت کی اکثریت دو خطرناک دشمنوں کی زد میں ہے، ایک طرف جہالت کی تلوار اور دوسری طرف مادّیت کی یلغار، اس لئے بصیرت سے کام لیتے ہوئے کتاب ھذا کی عبارات کو اس قدر سہل وآسان کردیا ہے کہ ایک عام شخص کے لئے بھی مسئلہ کو سمجھنا مشکل نہیں رہا۔ دوسری طرف مادّیت کا حملہ ایسا ہے کہ ایک خطیب کا خطبہ قدرِ طویل ہوجائے تو ناقابلِ برداشت۔ اسی طرح کتاب قدرے ضخیم ہوجائے تو اسے چھونے سے بھی احتراز کیا جاتا ہے۔ اس لئے کتاب کو نہایت ہی ملخّص ومہذب اور عام فہم جملوں میں مع ترجمہ تحریر کیا گیا ہے۔

(۳) مفردات کی شرح اس انداز میں کی گئی ہے کہ جس سے لفظی ومعنوی پیچیدگی باقی نہیں رہی۔

(۴) اکثر عبارات کی تلخیص وتہذیب ایک ایسے مخصوص انداز میں کی گئی ہے کہ جس سے عبارت کی کمی بھی محسوس نہ ہو اور بات بھی مکمل طور پر سمجھ آجائے۔ البتہ بعض مقامات پر علمی اضافے کے لئے عبارتوں کے سیاق وسباق کو بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

(۵) بعض شبہات کو قائلین کے لہجے میں ذکر کر کے نصوصِ شرعیہ کے ساتھ ان کا رد کیا گیا ہے۔

اگر چہ کتابِ ھذا توحید سے متعلق ہے لیکن اگر بنظرِ عمیق کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ جملہ علوم شرعیہ کی عکاسی کرتے ہوئے ملے گی۔

اس عظیم کتاب کی تقریظ کے لئے مجھ جیسے ناقصِ علم وفہم کا انتخاب میرے لئے باعثِ سعادت ہے، اور مجھے ذاتی طور پر بھی یہ انتساب اسی معنی میں ہی سمجھ آیا ہے کہ "لاَ یَشْقٰی جَلِیْسُھُم" تا کہ میں بھی اس سعادت سے محروم نہ رہوں۔

میری دل کی گہرائی سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ''کتاب التوحید'' سے لیکر ''توحید الٰہ العالمین'' تک کے جملہ مصنفین ومؤلفین کو جزائے خیر عطا فرمائے، ان کی دینی جھود ومساعی جمیلہ کو شرفِ قبولیت بخشے، اسی طرح جملہ معاونین پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ کتاب کے ہر قاری ومستمع کو اصلاحِ عقیدہ اور اسکے اعلاء وترویج کی توفیق عطا فرمائے، اور اس فیض کو جملہ احباب، ان کے والدین اور اساتذہ کرام کے لئے تا قیامت جاری فرمائے۔ (آمین یارب العالمین) وصلی اللہ علی النبی وآلہ واصحابہ اجمعین.



تقدیم

(عبداللہ ناصر رحمانی ﷿)

ان الحمد لله نحمده ونستعينه ، ونستغفره ، ونعوذ بالله من شرور انفسنا ، ومن سيئات أعمالنا ، من يهده الله فلا مضل له ، ومن يضلل فلاهادي له ، وأشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له ، وأشهد أن محمدا عبده ورسوله ۔

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴾ ①

﴿ يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ﴾ ②

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُطِعِ اللهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴾ ③

أما بعد:

فان أصدق الحديث كتاب الله ، وأحسن الهدى هدى محمد ﷺ ، وشر الامور محدثاتها ، وكل محدثة بدعة ، وكل بدعة ضلالة ، وكل ضلالة فى النار ۔

عقیدۂ توحید اساسِ اسلام، بلکہ اصلِ اسلام، بلکہ عینِ اسلام ہے۔رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث میں اسے روزِ آخرت، نجات کا محور ومدار قرار دیا گیا ہے۔④

جبکہ ''مسندِ احمد'' اور کتب ''سنن'' کی ایک حدیث جو معاذ بن جبل ﷛ سے مروی ہے، میں رسول اللہ ﷺ نے اسے دینِ اسلام کا سر بتلایا ہے۔اور یہ بات مسلَّم ہے کہ سر کی سلامتی، بقیہ جسم کی سلامتی کا ثبوت ہے، جبکہ سر بریدگی سے بقیہ جسم محض ایک مردار سا ڈھانچہ رہ جاتا ہے۔

ایک حدیث میں توحید کو وہ چابی کہا گیا ہے جس سے جنت کا بند دروازہ کُھل جائے گا، ایک اور حدیث میں اس بندہ کو کہ جو اس قدر گناہوں میں ملوث رہا کہ اس زمین کا اُجلا دامن سیاہ ہوگیا، توحید کی برکت سے نہ صرف ان گناہوں کی بخشش کی نوید سنادی گئی، بلکہ ان گناہوں کی جگہ رحمت وفضل کے خزانے لٹا دیئے گئے۔⑤

ایک اور حدیث جو ''حدیثِ بطاقہ'' کے نام سے معروف ہے، کا مضمون ہے کہ ایک بندہ کے توحیدِ خالص کے اقرار واعتراف اور شرک سے بچے رہنے کی برکت سے گناہوں کے ننانوے رجسٹر ہلکے اور ماند پڑ گئے۔

① (آل عمران: ۱۰۲) ② (النساء: ۱)
③ (الاحزاب: ۷۰،۷۱) ④ (مسند احمد)
⑤ (سنن ترمذی: رقم: ۲۶۳۹ وصححه الحاكم (۱/۶،۵۲۹) ووافقه الذهبی)

ایک اور حدیث میں ان ستر ہزار خوش نصیب افراد کا ذکرِ خیر موجود ہے جنہیں توحید کے عظیم الشان عقیدے پر کاربند اور مستقیم رہنے کی وجہ سے بغیر کسی حساب اور بلا کسی عذاب کے پروانۂ نجات تھما کر ''جنات النعیم'' کی وراثت سونپ دی جائے گی۔ ①

ایک اور حدیث میں بمصداقِ فرمانِ رسول ﷺ "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ" ان لوگوں کے لئے جنت میں داخلے کی بشارت موجود ہے جنہیں وقتِ مرگ، توحید کی کامل معرفت کے ساتھ ''لا الٰہ الا اللہ'' (جو کہ سب سے بڑا کلمۂ توحید ہے) پڑھنے کی توفیق میسر آ گئی۔ ②

عقیدۂ توحید صرف آخرت کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی ہی ضمانت نہیں، بلکہ دنیا کی فلاح، سعادت وسیادت، غلبہ وحکمرانی اور استحکامِ معیشت کا علمبردار بھی ہے۔ فلاح کا یہ پروگرام تو رسول اللہ ﷺ نے کوہِ صفا پر دی گئی اپنی پہلی دعوت جو صرف عقیدۂ توحید کے اپنانے پر مشتمل تھی میں پیش فرما دیا تھا۔ ''قُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلاَّ اللهُ تُفْلِحُوْا'' اسکے علاوہ آیتِ استخلاف، اور ''سورۃ القریش'' وغیرہ کا مضمون بھی اسی حقیقت پر شاہدِ عدل ہے۔

الغرض عقیدۂ توحید دونوں جہانوں کی سعادتوں کا سرچشمہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں اور جنوں کی بھلائی، بہتری اور خیرخواہی کا فیصلہ فرماتے ہوئے، توحید کو انکا مقصدِ تخلیق قرار دیا، اور صحیح بخاری کی ایک حدیث میں توحید کو "حَقُّ اللهِ عَلَى الْعِبَادِ" اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر حق قرار دیا گیا ہے۔

شرک کی مذمت: توحید کے مذکورہ فضائل ومحاسن کے برعکس شرک کی بڑی مذمت وشناعت بیان ہوئی ہے، چنانچہ شرعی نصوص سے یہ ثابت ہے کہ شرک ظلمِ عظیم ہے، مشرک کیلئے گناہوں کی بخشش اور توبہ کی قبولیت کی کوئی صورت اور گنجائش نہیں، شرک کرنے والے پر علی الاطلاق جنت کا داخلہ حرام ہے، شرک کرنے والا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں جھونک دیا جائے گا، پھر کبھی باہر نہ نکل سکے گا ﴿ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴾ شرک کرنے والا مغضوب اور ضال ہے، شرک کرنے والا اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے نزدیک لعنت وپھٹکار کا مستحق ہے، شرک کرنے والے شخص کا ہر چھوٹا، بڑا شرک اللہ تعالیٰ کی غیرت کو للکارنے کے مترادف ہے، شرک کرنے والا شخص انسان ہونے کے باوجود دنیا کی ہر مخلوق حتی کہ حقیر سے حقیر کیڑے سے اخس، ارذل اور احقر ہے: ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ﴾ ③ ﴿ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ﴾ ④

حضرات! مسئلہ توحید وہ اہم مسئلہ ہے جسے پڑھانے، سکھانے، سمجھانے، عمل کرنے اور کرانے، اور اس کے ساتھ ساتھ توحید کی ضد یعنی شرک کی بیخ کنی کرنے، نیز ارض اللہ اور اللہ کے بندوں کے قلوب واذہان کو

① (صحیح بخاری) ② (صحیح مسلم، جامع ترمذی، مسند احمد)
③ (البینة: ٦)۔ ④ (التین: ٥)

اس کی غلاظتوں، نجاستوں اور نحوستوں سے پاک صاف کرنے کے لئے ہر دور میں انبیاء ورسل علیہم السلام تشریف لاتے رہے۔انبیاء کی اس مقدس و پاکیزہ جماعت کی ہر ہستی نے بلا استثناء توحید کی دعوت کو اپنا اولین وآخرین مشن بنالیا، اور یہی رب کائنات کا امر بھی تھا:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ ①

''اور ہم نے ہر قوم میں اپنا رسول بھیجا، (اس دعوت کے ساتھ) کہ لوگو! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور ہر طاغوت سے بچ جاؤ''

نیز فرمایا: ﴿ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ ②

''اور آپ سے قبل ہم نے جو بھی رسول بھیجا، اس کی طرف یہی وحی نازل فرمائی کہ میرے سوا کوئی معبودِ حق نہیں ہے پس میری ہی عبادت کرو''

اس مقدس سلسلے کی آخری کڑی امام الانبیاء، اکرم الخلائق، سیدِ ولدِ آدم محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے، جن کی پوری حیاتِ طیبہ اور سیرتِ مطہرہ عقیدۂ توحید کی خدمت سے عبارت ہے۔ چنانچہ کوہِ صفا سے ''قُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا'' کی صدائے توحید بلند ہوئی اور یوں ایک عظیم الشان مشن کا باقاعدہ آغاز ہوا، اور پھر مکہ مکرمہ کی پوری دعوتی زندگی، اور مدینہ منورہ کی مکمل دعوتی و جہادی زندگی کا ایک ایک لمحہ ولحظہ اس بے مثل عقیدہ کی دعوت و پرچار میں صرف ہوا۔کم وبیش چوبیس (۲۴) غزوے اور اسی (۸۰) مقامات پر جہادی بعثتیں اور یلغاریں محض توحید کی خاطر عمل میں آئیں، اور بالآخر جب توحید کا یہ عظیم داعی، حجرۂ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا میں موت کی دہلیز پر کھڑا ہے تو گڑگڑا، گڑگڑا کر اپنے پروردگار سے یہ دعا فرمارہا ہے''اے اللہ میری قبر کو پوجا گاہ اور میلہ گاہ نہ بنانا، اے اللہ یہود ونصاریٰ پر اپنی لعنتیں نازل فرما کہ جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا''

قرآنِ حکیم کی ہر ہر آیت کا مضمون توحید پر مشتمل یا توحید کا متقاضی ہے، اسی مبارک اساس پر رسول اللہ ﷺ کا ہر معطر و پاکیزہ فرمان قائم ہے۔دینِ اسلام کے تمام اعمال وعبادات کا اساسی نکتہ توحید ہی ہے، ہر عمل سے توحید کی سربلندی اور اعلائے کلمۃ اللہ ہی مقصود ہے، دینِ اسلام سے ثابت شدہ تمام اذکار واوراد کی روح عقیدۂ توحید ہے، بلکہ اس عالمِ کونی کی ہر شئی خواہ ایک ذرۂ بے مقدار ہو یا وسیع وعریض آسمان وزمین، سب کا وجود توحیدِ باری تعالیٰ کا مظہرِ اتم ہے

---

① (النحل: ٣٦)

② (الانبیاء: ٢٥)

وفی کل شیئ له آیة　　تدل علی انه واحد

بقائے کائنات ، بقائے موحدین پر موقوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کائنات کی بقاء ، توحید اور اہلِ توحید کی بقاء کے ساتھ مشروط ہے ، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے "لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلٰى شِرَارِ النَّاسِ " یعنی قیامت بد بخت ترین لوگوں پر قائم ہوگی ، ایک حدیث میں " شرار " کی جگہ " حثالة " کا لفظ وارد ہوا ہے ، جسکا معنیٰ " بیکار " اور " ردی " قسم کے لوگ ہیں بد بخت ترین اور انتہائی ردی لوگ وہ ہیں جو توحید کے باغی اور شرک کے کیچڑ میں لت پت ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک اور حدیث میں " شرار " یا " حثالة " کی جگہ ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جو عقیدۂ توحید سے عاری ہونگے ، آپ ﷺ نے فرمایا: "لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالُ فِي الْاَرْضِ اَللّٰه اَللّٰه " یعنی اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک اس زمین میں اہلِ توحید موجود ہیں ، گویا اہلِ توحید کی بقاء ، اس کائنات کے بقاء کو مستلزم ہے۔ اور جب توحیدِ خالص کے نور سے منوّر آخری انسان دنیا سے اٹھ جائے گا تو باقی شرار اور حثالة رہ جائیں گے جن پر قیامت کی ہولناکیاں ٹوٹ پڑیں گی ، یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: " وہ لوگ کائنات کے سب سے بدترین لوگ ہیں جن پر قیامت قائم ہوگی "

حضرات ! ہماری مذکورہ انتہائی مختصر سی تحریر سے توحید کی ضرورت اور اہمیت واضح ہوئی ، اور یہ بات ثابت ہوئی کہ توحید کے بغیر نجات ناممکن ہے ، اور کیوں نہیں ، اللہ تعالیٰ نے جن و انس کی تخلیق کا مقصد صرف توحید ہی بیان فرمایا ہے ، ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ ① تو پھر اس کے بغیر نجات کیونکر ممکن ہے؟

بس اسی اہم ترین نکتہ کی خاطر ہم نے توحید کے مسئلہ کو موضوعِ تحریر بنانے کا فیصلہ کیا ، گو کہ اس موضوع پر علمائے متقدمین و متاخرین نے خوب لکھا ، تفصیل کیلئے ہمارے شیخ ، محدثِ دیارِ سندھ ، شیخ العرب والعجم علامہ بدیع الدین الراشدی رحمہ اللہ کا وہ عظیم الشان مقدمہ ملاحظہ فرمائیے جو کتاب " هداية المستفيد " کی زینت ہے ، ہمارے شیخ نے اپنے اس انتہائی مفید اور علم سے بھرپور مقدمے میں علیحدہ علیحدہ ہر صدی کے علماء و محدثین کی توحید سے متعلق تحریری خدمات بیان فرمائی ہیں۔ (فجزاهم الله عنا خير الجزاء)

خدمتِ توحید کا یہ تسلسل جب تیرھویں صدی میں داخل ہوا تو مشیتِ باری تعالیٰ سے عرب کی سرزمین جو اُس وقت جہالات و ضلالات کا منبع بنی ہوئی تھی کے ایک چھوٹے سے گاؤں درعیہ (جو موجودہ ریاض سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر ہے) میں ایک شخصیت نے جنم لیا ، ہمارے شیخ فرماتے ہیں :

" اسی صدی میں مجدد الدعوة الاسلامية ، شیخ الاسلام ، عَلَم الأعلام ، الداعی إلی اللہ ، والمجاہد فی سبیل اللہ ،

---

① (الذاريات : ٥٦)

محدثِ دوراں، مجددِ زمان الشیخ محمد بن عبدالوہاب الدرعی رحمہ اللہ پیدا ہوئے۔ آپ اس وقت آئے جب کہ ہر طرف شرک کا دور دورہ تھا، قبر پرستی، تعزیہ پرستی، درختوں، بتوں اور پتھروں کی پوجا مزاروں اور درگاہوں پر میلے اور عرس، بزرگوں اور ولیوں کو مشکل میں پکارنا، ان کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنا، وسیلہ اور نجات کا ذریعہ جاننا، انکے چلّے نکالنا، ان کے نام کے دن منانا، انکے ہاں تقرب حاصل کرنے کیلئے نذر و نیاز دینا، صدقات وخیرات کرنا۔ گویا کے لوگ اللہ تعالیٰ سے ناامید اور توحید سے بالکل دور ہو چکے تھے اور اسی وجہ سے عمل میں بہت کوتاہی واقع ہوئی، لوگ بے عملی اور بُرے کاموں میں گرفتار ہونے لگے، خود نجد کا یہ حال تھا کہ پورا علاقہ عقائدِ فاسدہ، خرافات وبدعات اور بے دینی کا مرکز بن چکا تھا، جگہ جگہ مصنوعی قبریں اور درگاہیں تھیں۔

شیخ نے اپنی دعوت کو ہمت، صبر واستقلال سے چلایا اور مخالفین کی طرف سے مناظرے ہوئے اور آپ کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، بہتان والزام عائد کیے گئے، لیکن شیخ نے ان سب تکلیفوں کو فراخ دلی سے برداشت کرتے ہوئے اپنی دعوت کو جاری رکھا، حتی کہ آپ کی دعوت کا اثر بڑھتے بڑھتے حجاز تک پہنچا اور ہر طرف توحید کی روشنی چمکنے لگی، اور لوگ پھر سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوئے، اسلام کو سمجھا، حق وباطل میں تمیز ہوئی۔

امام موصوف نے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں سے اکثر میں توحید کی دعوت اور شرک کی تردید پر زور دیا ہے، جن کا ذکر آپ کے حالاتِ زندگی میں آئے گا۔ ان شاء اللہ

ان سب میں آپ کی شہرۂ آفاق وہ کتاب ہے جو سب سے پہلے آپ نے تصنیف فرمائی یعنی ''کتاب التوحید الذی ھو حق اللہ علی العبید'' مصنف رحمہ اللہ نے اسے ابواب کی ترتیب پر لکھا ہے اور توحید کے ہر مسئلہ کے لئے الگ باب قائم کیا جس میں آیاتِ قرآنیہ، احادیثِ مرفوعہ اور پھر صحابہ کرام اور تابعین کے آثار جمع کیئے۔ آخر میں ان دلائل سے جو مسائل مستنبط سمجھے، ذکر فرمائے۔ امام الدعوۃ نے توحید کی تین قسمیں بیان فرمائیں:

- توحیدِ ربوبیت: اس میں استغاثہ، دعا، استعاذہ، نذر، ذبح وغیرہ کا بیان ہے۔
- توحیدِ الوہیت: اس میں توسل، شفاعتِ غیر شرعیہ کی تردید فرمائی۔
- توحیدِ صفات: اس میں جہمیہ، مشبہہ اور مؤولہ گمراہ فرقوں کی تردید فرمائی، مختصر لیکن جامع انداز میں، نیز سحر، جادو، ٹونہ، تعویذ گنڈہ، بدفالی، حلف لغیر اللہ جیسے امورِ شرکیہ کا بھی رد فرمایا۔

امامِ موصوف نے شروع عنوان میں حدیثِ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو بطورِ مقدمہ پیش کیا ہے جس میں یہ بیان

ہے "حَقُّ اللّٰہِ عَلَی الْعِبَادِ اَنْ یَّعْبُدُوْہُ وَلَا یُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَحَقُّ الْعِبَادِ عَلَی اللّٰہِ اَنْ لَّا یُعَذِّبَ مَنْ لَا یُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا"

اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اسکی بندگی کریں اور اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ جو شخص اسکے ساتھ کسی شئ کو شریک نہ ٹھہرائے وہ اس کو (قبر و قیامت میں) عذاب نہ دے۔

کتاب کی وجہ تسمیہ: امام موصوف نے اسی حدیث سے کتاب کا نام اخذ کیا، گویا کتاب اسم بامسمّٰی ہے۔ اس حدیث اور جو آیات اس سے قبل ذکر کی ہیں، ان سے چوبیس مسائل اخذ کئے ہیں جن سے مصنف کی وسعتِ علمی کا اندازہ ہوتا ہے ان میں سے بطور نمونہ کے دو مسئلے یہ ہیں۔

مشتملات کتاب (۱) ان العبادة هی التوحید (۲) ان عبادة الله لا تحصل الا بالکفر بالطاغوت مقدمہ کے بعد چھیاسٹھ (٦٦) ابواب قائم کئے ہیں، ہر باب کئی مسائل کا حامل ہے گویا کہ یہ کتاب عقائد کی ایک جامع مگر مختصر اور عام فہم کتاب ہے۔

پہلے چار ابواب میں توحید کی فضیلت اور ضرورت بیان کی اور اس کی طرف دعوت کی ترغیب دی اور شرک سے ڈرایا گیا ہے، اس کے بعد ایک باب ''توحید'' کی وضاحت اور تشریح کے لئے رکھا ہے۔ ''شرک'' کی اقسام بیان کرنے کے لئے دس ابواب قائم کیے ہیں۔ پھر ''شفاعت'' اور اس کے لواحق کے لئے دو باب، اور ''غلو'' کی مذمت اور اسکے نتائجِ بد بیان کرنے کے لئے پانچ ابواب قائم کیے ہیں۔ اس کے بعد سات ابواب میں کچھ ''رسومِ شرکیہ'' بیان فرمائی ہیں۔ پھر ان امور کو بیان کیا ہے جن کا تعلق عقیدہ سے ہے مثلاً: محبت، خوف، توکل، امید اور صبر، ان کو پانچ ابواب میں بیان فرمایا ہے۔

پھر دو ابواب ''اخلاص'' کی ترغیب اور ''ریاء'' سے ترھیب کیلئے ذکر کیئے ہیں، اس کے بعد دو باب ''تحاکم الی الطاغوت'' اور ''اطاعتِ غیر اللہ'' کی تردید میں لائے۔ پھر سترہ ابواب میں توحید کی صفات کو بیان کیا۔ پھر چار ابواب میں ''تقدیر'' کے احکام بیان کئے اور ''قدریوں'' کی تردید کی اور آخری سات ابواب میں اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان اور اس کے اعلیٰ و ارفع ہونے کا بیان فرمایا۔

اس حسنِ ترتیب نے سلف صالحین کی تصنیف و تبویب کی یاد تازہ کر دی۔

علامہ حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ کا وہ مقولہ جو انہوں نے اپنی کتاب ''بلوغ المرام'' کی شان میں فرمایا ہے وہ اس ''کتاب التوحید'' پر حرف بحرف صادق آتا ہے کہ "یستعین بہ الطالب المبتدی ولا یستغنی عنہ الراغب المنتھی" یعنی ''ایک مبتدی طالب علم بھی اس کتاب سے مستفید ہوتا رہے گا اور ایک منتہی عالمِ دین بھی اس سے مستغنی نہیں ہوگا''

اسی طرح امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الدرر البھیہ'' کے بارے میں فرمایا: ''فنسبة هذا المختصر الى المطولات من الكتب الفقهية نسبة السبيكة الذ هبية الى التربة المعدنية''
یعنی'' یہ مختصر کتاب کتبِ مطولہ جو کہ قیمتی معادن کا پہاڑ ہیں کے مقابلے میں ایک سونے کی ڈلی کی حیثیت رکھتی ہے'' بعینہ یہ صفت اس کتاب کی بنسبت ان مطولات کے نظر آتی ہے جو نویں صدی ہجری سے لیکر آج تک توحید پر لکھی گئی ہیں۔

اس کتاب نے شرک کے مراکز اور اہلِ بدعت کے کارناموں پر ایٹم بم کا کام کیا۔ مشرکین لرزہ براندام ہوئے، مخالفین نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اہلِ ہند نے شاہ اسماعیل شھید رحمہ اللہ کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کے ساتھ کیا۔ مگر بموجب فرمانِ الٰہی: ﴿ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ﴾ ①
''جو زمین اچھی ہوتی ہے، وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے''

جن خوش نصیب افراد کے اندر ایمان کی تمنا موجود تھی، ان کو صحیح راستہ معلوم ہوا۔ پھر ارضِ نجد، توحید سے منور ہوئی جس کے آثار آج تک موجود ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ ان شاء اللہ، جن لوگوں کے اندر عملی تغیر کافی حد تک آ گیا تھا وہ توحید سے سرشار اور پیکرِ عمل نظر آنے لگے۔

اس کتاب سے عرب وعجم کے کئی ملکوں کے افراد نے استفادہ کیا اور توحید کی راہ معلوم کر کے شرک وبدعت سے تائب ہوئے۔ خاص کر شیخ کے بھائی شیخ سلیمان بن عبد الوہاب رحمہ اللہ المتوفی ۱۲۰۸ھ جو آپ کے سخت مخالف تھے بلکہ جنہوں نے آپ کی تردید میں ایک رسالہ بنام'' الصواعق الالٰهية في الرد على الوهابية ''لکھا تھا۔ مگر چونکہ سلیم القلب تھے محض حسد وبغض اور عناد پر ان کی تردید مبنی تھی اس لئے بالآخر حق کو سمجھا اور اپنے غلط عقائد سے رجوع اِلی الحق ہوئے، اور اپنے بھائی شیخ کے پاس تائب ہو کر آئے جیسا کہ علامہ حسین بن غنام احسائی المتوفی ۱۲۲۵ھ نے اپنی کتاب'' روضة الافكار'' کے صفحہ ۹۶ جلد اول طبع اول میں ۱۱۹۰ھ کے حوادث میں ذکر کیا ہے اور شیخ سلیمان بن سحمان نے اپنی کتاب ''الضیاء الشارق'' کے صفحہ ۶۰ میں ذکر کیا ہے۔

مثل مشہور ہے:
''الاقارب کالعقارب''
قریبی رشتہ دار بچھوؤں کی مانند ہوتے ہیں۔

بھائیوں کی رقابت بڑی خطرناک اور تباہ کن ہوتی ہے۔ مگر یہ امام الدعوۃ رحمہ اللہ کے حسنِ اخلاق، رواداری، شیریں بیانی اور صحتِ استدلال وقوتِ معارضہ جیسے ہمہ گیر اوصاف سے متصف ہونے کی بیّن

① (الاعراف: ۵۸)

دلیل ہے کہ ان کے بھائی نے باوجود شدّتِ مخالفت کے آخر حق کی طرف رجوع کیا، اور اپنے بھائی کا ساتھ دیا، ایسی توفیق اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو بخشے (آمین)

کتاب التوحید کی اہلِ علم نے شرحیں بھی لکھیں، جیسے علامہ احمد بن حسن نے "الدرر النضید" لکھی، جو ۱۳۱۱ھ کو دہلی میں چھپی۔

دوسری شرح شیخ کے پوتے، محدث، فقیہ شیخ سلیمان بن عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ نے لکھی، آپ ۱۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۳ھ میں وفات پائی۔

بڑے بڑے اساتذہ کے علاوہ امام محمد بن علی الشوکانی رحمہ اللہ سے بھی آپ کو شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ آپ نے کتاب التوحید کی شرح بنام "تیسیر العزیز الحمید" لکھی، لائق مصنف، مقدمہ میں اس شرح کی ضرورت واہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مصنف رحمہ اللہ نے انبیاء ومرسلین علیہم السلام کی بیان کردہ توحید کے موضوع کے متعلق اور مشرکین میں سے جنہوں نے اس توحید کی مخالفت کی ان کے بارے میں کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ایک تصنیف "کتاب التوحید" ہے جو اپنے موضوع میں منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ نہ اس اسلوب کی کتاب اس سے پہلے لکھی گئی نہ بعد میں، میں ان شاء اللہ اسی کتاب کے بارے میں معروضات پیش کرونگا۔ اگرچہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اس کے درپے ہوں، لیکن جب میں نے کتاب دیکھی اور یہ معلوم ہوا کہ اس پر کسی نے تعرض نہیں کیا ہے اور یہ بھی دیکھا کہ طلبہ اور برادرانِ اہلِ علم اس کی شرح کے لئے ایک شوق اور تڑپ رکھتے ہیں اور یہ معلوم کرنے کے خواہاں ہیں کہ یہ کن اُمور پر مشتمل ہے تو میں نے مناسب سمجھا کہ اپنی علمی بساط کے مطابق یہ خدمت سرانجام دوں۔" ①

یہ شرح نہایت عمدہ اور علمی خزانے کا مجموعہ ہے اس میں خاص خوبی یہ ہے کہ شارح رحمہ اللہ نے تشریحِ متونِ احادیث کے ساتھ ساتھ احادیث پر محدثانہ کلام کیا ہے، اور جو روایات اصل کتاب میں بغیر حوالہ کے منقول ہیں ان کی تخریج کی ہے، کئی روایات کو بالأسانید ذکر کیا ہے اور جرح وتعدیل واختلافِ روایات اور زیادات وغیرہ کو بھی بیان کیا ہے، جن محدثین کی کتابوں سے حدیثیں نقل کی گئی ہیں ان کے تراجم وحالات مختصر بیان کیے ہیں اور شیخ رحمہ اللہ کی اصطلاحات کو بھی اچھی طرح واضح کیا ہے۔ مثلاً: جہاں صرف الصحیح کا حوالہ ہے، واضح کردیا ہے اس سے صرف "صحیح بخاری" مراد ہے یا "مسلم" یا دونوں اور "السنن والمسند" کی بھی تعین کی ہے کہ اس سے کون سی کتاب مراد ہے، ہمارے خیال میں کتاب التوحید کی احادیث سے استفادہ کرنے

① ("تیسیر العزیز الحمید" صفحہ : ٢٤)

والوں کیلئے اس شرح کو سامنے رکھنا ضروری ہے کیونکہ شارح رحمہ اللہ نے صحیح وغیر صحیح کی نشاندہی بھی کی ہے اور جہاں متابعت وشواہد مل سکے ہیں ان کا بھی ذکر فرماتے ہیں۔

الغرض کوئی اہلحدیث اور خالص توحید کی معرفت حاصل کرنے والا اس کتاب سے بے نیاز اور مستغنی نہیں ہوسکتا، مگر افسوس کہ شارح رحمہ اللہ اس شرح کو پورا نہ کر سکے، ''باب ماجاء فی منکر القدر'' تک شرح کی، باقی آخری سات ابواب کی شرح علامہ ابوبکر زہیر الشاویش نے '' فتح المجید '' سے مکمل کی، کما ذکرہ فی المقدمة وفی حاشية التيسير (صفحه ٦٩١)

یہ شرح دو مرتبہ شائع ہوئی ہے پہلی بار ۱۳۸۲ھ میں دوسری مرتبہ ۱۳۹۰ھ میں شیخ زہیر الشاویش کی تحقیق سے شائع ہوئی۔(انتھیٰ کلام شیخنا)

اس تقریر سے کتاب التوحید کے ساتھ ساتھ اس کی عظیم شرح ''تیسیر العزیز الحمید'' کی قدر و قیمت واہمیت بھی واضح ہوگئی۔'' انتھی کلامہ

یہ انتہائی مختصر مگر جامع کتاب، صرف کتاب وسنت کے دلائل پر مبنی ہے، اور یہی اصل علم ہے اور یہی اس کتاب کی سب سے عظیم خوبی ہے، چند اوراق پر مشتمل اس کتاب میں، توحید کی تعریف وتفسیر، توحید کی عظمت واہمیت وفضیلت، توحید کی تقسیم اور توحید کی دعوت کی فرضیت جیسے اہم موضوع انتہائی مؤثر طریقے سے ذکر کیے ہیں، پھر شرک کے خطرات واضح کئے، اور بہت سے وہ اُمور ذکر کئے جن کو لوگ عبادت سمجھ کر ارتکاب کررہے ہیں، حالانکہ وہ شرکیہ امور ہیں مثلاً: کڑے، دھاگے اور منکے پہننا، شرکیہ دم جھاڑے، تعویذ نویسی وتعویذ فروشی، درختوں اور پتھروں سے حصولِ برکت کی امیدیں وابستہ رکھنا، غیر اللہ کے نام جانور ذبح کرنا، نذریں اور منتیں ماننا، غیر اللہ سے استعاذہ کرنا، غیر اللہ سے استعانت واستغاثہ کرنا، غیر اللہ سے دعائیں مانگنا، انبیاء وصالحین کے حوالے سے یا ان کی قبروں کے تعلق سے غلو کا ارتکاب کرنا، جادو اور اس کی اقسام، جادوگروں سے جادو کے ازالہ کا مطالبہ کرنا، کہانت، علمِ نجوم، ستاروں کے تعلق سے غلط عقیدے، غیر اللہ سے اللہ تعالیٰ جیسی محبت، ان سے اس طرح ڈرنا، جیسا ڈرنا صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، غیر اللہ پر توکل کرنا، شرکِ اصغر یعنی ریا کاری کا ارتکاب، تحریم وتحلیل میں کتاب وسنت کی بجائے ائمہ وعلماء کے اقوال کے ساتھ تمسک کرنا اور یوں تقلیدِ جامد کا مظاہرہ کرنا، اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں تعطیل یا تأویل جیسے عقیدۂ باطلہ کی جسارت کرنا، غیر اللہ سے شفاعت طلب کرنا، وغیرہ وغیرہ بہت سے شرکیہ امور پر قرآن وحدیث کے دلائل کے ساتھ تنبیہ فرمائی ہے، اس کے علاوہ بہت سے چھوٹے امور جن سے غفلت کا مظاہرہ کرنے سے شرک کا دروازہ کھل سکتا ہے کو بڑے احسن طریق سے بیان کیا، اور یہ بتلایا کہ جنابِ محمد رسول اللہ ﷺ نے

توحید کی اساس پر کتنے احسن انداز سے صحابہ کی تربیت کی اور بعض چھوٹے چھوٹے امور کی مثالیں ذکر کر کے یہ بات واضح فرمائی کہ آپ ﷺ نے کس طرح شرک کا ہر چھوٹا بڑا دروازہ بند کردیا...... جو بذاتِ خود توحید کی اہمیت اور شرک کی مذمت وخطورت کی زبردست دلیل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک عظیم کتاب ہے، جو بالخصوص آج کے دور کی، بلکہ ہر دور کی بڑی اہم ضرورت ہے۔

اور اس کتاب کی سب سے پہلی شرح ''تیسیر العزیز الحمید'' جس کا ترجمہ وتفہیم وتلخیص آپ کے سامنے ہے، اس کے مؤلف کے علمی مرتبہ ومقام، اور محدثانہ وفقیہانہ شان اور ورع واخلاص کی بناء پر ایک عظیم اور بے مثل خصوصیت ومزیت کی حامل ہے۔

کتاب ''تیسیر العزیز الحمید'' کی شان میں مزید نکھار پیدا کرنے کے لئے اس کے مؤلف شیخ سلیمان بن عبداللہ التمیمی الدرعی رحمہ اللہ کی مختصر سوانح حیات اور گرانقدر علمی خدمات کا تعارف ضروری ہے۔

حیاتِ مؤلّف

شیخ رحمہ اللہ علم وحلم اور حفظ وذکاوت میں اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی تھے، حدیث، رجالِ حدیث، حدیث کی صحت وضعف، فقہ وتفسیر اور علم النحو میں دسترسِ تامہ رکھتے تھے۔ خاص کر رجالِ حدیث کی معرفت میں تو اکابر حفاظ کے ہم پلّہ تھے۔ ذہانت وذکاوت میں ضرب المثل تھے۔ تحریر انتہائی خوبصورت تھی، ان کے دور میں کتابت بالقلم میں کوئی ان کا مثل نہیں تھا۔

بہت سے علوم وفنون میں مہارت حاصل کی، رجالِ حدیث کی معرفت میں تو ''ید طولیٰ'' رکھتے تھے، اپنے بارے میں کہا کرتے تھے کہ'' میں اپنے گاؤں ''الدرعیۃ'' کے لوگوں کی اتنی معرفت نہیں رکھتا جتنی رجالِ حدیث کی معرفت رکھتا ہوں۔''

صغرِ سنی ہی میں علوم اور صفاتِ حمیدہ میں کمال حاصل کرلیا تھا۔ بچپن ہی سے علم سے وابستہ ہوگئے گویا دنیا اور اسکے مشاغل سے کوئی واسطہ ہی نہیں، ایک دفعہ بعض ساتھی باصرار باہر لے گئے تو آپ تربوز اور کدّو کی بیلوں میں فرق نہ کرسکے۔

اساتذہ: شیخ رحمہ اللہ نے اپنے دور کے جید علماءِ کرام سے علم حاصل کیا جن میں سے چند کے نام یہ ہیں: شیخ کے والدِ گرامی، شیخ حمد بن معمر، شیخ حسین اور شیخ علی (یہ دونوں آپ کے چچا تھے) شیخ عبداللہ بن فاضل، شیخ عبدالرحمٰن بن خمیس اور شیخ عبدالغریب وغیرہ۔

شیخ رحمہ اللہ کے دور کے عظیم محدث اور فقیہ الشیخ محمد بن علی الشوکانی رحمہ اللہ نے انہیں اجازۃ فی الحدیث مرحمت فرمائی۔

اہم تصانیف:

(۱) ''تیسیر العزیز الحمید شرح کتاب التوحید'' یہ کتاب درحقیقت شیخ رحمہ اللہ کے دادا شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ کی مسائل توحید پر عظیم کتاب ''کتاب التوحید'' کی شرح ہے۔ یہ کتاب ایک علمی سرمایہ اور مرجع خلائق ہے، مسائلِ توحید اور امورِ شرک کی معرفت میں اہلِ علم اس کتاب کے محتاج ہیں۔ شیخ رحمہ اللہ نے اپنی اس شرح پر حاشیہ بھی لکھا ہے۔

(۲) ''الد لا ئل فی حکمِ موالاۃ اھلِ الشرك''(مشرکین سے دوستی کا حکم اور اسکے ادلہ) یہ کتاب اتنی مفید اور مقبول عام ہے کہ طلبہ اسے حفظ کرتے ہیں۔

(۳) '' فتاویٰ'' شیخ رحمہ اللہ نے اپنے دور میں مختلف مسائل پر انتہائی مفید اور علمی فتاویٰ صادر فرمائے، ان فتاویٰ کو ''فتاویٰ أئمۃ الدعوۃ'' میں شامل کیا گیا ہے۔

ان کتب اور فتاویٰ کے مطالعے سے شیخ رحمہ اللہ کے علمی تبحر، ذکاوت، حفظ اور حسن الفہم کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

تلامذہ: شیخ رحمہ اللہ سے بہت سارے اہلِ علم نے استفادہ کیا، شیخ کے معروف تلامذہ میں ایک معروف نام شیخ محمد بن سلطان کا ہے۔

شیخ رحمہ اللہ زندگی بھر ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کا فریضہ انتہائی قوت اور استقامت کے ساتھ سرانجام دیتے رہے، اور اس سلسلے میں لوگوں کی ملامت وغیرہ کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' میں کسی امیر، رئیس اور حکومتی عہدیدار کا بھی لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ اگر کوئی کمزور اور غریب شخص اپنا کوئی مسئلہ یا حاجت پیش کرتا تو حتی الامکان اسے پورا کرنے کی کوشش کرتے۔

شہادت: علم وعمل کا یہ سپوت ۱۲۳۳ھ میں مرتبۂ شہادت سے سرفراز ہوا، جسکی قدرے تفصیل یہ ہے کہ ابراھیم پاشا بن محمد علی پاشا جب ''الدرعیۃ'' پر قابض ہوا تو کچھ منافقین وحاسدین نے شیخ رحمہ اللہ کی اس کے پاس چغلی کی اور ان کے خلاف اِسے ابھارا، تو ابراھیم پاشا نے شیخ رحمہ اللہ کو اپنے دربار میں طلب کیا، پہلے تو آپ کو ذہنی اذیت دینے کے لئے آپ کے سامنے آلاتِ لہو ولعب (ڈھول ڈھمکے وغیرہ) بجوائے، پھر آپ پر گولیوں کی بوچھاڑ کروادی جس سے شیخ رحمہ اللہ کا جسم چھلنی ہوگیا اور روح جسم عنصری سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طرف پرواز کرگئی۔ رحمه الله تعالیٰ وأجزل مثوبته واسكنه فسيح جنانه۔

ہم نے جب اس عظیم المنفعت کتاب کے ترجمہ کا آغاز کیا تو ارادہ یہی تھا کہ مکمل کتاب کا ترجمہ ہدیۂ

قارئین کیا جائے، لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ کتاب کے بعض مباحث خالص علمی اور دقیق ہیں، جو عوام الناس کی ذہنی رسائی سے بالاتر ہیں، مثلاً لغوی مباحث، نحوی تراکیب، مطول تخریج، اسنادی مطالب اور قواعد واصطلاحاتِ محدثین سے متعلق مسائل جو عام لوگوں کیلئے یکسر ناقابلِ فہم ہیں، وغیرہ۔ اور پھر آج کے دور کی علمی حوالے سے پست ہمتی بھی پیشِ نظر تھی، نیز مادیت کی یلغار بھی مطولات اور مجلدات سے پہلوتہی برتنے کا سبب بن چکی ہے۔ تو ان تمام اسباب کے پیشِ نظر میں نے اختصار، تہذیب اور تفہیم کا طریق اختیار کیا، البتہ اوّل سے آخر تک یہ کوشش ضرور کی ہے کہ عقیدے سے متعلق ذکر شدہ کوئی مسئلہ چھوٹنے نہ پائے، اور یہی کتاب کا اصل مقصود ہے۔ جہاں عبارت میں کچھ اغلاق یا غموض محسوس کیا وہاں سیاق وسباق کے قانون سے استفادہ کیا، کچھ مقامات پر زیادات کی ضرورت بھی محسوس کی جسے بین القوسین ذکر کرنا مناسب سمجھا۔ شرح میں مذکور اکثر ضعیف احادیث حذف کر دی ہیں جن احادیث کو ذکر کیا ہے ان کی مختصر تخریج جو کتاب کے مطبوعہ نسخہ سے ماخوذ ہے برائے افادیت شاملِ کتاب کر لی گئی ہے۔

اظہارِ تشکر

اس عظیم سفر کا اختتام مجھ ناچیز اور ناکارہ، کم ہمت اور کثیر المشاغل انسان کی طاقت سے انتہائی بعید تھا، کتابِ ھذا کی تیاری وتکمیل کے ہر مرحلے میں ہمارے انتہائی اقرب واخص شاگرد مولانا محمد داؤد شاکر ﷾ کا تعاون شامل رہا، ان کے مخلصانہ تعاون اور گاہے بگاہے کام کی ترغیب وتحریض کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا، ان کی شب وروز کی محنتِ شاقہ نیز کئی راتیں میرے ساتھ جاگتے رہنا اور میرے کثرتِ اسفار کی مجبوری کا احساس کرتے ہوئے میری غیر حاضری میں بھی اس عمل کو جاری رکھنا درحقیقت کتاب کی تکمیل کا اہم و بنیادی سبب ہے۔ فجزاه الله عنی خير الجزاء واسعده فی الدارين وزاده علما وعملا واخلاصا ووفقه لمزيد ما يحبه ويرضاه۔

کتاب کی کمپوزنگ ایک بڑا صبر آزما مرحلہ تھا، جسے ہمارے شاگردِ نجیب مولانا زبیر اسمٰعیل نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا، جس پر میں ان کا بے حد ممنون ومشکور ہوں۔

طباعت کے امور کی نگرانی ہمارے لائق، مخلص اور محنتی رفیقِ سفر سعد بن عبد العزیز کے حصہ میں آئی ہے اور وہ اپنے شعبہ میں بڑی توجہ اور محنت کے ساتھ سرگرمِ عمل ہیں۔ فجزاه الله خير الجزاء۔

میرے لئے یہ خوشی کا مقام ہے کہ سفرِ سعادت (تصنیف وتالیف) میں ہمارے ساتھ ہمارے دو مزید شاگرد المعھد السلفی للتعلیم والتربیۃ کے طالبِ علم رعثمان صفدر اور عبد اللہ شمیم بھی شامل ہو چکے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے اور مستقبل قریب میں ہمیں ان سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ اللھم زد فزد

اس موقعہ پر بڑی ناانصافی ہوگی اگر میں اپنے فاضل اور مخلص دوست فضیلۃ الشیخ علی بن عبداللہ النمی التمیمی ﷾ آف ریاض سعودی عرب کا ذکر خیر نہ کروں۔ حقیقت یہ ہے کہ ترجمہ وتالیف کی طرف ہمارے رجحان میں ان کی ترغیب، تحریض، تعاون اور ہمت افزائی کو بڑا دخل حاصل ہے، ان کی نصائح میرے لئے بڑی تقویت وحوصلہ افزائی کا باعث ثابت ہوئی ہیں، جس سے میں ان کا بھی صمیمِ قلب شکرگزار اور دعا گو ہوں۔ بارك الله في حياته، وعلمه، وعمله، و زوّده الاخلاص، والتقوىٰ، وجعله سنداً لخدمة الاسلام والمسلمين.

مشائخ کرام: فضیلۃ الشیخ خلیل الرحمٰن لکھوی ﷾، فضیلۃ الشیخ ابوعمار عمر فاروق السعیدی ﷾، فضیلۃ الشیخ ابوعبدالمجید محمد حسین البلتستانی ﷾ اور فضیلۃ الشیخ محمد ابراھیم بھٹی ﷾ کا بھی دل کی گہرائیوں سے شکرگزار ودعا گو ہوں، جن کی علمی تقاریظ نے کتاب کو حسن اور ہمیں حوصلہ بخشا۔ شكر الله سعيهم وسدد خطاهم وزادهم عزا وشرفا.

آخر میں، میں اپنے اہلِ خانہ اور بچوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں! جنہوں نے میری مصروفیات کا ادراک واحساس کرتے ہوئے اپنے بہت سے ضروری مطالبات سے دستبرداری اور دست کشی پر انتہائی صبر کے ساتھ آمادگی قبول کرلی ہے، اور بہت سی گھریلو ذمہ داریوں سے مجھے فارغ بھی کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں اس صبرو رضا کا عظیم صلہ عطا فرمائے۔

یہ عمل اس لحاظ سے انتہائی متواضع ہے کہ اس ناچیز وناکارہ کی کوششوں کا نتیجہ ہے، لیکن اس لحاظ سے عظیم تر ہے کہ یہ میرے پروردگار کی توحید ایسے عظیم موضوع پر مشتمل ہے، دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس عملِ متواضع کو اپنے بہت سے بندوں کی ہدایت کا ذریعہ بنادے اور اس قابل کردے کہ یہ قیامت کے دن میرے میزانِ حسنات میں جگہ پالے۔

قارئین سے ملتجی وملتمس ہوں کہ مجھے، میرے اساتذہ کرام، میرے والدین مرحومین اور میرے اہلِ خانہ کو اپنی خصوصی دعاؤں میں یاد رکھیں بالخصوص یہ ناکارہ قدم قدم پر آپ کی دعاؤں کا محتاج ہے۔

کتاب ھذا کی ہر درست بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اسی کی توفیق سے ہے جبکہ ہر غلطی میری طرف سے ہے اور شیطان کی شرارتوں اور وساوس کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ کا دین اس سے بری ہے۔ البتہ غلطیوں کی نشاندہی ضرور فرمائیں تاکہ آپ کو اجر مل جائے اور ہماری اصلاح ہوجائے، نیز اگلے ایڈیشن میں اس کی اصلاح کی جائے۔

ایک عجیب حسنِ اتفاق:

مقدمہ ھذا کی آخری سطر زیرِ تحریر تھی اور اس عمل کی بساط تقریباً لپٹ اور سمٹ چکی تھی مختلف مساجد کے میناروں سے آذانِ فجر گونجنا شروع ہوئی ...... جسے میں اپنے عملِ متواضع کے لئے نیک شگون تصور کرتا ہوں، اذان ہمارا عظیم دینی شعار ہے، دعوتِ تامہ وکاملہ ہے، بصورتِ اذان اس قطعۂ ارضی کے چپہ چپہ پر اللہ تعالیٰ کی توحید کا ڈنکا بج رہا ہے۔ میں اس نیک فالی پر اللہ تعالیٰ کی ذات سے پورے وثوق کے ساتھ یہ امید قائم کر چکا ہوں کہ ایک نہ ایک بندہ اس کتاب کو پڑھ کر ضرور راہِ راست پر آئے گا، ضرور اس کا سینہ خزانۂ توحید سے معمور اور نورِ توحید سے منور ہوگا......اس سیاہ کار کی نجات کے لئے یہی ایک بہت بڑا اثاثہ اور سرمایہ ہے...... یاالٰہ العالمین تو قبول فرمالے، اور مجھ سے راضی ہوجا، بھلا میں تیرے غُصّے اور ناراضگی کا کیسے متحمل ہوسکتا ہوں......انك سميع، قريب، مجيب الدعوات، وأصلي، وأسلم على نبيك محمد وعلى آله، وصحبه، وأهل طاعته اجمعين۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے مباحث

مصنف رحمہ اللہ نے بہت سے فوائد کے پیش نظر اپنی کتاب کا آغاز ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ سے فرمایا ہے۔سب سے اہم فائدہ قرآن مجید کی اقتداء ہے۔'' کہ اس کتاب مقدس کا آغاز ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ سے ہوا ہے۔''

دوسرا فائدہ رسول ﷺ کی حدیث پر عمل کرنا ہے، چنانچہ عبد القادر الرہاوی اپنی کتاب (الاربعین) میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ روایت لائے ہیں۔کہ "كُلُّ اَمْرٍ ذِىْ بَالٍ لَا يُبْدَأُ فِيْهِ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فَهُوَ اَقْطَعُ" یعنی جس با مقصد کام کو ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ سے نہ شروع کیا جائے تو وہ برکت سے خالی رہتا ہے۔لہذا ہر اچھا اور نیک عمل ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ سے شروع کرنا چاہیئے۔ [1]

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾

﴿ بسم ﴾ ''ب'' حرف جار بمعنی (ساتھ) ''اسم'' مجرور بمعنی (نام) قواعد لغت کی رو سے جار مجرور مل کر کسی کا متعلق ہوتے ہیں چاہے ان کا متعلق مذکور ہو یا محذوف، یہاں متعلق محذوف ہے اس محذوف کے بارہ میں اختلاف ہے۔

(ا) ''علمائے کوفہ کے نزدیک یہ محذوف فعل مقدم ہے، اصل یوں ہوگا" اَبْدَأُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ "یعنی میں اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں۔''

---

[1] اس حدیث میں شدید ضعف پایا جاتا ہے۔اس کی سند میں احمد بن محمد بن عمران نامی راوی ہے جس کے ضعیف ہونے پر تمام محدثین متفق ہیں۔اس معنی میں ایک اور حدیث ہے جس میں "لَا يُبْدَأُ فِيْهِ بِحَمْدِ اللّٰهِ'' کے الفاظ ہیں۔نیز ایک اور حدیث جو "لَا يُفْتَحُ بِذِكْرِ اللّٰهِ" کے لفظ سے وارد ہوئی ہے، اور مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، اور سنن کبریٰ بیہقی میں موجود ہے۔لیکن ان کی اسناد کا مدار قرہ بن عبد الرحمٰن المعافری پر ہے جو کہ ضعیف ہے۔واضح ہو کہ کتاب کو بسم اللہ سے شروع کرنے کے حوالے سے نبی ﷺ کی حدیث پر عمل مقصود ہے، اس سلسلہ میں مذکورہ ضعیف احادیث سے استدلال کرنے کے بجائے نبی ﷺ کے مکاتیب سے استدلال کرنا زیادہ بہتر ہے، چنانچہ صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول ﷺ نے مختلف ملوک کو جو مکاتیب ارسال کیئے وہ ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ سے شروع کیئے تھے۔دلیل کے لئے دیکھئے رسول ﷺ کا وہ خط مبارک جو آپ ﷺ نے ہرقل کو لکھا تھا وہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ سے شروع کیا تھا (صحیح بخاری / کتاب بدء الوحی الی رسول ﷺ)

(۲) ''بصریین کے نزدیک یہ محذوف اسم مقدم ہے، اس لحاظ سے اصل یوں ہے۔'' اِبْتِدَائِی کَائِنٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ''یعنی میرا شروع کرنا اللہ کے نام کے ساتھ قائم اور مستقر ہے۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان دونوں اقوال کو صحیح قرار دیا ہے، اور کہا ہے کہ دونوں استعمال قرآن مجید میں موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں علامہ زمخشری نے ایک تیسرا مذہب اختیار کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ''جار مجرور فعلِ محذوف مؤخر کے متعلق ہیں، اور جس نوعیت کا کام ہو اسی معنی کا فعل محذوف تصور کیا جائے۔ مثلاً قرأتِ قرآن مقصود ہو تو (بِسْمِ اللّٰهِ اَتْلُوْ......) وغیرہ۔'' انہوں نے فعلِ محذوف کو مؤخر اس لئے قرار دیا ہے تاکہ عمل کے ذکر سے قبل اللہ تعالیٰ کا نامِ نامی مذکور ہو جائے، جس میں ایک تو اختصاص کا فائدہ ہے، یعنی ہر کام کی ابتداء اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک کے ساتھ ہی مختص ہے کسی اور کے ذکر کی کوئی مجال نہیں۔

دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم اس شئی کی متقاضی ہے کہ اپنے کام کے ذکر سے پہلے اس ذات ''وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ'' کے نام پاک کا ذکر کیا جائے، جس کی توفیق کے بغیر نہ تو کسی کام کی ابتداء ممکن ہے اور نہ تکمیل۔

تیسرے یہ کہ ترتیبِ وجودی کی مطابقت بھی اسی میں ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا وجودِ مبارک ہر شئی پر مقدم ہے، لہٰذا ابتداء کے تعلق سے عمل کے ذکر سے پیشتر اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک کا ذکر ہونا چاہئے۔ یہ قول زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اور غالباً شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا بھی کسی حد تک اسی طرف میلان ہے۔

﴿ اللّٰه ﴾ یہ رب تعالیٰ کا عَلَم ''نام'' ہے۔ مشہور نحوی سیبویہ نے کہا ہے کہ یہ سب سے بڑا معرفہ ہے۔ بلکہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہی اسم اعظم ہے؛ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی دیگر تمام صفات کا موصوف بنتا ہے، جیسا کہ سورۃ الحشر کی آیات سے یہ نکتہ عیاں ہے۔

﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ ﴾ ①

(اللہ) کا اصل ''الالٰـہ'' ہے۔ بمعنی (معبود) ہمزۂ ثانیہ جو اصل لفظ کا فاء کلمہ ہے، کو گرا دیا گیا، پھر پہلی لام جو تعریف کی ہے کو دوسری لام جو عین کلمہ ہے میں ادغام کر دیا گیا، اب یہ ایک مشدد لام ہے، جس میں تعظیماً تفخیم پیدا کر کے (اللہ) کہا جاتا ہے۔

① (سورۃ الحشر: ۲۱......۲۴)

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

''اللہ تعالیٰ کا یہ نام اس کے تمام اسماء وصفات کے معنی کو سمیٹے ہوئے ہے''

مزید فرماتے ہیں: اس لفظ کے معنوی خصائص کا احاطہ ممکن نہیں ہے، کائنات میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ جاننے والے محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، مگر آپ ﷺ بھی فرمایا کرتے تھے: '' لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلَى نَفْسِكَ'' ①

یعنی: ''اے اللہ: تیرے خصائص ومحامد کو میں شمار نہیں کر سکتا، اس پر تو صرف تو ہی قادر ہے۔''

بھلا اس نام کے خصائص کا احاطہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے، کیونکہ اس مبارک نام والا، علی الاطلاق ہر قسم کے جلال وجمال وکمال کا مالک ہے، ہر قسم کی مدح، حمد وثناء، خوبی وبزرگی، عزت وفضیلت، خیر واحسان اور نیکی وفضل کا وہی مستحق ہے، کسی کو کچھ ملتا ہے تو اسی کی عطاء سے ملتا ہے۔ لہٰذا ہر حاجت مند کو اپنی ہر قسم کی ضرورت کی تکمیل کے لئے اسی نام کا سہارا لینا چاہیئے، صرف اسی نام کی برکت سے تھوڑی چیز زیادہ ہو جاتی ہے، خوف زائل ہو جاتا ہے، مصیبتوں اور پریشانیوں کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور تنگی وسعت میں بدل جاتی ہے، صرف اسی نام کا سہارا کمزور کو طاقتور، ذلیل کو معزز، فقیر کو غنی، خوف زدہ کو مانوس اور پریشان حال کو مطمئن وبے خوف کر دیتا ہے۔ یہ مقدس نام دھتکارے ہوئے انسانوں کی مضبوط پناہ گاہ ہے، دکھوں اور پریشانیوں کا مداوا ہے، اس نام سے برکتیں نازل ہوتی ہیں، اس نام کے واسطے سے خطائیں معاف کر دی جاتی ہیں، برائیاں ختم اور اچھائیاں حاصل کی جاتی ہیں۔

یہی وہ نام ہے جس کی وجہ سے آسمان وزمین اور ان کا نظام قائم ودائم ہے اور اسی نام کی خاطر کتابیں نازل کی گئیں، انبیاء ومرسلین علیہم السلام کو بھیجا گیا، شریعتیں نازل کی گئیں، حدود قائم کی گئیں اور جہاد فرض کیا گیا۔ اسی نام کی وجہ سے پوری خلق سعید یا شقی دو گروہوں میں بٹ گئی۔ اسی نام کی وجہ سے قیامت قائم کی جائے گی، میزانِ عدل رکھا جائے گا، پل صراط نصب کیا جائے گا، جنت یا جہنم کا داخلہ عمل میں لایا جائے گا، اسی نام کی بابت قبر وحشر میں سوال ہوگا۔ یہی وہ نام ہے جو دوستی اور دشمنی کی بنیاد ہے ''اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ'' اسی نام نے لوگوں کو نیک بخت یا بد بخت بنا دیا، کہ جس نے اس نام کو پہچان لیا اور اس کا حق ادا کر دیا وہ تو نیک بخت بن گیا، اور جو اس نام سے ناآشنا رہا اور اس کے حقوق کی ادائیگی سے غافل رہا وہ بد بخت ومحروم قرار پایا۔ خلق وامر بھی اسی نام کیساتھ قائم ہیں، چنانچہ کائنات میں موجود ہر شئی اسی کی مخلوق ہے، ہر مخلوق پر اسی کا امر قائم ونافذ ہے ﴿ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ﴾ ② ہر خلق، امر اور ثواب وعقاب اسی ذات سے شروع ہوتا ہے اور اسی کی طرف منتہی ہوتا ہے۔

① صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ (٤٨٦) عن عائشة رضی اللہ عنہا. ② (الاعراف: ٥٤)

الرحمن الرحیم

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ دونوں اسم ہیں، اور رحمت سے ماخوذ ہیں اور بے انتہاء رحمت کے حامل ہیں، البتہ صفت "الرَّحمٰن" میں "الرَّحیم" کی بہ نسبت زیادہ مبالغہ ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: رحمٰن اور رحیم دو اسم ہیں، ان میں رقت ورحمت کا معنی پایا جاتا ہے اور ایک اسم دوسرے کی بہ نسبت زیادہ رحمت کو مشتمل ہے۔

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ کہ صفت "رَحمٰن" میں جو رحمت ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھی اس سے مانگا جائے وہ عطا فرمائے گا، اور صفت "رَحیم" میں جو رحمت ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر اس سے نہ مانگا جائے تو وہ ناراض ہو جائے گا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ "رَحمٰن" سے جو رحمت مستفاد ہے وہ سب کے لیئے عام ہے، اور "رَحیم" سے جو رحمت مستفاد ہوتی ہے، وہ مؤمنین کے لئے خاص ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ رحمٰن اور رحیم کا فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ لفظ "رَحمٰن" اس صفت پر دلالت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے، اور لفظ "رَحیم" اس صفت پر دلالت کرتا ہے جو وہ فعلاً اپنی مخلوق پر رحم فرماتا ہے، گویا "رَحمٰن" ہونا اس کی صفت ہے، اور اس صفت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مخلوق پر رحم کرے اور مخلوق پر رحم کے اس تعلق پر صفت "رَحیم" دلالت کرتی ہے، اس لئے قرآن حکیم میں جہاں کہیں مخلوق پر رحم کرنے کا ذکر ہے۔ وہاں صفت "رَحیم" ہی کا استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:

﴿ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴾ ①

"بے شک اللہ لوگوں کیلئے بہت ہی شفقت اور رحمت والا ہے"

﴿ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ﴾ ②

"اور اللہ مؤمنوں پر بے حد رحم کرنے والا ہے"

﴿ إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴾ ③

بے شک اللہ ہی توبہ قبول کرنے والا، نہایت مہربان ہے"

یہی قول زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم باالصواب)

① (البقرة: ١٤٣)
② (الاحزاب: ٤٣)
③ (التوبة: ١١٨)

کتاب التوحید

(کتاب) ''کَتَبَ یَکْتُبُ'' سے مصدر ہے، اور اس میں جمع کا معنی پایا جاتا ہے، اور اسے ''کتاب'' اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے ضمن میں بہت سے ابواب اور موضوعات مجتمع ہوتے ہیں۔

توحید کی تعریف واقسام

''توحید'' باب تفعیل کا مصدر ہے، جس کا معنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار اور اعتراف کرنا ہے، دینِ اسلام کو دینِ توحید اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کا دارومدار اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ہے، چنانچہ وہ اپنی بادشاہت اور جملہ تصرفات میں وحدہ لاشریک لہ ہے، اپنی ذات وصفات میں یکتا اور بے نظیر ہے، اور اپنی الوہیت وعبادت میں اکیلا اور بے مثل ہے۔

اقسام توحید: توحید تین قسموں میں منحصر ہے۔

(۱) توحیدِ ربوبیت (۲) توحیدِ اسماء وصفات (۳) توحیدِ الوہیت

توحید کی معرفت کے لئے ان تینوں قسموں کی معرفت ضروری ہے، اور یہ تینوں قسمیں آپس میں لازم وملزوم ہیں، ان تینوں قسموں کی تعریف وتوضیح مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) توحیدِ ربوبیت: سے مراد یہ ہے کہ اس بات کا اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا رب، مالک، خالق اور رازق ہے، موت وحیات، نفع ونقصان اسی کے اختیار میں ہے، وہی دعائیں قبول کرتا ہے اور وہی مختارِ کل ہے۔ تقدیر پر ایمان لانا بھی اسی قسم کے ضمن میں ہے۔ ایمان کے حصول کے لئے صرف اسی قسم پر اکتفاء کرلینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ توحیدِ الوہیت بھی ضروری ہے؛ کیونکہ توحیدِ ربوبیت کا تو مشرکینِ مکہ بھی اقرار کرتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اقرار کو قبول نہیں کیا اور انہیں مشرک ہی کہا، چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴾ ①

''آپ ﷺ کہئے وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے، یا وہ کون ہے جو کانوں اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے، اور وہ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے، اور وہ کون ہے جو کاموں کی تدبیر کرتا ہے؟ ضرور وہ یہی کہیں گے کہ ''اللہ'' تو ان سے کہئے کہ پھر کیوں نہیں ڈرتے۔''

① (سورۃ یونس: ۳۱)

نیز فرمایا: ﴿ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ﴾ ①

''اور اگر آپ ان سے سوال کریں کہ آسمان سے پانی کس نے اتارا، پھر اس پانی سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد کس نے زندہ کیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے، اللہ تعالیٰ نے۔''

مشرکین مکہ کی توحید اور قرآن کا رد

اس معنی کی آیات قرآن پاک میں بکثرت وارد ہوئی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرکین مکہ توحید ربوبیت پر ایمان رکھتے تھے، بلکہ توحید ربوبیت کو ماننے کے ساتھ ساتھ عبادات کی بعض اقسام بھی خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لئے انجام دیتے تھے، مثلاً: حج، صدقہ، ذبح، نذر، اضطرار کے وقت خالص اللہ تعالیٰ کو پکارنا وغیرہ، بلکہ بعض مشرکین تو روزِ قیامت پر بھی ایمان رکھتے تھے، چنانچہ ایک جاہلی شاعر زہیر کہتا ہے:

یؤخر فیوضع فی کتاب فید خر لیوم الحساب اویعجل فینقم

''تمہارے برے اعمال کی سزا یا تو اعمال نامے میں درج کرکے قیامت کے دن کے لئے مؤخر کر دی جائے گی، یا پھر دنیا ہی میں انتقام لیکر فوری سزا دے دی جائیگی''

اسی طرح بعض مشرکین تقدیر پر ایمان رکھتے تھے۔ چناچہ ایک جاہلی شاعر عنترہ کہتا ہے:

یاعبل أین من المنیة مهرب ان کان ربی فی السماء قضاها

''اے عبل! اگر پروردگار نے آسمانوں میں موت کا فیصلہ کر دیا ہے تو پھر اس سے چھٹکارے کی جگہ کہاں مل سکتی ہے؟'' ②

ان تمام عقائد کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں مشرک قرار دیا۔ چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ﴾ ③

''مشرکین میں سے اکثر لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے بھی مشرک ہیں۔''

اب جسے اللہ تعالیٰ نے عقل سلیم سے نوازا ہے وہ ذرا سوچے اور غور کرے کہ اتنا کچھ ماننے اور سمجھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں مشرک کیوں کہا؟ ان کا خون بہانا اور ان کی عورتوں کو قیدی بنانا کیوں واجب قرار

---

① (العنکبوت: ٦٣)

② یہ مشرکین عرب کا عقیدہ تھا۔ اب ذرا تقابل کے لئے آج کے مسلمانوں کا عقیدہ بھی ملاحظہ کر لیجئے، جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی کی موت کا فیصلہ فرمالے، تو شاہ عبدالقادر جیلانی اسے ٹال سکتے ہیں، بلکہ کسی کو موت دے دے تو پیر صاحب اسے دوبارہ زندہ کر سکتے ہیں۔ عرب کے لوگ اس کے باوجود مشرک کے مشرک اور آج کے لوگ مسلمان؟ والعیاذ باللہ

③ (سورہ یوسف: ١٠٦)

دیا؟ ان کا مال کیوں مباح کیا؟ صرف اس بناء پر کہ وہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے اصل معنی ومقصود یعنی توحیدِ عبادت میں شرک کرتے تھے۔اس کی توضیح اگلے صفحات میں آئے گی۔ان شاء اللہ العزیز.

(۲) توحید الاسماء والصفات : اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء وصفات جو اس نے اپنی وحی کے ذریعے بیان فرما دیئے کا اقرار واعتراف کرنا، مثلاً عَلِيْمٌ (سب کچھ جاننے ولا) قَدِيْرٌ (پوری طرح قدرت رکھنے والا) سَمِيْعٌ (سب کچھ سننے والا) بَصِيْرٌ (خوب دیکھنے والا) اَلْحَيُّ (زندہ رہنے والا) اَلْقَيُّوْمُ (نظام کائنات کو سنبھالنے والا) جسے نہ تو کبھی نیند آتی ہے نہ اونگھ۔ رَؤُوْفٌ (بہت شفقت کرنے والا) رَحِيْمٌ (نہایت رحم کرنے والا) مُسْتَوِيْ عَلَى الْعَرْشِ (عرش پر بلند) وَغَيْرِ ذٰلِكَ مِنَ الْاَسْمَاءِ الْحُسْنٰى وَالصِّفَاتِ الْعُلٰى.

حصولِ ایمان کے لئے توحید کی اس قسم کی معرفت اور ایمان نہایت ضروری ہے، جب کہ صرف اس پر اکتفاء کر لینا اور بقیہ اقسام سے پہلو تہی برتنا یا انحراف کا شکار ہو جانا، حصولِ ایمان میں قطعاً کفایت نہیں کریگا۔ بلکہ ضروری ہے کہ توحیدِ اسماء وصفات کے ساتھ ساتھ توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ الوہیت کا بھی اقرار کرے۔ کفارِ مکہ توحیدِ اسماء وصفات کا اقرار کرتے تھے، گو بعض کفار سے بعض صفات کا انکار بھی ثابت ہے، مثلاً ان کا صفتِ ''رحمٰن'' کا انکار کرنا، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ﴾ ①

''وہ رحمٰن کا انکار کرتے ہیں۔''

لیکن ان کا یہ انکار محض عناد، ضد بازی اور تعنت کی بناء پر تھا، ورنہ ان کے جاہلی شعراء کے کلام میں جا بجا صفتِ رحمٰن کا ذکر ملتا ہے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ صفتِ رحمٰن کو وہ لوگ مانتے تھے۔الغرض اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں سے صرف صفتِ رحمٰن کا انکار بعض کفار سے ثابت ہے، اس کے علاوہ ان سے اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا انکار ثابت نہیں، جس سے معلوم ہوا کہ وہ توحیدِ ربوبیت کے ساتھ ساتھ توحیدِ صفات کو بھی مانتے تھے، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں مشرک کہا، کیوں؟ صرف اس لئے کہ وہ توحیدِ الوہیت کو کما حقہ نہیں مانتے تھے، اور ایک اللہ کی عبادت کی بجائے مختلف درگاہوں کی پوجا میں مصروف تھے، رسول اللہ ﷺ جب انہیں خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کی دعوت دیتے تو وہ جواباً کہا کرتے: ﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴾ ②

''کیا اس نے اتنے سارے معبودوں کے بجائے ایک ہی معبود بنا دیا، یہ تو بڑی عجیب بات ہے!''

① (الرعد: ۳۰) ② (ص: ۵)

مکی سورتیں بالخصوص توحید کی اس قسم پر تبصرے سے لبریز ہیں۔

(۳) توحیدِ الوہیت: یہ قسم اللہ تعالیٰ کیلئے ہر قسم کی عبادت کے خالص ہونے کی متقاضی ہے، چنانچہ تمام عبادات، مثلاً: محبت، خوف، رجاء (امید) توکل، رغبت، رہبت (طمع وڈر) اور دعاء ودیگر تمام عبادات ظاہراً و باطناً اللہ رب العزت کیلئے مختص ہیں، ان میں سے کسی عبادت کا کچھ بھی حصہ کسی غیر اللہ کیلئے مقرر نہیں کیا جا سکتا، حتیٰ کہ کسی مقرب فرشتے اور کسی نبی مرسل کے لئے بھی نہیں، دوسروں کا تو ذکر ہی کیا؟

توحید الوہیت کی ضرورت

توحیدِ الوہیت کا ذکر اللہ تعالیٰ کے درجِ ذیل فرامین کے اندر موجود ہے۔

﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴾ ①

''ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں (کسی اور کی نہیں) اور خاص تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ (کسی اور سے نہیں)''

﴿ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴾ ②

''پس تو اسی کی عبادت کر اور اسی پر بھروسہ رکھ۔ اور تیرا پروردگار تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔''

﴿ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴾ ③

''پس اگر یہ لوگ اعراض کریں تو کہہ دیجئے مجھے اللہ ہی کافی ہے۔ کوئی معبود برحق نہیں ہے مگر صرف وہی اسی پر توکل کرتا ہوں اور وہی عرش عظیم کا رب ہے۔''

﴿ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ﴾ ④

''آسمانوں کا، زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب وہی ہے، پس تو اسی کی عبادت کر اور اس کی عبادت پر جم جا۔ کیا تیرے علم میں اس کا ہم پلہ اور بھی ہے؟''

﴿ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴾ ⑤

''میں اسی پر توکل کرتا ہوں اور اسی کی طرف انابت کرتا ہوں۔''

﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ وَكَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا ﴾ ⑥

① (الفاتحہ: ٥) ② (ھود: ١٢٤) ③ (توبہ: ١٣١)
④ (مریم: ٦٥) ⑤ (ھود: ٨٩) ⑥ (الفرقان: ٥٨)

''اور اس زندہ پر توکل کر جسے کبھی موت نہیں آئے گی۔ اور اس کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کر اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے خوب اور مکمل آگاہ ہے۔''

﴿ وَاعۡبُدۡ رَبَّكَ حَتّٰى يَاۡتِيَكَ الۡيَقِيۡنُ ﴾ ①

''اور اپنے رب کی عبادت کر موت کے آنے تک۔''

واضح ہو کہ توحیدِ الوہیت دین کا اول و آخر اور ظاہر و باطن ہے، انبیاء علیہم السلام کی پہلی اور آخری دعوت یہی ہے، کلمہ طیبہ ''لاالٰہ الااللہ'' کا اصل تقاضہ و مدعیٰ یہی توحیدِ الوہیت ہے، کیونکہ اِلٰہ درحقیقت وہ ذات ہے جو تمام تر محبت، خشیت، جلال اور تعظیم کے ساتھ معبود ہو، جو تمام انواعِ عبادات کا مستحق ہو۔ توحیدِ الوہیت ہی کی خاطر تمام مخلوقات کو پیدا کیا گیا، انبیاء و مرسلین مبعوث کئے گئے، اور مختلف کتبِ سماوی کا نزول عمل میں لایا گیا۔ توحید کی اس قسم نے مؤمنین و کفار کو جدا جدا اور متمیز کر دیا، اور اسی قسم نے نیک بخت اہلِ جنت، اور بد بخت اہلِ جہنم میں فرق اور تمیز پیدا کر دیا۔

قرآن مجید کا پہلا امر کیا ہے۔؟

قرآن مجید کا پہلا امر یہ ہے کہ لوگ معبودِ برحق کی عبادت کریں، اسی لئے تمام انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے، اور ان کی پہلی دعوت یہی تھی کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴾ ②

''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جو تمہارا اور تم سے پہلے تمام لوگوں کا خالق ہے۔ تاکہ تم متقی بن جاؤ''

تمام انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی دعوت کیا تھی۔؟

سیدنا نوح علیہ السلام جو اول مرسل ہیں اور خاص طور پر شرک کے منظر عام پر آ جانے کے بعد ان کی بعثت عمل میں آئی، اپنی قوم سے فرما رہے ہیں ﴿ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ﴾ ③

یہی بات سیدنا ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمائی: ﴿ اُعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ﴾ ④

یہی بات سیدنا صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمائی: ﴿ اُعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ﴾ ⑤

یہی بات سیدنا شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمائی: ﴿ اُعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ﴾ ⑥

یعنی: ''اے قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، تمہارا اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

① (الحجر:۹۹) ② (البقرۃ:۲۱) ③ (المؤمنون:۲۳)
④ (الاعراف:۶۵) ⑤ (ھود:۶۱) ⑥ (الاعراف:۸۵)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم سے فرمارہے ہیں ﴿ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴾ ①

''میں نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف کرلیا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے بالکل یکطرفہ ہوکر۔ اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔''

بہرحال ہر نبی کی اول وآخر یہی دعوت تھی۔ قرآن مجید میں ہے کہ: ﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ﴾ ②

''اور آپ سے قبل ہم نے جس رسول کو مبعوث کیا اس کی طرف یہی وحی کی کہ میرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، پس صرف اور صرف میری ہی عبادت کرو۔''

﴿ وَسْئَلْ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمٰنِ آلِهَةً يُّعْبَدُونَ ﴾ ③

''اور آپ سے قبل ہم نے جو اپنے رسول مبعوث فرمائے ان سب سے پوچھو کہ کیا ہم نے رحمٰن کے علاوہ بھی کوئی معبود مقرر کیے تھے جس کی پوجا کی جاتی ہو؟ (ہرگز نہیں۔)''

سوال: سابقہ انبیاء علیہم السلام سے یہ بات کیسے پوچھی جائے؟

جواب: قرآن مجید کے ذریعہ، کیونکہ قرآن مجید تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کا ضامن ومحافظ ہے۔ اور مذکورہ چند آیات میں انبیاءِ سابقین کی دعوت کا ذکر موجود ہے۔

خاتم النّبیین محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی عمر بھر اسی دعوت کا پرچار کیا، چنانچہ (قُولُوا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ) کی دعوت سے اس مقدس مشن کا آغاز کیا، اور ہر لحہ وآن اس کا اعادہ کرتے رہے۔ ھرقل نے ابوسفیان سے پوچھا کہ محمد ﷺ کی دعوت کیا ہے؟ ابوسفیان نے جواب دیا، وہ کہتا ہے:

" أُعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَاتْرُكُوا مَا يَقُولُ آبَاءُ كُمْ " ④

یعنی ''اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور تمہارے آباؤاجداد جو کچھ کہتے ہیں وہ سب چھوڑ دو۔''

نبی ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے ہوئے فرمایا تھا: [تم اہل کتاب کی طرف جارہے ہو، انہیں سب سے پہلے یہ دعوت دینا کہ وہ (لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ) کی سچی گواہی دیں]

① (الانعام : ٨٠)　② (الانبیاء : ٢٥)　③ (الزخرف : ٤٥)

④ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی (٧) صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر (١٧٧٣)

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں کہ [وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو مان لیں] ①

اس سے یہ معلوم ہوا کہ توحید کا فہم ہر مکلف کا سب سے پہلا فریضہ ہے، یہی سب سے آخری فریضہ بھی ہے توحید کے اقرار کے ساتھ ہی انسان دینِ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے، اور آخری سانس کے ساتھ جب دنیا سے رخصت ہو رہا ہو تو توحید کی گواہی پر قائم اور اٹل ہو۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ" ②

''جس شخص کا آخری کلام "لا الٰہ الا اللہ" ہو وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

قرآن حکیم نے توحید کی اس قسم یعنی توحیدِ الوہیت کا بڑی بسط و تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، بلکہ اس ذکر کو بار بار دہرایا ہے، اس کی مختلف مثالوں سے وضاحت کی ہے، چنانچہ قرآن مجید کی کوئی سورت توحیدِ الوہیت کے ذکر سے خالی نہیں۔

توحید الوہیت کے دیگر نام

توحیدِ الوہیت کو توحید ''الٰہیت'' بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ "اِخلاصِ تألہ" یعنی اللہ تعالیٰ سے شدید ترین محبت پر مبنی ہے۔ اور یہ شدید ترین محبت، اخلاصِ عبادت کی متقاضی اور اسی کو مستلزم ہے۔

توحیدِ الوہیت کو ''توحیدِ ارادہ'' بھی کہا جاتا ہے کیونکہ الوہیت کا اہم ترین تقاضہ یہ ہے کہ ہر عمل سے اللہ تعالیٰ کی رضاء جوئی کا ارادہ مقصود ہونا چاہئے۔

توحیدِ الوہیت کو ''توحیدِ قصد'' بھی کہا جاتا ہے، گویا بندے کا قصدِ عبادت اخلاص پر مبنی ہو اور یہی قصد عبادت کے اخلاص کو مستلزم ہے۔

اس کا ایک نام ''توحیدِ عمل'' بھی ہے، کیونکہ توحید کا ایک لازمی تقاضہ یہ ہے کہ ہر عمل اللہ تعالیٰ کیلئے خالص ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴾ ③

''پس آپ اللہ ہی کی عبادت کریں، اسی کیلئے دین کو خالص کرتے ہوئے۔''

نیز فرمایا:

﴿ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ . وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ ④

① صحیح بخاری، كتاب المغازی (٤٣٤٧) "ان يوحدوا الله" کے الفاظ صحیح بخاری، كتاب التوحيد (٧٣٧٢) میں ہیں۔
② یہ حدیث حسن ہے، مسند احمد (٢٢٠٩٥) مسند معاذ بن جبل، سنن ابی داؤد (٣١١٦)
③ (الزمر: ٢) ④ (الزمر: ١١، ١٢)

’’آپ ﷺ کہہ دیجئے! کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اسطرح عبادت کروں کہ اسی کے لئے عبادت کو خالص کرلوں، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں پہلا فرمانبردار بن جاؤں۔‘‘

پورا قرآن توحید الوہیت پر مشتمل ہے

اگر آپ تدبر وتعقل سے کام لیں تو آپ پر یقیناً یہ نکتہ عیاں ہوگا کہ قرآن مجید کی ہر سورت، بلکہ ہر آیت توحیدِ الوہیت کی دعوت پر مشتمل ہے، کہیں عقیدۂ توحید اختیار کرنے کا امر ہے، تو کہیں مخالفینِ توحید کے شکوک وشبہات کا ازالہ ہے، کہیں اہلِ توحید کے لئے تیار شدہ انعامات واکرامات کا تذکرہ ہے، تو کہیں مخالفین ومعاندین توحید کے لئے عذابِ الیم کی وعیدیں مذکور ہیں۔

اور جن آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور افعال کا ذکر ہے وہ بھی توحیدِ الوہیت ہی کا بیان ہے؛ کیونکہ توحیدِ صفات، توحیدِ الوہیت کو متضمن ومستلزم ہے۔ توحیدِ الوہیت ہی دینِ اسلام کی وہ اٹل حقیقت ہے کہ جس کے بغیر کوئی چیز قابلِ قبول نہیں ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَحَجِّ الْبَیْتِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ‘‘ ①

’’پانچ باتوں پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے، پہلی یہ کہ لا اِلٰـــہَ اِلَّا اللّٰہ کی گواہی دینا یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبودِ برحق نہیں ہے، اور یہ گواہی دینا کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوۃ دینا، بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔‘‘

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ دینِ اسلام ان پانچ ارکان پر مبنی ہے اور یہ سب اعمال ہیں، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام، اللہ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ کی عبادت کا نام ہے، جس کا طریقہ یہ ہے کہ پورے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ادا کیا جائے اور نواہی سے اجتناب کیا جائے۔ اب یہ امر، عبادت کی تمام اقسام کو ضمن میں لیئے ہوئے ہے، یعنی عبادت کی جو بھی قسم ہے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے خالص ہو، اور اگر کسی شخص نے عبادت کی کسی ایک قسم میں کسی دوسرے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرلیا تو وہ ہرگز مسلمان نہیں ہوسکتا۔

عبادت کی چند اقسام

اب ہم ذیل کی سطور میں عبادت کی چند اقسام کا ذکر کرتے ہیں:

① صحیح بخاری، کتاب الایمان (۸)۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان (۱۵/۲۰)

(۱) محبت: محبت اللہ تعالیٰ کا حق ہے، چنانچہ اگر کسی شخص نے کسی غیر سے ایسی محبت کر لی جو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے روا ہے تو وہ شرک کا مرتکب ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ﴾ ①

''کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو اس کا ہم مثل قرار دیتے ہیں (اور وہ اس طرح کہ) ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ کا حق ہے۔''

آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴾ ②

''یہ لوگ جہنم سے نہیں نکل سکیں گے۔''

(۲) توکل: اللہ تعالیٰ پر توکل کیا جائے، غیر اللہ پر نہیں، چنانچہ اگر کسی شخص نے کسی ایسے کام کے سلسلے میں کہ جو اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے، کسی غیر پر توکل کر لیا تو اس نے شرک کا ارتکاب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ ③

''اگر تم قوی مومن ہو تو صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔''

واضح ہو کہ جس کام کے کرنے پر کوئی غیر اللہ قادر ہو اس کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کرنا چاہئے، اگر غیر اللہ پر توکل کرے گا تو یہ شرکِ اصغر ہو گا۔

(۳) الخوف: خوف بھی ایک عبادت ہے، جو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہی روا ہے، کسی غیر اللہ سے اس معنی میں ڈرنا کہ وہ اپنی مشیت اور قدرت سے مجھے کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے، شرکِ اکبر ہے؛ کیونکہ ایسا سمجھنا اس غیر اللہ میں نفع یا نقصان کا عقیدہ رکھنا ہے۔ حالانکہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴾ ④

''اور صرف مجھ ہی سے ڈرو''

نیز فرمایا:

﴿ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ ﴾ ⑤

''اور لوگوں سے نہ ڈرو صرف مجھ سے ڈرو''

نیز فرمایا:

① (البقرة : ١٦٥) ② (البقرة: ١٦٧) ③ (المائدة: ٢٣)
④ (النحل : ٥١) ⑤ (المائدة : ٤٤)

﴿ وَاِنۡ يَّمۡسَسۡكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنۡ يُّرِدۡكَ بِخَيۡرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضۡلِهٖ ؕ يُصِيۡبُ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ﴾ ①

''اور اللہ تعالیٰ تجھے کوئی نقصان پہنچائے تو اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ٹالنے والا نہیں، اور اگر تیرے ساتھ کسی بھلائی کا فیصلہ کر لے تو اس کے فضل کو کوئی نہیں روک سکتا، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے فضل سے نواز دے، وہ بڑا ہی بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

(۴) **الرجاء** : امیدیں وابستہ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، چنانچہ جن امور پر صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے ان کے سلسلے میں کوئی شخص کسی زندہ یا مردہ کو پکارے، اس امید کے ساتھ کہ ان کی طرف سے اس کا مطلوب حاصل ہو جائے گا، تو اس کا یہ فعل شرکِ اکبر شمار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا وَجَاهَدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓـئِكَ يَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰهِ ﴾ ②

''جو لوگ ایمان لائے، اور ہجرت کی، اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، یہ لوگ اللہ کی رحمت سے امیدیں قائم کرنے والے ہیں''

امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے ''لَا يَرْجُوْ عَبْدٌ اِلَّا رَبَّهٗ''

''بندہ صرف اپنے رب کی رحمت سے امیدیں وابستہ کرے۔''

(۵) **الصلاۃ والرکوع والسجود** : نماز، رکوع اور سجود بھی عبادات ہیں، جن کا صرف اللہ تعالیٰ ہی مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ ﴾ ③

''اپنے رب کیلئے نماز پڑھ اور قربانی دے''

نیز فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ارۡكَعُوۡا وَاسۡجُدُوۡا وَاعۡبُدُوۡا رَبَّكُمۡ ﴾ ④

ترجمہ: ''اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرو، اور اپنے رب ہی کی عبادت کرو''

(۶) **الدعاء** : (یعنی پکارنا) جن چیزوں پر صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے ان کے لئے اللہ تعالیٰ ہی کو پکارنا چاہئے، غیر اللہ کو پکارنا شرک ہوگا، خواہ وہ پکارنا محض حصولِ شفاعت و وسیلہ ہی کیلئے کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ مَا يَمۡلِكُوۡنَ مِنۡ قِطۡمِيۡرٍ ؕ اِنۡ تَدۡعُوۡهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡا دُعَآءَكُمۡ ۚ وَلَوۡ سَمِعُوۡا مَا اسۡتَجَابُوۡا لَـكُمۡ ؕ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكۡفُرُوۡنَ بِشِرۡكِكُمۡ ؕ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثۡلُ خَبِيۡرٍ ﴾ ⑤

① (یونس: ۱۰۷) ② (البقرة: ۲۱۸) ③ (الکوثر: ۲)
④ (الحج: ۷۷) ⑤ (الفاطر: ۱۳: ۱۴)

''اور جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں، اگر تم انہیں پکارو گے تو وہ تمھاری پکار نہیں سنیں گے اور (بفرضِ محال) اگر سن لیں گے تو تمہاری مدد کو نہیں پہنچ سکیں گے اور قیامت کے دن تمہارے اس شرک کا انکار کردیں گے اور تمہیں اس کی مانند کوئی خبر نہیں دے سکتا جو ہر چیز سے باخبر ہے''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴾ ①

''اور تمہارے پروردگار نے فرمایا ہے مجھے پکارو میں تمہاری دعائیں قبول کرونگا۔ بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل وخوار ہوکر جہنم میں داخل ہوجائیں گے''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ٥ قُلْ لِلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا ﴾ ②

''کیا انہوں نے اللہ کے سوا سفارشی بنا رکھے ہیں؟ کہہ دیجئے کہ، باوجودیکہ وہ کسی چیز کے مالک نہیں اور نہ ہی عقل رکھتے ہیں، کہہ دیجئے کہ، اللہ تعالیٰ ہی ہر قسم کی شفاعت کا مالک ہے''

(۷) الذبح: ذبح کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے لہذا اسی کے تقرب کی خاطر ذبح کرنا چاہیئے، اور کسی کیلئے نہیں ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ . لَا شَرِيكَ لَهُ ﴾ ③

''کہہ دیجئے کہ بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کیلئے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں''

(۸) النذر: نذر بھی اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ ﴾ ④

''چاہیئے کہ وہ اپنی نذریں پوری کریں''

---

① (المؤمن : ٦٠) ② (الزمر: ٤٣، ٤٤)
③ (الانعام: ١٦٢، ١٦٣) ④ (الحج : ٢٩)

نیز اللہ تعالیٰ نے مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا ﴾ ①

''وہ (متقی لوگ) اپنی نذروں کو پورا کرتے ہیں، اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کا شر خوب پھیلا ہوگا''

(۹) الطواف: طواف ایک عبادت ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے گھر (خانہ کعبہ) کیلئے مخصوص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ﴾ ②

''اور وہ اللہ تعالیٰ کے گھر کا طواف کریں''

(۱۰) التوبۃ: گناہوں سے توبہ واستغفار اللہ تعالیٰ سے کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ ﴾ ③

''اور اللہ تعالیٰ کے سوا گناہوں کو کون معاف کرسکتا ہے؟''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَتُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا اَیُّہَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ ④

''اے مومنو! تم سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ''

(۱۱) الاستعاذۃ: (پناہ طلب کرنا) جن امور میں صرف اللہ تعالیٰ پناہ دینے پر قادر ہے، ان امور میں اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ سے فرمایا: ﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴾ ⑤

''کہہ دیجئے! (میں پناہ پکڑتا ہوں صبح کے رب کی''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴾ ⑥

''کہہ دیجئے میں پناہ پکڑتا ہوں تمام لوگوں کے رب کی''

(پس معلوم ہوا کہ پناہ طلب کرنا عبادت ہے، اور اللہ کا ہی حق ہے، لہذا پناہ اللہ تعالیٰ کی طلب کرنے چاہیے)

(۱۲) الاستغاثۃ: (مدد طلب کرنا) جن چیزوں کے عطا کرنے پر اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے، ان میں کسی دوسرے سے مدد طلب کرنا یا انہیں غوث قرار دینا شرک ہے، تقاضہ توحید تو یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے مدد طلب کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

① (الدھر: ۷) ② (الحج: ۲۹) ③ (آل عمران: ۱۳۵)
④ (النور: ۳۱) ⑤ (الفلق: ۱) ⑥ (الناس: ۱)

﴿ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ ﴾ ①

''اور جب تم اپنے پروردگار سے مدد طلب کر رہے تھے پس اس نے تمہاری دعا قبول کی''

یہ اور دیگر تمام عبادات خالق کائنات کے ساتھ مختص ہیں، جس شخص نے ان عبادات میں کسی مخلوق کی شراکت کا عقیدہ رکھا وہ مشرک ہے۔ہم نے بطورِ خاص ان چند عبادات کا ذکر اس لئے کیا کہ قبروں کے پجاری بطورِ خاص ان عبادات کو یا تو غیر اللہ کے لئے مقرر کر دیتے ہیں یا ان میں دوسروں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا دیتے ہیں۔ بہرحال انکے علاوہ بھی جتنی عبادات ہیں انہیں غیر اللہ کیلئے مقرر کرنے والا، یا غیر اللہ کی شراکت کا عقیدہ رکھنے والا مشرک ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاعْبُدُوْا اللهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا ﴾ ②

''ہر قسم کی عبادت اللہ کے لئے انجام دو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ''

اہل مکہ کے مشرک ہونے کی وجہ

یہ شرکِ عبادت ہی تو ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کو کافر ٹھہرایا، ان کی جانوں، مالوں اور عورتوں کو مسلمانوں کے لئے مباح اور حلال قرار دیا، حالانکہ توحید کی بقیہ اقسام میں ان کا عقیدہ درست تھا، وہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق ہے، رازق اور مدبر ہے، اس کی بادشاہت میں کوئی شریک نہیں۔ (اس کے باوجود وہ مشرک کیوں تھے؟) اس لئے کہ وہ ان عبادات میں غیروں کی شراکت کے قائل تھے۔ چنانچہ وہ اپنے تلبیہ میں یوں کہا کرتے " لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ " ③

''اے اللہ میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، سوائے فلاں شریک کے جو تیرا ہی ہے، تو اس کا مالک ہے وہ مالک نہیں ہے۔''

چنانچہ نبی ﷺ ان کے پاس وہ توحید لیکر آئے جو کلمہ (لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ) کے معنی پر مشتمل تھی، جس کا مضمون وماحصل یہ تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے، نہ کسی مقرب فرشتے کی اور نہ ہی کسی نبی مرسل کی، اوروں کا تو ذکر ہی کیا؟

نبی ﷺ کی اس دعوت کا ان مشرکین نے کیا جواب دیا؟

﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴾ ④

''محمد ﷺ نے اتنے بہت سے معبودوں کو ایک ہی قرار دے دیا یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔''

---

① (الانفال: ۹) ② (النساء: ۳۶)
③ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب التلبیة وصفتها ووقتها، (۲۲/۱۱۸۵)
④ (ص: ۵)

(تو پھر آج بہت سے معبودوں کو پوجنے والا قبر پرست کس طرح مشرکینِ مکہ سے مختلف ہوسکتا ہے؟؟؟) ہاں ان سے بدتر ہوسکتا ہے؛ کیونکہ مشرکینِ مکہ کم از کم توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ صفات کو تو مانتے تھے، آج کا مسلمان تو توحید کی ان قسموں میں بھی بہت کچھ الحاد پیدا کر چکا ہے۔ (والعیاذ باللہ)

اقسامِ شرک

واضح ہو کہ توحید کی مذکورہ تین اقسام کی طرح ہم شرک کو بھی انہیں تین اقسام کی طرف تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) شرک فی الربوبیت (۲) شرک فی الاسماء والصفات (۳) شرک فی الالوہیت

ان میں ہر قسم دوسرے کی بنسبت اکبر واصغر ہوسکتی ہے۔ (جس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔ ان شاء اللہ)

(۱) شرک فی الربوبیۃ: شرک فی الربوبیت دو طرح سے ہے۔

''الف'': شرک تعطیل: یعنی اللہ رب العزت کے اسماء وصفات اور ربوبیت کے معطل ہونے کا عقیدہ رکھنا، یہ شرک کی سب سے بدترین قسم ہے، فرعون کا شرک اسی نوع کا تھا، جو کہتا تھا: ﴿وَمَا رَبُّ الْعَالَمِيْنَ﴾ ①
یعنی: ''رب العالمین کیا ہے؟''

فلاسفہ یا دھریوں کا عقیدہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، جو عالَم کی قدامت اور ابدیت کے قائل ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ یہ جہاں کبھی معدوم نہ تھا بلکہ ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا، اور اس کارخانۂ عالَم میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان اسباب کی پیداوار ہے جنہیں وہ عقول ونفوس کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ وحدۃ الوجود کے قائلین مثلا ابن عربی، ابن سبعین، تلمسانی اور ابن الفارض وغیرہ کا شرک بھی اسی نوع کا ہے، ان ملاحدہ نے اپنے الحاد کو اسلام کا زیور پہنانے اور تھوڑے سے حق کی زیادہ الحاد سے آمیزش کی کوشش کی ہے، چنانچہ ان کے یہ عقایدِ باطلہ ان لوگوں میں رواج پکڑ گئے جو چمگادڑ کی بصارت وبصیرت رکھتے ہیں۔ فرقِ باطلہ، جہمیہ اور قرامطہ جو اللہ رب العزت کے اسماء وصفات کی تعطیل کے قائل ہیں کا عقیدہ بھی اسی نوع سے تعلق رکھتا ہے۔

''ب'': شرک الوہیت کی دوسری قسم ان لوگوں کے شرک کی ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور ربوبیت کی تعطیل کا عقیدہ تو نہیں رکھا، لیکن دوسرے معبودوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا لیا، چنانچہ نصاریٰ کا شرک اسی نوع سے تعلق رکھتا ہے جنہوں نے اقانیمِ ثلاثہ میں سے تیسری اقنوم کو اِلٰہ قرار دیا۔

مجوسیوں کا شرک بھی اسی نوع سے متعلق ہے جو حوادثِ خیر کو ''نور'' اور حوادثِ شر کو ''ظلمت'' کی طرف

① (الشعراء: ۲۳)

منسوب کرتے ہیں۔ ستاروں کے تعلق سے پایا جانے والا شرک بھی اسی نوع کا ہے، چنانچہ بہت سے لوگ اس شرک میں گرفتار ہیں جو ستاروں کو اس عالَم کا مدبر قرار دیتے ہیں، مشرکین صابئہ کا یہی مذہب تھا۔

واضح ہو کہ قبر کے پجاریوں کا شرک بھی اسی نوع کا ہے، جن کا عقیدہ ہے کہ اولیاء کی روحیں موت کے بعد تصرف کا اختیار رکھتی ہیں، چنانچہ وہ حاجات پوری کرتے ہیں، تکلیفیں رفع کرتے ہیں، جو ان کو پکارے ان کی مدد کرتے ہیں اور جو ان کی طرف مضطر ولاچار ہو اس کی حفاظت کرتے ہیں...... یہ سب چیزیں تو ربوبیت کے خصائص میں سے ہیں۔ واللہ المستعان

(۲) شرک فی الاسماء والصفات: دوسری قسم شرک فی الاسماء والصفات ہے، اس شرک کا معاملہ سابقہ شرک سے کچھ ہلکا ہے، اس شرک کی بھی دو قسمیں ہے۔

''الف'': شرکِ تشبیہ: یعنی صفاتِ خالق کی صفاتِ مخلوق کے ساتھ مشابہت کا عقیدہ رکھنا، مثلاً یوں کہنا کہ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح ہے، اس کا سمع وبصر (سننا و دیکھنا) میرے سمع وبصر کی طرح ہے، اس کا ''استواء علی العرش'' میرے استواء کی طرح ہے۔ طائفۂ مشبہ (تشبیہ دینے والا گروہ) اسی شرک میں مبتلا تھا۔

''ب'': شرکِ اشتقاق: دوسری قسم شرکِ اشتقاق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جو معبود حق ہے کے مبارک ناموں میں سے اپنے باطل معبودوں کے نام نکالنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآىِٕهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ ①

''یعنی اللہ تعالیٰ کے پیارے پیارے نام ہیں، پس اسے انہیں ناموں کے ساتھ پکارو، اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو ان کے ناموں میں الحاد پیدا کرتے ہیں، عنقریب وہ اپنے کرتوتوں کا بدلہ دیئے جائیں گے''

اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد سے مراد شرک ہے، جس کی ایک صورت یہ ہے کہ انہوں نے "الاِلٰہ" سے اپنے معبود "اللات" کا نام نکال لیا، اور "العزیز" سے اپنے معبود "العُزّٰی" کا نام نکال لیا۔ (والعیاذ باللہ)

(۳) شرک فی الالوہیۃ والعبادۃ: شرک کی تیسری قسم شرک فی الالوہیۃ والعبادۃ ہے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں: ''اصلِ شرک، الوہیت (معبود ہونے) میں اللہ تعالیٰ کے شریک ہونے کا اعتقاد رکھنا ہے، یہ شرکِ اعظم ہے اور یہی دورِ جاہلیت کا شرک ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کا شرک ہے جو اللہ تعالیٰ کے افعال میں شراکت کے قائل ہیں، مثلاً یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی کچھ لوگ ایجادِ فعل کا اختیار رکھتے ہیں، گو وہ مستقل "اِلٰہ" نہیں ہیں، لیکن افعال میں شریک ضرور ہیں''

① (الاعراف: ۱۸۰)

شرک فی الالوہیۃ کی قسمیں: شرک فی الالوہیۃ کی بھی دو قسمیں ہیں۔

''الف'': ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کا (نِد) یعنی ہمسر یا شریک مقرر کرے، انہیں اس طرح پکارے جیسے اللہ کو پکارتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرح کا ان سے سوالِ شفاعت کرے، اللہ تعالیٰ جیسی ان سے امیدیں وابستہ کرے، اللہ تعالیٰ جیسی محبت رکھے، اللہ تعالیٰ جیسا خوف رکھے، الغرض اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شریک ٹھہرا کر، اللہ تعالیٰ کی طرح ان کی عبادت شروع کردے...... یہ شرک اکبر ہے۔

اس شرک کی اللہ تعالیٰ نے بے شمار آیات میں تردید اور تنقید فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا ﴾ ①

''صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو، اور اس عبادت میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ ②

''اور ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، اور ہر طاغوت کا انکار کرو۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ سُبْحَانَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ ③

''اور یہ لوگ اللہ کے سوا ان لوگوں کی عبادت کرتے ہیں جو ان کے کسی نفع ونقصان کے مالک نہیں ہیں، وہ کہتے ہیں یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں، کہہ دیجئے کیا تم اللہ تعالیٰ کو وہ خبر دینا چاہتے ہو جو آسمانوں اور زمینوں میں اللہ تعالیٰ نہیں جانتا، وہ ذات پاک ہے، اور بلند ہے اس چیز سے جو وہ شرک کرتے ہیں''

نیز فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ ④

''اللہ وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر مستوی ہو گیا، تمہارا اس کے سوا کوئی دوست یا شفیع نہیں ہے، تم نصیحت کیوں نہیں پکڑتے؟''

الغرض شرک کے اس قسم کی تردید اور بطلان میں بے شمار آیات موجود ہیں۔

① (النساء: ٣٦) ② (النحل: ٣٦)
③ (یونس: ١٨) ④ (السجدة: ٤)

شرکِ اصغر کی وضاحت

''ب'': شرکِ عبادت کی دوسری قسم شرکِ اصغر ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ عبادت میں اللہ تعالیٰ کیلئے اخلاص نہ ہو بلکہ بندوں کیلئے ریا کاری اور تصنع ہو، اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے بجائے اپنے آپ کو ابھارنا اور نمایاں کرنا مقصود ہو، یا طلبِ دنیا کی نیت وحرص ہو، یا کسی جاہ ومنصب اور مرتبہ کا حصول مطلوب ہو۔ ایسا شخص اپنے عمل کا کچھ حصہ اللہ تعالیٰ کے لئے اور کچھ غیر اللہ کیلئے مقرر کر دیتا ہے۔ شرکِ اصغر کے تحت کچھ صورتیں وہ بھی آسکتی ہیں جن کا تعلق الفاظ سے ہے، مثلاً غیر اللہ کی قسم، یا یوں کہنا: جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں، میرے لئے تو اللہ ہے اور آپ ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ الفاظ شرکِ اکبر کے تحت بھی مندرج ہو سکتے ہیں، پس یہ الفاظ ادا کرنے والے کے حال اور مقصد کو دیکھا جائے گا۔ (یہ ابن القیم رحمہ اللہ کے کلام کا خلاصہ ہے)

واضح ہو کہ مؤلف رحمہ اللہ نے اپنی اس عظیم الشان کتاب میں توحید الوہیت کے تحت مندرج ہونے والی عبادات کا ذکر فرمایا ہے، اور دلائل دیئے ہیں کہ ان عبادات کا اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہونا ضروری ہے، اس کے ساتھ ساتھ ان عبادات کے مقابل لوگوں کے شرک میں مبتلا ہونے کی وجوہ اور صورتیں بھی بیان فرمائی ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں یہ تمام تفصیلی مباحث آپ کے پیشِ خدمت ہیں، اللہ تعالیٰ مؤلف رحمہ اللہ کو اپنی رحمت ورضا میں ڈھانپ لے۔ (آمین)

قول اللہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ ①

''اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

عبادت کی حقیقت

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''عبادت در حقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی زبانی جو احکام و اوامر ارشاد فرمائے ہیں صرف انہی کی تابعداری کر لی جائے۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: ''عبادت ایک جامع نام ہے جس کا اطلاق ہر اس قول و عمل پر ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت و پسندیدگی کے مطابق ہو''

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''عبادت کا مدار پندرہ قواعد پر ہے جو انہیں مکمل کرے گا اس نے عبودیت کے تمام مراتب مکمل کر لیئے، اس کی تفصیل یوں ہے کہ عبادت کی تین قسمیں ہیں: (۱) دل کی عبادت (۲) زبان کی عبادت (۳) اور بقیہ اعضاء کی عبادت......

اور عبودیت کے پانچ احکام ہیں (۱) واجب (۲) مستحب (۳) حرام (۴) مکروہ (۵) اور مباح۔

یہ پانچوں احکام عبادت کی مذکورہ تینوں اقسام پر مرتب کریں تو عبادت کے پندرہ قواعد حاصل ہو جائیں گے۔''

(مطلب یہ ہے کہ کوئی عبادت اپنی مرضی سے نہیں کی جا سکتی بلکہ عبادت کی ہر قسم یا تو شرعاً فرض ہو گی یا حرام یا مستحب وغیرہ)

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''عبادت کی حقیقت تذلل و خضوع پر قائم ہے، اور شریعت کے تمام امور و وظائف کو عبادت کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے انتہائی درجہ کے تذلل اور خضوع کیساتھ ان امور و وظائف کو انجام دیتا ہے۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی عبادت کو کمالِ محبت و کمالِ خضوع اور کمالِ خوف سے عبارت قرار دیا ہے۔

آیتِ کریمہ: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ ① کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اس نے تمام جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے چنانچہ ان سب کی تخلیق میں یہی حکمت پنہاں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو پیدا کر کے ان سے وہ کچھ نہیں چاہا جو عام طور پر

---

① (الذاریات: ٥٦)

سردار اور وڈیرے اپنے غلاموں سے چاہتے ہیں کہ وہ ان کے لئے کمائیں، اور انہیں کھلائیں بلکہ اللہ تعالیٰ تو خود روزی دینے والا ہے، اس کی صفت یہ ہے کہ وہ صرف کھلاتا ہے، اور خود کبھی نہیں کھاتا۔

واضح ہو کہ عبادت جو فعلِ مامورات اور ترکِ منہیات کا نام ہے دینِ اسلام کی اصل حقیقت ہے، کیونکہ اسلام سے مراد استسلام ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنا اس طرح کہ اس میں انتہائی درجہ انقیاد و اطاعت کا پہلو پورے تذلل اور خضوع کے ساتھ نمایاں ہو۔

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ آیت: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ ① کا ترجمہ یوں کیا کرتے تھے کہ ''میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میں انہیں حکم دوں کہ میری عبادت کرو اور تاکہ میں انہیں اپنی عبادت کی دعوت دیتا رہوں۔''

امام مجاہد رحمہ اللہ یوں تفسیر فرماتے ہیں: ''تاکہ میں انہیں کچھ امور بجالانے کا حکم دوں، اور کچھ امور سے روک دوں۔ کَمَا قَالَ تَعَالٰی ﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴾ ②

''کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بے کار پیدا کیا گیا ہے۔؟''

(اور بقول امام شافعی رحمہ اللہ) اس پر کوئی امر یا نہی لاگو نہیں ہوتے؟؟

بہر حال ہماری تخلیق کا مقصد عبادت ہے، اور عبادت سے مراد عبادتِ شرعیہ ہے، اور عبادتِ شرعیہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اس آیتِ کریمہ سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ ہر قسم کی عبادت اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارا خالق اور منعمِ حقیقی ہے، اور ہمارا ہر معاملہ اسی کی قدرت و مشیت اور رحمت کے تابع ہے، اور اللہ رب العزت نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا اس پر کوئی دوسرا قادر نہیں ہے، اور ہم حصولِ رزق اور دفعِ ضرر کے لئے ہمیشہ اس کے محتاج و مفتقر ہیں لہذا وہی عبادت کئے جانے کے مستحق ہے۔

---

① (الذاريات: ٥٦)

② (القيامة: ٣٦)

وقولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ﴾ ①

''اور ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا (اس دعوت کیساتھ) کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور ہر طاغوت سے بچو۔''

طاغوت کیا ہے

''طاغوت'' طغیان سے مشتق ہے جس کا لغوی معنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔

امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: طاغوت سے مراد شیطان ہے۔ ②

(گویا ہر غیر اللہ کی عبادت یا اطاعت شیطان کی پیروی کا نتیجہ ہے)

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: طواغیت (طاغوت کی جمع) سے مراد کاہن ہیں جن پر شیاطین اترا کرتے تھے۔ ③

مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ: طاغوت سے مراد وہ شیطان ہے جو انسانی صورت میں ہوتا ہے، جس سے لوگ اپنے مختلف امور میں فیصلے کراتے ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: طاغوت سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی جائے۔

(یہ تفسیر صحیح ہے لیکن ان لوگوں کا استثناء کر لینا بہتر ہے جو اپنی عبادت سے راضی نہیں ہیں۔)

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''طاغوت سے مراد ہر وہ چیز ہے جسے بندہ اس کی حد سے بڑھا دے اس طرح کہ اسے معبود یا متبوع (قابل اطاعت) مان لے، لہٰذا کسی بھی قوم میں ہر وہ شخص طاغوت ہوگا جس سے لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں فیصلے کرائیں، یا اللہ تعالیٰ کے علاوہ اس کی عبادت کریں، یا بلا بصیرت اس کی اتباع کریں یا اس کی اطاعت میں ایسے کام بھی کر جائیں جو درست نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے دائرہ میں نہیں، لیکن انہیں یہ علم نہ ہو وہ تو محض اس طاغوت کی اطاعت میں وہ کام کیئے جا رہے ہیں۔...... یہ سب اس دنیا کے طواغیت ہیں ...... اور آج اگر دنیا کے احوال پر تأمل اور تفکر کریں تو یہ بات واضح ہوگی کہ لوگوں کی اکثریت اللہ تعالیٰ کی عبادت سے اعراض کر کے طواغیت کی عبادت کر رہی ہے، اور اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت سے اعراض کر کے طواغیت کی اطاعت و متابعت کر رہی ہے۔

---

① (النحل: ٣٦)

② صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب (١٠) معلقاً حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اسکی سند کو قوی کہا ہے، فتح الباری (٨/ ٢٥٢)

③ صحیح بخاری، کتاب التفسیر معلقاً. جبکہ ابن جریر (٣/ ١٣) اور ابن ابی حاتم نے اسے موصولاً بیان کیا ہے۔ فتح الباری (٨/ ٢٥٢)

مذکورہ آیتِ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت، گروہ اور ہر دور میں رسول مبعوث فرمائے، اور ہر رسول کو پابند کیا کہ وہ صرف میری عبادت کا حکم دیں، اور ہر طاغوت سے اجتناب کرنے کا حکم دیں۔

جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ إِلاَّ نُوْحِيْ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ ①

''اور ہم نے آپ سے قبل جتنے بھی رسول بھیجے ان کی طرف یہی وحی کی کہ میرے علاوہ کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو۔''

نبی ﷺ کو بھی یہی دعوت پیش کرنے پر مامور کیا گیا: ﴿ قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ إِلَيْهِ أَدْعُوْا وَإِلَيْهِ مَاٰبِ ﴾ ②

''کہہ دیجئے مجھے تو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں، اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں، اور اسی کی طرف لوٹنا ہے''

طاغوت سے بچے بغیر توحید کی تکمیل ناممکن ہے

یہ آیتِ کریمہ: ﴿ أَنِ اعْبُدُوا اللهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ کلمہ (لاالہ الا اللہ) ہی کی تفسیر ہے؛ کیونکہ جس طرح کلمہ (لاالہ الا اللہ) نفی اور اثبات پر مشتمل ہے، اسی طرح یہ آیت کریمہ بھی نفی اور اثبات پر مشتمل ہے، چنانچہ "اعبدوا اللہ" اثبات ہے، اور "اجتنبوا الطاغوت" نفی ہے، لہٰذا دینِ اسلام میں یہ نفی اور اثبات ضروری ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کیلئے ہر قسم کی عبادت کا اثبات، اور ہر غیر اللہ سے ہر قسم کی عبادت کی نفی۔ ''سورۃ الکافرون'' کا بھی یہی مضمون ہے، اور قولہ تعالیٰ ﴿ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ﴾ ③ میں بھی یہی اسلوب پایا جاتا ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کیا خوب لکھا ہے: '' توحیدِ عبادت میں قرآنِ حکیم کا طریقۂ بیان یہی ہے کہ نفی کو اثبات کے ساتھ جوڑا ہے، چنانچہ قرآن ہر غیر اللہ کی عبادت کی نفی کرتا ہے، اور ہر قسم کی عبادت کو اللہ تعالیٰ کیساتھ ثابت کرتا ہے، اور یہی حقیقتِ توحید ہے، نہ تو محض ''نفی'' توحید ہے اور نہ محض ''اثبات'' توحید ہے۔ نفی اور اثبات دونوں جمع ہوں گے تو توحید کا مکمل معنی حاصل ہوگا اور یہی "لا الہ الا اللہ" کی حقیقت ہے۔''

مذکورہ آیتِ کریمہ سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ تمام انبیاءِ کرام علیہم السلام کے دین کا اصل ایک ہی ہے اور وہ توحید ہے، اگرچہ بقیہ امورِ شرائع میں اختلاف ممکن ہے۔ (یہ بات بھی توحید کی اہمیت کو آشکارہ کرتی ہے۔) (فافهم وتدبر)

① (الانبیاء: ۲۵) ② (الرعد: ۳۶) ③ (البقرۃ: ۲۵۶)

قال :قوله تعالیٰ :﴿ وَقَضٰی رَبُّكَ اَلاَّ تَعْبُدُوْا اِلاَّ اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ﴾ ①

''اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم نہ عبادت کرو مگر صرف اسی کی اور (یہ فیصلہ بھی کر دیا ہے کہ) ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔''

اہمیت توحید آیت ''وَقَضٰی رَبُّكَ....'' کی روشنی میں

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ:''یہاں '' قَضٰی '' بمعنی '' اَمَرَ '' ہے۔'' یعنی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اسی کی عبادت کرو، اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو بھی ہیں وہ کسی نفع یا نقصان کے مالک نہیں، وہ یا تو انسان ہیں جو فقیر ہیں، اور قدم قدم پر پروردگار کی رحمت کے سہارے کے محتاج ہیں، یا جمادات ہیں جن میں کسی پکار کے سننے یا مدد کو پہنچنے کی کوئی استطاعت وصلاحیت نہیں ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے ساتھ ساتھ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے حقِ اطاعت وعبادت کے ساتھ والدین کے حقِ خدمت کا ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ والدین کا حقِ خدمت انتہائی اہم اور مؤکد اَمر ہے، نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حق کے بعد سب سے ضروری حق والدین کا ہے، قرآنِ حکیم میں یہ اسلوب بہت سے مقامات پر ملے گا کہ اللہ تعالیٰ کے حق کو اور والدین کے حق کو ایک ساتھ ذکر کیا گیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿... اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْكَ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ ﴾ ②

''...کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کر''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلاَّ اللهَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا...﴾ ③

''اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا''

نبی ﷺ کی بہت سی احادیث میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا امر اور ان کی نافرمانی کی حرمت مذکور ہے، اور حسنِ سلوک بھی ایسا جو نیکی اور احسان کی تمام انواع کو شامل ہو۔

" عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: سَأَلْتُ النَّبِیَّ ﷺ اَیُّ الْعَمَلِ اَحَبُّ اِلَی اللهِ عَزَّوَجَلَّ؟ قَالَ: "اَلصَّلٰوةُ عَلٰی وَقْتِهَا " قُلْتُ: ثُمَّ اَیٌّ ؟قَالَ: " ثُمَّ بِرُّ الْوَالِدَیْنِ " قُلْتُ: ثم اَیٌّ ؟ قَالَ: " اَلْجِهَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ " حَدَّثَنِیْ بِهِنَّ وَلَوِ اسْتَزَدْتُهٗ لَزَادَنِیْ " ④

① (الاسراء: ۲۳) ② (لقمان: ۱۴)
③ (البقرة: ۸۳) ④ صحیح بخاری، کتاب الادب (۵۹۷۰)

....

....

....

....

....

''سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷛ سے مروی ہے، میں نے نبی ﷺ سے پوچھا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پیارا عمل کونسا ہے؟ فرمایا: ''وقت پر نماز ادا کرنا'' میں نے کہا: پھر کونسا؟ فرمایا: ''ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک'' میں نے کہا: پھر کونسا؟ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا'' یہ باتیں آپ ﷺ نے بتلائیں، اگر میں مزید سوال کرتا تو آپ مزید ارشاد فرماتے۔''

" وَعَنْ اَبِی بَکْرَۃَ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : " اَلا اُنَبِّئُکُمْ بِاَکْبَرِ الْکَبَائِرِ؟ " قُلْنَا : بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ : " اَلْاِشْرَاکُ بِاللّٰہِ " وَ" عُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ "وَکَانَ مُتَّکِئًا فَجَلَسَ فَقَالَ : " اَلَا وَقَوْلُ الزُّوْرِ اَلَا وَشَھَادَۃُ الزُّوْرِ" فَمَا زَالَ یُکَرِّرُھَا حَتّٰی قُلْنَا: لَیْتَہٗ سَکَتَ " ①

''ابو بکرۃ ﷛ سے مروی ہے فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں بتاؤں کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟'' ہم نے عرض کیا: جی ہاں۔ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، اور والدین کی نافرمانی کرنا'' آپ ﷺ ٹیک لگائے بیٹھے تھے کہ اچانک ٹیک چھوڑ کر اٹھ کے بیٹھ گئے اور فرمایا: ''اور جھوٹی بات کہنا اور جھوٹی گواہی دینا.... اور جھوٹی بات کہنا اور جھوٹی گواہی دینا۔ آپ ﷺ یہ بات بار بار دہراتے رہے حتیٰ کہ ہم نے کہا: کاش آپ ﷺ خاموش ہو جائیں''

" وَعَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ قَالَ : قَالَ رَجُلٌ : یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ ! مَنْ اَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِیْ ؟ قَالَ "اُمُّکَ" قَالَ : ثُمَّ مَنْ ؟ قَالَ: "اُمُّکَ " قَالَ : ثُمَّ مَنْ ؟ قَالَ " اُمُّکَ" قَالَ : ثُمَّ مَنْ ؟ قَالَ:"اَبُوْکَ"" ②

''سیدنا ابو ھریرہ ﷛ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ: ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! میری حسنِ صحبت کا سب سے زیادہ کون مستحق ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہاری ماں'' اس نے کہا: پھر کون؟ فرمایا: ''تمہاری ماں'' اس نے کہا: پھر کون؟ فرمایا: ''تمہاری ماں'' اس نے کہا پھر کون؟ فرمایا: ''پھر تمہارا باپ''

اس باب میں بہت سی احادیث وارد ہیں، مزید اطلاع کیلئے امام بخاری ﷫ کی کتاب "الادب المفرد" کا مطالعہ کیجئے۔

① صحیح بخاری، کتاب الادب (۵۹۷۶) وصحیح مسلم، کتاب الایمان (۸۷)

② صحیح بخاری، کتاب الادب (۵۹۷۱)

وقولہ: ﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا ﴾ ①

”اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔“

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”یہاں اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں کو یہ حکم ارشاد فرما رہا ہے کہ وہ سب کے سب اللہ ”وَحْدَهٗ لَا شَرِيكَ لَهٗ“ کی عبادت کریں؛ کیونکہ وہی خالق، رازق اور منعم حقیقی ہے، لہذا وہی ہر قسم کی عبادت کا مستحق ہے، اور اس بات کا مستحق ہے کہ اسکی مخلوقات میں سے کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے“

میں کہتا ہوں: اللہ وحدہ لاشریک لہ کی خالص عبادت کا امر، قرآن حکیم کا سب سے پہلا امر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ ②

”اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جو تمہارا اور تم سے پچھلے لوگوں کا خالق ہے، تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ“

غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنے بندوں کو اپنی خالص عبادت کرنے کا حکم دیا، چنانچہ عبادت کی کسی نوع کو خاص نہیں کیا بلکہ حکم دیا کہ تمام انواعِ عبادت اللہ تعالیٰ کے لئے بجالاؤ، اسی طرح شرک سے روکا اور شرک کی کسی نوع کو خاص نہیں کیا، بلکہ یہ واضح کیا کہ انواعِ شرک میں سے کسی بھی نوع کا شرک اللہ تعالیٰ کے لئے جائز نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ توحیدِ عبادت ہی اصل توحید ہے؛ کیونکہ مشرکین مکہ کے ساتھ اصل خصومت عبادت ہی کے سلسلہ میں تھی، وہ اللہ تعالیٰ کی بھی عبادت کرتے اور دوسروں کی بھی عبادت کرتے..... انہیں اس روش کے ترک کا حکم دیا گیا، اور اس بات پر مامور کیا گیا کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کریں۔

واضح ہو کہ قرآن مجید نے سب سے پہلے ایک اللہ کی عبادت کرنے کا حکم صادر کر کے یہ نکتہ بھی سمجھا دیا کہ ہر مکلف کا پہلا فریضہ توحید کا اقرار و اعتراف، اور طاغوت کی نفی و انکار ہے۔ اللہ تعالیٰ پر صحیح اور کامل ایمان وہی متصور ہوگا جو خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کو مستلزم ہوگا..... اور جس کسی نے عبادت کی کسی بھی نوع میں غیر اللہ کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرالیا وہ شرک ہوگیا خواہ وہ کسی فرشتے کو شریک ٹھہرائے، یا نبی کو، یا ولی کو، یا کسی پتھر کے بت کو۔ واللہ المستعان۔

---

① (النساء: ٣٦)

② (البقرة: ٢١)

وقولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ٥ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ٥ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ ①

''آپ کہیئے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرما دیا ہے، وہ یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ، اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو، اور اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کرو۔ ہم تم کو اور ان کو رزق دیتے ہیں اور بے حیائی کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ خواہ وہ علانیہ ہوں یا پوشیدہ، اور جس کا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو، ہاں مگر حق کے ساتھ، اس کا تم کو تاکیدی حکم دیا جاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو کہ مستحسن ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے سنِ رُشد کو پہنچ جائے، اور ناپ تول پوری پوری کرو، انصاف کے ساتھ، ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔ اور جب تم بات کرو تو انصاف کرو، گو وہ شخص قرابت دار ہی ہو، اور اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا اس کو پورا کرو، اس کا اللہ تعالیٰ نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔ اور یقیناً یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے، سو اس پہ چلو، اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی۔ اس کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم پرہیزگاری (تقویٰ) اختیار کرو۔''

اہمیت توحید آیت ''قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ....'' کی روشنی میں

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر ﷺ کے ذریعے مشرکینِ مکہ سے مخاطب ہے جنہوں نے غیر اللہ کی عبادت کرنے، اپنی مرضی سے اللہ کے رزق کو حرام کرنے، اور اپنی اولاد کو قتل کرنے جیسے جرائم کا ارتکاب کیا تھا، اور یہ سب کچھ انہوں نے اپنی فاسد آراء اور شیطان کے بہکاوے کی

① (الانعام: ۱۵۱)

بناء پر کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ پروردگار نے کس چیز کو حرام کیا، اور کس چیز کی وصیت کی اور یہ سب کچھ حق اور وحی کی بنیاد پر ہے نہ کہ اس ظن اور تخمین کی بنیاد پر جس کے تم عادی ہو۔ اس کے بعد اللہ رب العزت نے دس وصیتیں ارشاد فرمائیں (ہم نے انہیں وصیتیں اس لئے کہا کہ آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ ﴾ یعنی: ''یہ اس نے تمہیں وصیت فرمائی ہے''

ان دس جامع وصیتوں کے بارے میں مؤلف رحمہ اللہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے: [مَنْ اَرَادَ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى وَصِيَّةِ مَحَمَّدٍ ﷺ فَلیَقْرَأْ قَوْلَهُ تَعَالٰى : ﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا ﴾ اِلٰى قَوْلِهٖ ﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا ﴾

یعنی ''جس شخص کی یہ خواہش ہو کہ وہ محمد ﷺ کی وہ وصیت دیکھے جس پر آپ ﷺ کی باقاعدہ مہر لگی ہوئی ہے تو وہ ان آیات کو پڑھ لے۔ ﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ ﴾ سے ﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ﴾ تک۔'' ①

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ دس وصیتیں اتنی عظیم الشان ہیں کہ گویا انہیں رسول اللہ ﷺ نے لکھا اور اپنی مہر لگا کر بند کر دیا جس میں اب کوئی کمی بیشی اور تغیر وتبدل ممکن نہیں ہے۔ جس سے ان وصیتوں کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اب ہم ان وصیتوں کو اختصار سے ذکر کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی وصیتیں

(۱) ان آیاتِ محکمات میں اللہ تعالیٰ کی پہلی وصیت تحریم شرک ہے۔ یہ بذاتِ خود توحید کی اہمیت کی دلیل ہے؛ کیونکہ اللہ رب العزت نے اجتنابِ شرک کی وصیت کو تمام وصایا پر مقدم کیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿...اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا ﴾ یہاں ''شَيْئًا'' کی تعیم وتنکیر خوب قابلِ غور ہے، اس تعیم وتنکیر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ترجمہ یوں ہوگا ''اس کے ساتھ کسی بھی عبادت میں کسی بھی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ۔'' گویا اس آیتِ کریمہ نے ہر نوع عبادت میں امکانِ شرک کو باطل ومسترد کر دیا، نیز اس آیتِ کریمہ نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی بھی چیز (فرشتہ، نبی، ولی، حجر یا شجر وغیرہ) کے معبود ہونے کی بھی تردید وتفنید کر دی......اور ایسا کیوں نہ ہو؟ شرک تو ہر ظلم سے بڑا ظلم ہے اور ہر قباحت سے بڑی قباحت ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مشرکینِ مکہ کو شرک کرنے سے روکا، جس میں واضح طور پر یہ نکتہ موجود ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے لیکن ساتھ ساتھ مختلف صالحین واصنام

① جامع ترمذی، رقم (۳۰۷۰) امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔ طبرانی کبیر میں ''مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَقْرَأَ صَحِيْفَةَ مُحَمَّدٍ ﷺ'' کے الفاظ ہیں، رقم (۱۰۰۶۰)

کو بھی شریک بناتے ، اللہ تعالیٰ کی انہیں دعوت یہ تھی کہ ان تمام شریکوں کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ کی عبادت کرو، اور قولاً وعملاً واعتقاداً اس عبادت کا اعتقاد واعتراف کرلو اور یہی (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا معنی وتقاضا ہے۔

(۲) دوسری وصیت ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا معنیٰ یہ ہے کہ ان کے ساتھ نیکی کی جائے ، ان کی حفاظت کی جائے ، ہر شر وضرر سے انہیں بچایا جائے ، ان کی تابعداری کی جائے ، اگر وہ غلام ہوں تو ان کی غلامی کے ازالہ کی کوشش کی جائے ، اور ان پر کسی طرح کا حکم یا آرڈر (order) نہ جمایا جائے۔''

(۳) تیسری وصیت "وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ" ہے۔ یعنی فقر وفاقہ کے خوف سے اپنے بچوں کو قتل نہ کرو، اور نہ ہی بیٹیوں کو زندہ درگور کرو۔

صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے ، فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سب سے بڑے گناہ کی بابت سوال کیا ، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ"

''یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک ٹھہراؤ ، حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ میں نے پوچھا: پھر کونسا؟ فرمایا: "اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ خَشْيَةَ اَنْ يَطْعَمَ مَعَكَ" یہ کہ اپنے بیٹے کو اس ڈر سے قتل کردو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گا۔ میں نے پوچھا: پھر کونسا؟ فرمایا: "اَنْ تُزَانِيَ حَلِيْلَةَ جَارِكَ" پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا۔ ①

(۴) چوتھی وصیت یوں فرمائی: ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ﴾

یعنی: ''بے حیائی کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ خواہ وہ علانیہ ہوں یا پوشیدہ''

ابن عطیہ فرماتے ہیں: یہاں فواحش کی تمام اقسام سے نہی عام وارد ہے ، یعنی کسی بھی معصیت کے قریب نہ پھٹکو خواہ وہ ظاہر ہو یا باطن۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے منقول ہے کہ بعض کفار چھپ کر زنا کرنے کو درست سمجھتے تھے جس پر اللہ تعالیٰ نے ہر معصیت سے روکا خواہ وہ اعلانیہ ہو یا چھپ کر۔

بعض مفسرین کہتے ہیں: ظاہر گناہ وہ ہے جو تمہارے اور مخلوق کے مابین ہو ، اور باطن گناہ وہ ہے جو تمہارے اور خالق کے مابین ہو۔

① صحيح بخاری ، كتاب التفسير (٤٧٦١)

صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷛ سے مرفوعاً مروی ہے (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا): "لَا اَحَدٌ اَغْیَرَ مِنَ اللّٰہِ وَلِذٰلِکَ حَرَّمَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ . . . . . " ①

"اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی باغیرت نہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اعلانیہ اور چھپے ہوئے تمام فواحش کو حرام قرار دے دیا"

گویا فواحش کا ارتکاب اللہ تعالیٰ کی غیرت کو للکارنے کے مترادف ہے۔ واللہ المستعان۔

(۵) پانچویں وصیت قتلِ نفس سے باز رہنے کی ہے یعنی جس نفس کے قتل کو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا اسے قتل نہ کرو، اِلَّا یہ کہ کسی نفس کا قتل حق کے ساتھ ہو...... اس حق کی تین صورتیں ہیں جو درج ذیل حدیث میں مذکور ہیں۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ مَرْفُوْعاً "لَا یَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ یَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَّا بِاِحْدٰی ثَلَاثٍ :اَلثَّیِّبُ الزَّانِی ، وَالنَّفْسُ بِالنَّفْسِ ، وَالتَّارِکُ لِدِیْنِہٖ اَلْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَۃِ " ②

سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷛ سے مروی ہے، رسول ﷺ نے فرمایا: ''جو مسلمان یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اس کا خون حلال نہیں، مگر تین میں سے ایک صورت کے ساتھ۔ شادی شدہ زانی، جان کے بدلے جان (یعنی: قصاص)، اور دین کو چھوڑ دینے والا جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والا (یعنی: مرتد)''

سیدنا عبداللہ بن عمر ﷛ سے مروی ہے کہ، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''معاہد (ذمی) کو قتل کرنے والا جنت کی خوشبو نہیں پائے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی دوری سے محسوس ہو جائیگی۔'' ③

(''معاہد'' سے مراد وہ کافر ہے جو قانونی طور پر ہماری مملکت اسلامیہ میں مقیم ہو) مقامِ غور ہے کہ جب ایک کافر کے قتل پر یہ وعید ہے تو مسلمان کے قتل پر کیا وعید ہوگی؟)

(۶) چھٹی وصیت یوں فرمائی: ﴿ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ ....الآیۃ ﴾ ''یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ۔'' اس سے مراد یہ ہے کہ اس میں بیجا تصرف نہ کرو، لیکن اگر کوئی شخص اس کے مال میں تجارت کر کے اسے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ﴾

یتیم کے مال کی نگرانی کرنے والا ناظر کہلاتا ہے، اور ناظر کے پاس اگر اپنا مال ہو تو وہ یتیم کے مال سے کوئی نفقہ یا اجرت نہ لے، اور اگر اس کے پاس اپنا مال نہ ہو تو پھر وہ معروف طریقے سے نفقہ لے سکتا ہے،

① صحیح بخاری، کتاب التفسیر (٤٦٣٤) ۔صحیح مسلم، کتاب التوبۃ (٣٣/ ٢٧٦٠)
② صحیح بخاری، کتاب الدیات رقم (٦٨٧٨) ۔صحیح مسلم، کتاب القسامۃ رقم (١٦٧٦)
③ صحیح بخاری، کتاب الجزیۃ والموادعۃ، رقم: (٣١٦٦).

اگر وہ مالِ یتیم میں انصاف پر قادر نہ ہو تو بہتر ہے کہ وہ اس کی نگرانی چھوڑ دے کیونکہ مالِ یتیم کے تعلق سے بڑے شدید احکام وارد ہوئے ہیں۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ﴾ ''یہاں تک کہ وہ اپنے سنِ رشد کو پہنچ جائے'' کا تقاضہ مدِ نظر رہنا چاہیئے، چنانچہ ناظر یتیم کے مال کی نگرانی اس کے جوانی کی عمر کو پہنچنے تک کرے گا، اس کے بعد اس کا مال اس کے سپرد کر دے گا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ﴾ ①

اس آیتِ کریمہ سے یتیم کا مال اس کے حوالے کرنے کی تین شرائط سامنے آ رہی ہیں۔

(۱) ان کا ابتلاء، جس سے مراد یہ ہے کہ انہیں اچھی طرح جانچ پرکھ لیا جائے کہ وہ اپنی مصلحتوں اور مال کی تدبیروں کی معرفت کے قابل ہو چکے ہیں (۲) بلوغت (۳) رشد، یعنی بے وقوفی و ناتجربہ کاری کا زائل ہونا۔

(۷) ساتویں وصیت اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ﴾

''اور ناپ تول میں پورے انصاف سے کام لو''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہاں اللہ تعالیٰ لین دین میں عدل و انصاف قائم رکھنے کا حکم دیتا ہے، جبکہ جو لوگ ماپ تول میں کمی بیشی کر جاتے ہیں وہ شدید وعید کے مستحق ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ٥ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ٥ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ٥ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ٥ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ٥ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ②

''بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی، کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں، اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔ کیا انہیں اپنے مرنے کے بعد جی اٹھنے کا خیال نہیں۔ اس عظیم دن کے لئے۔ جس دن سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہونگے۔''

یہ بات واضح طور پر معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑی امت ''قومِ شعیب علیہ السلام'' کو ناپ تول میں کمی کرنے کی وجہ سے صفحہ ہستی سے مٹا دیا تھا۔ واللہ المستعان

(۸) آٹھویں وصیت فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ﴾

اس سے مراد یہ ہے کہ ہر قول و فعل میں عدل و انصاف کا پہلو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اور ہر قریب و بعید کے حق میں انصاف کی بات کہی جائے، گویا بات میں عدل کا معیار ذاتی میلان یا رضاء و غضب نہیں ہے، بلکہ حق

① (النساء: ٦) ② (المطففين: ١ تا ٦)

وصدق ہے، اور یہی عینِ تقویٰ ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمانِ عالیشان ہے: ﴿ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ﴾ ①

''کسی قوم کی عداوت تمہیں خلافِ عدل پر آمادہ نہ کردے، عدل کیا کرو جو پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے۔''

(۹) نویں وصیت اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ﴾ ''اور اللہ کا عہد پورا کرو''

امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے تمہیں جو وصیتیں فرما رکھی ہیں انہیں پورا کرو، چنانچہ اس کے تمام مامورات ومنہیات میں اس کی پوری اطاعت کرو، جس کا طریقہ یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ پر پوری طرح عمل کرو، اس طرح اللہ تعالیٰ کے عہد کے ساتھ وفا کا تقاضہ پورا ہوجائے گا۔

(۱۰) دسویں وصیت اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ﴾

صراطِ مستقیم کی وضاحت

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بڑی عظیم آیت ہے، چنانچہ سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بہت سے اوامر ونواہی صادر فرمانے کے بعد آخری وصیت میں اپنے راستے کے علاوہ ہر راستے کی اتباع سے روک دیا، بلکہ ڈرادیا، اور یہ حکم دیا کہ صرف میرے راستے (کہ جو صراطِ مستقیم ہے) کی پیروی کی جائے۔ صراطِ مستقیم سے مراد دینِ اسلام ہے، اور یہ مستقیم اس لئے ہے کہ اس میں کوئی کجی نہیں، یہ راستہ محمد رسول اللہ ﷺ نے بتلایا، جس کی انتہاء پر جنت ہے، اس کے دائیں بائیں بہت سے راستے پھوٹتے ہیں، جو جادۂ مستقیم پر چلتا رہا وہ جنت میں داخل ہوجائے گا، جو اسی راستے کی انتہاء پر واقع ہے، اور جو دائیں بائیں دوسرے راستے پر چل نکلا وہ جادۂ مستقیم سے منحرف ہوگیا اور اس کے نتیجہ میں وہ کبھی جنت میں داخل نہ ہوگا؛ کیونکہ وہ اس شارع پر چل ہی نہیں رہا جس کے آخر میں جنت واقع ہے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

" عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: خَطَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خَطًّا بِيَدِهٖ ، ثُمَّ قَالَ: "هٰذَا سَبِيْلُ اللّٰهِ مُسْتَقِيْمًا " ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ يَمِيْنِ ذٰلِكَ الْخَطِّ وَعَنْ شِمَالِهٖ ، ثُمَّ قَالَ: " وَهٰذِهِ السُّبُلُ

① (المائدة: ۸)

لَيْسَ مِنْهَا سَبِيلٌ اِلاَّ عَلَيْهِ شَيْطَانٌ يَدْعُوالَيْهِ " ثُمَّ قَرَأَ:﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلاَ تَتَّبِعُوْا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهِ ﴾ " ①

''کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ایک سیدھا خط کھینچا، اور فرمایا یہ اللہ کا سیدھا راستہ ہے، پھر اس خط کے دائیں اور بائیں بہت سے خطوط کھینچے، اور فرمایا کہ ان تمام راستوں پر شیطان بیٹھا اپنی دعوت دے رہا ہے، پھر آپ ﷺ نے اس آیتِ کریمہ کی تلاوت فرمائی: ''یہی میرا سیدھا راستہ ہے پس اس کی اتباع کرو، اور دوسرے راستوں پر مت چلو ورنہ سیدھے راستے سے برگشتہ ہو جاؤ گے۔''

امام مجاہد رحمہ اللہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَلاَ تَتَّبِعُوْا السُّبُلَ ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''اللہ تعالی کے سیدھے راستے کے علاوہ باقی جو بھی راستے ہیں ان سے مراد بدعات وشبہات ہیں''

یہ قول مبنی برصدق ہے، کیونکہ نبی ﷺ کی حدیث ہے " مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ " ②

ایک روایت میں یوں بھی وارد ہوا " كُلُّ عَمَلٍ لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ " ③

یعنی ''جس شخص نے ہمارے اس دین میں نئی بات ڈالی، یا ایسا عمل کرلیا جس پر ہمارا امر نہیں ہے، تو وہ سب مردود ہے۔''

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

" تَعَلَّمُوْا الْعِلْمَ قَبْلَ اَنْ يُقْبَضَ ، وَقَبْضُهُ ذِهَابُ اَهْلِهِ، اَلاَ وَاِيَّاكُمْ وَالتَّنَطُّعَ وَالتَّعَمُّقَ وَالْبِدَعَ، وَعَلَيْكُمْ بِالْعَتِيْقِ " ④

''علم سیکھ لو قبل اس کے کہ اسے قبض کرلیا جائے، اور اس کا قبض کیا جانا علماء کا اٹھ (فوت ہو) جانا ہے، خبردار! دین میں زیادہ تعمق اور بدعات سے بچو، اور ''العتیق'' کو تھامے رکھو۔''

"العتیق" کا معنی قدیم یعنی پرانی چیز ہے، جس سے مراد وہ ہدایت ہے جس پر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام تھے۔

---

① یہ حدیث حسن ہے، مسند احمد (٤٤٣٧/٢، مسند ابن مسعود) مستدرک الحاکم (٣١٨/٢)/ صحیح ابن حبان (١٧٤١) مجمع الزوائد (٢٢/٧) سنن ابن ماجه (١١) السنة لابن ابی عاصم (١٦)

② صحیح بخاری، کتاب الصلح (٢٦٩٧) صحیح مسلم، کتاب الاقضیه (١٧١٨) (لفظ مسلم کے ہیں۔)

③ (مسلم)

④ یہ اثر" حسن لغیرہ" ہے۔ سنن الدارمی (٥٤/١) مصنف عبد الرزاق (٢٠٤٦٥) طبرانی کبیر (٨٨٤٥) ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ اثر ابوقلابہ نے بیان کیا ہے، امام ہیثمی فرماتے ہیں: ابوقلابہ کا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے، مجمع الزوائد (١٢٦/١) البتہ صحیح بخاری، کتاب العلم (١٠٠) صحیح مسلم، کتاب العلم (٢٦٧٣) اور جامع ترمذی (٢٦٥٢) میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کے مثل ہے۔

اور وہ امور جو بعد والے لوگوں نے بنا ڈالے ان سے دور بھاگو۔

سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ کا قول ہے: ''تم سنت کو مضبوطی سے تھام لو، مجھے ڈر ہے کہ عنقریب ایک دور آنے والا ہے کہ انسان جب تمام احوال میں نبی ﷺ کی اقتداء کی بات کرے گا تو لوگ اس کی مذمت کرینگے، اس سے نفرت کرینگے اور اسکو ذلیل ورسوا کرینگے''

مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ سہل بن عبداللہ پر رحم فرمائے وہ کتنی عظیم فراست کے مالک تھے، جو کچھ انہوں نے کہا وہ ہو رہا ہے بلکہ کہیں بڑھ کر ہو رہا ہے، چنانچہ جو شخص خالص توحید اور خالص متابعت رسول ﷺ کی بات کرتا ہے اسے کافر تک کہا جاتا ہے۔

صراطِ مستقیم کا عقیدۂ توحید سے تعلق

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کا اس بارے میں تبصرہ بڑا زبردست ہے، وہ فرماتے ہیں: ''ہم صراطِ مستقیم کے بارے میں بڑی مختصر اور جامع بات کہتے ہیں، اگرچہ لوگوں کی مختلف عبارتیں منقول ہیں جن کی حقیقت ایک ہی ہے، تاہم ہم کہتے ہیں: صراطِ مستقیم اللہ تعالیٰ کا وہ راستہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے قائم فرمادیا، اور وہ راستہ بندوں کو اللہ تعالیٰ تک پہنچاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا یہی ایک راستہ ہے، اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں، اور یہ وہی راستہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے انبیاء ورسل علیہم السلام کے ذریعے قائم فرمایا، اور وہ راستہ اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت اور اس کے رسول کی خالص اطاعت ہے، چنانچہ نہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک مقرر کیا جائے اور نہ اس کے رسول کی اطاعت میں کسی کو شریک کیا جائے، گویا توحید اور متابعت دونوں خالص رہیں...... کلمہ ''لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کی شہادت کا یہی مضمون ومفہوم ہے، لہٰذا صراطِ مستقیم کی جب بھی تفسیر کی جائے گی وہ ان ہی دو اصول میں داخل ہوگی، اور اس میں یہ نکتہ پنہاں ہے کہ تم اپنے دل سے اس سے محبت کرو، اور اپنے عمل سے اس کو راضی کرو، پہلا ہدف ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کے تمام تقاضے پورا کرنے سے حاصل ہوگا، اور دوسرا ہدف '' مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ'' کے تمام تقاضے پورا کرنے سے حاصل ہوگا، یہی ہدایت اور دینِ حق ہے، اور اسی کی معرفت اس پورے دین کی معرفت قرار پائے گی، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مبعوث فرمایا۔''

وقوله : " عَنْ مَعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ کُنْتُ رَدِیْفَ النَّبِیِّ ﷺ عَلٰی حِمَارٍ فَقَالَ لِیْ : یَامَعَاذُ ! اَتَدْرِیْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلَی الْعِبَادِ وَمَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَی اللّٰهِ ؟قُلْتُ : اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ: حَقُّ اللّٰهِ عَلَی الْعِبَادِ اَنْ یَعْبُدُوْهُ وَلَا یُشْرِکُوْا بِهٖ شَیْئًا ، وَحَقُّ الْعِبَادِ عَلَی اللّٰهِ اَلَّا یُعَذِّبَ مَنْ لَّا یُشْرِكُ بِهٖ شَیْئًا ۔ قُلْتُ : یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَفَلَا اُبَشِّرُ النَّاسَ؟ قَالَ : لَا تُبَشِّرْهُمْ فَیَتَّکِلُوْا . " ①

''سیدنا جناب معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: کہ ایک دفعہ میں آپ ﷺ کے پیچھے گدھے پر سوار تھا، آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے معاذ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر کیا حق ہے، اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے؟ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ اور اسکا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق یہ ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت کریں، اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں، اور بندوں کا حق اللہ تعالیٰ پر یہ ہے کہ اگر وہ شرک نہ کریں تو ان کو عذابِ جہنم سے بچالے۔ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! میں لوگوں کو اس کی خوشخبری سنادوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، کیونکہ پھر وہ اسی پر بھروسہ کرلیں گے۔''

اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حق ...... حدیث معاذ رضی اللہ عنہ

اس حدیث کے راوی معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں، یہ انصاری صحابی تھے جن کا تعلق بنوخزرج سے تھا، ان کی کنیت ابوعبدالرحمٰن تھی، یہ نبی ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک ہوئے، آپ احکام کے علم میں منتہیٰ تصور ہوتے تھے، سن اٹھارہ (۱۸) ہجری میں شام میں فوت ہوئے۔ مذکورہ حدیث میں ان کی فضیلت اس بات سے ظاہر ہورہی ہے کہ یہ نبی ﷺ کے پیچھے سواری (گدھے) پر سوار تھے، اس سواری کا نام عُفیر تھا، حجۃ الوداع کے موقع پر اس کی موت واقع ہوئی تھی۔

واضح ہو کہ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ایک انتہائی اہم مسئلہ کی وضاحت کیلئے استفہامی اسلوب استعمال کیا، اس قسم کا اسلوب طالبِ علم کی تفہیم میں زیادہ بلیغ اور مفید ہوتا ہے، کیونکہ کسی شخص سے اگر کوئی سوال کیا جائے اور وہ اسکا جواب نہ جانتا ہو، پھر اسے جواب سے آگاہ کیا جائے تو وہ جواب، فہم وحفظ کے اعتبار سے زیادہ مضبوط اور محفوظ ہوگا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اکرم ﷺ انتہائی اعلیٰ معلم اور مربی تھے۔

نبی ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے یہ پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر کیا حق ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ

① صحیح بخاری، کتاب اللباس (۵۹۶۷) صحیح مسلم، کتاب الایمان (۳۰/۴۹)

اللہ تعالیٰ کا وہ حق جسے بجالانا بندوں پر حتمی اور قطعی ہے، اور اسکے بعد ان سے یہ پوچھنا کہ بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے، اس سے مراد بندوں کی وہ جزاء ہے جسے عقیدۂ توحید اپنا لینے کے باعث عطا فرمانے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرما رکھا ہے، اور چونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہے، لہذا اسے حق العباد سے تعبیر کیا گیا، اور یہ حق اللہ رب العزت نے اپنے اوپر خود ہی متعین فرمایا ہے کسی مخلوق نے متعین نہیں کیا، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ ①

''مؤمنین کی مدد کرنا ہم پر واجب ہے''

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر یہ حق بیان کیا ہے کہ بندے اس کی عبادت کریں، اور اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھرائیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ توحید کی تکمیل صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت سے نہیں ہوتی بلکہ عبادت کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے شریک کی نفی اور انکار بھی ضروری ہے، ورنہ توحید ناقص ہی رہے گی، بلکہ ناقابلِ قبول رہے گی۔

اس حدیث میں توحیدِ عبادت کا ذکر ہے، اور یہ وہ توحید ہے جس کے بارے میں اہلِ مکہ سے مستقل خصومت قائم رہی، اس توحید کو صحیح معنی میں سمجھنا اور اپنانا اللہ تعالیٰ کا وہ حق ہے جو تمام بندوں پر قطعی فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ ہر قسم کی عبادت اللہ تعالیٰ کا ہی حق ہے نہ کہ ان باطل معبودوں کا جنہیں لوگ معبود سمجھتے ہیں، اور وہ تو قبر کی مٹی میں بوسیدہ ہو چکے اور کسی قسم کے اختیار کے قطعی مالک نہیں ہیں۔

بندے اگر اللہ تعالیٰ کی عملاً واعتقاداً عبادت کا حق پورا کریں، نیز ہر معبودِ باطل کا انکار کریں تو پھر اللہ رب العزت انہیں ضرور اپنے عذاب سے بچائے گا۔

سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے جب یہ عظیم الشان حدیث سنی تو نبی ﷺ سے سوال کیا کہ کیا میں تمام لوگوں کو یہ خوشخبری دیدوں؟ تاکہ وہ بھی اس بشارت پر خوش ہو جائیں، اور اس کے مقتضیٰ پر عمل کرلیں۔ نبی ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ کو اس کام سے روک دیا اور اس کی وجہ یہ بتلائی کہ لوگ اسی پر اعتماد کر کے بیٹھ رہیں گے، اور اعمالِ صالحہ میں تنافس اور ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کا جذبہ سرد پڑ جائے گا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث اپنی موت سے کچھ پہلے بیان فرمائی اس ڈر سے کہ کہیں میں کتمانِ علم کی وعید کی زد میں نہ آ جاؤں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کا اس حدیث کو بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نبی ﷺ کا بیان کرنے سے منع کرنا تحریم پر محمول نہیں تھا، ورنہ آپ کبھی بیان نہ کرتے، یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کا منع کرنا علی وجہ العموم ہو، اور سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے مخصوص افراد کو موت سے قبل کتمانِ علم کے ڈر سے بتلا دیا ہو۔ واللہ اعلم!

---

① (الروم: ٤٧)

اس باب کے مسائل

(۱) یہ معلوم ہوا کہ جن وانس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟

(۲) یہ واضح ہوا کہ عبادت ہی اصلِ توحید ہے کیونکہ مشرکینِ مکہ کے ساتھ اصل خصومت عبادت کے ہی تعلق سے تھی۔

(۳) جو شخص توحیدِ عبادت کے مقتضٰی کو نہیں پہچان پاتا اس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی نہیں کی۔ فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ﴾ (الکافرون: ۳) میں یہی معنی پایا جاتا ہے۔

(۴) انبیاء ورسل علیہم السلام کی بعثت کی حکمت واضح ہوئی یعنی ہر نبی توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کی دعوت کے ساتھ مبعوث ہوا۔

(۵) ہر امت میں رسول مبعوث ہوئے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا ﴾ ہے۔

(۶) یہ بات معلوم ہوئی کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہی ہے۔

(۷) سب سے اہم مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک طاغوت کا انکار نہ کیا جائے، یہی معنی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا ہے ﴿ فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ﴾

(۸) لفظِ طاغوت کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جسکی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کیجائے۔

(۹) یہ واضح ہوا کہ سلفِ صالحین کے نزدیک ''سورۃ الانعام'' کی مذکورہ تین آیات کتنی عظمت کی حامل تھیں، ان آیات میں دس وصیتوں کا ذکر ہے جن میں پہلی وصیت شرک سے نہی کی ہے۔

(۱۰) سورۃ الاسراء کی مذکورہ آیات اور ان میں بیان کردہ اٹھارہ مسائل کا علم ہوا، وہاں بھی پہلا مسئلہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک مقرر نہ کرنے کا ہے، چنانچہ ان آیات کا آغاز اللہ تعالیٰ نے اسطرح فرمایا (ترجمہ) ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ ٹھہراؤ ورنہ ملامت زدہ، بے یارو مددگار بیٹھے رہوگے''۔ اور ان آیات کا اختتام یوں فرمایا:

(ترجمہ) ''اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ ٹھہراؤ ورنہ ملامت زدہ اور بے یارو مددگار بنا کر جہنم میں ڈال دیئے جاؤگے۔''

(اس سے واضح ہوا کہ دین اسلام کا اول وآخر توحید ہے) اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بیان کردہ تمام

مسائل کی عظمت واہمیت یہ کہہ کر مزید واضح کردی کہ ﴿ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ﴾ کہ یہ تیرے پروردگار نے تیری طرف وحی فرمائی ہے جو سراسر حکمت ہے۔

(۱۱) سورۂ النساء کی آیت، جو دس حقوق والی آیت کہلاتی ہے کا علم ہوا، آپ دیکھئے کہ اس کا آغاز بھی اللہ تعالیٰ نے اس عظیم مسئلہ سے کیا ﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا ﴾ یعنی: ''صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اور اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔''

(۱۲) رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات سے چند دن قبل جو وصیت فرمائی تھی انتہائی توجہ طلب ہے (اس سے مراد وہ وصیت ہے جو نبی ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے ہوئے فرمائی تھی، یہ واقعہ آپ ﷺ کی وفات سے چند دن قبل پیش آیا۔)

(۱۳) اللہ تعالیٰ کا ہم پر جو حق ہے اس کی معرفت حاصل ہوئی۔

(۱۴) بندوں کا اللہ تعالیٰ پر جو حق ہے اس کا بھی علم ہوا، یہ حق ان بندوں کا ہے جو اللہ تعالیٰ کے توحید کے حق کو پورا کرتے ہیں۔

(۱۵) اس مسئلہ کا اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم کو علم نہ تھا۔

(۱۶) کسی مصلحت کے خاطر کچھ لوگوں سے کسی مسئلہ کا ذکر نہ کرنا جائز ہے۔

(۱۷) کسی مسلمان کو اگر کسی ایسے مسئلہ کا علم ہو جائے جو خوشخبری سے لبریز ہو تو اس کا اپنے ساتھیوں کو بتانا مستحب ہے۔

(۱۸) اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت پر اس طرح بھروسہ کر لینا کہ عمل سے کنارہ کشی ہو جائے جائز نہیں ہے، بلکہ اس روش کو اختیار کرنے سے ڈرتے رہنا چاہئے۔

(۱۹) مسئول کو اگر کسی مسئلہ کا علم نہ ہو تو اسے '' الله ورسوله اعلم'' کہنا چاہئے۔

(۲۰) یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کو کوئی مسئلہ بتانا اور بعض کو نہ بتانا جائز ہے۔

(۲۱) نبی ﷺ کی تواضع وانکساری معلوم ہوئی، کیونکہ آپ ﷺ نے گدھے کی سواری، اور وہ بھی ایک ساتھی کو پیچھے بٹھا کر فرمائی۔

(۲۲) سواری پر اپنے پیچھے کسی کو بٹھانا جائز ہے۔ اور یہ کہ یہ جانور پر کوئی ظلم نہیں ہے۔

(۲۳) سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی فضیلت واضح ہوئی کہ انہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیچھے سوار ہونے کا شرف عطا فرمایا۔

(۲۴) مسئلہ توحید کی عظمت آشکارہ ہوئی، اور وہ اس طرح کہ صحیح معنی میں توحید اختیار کرنے والے شخص کو جنت میں داخل کرنے، اور جہنم سے بچانے کو اللہ تعالیٰ اپنے اوپر لازم قرار دے دیتا ہے۔

باب فضل التوحيد و ما يكفر من الذنوب

توحید کی فضیلت کا بیان اور یہ کہ توحید تمام گناہوں کو مٹا دیتی ہے

وقول اللہ تعالیٰ : ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ ①

''اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں، اور اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ مخلوط نہیں کرتے، ایسوں ہی کے لئے امن ہے، اور وہی راہ راست پر چل رہے ہیں۔''

توحید کی فضیلت آیت: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ﴾ سے

مؤلف رحمہ اللہ نے پچھلے باب میں توحید کا معنی بیان فرمایا تھا، اب مناسب سمجھا کہ توحید کے فضائل بتلا دیئے جائیں، نیز یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ توحید کا مبارک عقیدہ گناہوں کو مٹا ڈالتا ہے۔

معنی توحید کے بیان کے بعد، فضائل توحید کا ذکر قارئین کیلئے ترغیب کا سبب بنے گا، نیز توحید کی ضد یعنی شرک سے نفرت وبُعد کا سامان پیدا کرے گا۔ والله ولي التوفيق

اس آیت کے نزول سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انتہائی پریشان ہو گئے، چنانچہ صحیح بخاری ومسند احمد وغیرہ میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر انتہائی گراں گزرا، انہوں نے نبی ﷺ سے اس پریشانی کا اظہار ان الفاظ میں کیا: یارسول اللہ ﷺ ہم میں سے بھلا کون ظلم نہیں کرتا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہاں ظلم سے مراد وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو، بلکہ یہاں ظلم سے مراد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے نیک بندے لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا: ﴿ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾② تو یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔ ③

جس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کا ایمان شرک کے ساتھ مخلوط ہوگا اس کے لئے نہ تو دنیا میں ہدایت ہے، اور نہ ہی آخرت میں امن (یعنی جہنم سے سلامتی) بلکہ یہ امن وہدایت توحید خالص کے ساتھ مشروط ہے۔ لیکن اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ شرک کے علاوہ دیگر گناہ کرنے والا امن میں آجائیگا، اور اللہ تعالیٰ اس کا مؤاخذہ نہیں فرمائے گا، بلکہ یہ ممکن ہے کہ اللہ رب العزت گنہگار کو اگر وہ توبہ نہیں کرتا پکڑ لے اور جب تک چاہے عذاب میں ڈالے رکھے، جس طرح کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴾ ④

---

① (الانعام: ۸۲) ② (لقمان: ۱۳) ④ (الزلزال: ۷-۸)

③ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء (۳۴۲۹) مسند احمد (۳۵۸۹/۱، مسند ابن مسعود) یہ الفاظ مسند احمد کے ہیں۔

''پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ برابر بُرائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔''

البتہ مؤاخذہ کی ایک شکل یہ ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں مختلف امراض یا مشکلات میں مبتلا کردے، جیسا کہ سیدنا ابوبکر صدیق ؓ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَمَنْ يَعْمَلْ سُوٓءًا يُجْزَ بِهِ ﴾ ① کے نزول پر نبی ﷺ سے پوچھا کہ بھلا ہم میں سے کون برائی نہیں کرتا، تو اگر ہر برائی کرنے والے کو اس کی سزا ملے گی تو پھر عذاب الٰہی سے کون بچ سکتا ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوبکر ؓ کیا تم بیمار نہیں ہوتے؟ کیا تمہیں تھکاوٹیں اور پریشانیاں لاحق نہیں ہوتیں؟ یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزائیں ہیں'' ②

تو گویا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو کہ جس کا ایمان شرک سے مخلوط نہیں ہے لیکن گناہوں کے ارتکاب کا ظلم کر بیٹھتا ہے، دنیا میں امراض و مشاکل کی صورت میں سزا دیدے اور آخرت میں امنِ تام یعنی جنت کا داخلہ عطا فرمادے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ظلم تین طرح کا ہے (۱) ظلم بمعنی شرک (۲) انسان کا دوسرے بندوں پر ظلم کرنا (۳) انسان کا اپنے نفس پر ظلم کرنا، ایسے گناہوں کے ارتکاب کے ساتھ جو شرک کے علاوہ ہیں۔

اب جو شخص ظلم کی ان تینوں صورتوں سے بچ گیا اس کیلئے مکمل ہدایت اور مکمل امن ہے، اور جو شخص پہلی دو صورتوں سے تو بچ گیا لیکن اپنے نفس پر ظلم کرنے سے نہ بچ سکا، اور کچھ گناہوں کا ارتکاب کر بیٹھا تو اس کیلئے امن و ہدایت تو ہے، لیکن اس معنی میں کہ وہ جنت میں تو ضرور داخل ہوگا، لیکن ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں پر اسے پکڑ لے، اور مبتلائے عذاب کردے، اور پھر جب چاہے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل فرمادے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے شرک نہ کرنے کی برکت سے اسے بالکل معاف فرمادے (اس مسئلہ کے سلسلہ میں وارد ہونے والی نصوص کا یہی خلاصہ ہے۔ وھذا ملخص کلام شیخ الاسلام رحمہ اللہ تعالیٰ)

اس آیتِ کریمہ میں توحید کی فضیلت کا پہلو یہ ہے کہ جو شخص خالص توحید پر قائم رہے گا، اور اس کا ایمان شرک کی نجاست و غلاظت سے ناپاک و نجس ہونے سے بچا رہے گا تو اس کے لئے مکمل ہدایت اور مکمل امن کی =

① (النساء: ۱۲۳)

② صحیح ابن حبان (۱۷۳٤) مستدرك حاكم (٤/ ۷۳) تاریخ کبیر للبخاری (۷۳٦٥) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة (۲۵۷٤، عن ابی هریرة).

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ ﷛ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَنَّ عِيْسٰى عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ، وَكَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ، وَالْجَنَّةَ حَقٌّ، وَالنَّارَ حَقٌّ، اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلٰى مَا كَانَ مِنَ الْعَمَلِ" (١)

''عبادہ بن صامت ﷛ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے یہ گواہی دی کہ کوئی معبودِ برحق نہیں مگر صرف اللہ تعالیٰ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور یہ گواہی دی کہ محمد ﷺ اس کا بندہ اور رسول ہیں، اور یہ گواہی دی کہ سیدنا عیسیٰ ؑ اللہ کے بندے اور رسول ہیں، اور اس کا کلمہ ہیں جو اس نے مریم کی طرف ڈالا، اور اس کی روح ہیں، اور یہ گواہی دی کہ جنت حق ہے، اور جہنم بھی حق ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمادے گا اس کے جیسے بھی عمل ہوں''

=

خوشخبری ہے، بلکہ اگر اس سے اور گناہ سرزد نہیں ہوئے تو وہ بلا عذاب جنت میں داخل کر دیا جائے گا، اور اگر صغیرہ گناہ سرزد ہوئے تو وہ کبیرہ گناہ نہ کرنے کی برکت سے معاف کر دیئے جائیں گے، اور اگر کبیرہ گناہ سرزد ہوئے تو وہ شرک نہ کرنے کی برکت سے معاف کر دیئے جائیں گے، اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہوگا، لیکن اگر اللہ تعالیٰ مؤاخذہ کرنا چاہے تو کرسکتا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کا عدل ہوگا، پھر بالآخر اللہ تعالیٰ اسے توحید کی وجہ سے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دے گا۔ واللہ اعلم۔

وقوله: عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ ﷛ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ شَهِدَ ......

اس حدیث کے راوی سیدنا عبادہ بن صامت ﷛ الانصاری الخزرجی ہیں، ان کی کنیت ابوالولید تھی، نقباء میں سے ایک تھے، جنگ بدر میں شریک ہوئے، بڑے جلیل القدر صحابہ میں شمار ہوتا تھا، رملہ شہر میں ۳۴ھ میں ۷۲ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

امام نووی ؒ فرماتے ہیں: یہ بڑی عظیم الشان حدیث ہے، اس کا شمار ان جامع احادیث میں ہوتا ہے جو بہت سے عقائد کے ذکر پر مشتمل ہیں۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بڑی جامعیت کے ساتھ ان عقائد کا ذکر فرمایا ہے جن کا قبول کر لینا لوگوں کو کفر کی ملتوں سے نکال کر دائرۂ اسلام میں منتقل کر دیتا ہے۔

چار اہم ترین عقائد

اب ہم ذیل میں اُن عقائد کی وضاحت کرتے ہیں جن پر یہ عظیم الشان حدیث مشتمل ہے۔

(١) صحيح بخاری، كتاب الانبياء (٣٤٣٥) صحيح مسلم، كتاب الايمان (٢٨)

(۱) پہلا عقیدہ "لَا اِلٰــہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی گواہی دینا ہے، گواہی سے مراد یہ ہے کہ اس کلمہ کو زبان سے ادا کرے، اس کے معنی کو اچھی طرح جان لے اور سمجھ لے، اور اس کے تقاضوں پر ظاہراً و باطناً عمل پیرا ہو جائے۔ صرف زبان سے کلمہ کا پڑھ لینا کافی نہیں ہے، چنانچہ حدیث میں نَـطَـقَ کا لفظ نہیں ہے بلکہ شَہِـدَ کا لفظ ہے، اور شہادت کا مفہوم نُطق، فہم، معرفت اور عمل کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے ﴿ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ ① "جان لو کہ بے شک کوئی معبود نہیں مگر صرف اللہ"

اس سے ثابت ہوا کہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ" کا فہم و معرفت حاصل کرنا ضروری ہے۔

"لَا اِلٰــہَ اِلَّا اللّٰہُ" کا معنی یہ ہے کہ معبودِ حق کوئی نہیں ہے، سوائے ایک معبود کے، اور وہ اللہ تعالیٰ ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ معنی کفارِ قریش بھی سمجھ چکے تھے، یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں "قُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ" کہا تو انہوں نے جواب دیا: ﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ﴾ ②

"اس نے تو اتنے سارے معبودوں کو ایک ہی معبود بنا دیا بڑی عجیب بات ہے"

سابقہ قومیں بھی اس کلمہ کا یہی معنی پہچانتی تھیں، چنانچہ سیدنا ھود علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو "لَا اِلٰــہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی دعوت پیش کی تو انہوں نے جواب دیا ﴿ اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاءُ نَا ﴾ ③

"کیا تم ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم صرف ایک اللہ کی عبادت کریں، اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے تھے؟"

(ثابت ہوا کہ کفار "لَا اِلٰــہَ اِلَّا اللّٰہُ" کا معنی بخوبی سمجھتے تھے لیکن مانتے نہیں تھے، آج مسلمان ہونے کا دعویدار اگر اس کلمہ کا معنی ہی نہیں سمجھتا تو بمقابلہ کفار اسے کس درجہ پر فائز کریں گے؟ ذرا غور کیجئے)

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ" کا معنی: اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا، اور ہر غیر اللہ کی عبادت کا ترک ہے

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ" کا معنی: اللہ تعالیٰ پر ایمان، اور ہر طاغوت کا انکار ہے۔

اس کلمہ عظیمہ میں یہ معنی پنہاں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی "اِلٰــہ" نہیں، اس کے سوا کسی کا "اِلٰــہ" ہونا سب سے بڑا باطل ہے، اور اس کے سوا کسی کو "اِلٰہ" ثابت کرنا سب سے بڑا ظلم ہے، اور دردناک عذاب کا موجب ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس کلمہ کے اندر پائی جانے والی نفی اور اثبات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے، یعنی

① (محمد: ۱۹) ② (ص: ۵)

③ (الاعراف: ۷۰)

اللہ تعالیٰ کے سوا ہر معبود، معبودِ باطل ہے جس کی نفی ضروری ہے، ایسی نفی جو ہر معبودِ باطل کا صفایا کر دے، اور اللہ تعالیٰ معبودِ حق ہے جس کا اثبات ضروری ہے، ایسا اثبات جو ہر شریک کا صفایا کر دے۔

اس نفی اور اثبات کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس حدیث میں مزید مؤکد فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا: "وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ" حالانکہ یہ معنی "مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" سے پوری طرح ادا ہو رہا تھا، چنانچہ "وَحْدَهٗ"، "اِلَّا اللّٰهُ" کی تاکید ہے اور "لَا شَرِيْكَ لَهٗ"، "لَا اِلٰهَ" کی تاکید ہے، اب اس تاکید کا تقاضا یہ ہے کہ اس کلمہ کو نفیاً و اثباتاً اچھی طرح پہچاننا ضروری ہے۔

(اِلٰہ) کا معنی و مفہوم

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں "اَلْاِلٰـــه" "اللہ ہے جو پوری مخلوق پر الوہیت اور عبودیت کا مالک ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" کا معنی "لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا هُوَ" کرتے ہیں، یعنی "اِلٰه"، بمعنی معبود ہے۔

زمخشری کہتے ہیں "اَلْاِلٰـــه" "اسم جنس ہے جس کا اطلاق ہر معبود پہ ہوتا ہے، خواہ وہ حق ہو یا باطل، پھر یہ معبودِ حق کے لئے مختص ہو گیا۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اَلْاِلٰه "اَلْمَعْبُوْدُ الْمُطَاعُ" ہے یعنی وہ ذات جو ہر طرح کی عبادت اور ہر طرح کی اطاعت کی مستحق ہے۔

الغرض علماءِ کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ "اَلْاِلٰه" بمعنی معبود ہے، تو پھر "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا یہی تقاضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو کسی ایک عبادت کے لئے بھی معبود نہ سمجھا جائے، لیکن افسوس! قبر پرستوں کا عقیدہ اس سے بالکل برعکس ہے، انہوں نے بہت سی عبادات اہلِ قبور کی طرف منتقل کر دیں، مثلاً: انہیں پکارنا، ان سے مدد مانگنا، ان سے سوال کرنا، ان کے لئے نذریں ماننا، اللہ رب العزت کے پاس ان کے توسل و شفاعت کا عقیدہ رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ ان کلمہ گو مسلمانوں کو اس بات کا شعور نہیں کہ مشرکینِ سابقین کی بھی تو یہی روش تھی، ابوجہل و ابولہب اور ان سے قبل قومِ نوح کے وَد، سُواع، یغوث، یعوق اور نسر کے پجاری اسی قسم کے معتقدات کے حامل تھے۔ ان معتقدات کی وجہ سے نبی ﷺ کی ان سے خصومت قائم رہی، اور نبی ﷺ نے ان سے عمر بھر قتال کا بازار گرم رکھا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: "مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں ان سے لڑتا رہوں، جب تک یہ گواہی نہ دے دیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں..." ①

(۲) عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث میں بیان شدہ دوسرا عقیدہ یہ ہے "وَاَنَّ مُحَمَّداً

① صحیح مسلم، کتاب الإیمان، رقم: ۱۲٤

عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" یعنی یہ گواہی دینا کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں۔ نبی ﷺ کی عبدیت اور رسالت کی شہادت دینا ضروری ہے، شہادت کے اس مفہوم کے ساتھ جو پیچھے ذکر ہو چکا۔ "عبد" سے مراد "المملوك العابد" ہے، یعنی محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے مملوک اور عبادت گزار ہیں، آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہیں، ربوبیت اور الوہیت میں آپ ﷺ کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ نبی ﷺ نے عبد اور رسول ہونے کو اکٹھا ذکر کیا، تا کہ آپ ﷺ کو ماننے والے اس افراط وتفریط کا شکار نہ ہو جائیں جس افراط وتفریط کا عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہوئے تھے۔ نبی ﷺ نے ایک حدیث میں اس کی صراحت بھی فرما دی:

"لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰى ابْنَ مَرْيَمَ ، فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ" ①

"مجھے میری حد سے آگے نہ بڑھاؤ، جیسا کہ نصاریٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام بن مریم کو بڑھا دیا تھا، میں تو اس کا بندہ ہوں لہٰذا تم مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہا کرو"

آپ ﷺ کے رسول ہونے کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ہر خبر کی تصدیق کی جائے، ہر امر کی اطاعت کی جائے، اور آپ ﷺ کی ہر نہی وزجر سے رُکا جائے، وہ شخص آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی میں ہرگز کامل نہیں ہو سکتا جو کسی دوسرے کی اطاعت کرے، اور آپ ﷺ کے امر کو چھوڑ دے (یعنی دوسروں کے قول کو آپ ﷺ کے فرمان کے مقابلے میں ترجیح دے۔) العیاذ باللہ

(۳) سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث میں بیان شدہ تیسرا عقیدہ یہ ہے "أَنَّ عِيْسٰى عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ" یعنی عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اسکے رسول ہیں۔

یہ عقیدہ نصاریٰ کے عقیدہ کے بالکل برعکس ہے وہ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ یا اللہ کا بیٹا کہتے تھے۔

(تعالى الله عن ذلك علوا كبيرا)

ہمیں چاہیے کہ ہم سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے اللہ تعالیٰ کے عبد ہونے کی گواہی دیں یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے عابد اور مملوک ہیں، نہ تو مالک ہیں اور نہ ہی ربوبیت والوہیت میں ان کا کوئی حصہ ہے، اسی طرح یہ بھی گواہی دیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں، جیسا کہ قرآن پاک میں اللہ کا فرمان ہے:

﴿ قَالَ إِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴾ ②

"کہا میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے اپنا پیغمبر بنایا ہے"

---

① صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، عن عمر رضی اللہ عنہ (۳٤٤٥)

② (مریم: ۳۰)

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے کلمۃ اللہ وروح اللہ ہونے کا مطلب

(۴) چوتھا عقیدہ یہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہیں۔ قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو "کَلِمَةُ اللهِ" اس لیئے کہا گیا کہ وہ کلمہ " کُنْ " سے بغیر باپ کے پیدا کئے گئے ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں وہ کلمہ جو اللہ تعالیٰ نے مریم علیہا السلام کی طرف القاء کیا وہ "کُنْ" ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام وجود میں آ گئے، یعنی عیسیٰ علیہ السلام خود کلمہ "کن" نہیں ہیں، بلکہ کلمہ "کُنْ" سے پیدا کئے گئے، کلمہ "کُنْ" اللہ تعالیٰ کا قول ہے جو مخلوق نہیں ہے۔

اس کلمہ کو مریم علیہا السلام کی طرف القاء کرنے کی صورت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو یہ کلمہ دیکر بھیجا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اِذن سے مریم علیہا السلام کے قمیص کی گریبان میں پھونکا، اور وہاں سے وہ انکے رحم میں داخل ہو گیا جس سے عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے اِذن سے پیدا ہوئے، اسی لئے عیسیٰ علیہ السلام کو "رُوْحُ الله" بھی کہا جاتا ہے۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے "روح اللہ" ہونے کا معنیٰ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے یوں بیان کیا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ان روحوں میں سے ایک روح ہیں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہے اور جن سے عالمِ ارواح میں "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" کا عہد لیا تھا۔①

بعض علماء کا قول ہے کہ روح سے مراد پھونک ہے جو جبرائیل امین علیہ السلام نے مریم علیہا السلام میں پھونکی تھی، چونکہ یہ پھونک اللہ تعالیٰ کے امر سے تھی اس لئے انہیں روح اللہ کہا گیا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے بھی یہی بات کہی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہاں طویل بحث کی ہے، ان کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ کہنا اللہ تعالیٰ کی طرف ایک ایسی اضافت ہے جو اللہ تعالیٰ کی خاص محبت ورضا کا مظہر ہے۔

(۵) حدیثِ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ میں پانچواں عقیدہ یہ بیان ہوا کہ "وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ" یعنی: "یہ گواہی دینا کہ جنت بھی حق ہے اور جہنم بھی حق ہے"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ خبر دی ہے کہ جو لوگ اس پر اور اس کے رسول پر سچا ایمان لائیں گے ان کے لئے جنت تیار ہے، اس پر کامل ایمان ہو، اسی طرح جو جہنم کے بارہ میں خبر دی گئی اس کی کامل تصدیق ہو۔ کتاب وسنت کے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور جہنم بنائی جا چکی ہیں، اور وہ اب بھی موجود ہیں، بہت سے اہلِ بدعت اس کے منکر ہیں ان کا کہنا ہے کہ جنت اور جہنم قیامت کے دن پیدا کی جائیں گی، لیکن یہ قول باطل ہے۔ =

① امام ھیثمی "مجمع الزوائد" (۷ /۲۵) میں فرماتے ہیں اس اثر کو "عبداللہ بن احمد" نے اپنے شیخ "محمد بن یعقوب الربالی" سے روایت کیا ہے، جو کہ مستور الحال ہے، جبکہ باقی راوی صحیح کے ہیں۔

قال: وَلَهُمَا مِنْ حَدِيْثِ عِتْبَانَ : " فَإِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَبْتَغِيْ بِذٰلِكَ وَجْهَ اللّٰهِ " ①

بخاری ومسلم کی ایک روایت جو حدیث عتبان کے نام سے مشہور ہے کہ: ''جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ''لا الٰہ الا اللہ'' کا اقرار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کی آگ کو حرام کر دیتا ہے''

مذکورہ بالا تمام عقائد پر ایمان لانے والے شخص کی جزا یہ ہے "اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلٰى مَا كَانَ مِنَ الْعَمَلِ" یعنی: ''اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کر دے گا جیسے بھی عمل ہوں''

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے حکم دے گا کہ جنت کے آٹھوں دروازوں میں سے جس سے چاہو داخل ہو جاؤ۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ اس جملے کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جو شخص ان عقائد کا اقرار کرلے، اور حقیقی ایمان اور توحید کو اپنا لے تو اسے اس کا اتنا اجر ملے گا جو اس کے گناہوں پر غالب آ جائے گا، جو اس کی مغفرت، رحمت، اور ابتداءً دخول جنت کا موجب بن جائیگا۔

قال: وَلَهُمَا مِنْ حَدِيْثِ عِتْبَانَ: " فَإِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ.....

یہ بخاری ومسلم کی ایک طویل حدیث کا جزء ہے، جسے سیدنا عتبان بن مالک الانصاری رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث سے ظاہراً یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ شہادتین کا اقرار کرنے والا شخص جہنم پر حرام کر دیا گیا ہے، اس معنی کی اور بہت سی احادیث وارد ہیں، مثلاً:

صحیحین میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نبی ﷺ کا یہ فرمان منقول ہے ''جو بندہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کی گواہی دیتا ہے اسے اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ پر حرام کر دیتا ہے'' ②

اسی معنی میں سیدنا عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت بحوالہ صحیح مسلم موجود ہے۔ ③

جبکہ بعض روایات میں ''شہادتین'' کا اقرار کرنے والے کے لئے جہنم کے حرام ہونے کا تو ذکر نہیں، لیکن جنت میں داخل ہونے کا ذکر ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں سیدنا ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں نبی ﷺ کا فرمان اس طرح وارد ہوا ہے ''جو بندہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی گواہی اور میرے رسول اللہ ہونے کی گواہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو ملے گا، وہ جنت سے قطعی نہیں چھپایا جائے گا، بشرطیکہ اسے اس گواہی دینے میں کوئی شک نہ ہو'' ④

---

① صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ (٤٢٥) صحیح مسلم، کتاب المساجد.... (٣٣)
② صحیح بخاری، کتاب العلم (١٢٨) صحیح مسلم، کتاب الایمان (٣٢) (الفاظ صحیح بخاری کے ہیں)۔
③ صحیح مسلم، کتاب الایمان (٢٩). ④ صحیح مسلم، کتاب الایمان (٢٧/٤٥).

اسی مضمون کی حدیث صحیحین میں ابوذر غفاری ؓ کی روایت سے موجود ہے ''جو بندہ "لَا اِلٰــهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہے پھر اسی پر اس کی موت آجائے تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا'' ①

(ان احادیث میں بظاہر ایک پیچیدگی ہے، اور وہ یہ کہ شہادتین کا اقرار کرنے والا جنت میں داخل ہوگا تو کیا کسی اور عمل کی ضرورت نہیں رہے گی؟)

اس سلسلہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ کا بہت عمدہ کلام موجود ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''یہ فضیلت مطلق نہیں ہے، بلکہ اس مضمون کی تمام احادیث کو جمع کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ فضیلت اس شخص کے لئے ہے جو "لَا اِلٰــهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا خالص دل سے اقرار کرے، پوری طرح صدق و یقین موجود ہو، کسی قسم کا کوئی شک نہ ہو، اور اسی پر اس کا خاتمہ ہو۔ اب ظاہر ہے جسے "لَا اِلٰــهَ اِلَّا اللّٰهُ" کے اقرار میں اخلاصِ کامل اور یقینِ تام حاصل ہو وہ تو اللہ تعالیٰ کی محبت کے ساتھ متعلق و منسلک رہے گا، ایسے انسان سے معصیتوں پر مصر ہونا ممکن نہیں ہے، اُس کے اس اخلاص و محبت اور صدق و یقین کے زیور سے آراستہ ہونے سے قبل اگر گناہ سرزد ہوئے ہوں تو وہ ان اوصاف کے اپنا لینے کے بعد یوں مٹ جائینگے جیسے رات کی تاریکیاں دن کے اجالوں سے چھٹ جاتی ہیں، کیونکہ توحیدِ خالص کو مذکورہ شرائط و قیود کے ساتھ اپنا لینا اور ہر قسم کے شرک سے اپنے آپ کو بچا لینا اتنی بڑی نیکی ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی گناہ ٹھہر ہی نہیں سکتا، جیسا کہ حدیثِ ''بطاقہ'' کے مضمون سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہے، جس کی رُو سے بندہ کا "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی گواہی بایں طور دینا کہ اس سے کبھی شرک صادر نہ ہوا، اس کے گناہوں پر مشتمل ننانوے (۹۹) دفاتر پر بھاری ثابت ہوگیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ "لَا اِلٰــهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا اقرار اگر مکمل صدق، یقین، محبت اور کامل تعلق باللہ کے ساتھ ہوگا تو یہ عظیم الشان اوصاف اتنے بھاری ہیں کہ ان کی موجودگی میں گناہوں کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا، جبکہ گناہوں کا ارتکاب تب ہی ممکن ہوتا ہے جب توحید کے تعلق سے صدق و یقین میں ضعف آجائے، ایسی صورت میں جانبِ معصیت راجح و غالب آجائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ مذکورہ شرائط اور قیود کے بغیر "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" پڑھتے ہیں، وہ اس سے قطعاً مستفید نہیں ہوسکیں گے، چنانچہ بہت سے لوگ کلمہ پڑھتے ہیں لیکن اخلاص و یقین سے نا آشنا ہوتے ہیں، اور بہت سے لوگ محض رسماً یا عادۃً یا تقلیداً کلمہ پڑھتے ہیں اور توحید کا رنگ ان کے بشاشتِ قلوب میں خلط ملط نہیں ہوتا، ایسے لوگ قبر میں فرشتوں سے کہیں گے (ہم لوگوں سے جو کچھ سنتے تھے وہی کہا کرتے تھے) ان لوگوں کے بیشتر اعمال پر بھی تقلید اور آباء و اجداد کی پیروی کا رنگ غالب ہوتا ہے، ایسا عقیدہ و عمل قطعاً مفید نہیں ہے، اور اگر اس ضعفِ عقیدہ و عمل کے ساتھ ساتھ گناہوں کا ارتکاب و اصرار اور دل

① صحیح بخاری، کتاب اللباس (۵۸۲۷) صحیح مسلم، کتاب الایمان (۱۵۴/۹۴)۔

کی غفلت وقساوت بھی شامل ہوتو یہ چیزیں بندے کے لئے مزید وبال کا باعث بن جائینگی۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے: ''ایمان ظاہری سجاوٹوں اور تمناؤں کا نام نہیں ہے، بلکہ عقیدہ کی قوت وصلابت کا نام ہے جو دل میں رچ بس جائے، اور عمل اس کی تصدیق کرتے رہیں، اس کے بعد بندہ جو خیر کا عمل کرے گا وہ قابل قبول ہوگا، اور جو شر کا عمل کرے گا وہ مردود ہوگا۔''

بکر بن عبداللہ المزنی کا قول ہے: سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دیگر صحابہ پر کثرتِ صوم وصلاۃ کی وجہ سے سبقت نہیں لے گئے، بلکہ توحید اور عقیدہ کی قوت سے کہ جو دل میں ثابت اور راسخ ہو چکی تھی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ کلمہ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه'' جنت کے داخلے اور جہنم سے نجات کا سبب بھی ہے اور مقتضی بھی۔ لیکن یہ تب ہی ممکن ہوگا جب تمام شروط متحقق اور مجتمع ہوں، اور تمام رکاوٹیں زائل ہو جائیں، چنانچہ بہت سے لوگ کلمہ پڑھتے ہیں لیکن کوئی نہ کوئی شرط مفقود ہوتی ہے یا کوئی نہ کوئی مانع موجود ہوتا ہے، ایسے لوگوں کا کلمہ پڑھنا فائدہ مند نہیں ہوسکتا۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ سے کسی نے کہا: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جس نے ''لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه'' پڑھا وہ جنتی ہو گیا، انہوں نے جواب دیا: جنتی وہ ہوگا جس نے ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه'' پڑھا اور اس کے تمام حقوق وفرائض ادا کئے۔

وہب بن منبہ رحمہ اللہ (مشہور تابعی) سے کسی نے سوال کیا: کیا ''لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه'' جنت کی چابی نہیں ہے؟ فرمایا: کیوں نہیں لیکن ہر چابی کے دندانے ہوتے ہیں، اگر تم ایسی چابی لائے جس کے دندانے ہوئے تو یقیناً جنت کا دروازہ کھل جائے گا ورنہ ہرگز نہیں کھل سکتا۔

وہب بن منبہ رحمہ اللہ کی یہ بات کتاب وسنت کی نصوص سے ماخوذ ہے۔

چنانچہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے جنت کے داخلے کو ایمان کیساتھ ساتھ عملِ صالح پر مرتب ومشروط فرمایا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَـهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴾ ①

''بے شک جو لوگ ایمان لائے، اور نیک عمل کرتے رہے ان کی مہمان نوازی جنت الفردوس میں ہوگی''

صحیح بخاری ومسلم میں ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جو میرے جنت میں داخلے کا باعث بن جائے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اور اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ دو اور صلہ رحمی کرو'' ②

=

① (الکھف: ۱۰۷)

② صحیح بخاری، کتاب الجنائز (۱۳۹۶) صحیح مسلم، کتاب الایمان (۱۳) (الفاظ بخاری کے ہیں)

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ ﷺ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قَالَ قَالَ مُوْسٰی یَا رَبِّ عَلِّمْنِیْ شَیْئًا اَذْکُرُکَ وَ اَدْعُوْکَ بِہٖ قَالَ: قُلْ یَا مُوْسٰی " لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" قَالَ یَا رَبِّ کُلُّ عِبَادِکَ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا قَالَ یَا مُوْسٰی لَوْاَنَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعَ وَعَامِرَھُنَّ غَیْرِیْ وَالْاَرْضِیْنَ السَّبْعَ فِیْ کِفَّۃٍ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فِیْ کِفَّۃٍ مَالَتْ بِھِنَّ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (ابن حبان) ①

''ابوسعید خدری ﷺ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے پروردگار! مجھے ایسی چیز بتا جس سے تیری یاد کروں اور تجھ سے دعا کیا کروں، فرمایا اے موسیٰ (علیہ السلام) "لَآ اِلٰـــہَ اِلَّا اللّٰہُ" پڑھا کر ''موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے پروردگار! اسے تو تیرے سب بندے پڑھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور، ان میں رہنے والے مجھے چھوڑ کر اور ساتوں زمینیں، ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دی جائیں، اور دوسرے پلڑے میں صرف "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" رکھ کر وزن کیا جائے تو "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" والا پلڑا بھاری ہوگا۔

اس معنی میں اور بہت سی نصوص موجود ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ توحید کے اقرار واعتراف کے ساتھ ساتھ عملِ صالح بھی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بشر بن الخصاصیہ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیعت کے لئے آئے تو آپ ﷺ نے شہادتین کے ساتھ ساتھ نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ اور جہاد فی سبیل اللہ کی شرط لگائی، تو بشر نے کہا جہاد اور صدقہ کی مجھ میں طاقت نہیں ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جہاد اور صدقہ کے بغیر تم جنت میں کیسے داخل ہوگے؟ چنانچہ بشر نے ان تمام امور پر بیعت کرلی'' ②

اس سے ثابت ہوا کہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کے اقرار کے ساتھ ساتھ اعمالِ صالحہ کا اہتمام انتہائی ضروری اور اہم ہے۔

قولہ: عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ ﷺ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ......

یہ حدیث ابوسعید خدری ﷺ کی روایت سے ہے جن کا نام سعد بن مالک بن سنان تھا، یہ خود اور ان کے والد عظیم صحابہ میں شمار ہوتے تھے، جنگ احد میں چھوٹی عمر ہونے کے باعث شریک نہیں کئے گئے، لیکن بعد کے تمام غزوات میں شریک ہوئے، مدینہ منورہ میں ۶۳ھ میں انتقال ہوا، ۶۴ اور ۶۵ ھجری کا قول بھی ملتا ہے۔

① اس کی سند ضعیف ہے۔ صحیح ابن حبان (۲۳۲۴) مستدرك حاکم (۱/۵۲۸) اس کی سند میں دراج بن سمعان ضعیف راوی ہے، اس کی بہت منکر روایات ہیں۔ امام ہیثمی نے اس حدیث کی نسبت ابویعلیٰ کی طرف کی ہے، اور کہا ہے: ''اس میں ضعفاء ہیں'' مجمع الزوائد (۱۰/۸۲)

② یہ حدیث ضعیف ہے، مسند احمد (۲۲۰۱۱ ج۸) طبرانی کبیر (۱۲۳۳) مستدرك الحاکم (۲/۷۹) اس کی سند ضعیف ہے، اس میں ابن المثنی جسکا نام مؤثر ہے، مجہول راوی ہے۔ امام ھیثمی فرماتے ہیں مسند احمد کی سند کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ مجمع الزوائد (۱/۴۲)

اس حدیث کا مضمون یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ایک خاص ذکر عطا فرمانے کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" پڑھتے رہنے کا حکم دیا، جس پر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے پروردگارِ عالم! یہ ذکر تو تمام بندے پڑھتے ہیں، سنن نسائی اور مستدرک حاکم کی ایک روایت کے مطابق موسیٰ علیہ السلام نے کہا، مجھے کوئی ایسا ذکر عنایت ہو جو صرف میرے ہی پاس ہو، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ جواب دیا، اس جواب پر آگے بات کریں گے، یہاں دو باتوں پر غور کرتے جائیے۔

ایک یہ کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے جب ذکر عطا فرمانے کا سوال کیا، تو اللہ تعالیٰ نے "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ"، مکمل کلمہ کا ذکر عطا فرمایا جو اس بات کی دلیل ہے کہ ذکر کرنے والا مکمل "لَا اِلٰــہَ اِلَّا اللّٰہُ" کا ذکر کرے اس میں ان جُہال صوفیاء کا رد ہے جو کلمہ طیبہ میں تقطیع کرتے ہیں، یعنی کلمہ کے دو ٹکڑے کر کے دونوں کا الگ الگ ذکر کرتے ہیں، "لا اِلٰــہ" کا الگ اور "اِلا اللّٰہ" کا الگ یا صرف "ھو ھو" پکارتے ہیں، یہ سب بدعت وضلالت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کا ذکر کرنے کا حکم دیا تو موسیٰ علیہ السلام نے اسے ایک عام ذکر قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے کسی خاص ذکر کی استدعا کی جو کسی دوسرے کے پاس موجود نہ ہو، یہ بات انسان کی طبیعت میں داخل اور شامل ہے کہ وہ ایسی چیز پر خوش ہوتا ہے جو صرف اس کے پاس ہو، اور کسی دوسرے کے پاس نہ ہو، حالانکہ اللہ رب العزت کی سنت اور رحمت تو اس امر کی متقاضی ہے کہ بندوں میں جس چیز کی حاجت جس قدر شدید ہو، وہ چیز اسی قدر زیادہ موجود ہو، جیسے پانی اور نمک وغیرہ کہ یہ دونوں چیزیں شدتِ حاجت کی بناء پر ہر جگہ متوفر ہیں، بخلاف موتی اور یاقوت کے۔ (کہ وہ کم مقدار میں پائے جاتے ہیں)

اسی طرح کلمہ "لَا اِلٰــہَ اِلَّا اللّٰہُ" کا بکثرت موجود ہونا اسی حکمتِ اِلٰہیہ کا مظہر ہے کہ یہ تمام جہان اسی کلمہ کے ذکر کا محتاج ہے، چنانچہ اس کا پڑھنا انتہائی آسان، اور معنی انتہائی عظیم ہے، تو گویا ہمیں کلمہ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کا بکثرت ذکر کرنا چاہیے، مگر افسوس! کہ امرِ واقع یہ ہے کہ علماءِ سوء (اور شیطان کے چیلوں) نے عجیب وغریب اذکار، اوراد اور احزاب اختراع کر کے کتابوں میں شائع کر رکھے ہیں جن کی نہ کوئی اصل ہے اور نہ ہی کوئی حوالہ، لوگوں کو افضل الذکر سے غافل کر کے اپنے مصنوعی اذکار میں الجھا رکھا ہے، یہاں ایک المیہ یہ بھی ہے کہ بیشتر اذکار شرک وبدعت پر مبنی ہوتے ہیں۔ (واللہ المستعان)

....

....

....

....

....

....

....

....

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو "لَااِلٰـــہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی عظمت وفضیلت سے آگاہ کیا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "لَااِلٰـــہَ اِلَّا اللّٰہُ" ساتوں آسمانوں، ساتوں زمینوں اور انکی تمام مخلوقات سے بھاری ہے۔ مسند احمد کی ایک حدیث۔ جو بروایت سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مرفوعاً ثابت ہے۔ میں ہے کہ "نوح علیہ السلام نے اپنی موت کے وقت اپنے بیٹے سے فرمایا تھا: میں تمہیں "لَااِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ" پڑھنے کا حکم دیتا ہوں اس لئے کہ یہ ساتوں آسمان، اور زمینیں اگر ترازوں کے ایک پلڑے میں ہوں، اور "لَااِلٰـــہَ اِلَّا اللّٰہُ" دوسرے پلڑے میں ہو تو "لَااِلٰـــہَ اِلَّا اللّٰہُ" کا پلڑا بھاری ہوگا، اور اگر ساتوں آسمان اور زمینیں ایک حلقہ کی شکل میں ہوں تو "لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" انہیں توڑ کر ریزہ ریزہ کر دے۔" ①

یہ دونوں حدیثیں کلمہ "لَااِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی فضیلت وعظمت اور قوت بیان کر رہی ہیں، اس تمام تر فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ یہ کلمہ سب سے افضل موضوع، توحید باری تعالیٰ پر مشتمل ہے، اور توحید باری تعالیٰ پورے دین کی چوٹی اور ملت کی اساس ہے۔

حافظ ابنِ قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اعمال کا تفاضل ان کی ظاہری صورتوں، اور تعداد کی بناء پر نہیں ہے بلکہ دل کے راسخ عقیدہ کی بناء پر ہے، اور حدیثِ بطاقہ اس کی انتہائی قوی دلیل ہے، جس سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ انتہائی صدقِ قلب سے کلمہ پڑھنے پر گناہوں کے ننانوے دفاتر ہلکے پڑ گئے، لیکن ہر کلمہ گو کو یہ فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی، تو پھر ضروری ہے کہ ہم "لَااِلٰـــہَ اِلَّا اللّٰہُ" کے تمام تر تقاضوں کو سمجھیں اور پورا کریں۔ (واللہ ولی التوفیق)

---

① اس کی سند صحیح ہے، مسند احمد رقم (٦٥٩٤، مسند عمرو بن العاص) الادب المفرد للبخاری رقم (٥٤٨) مستدرك الحاكم (٤٨/١) مجمع الزوائد (٨٤/١٠)

وللترمذی وحسنہ :عَنْ اَنَسٍ ﷛ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ یَقُوْلُ" قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ یَاابْنَ آدَمَ لَوْ اَتَیْتَنِیْ بِقُرَابِ الْاَرْضِ خَطَایَا ثُمَّ لَقِیْتَنِیْ لَاتُشْرِكُ بِیْ شَیْئًا لَاَتَیْتُكَ بِقُرَابِھَا مَغْفِرَةً" ①

ترمذی میں حدیث ہے، جسے امام ترمذی نے حسن کہا ہے کہ، انس بن مالک ﷛ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے آدم کے بیٹے! اگر تو زمین بھر گناہ لیکر میرے پاس آجائے، اور تو نے شرک نہ کیا ہو، تو میں زمین بھر مغفرت کیساتھ تجھے ملوں گا۔''

اس حدیث کے راوی انس بن مالک ﷛ ہیں، جو انصاری، خزرجی صحابی ہیں اور نبی ﷺ کے خادم ہیں، دس سال نبی ﷺ کی خدمت کی، رسول اللہ ﷺ نے آپ کی مال واولاد اور عمر میں برکت کی دعا کی تھی، نیز جنت کے داخلے کی بھی ②

چنانچہ آپ کثیر المال اور کثیر الاولاد صحابی تھے، اور آپ کی عمر بھی سو سال سے متجاوز تھی ۹۲ یا ۹۳ ھجری میں آپ کا انتقال ہوا۔

مذکورہ حدیث، حدیثِ قدسی ہے جو ایک طویل حدیث کا جزء ہے، افادہ عام کی خاطر پوری حدیث کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے آدم کے بیٹے! تو جب تک مجھے پکارتا رہے، اور جب تک میرے ساتھ اُمیدیں وابستہ کیئے رکھے، تب تک میں تجھے بخشتا رہوں گا تیرے جیسے بھی اعمال ہوں، اور مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ اے آدم کے بیٹے! اگر تیرے گناہ آسمان کے کناروں کو چھونے لگیں، پھر تو مجھ سے استغفار کرلے تو میں تجھے معاف کردونگا۔ اے آدم کے بیٹے! اگر تو زمین بھر گناہوں کے ساتھ میرے پاس آئے اور تو نے شرک نہ کیا ہو تو میں زمین بھر مغفرت کے ساتھ تجھے ملوں گا۔''

یہ حدیث توحید کی عظمت وفضیلت کی زبردست دلیل ہے، اس حدیث میں حصولِ مغفرت کی ایک کڑی شرط مذکور ہے، اور وہ یہ ہے کہ چھوٹے، بڑے، کم اور زیادہ ہر قسم کے شرک سے پاک ہونا، اور یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر ناممکن ہے، جو شخص اس انداز سے شرک سے بچالیا گیا تو اس کا قلب، قلبِ سلیم ہے جو مستحقِ نجات ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ . اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴾ ③

''اس دن مال واولاد نفع نہیں دیں گے (نفع میں تو وہ شخص رہے گا) جو اللہ کے پاس قلبِ سلیم لایا''

① سنن ترمذی (۳۵۴۰) امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔ مسند احمد (۲۱۳۶۹، مختصراً، مسند ابوذر) سنن الدارمی (۳۲۲/۲) مستدرك الحاكم (۲۴۱/۴) مجمع الزوائد (۲۱۶/۱۰)

② صحیح بخاری، کتاب الدعوات (٦٣٣٤) صحیح مسلم، کتاب المساجد (٦٦٠)

③ (الشعراء: ۸۸-۸۹)

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جو شخص توحیدِ خالص سے آراستہ ہے، لیکن توحید کے ساتھ ساتھ زمین بھر گناہوں کا بھی مرتکب ہے، اللہ تعالیٰ زمین کا دامن بھر کے اسے مغفرت عطا فرمائے گا، لیکن یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، چاہے تو معاف کردے، اور چاہے تو گناہوں پر پکڑ لے، لیکن توحید کی برکت سے اس کے لئے جہنم کا خلود نہیں ہے، بلکہ جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کردیا جائے گا۔ جس شخص کی توحید مکمل ہو، اللہ تعالیٰ کے لئے اخلاص بھی موجود ہو اور وہ دل، زبان اور بقیہ اعضاء کے ساتھ توحید کی شرائط پر قائم بھی ہو، یا موت کے وقت وہ دل اور زبان کے ساتھ توحید کی گواہی پر قائم ہو تو یہ تمام چیزیں بندے کے لئے اس کے تمام گناہوں کی مغفرت، اور جہنم سے بچاؤ کا موجب بن جائیں گی۔ جس شخص کا دل کلیۃً کلمہ توحید سے لبریز ہو جائے تو اس دل سے ازروئے محبت وتعظیم واجلال ومہابت وخشیت وتوکل ہر ماسوی اللہ نکل جائے گا، پھر یہ توحیدِ خالص اس کے تمام گناہوں کو خواہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر کیوں نہ ہو جلا کر راکھ کردے گی، بلکہ بعض اوقات نیکیوں سے بدل ڈالے گی، یہ توحید تو وہ اکسیرِ اعظم ہے کہ جس کا ایک ذرہ اگر گناہوں اور معصیتوں کے پہاڑ پر رکھ دیا جائے تو اس کا نور انہیں نیکیوں میں بدل ڈالے۔ (جعلنا اللہ من عبادہ الموحدین المخلصین)



اس باب کے مسائل

(۱) اللہ تعالیٰ کے فضل کی وسعت کا علم ہوا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے ہاں توحید کے ثواب کی کثرت کا علم ہوا۔

(۳) یہ نکتہ بھی معلوم ہوا کہ عقیدہ توحید کثرتِ ثواب کے ساتھ ساتھ گناہوں کا بھی کفارہ ہے۔

(۴) (لفظِ ظلم کے حوالے سے) سورۃ الأنعام کی آیت نمبر (۸۲) کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۵) حدیث عبادۃ بن صامت میں جن پانچ چیزوں کی گواہی، اوراس کی فضیلت کا ذکر ہے اس پہ غوروفکر کیجئے (ان تمام امور کو صدقِ قلب کے ساتھ اپنالینا چاہئے)

(۶) حدیثِ عبادۃ اور حدیثِ عتبان اور مابعد کی تمام احادیث ملانے سے "لَااِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا معنی بخوبی واضح ہوگیا، نتیجۃً ان احادیث کے حوالہ سے دھوکہ میں مبتلا لوگوں (جیسے مرجئہ وغیرہ) کی غلطی بھی واضح ہوگئی (تفصیل پچھلے صفحات میں مذکور ہے)۔

(۷) حدیثِ عتبان میں ''لا الٰہ الا اللہ'' کی جو شرط مذکور ہے اس پر خوب متنبہ ہونے کی ضرورت ہے (وہ شرط یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے کلمہ پڑھا جائے)۔

(۸) انبیاء کرام علیہم السلام بھی ''لا الٰہ الا اللہ'' کی فضیلت جاننے کے محتاج تھے (سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی حدیث کی طرف اشارہ ہے)۔

(۹) اس بات پر متنبہ ہونے کی ضرورت ہے کہ جب یہ بات معلوم ہے کہ کلمہ "لَااِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" تمام مخلوقات سے بھاری اوروزنی ہے، مگراس کے باوجود بہت سے کلمہ گوافراد کا میزان ہلکا ہوگا (اصل وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ کلمہ کا معنی سمجھنے، اوراس کے تقاضے اور شرائط پورا کرنے سے قاصر رہے، اور محض زبان سے کلمہ پڑھنے پراکتفاء کرلیا)۔

(۱۰) سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ والی حدیث سے نصاً یہ بات ثابت ہوگئی کہ آسمانوں کی طرح زمینیں بھی سات ہیں۔

(۱۱) یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ تمام زمینوں اور آسمانوں میں آبادیاں موجود ہیں۔

(۱۲) اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا اثبات معلوم ہوا جن کا اشاعرہ انکار کرتے ہیں۔

(۱۳) اگر آپ کو حدیثِ انس ﷺ کی معرفت حاصل ہو جائے تو آپ بخوبی یہ بات جان لیں گے کہ حدیثِ عتبان میں نبی ﷺ کے فرمان: "فَاِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَبْتَغِيْ بِذٰلِكَ وَجْهَ اللّٰهِ" سے مراد محض زبان سے کلمہ پڑھنا نہیں ہے، بلکہ کلیۃً شرک کو چھوڑ دینا ہے۔

(۱۴) سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور سیدنا محمد ﷺ دونوں کو اللہ کا بندہ اور رسول کہا گیا ہے، اس کی معنویت اور حکمت پر خوب غور کیجئے۔

(۱۵) سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا کلمۃ اللہ ہونا معلوم ہوا۔

(۱۶) سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا روح اللہ ہونا بھی معلوم ہوا۔

(۱۷) جنت اور جہنم کے وجود پر ایمان لانے کی فضیلت معلوم ہوئی۔

(۱۸) نبی ﷺ کے فرمان [عَلٰى مَاكَانَ مِنَ الْعَمَلِ] کی معرفت حاصل ہوئی (جس کا خلاصہ یہ ہے کہ موحد سے جیسے بھی اعمال صادر ہوں، اس کے لئے تمام گناہوں کی بخشش ہے۔ جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں مرقوم ہے، بالخصوص حافظ ابن رجب رحمہ اللہ کا قول دیکھئے)۔

(۱۹) یہ بات معلوم ہوئی کہ ترازو کے دو پلڑے ہیں۔

(۲۰) اللہ تعالیٰ کے لیئے صفت "الوجہ" (یعنی چہرہ) کے اثبات کی معرفت حاصل ہوئی۔



باب من حقق التوحید دخل الجنة بغیر حساب

توحید خالص کو کما حقہ اپنانے والا بلا حساب جنت میں داخل ہوگا

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ ①

''بے شک ابراھیم پیشوا، اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار، اور ایک طرف مخلص تھے، اور مشرکوں میں سے نہیں تھے''

بلا حساب جنت میں داخل ہونے کا معنیٰ

بلا حساب سے مراد بلا عذاب ہے، کیونکہ کتاب وسنت کے ادلہ سے یہ بات ثابت ہے کہ حساب تو سب کا ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ ②

یعنی: ''ہم تمام اُمتیوں اور نبیوں سے سوال کریں گے۔''

البتہ توحیدِ خالص اپنانے والوں پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی لطف وکرم ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ انہیں آسان حساب کے مرحلے سے گزار کر بلا عذاب جنت میں داخل کردے گا۔ اب یہ سمجھنا ضروری ہے کہ کما حقہ توحید اپنانے سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد توحید کی معرفت ہے، اور اس کی حقیقت کو پہچان لینے کے بعد اس پر علماً اور عملاً قائم ہوجانا ہے۔ حقیقت توحید یہ ہے کہ بندے کی روح اللہ تعالیٰ کی طرف از روئے محبت، خوف، انابت، توکل، دعا، اخلاص، خوف وہیبت اور تعظیم عبادت، کھچتی چلی جائے، اس طرح کہ اس کے دل میں غیر اللہ کے لئے کچھ باقی نہ رہے، اور یہ تعلق ایسا مستحکم ہوجائے کہ دل اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ اشیاء کا ارادہ کرنا ہی چھوڑ دے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے مامورات میں سے کسی امر کے حوالے سے کراہت وناپسندیدگی کا کوئی جذبہ باقی نہ رہے، اگر آپ غور کریں تو کلمہ ''لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه'' کی حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ ''اِلٰـه'' سے مراد ''مالوہ'' یعنی معبود ہے،

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

فَلِوَاحِدٍ كُنْ وَاحِدًا فِيْ وَاحِدٍ   اَعْنِيْ سَبِيْلَ الْحَقِّ وَالْاِيْمَانِ

''اس ذات واحد کیلئے تم بھی سب سے کٹ کر ایک ہوجاؤ، ایک ہی راہ پر چلتے ہوئے یعنی حق وایمان کی راہ۔''

---

① (النحل ۱۲۰) ② (الاعراف: ٦)

جو بندہ توحید کی اس حقیقت کو سمجھ کر اپنا لے گا وہ ان ستر ہزار افراد میں شامل ہو جائے گا جو کسی حساب کی دشواری، اور کسی عذاب میں مبتلا ہوئے بغیر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

سیدنا ابراھیم علیہ السلام کے اوصافِ حمیدہ

اس آیتِ کریمہ کی باب سے مناسبت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں سیدنا ابراھیم علیہ السلام کی چند عظیم الشان صفات کا تذکرہ فرمایا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ توحید کے کتنے اعلیٰ درجے پر فائز تھے، اسی طرح اتباعِ اوامر اور ترکِ نواہی کے ذریعے مقامِ عبودیت پر کس قدر استقامت تھی، چنانچہ جو سیدنا ابراھیم علیہ السلام کے اس منہج کا پیروکار رہو گا وہ بلا عذاب جنت میں داخل ہوگا، جیسا کہ سیدنا ابراھیم علیہ السلام داخل ہوں گے۔

اس آیتِ کریمہ میں سیدنا ابراھیم علیہ السلام کی چار صفات مذکور ہیں:

(۱) "أُمَّةً" یعنی وہ لوگوں کے لئے امام، معلم اور قدوۃ تھے جن کی زندگی کی ہر خصلت لائقِ اتباع ہوتی ہے۔

(۲) "قَانِتًا لِلّٰهِ" یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے، اور اس کی مکمل اطاعت کرنے والے تھے، "قَانِتٌ" کا اصل معنی اطاعت وعبادت پر ہمیشگی اختیار کرنے والا ہے۔

(۳) "حَنِيْفًا" یعنی شرک اور ہر قسم کے باطل عقائد سے مائل، اور منحرف ہونے والے، اور ان سے منحرف ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے والے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ ①

''میں اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا، یکسو ہو کر، اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں''

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ﴾ ②

''پس آپ یکسو ہو کر اپنا منہ دین کی طرف متوجہ کر دیں''

(۴) "وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" یعنی ابراھیم علیہ السلام مشرکین میں سے نہ تھے، یعنی ایسے موحّد خالص تھے جن میں شرک کی ذرہ برابر بھی آمیزش نہیں تھی۔

=

① (الانعام : ۷۹)

② (الروم: ۳۰)

وقوله تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِينَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ ﴾ ①

''اور جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔''

=

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے کفارِ قریش کی تردید کی ہے، وہ اپنے آپ کو ملتِ ابراھیمی کا پیرو کار قرار دیتے تھے، اللہ تعالی نے فرمایا کہ ابراھیم علیہ السلام تو ہر قسم کے شرک سے پاک تھے، تو پھر یہ مشرکین مکہ ان کے پیروکار کیسے ہو سکتے ہیں، ان کا پیروکار تو وہ ہے جو ان کے منہج یعنی شرک اور اہل شرک سے بیزار ہو کر توحید خالص پر قائم ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراھیم علیہ السلام کو اکیلا ہونے کے باوجود پوری امت قرار دیا، اس سے ان لوگوں کو تسلی دینا مقصود ہے جو اس راہِ سدید کے سالک ہیں، کہ وہ اس راہ پر چلنے والے تھوڑے لوگوں کو دیکھ کر وحشت میں مبتلا نہ ہو جائیں، اس راہ پر چلنے والا ایک ایک شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک پوری امت کا وزن رکھتا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ: "وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ" ''ابراھیم علیہ السلام مشرکین میں سے نہیں تھے''، میں اسی نکتے کو مزید واضح کیا گیا ہے، چنانچہ باطل کی تعداد اگرچہ بہت ہوتی ہے لیکن راہِ حق کا سالک اس تعداد سے دھوکہ نہیں کھاتا، اور اس کا باطل سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

وقوله:قوله تعالیٰ: وَالَّذِينَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ

اس آیت کریمہ کی مذکورہ باب سے مطابقت واضح ہے، چنانچہ اللہ رب العزت نے ان مومنین کے اوصاف بیان فرمائے ہیں جو جنت کی طرف سبقت کرنے والے ہیں، ان کا جنت میں داخل ہونا کچھ اوصاف کی بناء پر ہے، اور سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ اللہ رب العزت کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہیں کرتے، نہ شرک جلی اور نہ شرک خفی۔

جس شخص کے عقیدے کا یہ عالم ہو کہ وہ اس انداز سے توحید کو سمجھ کر اس پر کاربند ہو جائے، تو وہ اللہ رب العزت سے بڑا عظیم سودا یعنی جنت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اور اسے کسی مشکل حساب یا عذاب کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے: ''کہ وہ لوگ کسی غیر اللہ کی عبادت نہیں کرتے، بلکہ اللہ رب العزت کی توحید کی مکمل معرفت رکھتے ہیں، اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ ہر قسم کے ہمسر (شریک) اور نظیر سے پاک ہے، اس کی کوئی بیوی اور اولاد بھی نہیں ہے''

① (المؤمنون: ٥٩)

عن حصين بن عبد الرحمن قال كنت عند سعيد بن جبير فقال :اَيُّكُمْ رَأَى الكَوْكَبَ الَّذِى اِنْقَضَّ الْبَارِحَةَ ؟ فَـقُلْتُ اَنَا ثُمَّ قُلْتُ : أَمَّا اِنِّى لَمْ اَكُنْ فِى صَلٰوةٍ وَلٰكِنِّى لُدِغْتُ قَالَ فَمَا صَنَعْتَ ؟ قُلْتُ اِسْتَرْقَيْتُ . قَالَ فَمَا حَمَلَكَ عَلٰى ذٰلِكَ ؟ قُلْتُ حديث حدثناه الشعبى . قَالَ : مَاحَدَّثَكُمْ الشعبى ؟ قُلْتُ:حدثنا عن بريدة ابن الحصيب اَنَّهٗ قَالَ :" لاَرُقْيَةَ اِلَّا مِنْ عَيْنٍ اَوْ حُمَةٍ". فَقَالَ :قَدْ اَحسَنَ مَنِ انْتَهٰى اِلٰى مَا سَمِعَ وَلٰكِنْ حدثنا ابن عباس عن النبى ﷺ قَالَ:" عُرِضَتْ عَلَىَّ الْاُمَمُ فَرَأَيْتُ النَّبِىَّ مَعَهُ الرَّهْطُ وَالنَّبِىَّ وَمعَهُ الرَّجُلُ وَالرَّجُلَان وَالنَّبِىَّ وَلَيْسَ مَعَهٗ اَحَدٌ ،اِذْ رُفِعَ لِى سَوَادٌ عَظِيمٌ فَظَنَنْتُ اَنَّهُمْ اُمَّتِىْ فَقِيلَ لِىْ هٰذَا مُوْسٰى وَقَوْمُهٗ . فَنَظَرْتُ فَاِذَا سَوَادٌ عَظِيمٌ فَقِيلَ لِىْ هٰذِهٖ اُمَّتُكَ وَمَعَهُمْ سَبْعُوْنَ اَلْفًا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ وَلَا عَذَابٍ . " ثُمَّ نَهَضَ فَدَخَلَ مَنْزِلَهٗ فَخَاضَ النَّاسُ فِى اُوْلٰئِكَ فَقَالَ بَعْضُهُمْ: فَلَعَلَّهُمُ الَّذِيْنَ صَحِبُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَقَالَ بَعْضُهُمْ: فَلَعَلَّهُمُ الَّذِيْنَ وُلِدُوْا فِى الْاِسْلَامِ فَلَمْ يُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا وَذَكَرُوْا أَشْيَاءَ . فَخَرَجَ عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاَخْبَرُوْهُ فَقَالَ :"هُمُ الَّذِيْنَ لَايَسْتَرْقُوْنَ وَلَا يَكْتَوُوْنَ وَلَايَتَطَيَّرُوْنَ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ . "فَقَامَ عُكَاشَةُ بْنُ مِحْصَنٍ فَقَالَ اُدْعُ اللّٰهَ اَنْ يَجْعَلَنِى مِنْهُمْ . قَالَ :"اَنْتَ مِنْهُمْ" ثُمَّ قَامَ رَجُلٌ اٰخَرُ فَقَالَ: اُدْعُ اللّٰهَ اَنْ يَجْعَلَنِىْ مِنْهُمْ فَقَالَ:"سَبَقَكَ بِهَا عُكَاشَةُ۔ " ①

حصین بن عبد الرحمٰن فرماتے ہیں : کہ ایک دفعہ میں سعید بن جبیر کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا تو انہوں نے سوال کیا کہ گزشتہ رات ایک ستارہ ٹوٹا تھا وہ تم میں سے کس نے دیکھا ؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے دیکھا تھا، پھر عرض کیا کہ اس وقت میں نماز نہیں پڑھ رہا تھا، بلکہ کسی زہریلی چیز کے ڈس لینے کی وجہ سے تکلیف کی بنا پر جاگ رہا تھا، سعید نے فرمایا، پھر تم نے کیا کیا؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے کسی ساتھی سے دم کروالیا تھا، فرمایا تم نے دم کیوں کرایا؟ میں نے عرض کیا کہ اس ایک حدیث کی بناء پر جو مجھے امام شعبی نے روایت کی ہے، فرمایا انہوں نے تمہیں کیا حدیث سنائی ؟ میں نے عرض کیا، انہوں نے بریدہ بن حصیب الاسلمی ؓ سے روایت کی، فرماتے ہیں کہ'' دم تو صرف نظر بد یا کسی زہریلی چیز کے کاٹے پر ہے'' سعید نے فرمایا، جو شخص کسی حدیث کو سن کر اس پر عمل پیرا ہو جائے پس اس نے بہت اچھا

---

① صحیح بخاری ،کتاب الرقاق(٦٥٤١) صحیح مسلم ،کتاب الایمان (٢٢٢)

کیا۔لیکن ہمیں تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ سے ایک حدیث بیان فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھ پر بہت سی امتیں پیش کی گئیں، چنانچہ میں نے کسی نبی کو دیکھا کہ اسکے ساتھ چند افراد پر مشتمل ایک جماعت ہے، اور کسی نبی کو دیکھا کہ اس کے ساتھ ایک یا دو آدمی ہیں اور کسی نبی کو دیکھا کہ وہ تنہا ہے، اور اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں، پھر یکایک میرے سامنے ایک بہت بڑی جماعت آئی جسے دیکھ کر میں نے خیال کیا کہ یہ میری امت ہے، لیکن مجھے بتایا گیا کہ یہ تو موسیٰ علیہ السلام اور انکی قوم ہے، پھر میں نے ایک اور بہت بڑی جماعت دیکھی، اور مجھے بتایا گیا کہ یہ آپ کی امت ہے، انکے ساتھ ستر ہزار افراد ایسے بھی تھے جو بلا کسی حساب، اور عذاب کے جنت میں داخل ہوں گے۔'' پھر رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور اپنے گھر تشریف لے گئے، اور صحابہ کرام ان ستر ہزار افراد کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنے لگے، کسی نے کہا یہ وہ لوگ ہو سکتے ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل ہے، اور کسی نے کہا یہ وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو اسلام میں پیدا ہوئے، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کبھی کسی قسم کا شرک نہیں کیا (بعض صحابہ نے) کچھ اور باتیں بھی کی، پھر رسول اللہ ﷺ دوبارہ تشریف لے آئے تو صحابہ کرام نے اپنی باتوں سے آپ ﷺ کو آگاہ کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ تو وہ لوگ ہیں جو دم نہیں کرواتے اور اپنے جسموں پر آگ سے داغ نہیں لگواتے، اور فال نہیں لیتے، اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔'' عکاشہ بن محصن کھڑے ہوئے اور کہا: یا رسول اللہ ﷺ! دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان میں شامل فرمالے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو انہی میں سے ہے''، پھر ایک اور شخص کھڑا ہوا، اور کہا کہ میرے لئے بھی یہ دعا فرما دیجئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے عکاشہ سبقت لے گیا۔''

یہ حدیث بخاری شریف میں مختصراً و مطولاً (دونوں طرح) وارد ہوئی ہے، اس کے علاوہ صحیح مسلم میں بھی ہے اور مذکورہ بالا الفاظ صحیح مسلم ہی کے ہیں، ترمذی اور نسائی میں بھی یہ روایت موجود ہے۔

حصین بن عبدالرحمٰن کا کوفہ کے ثقہ علماء میں شمار ہوتا ہے، البتہ آخر عمر میں متغیر الحفظ ہو گئے تھے، ۱۳۶ھ میں انتقال ہوا، جبکہ سعید بن جبیر بہت بڑے امام اور فقیہ تھے، ان کا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوتا ہے، انہیں ۹۵ھ میں حجاج بن یوسف کے سامنے قتل کر دیا گیا تھا۔

مذکورہ روایت میں جب سعید بن جبیر نے گزشتہ رات ستارے کے ٹوٹنے کی بابت سوال کیا تو حصین بن

عبدالرحمٰن نے جواب دیا کہ میں نے اس ستارے کا ٹوٹنا دیکھا تھا، ساتھ ہی کہا کہ میں اس وقت نماز نہیں پڑھ رہا تھا بلکہ ایک زہریلی اور مُوذی چیز کے ڈس لینے کی وجہ سے تکلیف کے باعث جاگ رہا تھا، انکا مقصد یہ تھا کہ لوگ انکے اتنی رات جاگنے سے یہی سمجھیں گے کہ وہ قیام اللیل کر رہے ہوں گے اگرچہ وہ تہجد گزار تھے، مگر چونکہ اس وقت نماز نہیں پڑھ رہے تھے، لہذا یہ وضاحت کردی جو اس بات کی دلیل ہے کہ سلف صالحین کسقدر صادق القول اور مخلص تھے، کسقدر ریاء کاری سے بچتے تھے، آجکل تو لوگ اپنی تعریفوں کے خود ہی پل باندھتے ہیں، بڑے بڑے دانوں کی تسبیحیں اٹھائے پھرتے ہیں، مقصود لوگوں کو بتانا ہوتا ہے کہ وہ تسبیح میں مصروف ہیں، اور ان دانوں کی تعداد کے برابر تسبیح کرتے ہیں، جبکہ صحابی رسول سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷜ ایک عورت کے پاس سے گزرے جو تسبیح کے دانوں پر ذکر کررہی تھی تو آپ نے اسے کاٹ کر پھینک دیا، پھر ایک اور شخص کے پاس سے گزرے جو کنکریوں پر تسبیحات پڑھ رہا تھا تو آپ نے اسے پاؤں سے ٹھوکر ماری، اور فرمایا: تم نے ظلم کرتے ہوئے ایک بدعت کو جاری کیا ہے، تم تو ازروئے علم اصحاب محمد ﷺ پر بھی سبقت لے گئے۔① (والعیاذ باللہ)

سعید بن جبیر ﷫ کے پوچھنے پر حصین بن عبدالرحمٰن نے بتایا کہ میں نے بچھو کے کاٹے پر کسی ساتھی کو طلب کرکے اس سے دم کروالیا تھا، جس کی انہوں نے دلیل طلب کی، یہ بھی علماء سلف کا منہج تھا کہ وہ عمل کی حجت اور دلیل طلب کیا کرتے تھے، چنانچہ حصین ﷜ نے بریدہ بن حصیب الأسلمی ﷜ کی مذکورہ بالا حدیث بیان کردی جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ دم تو صرف نظر بد اور زہریلے جانور کے کاٹے پر ہے'' ②

یعنی ان دو چیزوں پر دم بہت زیادہ نافع اور باعث شفا ہے، اس حدیث کی تفصیل آگے ایک مستقل باب میں آئے گی۔

سعید بن جبیر ﷫ نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس دلیل پہنچے، اور وہ اس کو اپنا لے تو یہ بہت اچھا اور درست اقدام ہے، البتہ وہ شخص قابل مذمت ہے جو دلیل کی بناء پر نہیں بلکہ جہلاً وتقلیداً کوئی عمل کرنے لگے، اور وہ شخص بھی قابل مذمت ہے جو دلیل جان لینے کے باوجود عمل نہیں کرتا، اس سے سلف صالحین کے منہج کا پتہ چلتا ہے، ان کے عمل کی اساس دلیلِ کتاب وسنت تھی۔ واللہ ولی التوفیق۔

سعید بن جبیر ﷫ نے سیدنا عبداللہ بن عباس ﷠ کی حدیث پیش کی، سیدنا عبداللہ بن عباس ﷠ نبی ﷺ کے چچا کے بیٹے تھے نبی ﷺ نے ان کے لئے یہ دعا فرمائی تھی:

① یہ اثر حسن درجہ کا ہے۔ سنن دارمی (۶۸/۱، ۶۹) "البدع" (۸-۱۳)

② اس کی سند صحیح ہے۔ مسند احمد (۱۹۲۹، ۱۹۹۵۰، ۲۲۲۳۰ ج ۷، مسند عمران بن حصین) سنن ابی داؤد (۳۸۸٤) سنن ترمذی (۲۰۵۷)

"اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِیْ الدِّیْنِ وَ عَلِّمْهُ التَا وِیْل" ①

''اے اللہ اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور تفسیر کا علم سکھا''

امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے، اگر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہماری عمر کے بقدر نبی علیہ السلام کی صحبت پا لیتے تو ہم میں سے کسی کے پاس اس کے علم کا دسواں حصہ بھی نہ ہوتا، ان کا ۶۸ھ میں مقام طائف پر انتقال ہوا۔

مذکورہ بالا حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا کہ ''مجھ پر بہت سی اُمتیں پیش کی گئیں'' یہ معاملہ معراج کی رات ہوا جیسا کہ سنن ترمذی اور سنن نسائی کی روایت میں صراحت ہے۔ ②

اس حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ انبیاء کرام اپنے پیروکاروں کی تعداد کے اعتبار سے متفاوت تھے، چنانچہ ایسے نبی بھی گزرے جن کے پیروکار محض ایک رھط تھے، رھط اس جماعت کو کہتے ہیں جس کی تعداد دس سے کم ہو، کچھ ایسے انبیاء علیہم السلام بھی گزرے جن کا کوئی پیروکار نہیں تھا، یہ حدیث ان لوگوں پر بہت بڑا رد ہے جو کثرت تعداد کو حجت سمجھتے ہیں، جن کا عقیدہ یہ ہے کہ حق اکثریت میں محصور ہے، یہ عقیدہ باطل ہے، حق تو کتاب و سنت کی اتباع ہے۔

اُمتِ محمد یہ سے ستر ہزار افراد کے بلا حساب جنت میں داخل ہونے کا بیان

اس حدیث کا مرکزی موضوع یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت جو ایک بڑے انبوہ پر مشتمل ہے میں ستر ہزار افراد ایسے ہیں جو بلا حساب و عذاب جنت میں داخل ہوں گے، صحیحین کی ایک حدیث کے مطابق ان کے چہرے چودہویں کے چاند کی طرح روشن ہوں گے۔ ③

جبکہ ایک اور حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جنت میں داخل ہونے والا پہلا گروہ ہوگا۔ ④

واضح ہو کہ بعض احادیث میں ستر ہزار سے زیادہ تعداد بھی ثابت ہے، چنانچہ مسند احمد کی ایک حدیث کے الفاظ ہیں: "فَاسْتَزَدْتُ رَبِّیْ فَزَادَنِیْ مَعَ کُلِّ اَلْفِ سَبْعِیْنَ اَلْفًا" ⑤

یعنی: ''میں نے اپنے رب سے اس تعداد کو بڑھا دینے کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کرتے ہوئے تعداد بڑھا دی، ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار مزید''

① حدیث صحیح ہے۔ مسند احمد (۲۳۹۷، ۲۸۸۱، ۳۰۲۳، ۳۰۳۳، ۳۱۰۲ ج ۱، مسند ابنِ عباس رضی اللہ عنہ)

② سنن ترمذی (۲۴۴۶) امام ترمذی نے اسے "حسن صحیح" کہا ہے۔

③ صحیح بخاری، کتاب اللباس (۵۸۱۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان (۲۱۶/۳۶۹) الفاظ "صحیح مسلم" کے ہیں۔

④ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق (۳۲۴۶) صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها۔

⑤ مسند احمد (۸۷۱۵ ج ۳، مسند ابی هریرة رضی اللہ عنہ) حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اسکی سند جید ہے، فتح الباری (۳۱۰/۱۱)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔
جبکہ ترمذی، طبرانی اور ابن حبان وغیرہ میں ابوامامۃ الباھلی رضی اللہ عنہ سے مرفوعا مروی ہے ''نبی ﷺ نے فرمایا:
'': میرے پروردگار نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ میری امت میں سے ستر ہزار افراد کو بلا حساب وعذاب جنت میں داخل فرمائے گا، اور ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار مزید داخل فرمائے گا، اور اس کے بعد میرے رب کے تین چلو مزید ہوں گے جو بلا حساب وعذاب جنت میں داخل ہونگے'' ①

بلا حساب جنت میں داخل ہونے والوں کے اوصاف

اس گروہ کی رسول اللہ ﷺ نے چار صفات بیان کی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے

(۱) پہلی صفت یہ ہے کہ وہ دم جھاڑ نہیں کراتے، یہاں دو الفاظ قابل غور ہیں۔

(۱) رقیہ (۲) استرقاء

حدیث میں استرقاء کی ممانعت ہے جس کا معنی کسی سے دم کروانا یا کسی سے دم کرنے کے لئے کہنا، یہ اس لئے معیوب قرار دیا گیا کہ دوسروں کو دم کیلئے کہنے والا غیر اللہ کی طرف متوجہ اور ملتفت ہے جو غیرتِ توحید کے منافی ہے، جبکہ ''رقیہ'' یعنی از خود کسی کو دم کرنا ایک مستحسن امر ہے، صحابہ کرام نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ اگر ہم اپنے کسی بھائی کی عیادت کیلئے جائیں تو اسے دم کر سکتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" مَنِ اسْتَطَاعَ مِنكُمْ اَنْ يَّنْفَعَ اَخَاهُ فَلْيَنْفَعْهُ " ②

یعنی: ''جو اپنے بھائی کو کوئی نفع پہنچانے کی طاقت رکھتا ہو تو ضرور پہنچا دے''

گویا رقیہ تو اپنے بھائی پر ایک احسان ہے، اور استرقاء تمام توکل کے منافی ہے۔ واللہ اعلم!

(۲) "ولا یکتوون" یعنی وہ لوگ دوسروں کو اپنے جسم پر آگ سے داغ لگانے کا نہیں کہتے، جیسا کہ وہ دوسروں کو اپنے جسم پر دم کرنے کا نہیں کہتے، اس میں ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کی قضاء پر راضی ہونا اور جس تکلیف میں مبتلا ہیں اس پر یہ سوچ کر لذت حاصل کرنا کہ یہ تکلیف کسقدر گناہوں کا کفارہ بنے گی۔
واضح ہو کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم پر داغ لگانا جائز ہے یہ عمل "الکی" کہلاتا ہے، "الکی" کا دوسرا معنی یہ بھی ہے کہ از خود کسی مریض کو داغ لگانا، یہ بہت سی احادیث سے ثابت ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک طبیب بھیجا جس نے انہیں آگ

① طرق وشواہد کی بناء پر صحیح ہے، مسند احمد (۵/۲۶۸) سنن ترمذی (۲۴۳۷) صحیح ابن حبان (۲۶۴۲ عن ابی امامة

② صحیح مسلم، کتاب السلام (۶۳/۲۱۹۹)

سے داغ لگایا۔ ①

اس کے علاوہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو "ذات الجنب" کی تکلیف سے داغ لگایا گیا تھا۔ ②

نبی ﷺ نے خود اپنے صحابی اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کو اپنے ہاتھ سے داغ لگایا۔ ③

البتہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ شفا تین چیزوں میں ہے: (۱) شہد پینا، (۲) سنگی لگوانا، (۳) اور آگ سے داغنا، اور میں اپنی امت کو آگ سے داغنے سے روکتا ہوں۔ ایک حدیث میں یہ لفظ بھی ہیں کہ آگ سے داغ لگوانا مجھے پسند نہیں ہے۔ ④

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے ان تمام احادیث میں بڑی عمدہ تطبیق دی ہے، فرماتے ہیں کہ: احادیث "الکی" چار طرح سے وارد ہیں، ایک یہ کہ آپ ﷺ نے یہ عمل کیا، دوسری یہ کہ آپ ﷺ نے اس عمل سے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، تیسری یہ کہ آپ ﷺ نے اس عمل کو چھوڑنے والوں کی تعریف کی، اور چوتھی یہ کہ آپ ﷺ نے اس عمل سے منع فرمایا۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے، چنانچہ آپ کا یہ عمل کرنا اسکے جواز کی دلیل ہے، اس کو ناپسند فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ناجائز نہیں ہے، اور اس عمل کو چھوڑنے والوں کی تعریف کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس عمل کا نہ کرنا افضل ہے، اور اس عمل سے روکنا اظہارِ کراہت ہے۔

(۳) تیسری خوبی "وَلَا يَتَطَيَّرُوْنَ" ہے یعنی وہ لوگ پرندوں سے فال نہیں لیتے، اس کا بیان آگے ایک مستقل باب میں آئیگا۔

(۴) چوتھی خوبی "وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ" ہے یعنی وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں، توکل درحقیقت وہ اصل جامع ہے جس پر سابقہ تینوں امور کی بنیاد ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ پر توکل خلاصہ توحید ہے بلکہ توحید کی وہ بلند چوٹی ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت، خوف، رجاء اور رضاء کے ثمرات پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے، اور بعض بندوں کو یہ توکل ایسے مقام پر پہنچا دیتا ہے کہ انہیں تکلیفوں پر لذت محسوس ہوتی ہے، بلکہ وہ تکلیفوں اور آزمائشوں کو اللہ تعالیٰ کی نعمت تصور کرتے ہیں، اور یہ درجہ محض اللہ کے فضل سے حاصل ہوتا ہے۔

① صحیح مسلم، کتاب السلام (۲۲۰۷)

② صحیح بخاری، کتاب الطب (۵۷۲۱)

③ سنن ترمذی (۲۰۵۰) صحیح ابن حبان (۱٤۹٤)

④ صحیح بخاری، کتاب الطب (۵٦۸۰) صحیح مسلم، کتاب السلام (۷۱/۲۲۰۵) (الفاظ صحیح بخاری کے ہیں)

واضح ہو کہ حقیقتِ توکل یہ نہیں ہے کہ بندہ اصلاً اسباب کو بروئے کار لانا چھوڑ دے، اسباب تو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں، اور انہیں اختیار کرنا ایک فطری اور ضروری امر ہے، البتہ مکروہ اور معیوب اسباب سے بچنا چاہئے، اور ایسے اسباب بروئے کار لانا چاہیں جن کی مشروعیت ثابت ہو، مثال کے طور پر ایک مریض حصولِ شفا کیلئے دم جھاڑ کروانے یا آگ سے داغ لگوانے جیسے اسباب سے بچے کیوں کہ یہ مکروہ قرار دیئے گئے ہیں، اور یہ عین توکل ہے لیکن جو اسباب شرعا درست ہیں انہیں اختیار کرنا حقیقتِ توکل کے منافی نہیں، ان اسباب کو چھوڑ دینا مشروع قرار نہیں دیا جا سکتا، مثلا مریض کا دوا سے علاج کرانا، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "مَاأَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ دَاءٍ اِلَّا أَنْزَلَ لَهُ شِفَاءً" ①

یعنی: ''اللہ تعالیٰ نے جو بیماری اتاری ہے اس کا علاج بھی اتارا ہے''

مسند احمد میں سیدنا اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میری موجودگی میں کچھ اعرابی نبی ﷺ کے پاس آئے اور کہا یارسول اللہ ﷺ! کیا ہم دوا سے علاج کر سکتے ہیں فرمایا:

''ہاں، اے اللہ کے بندو! دوا استعمال کرو اسلئے کہ اللہ عزوجل نے جو بھی بیماری رکھی ہے اس کا علاج بھی رکھا ہے صرف ایک بیماری کے علاوہ اور وہ بڑھاپا ہے'' ② واللہ اعلم

اس حدیث کو سنتے ہی عکاشہ بن محصن نے نبی ﷺ سے استدعا کی کہ آپ ﷺ اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے ان ستر ہزار افراد میں شامل کر لے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ تم انہیں میں سے ہو''

اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ اسے ان افراد میں شامل فرما لے''

گویا آپ ﷺ نے دعا کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی، اور عکاشہ اس عظیم بشارت کے مستحق قرار پا گئے، پھر ایک دوسرے صحابی نے یہی استدعا کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بازی عکاشہ جیت چکا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس وقت طلبِ جنت کی جو حرص خواہش اور طمع کی سچائی عکاشہ کے پاس تھی وہ دوسرے کے پاس نہیں تھی، اسی لئے عکاشہ کی استدعا قابل قبول قرار پا گئی۔ جعلنا الله من هؤلاء السبعين الفا.

---

① صحیح بخاری، کتاب الطب (٥٦٧٨)

② یہ حدیث صحیح ہے۔ مسند احمد (١٤٨١ ج٦، مسند اسامہ بن شریك) الادب المفرد (٢٩١) سنن ابی داؤد (٢٠١٥، ٣٨٥٥) سنن ترمذی (٢٠٣٨) امام ترمذی نے اسے "حسن صحیح" کہا ہے۔

اس باب کے مسائل

(۱) توحید کے تعلق سے لوگوں کے مختلف مراتب و درجات کی معرفت۔

(۲) توحید کو عملی طور پر اپنانے اور اس پر کاربند رہنے کا معنی معلوم ہوا۔

(۳) اللہ تعالیٰ کا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی تعریف اس بنیاد پر کرنا کہ وہ مشرکین میں سے نہیں تھے جس سے واضح ہوا کہ شرک سے کلی طور پر پاک وصاف ہونا ایک نہایت ہی عظیم الشان مقام ہے۔

(۴) اسی طرح اللہ رب العزت کا اولیاء کرام رحمہم اللہ کی تعریف فرمانا اس بنا پر کہ ان کا دامن شرک سے پاک تھا، اس بات کی دلیل ہے کہ شرک سے پاک صاف ہونا بڑی عظمت کا حامل مقام ہے۔

(۵) دم کروانے اور آگ سے داغ لگوانے کو چھوڑ دینا توحید پر عملاً کاربند رہنے کا بڑا زبردست ثبوت ہے۔

(۶) ''سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مذکورہ بالا حدیث میں جنت میں بلا حساب وعذاب داخل ہونیوالوں کی جوصفات ذکر ہوئی ہیں'' ان کا اصل محور "توکل علی اللہ" ہے (جو اس بات کا ثبوت ہے کہ توکل، توحید کی بڑی اہم کڑی ہے کہ اس کا حق ادا کرنیوالا ان ستر ہزار افراد میں شامل ہوگا)

(۷) یہ بات معلوم ہوئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کتنے گہرے علم کے مالک تھے، اور ان کے علم کی گہرائی کا سبب یہ تھا کہ وہ یہ نکتہ بخوبی سمجھتے تھے کہ عمل کے بغیر علمی تعمق حاصل نہیں ہوسکتا (گویا عملِ صالح ہی علمِ نافع کی اساس ہے)

(۸) یہ بات معلوم ہوئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حصولِ خیر کے کس قدر حریص تھے۔ (یہی وجہ ہے کہ نبی علیہ السلام جب ستر ہزار افراد کا ذکر فرما کر گھر تشریف لے گئے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس جستجو میں ڈوب گئے، اور آپس میں باتیں کرنے لگے کہ وہ خوش نصیب لوگ کون ہوسکتے ہیں۔)

(۹) امت محمدیہ کی کمیۃً وکیفیۃً فضیلت ثابت ہوئی (کمیۃً اس طرح کہ وہ تعداد میں تمام امتوں سے زیادہ، اور کیفیۃً اس طرح کہ اس عظیم امت کی ایک بہت بڑی تعداد بلا حساب جنت میں داخل ہوگی)۔

(۱۰) سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی امت کی فضیلت بھی واضح ہوئی۔

(۱۱) یہ بات معلوم ہوئی کہ نبی ﷺ پر (معراج کے وقت) تمام امتیں پیش کی گئیں

(۱۲) یہ بات معلوم ہوئی کہ ہر اُمت میدان محشر میں اپنے اپنے نبی کے ساتھ الگ الگ آئے گی۔

(۱۳) انبیاء کرام کی دعوت کو قبول کرنیوالے ہمیشہ تھوڑے ہی لوگ ہوتے ہیں۔

(۱۴) یہ بات معلوم ہوئی کہ جس نبی کی کسی بھی شخص نے دعوت قبول نہیں کی وہ قیامت کے روز اکیلا آئیگا۔

(۱۵) علم نافع کا اصل ثمرہ یہ ہے کہ کوئی شخص کثرتِ تعداد سے دھوکہ نہ کھائے، اور قلتِ تعداد پر کسی خوف و وحشت میں مبتلا نہ ہو (بلکہ تعداد کو حق کا مبنیٰ بنانے کے بجائے کتاب وسنت کی دلیل کو حجت تصور کرے)۔

(۱۶) نظرِ بد اور زہریلے جانور کے کاٹے پر رقیہ یعنی دم کرنے کی اباحت معلوم ہوئی۔

(۱۷) سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے قول "قَدْ اَحْسَنَ مَنِ انْتَهٰی اِلٰی مَا سَمِعَ" سے علماء سلف کے علم کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے ان کے اس قول کی رو سے مذکورہ دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض وتناقض نہیں ہے (کیونکہ اصل عمل بالسنۃ ہے) کما تقدم

(۱۸) یہ بات معلوم ہوئی کہ جو وصف انسان میں موجود نہیں ہے اس پر خوامخواہ مدح وتعریف کے مستحق بننے سے سلف صالحین کتنا بچتے تھے (حصین بن عبدالرحمٰن کا قول "لَمْ اَكُنْ فِی صَلَاةٍ" ملاحظہ ہو)۔

(۱۹) نبی علیہ السلام کا سیدنا عکاشہ رضی اللہ عنہ سے فرمانا "اَنْتَ مِنْهُمْ" آپ ﷺ کی نبوت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

(۲۰) سیدنا عکاشہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا علم ہوا۔

(۲۱) نبی علیہ السلام کا دوسرے شخص سے یہ فرمانا کہ عکاشہ سبقت لے گیا میں معاریض (یعنی کنایہ وذومعنی کلام) کے استعمال کا جواز ثابت ہوا۔

(۲۲) نبی علیہ السلام کے حسنِ خُلق کا علم ہوا۔



باب الخوف من الشرك

شرک سے ڈرتے رہنے کا بیان

قوله تعالیٰ: ﴿ إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ ﴾ ①

"بے شک اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں بخشتا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے، اور اس کے سوا جس گناہ کو چاہے معاف کردے"

شرک سب سے بڑا گناہ ہے، اسی لئے اس پر دنیا وآخرت کی وہ سزائیں مرتب ہوتی ہیں، جو کسی اور گناہ پر بیان نہیں کی گئیں۔ نیز مشرک کو اللہ تبارک وتعالیٰ توبہ کے بغیر معاف نہیں فرماتا، جبکہ دوسرے گناہوں کو اپنی مشیت ورحمت سے توبہ کے بغیر بھی معاف فرمادیتا ہے۔

شرک کی پہچان کی فضیلت

ان وجوہ کے پیش نظر مؤلف رحمہ اللہ نے "باب الخوف من الشرك" شرک سے ڈرتے رہنے کا باب، قائم کیا ہے، اور اس عظیم گناہ کی ہیبت وشناعت کا ذکر فرمایا ہے، تاکہ مؤمن اس گناہ کو پہچان لے، اور اس کے اسباب، اقسام اور مبادیات کا تعارف حاصل کرلے، تاکہ پہچان لینے کے بعد اس کے لئے شرک سے بچنا آسان ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اچھے امور کا تعارف ضروری ہے تاکہ انہیں اختیار کیا جائے، اسی طرح بُرے امور کو پہچاننا بھی ضروری ہے تاکہ ان سے اجتناب کیا جائے۔

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: لوگ رسول اللہ ﷺ سے خیر کے متعلق پوچھا کرتے تھے، اور میں شر کے متعلق پوچھا کرتا تھا، اس ڈر سے کہ کہیں عدمِ تعارف کی بناء پر شر میں گرفتار نہ ہوجاؤں۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: کہ جب اسلام میں ایسے لوگ پیدا ہوجائیں گے جنہیں جاہلیت کی پہچان نہ ہو تو اسلام ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان اسی لئے عظیم الشان تھا کہ انہیں خیر سے مکمل طور پر محبت تھی، اور شر سے مکمل طور پر نفرت تھی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جس طرح خیر اور اس کے حسنِ انجام سے متعارف تھے، اسی طرح شر اور اس کے انجامِ بد سے بھی واقف تھے۔ شرک چونکہ ایسا شر ہے کہ اس سے بڑا کوئی شر نہیں، لہذا اس باب میں شرک کی قباحتوں اور اس کے نقصانات کو بیان کیا گیا ہے، تاکہ اس سے بچنا ممکن ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے معاشرے کو شرک سے پاک فرمادے۔

---

① (النساء: ٤٨)

....

....

....

....

....

....

....

مذمتِ شرک قرآن سے

آیتِ کریمہ سے واضح ہوا کہ شرک سب سے بڑا گناہ ہے۔کیا اس کی ہیبت وخوفنا کی اس بات سے عیاں نہیں ہوتی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے دربار میں مشرک انسان کے لئے اس وقت تک کوئی معافی نہیں جب تک کہ وہ توبہ کر کے شرک کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چھوڑ نہ دے، شرک کے علاوہ جو بھی گناہ ہے اس کی مغفرت اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، وہ چاہے تو اسے بغیر توبہ کے معاف فرمادے، اور چاہے تو معاف نہ فرمائے۔اور اس گناہ کی وجہ سے بندہ کو مبتلائے عذاب کردے، پھر توحید کی برکت سے جنت عطا فرمادے۔

لیکن شرک توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ ہر بُرائی سے بُرا، اور ہر ظلم سے بڑا ظلم ہے، اور کیوں نہ ہو، اس میں براہ راست رب العالمین کی توہین وتنقیص ہے، اور وہ حق جو خالصتاً ذاتِ یکتا ویگانہ کیلئے خاص ہے وہ غیر کیلئے متعین کرنا ہے، رب العالمین سے عداوت ومعاندت کا اظہار ہے، مخلوق کو خالق کے ساتھ تشبیہ دینا ہے۔سبحان اللہ! یہ کیسی تشبیہ ہے؟ وہ جسے ایک ذرہ کا اختیار نہیں ہے، بلکہ اپنے نفس تک کا اختیار نہیں، اسے اس خالق کے ساتھ تشبیہ دی جائے، جو پوری کائنات کا مالک اور مختار ہے۔عاجز کو قادر کے اور فقیر کو غنی کے برابر کردینا نہ صرف یہ کہ ظلم ہے بلکہ جہالت وحماقت کی دلیل ہے۔اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہوسکتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے عدمِ معافی کا اعلان فرمایا، حالانکہ اس کا فرمان ہے کہ میں نے اپنی ذات پر رحم کرنا لکھ دیا ہے، اور لازم کرلیا ہے۔اور میں نے ہی بندوں کو حکم دیا ہے کہ میری رحمت سے مایوس ہرگز ہرگز نہ ہونا۔لیکن اس عمومِ رحمت وشفقت کے باوجود اس نے شرک کے بارے میں عدمِ مغفرت کا اعلان فرمادیا، اور یہ کہ مشرک اسکے دربار میں پیش ہوکر شرک سے خالص توبہ کرے اور دوبارہ اس سے کسی بھی نوعیت کا شرک صادر نہ ہو۔

قوله :وقال الخليل عليه السلام : ﴿ وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَن نَّعْبُدَالْاَصْنَامَ ﴾ ①

''اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے پناہ دے''

قال :وفی الحديث " اَخْوَفُ مَا اَخَافُ عَلَيْكُمْ اَلشِّرْكُ الْاَصْغَرُ، فَسُئِلَ عَنْهُ فَقَالَ : اَلرِّيَاءُ"

''مجھے تمہارے متعلق سب سے زیادہ خطرہ شرکِ اصغر کا ہے، شرکِ اصغر کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ''ریاکاری'' ہے'' ②

سیدنا ابراھیم علیہ السلام کا شرک سے ڈرنا

"اصنام" صنم کی جمع ہے، اور اس سے مراد وہ بُت ہیں جو انسان کی صورت میں گھڑے جائیں۔ سیدنا ابراھیم علیہ السلام نے اپنے اور اپنے بیٹوں کے لئے شرک سے محفوظ رہنے کی دعا فرمائی، حالانکہ وہ خود پیغمبر تھے، اور ان کی اولاد بھی پیغمبر ہوئی لیکن اس کے باوجود ان کا یہ دعا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ شرک کا خوف کس طرح ان کے دلوں میں تھا۔ جب اتنے جلیل القدر نبی شرک سے اس قدر خائف تھے تو ہمارا کیا حال ہونا چاہئے۔

ابراھیم التیمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ سیدنا ابراھیم علیہ السلام سے بڑھ کر آزمائش سے بے خوف کون ہوسکتا ہے؟ چنانچہ آپ کی اس دعا سے ہمیں شرک سے ڈرتے رہنے کا درس ملتا ہے۔ یہ کہنا جہالت ہے کہ اس امت میں اب شرک واقع نہیں ہوسکتا، شرک سے امت کی اسی بے خوفی نے اسے شرک میں مبتلا کر دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا اپنی امت کے بارے میں شرکِ اصغر سے ڈرنا

مصنف رحمہ اللہ نے اس حدیث کو مختصراً ذکر فرمایا ہے، جبکہ مسند احمد وغیرہ میں پوری حدیث اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے تمہارے شرکِ اصغر میں واقع ہوجانے کا سب سے زیادہ خوف اور خطرہ ہے'' تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا اے اللہ کے رسول ﷺ! شرکِ اصغر کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''شرکِ اصغر ریاکاری ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن جب بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دے گا تو فرمائے گا: (اے ریاکاری کرنے والو!) جن کو دکھانے کے لئے تم عمل کرتے تھے، ان کے پاس چلے جاؤ، اور دیکھو کیا ان کے پاس تم اپنے عمل کی جزاء پاتے ہو؟''

یہ حدیث بڑی زبردست تنبیہ کی حامل ہے، جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے کامل الایمان انسانوں پر شرکِ اصغر =

---

① (ابراھیم: ۳۵)

② مسند احمد (۲۳۶۹۲،۲۳۶۹۳ ج۹، مسند محمود بن لبید) امام منذری نے "الترغیب والترھیب" (۱/ ۶۹) میں اس کی سند کو جید کہا ہے۔ امام عراقی نے "تخریج الاحیاء" (۳/ ۲۹۴) میں اس حدیث کے رواۃ کو ثقہ کہا ہے۔

قال: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: "مَنْ مَاتَ وَھُوَ یَدْعُوْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ نِدًّا دَخَلَ النَّارَ"

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص غیر اللہ کو پکارتے پکارتے مر گیا تو وہ جہنم میں داخل ہوگا'' ①

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: "مَنْ لَقِیَ اللّٰہَ لَا یُشْرِكُ بِہٖ شَیْئًا دَخَلَ الْجَنَّۃَ وَمَنْ لَقِیَہٗ یُشْرِكُ بِہٖ شَیْئًا دَخَلَ النَّارَ" ②

صحیح مسلم شریف میں سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ تبارک وتعالیٰ کو اس حال میں ملے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے تو وہ جنت میں جائے گا، اور جو اللہ تبارک وتعالیٰ کو اس حال میں ملے گا کہ اس کے ساتھ شرک کرتا ہو تو بلاشبہ وہ جہنم میں جائے گا''

=

میں واقع ہونے کا اندیشہ ہوسکتا ہے، تو ہم جیسے ضعیف الایمان لوگوں کے شرک میں ملوث ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ لہٰذا شرک کا خوف دل میں ہمیشہ رکھنا چاہئے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرنی چاہے کہ وہ ہمیں شرک سے محفوظ رکھے۔

وقولہ: قال: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ:......

مشرک کی سزا کتنی بھیانک اور دردناک ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ اس مشرک انسان نے محتاجِ محض کو اللہ تعالیٰ کے ہم مثل کرنے کی جسارت کی ہے، حالانکہ کوئی اسکا ہم مثل اور ہمسر نہیں ہے، بلکہ ہر چیز اسکی محتاج ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ یَاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴾ ③

''اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو، اور اللہ بے نیاز خوبیوں والا ہے''

وقولہ: وَلِمُسْلِمٍ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ:......

اس حدیث میں توحید کی فضیلت ہے، چنانچہ موحد کیلئے جنت کا داخلہ یقینی ہے اگرچہ اسے اپنے گناہوں کے باعث جہنم میں جانا پڑے، لیکن توحید کو اپنانے اور شرک سے بچے رہنے کے باعث اسے جہنم سے نکال کر جنت میں ضرور داخل کیا جائے گا، اور اس کے برعکس جو انسان شرک پر مرا تو اللہ تعالیٰ اولاً: تو اسے جنت اور رحمت سے یکسر محروم کردے گا، ثانیاً: اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم کی آگ برداشت کرنی پڑے گی۔

---

① صحیح بخاری، کتاب التفسیر (٤٤٩٧) ② صحیح مسلم، کتاب الایمان (١٥٢/٩٢)
③ (الفاطر: ١٥)

اس باب کے مسائل

(۱) شرک سے ہمیشہ خوف کرتے رہنا چاہئے۔

(۲) ''ریاء'' (دکھلاوا) شرک میں سے ہے۔

(۳) نیک بندوں پر سب سے زیادہ خدشہ ریاء میں واقع ہونے کا ہے۔

(۴) ریاء شرک اصغر ہے۔

(۵) جنت اور جہنم کا قریب ہونا (جب کہ ایک عمل جنت میں داخلے کا باعث ہے، اور اس کا ترک جہنم میں پہنچا دیتا ہے۔)

(۶) جنت اور جہنم کے قریب ہونے کا ایک ہی حدیث میں ذکر کیا گیا ہے (یعنی حدیث جابر رضی اللہ عنہ جو کہ گزر چکی ہے)

(۷) جو شخص شرک نہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ملے گا وہ ضرور جنت میں جائے گا، اور جو شخص شرک کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ملے گا وہ بلاشبہ جہنم میں ہی جائے گا خواہ وہ سب سے بڑا عبادت گزار ہی کیوں نہ ہو۔

(۸) ایک نہایت عظیم الشان مسئلہ یہ بیان ہوا کہ سیدنا ابراهیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنے اور اپنی اولاد کے بارے میں بتوں کی عبادت سے بچائے رکھنے کا سوال کیا تھا۔

(۹) دراصل سیدنا ابراهیم علیہ السلام نے بہت سے لوگوں کی حالت سے عبرت پکڑتے ہوئے اپنے اور اپنی اولاد کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا تھا؛ کیونکہ بہت سے لوگ شرک میں گرفتار تھے۔ جیسا کہ سیدنا ابراهیم علیہ السلام نے خود ہی فرمایا تھا: ﴿ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ﴾

''اے پروردگار ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے''

(۱۰) امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں کلمہ ''لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه'' کی تفسیر ہے۔ (کیونکہ اس کلمہ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ غیر اللہ کو چھوڑ کر ایک اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت کی جائے)

(۱۱) یہ بھی معلوم ہوا کہ شرک سے محفوظ رہنے والے انسان کی کتنی فضیلت ہے۔



باب الدعاء الی شہادۃ ان لا الہ الا اللہ

''لا الٰہ الا اللہ'' کی گواہی کی دعوت دینے کا بیان

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ ①

''آپ کہہ دیجئے میری راہ یہی ہے۔ میں اور میرے فرماں بردار اللہ کی طرف بلا رہے ہیں، پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ۔ اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔''

سابقہ ابواب میں مصنف ؒ نے یہ بات واضح کی ہے کہ تخلیق کائنات کی حکمت توحید ہے، پھر توحید کے فضائل بھی بیان فرما دیئے، نیز توحید کی ضد یعنی شرک کی خوفناکی اور تباہ کاری کا بھی ذکر فرما دیا، اور یہ واضح کر دیا کہ شرک جہنم میں ہمیشگی کا موجب ہے، اب اس باب کو قائم کر کے یہ تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ جو شخص ان تمام باتوں کو جان لے وہ انہیں اپنے تک محدود نہ رکھے بلکہ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت الی اللہ پر کمربستہ ہو جائے، انبیاء کرام ؑ اور ان کے حقیقی اور سچے پیروکاروں کا یہی منہج تھا، پھر مذکورہ بالا باب میں یہ نکتہ بھی پنہاں ہے کہ جب انسان عملِ دعوت پر کمربستہ ہو جائے تو اس کا نکتہ آغاز توحید باری تعالیٰ ہی ہو؛ کیونکہ توحید اصلِ دین ہے جس کے بغیر عمل کا صحیح ہونا، اور قابلِ قبول قرار دیا جانا ناممکن ہے، شرک کی موجودگی میں کوئی عبادت قابل قبول نہیں ہو سکتی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴾ ②

''لائق نہیں کہ مشرک اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو آباد کریں۔ درآں حالیکہ وہ خود اپنے کفر کے آپ ہی گواہ ہیں، ان کے اعمال غارت و اکارت ہیں، اور وہ دائمی طور پر جہنمی ہیں''

اور چونکہ توحید کی گواہی اول فریضہ ہے، لہٰذا ہر داعی دعوتِ توحید ہی سے اپنی مشن کا آغاز کرے۔

آیتِ قرآنی سے استدلال

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر ؒ فرماتے ہیں: یہاں اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو یہ حکم ارشاد فرما رہا ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے اصل راستے، طریقے اور منہج سے آگاہ کر دیں، اور وہ ہے ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کی =

① (یوسف: ۱۰۸) ② (التوبہ: ۱۷)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ﷠: اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَمَّا بَعَثَ مَعَاذًا اِلَى الْيَمَنِ قَالَ لَهٗ: "اِنَّكَ تَاْتِىْ قَوْمًا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ، فَلْيَكُنْ اَوَّلَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ: شَهَادَةُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" وَفِىْ رِوَايَةٍ: "اِلٰى اَنْ يُّوَحِّدُوْا اللّٰهَ" فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِىْ كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ، فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ، فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَاِيَّاكَ وَكَرَائِمَ اَمْوَالِهِمْ، وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّهٗ لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ" (اخرجاه) [1]

عبداللہ بن عباس ﷠ سے مروی ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے جب معاذ بن جبل ﷛ کو یمن بھیجا تو فرمایا: ''تم اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی طرف جا رہے ہو، یہ ضروری ہے کہ انہیں سب سے پہلے جس چیز کی طرف دعوت دو وہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی گواہی ہو، ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ انہیں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کر لینے کی دعوت دو اگر وہ توحید کی دعوت مان لیں تو پھر انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اگر وہ نماز کی دعوت بھی قبول کر لیں تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے وصول کی جائے گی، اور فقراء میں بانٹ دی جائے گی، اگر وہ زکوٰۃ کے فریضے کو بھی قبول کر لیں تو ان کے عمدہ مال وصول کرنے سے اجتناب کرنا، اور مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا؛ کیونکہ مظلوم کی بددعا اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا''

=

گواہی کی دعوت دیتے رہنا، اور یہ دعوت مکمل بصیرت اور یقین و برھان پر قائم ہو، نیز لوگوں کو یہ بھی بتا دیا جائے کہ جو بھی شخص رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا دعویٰ کرے گا وہ لازماً داعی الی اللہ ہوگا۔

مصنف ﷫ کے قائم کردہ عنوان اور اس کے تحت ذکر کردہ اس آیت کریمہ کے مابین مطابقت کی صورت بالکل واضح ہے، آیت کریمہ کے آخر میں "سبحان اللّٰه" ہے، جو جملہ تنزیہ ہے، اور یہ بات واضح کرتا ہے کہ اللہ رب العزت ہر قسم کے شریک اور مثل و ند سے پاک ہے۔

وقوله: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمَا: اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَمَّا بَعَثَ مَعَاذًا......

اس حدیث میں سیدنا معاذ بن جبل ﷛ کی یمن کی طرف جس بعثت کا ذکر ہے، وہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی (٤٣٤٧) صحیح مسلم، کتاب الایمان (١٨/٢٨) لفظ صحیح مسلم کے ہیں۔

سے قبل ہوئی تھی، بعض علماء ومؤرخین نے ۹ھ کا آخر بھی ذکر کیا ہے۔ پہلا قول امام بخاری رحمہ اللہ نے "کتاب المغازی" کے آخر میں نقل فرمایا ہے۔ نبی ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بطور والی اور بطور قاضی مبعوث فرمایا تھا، آپ ﷺ نے انہیں یمن بھیجتے ہوئے کچھ نصیحتیں فرمائیں، چنانچہ سب سے پہلے آپ ﷺ نے انہیں اس بات سے آگاہ کیا کہ وہاں تمہارا اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ سے بھی سامنا ہوگا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یمن میں اہل کتاب بہت بڑی تعداد میں تھے اور آپ ﷺ نے انہیں اس لئے آگاہ کیا تاکہ وہ ان سے مناظرہ کرنے کے لئے تیار رہیں؛ کیونکہ مشرکین عرب کے برعکس اہل کتاب زیادہ علم رکھتے تھے، لہذا انہیں پہلے سے یہ بات بتادی گئی تاکہ وہ پوری بصیرت اور دلائل کی تیاری کے ساتھ قوم کا سامنا کریں، اور تاکہ وہ لوگ بھی سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ پر شک وشبہ کا کوئی جال پھینکنے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔

حدیثِ معاذ رضی اللہ عنہ سے استدلال

اس کے بعد نبی ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو دعوت کی اصل ترتیب سے آگاہ کیا، چنانچہ فرمایا کہ سب سے پہلے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی شہادت کی دعوت دینا، بعض روایتوں میں "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کے ساتھ "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کی شہادت بھی مذکور ہے۔

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی شہادت کا معنی یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہر قسم کی عبادت کا مستحق قرار دیا جائے، اور اللہ کے سوا جو بھی معبود بنائے گئے ہیں انہیں باطل قرار دے کر ان کی عبادت کا انکار کردیا جائے، یہی ایمان باللہ اور کفر بالطاغوت ہے، جس کا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ذکر ہے۔

﴿ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ﴾ (١)

''جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کرکے، اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے پس اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا، جو کبھی نہ ٹوٹے گا''

یہاں ''کفر بالطاغوت'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے سوا جو معبود بنائے گئے ہیں انہیں دل سے یکسر نکال دے، اور انکے تعلق سے ہر قسم کے شرک سے براءت اختیار کرلے، اور انکے معبود ہونے کے پہلو کو بغض وعداوت کا باعث بنالے۔ جبکہ ایمان باللہ سے مراد صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے، اسطرح کہ وہ عبادت اللہ تعالیٰ کی انتہائی محبت، اسکے سامنے انتہائی تذلل، اور اسکے ہر امر کے انتہائی انقیاد وقبول کو متضمن ہو، پھر

(١) (البقرة: ٢٥٦)

ایمان باللہ اخلاصِ عبادت کو بھی مستلزم ہے، جو علمِ نافع اور عملِ صالح کی اساس ہے۔ وہ لوگ پرلے درجے کی جہالت کا شکار ہیں جو اس کلمے کو محض نطق یا صرف اللہ تعالیٰ کے وجود کے اقرار تک محدود رکھتے ہیں، یہ بات تو بت پرست بھی مانتے تھے، اور اہل کتاب تو علم میں ان سے کہیں آگے تھے، اگر ان جہلاء کی بات کو درست مان لیا جائے تو پھر کیا انہیں محض نطق واقرار کی دعوت دی گئی تھی، ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کلمے کی شہادت علم، معرفت، اور عمل تمام چیزوں کی متقاضی ہے۔

حدیثِ معاذ رضی اللہ عنہ کی روشنی میں دعوتِ دین کے چند ضوابط

☆ واضح ہو کہ یہ حدیث اس بات کی بھی انتہائی ٹھوس دلیل ہے کہ توحید یعنی اللہ تعالیٰ کی اخلاصِ عبادت اور ہر ماسوی اللہ کی عبادت سے اجتناب، اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر اولین فریضہ ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء ومرسلین علیہم السلام نے سب سے پہلے اپنی قوموں کو توحید کی دعوت دی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ ①

''آپ سے پہلے بھی جو رسول ہم نے بھیجا اس کی طرف یہی وحی نازل فرمائی کہ میرے سوا کوئی معبود برحق نہیں، پس تم سب میری ہی عبادت کرو۔''

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ ②

''ہم نے ہر اُمت میں رسول بھیجا کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو، اور اسکے سوا تمام معبودوں (طاغوت) سے بچو''۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کہ رسول اللہ ﷺ کے دین سے انتہائی صراحت وبداہت کے ساتھ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اصل اسلام توحید ہے، لوگوں کو سب سے پہلے "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کی شہادت دینے کا حکم دیا جائے، اس کلمہ کو پڑھکر کافر مسلمان ہوجاتا ہے، دشمن دوست بن جاتا ہے، حلال الدم والمال، حرام الدم والمال بن جاتا ہے، اور اگر یہ عقیدہ اس کے دل میں ہو تو ایمان اس کے دل میں داخل ہوجاتا ہے، اور اگر صرف زبان کے نطق تک محدود ہے اور دل سے تصدیق نہیں ہے تو وہ شخص ظاہراً اسلام قبول کرسکا، باطنی ایمان سے محروم رہیگا۔''

---

① (الانبیاء: ۲۵) ② (النحل: ۳٦)

☆ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دعوت وتعلیم میں " اَھَمّ فَالْاَھَمّ "کا قاعدہ ذہن نشین رکھنا چاہئے۔

☆ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ''شھادتین'' کے نطق اور اقرار کے بغیر بندہ مسلمان نہیں بن سکتا۔

شیخ الاسلام فرماتے ہیں: کہ قدرت کے باوجود اگر کوئی شخص شھادتین کا نطق نہیں کرتا تو وہ بالاتفاق کافر ہے، ائمہ سلف نے اسے ظاہراً وباطناً کافر قرار دیا ہے۔

☆ اس حدیث سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ کفار فروعِ دین کے مخاطب اولین نہیں ہیں؛ کیونکہ انہیں توحید ورسالت قبول کرنے کے بعد نماز کی تعلیم دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حدیث میں وتر کے عدمِ فرض کی دلیل بھی موجود ہے؛ کیونکہ اگر وتر کو فرض مان لیا جائے تو پھر فرض نمازوں کی تعداد چھ ہو جائے گی، جبکہ حدیث میں (فرض) پانچ نمازیں مذکور ہیں۔

☆ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کے بعد سب سے بڑا اور محکم فریضہ زکوۃ ہے، جو اغنیاء سے وصول کر کے اس علاقے کے فقراء میں بانٹ دی جائے، نبی ﷺ نے فقراء کا بطور خاص اس لئے ذکر کیا کہ ان کا حق دوسروں کی بنسبت زیادہ مؤکد ہے۔

☆ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زکاۃ وصول کرنے والے کی نگاہ عمدہ اور نفیس مال پر نہ ہو بلکہ وسط یعنی درمیانے درجے کا مال وصول کرے، اس طرح زکاۃ دینے والا ردی قسم کا مال نکالنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ درمیانے درجے کا مال ادا کرے، البتہ اگر وہ بطیبِ خاطر عمدہ مال ادا کرتا ہے تو وصول کرنا جائز ہوگا۔

☆ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے مظلوم کی بددعا سے بچنے کا حکم دیا ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ اسکے ساتھ انصاف کا برتاؤ کیا جائے، کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے کہ مبادا بددعا نہ کردے، مظلوم اگرچہ اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہی کیوں نہ ہو، مگر اس کی بددعا اللہ تعالیٰ تک ضرور پہنچتی ہے اور اللہ قبول فرماتا ہے۔

واضح ہو کہ اس حدیث میں روزے اور حج کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ یہ دونوں عمل بھی اس وقت فرض ہو چکے تھے کیونکہ سیدنا معاذ بن جبل ﷺ کی بعثت نبی ﷺ کے آخری ایام میں ہوئی تھی، اس کا بعض علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ اس حدیث میں راویوں نے اختصار کر دیا ہے، لیکن یہ جواب درست نہیں، بلکہ یہ جواب ان راویوں میں باعث طعن بن سکتا ہے، اس کا درست جواب یہ ہے کہ نبی ﷺ ہر مقام پر مناسبِ حال، اعمال کا ذکر فرمایا کرتے تھے، بعض اوقات صرف ان فرائض کے ذکر پر اکتفاء فرماتے جن کے ترک پر قتال واجب ہے، مثلاً نماز اور زکاۃ، بعض اوقات صرف نماز اور روزے کا ذکر فرماتے جب آپ یہ محسوس کرتے کہ مخاطب

پر زکاۃ فرض نہیں ہے، بعض اوقات نماز، زکاۃ اور روزہ تینوں فرائض کا ذکر فرماتے، اور حج کا ذکر اس لئے نہ فرماتے کہ مخاطب پر حج فرض نہیں ہے۔

واضح ہو کہ شریعت میں نماز اور زکاۃ کو جو اہمیت اور مقام حاصل ہے وہ کسی اور فریضے کو حاصل نہیں ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نماز اور زکاۃ پر قتال کا ذکر فرمایا ہے، پھر نماز اور زکاۃ دونوں ظاہری عبادتیں ہیں جبکہ روزہ باطنی عبادت ہے۔ (واللہ اعلم)

وَلَهُمَا عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ يَوْمَ خَيْبَرَ: "لَأُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَداً رَجُلاً يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلٰى يَدَيْهِ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ، وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ" فَبَاتَ النَّاسُ يَدُوْكُوْنَ لَيْلَتَهُمْ أَيُّهُمْ يُعْطَاهَا؟ فَلَمَّا أَصْبَحُوْا غَدَوْا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ كُلُّهُمْ يَرْجُوْ أَنْ يُعْطَاهَا. قَالَ "أَيْنَ عَلِيُّ بْنُ أَبِيْ طَالِبٍ" فَقِيْلَ هُوَ يَشْتَكِيْ عَيْنَيْهِ قَالَ "فَأَرْسِلُوْا إِلَيْهِ" فَأُتِيَ بِهٖ، فَبَصَقَ (رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ) فِيْ عَيْنَيْهِ، وَدَعَا لَهٗ فَبَرَأَ كَأَنْ لَمْ يَكُنْ بِهٖ وَجَعٌ، فَأَعْطَاهُ الرَّايَةَ وَقَالَ: "أُنْفُذْ عَلٰى رِسْلِكَ حَتّٰى تَنْزِلَ بِسَاحَتِهِمْ ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى الْإِسْلَامِ، وَأَخْبِرْهُمْ بِمَا يَجِبُ عَلَيْهِمْ مِنْ حَقِّ اللّٰهِ فِيْهِ فَوَاللّٰهِ لَأَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ أَنْ يَّكُوْنَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ" يَدُوْكُوْنَ أَيْ: يَخُوْضُوْنَ. ①

صحیحین میں سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگِ خیبر کے دن فرمایا: "کل میں ایسے شخص کو (خیبر کا جھنڈا دوں گا) جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں، اس کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ خیبر کی فتح عطا فرمائے گا، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رات بھر سوچتے رہے کہ یہ جھنڈا کسے دیا جائیگا، صبح سویرے تمام صحابہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آ گئے، سب کو یہ امید تھی کہ جھنڈا اسے دیا جائے گا، پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہاں ہیں؟ آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ ان کی آنکھیں دکھ رہی ہیں (لہذا وہ یہاں نہیں آ سکے)۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کی طرف آدمی بھیج کر انہیں بلا لیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے ان کی آنکھوں میں لعابِ دھن لگایا اور دعا فرمائی، جس سے وہ فوراً تندرست ہو گئے، جیسے انہیں کوئی درد نہ تھا، پھر رسول اللہ ﷺ نے انہیں جھنڈا عطا کیا اور فرمایا: نہایت خاموشی سے نکلو، اور (یہودیوں کی) بستی (خیبر) میں ہی جا کر رکو پھر انہیں اسلام کی دعوت دو، اور دینِ اسلام میں ان پر جو اللہ تعالیٰ کے حقوق عائد ہوتے ہیں ان سے انہیں باخبر کر دو، اللہ کی قسم! اگر تمہارے ذریعے اللہ تعالیٰ صرف ایک شخص کو دین کی ہدایت دیدے تو یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں (یعنی دنیا کے سب سے قیمتی خزانوں) سے بہتر ہے۔

بخاری و مسلم کی یہ روایت سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، یہ انصاری صحابی ہیں، جن کا تعلق قبیلہ بنو خزرج سے تھا، انکے والد سیدنا سعد بن مالک رضی اللہ عنہ کو بھی صحبت کا شرف حاصل تھا ۸۸ھ میں سو سال سے زائد عمر میں انتقال ہوا۔

① صحیح بخاری، کتاب المغازی (٤٢١٠) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة (٢٤١٦)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت ومنقبت

یہ حدیث سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے زبردست مناقب میں سے ہے، بلکہ شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں سب سے صحیح یہی حدیث ہے، چنانچہ فتح خیبر کی رات آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں خیبر کا جھنڈا اس شخص کو دونگا جو اللہ اور اسکے رسول سے محبت کرتا ہے، اور اللہ اور اسکا رسول اس سے محبت کرتے ہیں یہاں جنگ میں جھنڈا رکھنے کی سنت ثابت ہوتی ہے، جنگ میں جھنڈا اٹھانے کا مقصد صاحب الجیش کے مقام کی نشاندھی ہے، جھنڈا بعض اوقات لشکر کے کمانڈر کے پاس ہوتا ہے اور بعض اوقات کمانڈر اس شخص کو تھما دیتا ہے جو لشکر میں سب سے آگے چلتا ہے۔

مسند احمد اور ترمذی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ''نبی علیہ السلام کے جھنڈے کا رنگ سیاہ تھا'' ① بعض جنگوں میں سفید کا ذکر بھی ملتا ہے۔

ابن عدی سیدنا ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کے جھنڈے پر "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُـحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" لکھا ہوتا تھا۔

یہ حدیث سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت وعظمت پر دال ہے اور ان نواصب وخوارج پر زبردست رد ہے جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر تبراء کرتے ہیں، اور ولاء پر مبنی سلوک نہیں کرتے بلکہ خوارج تو ان کی تکفیر کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اگر کسی شخص کے کفر پر مرنے کا علم ہو تو وہ اسکی تعریف وتوصیف کیسے کرسکتا ہے، اور یہ حدیث تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ایمان کی گواہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی محبت ایمان کی علامت ہے اور اوران کا بغض نفاق کی، ویسے عمومی طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ ہر مؤمن اور متقی سے محبت کرتے ہیں۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت کہ اللہ تعالیٰ صفتِ محبت سے متصف ہے۔

یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کی صداقت وحقانیت کا عظیم نشان ہے کیونکہ آپ ﷺ نے فتحِ خیبر کی پیش گوئی فرمادی تھی اور وہ اسی دن پوری ہوگئی۔

یہ حدیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علومرتبت کی بھی دلیل ہے کیونکہ وہ رات بھر جاگ کر اسی سوچ میں مگن رہے کہ خیبر کا جھنڈا کس خوش نصیب کو عطا ہوتا ہے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جس شخص کو خیبر کا جھنڈا عطا فرمانے کا ذکر فرمایا اس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کی خبر دیدی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوری

① سنن ترمذی (۱۶۸۱) امام ترمذی نے اسے "حسن" کہاہے۔ سنن ابن ماجہ (۲۸۱۸) شرح السنۃ للبغوی (۴۰۳/۱۰).

رات یہ سوچتے ہوئے کاٹ دی کہ یہ جھنڈا کس خوش نصیب کو ملتا ہے بلکہ اس خواہش پر قائم رہے کہ یہ سعادت ہمیں حاصل ہو جائے، اس سے ثابت ہوا کہ وہ حصولِ خیر کے کتنے حریص اور متمنی تھے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: مجھے صرف اس دن امارت کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس حدیث میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور منقبت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنا لعاب مبارک ان کی آنکھوں میں لگایا۔

طبرانی میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول منقول ہے کہ اس کے بعد مجھے نہ کبھی آنکھ میں درد ہوا اور نہ کبھی سر میں۔

یہ حدیث تقدیر پر ایمان لانے جیسے اہم ترین مسئلہ کو بھی واضح کر رہی ہے، چنانچہ جو لوگ جھنڈا پا لینے کی سعی کرتے رہے انہیں حاصل نہ ہو سکا، اور جس نے کچھ کوشش نہ کی بلکہ آنکھوں میں درد کے مرض میں مبتلا تھا، اسے حاصل ہو گیا۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے کچھ جنگی اصول بیان فرمائے ہیں۔ ان میں پہلا اصول یہ ہے کہ دشمن کے علاقے کی طرف بڑھنے والا لشکر انتہائی وقار، رفق ولین اور آہستگی کا مظاہرہ کرے اور عجلت، شور شرابہ اور چیخنے چلانے سے اجتناب کرے۔ اس نرمی اور آہستگی کو ضعف یا بزدلی پر محمول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اگلا جملہ شجاعت کا مظہر ہے یعنی "حَتّٰی تَنْزِلَ بِسَاحَتِهِمْ" یعنی آہستگی سے جاؤ، اور دشمن کے صحن میں جا اترو (اس سے بڑی بہادری کیا ہو سکتی ہے؟)

حدیثِ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے استدلال

اس حدیث کا سب سے اہم نکتہ، جس کا مذکورہ باب سے تعلق بھی ہے، وہ نبی ﷺ کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دینا کہ انہیں پہلے اسلام کی دعوت دینا، ایک حدیث میں الفاظ ہیں کہ جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ نبی علیہ السلام سے جھنڈا لیکر چل پڑے تو تھوڑا سا دور جا کر بلند آواز سے نبی علیہ السلام سے پوچھا کہ میں ان لوگوں سے کس چیز پر قتال کروں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم ان سے اس وقت تک قتال کرو جب تک وہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" اور "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کی گواہی نہ دے دیں، جب ایسا کر لیں تو انہوں نے اپنے خون اور مال بچا لئے، مگر کسی دوسرے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے"

اس سے واضح ہوا کہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی گواہی سے مراد، مکمل اخلاص کے ساتھ ہر طرح کے شرک کو چھوڑتے ہوئے اطاعت قبول کر لی جائے، کیونکہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا کلمہ یہودی کہا کرتے تھے، لیکن وہ اخلاصِ توحید اور ترکِ شرک کی دولت سے محروم تھے تو انہیں اس کلمے کی دعوت دینے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس

کلمہ کے اقرار کے ساتھ ساتھ معنی کا اعتقاد درست کریں، اور اسکے مقتضیٰ پر عمل کرتے رہیں، بعینہ یہی دعوت انہیں قرآن میں دی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴾ ①

''آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! ایسی انصاف والی بات کی طرف آؤ جو ہم اور تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں، نہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو ہی رب بنائیں۔ پس اگر وہ منہ پھیرلیں تو تم کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں''

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قتال سے قبل دعوت دینا فرض ہے، ہاں ایسی قوم جنہیں دعوت پہلے سے پہنچ چکی ہو لیکن وہ قبول نہیں کرتے، ان سے دعوت دیئے بغیر قتال کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بنوالمصطلق پر شب خون مارا تھا۔ لیکن اگر انہیں دعوت نہیں پہنچی تو پھر قتال سے قبل دعوت دینا فرض ہوگا۔

"يَدُوْكُوْنَ" کا معنی "يَخُوْضُوْنَ" یعنی کسی مسئلہ میں بہت زیادہ غور وخوض کرنا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب وہ اسلام کی دعوت قبول کرلیں تو انہیں اسلام کے عائد کردہ حقوق وفرائض سے آگاہ کرنا بھی ضروری ہے، مثلاً نماز، روزہ، اور زکاۃ وغیرہ۔ جیسا کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منعِ زکاۃ پر قتال فرمایا تھا کہ زکاۃ اسلام میں مال کا حق ہے، میں ایک بکری جو نبی علیہ السلام کے دور میں دیا کرتے تھے کے روک لینے پر ان سے قتال کروں گا۔

دعوت اِلی اللہ کی زبردست فضیلت

یہ حدیث دعوت کی زبردست فضیلت بیان کررہی ہے، چنانچہ اگر آپ کی دعوت سے ایک شخص بھی راہ راست پر آجاتا ہے تو یہ تمام سرخ اونٹوں سے بہتر ہوگا۔ سرخ اونٹ اہل عرب میں سب سے نفیس مال شمار ہوتا تھا، بلکہ کسی شی کی عمدگی اور نفاست کے اظہار کیلئے سرخ اونٹ ضرب المثل ہوتا تھا۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''امور آخرت کی امور دنیا سے تشبیہ فقط مسئلہ کو ذہن سے قریب کرنے کیلئے ہے وگرنہ آخرت کا ایک ذرہ پوری زمین سے قیمتی ہے'' واللہ اعلم

① (آل عمران: ٦٤)

اس باب کے مسائل

(۱) جو شخص رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا دعویدار ہے اس کیلئے انتہائی ضروری ہے کہ وہ اس دعوی کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے اللہ کے دین کی دعوت کا فریضہ ادا کرتا رہے۔ (کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا اولین اسوہ داعی إلی اللہ ہونا تھا)۔

(۲) داعی إلی اللہ، لازماً اخلاص نیت کا اہم ترین نکتہ ملحوظِ خاطر رکھے، چنانچہ بہت سے لوگ بظاہر حق کی دعوت دیتے ہیں لیکن درحقیقت وہ اپنی ذات کی طرف بلا رہے ہوتے ہیں۔

(۳) داعی الی اللہ کا عملِ دعوت کے تعلق سے بصیرت سے بہرہ مند ہونا فرض ہے۔

(۴) کسی بندے کی حسن توحید کی اہم نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہر عیب سے پاک ہونے کا عقیدہ رکھے۔

(۵) شرک کی قباحت کی ایک وجہ بھی یہی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں بہت بڑا عیب ہے۔

(۶) سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ایک مسلمان خواہ وہ خود شرک نہ بھی کرتا ہو، کو مشرکین سے دور رکھنا توحید کا اہم ترین نکتہ ہے۔

(۷) توحید دین اسلام کا سب سے پہلا فریضہ ہے۔

(۸) ایک داعی ہر شئی حتی کہ نماز سے بھی پہلے توحید کی دعوت سے اپنے مشن کا آغاز کرے۔

(۹) رسول اللہ ﷺ کے فرمان " اَنْ یُّوَحِّدُوا اللّٰه " کا وہی معنی ہے جو "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" کی گواہی دینے کا ہے۔

(۱۰) بعض لوگ باوجودیکہ اہلِ کتاب میں سے ہیں، مگر وہ "لَا اِلٰـــهَ اِلَّا اللّٰه" کی شہادت کی معرفت نہیں رکھتے، یا معرفت تو رکھتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں کرتے۔

(۱۱) حدیثِ معاذ ﷺ میں اس بات پر تنبیہ موجود ہے کہ تعلیم دینے میں تدریج (یعنی آہستہ آہستہ) کا پہلو برقرار رکھا جائے۔

(۱۲) دعوت وتعلیم میں "اَهَمْ فَالْاَهَمْ" کے قاعدے کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔

(۱۳) زکاۃ کا مصرف معلوم ہوا یعنی علاقے کے مالداروں سے لیکر اسی علاقے کے غریبوں میں تقسیم کر دی جائے۔

(۱۴) استاد اپنے طالب علم کے شکوک وشبہات کو دور کرنے کی کوشش کرے۔

(۱۵) عاملِ زکاۃ کو عمدہ مال وصول کرنے سے روکنا ثابت ہوا۔

(۱۶) مظلوم کی آہ سے ڈرتے رہنا چاہئے۔

(۱۷) یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اور مظلوم کی آہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔

(۱۸) توحید کی خاطر سید المرسلین ﷺ اور صحابہ کرام ؓ بڑی مشقتوں، فاقوں اور بیماریوں سے دوچار ہوئے (لیکن انکی توحید متزلزل نہ ہوئی، جس سے ثابت ہوا کہ مستحکم اور ٹھوس توحید کی یہی نشانی ہے۔)

(۱۹) نبی ﷺ کا فرمان: "لَأُعْطِيَنَّ الرَّأْيَةَ" ''میں جھنڈا عطا کرونگا'' آپ ﷺ کی نبوت کی صداقت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

(۲۰) آپ ﷺ کا سیدنا علی ؓ کی آنکھوں میں لعاب لگانا (اور ان کا شفایاب ہوجانا) بھی آپ کی نبوت کی صداقت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

(۲۱) سیدنا علی ؓ کی فضیلت کا اثبات۔

(۲۲) صحابہ کرام ؓ کی فضیلت عیاں ہوتی ہے کہ وہ فتح خیبر کی بشارت کو نظر انداز کرکے رات بھر یہی سوچتے رہے کہ نبی ﷺ خیبر کا جھنڈا کسے عطا فرماتے ہیں۔

(۲۳) ''ایمان بالقدر'' کا مسئلہ نکھر کا سامنے آیا کیونکہ جس نے جھنڈا حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اسے مل گیا، اور جنہوں نے کوشش کی انہیں نہ مل سکا۔

(۲۴) نبی ﷺ کے فرمان "عَلٰى رِسْلِكَ" یعنی انتہائی متانت، وقار اور آہستگی سے میدانِ جہاد میں جانا، میں ادبِ قتال ہے۔

(۲۵) قتال سے قبل اسلام کی دعوت دینا فرض ہے۔

(۲۶) جنہیں پہلے دعوت دی جاچکی ہو اور ان سے قتال بھی کیا جاچکا ہو انہیں بھی دعوت دینا مشروع ہے۔

(۲۷) دعوتِ دین میں حکمت کا پہلو ملحوظ رکھا جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ انہیں ضروری امور سے باخبر کرو۔

(۲۸) اسلام میں اللہ تعالیٰ کے، بندوں پر جو حقوق ہیں انہیں کو پہچاننا ضروری ہے۔

(۲۹) جس شخص کے ہاتھوں ایک شخص اسلام قبول کرلے وہ کتنے اجر وثواب کا مستحق ہے۔

(۳۰) فتویٰ پر قسم کھائی جاسکتی ہے۔

باب تفسیر التوحید وشہادۃ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اللّٰہُ

عقیدہ توحید اور کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کی شہادت کا صحیح مطلب ومفہوم

سابقہ ابواب میں مصنف رحمہ اللہ نے توحید کے تعلق سے بعض اہم موضوعات کا ذکر فرمادیا ہے جن میں توحید کے فضائل ،توحید کی طرف دعوت دیتے رہنے کی فرضیت ،توحید کی ضد یعنی شرک کی تباہ کاریاں جیسے موضوعات ہیں ۔اب یقیناً لوگ اس بات کے مشتاق و متمنی ہوں گے کہ وہ توحید کے اصل معنی ومفہوم کو پہچانیں کہ جس کی خاطر مخلوقات پیدا کی گئیں ،اور جس کی شان یہ ہے کہ توحید پر مرتے دم تک قائم رہنے والا خواہ زمین بھر گناہ کر چکا ہو جب اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کردیگا۔

مؤلف رحمہ اللہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ توحید محض نام نہیں کہ جس کا کوئی معنی نہ ہو یا فقط ایک قول نہیں کہ جس کی کوئی حقیقت نہ ہو۔ یہ مقام افسوس ہے کہ بعض جہلاء محض کلمہ شہادت کے پڑھ لینے ہی کو غایتِ توحید تصور کرتے ہیں ،جبکہ کچھ جہلاء تھوڑا سا آگے بڑھکر صرف اس حد تک قائل ہوتے ہیں کہ " الـــہ " سے مراد خالق ومالک ہے ،لہذا صرف توحیدِ ربوبیت کے اقرار سے مکمل توحید حاصل ہوجائیگی۔

واضح ہو کہ یہ دونوں مفہوم باطل ہیں ،توحید تو بڑے عظیم اور جلیل معنی پر مشتمل ایک عقیدہ ہے ،اس معنیٰ کا حاصل یہ ہے کہ توحید ہر ماسوی اللہ کی عبادت سے مکمل طور پر بریٔ ہونے اور ہر قسم کی عبادت کے ساتھ ،نیز دل وجان کی گہرائیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا نام ہے۔سورۂ بقرۃ کی آیت :﴿ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ ﴾ میں مذکور ''کفر بالطاغوت'' اور ''ایمان باللہ'' کا یہی معنی ہے۔ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴾ ①

''اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے ،اسکے علاوہ معبودِ برحق کوئی نہیں ،وہ نہایت رحم کرنے والا اور بخشنے والا ہے''

سورۂ یاسین میں مذکور مؤمن کا عقیدۂ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْــًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ○ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ ②

''مجھے کیا ہوگیا ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ،اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۔کیا میں اسے چھوڑ کر ایسوں کو معبود بناؤں کہ اگر رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی سفارش مجھے کچھ بھی نفع نہ پہنچاسکے ،اور نہ وہ مجھے بچاسکیں ۔پھر تو میں یقیناً کھلی اور واضح گمراہی میں ہوں ۔''

---

① (البقرة : ١٦١)

② (یس : ٢٢ ...... ٢٤)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قُلْ اِنِّیٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ . وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ . قُلْ اِنِّیٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ . قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ ﴾ ①

''آپ کہہ دیجئے! کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کروں کہ اسی کے لئے عبادت کو خالص کرلوں۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا فرماں بردار بن جاؤں۔ کہہ دیجئے! کہ مجھے تو اپنے رب کی نافرمانی کرتے ہوئے بڑے دن کے عذاب کا خوف لگتا ہے۔ کہہ دیجئے! کہ میں تو خالص کر کے صرف اپنے رب ہی کی عبادت کرتا ہوں۔''

اللہ تعالیٰ نے مؤمنِ آل فرعون کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَیٰقَوْمِ مَا لِیْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَی النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَی النَّارِ . تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَی الْعَزِیْزِ الْغَفَّارِ . لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ لَیْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِی الدُّنْیَا وَلَا فِی الْاٰخِرَةِ ﴾ ②

''اے میری قوم! یہ کیا بات ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف بلا رہا ہوں، اور تم مجھے دوزخ کی طرف بلا رہے ہو۔ تم مجھے یہ دعوت دے رہے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کروں جس کا کوئی علم مجھے نہیں، اور میں تمہیں غالب بخشنے والے (معبود) کی طرف دعوت دے رہا ہوں۔ اور یہ یقینی امر ہے کہ تم مجھے جس کی طرف بلا رہے ہو وہ تو نہ دنیا میں پکارے جانے کے قابل ہے اور نہ آخرت میں، اور یہ (بھی یقینی بات ہے) کہ ہم سب کا لوٹنا اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، اور حد سے گزر جانے والے ہی (یقیناً) اہل دوزخ ہیں۔''

قرآن حکیم میں اس معنی کی بے شمار آیات موجود ہیں جو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ توحید اور "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا اصل معنی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمام سفارش کرنے والوں اور شریکوں کی عبادت سے مکمل براءت کا اعلان کر دیا جائے، اور اکیلے اللہ تعالیٰ کو عبادت کا مستحق قرار دے دیا جائے۔ یہی ہدایت اور دین حق ہے جسے انبیاء کرام علیہم السلام لیکر آئے اور جس کا مفصل بیان لیکر اللہ تعالیٰ کی کتابیں نازل ہوئیں۔ جو انسان محض "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" پڑھ لے، اور نہ تو اسکے معنی کی معرفت ہو اور نہ ہی اسکے مقتضی پر عمل ہو، اسی طرح جو انسان اہل توحید میں سے ہونے کا دعویٰ کرے اور وہ توحید کو پہچانتا ہی نہ ہو، تو اس شخص سے اس کی توحید یا اس کا "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہنا کچھ کفایت نہ کرے گا، اور جو شخص عدمِ معرفت اور عدمِ عمل کے ساتھ ساتھ کسی عبادت، مثلاً: دعا، خوف، ذبح، نذر، توبہ و انابت وغیرہ، میں غیر کو بھی اللہ کا شریک بنا لیتا ہے، تو وہ مشرک ہے۔

① (الزمر: ١١ ...... ١٤)
② (غافر: ٤١ ...... ٤٣)

قولہ تعالیٰ: ﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ﴾ ①

''جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں خود وہ اپنے رب کے تقرب کی جستجو میں رہتے ہیں کہ ان میں سے کون زیادہ نزدیک ہو جائے، وہ خود اس کی رحمت کی امید رکھتے اور اسکے عذاب سے خوفزدہ رہتے ہیں، (بات بھی یہی ہے) کہ تیرے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہی ہے۔''

آیتِ کریمہ ﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ..... ﴾ سے ''لا إلٰہ الا اللہ'' کے صحیح مفہوم کا بیان

اس مذکورہ بالا آیت کریمہ کا مکمل معنی سمجھنے کیلئے اس سے پہلی آیت پڑھنا ضروری ہے۔

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا ﴾ ②

''کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جنہیں تم معبود سمجھ رہے ہو انہیں پکارو، لیکن نہ تو وہ تم سے کسی تکلیف کو دور کرسکتے ہیں اور نہ بدل سکتے ہیں۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ ان مشرکین سے کہیئے کہ اللہ کے سوا تم نے جو انداد و شرکاء بنا رکھے ہیں انہیں تم جتنا بھی پکار لو اور جس قدر چاہو ان کی طرف مائل ہو جاؤ وہ تمھاری کوئی تکلیف بالکلیہ ٹالنے کی کوئی طاقت نہیں رکھتے بلکہ انہیں اتنی قدرت بھی نہیں ہے کہ اس تکلیف کو کسی دوسرے کی طرف تحویل کردیں۔''

مقصد یہ ہے کہ تکلیف کے ٹالنے یا تحویل کرنے پر صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ ہی قادر ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''کہ یہاں جو مشرکین مخاطب ہیں وہ درحقیقت ملائکہ، سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور سیدنا عزیر علیہ السلام کی عبادت کرتے تھے۔''

اسی طرح صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کریمہ کی تفسیر میں منقول ہے ''کہ درحقیقت کچھ انسان بعض جنوں کی عبادت کرتے تھے پھر وہ جن تو حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے، مگر وہ لوگ ان کی عبادت پر قائم رہے۔ تو اللہ رب العزت ان مشرکین کو باوجودیکہ وہ ملائکہ اور انبیاء و صالحین علیہم السلام کی عبادت کرتے تھے، فرما رہا ہے کہ یہ تمہارے کسی کام نہیں آسکتے اور نہ تمہاری کسی تکلیف کا ازالہ کرسکتے ہیں، نہ اسے پھیر سکتے ہیں بلکہ وہ خود اللہ تعالیٰ تک قرب اور رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور اس سے

① (بنی اسرائیل: ٥٧)

② (بنی اسرائیل: ٥٦)

قریب تر ہونے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں ۔انکی تمام تر امیدیں اسی کی رحمت کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کے عذاب سے وہ ہمہ وقت خائف رہتے ہیں'' ①

مفسر طبری کے قول کے مطابق یہاں وہ مشرکین مراد ہیں جو اپنے بتوں سے استغاثہ کیا کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ ان سے فرما رہا ہے کہ وہ تمہاری کسی تکلیف کو ٹالنے یا پھیرنے کی کوئی قدرت نہیں رکھتے۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ان آیات کی تفسیر میں یہ سارے اقوال حق ہیں، اور یہ آیات ان تمام معبودوں کے ذکر پر مشتمل ہیں جنہیں لوگوں نے معبود بنالیا حالانکہ وہ خود اللہ تعالیٰ کے عابد ہیں خواہ ان کا تعلق فرشتوں سے ہو یا جنوں سے یا انسانوں سے۔اب حالانکہ یہ تمام ملائکہ، انبیاء علیہم السلام وصالحین ، اور جن وغیرہ اللہ تعالیٰ کے انتہائی مقرب ہیں مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت کرنے یا انہیں پکارنے سے منع فرمادیا اور ساتھ ہی یہ فرمادیا کہ ان کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے، وہ تو خود اللہ تعالیٰ کے قرب کے متمنی ومتلاشی ہیں، اور ہمہ وقت خوف ورجاء کی کیفیت سے دوچار رہتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف اور اسکی رحمت کی طمع وامید۔''

اس سے واضح ہوا کہ کلمہ ''لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ'' اور عقیدۂ توحید کا معنی یہ ہے کہ نیک لوگوں، خواہ ان کا تعلق ملائکہ سے ہو یا انسانوں سے ہو یا جنوں سے، کی عبادت ترک کرنا ضروری ہے، نہ انہیں پکارنا جائز ہے اور نہ ان کا وسیلہ جائز ہے۔اور مشرکین تو انہیں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے تھے، تو ان لوگوں کا انجام کیا ہوگا جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر انہیں کے ہو رہیں، لہذا توحید محض دعوی سے ثابت نہیں ہوتی، بلکہ کلمہ توحید کے مجرد نطق یعنی محض اقرار سے بھی ثابت نہیں ہوتی، اس کیلئے ضروری ہے کہ جتنے بھی مشرکین ہیں ان سے اور انکے دین سے مکمل براءت اور مفارقت (علیحدگی) اختیار کرلی جائے۔

① صحیح بخاری، کتاب التفسیر رقم (٤٧١٤)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ إِنَّنِي بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ . إِلَّا الَّذِي فَطَرَنِي فَإِنَّهُ سَيَهْدِينِ. وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴾ ①

''جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے اور اپنی قوم سے فرمایا کہ میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ بجز اس ذات کے جس نے مجھے پیدا کیا، اور وہی مجھے ہدایت بھی دے گا۔ اور (ابراہیم علیہ السلام) اسی کو اپنی اولاد میں باقی رہنے والی بات قائم کر گئے تا کہ لوگ (شرک سے) باز رہتے رہیں۔''

قولہ: ﴿ اِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ﴾ ②

''ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنایا ہے''

اسوۂ ابراھیمی علیہ السلام کی روشنی میں کلمہ ''لا إلٰہ الا اللہ'' کی شہادت کا مفہوم

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے بندے، رسول اور خلیل جو ''امام الحنفاء'' تھے، اور ان کے بعد جتنے بھی انبیاء علیہم السلام آئے، ان سب کے باپ تھے، کا عقیدہ و منہج بیان فرمایا ہے، چنانچہ وہ عقیدۂ و منہج یہ ہے کہ انہوں نے اپنے باپ اور پوری قوم سے مکمل براءت اور بیزاری کا محض اس بناء پر اعلان فرما دیا کہ وہ لوگ شرک میں مبتلا تھے، اور بعینہ یہی عقیدۂ و منہج وہ کلمہ باقیہ ہے جسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنی ذریت یعنی اولاد میں چھوڑ گئے تا کہ وہ اسی منہج کی اقتداء کریں۔

قتادہ رحمہ اللہ، جو کہ علماءِ تابعین میں سے ہیں ''کلمۂ باقیۃ'' کی تفسیر اخلاص اور توحید سے کرتے ہیں، تو معنی یہ کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں اہل توحید ہمیشہ موجود رہیں گے، جنکی پہچان یہ ہوگی کہ وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے منہج کی پیروی کرتے ہوئے ہر قسم کے شرک اور اہل شرک سے براءت اور بیزاری کا اظہار کرتے رہیں گے اور فعلاً صرف ایک اللہ رب العزت کی عبادت کرتے رہیں گے، وہ کلمے کو محض نطق و اقرار کا کلمہ نہیں بنائیں گے، بلکہ عملی طور پر توحید کے اثبات کے لئے وہ سارے امور انجام دیں گے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام انجام دیتے رہے۔ لہٰذا توحید اور ''لَا اِلٰـــہَ اِلَّا اللّٰہ'' کی شہادت کا یہی معنی ہوگا کہ ولاء اور براء (دوستی اور دشمنی) کی اساس اللہ رب العزت کی ذات ہے۔ (یعنی توحید خالص۔)

آیتِ کریمہ ﴿اِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ....﴾ کی روشنی میں کلمہ ''لا إلٰہ الا اللہ'' کی شہادت کی صحیح تفسیر

اس آیت کریمہ کی تفسیر خود رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے، چنانچہ سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ اسلام قبول =

① (الزخرف: ۲۶ ...... ۲۸) ② (التوبہ: ۳۱)

قوله تعالیٰ : ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ ①

''بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے شریک اوروں کو ٹھہرا کر ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں، جیسی محبت اللہ تعالیٰ سے ہونی چاہئے، اور ایمان والے اللہ تعالیٰ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں''

کر کے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ اسی آیت کریمہ کی تلاوت فرما رہے تھے تو سیدنا عدی رضی اللہ عنہ نے کہا: کہ یہود ونصاری نے تو اپنے علماء ورھبان کی عبادت نہیں کی؟۔ (پھر قرآن نے یہ کیسے کہہ دیا کہ انہوں نے انہیں رب بنایا ہوا تھا) تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کہ دراصل ان کے علماء نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا، اور وہ ان کے پیروکار بنے رہے اور یہی ان کی عبادت ہے۔'' ②

چنانچہ یہاں جو شرک کی شکل منقول ہے وہ یہ ہے کہ حلال وحرام میں قرآن وحدیث کو پسِ پشت ڈال کر علماء کے فتاویٰ اور آراء کو قبول کر لیا جائے۔ تو یہاں مصنف رحمہ اللہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تحریم اور تحلیل میں علماء کی اطاعت کرنا ان کی عبادت کرنا ہی ہے اور عبادت تو صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے، جس نے کسی مخلوق کی اطاعت کی وہ درحقیقت اس کی عبادت کر رہا ہے، تو گویا توحید اور کلمہ ''لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ'' کی صحیح تفسیر اور مکمل تفسیر میں یہ بات بھی شامل ہوگی کہ صرف اللہ رب العزت کی اطاعت کی جائے، اور چونکہ رسول اللہ ﷺ، اللہ تعالیٰ کے مأذون ومرسل ہیں، اور انکی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے، لہٰذا خالصتاً صرف انہیں کا پیروکار بن کر رہا جائے۔ اس آیتِ کریمہ پر غور کرنے سے اصلِ توحید اور کلمہ ''لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ'' کا معنی خوب نکھر جاتا ہے، چنانچہ جب شرکِ اطاعت کا معاملہ اس قدر شدید ہے تو پھر شرکِ عبادت کا معاملہ کتنا خوفناک اور خطرناک ہوگا؟

آیتِ کریمہ ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ....﴾ کی روشنی میں توحید کا مفہوم

وقوله: قوله تعالیٰ : وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا....

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مؤلف رحمہ اللہ نے ذکر کردہ مسائل کے ضمن میں فرمایا ہے کہ توحید اور کلمہ ''لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ'' کی تفسیر سورۂ بقرۃ کی اس آیت سے ہو رہی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا ذکر کیا اور فرمایا کہ وہ جہنم سے کبھی باہر نہیں آ سکیں گے، ان کا شرک صرف یہ تھا کہ وہ اپنے انداد اور شرکاء سے اللہ تعالیٰ جیسی محبت

---

① (البقرۃ: ١٦٥)

② سنن ترمذی (٣٠٩٥) سنن الکبریٰ بیہقی (١١٦/١٠) ابن جریر(١٦٦٣١) طبری (١٦٦٣٤) البانی رحمہ اللہ نے اسے ''حسن'' کہا ہے۔

وفی الصحیح عَنِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ: مَنْ قَالَ: "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَكَفَرَ بِمَا يُعْبَدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَرُمَ مَالُهٗ وَدَمُهٗ وَحِسَابُهٗ عَلَى اللّٰهِ" (١)

صحیح مسلم میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا اقرار کر لے، اور اللہ تعالیٰ کے سوا جس جس کی عبادت کی جاتی ہے ان سب کا انکار کر دے، تو اس کا مال و خون یعنی محفوظ ہو گیا، اور اس کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔''

=

کرتے تھے، اس سے ثابت ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بھی خوب محبت کرتے تھے مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں دائرہ اسلام میں داخل نہیں فرمایا، تو پھر اس شخص کا معاملہ کتنا خطرناک ہو گا جو اپنے انداد و شرکاء سے اللہ تعالیٰ سے بڑھکر محبت کرتا ہو؟ اور اس شخص کا معاملہ کتنا خطرناک ہو گا جو تمام تر محبت اپنے انداد و شرکاء سے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں کرتا؟ یہاں مصنف رحمہ اللہ کا مقصود یہ بتانا ہے کہ توحید اور کلمہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کے معنی میں بنیادی طور پر یہ بات شامل ہے کہ صرف اللہ رب العزت ہی اصل محبت کا مستحق ہے، وہ محبت جو اخلاصِ عبادت کو موجب و مستلزم ہے، محبت میں یہ تفاضل ایمان و عمل اور ان کی جزاء کے تفاضل کو مستلزم ہے۔ واللہ اعلم

ایسی عظیم الشان حدیث جو کلمہ ''لا إلٰہ الا اللہ'' کی شہادت کا معنی واضح کرتی ہے

وقوله: وفی الصحیح عَنِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ: مَنْ قَالَ:......

یہ حدیث صحیح مسلم میں سیدنا طارق بن اشیم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے مال اور جان کی حفاظت کو دو چیزوں سے معلق فرمایا ہے:

(۱) "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا اقرار (۲) اللہ کے سوا جس جس کی پوجا کی جاتی ہے ان سب کا کفر و انکار۔

اب یہاں غور کیجئے کہ مجرد نطق (محض اقرار) کلمہ کو کافی نہیں سمجھا گیا، صرف کلمے کے تلفظ پر مال و جان کی حفاظت کی ضمانت نہیں دی گئی بلکہ تلفظِ کلمہ کے ساتھ ساتھ اگر معرفتِ کلمہ بھی حاصل ہے پھر بھی مال و جان کی حفاظت کی ضمانت نہیں ہے، بلکہ اس تلفظ اور معرفت کے ساتھ اقرار بھی شامل ہو جائے بلکہ اقرار کے ساتھ ساتھ بندہ پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگا دے تو پھر بھی مال و جان کی حفاظت نہیں ہے، یہ ضمانت اسی صورت ملے گی کہ کلمہ توحید کے تلفظ، معرفت، اقرار اور عملی طور پر زندگی بھر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ

---

(١) صحیح مسلم، کتاب الایمان (٩٤٢٦)

ساتھ اللہ کے علاوہ تمام معبودوں کا انکار کردے، اگر اس انکار میں کسی قسم کا شک یا تردد بھی شامل ہو تو پھر بھی مال و جان محفوظ نہیں۔ یہی بیان رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث میں موجود ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ مَرْفُوْعًا" اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَیُؤْمِنُوا بِیْ وَبِمَا جِئْتُ بِهِ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَائَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ "①

سیدنا ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے لوگوں سے اس وقت تک قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جب تک وہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی گواہی نہ دے دیں، اور مجھ پر اور جو شریعت میں لیکر آیا ہوں اس پر ایمان نہ لے آئیں، جب وہ ایسا کر لینگے تو اپنا خون اور مال مجھ سے بچا لینگے، اِلَّا یہ کہ اس گواہی کے کسی حق کو پامال کر دیں، اور اللہ تعالیٰ ان سے حساب لے لیگا۔''

مصنف رحمہ اللہ نے اس باب میں کتاب وسنت کے دلائلِ قاطعہ سے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" اور عقیدۂ توحید کی صحیح تفسیر پیش کی ہے۔ اس باب کے آخر میں مزید فرماتے ہیں: "وشرح هذه الترجمة ما بعدها من الابواب" کہ ''اس باب کی مزید شرح اگلے ابواب میں آرہی ہے''، چنانچہ اگلے ابواب میں مصنف رحمہ اللہ نے بہت سی عبادات اور بہت سے اعتقادات کو جمع فرما دیا ہے جو توحید اور کلمہ توحید "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی مزید حقیقت اور تفسیر کو واضح کریں گے۔ (واللّٰہ هو الموفق)



① صحیح مسلم، کتاب الإیمان، رقم (٢١/ ٣٤)

اس باب کے مسائل

اس باب میں جو سب سے بڑا اور اہم مسئلہ بیان ہوا وہ توحید اور "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی حقیقی گواہی کی اصل تفسیر ہے، یہ تفسیر بڑے واضح امور کے ساتھ بیان ہوئی، جن میں پہلے تو سورۃ الاسراء کی آیت ہے جس میں اللہ رب العزت نے ان مشرکین کا رد فرمایا جو صالحین اور مقربین کو پکارا کرتے تھے، اور یہ بات واضح کردی کہ ان کا یہ عمل شرکِ اکبر ہے۔

وہ امور جن کے ذکر سے توحید کی تفسیر کی، ان میں سے ایک امر ''سورۂ براءۃ'' کی مذکورہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا کہ اہل کتاب نے اپنے علماء اور راھبوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا اپنا رب بنالیا، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ انہیں تو ایک اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس سے واضح ہوا کہ ان کے جس عمل کو شرک قرار دیا گیا وہ علماء اور درویشوں کی عبادت کرنا تھا یعنی ان کے حلال وحرام کو معصیتاً ماننا تھا، وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے اور نہ ہی انہیں پکارتے تھے (جس سے ثابت ہوا کہ توحید کی تفسیر میں یہ بات بھی نمایاں ہے کہ خالص اللہ رب العزت کی اطاعت کرنا ہی توحید ہے، محمد ﷺ کی اتباع کا حکم صرف اس لئے ہے کہ ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار دی گئی ہے، اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت کرنا ان کی عبادت کرنا ہے اور عبادت تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے، لہٰذا یہ اطاعت سراسر عقیدۂ توحید کے منافی ہے)

توحید کی تفسیر جن امور سے کی گئی ان میں ایک امر سیدنا ابراھیم خلیل اللہ علیہ السلام کا وہ قول ہے جو انہوں نے مشرکین سے کہا: ''کہ میں تمہارے تمام معبودوں سے جنہیں تم اللہ تعالیٰ کے سوا پوجتے ہو براءت کا اظہار کرتا ہوں، اور صرف اس اللہ رب العزت کی عبادت کرتا ہوں جس نے مجھے پیدا فرمایا''، اب یہاں سیدنا ابراھیم علیہ السلام نے تمام معبودوں میں سے صرف ایک معبود یعنی اللہ تعالیٰ کا استثناء کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عمل کو عینِ توحید قرار دیا۔ ثابت ہوا کہ یہ براءت اور اس کے مقابلے میں یہ موالات توحید اور کلمہ توحید "لَا اِلٰـــــہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی تفسیر ہے۔ پھر اللہ رب العزت نے اس براءت اور موالات کو ان کی آئندہ آنیوالی نسلوں میں مستقل باقی رکھنے کا فیصلہ فرمایا تاکہ لوگ اس معرکۃ الآراء عقیدے کو سیدنا ابراھیم علیہ السلام کا منہج سمجھتے ہوئے اس کے پیروکار بنے رہیں۔

جن امور سے کلمہ توحید کی تفسیر کی گئی ان میں ایک امر ''سورۃ البقرۃ'' کی مذکورہ آیت ہے، جس میں اللہ تعالیٰ

نے مشرکین کا ذکر کیا اور ان کے تعلق سے فرمایا کہ وہ کبھی جہنم سے باہر نہیں نکل سکیں گے، پھر بیان فرمایا کہ ان کا شرک یہ تھا کہ وہ اپنے معبودوں سے اللہ تعالیٰ جیسی محبت کرتے تھے، جس کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بھی عظیم محبت کا دم بھرتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ دائرہ اسلام میں داخل نہ ہو سکے اور قیامت کے دن جہنم سے خارج نہ ہو سکیں گے۔ تو پھر اس شخص کا انجام کتنا بھیانک ہوگا جو اپنے معبودوں سے اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبت کرتا ہو؟ اور اس شخص کا انجام کتنا خطرناک ہوگا جو صرف اپنے معبودوں سے محبت رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں کرتا؟

جن امور سے کلمہ توحید کی تفسیر کی گئی ان میں سے ایک امر نبی ﷺ کی مذکورہ حدیث بھی ہے جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ ''جس شخص نے "لَا اِلٰــــہَ اِلَّا اللّٰہُ" کا اقرار کرلیا، اور اللہ تعالیٰ کے سوا جس جس کی عبادت کی جاتی ہے ان سب کا انکار کردیا تو اس کی مال وجان محفوظ ہوگئی، اس کے حساب کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے'' یہ حدیث "لَا اِلٰــــہَ اِلَّا اللّٰہُ" کے معنی کو خوب واضح کررہی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے محض کلمہ "لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ" کے تلفظ کو جان ومال کی عصمت وحفاظت کا سبب قرار نہیں دیا، بلکہ اگر کوئی شخص تلفظ کے ساتھ ساتھ اس کے معنی کو بھی پہچانتا ہے، بلکہ معنی پہچاننے کے ساتھ ساتھ اس کا اقرار بھی کرتا ہے، بلکہ ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ اس کا کردار یہ ہے کہ وہ صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کرتا ہے، اور کسی کی نہیں، تو ان تمام چیزوں کے باوجود اس کے مال وجان کی عصمت وحفاظت کی ضمانت نہیں ہے، بلکہ یہ ضمانت صرف اس صورت ہے کہ وہ اس کلمہ کے تعلق سے ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ ہر ماسوی اللہ معبود کا کھلم کھلا انکار کرے، اگر اسے اس انکار میں شک ہے یا وہ اس انکار میں توقف کا مرتکب ہے تو اس کی مال وجان محفوظ نہیں۔

اس حدیث نے کیا پیارے انداز سے اس مسئلہ کی عظمت وجلالت کا ذکر کردیا، اور کیا خوب وضاحت سے کلمہ توحید "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی تفسیر بیان کردی، اور یہ حدیث مخالفین کے عقیدوں کے خلاف کیا خوب دلیلِ قاطع بن گئی۔



باب من الشرك لبس الحلقة والخيط ونحوها لرفع البلاء أو دفعه

رفعِ بلاء اور دفعِ مصائب کیلئے چھلّا یا دھاگا پہننا شرک ہے

قول الله تعالیٰ: ﴿ اَفَرَأَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ قُلْ حَسْبِيَ اللهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴾ ①

''اچھا یہ تو بتاؤ جنہیں تم اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہو اگر اللہ تعالیٰ مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو کیا یہ اسکے نقصان کو ہٹا سکتے ہیں؟ یا اللہ تعالیٰ مجھ پر مہربانی کا ارادہ کرے تو کیا یہ اس کی مہربانی کو روک سکتے ہیں؟ آپ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے، توکل کرنے والے اسی پر توکل کرتے ہیں۔''

رفعِ بلاء سے مراد تکلیف حاصل ہونے کے بعد اسے ٹالنا، جب کہ دفعِ بلاء سے مراد تکلیف کے حصول سے قبل اسے روک دینا ہے۔

اس باب کو کتاب التوحید میں ذکر کرنے کی وجہ

مصنف رحمہ اللہ نے توحید اور کلمہ ''لَا اِلٰـــهَ اِلَّا اللهُ'' کی شہادت کی تفسیر انتہائی احسن انداز سے بیان فرمادی، اب یہاں سے چندان امور کا ذکر شروع فرمایا جو شرکِ اکبر یا اصغر کے ضمن میں آتے ہیں، اور اس سے مؤلف رحمہ اللہ کا مقصود توحید کے مفہوم کو مزید نکھارنا ہے، کیونکہ قاعدہ ہے ''وَبِـضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ'' ''کسی چیز کی ضد کے بیان سے وہ مزید نکھر جاتی ہے''

لہذا جو شخص شرک کو نہیں جانتا وہ کما حقہ توحید بھی نہیں پہچان سکتا، اسی طرح توحید کو نہ پہچاننے والا شرک کی معرفت سے قاصر ہے۔ تو چونکہ توحید اور شرک دونوں کی پہچان ضروری ہے اور توحید کی پہچان گزشتہ ابواب میں خوب ہو چکی ہے، لہذا اب چند شرکیہ امور کا ذکر ہوتا ہے۔

آیتِ کریمہ سے استدلال

وقوله:قول الله تعالیٰ: اَفَرَاَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللهُ......

اس آیتِ کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ اللہ رب العزت اپنے نبی ﷺ کے ذریعے مشرکینِ مکہ سے پوچھتا ہے کہ جن معبودوں کی تم عبادت کرتے ہو اور ان کے مختلف نام بھی رکھے ہوئے ہیں، بلکہ بعض کے مؤنث نام ہیں جو عجز اور ضعف کی علامت ہیں، کیا وہ اللہ تعالیٰ کے امر سے پہنچی ہوئی کوئی تکلیف، فقر یا مرض ٹالنے کی طاقت

① (الزمر ۳۸)

رکھتے ہیں؟ یا اگر اللہ تعالیٰ رحمت کا فیصلہ فرمالے اور صحت، عافیت اور خیر پہچانے کا ارادہ فرمالے تو کیا وہ اسے روکنے کی قدرت رکھتے ہیں؟ معروف مفسر مقاتل کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے انہیں بلا کر ان سے یہ بات معلوم کی تو وہ سب خاموشی ہی اختیار کیئے رہے، اور لاجواب ہوگئے، کیونکہ یہ بات تو وہ خود بھی جانتے تھے کہ ہمارے یہ معبود عند اللہ محض وسائط وشفعاء ہیں، انہیں مضطر کی دعا قبول کرنے یا مصائب کو ٹالنے کی قطعاً کوئی طاقت وصلاحیت میسر نہیں۔

واضح ہو کہ اس آیت کریمہ کے عموم میں ہر وہ معبود داخل وشامل ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا پکارا گیا، خواہ وہ فرشتہ ہو یا نبی یا ولی ہو دوسروں کی تو بات ہی کیا، تو جب یہ لوگ کسی کشفِ ضر یا امساکِ خیر کی قدرت نہیں رکھتے تو پھر ان کی عبادت کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے۔ اور جب ان کی عبادت باطل ہے تو پھر مشرکین کے تراشے ہوئے بتوں اور مقرر کیئے ہوئے معبودوں کی عبادت تو ابطل الباطل ہوگی، اور پھر غور کریں کہ ازالۂ مصائب اور دفعِ مشاکل کیلیئے دھاگے اور چھلے کی کیا حیثیت رہ جائیگی۔

اس آیت کریمہ کے ذکر سے مؤلف رحمہ اللہ یہی نکتہ سمجھانا چاہتے ہیں، کچھ لوگ دھاگے اور چھلے اور اس قسم کے دیگر امور سے انتفاع کے جواز کے لئے ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو مراسیل ابی داؤد میں علی بن حسین سے مرفوعاً مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں ''کھیتی باڑی کرو کیونکہ یہ مبارک پیشہ ہے، اور اس میں کثرت سے گدھوں (یا دیگر جانوروں) کی کھوپڑیاں رکھا کرو'' ①

ایک اور حدیث میں کھوپڑیاں رکھنے کی علت نظر بد سے حفاظت، بیان ہوئی ہے۔ ②

لیکن اس قسم کی احادیث سے استدلال درست نہیں ہے، کیونکہ یہ دونوں حدیثیں ساقط ہیں، اول الذکر مرسل ہے اور ثانی الذکر منقطع ہے، اور امام سیوطی رحمہ اللہ نے دونوں کو ضعیف کہا ہے، اور بر تقدیر تسلیم صحت لفظِ ''جماجم'' جو اس حدیث میں وارد ہوا ہے کی تفسیر ''بیج'' سے بھی کی گئی ہے، پھر کوئی اشکال باقی نہ رہیگا۔ پھر کچھ لوگ جانوروں کے سر کھیتوں میں اس لئے بھی رکھتے تھے کہ پرندے دور رہیں، اس صورت میں بھی کوئی اشکال باقی نہ رہیگا، پھر نبی ﷺ اس قسم کے دھاگوں اور چھلوں کے کاٹنے اور اتارنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ ③

=

① یہ حدیث مرسل ہے۔ ابوداؤد نے ''المراسیل'' (۵۴۰) میں علی بن عمر کے طریق سے روایت کیا ہے۔ ابن حبان نے اس روای کو ثقہ کہا ہے اور کہا ہے: اس کی وہ حدیث معتبر ہے جو اس کے بیٹوں کے طریق سے نہ ہو۔ باقی تمام راوی ثقہ ہیں۔

② یہ روایت شدید ضعیف ہے، امام هیثمی المجمع (۱۰۹/۵) میں فرماتے ہیں: اس حدیث کو بزار نے روایت کیا ہے، اس میں هیثم بن محمد بن حفص اور یعقوب بن محمد الزهری ضعیف راوی ہیں۔

③ صحیح بخاری، کتاب الجهاد (۳۰۰۵) صحیح مسلم، کتاب اللباس (۲۱۱۵)

وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ ﷺ: اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ رَأَى رَجُلًا فِي يَدِهِ حَلْقَةٌ مِّنْ صُفْرٍ فَقَالَ مَا هٰذِهِ؟ قَالَ مِنَ الْوَاهِنَةِ فَقَالَ :"اِنْزِعْهَا فَاِنَّهَا لَا تَزِيْدُكَ اِلَّا وَهْنًا فَاِنَّكَ لَوْمُتَّ وَهِيَ عَلَيْكَ مَا اَفْلَحْتَ اَبَداً۔" (رواه احمد بسند لابأس به) ①

سیدنا عمران بن حصین ﷺ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کے ہاتھ میں پیتل کا چھلا دیکھا، فرمایا: تجھ پر افسوس! یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: یہ واھنہ کے مرض کے علاج کیلئے ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے اتار پھینک، یہ تمھیں کمزوری کے علاوہ کوئی فائدہ نہ دیگا اور اگر اس چھلے کو پہنے ہوئے تجھے موت آگئی تو تو کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔'' (اس حدیث کو امام احمد نے ایک ایسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے جسے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں)

=

اور یہ چیز انبیاء و مرسلین ﷺ کی دعوت کے بھی خلاف ہے، چنانچہ وہ تو دفعِ ضرر اور جلبِ خیر کیلئے صرف اللہ تعالیٰ کو پکارنے کی دعوت دیا کرتے تھے، اور ان چیزوں کا استعمال امورِ جاہلیت میں سے بھی ہے، چنانچہ اہلِ جاہلیت کا ان چیزوں کے بارے میں تبرک اور انتفاع کا عقیدہ تھا جسکی نبی ﷺ نے بھرپور تردید و تفنید فرمائی۔

وقوله: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ ﷺ: اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ رَأَى رَجُلًا فِي يَدِهِ حَلْقَةٌ......

یہ حدیث مسند احمد کے علاوہ صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم میں بھی ہے، امام حاکم نے اسے صحیح الاسناد کہا ہے اور امام ذھبی ﷫ نے بھی اسے برقرار رکھ کر امام حاکم ﷫ کی موافقت کی ہے۔

مؤلف ﷫ نے اس کی ایک متابعت بھی ذکر فرمائی ہے۔ اس حدیث کے راوی سیدنا عمران بن حصین ﷠ ہیں جو صحابی ابن صحابی ہیں، عامِ خیبر اسلام قبول کیا، اور ۵۲ھ میں بصرہ میں فوت ہوئے۔

حدیثِ عمران بن حصین ﷛ سے استدلال

اس حدیث کا مضمون یہ ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کے ہاتھوں میں پیتل کا چھلا دیکھا، یہاں اس شخص کا نام مذکور نہیں ہے، جبکہ مستدرک حاکم کی روایت میں سیدنا عمران بن حصین ﷛ اسے اپنے واقعہ کے طور پر بیان فرما رہے ہیں، گویا وہ چھلا سیدنا عمران بن حصین ﷛ ہی نے پہن رکھا تھا، نبی ﷺ کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ یہ مرضِ واھنہ کے علاج کیلئے ہے، واھنہ ایک رگ ہے جو کندھے اور ہاتھ میں ہوتی ہے اور اس میں درد اٹھتا ہے ② یہ درد صرف =

① مسند احمد (۲۰۰۲۰ ج۷، مسند عمران بن حصین) سنن ابن ماجه (۳۵۳۱) صحيح ابن حبان (۱٤۱۰) مستدرك الحاكم (٤/ ۲۱٦) سلسلة الضعيفة، رقم: (۱۲۰۹)

② واھنہ ایک ریاحی درد ہے جو کندھے سے لے کر بازو تک آتا ہے، خصوصاً بڑھاپے میں۔ (الغات الحديث ٤/ ٥٤٨)

ولـه عن عقبة بن عامر ﷺ مـرفـوعاً:"مَنْ تعلَّقَ تمِيمَةً فَلا اَتَمّ اللّٰهُ لَه ، وَمَنْ تعلَّق وَدَعَةً فَلا وَدَعَ اللّٰهُ لَهُ" وَفِيْ رِوايَة "مَنْ تعلَّق تمِيمَةً فقدْ أشْرَكَ" ①

مسند احمد میں سیدنا عقبہ بن عامر ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے تمیمہ لٹکایا، اللہ تعالیٰ اس کا کوئی کام پورا نہ فرمائے اور جس نے ''ودعۃ'' یعنی سپی لٹکائی اللہ تعالیٰ اسے کبھی آرام نہ دے، اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ''جس نے تمیمہ لٹکایا اس نے شرک کیا۔''

=

مردوں کو ہوتا ہے، اس درد کو روکنے کیلئے انہوں نے بطور تعویز یہ چھلا پہنا ہوا تھا تو نبی ﷺ نے اسے اتار دینے اور پھینک دینے کا حکم دیا، اور ساتھ ہی فرمایا کہ یہ تمہیں نفع نہیں دیگا، بلکہ تمہارے جسم میں وھن اور کمزوری پیدا کر دیگا۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس چھلے میں کچھ تاثیر تو ہوئی، نفع نہیں تو نقصان ہی صحیح ؟ جواب یہ ہے کہ یہ بات آپ ﷺ نے اس لئے نہیں فرمائی کہ وہ کمزوری جو پیدا ہوگی وہ اس چھلے کی ذاتی تاثیر ہے بلکہ وہ ان کے اس شرک کی سزا ہے۔ اور اس حدیث کا آخری جملہ کہ ''اگر یہ پہنے ہوئے تمہیں موت آ گئی تو تم کبھی کامیاب نہ ہوسکو گے'' انتہائی خطرناک سزا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ یہ عمل شرک ہے لہذا اسکے پہننے کی صورت میں وہ شرک میں ملوث ہوں گے، اور حالتِ شرک میں مرنے والا کبھی کسی فلاح اور سعادت کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ اور یہاں غور کیجئے کہ یہ بات نبی ﷺ اپنے ایک صحابی سے فرما رہے ہیں، کچھ لوگ جو اپنے آپ کو اولیاء وصالحین ﷺ کی آل واولاد قرار دیتے ہیں، وہ نا معلوم کس بناء پر اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ خواہ وہ کچھ بھی کرتے رہیں انکے بڑے انہیں بچالیں گے، تو کیا انکا مقام ایک صحابی کے مقام سے بڑھ کر ہے؟ (بلکہ اللہ تعالیٰ تو اپنے نبی ﷺ سے مخاطب ہے کہ اگر آپ سے بھی شرک سرزد ہو گیا تو آپ کے بھی تمام اعمال برباد ہو جائیں گے ②)

وقوله:وله عن عقبة بن عامر ﷺ مرفوعاً:"مَنْ تعلَّق تمِيمَةً ......

یہ حدیث سیدنا عقبہ بن عامر الجہنی ﷺ کی روایت سے ہے جو مشہور صحابی ہیں، اور بڑے فاضل فقیہ تھے، اور امیر معاویہ کے دور میں تین سال مصر کے گورنر رہے، تقریباً ۶۰ھ میں انتقال ہوا۔

سیدنا عقبہ بن عامر ﷺ مذکورہ روایت کے سلسلہ میں ایک قصہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کے پاس دس افراد پر مشتمل ایک جماعت دین اسلام پر بیعت کرنے آئی، آپ ﷺ نے نو افراد سے بیعت لے لی اور ایک کو

=

① یہ حدیث حسن ہے۔ مسند احمد (٤/ ١٥٤) مسند ابی یعلی، رقم:(١٧٥٩) مستدرك الحاكم (٤/ ٢١٦، ٢١٧)
② (الزمر: ٦٥)

ولابن ابی حاتم عن حذیفة ﷺ اَنَّہٗ رَاٰی رَجُلاً فِی یَدِہٖ خَیْطٌ مِنَ الْحُمّٰی فَقَطَعَہٗ وَتَلاَ قَوْلَہٗ تَعَالٰی:﴿ وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلاَّ وَھُمْ مُشْرِکُوْنَ ﴾ ①

ابن ابی حاتم نے سید نا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ ''انہوں نے ایک شخص کے ہاتھ میں بوجہ بخار دھاگہ بندھے دیکھا تو اسے کاٹ دیا، اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تلاوت کی۔ ''اکثر لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے باوجود شرک کرنیوالے ہیں۔''

=

چھوڑ دیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ آپ ﷺ نے اِسے کیوں چھوڑ دیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس نے تمیمہ لٹکایا ہوا ہے، پھر نبی علیہ السلام نے اپنے دستِ مبارک سے اسے کاٹ دیا، اور پھر اس کی بیعت قبول فرمائی، اور ساتھ ہی فرمایا: ''تمیمہ لٹکانے والا شرک کرتا ہے'' ②

یہاں تمیمہ سے مراد بقول امام ترمذی رحمہ اللہ اور ابن الاثیر وہ منکا ہے جو اہلِ عرب اپنے بچوں کے گلوں میں باندھ دیا کرتے تھے، بیماریوں اور نظرِ بد وغیرہ سے بچاؤ کیلئے، اسلام نے اس عمل کو باطل قرار دیا، اور نبی ﷺ نے بد دعا دی کہ تمیمہ لٹکانے والے کی کوئی حاجت وضرورت پوری نہ ہو، اور ''ودعہ'' یعنی سمندر سے نکلنے والی سیپ (جسے وہ نظر بد سے بچاؤ کے لئے پہنتے تھے) کو پہننے والا کبھی سکون وآرام نہ پائے۔ تو گویا یہ عمل دہری وعید کا حامل ہے ۱۔ شرک ۲۔ نبی ﷺ کی بد دعا۔

وقولہ: ولابن ابی حاتم عن حذیفة ﷺ اَنَّہٗ رَاٰی رَجُلاً فِیْ یَدِہٖ خَیْطٌ مِنَ الْحُمّٰی ......

یہ اثر ابن ابی حاتم میں بروایت عروۃ بن الزبیر عن حذیفہ مذکور ہے، لیکن عروہ کا حذیفہ سے سماع ثابت نہیں۔
حذیفہ ابن الیمان جلیل القدر صحابی ہیں، انصار کے حلیف تھے، اور سابقین اولین میں شمار ہوتے تھے، انہیں نبی علیہ السلام کے رازداں ہونے کا شرف حاصل ہے، ان کے والد بھی صحابی تھے۔ ان کا انتقال ۳۶ھ میں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی ایام میں ہوا۔

یہ ایک بیمار شخص کی عیادت کیلئے تشریف لے گئے تو دیکھا کہ اس کے بازو کے ساتھ دھاگہ بندھا ہوا ہے، پوچھا یہ کیا ہے؟ اس شخص نے بتایا کہ اس میں بخار کا دم کر کے مجھے پہنایا گیا ہے تو آپ نے اسے کاٹ دیا، اور فرمایا: اگر تم یہ دھاگہ پہنے ہوئے مرجاتے تو میں تمہارا جنازہ نہ پڑھتا۔

---

① (تفسیر ابن ابی حاتم (۱۲/۴۰)
② یہ حدیث حسن درجہ کی ہے۔ مسند احمد (۱۷۴۰۹ ج۶، مسند عقبہ بن عامر)

حدیثِ حذیفہ رضی اللہ عنہ سے استدلال

صحابی کا اس دھاگے کو کاٹنا اس عمل کے انکارِ شدید کی دلیل ہے، اگر چہ اس شخص نے اس دھاگے کو شفاء کا ایک سبب قرار دیا تھا، لیکن اسباب تو صرف وہ جائز ہیں جن کی اباحت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے ثابت ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ ان اسباب پر اعتماد نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے حصولِ شفا کا اعتقاد ہو۔ اب حالانکہ اس دھاگے پر رقیہ یعنی صحیح دم کیا گیا تھا مگر صحابی رسول رضی اللہ عنہ نے اسے کاٹ دیا، تو جو چیزیں بذاتِ خود شرک ہیں، جیسے تمائم، دھاگے، منکے اور طلاسم وغیرہ تو ان کا استعمال کس قدر خطرناک ہوگا۔ سیدنا حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے اس عمل کے شرک ہونے پر اس آیت کریمہ سے استدلال کیا: ﴿ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ﴾

''اکثر لوگ اللہ پر ایمان لانے کے باوجود شرک کرنیوالے ہیں''

اس آیت کریمہ میں جس شرک کا ذکر ہے وہ شرکِ اکبر ہے، جبکہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جس شرک کی نکیر کی وہ شرک اصغر تھا، تو یہ بھی سلف صالحین رحمہم اللہ کا طریقہ ہے کہ وہ شرک اکبر کے بارے میں نازل ہونیوالی آیات سے شرکِ اصغر کی حرمت پر استدلال کیا کرتے تھے۔ (جو ہر قسم کے شرک کے انتہائی قابلِ نفرت اور بدترین ہونے کا بڑا ٹھوس ثبوت ہے) واللہ اعلم!



اس باب کے مسائل

(۱) چھلا اور دھاگہ، اور اس قسم کی دوسری اشیاء پہننے پر شدید وعید وارد ہوئی۔

(۲) چھلا اور دھاگہ پہنے اگر صحابی بھی فوت ہو جاتا تو وہ کبھی کامیاب نہ ہوتا۔ یہ بات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس کلام کے اثبات کے لئے زبردست شاہد کی حیثیت رکھتی ہے کہ ''سب سے چھوٹا شرک بھی اکبرالکبائر میں سے ہے۔''

(۳) جہالت کی بناء پر تمائم اور تعویذ گنڈوں کا پہننا بھی کوئی قابلِ قبول عذر نہیں۔

(۴) (ان چیزوں کا استعمال آخرت میں تو وعیدِ شدید کا حامل ہے ہی) لیکن دنیا میں بھی ان کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ وھن کے سوا کچھ نہ دے گا۔

(۵) جو شخص ان چیزوں کو پہنے اس پر وعید شدید کے ساتھ انکار ہے۔

(۶) اس بات کی تصریح کہ کسی قسم کا تعویذ دھاگہ یا چھلا لٹکانے والا انہیں چیزوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔

(۷) بخار کا تعویذ، دھاگہ لٹکانا بھی شرک ہے۔

(۸) کسی بھی قسم کا تعویذ لٹکانے والا شرک کر رہا ہے۔

(۹) سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کا مذکورہ آیت کی تلاوت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شرکِ اکبر کی آیات پڑھکر شرکِ اصغر کی حرمت پر استدلال کیا کرتے تھے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۂ بقرۂ کی آیت میں کیا۔

(۱۰) نظرِ بد سے بچاؤ کے لئے سیپ وغیرہ لٹکانا بھی شرک ہے۔

(۱۱) تعویذ دھاگہ اور سیپ لٹکانے والے کو یہ بددعا دینا درست ہے، کہ ''اللہ رب العزت تمہاری کوئی خواہش پوری نہ فرمائے اور تمہارا سکون غارت کر دے۔''



باب ما جاء فی الرقی والتمائم

دم اور تعویذوں کے حکم کا بیان

فی الصحیح عَنْ اَبِیْ بَشِیْرِ الْاَنْصَارِی رضی اللہ عنہ اَنَّہٗ کَانَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فِیْ بَعْضِ أَسْفَارِہٖ "فَاَرْسَلَ رَسُوْلاً أَنْ لاَّ یُبْقَیَنَّ فِیْ رَقَبَۃِ بَعِیْرٍ قِلَادَۃٌ مِّنْ وَتَرٍ أَوْ قِلَادَۃٌ اِلاَّ قُطِعَتْ" ①

صحیح ''بخاری و مسلم'' میں ابو بشیر الانصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے آپ ﷺ نے اپنا ایک نمائندہ بھیجا (جو لوگوں میں یہ اعلان کردے) کہ ''کسی اونٹ کی گردن میں کمان کی تار کا قلادہ باقی نہ رہنے دیا جائے بلکہ اسے کاٹ دیا جائے۔''

رقیہ یعنی دم تین طرح کا ہوتا ہے، ایک وہ جو جائز ہے، دوسرا وہ جو ناجائز ہے اور تیسرا وہ جس کے جواز وعدمِ جواز میں اختلاف ہے، اس اختلاف کی وجہ سے مصنف رحمہ اللہ نے اپنے مذکورہ ترجمۃ الباب میں اس کے مطلق شرک ہونے کا حکم نہیں لگایا۔ ان کے احکامات آپ اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

ابو بشیر الانصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث اور اس کی وضاحت

یہ حدیث ابو بشیر الانصاری رضی اللہ عنہ (جن کا اصل نام قیس بن عبید بتایا گیا ہے)، سے مروی ہے یہ جنگ خندق میں موجود تھے، ۶۰ھ کے بعد انتقال ہوا، سو سال سے زائد عمر پائی۔ ان کا بیان ہے کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھا (اس سفر کی تعیین نہیں ہوسکی) اس موقعہ پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک قاصد کو لوگوں کی طرف بھیجا، ایک روایت میں اس قاصد کا نام زید بن حارثہ مذکور ہے، چنانچہ انہوں نے نبی ﷺ کے حکم سے یہ اعلان کیا کہ جانوروں کی گردنوں سے ''اوتار'' کے قلادے اتار لئے جائیں۔ ''اوتار'' سے مراد کمان کی تندی ہے، لوگ اس تندی کا قلادہ اونٹوں یا دیگر جانوروں کے گلوں میں ڈال دیا کرتے تھے، ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اس طرح وہ نظرِ بد سے محفوظ رہیں گے، تو نبی ﷺ نے اسے کاٹ دینے کا حکم دے دیا، کیونکہ یہ اوتار اللہ تعالیٰ کے کسی امر کو ٹالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ واضح ہو کہ اوتار کے علاوہ اگر کوئی رسی یا دھاگہ ہو تو اس کا قلادہ بنا کر جانور کو پہنانا ممنوع نہیں ہے، کیونکہ مشرکین صرف اوتار کے قلادے میں نظرِ بد کے بچاؤ کا عقیدہ رکھتے تھے۔ سنن ابی داؤد اور نسائی میں اس سلسلہ میں ابو وھب الجیشانی کے طریق سے ایک صریح حدیث بھی وارد ہوئی ہے: =

① صحیح بخاری، کتاب الجهاد (۳۰۰۵) صحیح مسلم، کتاب اللباس (۲۱۱۵)

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: [اِنَّ الرُّقٰى وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ] ①

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''جھاڑ پھونک ،تعویذ گنڈے اور تولہ یعنی محبت پیدا کرنے کے منتر شرک ہیں۔''

=

"اِرْبِطُوْا الْخَيْلَ وَقَلِّدُوْهَا وَلَا تُقَلِّدُوْهَا الْاَوْتَارَ " ②

یعنی: ''گھوڑے کو باندھو، اور اسے قلادہ پہناؤ لیکن اوتار کا قلادہ نہ پہناؤ۔''

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ عقبہ بن عامر کی یہ حدیث (کہ جو تعویز پہنے اللہ اس کی مراد پوری نہ کرے) اسی معنی میں ہے، چنانچہ تمائم سے مراد وہ قلادے ہیں جو نظرِ بد کیلئے پہنے اور پہنائے جاتے تھے، اس حدیث کے پیش نظر اوتار کو بھی تمائم کی طرح عملِ شرک قرار دیا جائے گا، چنانچہ جس طرح جانوروں کو تعویز پہنانے والا رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق مرتکبِ شرک ہو رہا ہے بعینہ اسی طرح جانوروں کو اوتار کا قلادہ نظرِ بد سے تحفظ کیلئے پہنانے والا بھی مرتکبِ شرک ہو رہا ہے۔ ہماری اس تقریر سے ان لوگوں کا قول باطل ہوگیا جو تمائم سے منع کو کراہت تنزیہی پر محمول کرتے ہیں، کیونکہ شرک ''تنزیھاً'' نہیں بلکہ ''تحریماً'' ناجائز و ناپسند ہے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث اور اس کی وضاحت

وقوله:وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ:......

یہ حدیث سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس کے وارد ہونے کا ایک قصہ ہے، انہوں نے اپنی بیوی زینب کے گلے میں ایک دھاگا دیکھا، پوچھا یہ کیا ہے؟ جواب ملا یہ ایک دھاگہ ہے جو ہمیں دم کر کے پہنایا گیا ہے، آپ نے اسے پکڑ کر کاٹ دیا اور فرمایا: عبداللہ کا خاندان شرک سے قطعی بے زار اور لاتعلق ہے۔ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: کہ ''رقی''، ''تمائم'' اور ''تولہ'' یہ سب شرک ہیں، اس پر ان کی بیوی زینب نے کہا: آپ کیا بات کرتے ہیں، ایک بار میری آنکھوں میں تکلیف تھی، میں فلاں یہودی کے پاس جا کر دم کراتی جس سے تکلیف ختم ہو جاتی، تو سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ سب عملِ شیطان ہے، وہ اپنے ہاتھ سے تمہاری آنکھ میں چبھن پیدا کرتا جس سے تکلیف شروع ہو جاتی، اور پھر جب وہ

---

① یہ حدیث حسن درجہ کی ہے۔مسند احمد (٣٦١٥ ج٢ ،مسند ابی مسعود) سنن ابی داؤد (٣٨٨٣) سنن ابن ماجه (٣٥٣٠) مستدرك الحاكم (٤١٨/٤) امام حاکم نے اسے صحیح کہا ہے، اور امام ذھبی نے اس کی موافقت کی ہے۔

② حدیث ضعیف ہے۔مسند احمد (١٩٠٥٤ ج٧، مسند ابی وهب الجشمی) سنن ابی داؤد (٢٥٤٣) سنن نسائی (٢١٨/٦) سند میں عقیل بن شبیب راوی مجہول ہے۔امام ھیثمی نے احمد کے راویوں کو ثقہ کہا ہے۔

یہودی دم کرتا تو وہ اپنا ہاتھ روک دیتا، (جس سے تکلیف تھم جاتی ہے) تم وہ الفاظ کیوں نہیں کہتی جو ایسے موقعہ پر نبی ﷺ کہا کرتے تھے یعنی "اَذْهِبِ البَأْسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِي لَاشِفَاءَ اِلَّاشِفَاءُكَ شِفَاءً لَايُغَادِرُ سَقَمًا" یعنی "اے لوگوں کے رب اس تکلیف کو دور کر دے، اس سے شفا عطا فرما دے، بے شک تو ہی شفا دینے والا ہے کسی اور کے اختیار میں شفا نہیں ہے، شفا تو صرف تیرے امر سے آتی ہے، ایسی شفا عطا فرما دے جو ہر بیماری کا خاتمہ کر دے" (ابن ماجہ، ابن حبان، مستدرک حاکم) ①

واضح ہو کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود ؓ کی مذکورہ حدیث میں تین چیزوں کا بیان ہے۔

۱۔ رقی ۲۔ تمائم ۳۔ تولہ۔

تمائم، رقیہ اور تولہ کی تفسیر

مصنف رحمہ اللہ نے ان تینوں چیزوں کی خود ہی تعریف فرما دی، چنانچہ فرماتے ہیں:

"تمائم" سے مراد وہ چیز ہے جو نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کے لئے بچوں کے گلے میں لٹکائی جاتی تھی، یہ شئی معلق یعنی تعویز اگر قرآنی آیات پر مشتمل ہو تو بعض علماءِ سلف سے ان کا جواز اور رخصت منقول ہے، جبکہ بعض علماء نے انہیں ناجائز اور منہی عنہ قرار دیا ہے، ان میں عبداللہ بن مسعود ؓ بھی شامل ہیں، یہی قول عبداللہ بن عباس، حذیفہ بن یمان، عقبہ بن عامر اور عبداللہ بن عکیم ؓ سے مروی ہے۔ تابعین کی ایک بہت بڑی جماعت جن میں سیدنا عبداللہ بن مسعود ؓ کے تمام شاگرد شامل ہیں، تعویزوں کی حرمت کی قائل تھی، علماء متاخرین نے بھی قطعاً و جزماً تعویزوں کو ناجائز کہا ہے، ان کا استدلال اسی حدیثِ ابن مسعود پر قائم ہے، چنانچہ ان صحابہ و تابعین نے اس حدیث اور اس کے معنی کی تمام احادیث کو ان کے عموم پر رکھا ہے جو کہ ان احادیث کا ظاہر ہے، چنانچہ احادیث نے دم جھاڑ میں شرکیہ اور غیر شرکیہ یا قرآنی اور غیر قرآنی کا فرق کیا ہے، لیکن تعویزوں کے تعلق سے ایسا کوئی فرق سامنے نہیں آتا، اسی لئے عبداللہ بن عباس ؓ فرمایا کرتے تھے کہ "معوذتین" پڑھکر دم کر دو، لکھ کر نہ لٹکاؤ۔

اس سلسلہ میں سیدنا عبداللہ بن عکیم ؓ کی ایک مرفوع حدیث آگے آرہی ہے۔ واضح ہو کہ وہ تعویذ جو قرآن مجید کی آیات یا اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر مشتمل ہیں کے لٹکانے کا جواز عبداللہ عن عمرو بن العاص ؓ

---

① یہ حدیث حسن درجہ کی ہے۔ مسند احمد (۳۶۱۵ ج۲، مسند ابی مسعود) سنن ابی داؤد (۳۸۸۳) سنن ابن ماجہ (۳۵۳۰) مستدرك الحاكم (۴/۴۱۸) امام حاکم نے اسے صحیح کہا ہے، اور امام ذھبی نے اس کی موافقت کی ہے۔

کی طرف منسوب ہے۔ان کی طرف اس قول کی نسبت مسند احمد میں مروی ان کی ایک روایت کی بنا پر کی گئی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ نے ڈراور خوف کے ازالہ کیلئے کچھ کلمات تعلیم فرمائے تھے جو درج ذیل ہیں:

"اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ غَضَبِهٖ وَشَرِّ عِبَادِهٖ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنَ وَاَنْ يَّحْضُرُوْنَ"

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنے ان بچوں کو جو عقل وشعور کی عمر تک پہنچ چکے تھے یہ کلمات یاد کرایا کرتے تھے، اور جو بچے سنِ شعور تک نہیں پہنچے تھے لکھ کر ان کے گلوں میں لٹکا دیا کرتے تھے، یہ روایت مسند احمد میں ہے لیکن اس کی سند میں ضعف ہے، وجہ ضعف محمد بن اسحاق کا مدلس ہونا ہے، اور یہ روایت عمرو بن شعیب سے عنعنہ کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، لہذا یہ حدیث نا قابل احتجاج ہے۔

''رقی'' رقیہ کی جمع ہے، مصنف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہیں عزائم بھی کہا جاتا ہے، انکا جواز ایک شرط کیساتھ مشروط ہے، اور وہ شرط یہ ہے کہ یہ شرک سے پاک ہوں۔ چنانچہ نبی ﷺ سے نظرِ بد اور زہریلے کیڑے کے کاٹنے پر دم کی رخصت منقول ہے، شرکیہ دم سے مراد وہ دم ہیں جن میں کسی بھی طرح کا کوئی شرک موجود ہو۔ مثلاً دعائے غیر اللہ، استغاثہ بغیر اللہ، استعاذہ من غیر اللہ یا ملائکہ، انبیاء علیہم السلام اور جنوں وغیرہ کے ناموں کیساتھ دم۔ البتہ وہ دم جو قرآنی آیات پر مشتمل ہیں یا جن میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات ہیں یا اللہ تعالیٰ سے دعاء یا استغاثہ واستعاذہ ہے وہ ممنوع نہیں، بلکہ جائز اور مستحب ہیں، کیونکہ وہ شرک سے پاک ہیں۔

صحیح مسلم میں سیدنا عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم جاہلیت میں دم کیا کرتے تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد ہم نے اس فعل کے بارے میں نبی ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ پر اپنے دم پیش کرو، ایسے دموں میں کوئی حرج نہیں جو شرک سے پاک ہوں'' ①

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''کہ نبی ﷺ نے دم کیا بھی ہے، اور آپ کو دم کیا بھی گیا ہے، اور آپ ﷺ سے دم کی بابت اذن اور اجازت بھی ثابت ومشروع ہے۔ اگر یہ دم قرآن پاک کی آیات یا اللہ تعالیٰ کے اسماء پر مشتمل ہے تو پھر مباح یا مأمور بہ ہے، اور اگر یہ عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں ہے تو پھر ممنوع ہے، بلکہ بعض اوقات کفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے ورنہ کم از کم شرک تو ضرور ہوتا ہے۔''

علامہ ابن التین فرماتے ہیں: کہ معوذات اور اللہ تعالیٰ کے اسماء کے ساتھ دم کرنا طب ربانی ہے۔

امام سیوطی فرماتے ہیں: کہ دم کے جواز پر علماء کا اجماع ہے لیکن اس سلسلہ میں تین شرائط کا پایا جانا =

① صحیح مسلم، کتاب السلام (٢٢٠)

وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُكَيْم مَرْفُوْعاً رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: "مَنْ تَعَلَّقَ شَيْئًا وُكِّلَ اِلَيْهِ" ①

سیدنا عبداللہ بن عکیم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے کوئی چیز لٹکائی وہ اسی کے سپرد کر دیا جائے گا۔''

=

ضروری ہے۔ ۱۔ وہ دم اللہ تعالیٰ کے کلام یا اسماء وصفات پر مشتمل ہو ۲۔عربی زبان میں ہو اور اس کا معنی بھی معلوم ہو ۳۔ یہ عقیدہ ہو کہ دم بذاتِ خود مؤثر نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے امر سے شفا ملتی ہے۔

''تولہ'' ایک ایسے عمل کا نام ہے جس کے ذریعے بیوی کو اس کے شوہر یا شوہر کو اس کی بیوی کی طرف مائل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ صحیح ابنِ حبان میں ہے کہ مذکورہ حدیث کے راوی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ہم ''رقی'' اور ''تمائم'' تو پہچانتے ہیں یہ تولہ کیا ہے؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ ایک عمل ہے، جو عورتیں اپنے شوہروں کی محبت حاصل کرنے کیلئے طلب کرتی ہیں۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: یہ عمل جادو کی ایک قسم ہے اور شرک بھی ہے، کیونکہ اس عمل کے ذریعے دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت کیلئے غیر اللہ کا قصد کیا جاتا ہے۔

حدیثِ عبداللہ بن عکیم رضی اللہ عنہ اور اس کی وضاحت

وقوله: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُكَيْم مَرْفُوْعاً رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: "مَنْ تَعَلَّقَ شَيْئًا وُكِّلَ اِلَيْهِ......

یہ حدیث مسند احمد اور ترمذی کے علاوہ ابوداؤد اور حاکم میں بھی موجود ہے۔ اس حدیث کے راوی عبداللہ بن عکیم ہیں جو ابومعبد الجہنی کی کنیت اور نسبت کے ساتھ معروف تھے، امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انہوں نے نبی ﷺ کا زمانہ پایا لیکن ان کا نبی علیہ السلام سے سماع ثابت نہیں ہے۔ ابوحاتم، ابوزرعۃ اور ابن حبان وغیرہ کا بھی یہی قول ہے، امام بغوی کے نزدیک بھی ان کے سماع میں شک ہے، ان ائمہ کے اس کلام کا ظاہر یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے البتہ اس کا ایک شاہد بروایت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ موجود ہے۔

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جو شخص کوئی چیز لٹکائے یا اس کے ساتھ قلبی تعلق جوڑ لے تو اللہ رب العزت اسے اسی کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ جڑ جائے اور اپنی حاجات وضروریات اسی پہ ڈال دے، اسی سے التجائیں کرے اور سارے معاملات اسی کے سپرد کر دے تو اللہ رب العزت اسے کافی اور شافی ہو جاتا ہے، اس کے سارے کام سنبھال لیتا ہے، ہر دور کی چیز قریب کر دیتا ہے

=

---

① یہ حدیث ضعیف ہے۔ مسند احمد (١٨٨٠٤، ١٨٨٠٩ ج٦) سنن ترمذی (٢٠٧٢) مستدرك الحاكم (٢١٦/٤)

وروی احمد عن رویفع ؓ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ " یَا رُوَیفِعُ ! لَعَلَّ الْحَیَاۃَ سَتَطُوْلُ بِكَ فَأَخْبِرِ النَّاسَ أَنَّ مَنْ عَقَدَ لِحْیَتَهُ أَوْ تَقَلَّدَ وَتَرًا اَوِ اسْتَنْجٰی بِرَجِیْعِ دَابَّةٍ أَوْعَظْمٍ فَاِنَّ مُحَمَّدًا بَرِیْءٌ مِنْهُ" ①

امام احمد بن حنبل رویفع بن ثابت سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں: مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے رویفع! شاید میرے بعد تم لمبی عمر پاؤ تو لوگوں کو بتا دینا کہ، جس شخص نے اپنی داڑھی کو بٹ دیا یا تانت کا قلادہ پہنایا جانور کے گوبر یا اس کی ہڈی سے استنجاء کیا تو محمد ﷺ اس سے بری ہیں''

=

اور ہر تنگی آسانی میں بدل دیتا ہے۔ جیسا کہ اس کا فرمان ہے: ﴿ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ﴾
''اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے وہ اس کیلئے کافی ہے''

مسند احمد میں روایت ہے، عطاء خراسانی فرماتے ہیں: کہ میں نے بہت بڑے تابعی وھب بن منبہ کو طواف کرتے ہوئے دیکھا، ان سے ملاقات کی اور عرض کیا کہ اس مقام پر مجھے نصیحت کیجئے اور وہ نصیحت بہت مختصر ہو، تو انہوں نے فرمایا: کیوں نہیں، اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ: اے داؤد مجھے اپنی عزت وعظمت کی قسم! میرا جو بندہ تمام مخلوقات سے کٹ کر میرے ساتھ جڑ جائے گا، اور یہ بات میں اس کی نیت سے جان لوں تو پھر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں اور ان کی تمام مخلوقات اس کے لئے سازشیں کریں تو میں اسے ان آسمانوں اور زمینوں کے بیچ میں سے مخرج یعنی نکلنے کی جگہ مہیا کردوں گا، اور مجھے اپنی عزت وعظمت کی قسم! میرا کوئی بندہ اگر مجھے چھوڑ کر کسی مخلوق کے ساتھ جڑ جائے، اور یہ بات میں اس کی نیت سے جان لوں تو میں اس کے ہاتھ سے اسباب سماوی کاٹ دوں گا، اور پاؤں تلے زمین کو ناراض کردوں گا، پھر مجھے کوئی پرواہ نہ ہوگی کہ وہ کس وادی میں ہلاک وبرباد ہوگیا۔

حدیثِ رویفع ؓ اور اس کی وضاحت

وقولہ: وروی احمد عن رویفع ؓ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:......

یہ حدیث مسند احمد میں ابن لھیعۃ کے طریق سے ہے جو متکلم فیہ ہے۔ امام احمد نے اس حدیث کو ایک اور سند سے ذکر کیا ہے، اس میں شیبان القطبانی نامی راوی ہے جسے مجہول کہا گیا ہے، جبکہ دونوں سندوں کے بقیہ رواۃ ثقہ ہیں، البتہ یہ حدیث ابوداؤد اور نسائی میں اور طریق سے مروی ہے، اور وہ طریق ثابت ہے، امام نووی نے اسے حسن قرار دیا ہے، جبکہ بعض محدثین نے صحیح بھی کہا ہے۔

---

① یہ حدیث صحیح ہے۔ مسند احمد (١٦٩٩٢، ١٦٦٩٣، ج٦) سنن ابی داؤد (٣٦) سنن نسائی (١٣٥/٨)

اس حدیث میں نبی ﷺ کا رویفع کو یہ فرمانا کہ شاید تمہاری زندگی لمبی ہو یہ آپ ﷺ کی نبوت کی علامات میں سے ہے۔ کیونکہ رویفع نبی ﷺ کے انتقال کے بعد تقریباً چھیالیس سال زندہ رہے۔

نبی ﷺ کا ان سے یہ فرمانا کہ لوگوں کو ان امور کی خبر دے دینا ان کے لئے ایک امر اور فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ انہوں نے اس حدیث کو خوب بیان کیا۔

اس حدیث میں تین چیزوں کا ذکر ہے :

(۱) داڑھی کو بٹ دینا: اس کے دو معنی ہیں، پہلا یہ کہ کچھ عجمی اپنی داڑھیوں کو بٹا کرتے تھے، اس میں گرہیں لگایا کرتے تھے۔ ابو السعادات کا قول ہے کہ ایسا وہ تکبر کی بنا پر کیا کرتے تھے لہذا شریعت نے ان کے تشبہ سے منع فرما دیا۔

دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ بالوں کو گھنگریالا بنانے کے لئے بٹنا اور گرہیں لگانا۔ ایسا وہ لوگ کرتے تھے جن کا مزاج نسوانیت کی طرف مائل تھا۔

بعض احادیث میں نماز میں داڑھی کو بٹنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، چنانچہ بعض علماء نے اس حدیث کو بھی نماز پر محمول کیا ہے۔ (بہتر ہے کہ اس حدیث کو اپنے عموم پر رکھا جائے)

(۲) دوسرا مسئلہ تانت کا ہے، تانت کہتے ہیں قلادہ پہننا یا جانور کو پہنانا، یہ کام بھی دورِ جاہلیت میں مروج تھا، چنانچہ وہ نظرِ بد سے بچاؤ کے لئے اپنی یا جانوروں کی گردنوں میں بطورِ تعویذ قلادہ ڈال دیا کرتے تھے جس سے شریعت نے منع کر دیا۔

(۳) تیسرا مسئلہ جانور کی ہڈی یا گوبر سے استنجاء کرنے کی ممانعت ہے، صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں اس ممانعت کی علت مذکور ہے کہ: "فَاِنَّهُ زَادُ اِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ" ①

یعنی ''یہ دونوں چیزیں جنوں کی خوراک ہیں''۔

اور ان سے استنجاء کرنے سے ان کی خوراک فاسد ہو جائے گی۔

صحیح ابن خزیمہ اور سنن دارقطنی میں سیدنا ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ کے طریق سے مروی ایک اور حدیث میں اس ممانعت کی ایک اور علت وارد ہوئی ہے "اِنَّهُمَا لَا يُطَهِّرَانِ" ②

یعنی ''یہ دونوں چیزیں پاک نہیں کر سکتیں''

=

① صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ (٤٥٠) صحیح ابن خزیمہ (٨٢)

② صحیح ابن خزیمہ، باب الاستنجاء بالاحجار (٨٠) سنن دار القطنی (٥٦/١)

وعن سعیدبن جبیر قال: مَنْ قَطَعَ تَمِیْمَةً مِّنْ اِنْسَان کَانَ کَعِدْلِ رَقَبَةٍ (رواه وکیع)
وله عن ابراهیم قال: کَانُوْا یکْرَهُوْنَ التَّمَائِمَ کُلَّهَا مِنَ الْقُرْآنِ وَ غَیْرِ الْقُرْآن .

سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جس شخص نے کسی انسان کا تعویذ کاٹ دیا اسے ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ملے گا، یہ قول امام وکیع نے ذکر کیا ہے، اور انہوں نے ابراھیم النخعی کا بھی ایک قول ذکر کیا ہے: کہعبد اللہ بن مسعود اور ان کے اصحاب وتلامذہ تمام تعویذوں کو حرام کہتے تھے خواہ وہ قرآنی آیات سے ہوں یا قرآن پاک کے علاوہ کسی اور چیز سے ہوں۔

=

چونکہ یہ دونوں علتیں منصوصہ ہیں لہذا دونوں معتبر ہونگی، اور ان دونوں چیزوں سے استجاء ناجائز قرار پائے گا۔

وقوله:وعن سعیدبن جبیر قال: مَنْ قَطَعَ تَمِیْمَةً مِّنْ اِنْسَانٍ......

تعویذ کاٹنے کا ثواب

سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا مذکورہ قول مرفوع کے حکم میں ہے، کیونکہ ایسی بات رائے سے نہیں کہی جاسکتی، اس لحاظ سے یہ روایت مرسل قرار پائے گی کیونکہ سعید تابعی تھے، انکے اس قول سے تعویذ کی مذمت اور شناعت ثابت ہوتی ہے، اور اسکے ساتھ ساتھ کسی کا تعویذ کاٹ دینے کی فضیلت بھی واضح ہوتی ہے۔

ابراھیم النخعی رحمہ اللہ کا قول بھی تعویذ کی حرمت اور ناپسندیگی کا مظہر ہے، ان کا یہ فرمانا " کَانُوا یکْرَهُوْنَ التَّمَائِمَ " اس سے مراد سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب وتلامذہ ہیں، جو قرآنی یا غیر قرآنی ہر قسم کے تعویذ کو ناجائز کہا کرتے تھے۔ (واللہ اعلم)



اس باب کے مسائل

(۱) "رقی" یعنی دم جھاڑ اور "تمائم" یعنی تعویذ وغیرہ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) "تِوَلہ" یعنی تعویذاتِ محبت کی تفصیل معلوم ہوئی۔

(۳) یہ تینوں چیزیں (رقیہ، تمیمہ اور تولہ) بلا استثناء شرک ہیں۔

(۴) البتہ اگر صحیح کلام کے ساتھ نظرِ بد اور زہریلے جانور کے کاٹے پر رقیہ یعنی دم کیا جائے تو یہ شرک نہیں ہوگا۔

(۵) تمیمہ اگر قرآن پاک سے ہو تو اس کے شرک ہونے یا نہ ہونے میں علماء کا اختلاف ہے (جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں مذکور ہے)

(۶) نظرِ بد سے بچاؤ کے لئے جانوروں کے گلوں میں تانت لٹکانا شرک ہے۔

(۷) تانت لٹکانے والا وعیدِ شدید کا مستحق ہے (یعنی نبی ﷺ اس سے بری ہیں)

(۸) کسی شخص کے تعویذ کاٹنے کا ثواب بیان ہوا۔

(۹) ابراھیم نخعی رحمہ اللہ کا قول، مذکورہ اختلافِ علماء کے منافی نہیں ہے، کیونکہ "کَانُوْا یکْرَھُوْنَ" سے ان کی مراد سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب وتلامذہ ہیں۔



باب من تبرك بشجرة او حجر ونحو هما

کسی درخت یا پتھر وغیرہ سے برکت طلب کرنے والے کا حکم

وقول الله تعالیٰ: ﴿ اَفَرَاَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى . اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى. تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى. اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴾ ①

''کیا تم نے لات وعزی کو دیکھا اور منات تیسرے پچھلے کو۔ کیا تمھارے لئے لڑکے اور اللہ تعالیٰ کیلئے لڑکیاں ہیں؟ ۔ یہ تو اب بڑی بے انصافی کی تقسیم ہے۔ دراصل یہ تو صرف نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے انکے رکھ لیے ہیں اللہ تعالیٰ نے انکی کوئی دلیل نہیں اتاری یہ لوگ تو صرف انکل کے اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، اور یقیناً انکے رب کی طرف سے انکے پاس ہدایت آچکی ہے۔''

اس باب میں مؤلف رحمہ اللہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کسی چیز مثلاً درخت، پتھر، جگہ، غار، چشمہ، یا قبر وغیرہ سے برکت طلب کرنے، یا ان سے امیدیں وابستہ کرنے، یا ان چیزوں سے حصولِ برکت کا عقیدہ رکھنے کا کیا حکم ہے؟ یہ سارے امور شرک قرار پائیں گے یا نہیں؟ اگلے صفحات میں واضح ہوگا کہ بہت سے قبر پرست مشرکین بہت سی چیزوں کے متبرک ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے، بلکہ حصولِ برکت کے لئے ان کا قصد بھی کرتے تھے۔ (لہذا یہ مشرکانہ عمل ہی تصور ہوگا) (والعیاذ باللہ)

سورۃ النجم کی آیات سے استدلال

یہ سورۃ النجم کی آیات ہیں، آغازِ سورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی طرف وحی فرمانے کا تذکرہ فرمایا، پھر اپنے کچھ آثارِ قدرت بیان فرمائے، پھر مشرکینِ مکہ پر حجت قائم کرتے ہوئے فرمایا: کہ جن معبودانِ باطلہ کی تم عبادت کرتے ہو وہ محض پتھر ہیں، اور عقل وشعور سے عاری ہیں، کیا انہیں پوجنے کی تمھارے پاس وحی الٰہی سے کوئی سند یا دلیل ہے؟ (تم میرے پیغمبر کی اطاعت کیوں نہیں کر لیتے جو ہماری وحی کے بغیر کبھی بولتے ہی نہیں، النجم: ۳) یہاں مشرکین مکہ کے تین معبودوں کا ذکر ہے، ایک ''اللات'' جسے بنوثقیف پوجتے تھے، دوسرا ''العزیٰ'' جو قریش اور بنو کنانہ کا معبود تھا، اور تیسرا ''منات'' جو بنو ہلال کا اور بروایتِ ابن ہشام ھزیل اور خزاعہ کا معبود تھا۔

① (النجم ۱۹......۲۳)

واضح ہو کہ ایک مومن کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان بتوں اوران کی عبادت کی کیفیت کو پہچانے، نیز ان بتوں کے تعلق سے مشرکینِ مکہ کے شرک کی حقیقت کیا تھی، اس کا بخوبی ادراک کرے، تا کہ شرک کی ان صورتوں کو موجودہ دور کے شرک پر منطبق کر سکے، اور توحید واخلاص اور شرک وکفر میں فرق وامتیاز بالکل نکھر کر سامنے آجائے۔

مشرکین کے بتوں ''اللات''، ''المناۃ'' اور ''العزیٰ'' کا تعارف

(۱) اللّات: مشرکینِ مکہ ''اللّات'' کو اِلٰہ سے مشتق مانتے تھے، بعض تو اسے نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ کا مؤنث قرار دیتے تھے...... یہ ایک سفید رنگ کی چٹان تھی جس پر نقش ونگار کیا گیا تھا، طائف کے ایک گھر کے اندر تھا، اس پر خانہ کعبہ کی طرح پردہ بھی ڈال دیا گیا تھا، اور باقاعدہ اس کے خدمت گار موجود تھے جو اس کی خدمت کے لئے وقف تھے، اس کے اردگرد ایک وسیع صحن تھا، اہلِ طائف اس کی پوجا بھی کرتے اور اس کے ذریعے عرب کے دیگر قبائل (علاوہ قریش) پر فخر بھی کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے بنو ثقیف کو اسلام کی ہدایت عطا فرمادی تو رسول اللہ ﷺ نے سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو طائف روانہ فرمایا جنہوں نے اسے گرا کر اس کے تمام ٹکڑوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔

عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، مجاھد، حمید اور ابو صالح رحمہم اللہ وغیرہ ''اللات'' کی تاء کو مشدد پڑھا کرتے تھے ان کا بیان ہے کہ ''اللات'' نامی یہ ایک نیک شخص تھا جو حاجیوں کو ستو گھول کر پلاتا تھا، جب اس کا انتقال ہوا تو لوگوں نے اس کا بت گھڑ کر اس کی قبر کی مجاورت اور پوجا شروع کر دی (صحیح بخاری)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ جب اللات کا انتقال ہوا تو عمرو بن لحی نے لوگوں سے کہا کہ یہ مرا نہیں بلکہ چٹان کے اندر چلا گیا ہے، چنانچہ لوگوں نے اس چٹان کی پوجا شروع کر دی اور اس پر قبہ نما گھر بھی تعمیر کر ڈالا۔

اب یہاں قابلِ غور حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور میں بھی شرک کی مذکورہ تمام صورتیں موجود ہیں۔ بزرگوں اور بعض دفعہ تو انتہائی بدچلن لوگوں کی قبروں پر قبے بن جاتے ہیں، ان قبروں کی مجاورت بھی ہوتی ہے اور عبادت بھی، لوگ آکر انہیں پکارتے ہیں اور ان سے اپنی مشکلات کا حل طلب کرتے ہیں۔

(ولا حول ولا قوۃ الا باللہ)

(۲) العزّٰی: مشرکین نے اپنے بت ''العزیٰ'' کا نام اللہ تعالیٰ کے نام ''العزیز'' سے مشتق کیا تھا۔ ابنِ جریر فرماتے ہیں یہ ایک درخت تھا جس پر عمارت تعمیر کردی گئی اور اس عمارت کو بھی غلاف پہنا دیا

گیا...... یہ مکہ اور طائف کے درمیان واقع تھا اور قریش اس کی بہت تعظیم کرتے تھے، ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) نے جنگِ اُحد کے موقع پر فخر یہ انداز میں اسی کا نام لیا تھا "لَنَا عُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ"

"ہمارے لئے عزیٰ ہے تمھارا کوئی عزیٰ نہیں ہے۔"

جس کا جواب دینے کیلئے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ تم کہو: "اَللّٰہُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ" ①

'اللہ تعالیٰ ہمارا مولیٰ ہے اور تمھارا کوئی مولیٰ نہیں'

امام نسائی رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کر لینے کے بعد سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عُزّٰی کی طرف روانہ فرمایا، جنہوں نے وہاں موجود درختوں کو کاٹ دیا، پھر نبی ﷺ کو خبر دی تو رسول اللہ ﷺ فرمایا: ابھی تم نے کچھ بھی نہیں کیا، دوبارہ جاؤ، چنانچہ وہ دوبارہ گئے، تو اس کے تمام مجاور اپنے بچاؤ کے لئے پہاڑوں میں روپوش ہو گئے ان کی زبانوں پر یا عزیٰ، یا عزیٰ، کا ورد تھا، جب سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مزید قریب آئے تو یکا یک ایک عورت باہر نکلی جو بالکل برہنہ تھی، اس کے بال کھلے ہوئے تھے، اور ان بالوں پر وہ بھر بھر کے مٹی ڈال رہی تھی، سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دیا پھر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر خبر دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ (عورت) درحقیقت عزیٰ تھی۔ ②

ابن ہشام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عُزّٰی میں سے لوگ آوازیں سنا کرتے تھے (جو اسی عورت کی آوازیں تھیں۔)

ابو صالح رحمہ اللہ فرماتے تھے: عُزّٰی کے پاس ان کا اندازِ عبادت یہ تھا کہ وہ چونکہ کھجور کا درخت تھا لہذا اس پر وہ دھاگے اور کپڑے باندھا کرتے تھے۔

کیا آج یہ سب کچھ نہیں ہو رہا ہے، مختلف مقامات پر مختلف درختوں کو متبرک مان کر ان پر دھاگے اور کپڑے نہیں باندھے جا رہے؟ ایسے درختوں کے پاس جانور ذبح نہیں کئے جا رہے؟ (واللہ المستعان۔)

(۳) منات: یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان "قدید" کے قریب مشلل مقام پر ایک بت تھا۔ خزاعہ، اوس اور خزرج اس کی تعظیم کرتے تھے، بلکہ حج کے لئے آتے تو یہیں سے احرام باندھ کر تلبیہ پڑھنا شروع کرتے، وہ منات کو اللہ تعالیٰ کے اسم "المنان" سے مشتق سمجھتے تھے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کا نام مناۃ اس لئے تھا کہ اس کے پاس حصولِ برکت کے لئے کثرت سے خون بہایا جاتا تھا۔ فتح مکہ کے سال رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اسے توڑنے کے لئے روانہ فرمایا اور یوں اس کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔

① یہ حدیث کا جزء ہے۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی (٤٠٤٣) عن البراء رضی اللہ عنہ)

② یہ حدیث حسن درجہ کی ہے۔ ابو نعیم فی الدلائل ص (٤٦٩) عن ابی الطفیل بسند حسن۔

ابنِ اسحاق رحمہ اللہ اپنی سیرت کی کتاب میں فرماتے ہیں: اہل عرب نے کعبۃ اللہ کے ساتھ کچھ طواغیت بنا رکھے تھے یہ مختلف گھر تھے جن کی وہ بیت اللہ کی طرح تعظیم کیا کرتے تھے، اس کے وقف خدام بھی ہوتے، اوران گھروں کو غلاف بھی پہناتے، ان گھروں کیلئے قربانیاں روانہ کی جاتیں، اوران کے پاس ذبح کی جاتیں، نیز بیت اللہ کی طرح ان کا طواف بھی کیا جاتا۔ اور وہ کعبۃ اللہ کوان تمام گھروں سے افضل مانتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ بیت اللہ درحقیقت ابراھیم علیہ السلام کا گھر اوران کی مسجد تھی۔

ابنِ اسحاق نے جو عرب کے شرک کے حالات بتائے ہیں آج بعینہ وہ سب کچھ موجودہ دور کے قبر پرست کررہے ہیں، بلکہ بہت کچھ اضافہ بھی کر چکے ہیں۔ واللہ المستعان۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں مشرکین مکہ کی بُت پرستی کی روش کا رد فرمایا، اوران کے اس عمل و اعتقاد کو محض کذب و افتراء قرار دیا، اور فرمایا یہ معبودانِ باطلہ اوران کے مجوزہ نام تمہاری اور تمہارے آباء واجداد کی اختراع ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انکے بارے میں کوئی دلیل اور حجت وارد نہیں ہے، تمہاری دلیل صرف اتباعِ ظن ہے یعنی تم نے اپنے آباء واجداد کے مسلک کی صداقت کا ظن قائم کر کے ان کی پیروی کرتے ہوئے ان شرکیہ اعمال کو روا رکھا ہوا ہے۔ (آج بھی قبر پرستوں اور مبتدعین کے پاس اصل حجت آباء واجداد اور قوم و برادری کی تقلید ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں) اللہ تعالیٰ نے ان آیاتِ کریمہ کے آخر میں ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ جَآءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَىٰ ﴾ (1)

"''ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آچکی ہے۔''

حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے واضح حق اور حجت قاطعہ دیکر اپنے رسول مبعوث فرمادیئے، یہی پروردگار کی ہدایت ہے، لیکن انہوں نے رسولوں کی پیروی کے بجائے اپنے ظن وتخمین اور آباء واجداد کی تقلید کو ترجیح دی۔

واضح ہو کہ ان آیات کریمہ میں تمام طواغیت کی عبادت کے باطل ہونے پر بڑے قطعی اور ٹھوس دلائل موجود ہیں، ان پر مزید کیا اضافہ کیا جاسکتا ہے؟ وہ ذات کسقدر پاک ہے جس کا کلام ہدایت، رحمت اور شفاء ہے۔

ان دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے جن معبودوں کو پوجا وہ سب مؤنث نام ہیں، اور مؤنث تو کمزوری اور عجز وضعف کا مظہر ہوتی ہے، تو پھر مؤنث معبود بننے کے قابل کیسے ہوسکتی ہے؟ پھر ان کی تقسیم کس =

(1) (النجم: ۲۲)

عن ابی واقد اللیثی ؓ قال :خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ اِلٰی حُنَیْنٍ وَنَحْنُ حُدَثَاءُ عَھْدٍ بِکُفْرٍ ، وَلِلْمُشْرِکِیْنَ سِدْرَۃٌ یَعْکِفُوْنَ عِنْدَھَا ، وَیَنُوْطُوْنَ بِھَا اَسْلِحَتَھُمْ یُقَالُ لَھَا: ذَاتُ اَنْوَاطٍ فَقُلْنَا: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اِجْعَلْ لَنَا ذَاتَ اَنْوَاطٍ کَمَا لَھُمْ ذَاتُ اَنْوَاطٍ :فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ :اَللّٰہُ اَکْبَرُ اِنَّھَا السُّنَنُ ، قُلْتُمْ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ کَمَا قَالَتْ بَنُوْاِسْرَائِیْلَ لِمُوْسٰی اِجْعَلْ لَنَا اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ . قَالَ : اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْھَلُوْنَ ، لَتَرْکَبُنَّ سُنَنَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ . (رواہ الترمذی وصححہ) ①

سیدنا ابو واقد اللیثی ؓ فرماتے ہیں: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حنین کی طرف گئے اس وقت ہم نے کفر کو نیا نیا چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا، مشرکین کا ایک بیری کا درخت تھا جس کے پاس قیام کرنا، اور اس پر اپنا اسلحہ لٹکانا وہ باعثِ برکت خیال کرتے تھے۔ اس درخت کا نام ذاتِ انواط تھا، ہم بھی ایک بیری کے درخت کے پاس سے گزرے تو ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! جیسا ان مشرکین کیلئے ایک ذاتِ انواط ہے ویسا ہمارے لئے بھی ایک ذاتِ انواط مقرر فرما دیجئے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اللہ اکبر کہا اور فرمایا: (سابقہ قوموں کے یہ) طور طریقے رہے ہیں، مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم نے بالکل وہی بات کہی ہے جو بنی اسرائیل نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی کہ ''ہمارے لئے بھی کوئی معبود بنا دیجئے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں'' تم بڑی جہالت اور نادانی کی بات کہہ گئے، تم سابقہ قوموں کے طریقوں پہ چلو گے!! (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا اور اسکو صحیح کہا ہے)

=

قدر باطل ہے کہ انہیں اپنے لئے مذکر پسند ہیں اور مؤنث کی اپنے گھروں میں ولادت باعثِ عار سمجھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے شرکاء مؤنث بناتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اولاد اور وہ بھی مؤنث ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، تو یہ کیسی تقسیم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے وہ چیز جو ناپسندیدہ اور ناقص ہے اور اپنے لئے وہ چیز جو پسندیدہ اور کامل ہے؟ تیسری دلیل کہ جن معبودوں کی تم نے عبادت کی وہ اور ان کے مجوزہ نام تمہارے یا تمہارے آباء واجداد کے رکھے ہوئے ہیں، پھر ان ناموں کے تعلق سے تمہارا مستدل کسی ٹھوس دلیل کی بجائے ظن اور تخمین ہے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے بارے میں کوئی دلیل یا سند نازل نہیں ہوئی۔ یہ تمام ادلہ بطلانِ عبادتِ اوثان کے لئے نہایت کافی وشافی ہیں۔ وللہ الحمد .

① یہ حدیث صحیح ہے۔ مسند احمد (۲۱۹۵۹) ج۸، مسند ابو واقد اللیثی)
سنن ترمذی (۲۱۸۰) صحیح ابن حبان (۱۸۳۵)

وقوله:عن ابی واقد اللیثی ﷺ قال :خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِلٰی حُنَیْنِ ......

یہ حدیث ترمذی کے علاوہ بالفاظ مختلفہ مسند احمد، ابوداؤد، نسائی، مسند ابویعلیٰ، مصنف ابن ابی شیبہ اور طبرانی وغیرہ میں بھی موجود ہے۔اس کے راوی ابو واقد اللیثی ہیں جن کا نام حارث بن عوف تھا، یہ مشہور صحابی ہیں، ۶۸ھ میں ۸۵ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

جس سفر میں یہ واقعہ پیش آیا یہ بمطابق روایتِ مذکورہ حنین کا سفر تھا، بعض روایتوں میں فتح مکہ کا سفر مذکور ہے۔لیکن ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ جنگِ حنین اور فتح مکہ ایک ہی سفر میں پیش آئے تھے۔

اس حدیث میں مشرکین کے جس درخت کا ذکر ہے یہ بیری کا تھا، ذاتِ انواط کے نام سے موسوم تھا، وہ اس کے قریب ٹھہرنا، قیام کرنا اور اس پر اسلحہ لٹکانا باعثِ برکت و کامیابی خیال کرتے تھے، فتح مکہ کے سفر میں نبی ﷺ کو یہ درخت راستے میں دکھائی دیا، اس کا بڑا گھنا سایہ تھا، اور وہ گرم ترین دن تھا مگر آپ ﷺ نے بوجہ غیرتِ عقیدہ، ضرورت وطلب کے باوجود اس درخت کے گھنے سایہ میں بیٹھنا گوارہ نہ کیا، اور بہت ہلکے سائے میں قیام فرمالیا۔بعض صحابہ نے جو فتح مکہ کے موقع پر بالکل نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے ذاتِ انواط جیسے ایک درخت کا مطالبہ کردیا، وہ چونکہ اس امر کو بڑا محبوب تصور کرتے تھے لہذا تقرب اِلی اللہ کے قصد سے، انتہائی صالح نیت کے ساتھ بڑی سادگی سے یہ بات کہہ دی، چونکہ یہ بات عدمِ علم کی بنا پر نکلی، جس سے ان کی جلالتِ شان میں کوئی فرق نہ آیا، اور بڑے احسن طریق سے ان کی اصلاح کردی گئی جسے انہوں نے فوراً قبول کرلیا۔رسول اللہ ﷺ نے ان کے اس مطالبہ کو سن کر "اللّٰہ اکبر" کہا۔بعض روایتوں میں "سبحان اللّٰہ" کہنا بھی مذکور ہے۔اس سے مقصود اس مطالبے پر اظہارِ تعجب تھا، اور چونکہ یہ مطالبہ ایسا تھا جو اللہ تعالیٰ کی تنقیص شان پر مشتمل تھا اور شرک پر منتج ہورہا تھا، لہذا آپ ﷺ نے "اللّٰہ اکبر" اور "سبحان اللّٰہ" کہہ کر فوراً اللہ تعالیٰ کی تعظیم وتنزیہ بیان فرمادی۔پھر فرمایا کہ تمہارا ذاتِ انواط درخت کا طلب کرنا تاکہ وہاں قیام کرسکو اور حصولِ برکت کیلئے اپنے ہتھیار لٹکا سکو، بالکل بنی اسرائیل کے مطالبے سے ملتا جلتا ہے جو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا، انہوں نے کہا تھا کہ جیسے مشرکین کے اِلٰہ (معبود) ہیں، ویسا ہمیں بھی ایک اِلٰہ بنادو۔

اب ذرا غور کیجئے، اسلام میں ان نئے داخل ہونے والے صحابہ کرام کا مطالبہ کیا تھا اور اس مطالبے کا مقصد کیا تھا؟ کیا انہوں نے اس درخت کا مطالبہ اس لئے کیا تھا کہ اس کی عبادت کریں؟ یا اس درخت سے فریادرسی کریں؟ بالکل نہیں۔ان کے اس مطالبے کا مقصد محض اس پر اپنے ہتھیار لٹکا کر اور اس کے نزدیک کچھ

دیر بیٹھ کر برکت حاصل کرنا تھا۔مگر رسول اللہ ﷺ نے اسے بھی اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرا معبود مقرر کرنا قرار دیا!!
جب یہ اعتقاد اس قدر خطرناک ہے تو پھر آج کے قبر پرستوں کا اعتقاد وعمل کتنا خطرناک اور ہولناک ہوگا جو مردوں کو پکارتے ہیں ،ان سے استغاثہ کرتے ہیں ،ان کے نام پر جانور ذبح کرتے ہیں ،ان کے لئے نذریں مانتے ہیں ،ان کی قبروں کا طواف کرتے ہیں ،انہیں اور ان کی دیواروں کو چومتے ہیں ،انہیں چھونا اور ان کی مجاورت کرنا متبرک گردانتے ہیں ،اور ان کے لئے باقاعدہ مجاور مقرر کرتے ہیں ،اور ان قبروں اور قبوں کو چادروں سے ڈھانپتے ہیں۔
ان قبر پرستوں کے اس گھناؤنے کردار اور صحابہ کرام کے اس مطالبے میں بظاہر کوئی نسبت نہیں ،لیکن صحابہ کو کس انداز سے تنبیہ کی گئی جو انہوں نے قبول کر لی......تو آج کے قبر پرستوں کا کیا ہیبت ناک انجام ہوگا جو شرک کی دلدل میں بُری طرح دھنسے ہوئے ہیں ،اور تنبیہ کرنے پر بھی پرلے درجے کے عناد وانکار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔(واللہ المستعان)

دورِ حاضر کے ذاتِ انواط

امام ابوبکر الطرطوشی جو علمائے مالکیہ میں سے ہیں ،فرماتے ہیں :''اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے ،تم دیکھو اور تمہیں جہاں کہیں کوئی بیری کا یا عام سا ایسا درخت نظر آئے جس کا لوگ قصد کرتے ہوں ،اس کی تعظیم برلاتے ہوں ،ان کی طرف سے صحت وشفاء کی امیدیں وابستہ کرتے ہوں اور ان پر کیلیں ٹھوکتے ہوں یا کپڑے اور دھاگے لپیٹتے ہوں تو وہ آج کے دور کا ''ذاتِ انواط'' ہے اسے کاٹ ڈالو ''
حافظ ابو محمد عبدالرحمٰن بن اسماعیل الشافعی جو ابو شامہ کنیت کے ساتھ معروف تھے ،اپنی کتاب ''البدع والحوادث'' میں فرماتے ہیں :''شرک کی ایک صورت جو آج کے دور میں ایک ابتلاء وفتنہ بن کر پھیل چکی ہے اور جسے شیطانِ لعین نے عامۃ الناس کیلئے بڑا مزین بنا کر پیش کیا ہے ،یہ ہے کہ شیطانی القاء سے کچھ دیواروں ،ستونوں یا مخصوص جگہوں کی تخلیق وتعیین عمل میں آتی ہے اور شیطان کا کوئی نہ کوئی چیلا اٹھ کھڑا ہوتا ہے جو کہتا ہے کہ میں نے خواب میں وہاں فلاں مشہور ولی کا ڈیرہ دیکھا ہے ،بس پھر کیا ہے لوگ اس جگہ کو محفوظ کر لیتے ہیں ،اور اللہ تعالیٰ کے فرائض اور رسول اکرم ﷺ کی سنتوں کو یکسر نظر انداز کر کے انہیں کی تعظیم وتقرب میں کمر بستہ وکوشاں رہتے ہیں ،ان جگہوں کی تعظیم انکے دلوں میں راسخ ہو جاتی ہے ،پھر اپنے بیماروں کیلئے ان سے شفاء کے امیدوار بن جاتے ہیں اور اپنی حوائج وضروریات کی خاطر ان کیلئے نذریں اور منتیں

مان لیتے ہیں، اس قسم کے بہت سے چشمے، دیواریں، درخت اور پتھر موجود ہیں۔ حافظ ابوشامہ نے دمشق شہر میں موجود ایسے کئی مقامات کا تذکرہ کیا۔ پھر فرمایا: اس قسم کے تمام مقامات ''ذاتِ انواط'' کا حکم رکھتے ہیں جس کا تذکرہ حدیثِ رسول اللہ ﷺ میں وارد ہے، اللہ تعالیٰ ان مقامات کو کاٹنے، توڑنے بلکہ جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی توفیق عطا فرمائے''

شیخ ابواسحاق کا جرأتمندانہ واقعہ

اوپر آپ نے امام ابوبکر الطرطوشی کا کلام ملاحظہ فرمایا اس کلام کو تحریر کر کے آگے ایک واقعہ لکھتے ہیں، فرماتے ہیں: ''اس حوالہ سے مجھے شیخ ابواسحاق الجبنیانی کا ایک جرأتمندانہ فعل بڑا پسند آیا، شیخ ابواسحاق ایک عابد وزاہد اور صالح بزرگ تھے، افریقہ کے رہنے والے تھے اور چوتھی صدی ہجری کے زھاد علماء میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی بابت ان کے ایک دوست ابوعبداللہ محمد بن ابی العباس المؤدب کا بیان ہے کہ ان کے گھر کے پاس ایک چشمہ تھا جو ''عین العافیۃ'' کے نام سے مشہور تھا عامۃ الناس اس چشمہ کے تعلق سے مبتلائے فتنہ ہو چکے تھے، دور دور سے آ کر یہاں حاضری دیتے بالخصوص جن کے نکاح پر کوئی رکاوٹ ہوتی یا نکاح تو ہو جاتا لیکن اولاد نہ ہوتی وہ وحصولِ برکت وشفاء کیلئے ''عین العافیۃ'' کا رخ کرتے، یہ معاملہ خاصا مشہور ہو چکا تھا۔ ابوعبداللہ فرماتے ہیں ایک صبح میں نے اسی چشمہ کی سمت سے اذان کی آواز سنی، اذان دینے والا ان کا دوست شیخ ابواسحاق تھا۔ چنانچہ میں گھر سے نکل کر چشمہ کی طرف گیا، وہاں دیکھا کہ ابواسحاق اس چشمہ کو پوری طرح منہدم کر کے اس کے ملبے پر کھڑے ہو کر اذانِ صبح دے رہے ہیں، میرے وہاں پہنچنے تک وہ اذانِ صبح سے فارغ ہو چکے تھے اور یہ دعا کر رہے تھے کہ: الٰہی میں نے اس چشمہ کو ڈھادیا ہے اب تو اتنی دعا قبول کر لے کہ کوئی شخص یہاں کا رخ نہ کرنے پائے، یہ دعا قبول ہوئی اور ہم نے آج تک یہاں کسی کو سر اٹھاتے نہیں دیکھا۔ ان کے اسی کردار کی وجہ سے علماء ومحدثین ان کی تعظیم وتوقیر کیا کرتے تھے، ابومحمد ابن ابی زید کا قول ہے: ''ابواسحاق جس راہ پر چلے وہ خالی پڑا ہے اور اس پر آج کوئی نہیں چل رہا۔'' قابسی کا کہنا ہے: ابواسحاق الجبنیانی ایک ایسے امام ہیں جو اقتداء کئے جانے کے لائق ہیں، ان کا ۳۶۹ھ میں انتقال ہوا۔ رحمه الله رحمة واسعة

واضح ہو کہ اس حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ سابقہ امتوں کی پیروی کرو گے۔ یعنی ان کے طرق، مناھج اور افعال پوری طرح اپناؤ گے۔ قرائن وشواہد سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ خبر

بالکل صحیح نکلی اور ایسا ہی ہو رہا ہے، گویا یہ حدیث ضمنی طور پر رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی شہادت پر بھی مشتمل ہے کیونکہ آپ ﷺ نے جو پیشن گوئی فرمائی اس کی صداقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوئی۔ (فالحمد لله على ذلك حمدا كثيرا)

ایک اہم تنبیہ

بعض علماء متاخرین نیک لوگوں کے آثار کے ساتھ تبرک کو مستحب قرار دیتے ہیں، مثلاً: ان کا جوٹھا پانی پینا، یا ان کو اور ان کے کپڑوں کو چھونا، یا نومولود بچے کو ان کے پاس لیجانا تاکہ وہ کھجور وغیرہ چبا کر ان کے منہ میں ڈالیں تاکہ بچے کے پیٹ میں سب سے پہلے ان کے منہ کا لعاب داخل ہو، یا ان کے پسینے سے برکت لینا وغیرہ اس سلسلہ میں امام نووی رحمہ اللہ نے صحیح مسلم کی شرح میں کافی تفصیل سے لکھا ہے، ان کا استدلال ان احادیث سے ہے جن میں صحابہ کرام کا رسول اللہ ﷺ کے اس قسم کے آثار سے برکت حاصل کرنے کا تذکرہ ہے، وہ اس معاملے پر دیگر نیک لوگوں کو آپ ﷺ جیسا قرار دیتے ہیں لیکن یہ صریح غلط ہے، اس کی کئی وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی نیک ہو وہ نبی ﷺ کے فضل و برکت میں برابری تو دور کی بات ہے، قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔ دوسری وجہ یہ کہ کسی کا نیک ہونا اس وقت تک ثابت نہیں ہوسکتا جب تک دل کا نیک ہونا ثابت نہ ہو اور دل کا نیک ہونا ایک ایسا امر ہے جس پر بندوں کا مطلع ہونا ممکن نہیں، اس کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نص چاہئے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کرام ﷺ کے صدق و صلاح کی گواہی دی، اسی طرح تابعین عظام کے نیک ہونے پر نصوص موجود ہیں، اسی طرح ائمہ اربعہ کے نیک ہونے پر پوری امت کا اتفاق ہے، دوسروں کے نیک ہونے کی زیادہ سے زیادہ اچھی امید تو رکھی جاسکتی ہے لیکن قطعیت کے ساتھ گواہی نہیں دی جاسکتی کہ یہ نص کے بغیر ممکن نہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جس شخص کے نیک ہونے پر ہمارا حسنِ ظن ہے، ہمیں نہیں معلوم اس کا خاتمہ کیسا ہو، اور اعمال کا مدار تو خاتمہ پر ہے، تو پھر کس شخص کے آثار تبرک کے قابل ہوں گے؟

چوتھی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام ﷺ سے باوجودیکہ ان کے صلاح و تقویٰ پر نصوص موجود ہیں، عملی طور پر ایسا کچھ ثابت نہیں ہے نہ زندگی میں، نہ موت کے بعد۔ اگر یہ عمل خیر ہوتا تو وہ ضرور ایسا کرتے، چنانچہ انہوں نے ابوبکر صدیق، عمر فارق، عثمان غنی اور علی مرتضٰی ﷺ کے آثار سے تبرک کیوں نہ کیا؟ حالانکہ یہ سب مبشر بالجنۃ تھے، تابعین نے سعید بن مسیب، زین العابدین، اویس قرنی اور حسن بصری ﷺ کے آثار سے تبرک کیوں نہ

کیا؟ حالانکہ ان کا فضل وصلاح قطعی الثبوت ہے۔ صحابہ وتابعین میں تبرک کی ان صورتوں کے موجود نہ ہونے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ تبرک کا یہ معاملہ صرف نبی ﷺ کے ساتھ مخصوص تھا۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ نبی ﷺ کے علاوہ کسی کے آثار سے تبرک اسے مبتلائے فتنہ کرسکتا ہے، چنانچہ وہ اپنے طور پر عجب اور ریاکاری کا شکار ہوسکتا ہے، پھر یہ معاملہ ایسا ہوگا جیسا منہ کے سامنے کسی کی تعریف کرنا، بلکہ اس سے بھی زیادہ سنگین۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)



اس باب کے مسائل

(۱) سورۂ النجم کی آیات نمبر ۱۹ تا ۲۳ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) صحابہ کرام ﷺ کے ''ذات انواط'' کے مطالبے کی حقیقی صورت اور اصل وجہ معلوم ہوئی۔

(۳) انہوں نے جو مطالبہ کیا اسے عملی جامہ پہنانے کی نوبت نہ آئی، بلکہ اس سے قبل ہی ان کی اصلاح عمل میں آ چکی تھی۔

(۴) ''ذات انواط'' کے مطالبے سے صحابہ کرام ﷺ کا مقصود اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا تھا، کیونکہ وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس عمل کو پسند فرماتا ہے۔

(۵) جب صحابہ کرام ﷺ توحید کے ایک اہم نکتے سے ناآشنا رہے تو دوسروں کا ناآشنا رہنا تو اور زیادہ قرینِ قیاس ہے (لہذا توحید کے مسائل کے فہم کے لئے بڑی توجہ، دقتِ نظر اور باریک بینی کی ضرورت ہے) (واللہ ولی التوفیق)

(۶) صحابہ کرام ﷺ کی نیکیاں اور ان کے بدلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کے وعدے، یہ ایک ایسا رتبہ ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں (یعنی مذکورہ معاملے کے باوجود ان کی عظمتِ شان برقرار ہے)

(۷) رسول اللہ ﷺ نے اس مطالبے پر صحابہ کرام ﷺ کو معذور قرار نہیں دیا (اور یہ سوچ کر خاموشی اختیار نہیں کی کہ یہ لوگ ابھی نئے مسلمان ہیں لہذا معذور ہیں) بلکہ ان کے اس مطالبے کو سختی سے رد فرمایا۔ اولاً آپ نے تعجباً وانکاراً اللہ اکبر کہا، پھر فرمایا یہ روش اور طور طریقے پہلے لوگوں میں بھی موجود تھے۔ پھر فرمایا: تم پہلے لوگوں کے طور طریقوں کی ہو بہو پیروی کرو گے، گویا ان تین امور سے رسول اللہ ﷺ نے مسئلہ کی شدت، خطورت اور نزاکت وحساسیت بیان فرمائی (چوتھا اہم نکتہ، فقرہ ۸ میں آ رہا ہے)

(۸) سب سے بڑا مسئلہ جو اس حدیث کا اصل مقصود ہے یہ ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام ﷺ کے اس مطالبے کو بنی اسرائیل کے مطالبے جیسا قرار دیا۔ بنی اسرائیل نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: ''ہمیں بھی ایک الٰہ (معبود) بنا کر دے دو......

(۹) یہ بات واضح ہوئی کہ درختوں وغیرہ سے حصولِ برکت کی نفی وانکار بھی "لا الٰہ الا اللہ" کے معنی میں داخل ہے۔ یہ بڑا باریک اور دقیق مسئلہ ہے، حتی کہ بعض صحابہ پر بھی مخفی رہا۔

(۱۰) نبی ﷺ نے اس فتویٰ پر قسم کھائی ، جو اس کے اہم ہونے کا ثبوت ہے ، کیونکہ آپ ﷺ ہر بات پر خوامخواہ قسم نہیں کھاتے تھے ، بلکہ بڑی اہمیت و مصلحت کے حامل امور پر قسم کھاتے تھے۔

(۱۱) یہ بات واضح ہوئی کہ شرک ، اکبر بھی ہوتا ہے اور اصغر بھی ، اور صحابہ کرام ﷺ کا مطالبہ شرکِ اصغر پر مبنی تھا یہی وجہ ہے کہ وہ اس مطالبے پر مرتد قرار نہیں پائے۔

(۱۲) صحابہ کرام ﷺ کا یہ کہنا کہ ہم مذکورہ مطالبہ اس لئے کر بیٹھے کہ ہمارا زمانہ کفر قریب تھا اور ہم نئے نئے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے ، اس بات کی دلیل ہے کہ دوسرے صحابہ کرام ﷺ جنہیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں کچھ وقت گزارنے کی سعادت میسر ہو چکی تھی وہ اس اہم مسئلہ سے ناواقف نہیں تھے ، بلکہ انہیں اس نکتۂ توحید کی پوری پوری معرفت تھی۔

(۱۳) تعجب کے وقت اللہ اکبر کہنا ثابت ہوا ، کچھ لوگ اسے مکروہ گردانتے ہیں اور اس حدیث میں ان کا رد موجود ہے۔

(۱۴) وہ امور جو شرک تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکتے ہیں ان کا بھی سدِ باب ضروری ہے (چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس سفر میں ذاتِ انواط درخت دیکھ لیا مگر اس کے سائے تلے بیٹھنا گوارہ نہیں کیا ، باوجودیکہ وہ سایہ بہت گھنا تھا تا کہ کسی کے ذہن میں جاہلیت والا فتنہ نہ جاگ اٹھے)

(۱۵) اہلِ جاہلیت سے کسی معاملے میں تشبیہ جائز نہیں۔

(۱۶) عندالتعلیم ، استاد اپنے شاگردوں کی کسی غلطی پر غصہ میں آسکتا ہے (یہ ایک فطری امر ہے بالخصوص جب استاد انتہائی مخلص ہو)

(۱۷) نبی ﷺ نے "انھا السنن" کہہ کر ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا (یعنی یہ طور طریقے پہلے لوگوں میں تھے ، اور میری امت سابقہ امتوں کی ہو بہو پیروی کرے گی)

(۱۸) آپ ﷺ کا یہ فرمانا (تم سابقہ قوموں کی پیروی کرو گے) آپ ﷺ کی نبوت کی صداقت کا نشان ہے ، کیونکہ آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا وہ حرف بحرف ہوا اور ہو رہا ہے۔

(۱۹) اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہود و نصاریٰ کی جن حرکتوں پر ان کی مذمت فرمائی ہے اس سے درحقیقت ہمیں تنبیہ کرنا مقصود ہے تا کہ ہم احتیاط کریں اور ان امور کے ارتکاب سے بچنے کی پوری کوشش کریں جن کے ارتکاب سے یہود و نصاریٰ مذموم قرار پائے۔

(۲۰) (اب چونکہ سابقہ امتوں کی پیروی ایک مذموم فعل ہے) لہذا صحابہ کرام ﷺ اس مسلمہ

اصول پرسختی سے کاربند ہوچکے تھے کہ عبادات کا اصل مبنی اوراساس" لا الــــہ الا اللہ" اوررسول ﷺ کا امر ہے(نہ کہ دوسروں کی تقلید۔)اس اہم نکتے کی قبرمیں ہرشخص سے پوچھے جانے والے تینوں سوال پوری پوری ترجمانی کررہے ہیں:" مَنْ رَبُّكَ؟ مَنْ نَبِيُّكَ؟ مَادِيْنُكَ؟ "

''مَنْ رَبُّكَ '' سوال کا تعلق تو ظاہروواضح ہے۔

'' مَنْ نَبِيُّكَ '' کا تعلق اس طرح کہ آپ نبی ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے (اللہ تعالیٰ کی وحی سے)غیب کی چیزیں بتلائیں،اورآپ ﷺ کی ہرخبر سچ ثابت ہوئی۔

''وَمَا دِيْنُكَ'' پران کا قول ﴿ اِجْعَلْ لَنَا اِلٰهاً .....الایۃ ﴾ دلالت کرتا ہے(چنانچہ الہ حق تو موجود ہے کسی اورالہ کے تعین کے حوالے سے بنی اسرائیل کا مطالبہ سراسرباطل ہے۔اس الہ حق نے دین بنایاہے جوحق وصدق ہے اس کواختیار کرنے والا کامیاب ہوگا اورقبر میں اس سوال کا صحیح جواب دینے کے قابل ہوگا۔اورجوالہ حق کے بنائے ہوئے دین سے روگردانی کرکے دوسروں کی باتوں پردھیان دے گا وہ قبرمیں پوچھے گئے اس سوال پرلاجواب ہوجائے گا)

(۲۱) یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مشرکین کے طورطریقوں کی طرح اھل کتاب کے طورطریقے بھی مذموم ہیں۔

(۲۲) جوشخص ایک عرصہ باطل پرقائم رہاہواس کادل باطل امورکاعادی بن چکا ہو،وہ شخص اگر باطل سے کنارہ کشی اختیارکرکے اسلام قبول کرلے،توان باطل امورکہ جن کا وہ عادی تھا کے کچھ اثرات کا دل میں باقی رہ جانا بعیدازقیاس نہیں ہے،صحابہ کرام ﷺ کا یہ کہنا کہ " نحن حدثاء عهد بكفر" اس بات کی دلیل ہے۔پھرصدق واخلاص کے ساتھ ساتھ نورحق کی ممارست سے رفتہ رفتہ ساری تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اوردل ایک شفاف آئینہ بن جاتا ہے۔ واللہ الموفق.



باب ماجاء فی الذبح لغیر اللہ

غیر اللہ کے نام ذبح کرنے کا بیان

وقوله تعالیٰ: ﴿ قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ . لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴾ (۱)

''آپ فرمادیجئے کہ بالیقین میری نماز، اور میری ساری عبادت، اور میرا جینا، اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے، اور میں سب ماننے والوں سے پہلا ہوں۔''

اس باب میں دو باتیں بطورِ خاص بیان ہونگی۔

(۱) غیر اللہ کے نام ذبح کرنے کا کیا حکم ہے! یہ عمل شرک ہے یا نہیں؟

(۲) غیر اللہ کے نام ذبح کرنے والے شخص کے بارے میں شریعت نے کیا وعید بیان کی ہے؟ اور وہ کس سزا کا مستحق ہے؟

آیت ﴿ قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي.... ﴾ سے استدلال

حافظ ابن کثیر ؒ فرماتے ہیں: یہاں اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ سے مخاطب ہے، اور انہیں یہ حکم دے رہا ہے کہ مشرکین مکہ کو اپنے عقیدہ سے آگاہ کردو، کیونکہ مشرکین تو غیر اللہ کی پوجا و پرستش کرتے ہیں، اور غیر اللہ کے نام پر اپنے جانور ذبح کرتے ہیں۔ اور یہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کے ساتھ شرک ہے، لہذا ضروری ہے کہ آپ ﷺ ان کے عقائد کی مخالفت بھی کریں، اور ان کے عقائدِ باطلہ سے اظہار ناراضگی و بیزاری بھی کریں، اور انہیں اپنے عقیدہ، جوکہ بالکل صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ کے امر پر مبنی ہے سے مطلع بھی کردیں۔

"صَلَاۃَ": سے مراد نماز ہے (یا عموم مراد لیں تو ہر بدنی عبادت مراد ہوسکتی ہے) یہ اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔

"نُسُك": ذبح یا قربانی کو کہتے ہیں، یہ تفسیر سعید بن جبیر اور ضحاک ؒ سے منقول ہے، جبکہ مجاہد ؒ کے نزدیک "نُسُك" وہ قربانی ہے جو حج یا عمرہ کے موقع پر کی جائے (اس سے تمام مالی عبادات کی طرف اشارہ بھی مراد ہوسکتا ہے) یہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔

=

(۱) (الانعام: ۱۶۲، ۱۶۳)

وقولہ تعالیٰ: ﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴾ ①

''پس تو (ﷺ) اپنے رب کے لئے نماز پڑھ اور قربانی کر۔''

=

" مَحْيَايَ " سے مراد ہر وہ عمل جو پوری زندگی میں کر چکے ہیں یا آئندہ کرنے ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں۔

" مَمَاتِيْ " سے مراد موت، یعنی وہ ایمان اور عمل صالح جو عند الموت حاصل اور موجود ہوگا وہ بھی اللہ رب العزت کیلئے ہے، اسی کی رضا کے لئے خالص ہے۔ اور ان امور میں سے کسی امر میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ "وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ" کا معنی یہ ہے کہ ان تمام امور کے ایک اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کرنے اور بجا آوری کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔

" وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ " (اور میں سب ماننے والوں میں سے پہلا ہوں) اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر نبی کا اسلام اپنی امت کے اسلام سے پہلے ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ یہ وہی عقیدہ اور دعوت ہے جس پر سابقہ تمام انبیاء ومرسلین علیہم السلام بھی قائم ومستقر تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلاَّ نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلاَّ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ ②

''اور ہم نے آپ سے قبل جتنے بھی رسول بھیجے ان کی طرف یہی وحی کی کہ میرے علاوہ کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو۔''

﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ ..... ﴾ اس آیت کریمہ کو اس باب کے تحت ذکر کرنے کا مقصد بالکل واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ قربانی اور ذبح ایک عبادت ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے، جبکہ غیر اللہ کے نام پر ذبح شرک ہے۔

آیت ﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴾ سے استدلال

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو یہ دونوں عبادتیں بجالانے کا حکم دیا ہے یعنی نماز اور قربانی، یہ دونوں عبادتیں قرب، تواضع اور افتقار واحتیاج کا مظہر ہیں، نیز اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن، قوتِ یقین اور طمانینتِ قلب کی دلیل ہیں.... (الی ان قال) نسک سے مراد وہ ذبیحہ جس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہو، یہ اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کے لئے ایک بہت ہی عظیم الشان عبادت

=

① (الکوثر: ٢) ② (الانبیاء: ٢٥)

قال : عن علی رضی اللہ عنہ قَالَ حَدَّثَنِی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بِاَرْبَعِ کَلِمَاتٍ :"لَعَنَ اللّٰہُ مَنْ ذَبَحَ لِغَیْرِ اللّٰہِ، وَلَعَنَ اللّٰہُ مَنْ لَعَنَ وَالِدَیْہِ ، وَلَعَنَ اللّٰہُ مَنْ آوٰی مُحْدِثًا ، وَلَعَنَ اللّٰہُ مَنْ غَیَّرَ مَنَارَ الْاَرْضِ "①

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے چار باتیں بتائیں:''اللہ تعالیٰ کی اس شخص پرلعنت ہو جو غیر اللہ کے لئے ذبح کرے،اور اللہ تعالیٰ کی اس شخص پر لعنت جو اپنے والدین پرلعنت بھیجے،اور اللہ تعالیٰ کی اس شخص پرلعنت جو کسی بدعتی (یا مجرم) کو پناہ دے،اور اللہ تعالیٰ کی اس شخص پرلعنت جو زمین کے نشانات تبدیل کرے۔''

=

ہے، پھر اظہار شکر کا عظیم ذریعہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کوثر جیسی عظیم نعمت کی عطا پر اپنے پیغمبر ﷺ کو بذریعہ نماز وقربانی ادائیگی شکر کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔بدنی عبادات میں سب سے بڑی عبادت نماز ہے جب کہ مالی عبادات میں قربانی کو یہ درجہ حاصل ہے۔زندہ دل لوگ جانتے ہیں کہ جو برکات نماز میں حاصل ہوتی ہیں وہ کسی اور عبادت میں نہیں،اسی طرح قربانی اگر ایمان ،اخلاص ،قوتِ یقین اور اخلاصِ ظن کا مرقع ہو تو اس سے حاصل ہونے والی برکات وخیرات کا معاملہ بڑا ہی عجیب اور محیر العقول ہے۔یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کثیر الصلوٰۃ بھی تھے اور کثیر النحر بھی۔''

واضح ہو کہ " وَانْحَرْ" کی یہی تفسیر صحیح ہے،بعض لوگ" وَانْحَرْ" کا معنی رفع الیدین فی الصلوٰۃ سے کرتے ہیں،اور اس سلسلہ میں مستدرک حاکم اور سنن کبریٰ وغیرہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں،مگر وہ حدیث موضوع ہے اس کی سند میں ایک راوی اسرائیل بن حاتم منکر الحدیث،اور وضاع ہے۔

غیر اللہ کے نام ذبح کرنے والا ملعون ہے

وقوله:قال : عن علی رضی اللہ عنہ قَالَ حَدَّثَنِی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بِاَرْبَعِ کَلِمَاتٍ :......

یہ حدیث صحیح مسلم کے علاوہ مسند احمد میں بھی ہے،اس کے راوی سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہے، جو ہاشمی اور قریشی تھے، نبی ﷺ کے چچا زاد بھائی بھی تھے اور داماد بھی ،سابقین اولین میں شمار ہوتے تھے،عشرہ مبشرہ میں ان کا نام بھی شامل تھا، چوتھے خلیفہ راشد تھے،ابن ملجم خارجی ملعون نے سن ۴۰ھ رمضان کے مہینے میں آپ کو شہید کیا،آپ کے مناقب بے شمار ہیں۔

① صحیح مسلم ،کتاب الاضاحی(۱۹۷۸)

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے چار قسم کے افراد پر لعنت بھیجی ہے۔ لعنت سے مراد مواقعِ رحمت سے دوری ہے، لعین یا مردود وہ شخص ہے جو یا تو لعنت کا مستحق بن چکا ہو یا اس پر لعنت واقع ہونے کی بددعا کی جا چکی ہو۔

ابو السعادات فرماتے ہیں: لفظ لعنت کی نسبت اگر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو رحمت سے دوری کے معنی میں ہوگی، اور اگر مخلوق کی طرف ہو تو گالی اور بددعا کے معنی میں ہوگی۔

جن چار افراد پر لعنت بھیجی گئی ہے، ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو غیر اللہ کے لئے ذبح کرے۔

امام نووی رحمہ اللہ شرحِ مسلم میں فرماتے ہیں: ''کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی بجائے کسی اور کے نام پر ذبح کرے، جیسے بت، صلیب، یا موسیٰ یا عیسیٰ علیہما السلام کے نام پر، یا کعبۃ اللہ کے نام پر، یہ سب حرام ہے، اس ذبیحہ کو کھانا بھی حرام ہے خواہ ذبح کرنے والا مسلمان ہی کیوں نہ ہو... اور اگر غیر اللہ کے نام ذبح کرنے سے اس کی تعظیم اور عبادت بھی مقصود ہو جائے تو یہ کفر ہوگا، اور اس طرح ذبح کرنے والا اگر مسلمان ہے تو وہ ذبح کرتے ہی مرتد ہو جائے گا''

غیر اللہ کے نام ذبح کرنے کی چند صورتیں

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ کے ضمن میں ''ذبح لغیر اللہ'' کے تعلق سے بہت عمدہ اور مفصل لکھا ہے ان کی گفتگو میں سے دو باتیں بہت ہی زیادہ قابل ذکر ہیں۔ ''ایک تو یہ کہ ''ذبح لغیر اللہ'' سے مراد یوں کہنا ہے کہ یہ ذبیحہ فلاں کیلئے ہے، اور ذبح میں اگر غیر اللہ کا قصد یا نیت شامل ہو جائے تو وہ حرام ہو جائے گا خواہ عند الذبح اسکا نام لے یا نہ لے۔ دوسری بات یہ کہ اگر غیر اللہ کے نام ذبح کیا جا رہا ہے اور اس غیر اللہ کا تقرب بھی مقصود ہے تو خواہ اس جانور کو بسم اللہ پڑھ کر بھی ذبح کیوں نہ کرے وہ حرام ہی ہوگا۔ پھر شیخ الاسلام نے فرمایا: اس امت کے بہت سے منافقین ایسا کرتے ہیں''

واضح ہو کہ دورِ جاہلیت میں مکہ میں جنوں کیلئے جو جانور ذبح کئے جاتے تھے وہ بھی اسی قبیل سے ہیں جس کی تفصیل زمخشری نے یوں بیان کی ہے کہ دورِ جاہلیت میں لوگ کوئی گھر خریدتے یا بناتے تو اس میں یا کسی بھی اچھی چیز میں جنوں کی طرف سے نقصان پہنچانے کے خوف سے جانور ذبح کیا کرتے، وہ جانور جنوں کی طرف منسوب ہوتے تھے۔

امام نووی رحمہ اللہ نے اپنے شیخ ابراھیم المروزی کے حوالے سے لکھا ہے: ''کہ اہلِ بخاری تو اس ذبیحہ کی بھی

حرمت کا فتویٰ دیتے تھے جو بادشاہ کے استقبال کے وقت اسکے قرب کے حصول کے لئے ذبح کیا جاتا تھا۔ وہ اسے بھی "ما اھل لغیر اللہ" کے عموم میں شامل کرتے تھے۔''

رافعی کا کہنا ہے: ''یہ ذبح تو بادشاہ کی آمد کی خوشی میں ہوتا ہے جیسے بچے کی پیدائش پر خوشی کی وجہ سے عقیقہ کے جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔''

ہم کہتے ہیں کہ اگر بادشاہ کی آمد پر خوشی کے جذبات سے جانور ذبح کئے جائیں تو یہ جائز ہوگا جیسا کہ رافعی کا قول ہے، اور اگر حصولِ قرب کے لئے ذبح کئے جائیں تو پھر وہ حدیث کے عموم میں داخل ہوکر مکروہ قرار پائے گا جیسا کہ اہلِ بخاری کا فتویٰ ہے۔

ماں باپ کو گالی دینے کی وعید

دوسرا شخص جسے رسول اللہ ﷺ نے ملعون قرار دیا وہ ہے جو اپنے والدین کو گالی دے۔ صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان موجود ہے:

" مِنَ الْكَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَهَلْ يَشْتِمُ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ؟ قَالَ: نَعَمْ: يَسُبُّ أَبَا الرَّجُلِ فَيَسُبُّ أَبَاهُ وَيَسُبُّ أُمَّهُ فَيَسُبُّ أُمَّهُ " ①

''آدمی کا اپنے والدین کو گالی دینا کبیرہ گناہوں میں سے ہے صحابہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! بھلا کوئی شخص اپنے والدین کو گالی دے سکتا ہے؟ فرمایا: ہاں: وہ کسی دوسرے شخص کے باپ کو گالی دے گا تو وہ جواب میں اس کے باپ کو گالی دے گا، اور وہ کسی دوسرے شخص کی ماں کو گالی دے گا تو وہ جواب میں اس کی ماں کو گالی دے گا۔''

غور کیجئے یہ اس شخص کا حال ہے جو اپنے ماں باپ کو براہِ راست گالی نہیں دیتا بلکہ ان تک گالی پہنچنے کا سبب بنتا ہے، تو پھر اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جو براہِ راست اپنے ماں باپ کو گالی دیتا ہو۔

تیسرا شخص جو اس حدیث میں ملعون قرار دیا گیا ہے وہ ہے جو کسی ''مُحدِث'' کو پناہ دے، ''مُحدِث'' دال کی زیر اور زبر دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے، اگر دال کی زیر کے ساتھ پڑھیں تو اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جو کسی ظلم یا بدعت کا ارتکاب کرے، اس معنی کی صورت میں پناہ دینے سے مراد واضح ہے، اور اگر ''مُحدَث''، یعنی دال کی زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو اس سے مراد بدعت ہوگا، اس معنی کی صورت میں پناہ

① صحيح مسلم، كتاب الايمان (٩٠) عن عبد الله بن عمرو بن العاص ﷺ

دینے سے مراد اس سے راضی ہونا یا اسے پسند کرنا ہوگا، چنانچہ جو شخص بدعت سے راضی ہو اور بدعت کے مرتکب شخص کی اصلاح کی کوشش نہ کرے تو اس کا یہ کردار اسے پناہ دینے کے مترادف ہوگا۔

ہم نے جو "محدِث" (بکسرِ الدال) سے مراد ظالم اور بدعتی دونوں ذکر کئے ہیں تو ان دونوں میں بدعتی کا عمل زیادہ خطرناک اور گھناؤنا ہے، کیونکہ ظالم کا ظلم اسکی یا کسی دوسرے شخص کی ذات تک محدود ہے جبکہ بدعتی کی بدعت دین کے لئے نقصان دہ ہے، لہذا ظالم کی بہ نسبت بدعتی کو پناہ دینا یا اس کی توقیر کرنا زیادہ اور بڑے گناہ کا باعث ہے (اسلیئے سفیان ثوری رحمہ اللہ کا قول ہے: کہ ابلیس کو گناہ سے زیادہ بدعت محبوب ہے)

اعاذنااللہ من البدعة واهلها .

چوتھی چیز جو باعثِ لعنت بنتی ہے، وہ زمین کے نشانات تبدیل کرنا ہے، اس سے مراد وہ حدود ہیں جو آپ کی اور آپ کے پڑوسی کی زمین کو جدا کریں۔ حدود کے ان نشانات کو تبدیل کرنے والا ملعون قرار پایا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک اور حدیث میں اس عمل کی شدید ترین وعید بیان فرمائی ہے، چنانچہ صحیح بخاری، کتاب المظالم میں، اور صحیح مسلم، کتاب المساقات میں، رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان مذکور ہے "جو اپنے بھائی کی ایک بالشت زمین پر ظلماً قبضہ کرلے قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا"

(زمین کے نشانات تبدیل کرنے کا ایک معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حکومت مختلف علاقوں کی مسافتیں لکھوانے کا اہتمام کرتی ہے تاکہ سفر کرنے والوں کو اپنے سفر کی سمت اور مسافت کا اندازہ رہے، اور انہیں اس تعلق سے کسی ابہام یا پریشانی کا شکار نہ ہونا پڑے، ان نشانات کو مٹانے یا تبدیل کرنے والا بھی اس حدیث کی وعید کا حقدار ہے، یعنی مستحق لعنت ہے)

قال :وعن طارق بن شهاب أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ : " دَخلَ الجَنَّةَ رَجُلٌ فِيْ ذُبَابٍ وَدَخلَ النَّارَ رَجُلٌ فِيْ ذُبَابٍ قَالُوْا : وَكَيْفَ ذٰلِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ؟ قَالَ :مَرَّ رَجُلَانِ عَلٰى قَوْمٍ لَهُمْ صَنَمٌ لَا يُجَاوِزُهُ أَحَدٌ حَتّٰى يُقَرِّبَ لَهٗ شَيْئًا فقَالُوْا لِأَحدِهِمَا : قَرِّبْ قَالَ: مَا عِنْدِيْ شَيْئٌ قَالُوْا: قَرِّبْ وَلَوْ ذُبَابًا فَقَرَّبَ ذُبَابًا فَخَلُّوْا سَبِيْلَهٗ فَدَخَلَ النَّارَ . وَقَالُوْا لِلْاٰخَرِ : قَرِّبْ قَالَ : مَا كُنْتُ لِأُقَرِّبَ لِأَحَدٍ شَيْئًا دُوْنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ ، فَضَرَبُوْا عُنُقَهٗ فَدَخَلَ الْجَنَّةَ " ①

طارق بن شہاب ﷜ فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ایک شخص جنت میں داخل ہوا ایک مکھی کی وجہ سے ایک دوسرا شخص ایک مکھی ہی کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوگیا، صحابہ کرام ﷢ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ کیسے ہوا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا دو شخص ایک قوم کے پاس سے گزرے، جن کا ایک بت تھا، جس پر کچھ چڑھاوا چڑھائے بغیر کوئی نہ گزر سکتا تھا (انہوں نے ان دونوں مسافروں کو پکڑ لیا) ایک سے کہا کچھ چڑھاوا چڑھاؤ، اس نے جواب دیا کہ میرے پاس چڑھانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے، انہوں نے کہا: کچھ تو چڑھانا پڑے گا، خواہ ایک مکھی ہی سہی، اس نے ایک مکھی کا چڑھاوا پیش کردیا، اور انہوں نے اس کا راستہ چھوڑ دیا، یہ شخص جہنم میں داخل ہوگیا۔ پھر انہوں نے دوسرے شخص سے کہا: اب تم چڑھاوا پیش کرو، اس مردِ مومن نے جواب دیا میں غیر اللہ کے نام پر کوئی چڑھاوا نہیں چڑھاتا، انہوں نے اسی وقت اس کی گردن اڑادی اور وہ سیدھا جنت میں جا پہنچا۔''

مؤلف ﷫ نے اس حدیث کو امام احمد کی طرف منسوب کیا ہے، امام احمد نے یہ حدیث اپنی مسند میں نہیں بلکہ کتاب الزھد میں روایت کی ہے۔ یہ حدیث طارق بن شھاب ﷜ سے مرفوعاً مروی ہے، جنہیں نبی ﷺ کی صحبت کا شرف تو حاصل تھا لیکن آپ ﷺ سے سماع ثابت نہیں، اسی لئے بہت سے علماء نے اس حدیث کو مرسل قرار دیا ہے، حافظ ابن حجر ﷫ فرماتے ہیں: جب ان کا نبی ﷺ سے لقاء ثابت ہے تو یہ صحابی ہوئے، اس کے بعد سماع کا ثابت نہ ہونا اس حدیث کی صحت میں موجب قدح نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ حدیث مرسلِ صحابی قرار پائی گی جو قولِ راجح کے مطابق مقبول ہے۔ امام نسائی ﷫ نے ان سے متعدد مرفوع حدیثیں روایت کی ہیں، جو ان کی صحبتِ رسول ﷺ کے اثبات کی دلیل ہے، ان کا ۸۳ھ میں انتقال ہوا۔

① یہ حدیث صحیح ہے، لیکن موقوف ہے "الزھد" لامام احمد (ص۳۲) "الحلیہ" لابی نعیم (۱/۲۰۳).

حدیثِ ذباب (مکھی) سے مسئلة الباب کیلئے استدلال

اس حدیث میں جن دو افراد کا ذکر ہے ان کا تعلق بنی اسرائیل سے ہو سکتا ہے۔

اس حدیث میں مذکور قصہ اس بات کی دلیل ہے کہ شرک چاہے کتنی ہی چھوٹی، تھوڑی اور حقیر چیز میں ہو، انتہائی خطرناک اور عذابِ جہنم کا موجب ہے، چنانچہ آپ غور کیجئے کہ مکھی جو انتہائی خسیس، رذیل اور حقیر جانور ہے، کا چڑھاوا چڑھانے والا جہنم میں داخل ہوگیا تو پھر بڑے بڑے اور پاک اور حلال جانوروں کے چڑھاوے پیش کرنے والا کس قدر گنہگار اور عذابِ شدید کا مستحق بنے گا؟ مکھی کا چڑھاوا بظاہر ایک معمولی سا عمل ہے، لیکن چونکہ یہ اللہ رب العزت کی عبادت میں شرک ہے لہذا بہت بڑا گناہ ہے، اور شرک چاہے جیسا بھی ہو، اور جتنا بھی ہو اس کا انجام جنت کے حرام ہونے اور جہنم کے مستقل ٹھکانہ بننے کے سوا کچھ نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ﴾ ①

یعنی "جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے گا اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کر دے گا، اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا"

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: تم آج کچھ کام ایسے کرتے ہو جو تمہارے نزدیک بال سے زیادہ باریک ہیں، ہم انہیں رسول اللہ ﷺ کے دور میں تباہ کن شمار کیا کرتے تھے ②

یہاں یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ اس شخص نے قصداً شرک نہیں کیا تھا، بلکہ ان کے شر سے بچنے کے لئے مکھی کا چڑھاوا چڑھا بیٹھا، اور واصلِ جہنم ہوگیا، تو پھر ان لوگوں کا کیا انجام ہوگا جو قصداً وارادۃً وعقیدۃً شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔

جہاں یہ حدیث شرک کی مذمت وشناعت پر مشتمل ہے وہاں توحید کی فضیلت پر بھی زبردست دلیل ہے، چنانچہ دوسرے شخص کو محض اس لئے بہشت کی وراثت مل گئی کہ اس نے اپنے دامن کو شرک کی آلودگی سے بچالیا اور غیرتِ توحید کا عملی مظاہرہ کرگیا۔

اس حدیث میں مذکور قصہ ایک صحیح حدیث کے معنی کو خوب واضح کرتا ہے، چنانچہ رسول ﷺ کا فرمان ہے: "جنت تم سے تمہارے جوتے کے تسمے سے بھی قریب ہے، اور جہنم بھی اتنے ہی فاصلے پر ہے۔" ③

واللہ اعلم

① (المائده: ٧٢) ② (صحيح بخاری، رقم: (٨٣)
③ صحيح بخاری، كتاب الرقاق (٦٤٨٨) عن ابن مسعود رضي الله عنه.

اس باب کے مسائل

(۱) آیتِ کریمہ: ﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) آیتِ کریمہ: ﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۳) حدیث میں جن لوگوں کو لعنت کا مستحق قرار دیا گیا ہے ان کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے ان لوگوں کا ذکر کیا گیا جو غیر اللہ کے نام ذبح کرتے ہیں (جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ توحید اور شرک کے مسائل سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔)

(۴) وہ شخص بھی لعنت کا مستحق ہے جو اپنے والدین پر لعنت بھیجے، اور اسکی ایک صورت یہ ہے کہ وہ شخص کسی دوسرے شخص کے والدین کو گالی دے جس کے جواب میں وہ شخص اسکے والدین کو گالی دے۔

(۵) اس شخص کا ملعون ہونا ثابت ہوا جو کسی مجرم کو پناہ دیتا ہے، جس کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص کسی ایسے جرم کا ارتکاب کرے جو شرعاً قابلِ تعزیر ہے، وہ شخص آپ سے پناہ طلب کرے اور آپ اسے پناہ دے دیں، تو آپ کا یہ عمل موجب لعنت ہوگا۔

(۶) اس شخص کا ملعون ہونا ثابت ہوا جو زمین کے نشانات بدل دیتا ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ ان نشانات کو آگے پیچھے کر دے جو اس کے اور اس کے پڑوسی کے حق کو متعین کرتے ہیں، اور اس طرح وہ اپنے پڑوسی کی زمین کو ہتھیانے کی کوشش کرے۔

(۷) کسی متعین شخص پر لعنت بھیجنے اور مطلقاً وعموماً گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں پر لعنت بھیجنے میں جو فرق ہے، اس کی وضاحت حاصل ہوئی (اس کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ نے کسی متعین شخص کو اس کا نام لیکر ملعون نہیں کہا، بلکہ چند گناہوں کا ذکر کیا اور ان کے مرتکبین کو مستحقِ لعنت قرار دیا، آپ ﷺ کا یہی اسلوب تھا، جیسا کہ ایک حدیث میں سود کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے اور گواہی دینے والے کو ملعون قرار دیا۔ آپ ﷺ کے اس اسلوب میں ہمارے لئے یہ نصیحت موجود ہے کہ ہم کسی متعین شخص کو ملعون نہ کہیں، بلکہ ضرورت پڑے تو اس معصیت کے مرتکب پر لعنت کا حکم لگائیں، یعنی یوں کہیں کہ جو شخص فلاں کام کرتا ہے اسے رسول اللہ ﷺ نے ملعون قرار دیا ہے) واللہ اعلم!

(۸) یہ بھی معلوم ہوا کہ مکھی والا واقعہ توحید و شرک کی عظمت و ہیبت کے بیان میں کتنی عظمت کا حامل ہے۔

(۹) اس حقیقت پر خوب غور کیا جائے کہ مکھی کا چڑھاوا چڑھانے والا جہنم میں داخل ہوا، حالانکہ اس کے اس عمل میں اس کا قصد وارادہ شامل نہیں تھا، بلکہ محض جان بچانا مقصود تھا (توان لوگوں کی بربادی کا تصور کیجئے جو قصداً وارادۃً وعقیدۃً شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔)

(۱۰) مؤمنین کے دل میں شرک کی ہیبت کس قدر پیوست ہے، چنانچہ اس شخص نے قتل ہونا گوارہ کرلیا، اور اس تکلیف کو بڑے صبر سے جھیلتے ہوئے جان کی بازی لگادی مگر ان کے مطالبے کو پورا نہیں کیا، حالانکہ انہوں نے محض ایک ظاہری عمل کا تقاضہ کیا تھا (یعنی صرف ایک بار مکھی چڑھانے کا حکم دیا تھا، ان کا یہ تقاضا ہرگز نہ تھا کہ اس عمل کو مستقل اپنے عقیدے کا حصہ بنالو، تو اس ایک بار کے ظاہری عمل کو بھی قبول نہ کرنا اور اپنی جان گنوا دینا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شرک کے ہولناک انجام سے بہت خائف تھے۔)

(۱۱) جو شخص جہنم میں داخل ہوا وہ مسلمان تھا، کیونکہ اگر وہ کافر ہوتا تو نبی ﷺ یہ نہ فرماتے: کہ وہ صرف ایک مکھی کی وجہ سے جہنم میں گیا۔

(۱۲) یہ واقعہ ایک صحیح حدیث کی توضیح پیش کررہا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے جنت اور جہنم کو جوتے کے تسمے سے بھی قریب تر قرار دیا ہے۔

(۱۳) یہ بات معلوم ہوئی کہ قلبی عمل ہی درحقیقت مقصودِ اعظم ہے، حتی کہ بتوں کے پجاری بھی اس نکتہ سے واقف ہیں۔



باب لا یذبح للہ بمکان یذبح فیہ لغیر اللہ

جس جگہ غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کئے جاتے ہوں وہاں اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔

وقول اللہ تعالیٰ: ﴿ لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ . فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ ﴾ ①

''آپ اس (مسجد ضرار) میں کبھی کھڑے نہ ہوں، البتہ جس مسجد کی بنیاد اوّل دن سے تقوٰی پر رکھی گئی ہے، وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

اس باب میں مؤلف رحمہ اللہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ جس مقام پر غیر اللہ کے نام جانور ذبح ہوتے ہیں وہاں شرک کے اشتباہ سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے نام پر بھی ذبح کرنے سے گریز کرنی چاہیے۔

مسجد ضرار کے قصہ سے استدلال

اس سلسلے میں جو آیتِ کریمہ پیش کی ہے اس کی تفسیر میں مفسرین کے کلام کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مسجدِ ضرار میں نماز ادا کرنے، بلکہ وہاں کھڑا ہونے سے بھی روک دیا، اس معاملے میں آپ ﷺ کی اُمت بھی آپ کے تابع ہے۔ پھر اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کو مسجدِ قباء میں نماز پڑھنے کی ترغیب وتحضیض فرمائی، اور اس کا سبب یہ بیان فرمایا کہ اس مسجد کی پہلے دن سے ہی تقویٰ پر بنیاد رکھی گئی ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے مسجدِ قباء میں نماز کی ادائیگی کو باعتبارِ ثواب عمرہ کے برابر قرار دیا۔ ②

جبکہ صحیح بخاری ومسلم میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سوار اور پیدل ''مسجدِ قباء'' کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے۔ ③

---

① (التوبہ: ١٠٨)

② یہ حدیث شواہد وطرق کی بناء پر حسن درجہ کی ہے۔ سنن ترمذی (٣٢٤) وقال: حسن غریب۔ سنن ابن ماجہ (١٤١١) مستدرك حاكم (٤٨٧/١) مسند احمد (١٥٩٨١ ج ٥ سعد بن حنيف) سنن نسائی (٣٧/٢) صحیح ابن حبان (١٠٣٨)

③ صحیح بخاری، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة (٧٣٢٦) صحیح مسلم، كتاب الحج (١٣٩٩) عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ۔

واضح ہو کہ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں یہ صراحت ہے کہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقوی پر رکھی گئی ہے وہ مسجد نبوی ہے، چنانچہ سیدنا ابوسعید خدری ﷛ فرماتے ہیں: دو افراد نے آپس میں اس مسجد کے بارے میں اختلاف کیا جو اول یوم سے تقویٰ پر قائم ہے، ایک نے کہا: وہ مسجدِ قباء ہے، دوسرے نے کہا: وہ مسجدِ نبوی ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس سے مسجدِ نبوی ہی مراد ہے۔'' ① گویا روایتوں میں تعارض پایا گیا۔ حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کوئی تعارض نہیں، مسجدِ قباء جب مؤسس علی التقویٰ ہے تو مسجدِ نبوی بطریق اولیٰ مؤسس علی التقویٰ ہے، (لہذا دونوں مساجد کا اول یوم سے تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہونا صحیح ہے۔)

مسجدِ ضرار کا قصہ یہ ہے کہ اسے منافقین نے تعمیر کیا، اس تعمیر میں ان کے چند مذموم مقاصد شامل تھے، جن کا قرآنِ حکیم نے بایں الفاظ تذکرہ فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِداً ضِرَارًا وَّ كُفْراً وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَاداً لِّمَنْ حَارَبَ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلاَّ الْحُسْنٰى وَاللهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ ②

''بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ان اغراض کے لئے مسجد بنائی ہے کہ ضرر پہنچائیں، اور کفر کی باتیں کریں، اور ایمانداروں میں تفریق ڈالیں، اور اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس سے پہلے سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا مخالف ہے، اور قسمیں کھائیں گے کہ بجز بھلائی کے اور ہماری کچھ نیت نہیں، اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔''

اس مسجد کی تعمیر اس وقت عمل میں آئی جب رسول اللہ ﷺ جنگِ تبوک کیلئے محوِ سفر تھے، منافقین نے آپ ﷺ سے اس مسجد میں نماز ادا کرنے کی درخواست کی تا کہ لوگوں پر یہ باور کرا سکیں کہ اسے آپ ﷺ کی تائید اور موافقت حاصل ہے، اور بظاہر اسباب یہ بیان کئے کہ یہ مسجد کمزور لوگوں کے لئے بنائی گئی ہے، نیز ان کے لئے جو سرد راتوں میں بیماری کے باعث مسجدِ نبوی میں جانے سے قاصر ہیں، رسول اللہ ﷺ نے تبوک سے واپسی پر آنے کا وعدہ فرمالیا، اور جب آپ ﷺ تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے اور ایک آدھ دن کی مسافت باقی رہ گئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس مسجد کی تعمیر کے مقاصدِ خبیثہ سے آگاہ فرمادیا، جب آپ ﷺ پر حقیقت واضح ہوگئی تو آپ ﷺ نے مدینہ داخل ہونے سے پہلے ہی اپنے جانثاروں کو بھیج کر اسے مکمل طور پر منہدم کروادیا۔ ③

مؤلف ﷫ نے اس آیت کریمہ کو اس باب میں ذکر کر کے یہ استدلال کیا ہے کہ جب مذموم مقاصد

---

① صحیح مسلم، کتاب الحج (۱۳۹۸) ② (سورۃ التوبہ: ۱۰۷)
③ یہ حدیث مرسل ہے۔ ابن جریر (۱۷/۱۱)

....

....

....

....

....

....

....

....

....

کے تحت بنی ہوئی مسجد میں کھڑا ہونے تک کی ممانعت ہے، حالانکہ آپ نے وہاں اللہ تعالیٰ کے لئے کھڑا ہونا تھا تو پھر ایسا مقام جو غیر اللہ کے نام پر جانوروں کو ذبح کرنے کے لئے بنایا گیا ہو وہاں ایک موحد اپنا جانور کیسے ذبح کر سکتا ہے؟ اگر چہ اس نے اللہ تعالیٰ کے نام پر ہی ذبح کرنا ہے، لیکن چونکہ اس مقام کی تاسیس شرک پر ہے، لہذا وہاں جانے سے گریز کرنا چاہئے، جیسا کہ سیدنا ثابت بن الضحاک ﷺ کی آئندہ سطور میں آنے والی حدیث سے بصراحت ثابت ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت کریمہ میں مسجدِ قباء میں موجود کچھ رجال (لوگوں) کا تذکرہ فرمایا، ان کی بابت یہ خبر دی کہ وہ پاکیزہ رہنا پسند کرتے ہیں، پھر اللہ رب العزت نے ان سے اپنی محبت کا اظہار فرمایا، اس پاکیزگی سے جہاں ظاہری نجاستوں سے پاک صاف ہونا ہے وہاں شرک وکفر کی گندگی سے پاک ہونا بھی بالأولیٰ مراد ہوگا۔

محدث ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پانی سے نجاستوں کو پاک کرنا اچھا عمل ہے لیکن وہ تو گناہوں سے پاک صاف تھے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ، قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴾ سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کہ نیک لوگوں اور ہر طرح کی نجاستوں سے پاک صاف ہونے والوں کی جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی ایک مستحب عمل ہے۔

قال :عن ثابت بن الضحاك ، قال :نَذَرَ رَجُلٌ أَنْ يَنْحَرَ إِبِلاً بِبُوَانَةَ فَسَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ: "هَلْ كَانَ فِيهِ وَثَنٌ مِنْ أَوْثَانِ الْجَاهِلِيَّةِ يُعْبَدُ ؟قَالُوْا :لاَ ـ قَالَ: فَهَلْ كَانَ فِيهَا عِيدٌ مِنْ أَعْيَادِهِمْ؟ قَالُوْا:لاَ ـ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:أَوْفِ بِنَذْرِكَ ، فَإِنَّهُ لاَ وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِي مَعْصِيَةِ اللّٰهِ وَلاَ فِيمَا لاَيَمْلِكُ ابْنُ آدَمَ](رواه ابوداؤد واسناده على شرطهما) ①

سیدنا ثابت بن الضحاک ﷛ سے مروی ہے :ایک شخص نے بوانہ مقام پر اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی، پھر نبی ﷺ سے اس بابت سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:''کیا وہاں کبھی دورِ جاہلیت میں پوجے جانے والے بتوں میں سے کوئی بت رہا ؟ صحابہ نے عرض کیا :نہیں ،آپ ﷺ نے فرمایا: کیا وہاں کبھی کسی میلے یا عرس کا انعقاد ہوا ؟ صحابہ نے عرض کیا :نہیں ،تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اب تم اپنی نذر پوری کر سکتے ہو، بے شک اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں نذر پوری کرنا جائز نہیں ،اور نہ ہی اس چیز میں جو ابن آدم کی ملکیت میں نہ ہو۔'' (اسے ابوداؤد نے روایت کیا،اور اسکی سند بخاری ومسلم کی شرط پر ہے)

سنن ابوداؤد ہی کی ایک حدیث (جو کہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے مروی ہے ،) میں اسی قسم کی نذر ماننے کا ایک عورت کا واقعہ مذکور ہے ،جس مقام پر ذبح کرنے کی اس عورت نے نذر مانی اس مقام کے حوالے سے نبی ﷺ نے یہی سوال کیا کہ وہاں کسی دور میں کبھی کوئی شرک تو نہیں ہوا؟ جب آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ وہاں ایسا کبھی نہیں ہوا تو آپ ﷺ نے اس عورت کو اس مقام پر اسکی نذر پوری کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی ۔②

حدیثِ ثابت بن الضحاک ﷛ سے استدلال

ثابت بن الضحاک ﷛ کی مذکورہ حدیث میں جس شخص کی نذر کا قصہ منقول ہے وہ کردم بن سفیان ہو سکتا ہے۔ ایک حدیث میں نذر ماننے کا سبب بھی مذکور ہے، چنانچہ اس نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا کہ میں نے یہ نذر مانی ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر مجھے ایک بیٹا عطا فرمادے تو میں بوانہ مقام پر (پچاس اونٹ) ذبح کرونگا، بوانہ مقام اسفلِ مکہ میں یلملم کے قریب واقع ہے۔

---

① یہ حدیث صحیح ہے۔سنن ابوداؤد (٣٣١٣) سنن الکبریٰ بیہقی (١٠/٨٣) معجم طبرانی کبیر (١٣٤١) التلخیص الحبیر (٤/١٨٠)

② یہ حدیث حسن صحیح ہے۔سنن ابوداؤد (٣٣١٢) سنن الکبریٰ بیہقی (١٠/٧٧)

جب اس شخص نے اپنی نذر کی بابت نبی ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے دو سوال کئے، پہلا: یہ کہ کیا بوانہ مقام میں کسی بھی دور میں کسی بت پرستی کا وجود ملتا ہے؟ دوسرا: یہ کہ کیا وہاں کسی بھی دور میں کوئی شرکیہ میلہ یا اجتماع عام منعقد ہوا؟ ①

آپ ﷺ کے ان دو استفسارات سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ اگر بوانہ مقام پر کوئی شرک منعقد ہوا ہوتا تو آپ اسے وہاں نذر پوری کرنے سے روک دیتے، اسی طرح اگر کوئی میلہ منعقد ہوا ہوتا تو بھی وہاں نذر پوری کرنے کی اجازت نہ دیتے، کیونکہ آپ ﷺ نے اس یقین دہانی کے بعد کہ وہاں نہ تو کبھی غیر اللہ کی پوجا ہوئی ہے اور نہ ہی کوئی میلہ منعقد ہوا ہے، نذر پوری کرنے کا حکم دیا۔ تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ جو مقام غیر اللہ کی کسی بھی عبادت کے لئے بنایا گیا ہو وہاں اللہ تعالیٰ کے نام پر بھی جانور ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔



① یہ حدیث صحیح ہے۔ مسند احمد (۲۵۵ ج ۱، مسند عمر بن الخطاب) سنن الکبریٰ بیہقی (۸۳/۱۰) سنن ابوداؤد، رقم: (۳۳۱۳)

اس باب کے مسائل

(۱) قولہ تعالیٰ: ﴿لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) یہ بات واضح ہوئی کہ اللہ رب العزت کی معصیت اور اللہ رب العزت کی اطاعت کا زمین پر اثر ہوتا ہے۔

(۳) کسی ایسے مسئلے کو کہ جس میں کوئی اشکال ہو، کسی واضح مسئلے پر پیش کرنا معلوم ہوا، تا کہ اس طریقے سے مشکل مسئلے کا اشکال دور ہو جائے۔

(۴) مفتی، ضرورت کے تحت مسئولہ مسئلے کی بابت تفصیلات دریافت کر سکتا ہے۔

(۵) نذر پورا کرنے کے لئے کسی جگہ کا تعین کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اس تعین میں کوئی شرعی مانع موجود نہ ہو۔

(۶) جس مقام پر نذر پورا کرنا مقصود ہو اگر وہاں کسی قسم کی جاہلیت کی بت پرستی ہوئی ہو تو وہاں نذر پوری کرنا جائز نہیں، خواہ وہ بت پرستی زائل ہی کیوں نہ ہو چکی ہو۔

(۷) نذر پوری کرنے کے لئے جس مقام کا انتخاب کیا گیا ہو اگر وہاں کسی بھی دور میں کوئی میلہ لگتا رہا ہو تو وہاں نذر پوری کرنا جائز نہیں ہے، خواہ اس میلے کا رواج ختم ہی کیوں نہ ہو گیا ہو۔

(۸) جو مقام شرک یا میلوں کے انعقاد کے اڈے رہ چکے ہوں، وہاں کے لئے مانی گئی نذر پوری کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ نذرِ معصیت کہلائے گی (اور رسول اللہ ﷺ نے نذرِ معصیت پورا کرنے سے منع فرمادیا)

(۹) مشرکین کے جو بھی تہوار یا میلے ہوں ان میں ان کی کسی بھی طرح کی مشابہت سے گریز کرنا معلوم ہوا، خواہ ان کا تشبہ مقصود نہ بھی ہو۔

(۱۰) یہ بات معلوم ہوئی کہ ایسی ہر نذر باطل ہے جس کے پورا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو۔

(۱۱) یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ انسان جس چیز کا مالک نہیں ہے، اس کی نذر ماننا جائز نہیں ہے۔



باب من الشرك النذر لغير الله

غیر اللہ کے نام کی نذر شرک ہے

قولہ تعالیٰ: ﴿ یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْماً کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا ﴾ ①

''جو نذر پوری کرتے ہیں، اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی بُرائی چاروں طرف پھیل جانے والی ہے''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُهٗ ﴾ ②

''تم جتنا کچھ خرچ کرو یعنی خیرات اور جو کچھ نذر مانو اسے اللہ تعالیٰ بخوبی جانتا ہے۔''

نذر ایک عبادت ہے، اور عبادت کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے، لہذا نذر لغیر اللہ شرک ہوگی، جو شخص اطاعت پر مشتمل کوئی نذر مانے گا تو اسے پورا کرنا اس پر واجب ہوگا، اور پورا کرنے کی صورت میں اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا، جو اسکے عبادت ہونے کی دلیل ہے؛ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نذر پوری کرنے والوں کی بایں الفاظ مدح وتعریف فرمائی: ﴿ یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ ﴾ ''(کہ مومن وہ ہیں) جو نذر پوری کرتے ہیں'' پس اگر کوئی شخص کسی مخلوق کیلئے نذر مان لے تاکہ اس کا قرب اور عند اللہ شفاعت حاصل ہو، اور اس کی مشکلات کا ازالہ ہو تو یہ عمل صراحتاً شرک قرار پائے گا، یہ عمل ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص غیر اللہ کیلئے نماز پڑھے۔

وقولہ: قولہ تعالیٰ: یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْماً....

یہ آیتِ کریمہ نذر لغیر اللہ کے شرک ہونے کی دلیل ہے، وجہ استدلال یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے نذر پوری کرنے والوں کی تعریف فرمائی ہے، اور اللہ تعالیٰ بندوں کی تعریف تب ہی فرماتا ہے جب وہ کسی واجب یا مستحب فعل کو انجام دیں، یا پھر کسی حرام امر کو چھوڑ دیں، اور یہ سب عبادت ہے جسے غیر اللہ کیلئے ادا کرنا شرک ہوگا۔

وقولہ: قولہ تعالیٰ: وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَّذْرٍ ....

اس آیتِ کریمہ سے وجہ استدلال یہ ہے کہ ہمارا خرچ کیا ہوا ہر نفقہ، اور مانی ہوئی ہر نذر اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے جس کی وہ جزاء عطا فرمائے گا، اور جزاء اس عمل پر مرتب ہوتی ہے جو عبادت ہو، لہذا نذر ماننا ایک عبادت ہے جیسا کہ صدقہ ایک عبادت ہے، چنانچہ جس طرح غیر اللہ کے نام صدقہ دینا شرک ہوگا اسی طرح غیر اللہ کے نام مانی ہوئی نذر بھی شرک ہوگی۔

① (الدھر: ۷) ② (البقرۃ: ۲۷۰)

حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہاں اللہ تعالیٰ یہ خبر دے رہا ہے کہ وہ بندوں کی دی ہوئی تمام خیرات کو اور مانی ہوئی ہر نذر کو جانتا ہے، لہذا وہ اس کی ان لوگوں کو خوب جزاء عطا فرمائے گا جو اس کی رضا جوئی کے لئے خرچ کریں گے یا نذر مانیں گے۔ جب آپ نے یہ بات جان لی کہ نذر بھی ایک عبادت ہے تو پھر قبر پرستوں کی قبر والوں کے نام...... جن کے بارے میں وہ نفع وضرر کا اعتقاد رکھتے ہیں...... نذر ماننا شرک فی العبادت ہوگا۔''

حافظ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''غیر اللہ مثلاً: بت، سورج، چاند اور قبر وغیرہ کے لئے نذر ماننا ایسے ہی ہے جیسے کسی غیر اللہ کی قسم کھانا، جو شخص کسی مخلوق کی قسم کھاتا ہے اسے وہ قسم پوری کرنا جائز نہیں، اور نہ ہی اس قسم کا کوئی کفارہ ہے، اسی طرح مخلوق کے لئے نذر ماننے کا مسئلہ ہے، جس نے غیر اللہ کے لئے نذر مانی اسے اس کا پورا کرنا جائز نہیں، اور نہ ہی اس کا کوئی کفارہ ہے؛ کیونکہ غیر اللہ کی قسم اور نذر دونوں شرک ہیں اور شرک کی کوئی عزت وحرمت نہیں، بلکہ مرتکبِ شرک کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے عمل سے توبہ کرے۔

نذرِ معصیت کی کچھ صورتیں

شیخ الاسلام مزید فرماتے ہیں...: ''جو شخص قبروں کے لئے نذر مانتا ہے، مثلاً: قبروں پر دیئے جلانے یا قبروں پر رکھے گئے چراغوں میں تیل ڈالنے کی نذر مانتا ہے، تو یہ سب نذرِ معصیت اور گمراہ لوگوں کا کردار ہے، جسے پورا کرنا ہرگز جائز نہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص قبروں پر بیٹھے ہوئے مجاوروں کو نقدی یا نذرانہ پیش کرنے کی نذر مانتا ہے تو یہ نذرِ معصیت ہوگی کیونکہ قبروں پر بیٹھے ہوئے مجاوروں میں لات ومنات وعزیٰ پر بیٹھے ہوئے مجاوروں سے تشبہ پایا جاتا ہے، یہ مجاور ناحق لوگوں کا مال کھاتے ہیں اور ان کو اللہ کے دین سے روکتے ہیں، یعنی دین ودنیا دونوں کے ڈاکو ہیں (انتھیٰ ملخصاً)

شیخ قاسم حنفی ''دررالبحار'' کی شرح میں فرماتے ہیں: ''وہ نذر جو آج کل اکثر عوام الناس مانتے ہیں جس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی شخص کا کوئی رشتہ دار غائب ہوجائے یا بیمار ہوجائے یا اسے کوئی دوسری حاجت درپیش ہو، تو وہ کسی نیک شخص کے پاس جاکر کہتا ہے: اے میرے آقا! اگر میرا گمشدہ عزیز مل جائے یا میرے مریض کو شفاء حاصل ہوجائے یا میری حاجت پوری کردی جائے، تو میں اتنے سونے یا چاندی یا راشن یا پانی یا تیل وغیرہ کا نذرانہ پیش کرونگا۔ یہ نذر باجماعِ امت، کئی وجوہ سے باطل ہے، پہلی وجہ یہ کہ یہ نذر مخلوق کیلئے ہے اور مخلوق کے لئے نذر جائز نہیں؛ کیونکہ نذر ایک عبادت ہے اور مخلوق کی عبادت جائز نہیں ہے۔

=

وفی الصحیح عن عائشة رضی الله عنها أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ:" مَنْ نَذَرَ اَنْ يُّطِيْعَ اللّٰهَ فَلْيُطِعْهُ ، وَمَنْ نَذَرَ اَنْ يَّعْصِيَ اللّٰهَ فَلَا يَعْصِهٖ" ①

اور صحیح بخاری میں ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے کی نذر مانے، وہ ضرور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے، (یعنی اس نذر کو پورا کرے) اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے کی نذر مانے، وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرے۔ (یعنی اس نذر کو پورا نہ کرے)''

دوسری وجہ یہ ہے کہ جس کیلئے نذر مانی گئی وہ میت ہے اور میت کے پاس کسی چیز کی ملکیت یا اختیار نہیں ہے۔
تیسری وجہ یہ ہے کہ اس کا یہ عقیدہ ہے کہ میت امور میں تصرف کرنے پر قادر ہے، اور یہ عقیدہ کفر ہے۔''
شیخ قاسم حنفی مزید فرماتے ہیں: ''...جب آپ کو یہ بات معلوم ہوگئی تو پھر اچھی طرح سمجھ لو کہ اولیاء کی قبروں پر رکھے گئے درھم ودینار اور شمع وتیل وغیرہ سب حرام ہیں، اور ان کے حرام ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔''

وقوله:وفی الصحیح عن عائشة رضی الله عنها أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: ......

یہ حدیث ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی اور نبی ﷺ کی بیوی تھیں، نبی ﷺ نے ان سے سات سال کی عمر میں نکاح کیا، اور جب ان کی عمر نو سال ہوئی تو ان کی رخصتی عمل میں آئی۔ آپ کو اس اُمت کی تمام عورتوں میں علی الاطلاق سب سے زیادہ اعلم اور افقہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آپ نبی ﷺ کی بیویوں میں (خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا کے بعد) سب سے افضل ہیں، ۵۷ھ میں انتقال ہوا۔
اس حدیث کی دلالت بالکل واضح ہے، یعنی نذرِ اطاعت کو پورا کرنا واجب ہے، جبکہ نذرِ معصیت کو چھوڑ دینا ضروری ہے، ان دونوں مسئلوں پر اُمت کا اجماع بھی ثابت ہے۔



① صحیح بخاری، کتاب الأیمان والنذور(۶۷۰۰)سنن ابی داؤد(۳۲۷۹)

اس باب کے مسائل

(۱) نذرِ اطاعت کا پورا کرنا واجب ہے۔

(۲) جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ نذر ماننا ایک عبادت ہے، تو پھر غیر اللہ کے نام کی نذر ماننا شرک ہوا۔ (کیونکہ غیر اللہ کی عبادت شرک ہے)

(۳) اگر کسی شخص نے ایسی نذر مان لی جو معصیت پر مبنی ہوتی ہے، تو اسے پورا کرنا جائز نہیں ہے۔



باب من الشرك الاستعاذة بغير الله

غیر اللہ سے استعاذہ شرک ہے

حقیقتِ استعاذہ

''استعاذہ'' سے مراد پناہ طلب کرنا یا بچاؤ حاصل کرنا ہے۔ حقیقتِ استعاذہ یہ ہے کہ جس چیز کا خوف آپ پر مسلط ہے، اس سے بچ اور بھاگ کر آپ کسی کے دامنِ پناہ کی طرف لاچار ہوں، اور وہ آپ کو بچانے اور پناہ دینے پر قدرت بھی رکھتا ہو، اسی لئے عربی لغت میں ''مستعاذ بہ'' یعنی جس سے پناہ طلب کی جاتی ہے، کومعاذ وملجاً کہتے ہیں، جس میں جائے پناہ وجائے قرار کا معنی پناہ ہے۔

اللہ رب العزت کی پناہ چاہنے کا معنی یہ ہے کہ دنیا وآخرت کی ہر موذی ومہلک چیز سے بچاؤ حاصل کرنے کیلئے ہر پناہ گاہ سے کٹ کر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے ڈال دے، اسی ذاتِ وحدہ لاشریک لہ کا سہارا تھام لے اور پوری طرح اس کی سپردگی میں آجائے۔ یہ جملے محض مثال دینے اور سمجھانے کیلئے عرضِ خدمت کئے گئے ہیں، ورنہ بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف التجاء اور اعتصام کی جو صورت ہے، اور اس کی طرف افتقار وتذلل کی جو کیفیت ہے اسے احاطۂ عبارت میں لانا ناممکن ہے۔'' (یہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کے کلام کا مفہوم ہے)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''استعاذہ درحقیقت ہر شر والے کے شر سے بچاؤ حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف التجاء کرنے اور اس کی جناب کے ساتھ چمٹ جانے کا نام ہے۔ لفظ ''العیاذ'' میں رفعِ شر اور لفظ ''اللیاذ'' میں طلبِ خیر کا معنی پایا جاتا ہے۔''

واضح ہو کہ بہت سے علماء نے استعاذہ کا یہی معنی بیان کیا ہے جس سے یہ امر واضح ہوا کہ استعاذہ ایک عبادت ہے، جس پر صرف اللہ تعالیٰ کا ہی حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بہت سے مقامات پر اپنی ذات کے ساتھ استعاذہ کرنے کا حکم دیا ہے، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَالسَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ ①

''سو تو اللہ کی پناہ مانگتا رہ، بے شک وہ پورا سننے والا، اور سب سے زیادہ دیکھنے والا ہے''

مزید فرمایا: ﴿ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَاَعُوْذُبِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴾ ②

① (غافر: ٥٦) ② (المؤمنون: ٩٧، ٩٨)

وقوله تعالیٰ: ﴿ وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا ﴾ ①

''بات یہ ہے کہ چند انسان بعض جنات سے پناہ طلب کیا کرتے تھے جس سے جنات اپنی سرکشی میں اور بڑھ گئے''

''اور دعا کریں کہ اے میرے پروردگار! میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں، اور اے رب! میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے پاس آ جائیں''

اور فرمایا: ﴿ قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴾ ②

''آپ ﷺ کہہ دیجئے! میں صبح کے رب کی پناہ میں آتا ہوں''

اور فرمایا: ﴿ قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ . مَلِكِ النَّاسِ . إِلَٰهِ النَّاسِ ﴾ ③

''آپ ﷺ کہہ دیجئے! کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ میں آتا ہوں، لوگوں کے مالک کی اور ان کے معبود کی (پناہ میں)''

جب ہم نے صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا رب، بادشاہ اور معبود مان لیا ہے (اس کی سوا کسی کو نہیں) تو پھر مصائب و شدائد میں اس کے سوا ہمارا کوئی ملجأ و ماویٰ اور معاذ نہیں ہے، لہٰذا ہم اسی ذات کے ساتھ پوری طرح جڑے رہیں، اور اسی کو ہر قسم کی عبادات کا مستحق قرار دیں، تو وہ یقیناً ہمیں پناہ مہیا فرمائے گا۔

(ملخص من كلام ابن تيميه رحمه الله)

شارح رحمه الله فرماتے ہیں: جب بندہ (سورۃ الناس میں بیان شدہ) اللہ تعالیٰ کی تینوں صفات: ''رب، ملک اور الٰہ'' کا کما حقہ ادراک حاصل کر لے، اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے امر، بابت استعاذہ کو قبول کرتے ہوئے اسی کی پناہ طلب کرتا رہے تو بلا شبہ اس نے ایک عظیم الشان عبادت کا حق ادا کر دیا۔

استعاذہ نہ صرف یہ کہ ایک بڑی برگزیدہ عبادت ہے بلکہ توحید الوہیت کے عظیم تر حقائق میں شمار ہوتی ہے۔ جو بندہ غیر اللہ سے استعاذہ کرے گا وہ اس کی عبادت کر رہا ہے، جیسے کوئی شخص غیر اللہ کیلئے نماز پڑھے تو وہ اسی کی عبادت کر رہا ہے، اس معاملہ میں استعاذہ اور نماز میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ مخلوق سے وہ چیز طلب کرنا جائز ہے جس کے دینے پر وہ قادر ہو، اور جس چیز کے دینے پر اسے قدرت حاصل نہیں ہے، وہ اس سے طلب نہیں کی جا سکتی، مثال کے طور پر دعا، جو کہ صرف اللہ تعالیٰ سے کی جا سکتی ہے، اور ظاہر ہے استعاذہ، دعا ہی کی ایک قسم ہے۔

استعاذہ بغیر اللہ کے شرک ہونے پر قرآن سے استدلال

وقوله: وقوله تعالیٰ: وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ.... =

① (الجن: ٦) ② (الفلق: ١) ③ (الناس: ١ تا ٣)

قال :وعن خولة بنت حکیم قالت :سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ :"مَنْ نَزَلَ مَنْزِلًا فَقَالَ: اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ، لَمْ یَضُرَّہٗ شَیْئٌ حَتّٰی یَرْتَحِلَ مِنْ مَنْزِلِہٖ ذٰلِکَ " ①

خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا سے مروی ہے ،فرماتی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:''جو شخص کسی جگہ جائے ،اور یہ الفاظ کہہ لے: اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ. . . . . .

یعنی ''میں اللہ تعالیٰ کے مکمل کلمات کی پناہ چاہتا ہوں ، ہر مخلوق کے شر سے ۔''

تو اسے اس جگہ سے واپس کوچ کرنے تک کوئی چیز نقصان نہیں دے گی ۔''

دورِ جاہلیت میں لوگ اس عقیدۂ بد میں مبتلا تھے کہ جب کوئی شخص دورانِ سفر کسی خوفناک وادی یا جنگل سے گزرتا تو وہاں داخل ہوتے ہوئے بلند الفاظ سے یہ الفاظ کہتا:"اَعُوْذُ بِسَیِّدِ ھٰذَا الْوَادِیْ مِنْ سُفَھَاءِ قَوْمِہٖ" یعنی ''میں اس وادی کے سردار جن کی پناہ میں آتا ہوں ، یہاں کے کسی بھی بیوقوف جن کی شرارت سے'' ② جن ، جب انسانوں کا یہ استعاذہ سنتے تو ان کی طغیانی ، سرکشی اور غرور میں مزید اضافہ ہوجاتا۔

اس آیتِ کریمہ سے مؤلف رحمہ اللہ کا استدلال یہ ہے کہ غیر اللہ سے استعاذہ شرک ہے ، کیونکہ جنوں نے اسلام قبول کرلینے کے بعد اپنی جاہلیت کے دور کے شرک کے وہ امور بیان کئے جن میں وہ مبتلا تھے ، اور ان امور میں استعاذہ کا بھی ذکر کیا۔علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ غیر اللہ سے استعاذہ جائز نہیں ہے ، یہی وجہ ہے کہ ان سے ایسے دموں کی ممانعت وارد ہے جسکا معنی معلوم نہ ہو ، کیونکہ ممکن ہے ان میں استعاذہ بغیر اللہ قسم کی کوئی چیز ہو۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں:''جنوں سے استعاذہ جائز نہیں ہے ؛ کیونکہ یہ وہ عمل کفر ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان:﴿ وَاَنَّہٗ کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ.....﴾ میں کفار کی مذمت فرمائی ہے۔''

حدیثِ خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا کی شرح

وقولہ:قال :وعن خولة بنت حکیم قالت :سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ :......

اس حدیث کی راوی خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا ہیں ، ان کی کنیت اِم شریک تھی ، کچھ علماء کا خیال ہے کہ یہی وہ خاتون

① صحیح مسلم ،کتاب الذکر والدعاء (۲۷۰۸) ② رواہ عبد بن حمید ، وابن المنذر.

تھیں جنہوں نے نبی ﷺ کو اپنا نفس ھبہ کیا تھا، ھبہ کرنے سے قبل یہ سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے عقد میں تھیں۔

حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بڑی صالحہ اور فاضلہ خاتون تھیں۔

یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کی ایک انتہائی مبارک اور اہم دعا پر مشتمل ہے، " اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ . . . . " اس دعاء میں ایک اہم عبادت یعنی استعاذہ کا ذکر ہے، اس دعاء میں یہ تعلیم موجود ہے کہ استعاذہ جنوں یا کسی دیگر مخلوق کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے اسماء وصفات کا ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ "المفھم" میں فرماتے ہیں: " الکلمات التامات " سے مراد وہ کلمات ہیں جو اتنے کامل ہیں کہ انہیں کوئی عیب یا نقص لاحق نہیں ہو سکتا۔

بعض علماء نے اس سے مراد ایسے کلمات لئے ہیں جو کافی وشافی ہیں۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ یہاں کلمات سے مراد قرآن حکیم ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو ہدایت اور شفاء قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات اور اسماء وصفات سے استعاذہ کرنے کیلئے لازم ہے کہ وہ اپنی التجاء، استعاذہ اور توکل میں دل سے سچا ہو...... اگر استعاذہ میں کما حقہ صدق کا پہلو موجود ہے تو اسے اس کا مقصود ضرور حاصل ہوگا، اس کے علاوہ عقیدۂ توحید کے اس عظیم الشان مظاہرے پر گناہوں کی بخشش بھی۔

علماء کرام نے خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے اجماعاً یہ عقیدہ بیان کیا ہے کہ غیر اللہ سے استعاذہ جائز نہیں ہے...... علماء نے یہاں یہ بھی استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمات غیر مخلوق ہیں؛ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کے کلمات مخلوق ہوتے تو نبی ﷺ ان سے استعاذہ کی تعلیم نہ دیتے؛ کیونکہ استعاذہ بالمخلوق تو شرک ہے۔ لہذا یہاں جہمیہ اور معتزلہ کے عقیدہ باطلہ کہ "قرآن حکیم مخلوق ہے" پر ظاہر اور واضح رد موجود ہے، یہی بات شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بیان فرمائی۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "جو شخص شیطان کے نام پر جانور ذبح کرے، یا اس سے دعا مانگے، یا استعاذہ کرے، یا اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے اس کے پسندیدہ کام کرے، تو اس نے شیطان کی عبادت کی، خواہ وہ اسے عبادت کا نام نہ بھی دیتا ہو...... بلکہ یہ سمجھتا ہو کہ اس طرح شیطان میرے مسخر ہو کر میرا خادم بن جائے گا...... حقیقتِ امر یہ ہے کہ وہ شیطان کا خادم اور عابد بن کر بظاہر اس سے کچھ خدمتیں کروا لیتا ہے لیکن دراصل شیطان اس کا خادم نہیں بن سکتا؛ کیونکہ نہ وہ انسان کے سامنے جھک سکتا ہے اور نہ ہی اس کی

عبادت اور تعظیم کر سکتا ہے۔ (وہ تو اس تمام صورتِ حال میں انسان کو گمراہ کرنے کے پروگرام پر عمل پیرا ہوتا ہے جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہو جاتا ہے)

خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث میں جو دعا ذکر ہوئی وہ بڑی جامع ہے، کیونکہ اس میں ہر مخلوق کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی جا رہی ہے، ہر مخلوق میں انسان، جن، حیوان، درندے اور آفات سماوی مثلاً: آندھی، بجلی اور کڑک وغیرہ سب شامل ہیں، پھر ہر قسم کا شر مراد ہے، پھر دنیا و آخرت دونوں جہانوں کا شر مراد ہے...... ﴿مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ﴾ کا معنی یہ ہے کہ ہر وہ مخلوق جس میں شر ہو اسکے شر سے پناہ چاہتا ہوں، جس سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ کچھ مخلوقات یقیناً ایسی ہیں جس میں کوئی شر نہیں مثلاً: جنت، انبیاء کرام علیہم السلام اور ملائکہ۔

اس مختصر مگر جامع دعا کی فضیلت ملاحظہ کیجئے کہ جو شخص کسی بھی جگہ یہ دعا پڑھ لے جب تک وہاں قیام پذیر ہے تب تک اسے کوئی چیز نقصان نہیں دے گی۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ خبر بالکل سچی، صحیح اور مجرب ہے، جب سے میں نے یہ حدیث سنی اس پر عمل کر رہا ہوں اور ہر نقصان اور شر سے محفوظ رہتا ہوں، ایک رات ''مہدیہ'' مقام پر ٹھہرا مجھے ایک بچھو نے ڈس لیا، غور کیا تو مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ آج میں یہ دعا پڑھنی بھول گیا تھا۔''



اس باب کے مسائل

(۱) سورۃ الجن کی آیت کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) یہ واضح ہوا کہ غیر اللہ سے استعاذہ شرک ہے۔

(۳) استعاذہ بغیر اللہ کے شرک ہونے پر حدیث خولہ سے استدلال، وجہ استدلال یہ ہے کہ علماء کرام اس حدیث سے اللہ تعالیٰ کے کلمات کے غیر مخلوق ہونے کا استدلال کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ مخلوق سے استعاذہ شرک ہے۔ (لہذا اس حدیث سے استعاذہ بغیر اللہ کا شرک ہونا واضح ہوا)

(۴) یہ دعا "اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ. . . ." باوجودیکہ بہت مختصر ہے مگر کتنی بڑی فضیلت وعظمت کی حامل ہے۔

(۵) اگر کوئی شیئ کسی دنیوی منفعت کا باعث بن رہی ہو، اس سے کسی شر کا ازالہ یا منفعت کا حصول عمل میں آرہا ہو، تو وہ منفعت اس بات کی ہرگز دلیل نہیں کہ وہ عمل شرک نہیں (صاحبِ کتاب کا اشارہ اس طرف ہے کہ کچھ لوگ جنوں کی عبادت کر کے اپنا مسخر کر لیتے ہیں اور ان سے کچھ کام کروا لیتے ہیں، ان کاموں سے حاصل ہونے والی منفعتوں کے حصول کو وہ اس بات کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ یہ عمل (جنوں کی عبادت وغیرہ) جائز ہے تب ہی تو فوائد حاصل ہوتے ہیں)۔ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس دنیوی فائدے سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ وہ عمل جائز ہے کیونکہ کتاب وسنت کے دلائل سے اس عمل کا شرک ہونا ثابت ہے۔ لہذا وہ شرک ہے اور ناجائز اور حرام ہے۔ (فافهم وتدبر)



باب من الشرك ان يستغيث بغير الله او يدعو غيره
غیر اللہ سے فریاد رسی یا دعا کرنا شرک ہے

استغاثہ اور دعا کا معنی

شیخ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: استغاثہ (غوث سے مأخوذ ہے) جس کا معنی مدد طلب کرنا ہے، جو درحقیقت مشکلات کے حل کے لئے فریاد کناں ہونے کا نام ہے۔ جیسے استنصار کا معنی (نصرت) یعنی مدد طلب کرنا، اور استعانہ کا معنی (عون) یعنی مدد طلب کرنا ہے۔

علماءِ اسلام فرماتے ہیں: ''استغاثہ اس مدد کو کہتے ہے جو کسی پریشانی کے دفع وازالہ کیلئے طلب کی جائے۔ جب کہ دعا عمومی طور پر پکارنے کا نام ہے، خواہ دفعِ شر کیلئے کی جائے یا حصولِ خیر کیلئے، اس لئے دعا کا استغاثہ پر عطف من باب عطف العام علی الخاص ہے۔ یہاں (دعا) سے مراد دعاءِ مسئلہ ہے، یعنی کسی ایسی حاجت پر پکارنا اور سوال کرنا جس کے حل پر صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے۔ ایسی حاجت میں غیر اللہ کو پکارنا نہ صرف یہ کہ شرک ہے بلکہ پرلے درجے کی حماقت اور نادانی ہے؛ کیونکہ غیر اللہ تو اس حاجت کو پورا کرنے پر قدرت ہی نہیں رکھتے، پھر ان کو پکارنا چہ معنی دارد؟''۔

دعا کی اقسام اور ان کی وضاحت

واضح ہو کہ بہت سے علماءِ کرام مثلاً: شیخ الاسلام ابن تیمیہ، حافظ ابن القیم رحمہما اللہ اور دیگر کی تحریروں سے عیاں ہوتا ہے کہ دعا کی دو قسمیں ہیں، ایک دعاءِ عبادت، اور دوسری دعاءِ مسئلہ۔ قرآن حکیم میں جہاں بھی لفظِ دعا وارد ہوا ہے اس سے مراد کبھی تو دعاءِ عبادت ہوتا ہے، کبھی دعاءِ مسئلہ اور کبھی دونوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دعاءِ عبادت اور دعاءِ مسئلہ آپس میں لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دعاءِ مسئلہ سے مراد یہ ہے کہ دعا کرنے والا اپنی حاجات وضروریات کا سوال کرے، اپنے معبود سے اپنے لئے حصولِ نفع اور دفعِ ضرر کا مطالبہ کرے۔ جس کا معنی یہ ہوا کہ معبود صرف وہ بن سکتا ہے جو ہر قسم کے نفع ونقصان کا مالک ہو، تاکہ اپنے سائل وعابد کے سوال پر اسے نفع عطا فرما سکے اور اس کے ضرر کو دفع کر سکے۔ اور اس تمام پر صرف اللہ رب العزت ہی قادر ہے، دوسرا کوئی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اپنے سوا پکارے جانے والے تمام معبودوں کے معبود ہونے کا یہ کہہ کر انکار فرمایا کہ وہ تو کسی نفع ونقصان کے

مالک نہیں: ﴿ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ ①

''آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہارے کسی نقصان کے مالک ہیں نہ کسی نفع کے، اللہ ہی خوب سننے اور پوری طرح جاننے والا ہے''

ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاءُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ ②

''اور یہ لوگ اللہ (واحد) کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ تو ان کو ضرر پہنچا سکیں اور نہ ان کو نفع پہنچا سکیں، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔''

یہ حجت قرآن حکیم میں بہت سے مقامات پر مذکور ہے جو یہ صراحت کرتی ہے کہ معبود کا ہر قسم کے نفع ونقصان کا مالک ہونا ضروری ہے۔

دعاءِ عبادت سے مراد ایسی دعا ہے جو محض معبود کے عذاب کے خوف، اور اسکی رحمت کی امید سے کی جائے۔ اب معبود کو طلب نفع یا دفع ضرر کیلئے پکارنا دعاءِ مسئلہ اور خوفاً یا طمعاً پکارنا دعاءِ عبادت ہے۔

واضح ہو کہ دونوں قسمیں آپس میں لازم ملزوم ہیں، چنانچہ ہر دعاءِ عبادت، دعاءِ مسئلہ کو مستلزم ہے اور دعاءِ مسئلہ، دعاءِ عبادت کو ضمن میں لئے ہوتی ہے۔

اس تحقیق سے ان قبر پرستوں کے بہت بڑے شبہ کا رد ہوتا ہے جو اہل قبور سے دعائیں کرتے ہیں، جب ان سے کہا جائے کہ قرآنِ حکیم تو خالص اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اخلاصِ دعا کا حکم دیا ہے وہاں سے مراد دعاءِ عبادت ہے، جو واقعی اللہ تعالیٰ کا حق ہے، لیکن دعاءِ مسئلہ کے لئے دوسروں کا در کھٹکھٹایا جا سکتا ہے؛ چنانچہ وہ آیتِ قرآنی: ﴿ وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ میں " فَلَا تَدْعُوْا" کی تفسیر " فَلَا تَعْبُدُوْا" سے کرتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ لہذا نفی عبادت کی ہے نہ کہ پکارنے کی؟

اول جواب تو یہ ہے کہ قرآن نے دوسروں کے کسی بھی قسم کے نفع ونقصان کے مالک ہونے کی نفی کی ہے پھر انہیں پکارنے کا فائدہ؟

اور دوسری بات یہ کہ اگر دعاءِ عبادت مراد لے بھی لیں تو دعاءِ مسئلہ اس کے اندر لازماً داخل ہوگی؛ کیونکہ ہر دعاءِ عبادت دعاءِ مسئلہ کو مستلزم ہوتی ہے جیسا کہ ہر دعاءِ مسئلہ، ہر دعاءِ عبادت کو متضمن ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

① (المائدة: ٧٦) ② (یونس: ١٨)

تیسری بات یہ کہ اگر چہ وہ آیات جو دعاءِ عبادت پر مشتمل ہیں وہ دعاءِ مسئلہ کو بھی مستلزم ہیں، لہذا دعاءِ مسئلہ میں شرک کے رد کے لئے کافی ہیں۔مگر قرآنِ حکیم میں ایسی بیسیوں آیات موجود ہیں جو صرف دعاءِ مسئلہ کے تعلق سے مشرکین کے شرک کا رد کر رہی ہیں۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

﴿ لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِيْنَ إِلَّا فِيْ ضَلَالٍ ﴾ ①

''اسی کو پکارنا حق ہے۔ جو لوگ اوروں کو اس کے سوا پکارتے ہیں وہ ان (کی پکار) کا کچھ بھی جواب نہیں دیتے، مگر جیسے کوئی شخص اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوئے ہو کہ اس کے منہ میں پڑ جائے حالانکہ وہ پانی اس کے منہ میں پہنچنے والا نہیں، ان منکروں کی جتنی پکار ہے سب گمراہی میں ہے''

﴿ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ . ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ إِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴾ ②

''اب بھی جب تمہیں کوئی مصیبت پیش آ جائے تو اسی کی طرف نالہ وفریاد کرتے ہو۔ اور جہاں اس نے وہ مصیبت تم سے دفع کر دی تم میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگ جاتے ہیں''

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُوْنِهِ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴾ ③

''کہہ دیجئے کہ اللہ کے سوا جنہیں تم معبود سمجھ رہے ہو انہیں پکارو لیکن نہ تو وہ تم سے کسی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں، اور نہ بدل سکتے ہیں''

﴿ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ إِلَّا إِيَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴾ ④

''اور سمندروں میں مصیبت پہنچتے ہی جنہیں تم پکارتے ہو سب گم ہو جاتے ہیں صرف اللہ باقی رہ جاتا ہے۔ پھر جب وہ تمہیں خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو تم منہ پھیر لیتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے''

﴿ فَإِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴾ ⑤

''پس یہ لوگ جب کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں اس کے لئے عبادت کو خالص کر کے پھر جب وہ انہیں خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو اسی وقت شرک کرنے لگتے ہیں''

① (الرعد: ١٤) ② (النحل: ٥٣، ٥٤)
③ (الاسراء: ٥٦) ④ (الاسراء: ٦٧)
⑤ (العنکبوت: ٦٥)

﴿ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ﴾ ①

''اور انسان کو جب کبھی کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ خوب رجوع ہو کر اپنے رب کو پکارتا ہے، پھر جب اللہ تعالیٰ اسے اپنے پاس سے نعمت عطا فرما دیتا ہے تو وہ اس سے پہلے جو دعا کرتا تھا اسے (بالکل) بھول جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے شریک مقرر کرنے لگتا ہے، جس سے (اوروں کو بھی) اس کی راہ سے بہکائے، آپ کہہ دیجئے! کہ اپنے کفر کا فائدہ کچھ دن اور اٹھا لو، (آخر) تو دوزخیوں میں ہونے والا ہے۔''

علاوہ ازیں ایسی بے شمار احادیث مروی ہیں جن میں دعاءِ مسئلہ کو توحید کے ساتھ مقرون کیا گیا ہے، جو اس بات کی موجب و متقاضی ہیں کہ ہر قسم کی حاجت اللہ تعالیٰ ہی سے طلب کی جائے۔

صحیح مسلم میں ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک حدیث قدسی مروی ہے، رسول اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"يَا عِبَادِيْ كُلُّكُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ هَدَيْتُهٗ فَاسْتَهْدُوْنِيْ أَهْدِكُمْ. يَا عِبَادِيْ كُلُّكُمْ جَائِعٌ اِلَّا مَنْ أَطْعَمْتُهٗ فَاسْتَطْعِمُوْنِيْ أُطْعِمْكُمْ. يَا عِبَادِيْ كُلُّكُمْ عَارٍ اِلَّا مَنْ كَسَوْتُهٗ فَاسْتَكْسُوْنِيْ أَكْسُكُمْ. يَا عِبَادِيْ اِنَّكُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَاَنَا أَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا فَاسْتَغْفِرُوْنِيْ أَغْفِرْ لَكُمْ . ." ②

''اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو، الا وہ جسے میں ہدایت دوں، پس مجھ سے ہدایت طلب کرو، میں ہی تمہیں ہدایت دونگا۔ اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو، سوائے اس کے جسے میں کھانا کھلاؤں، لہذا مجھ سے کھانا طلب کرو میں تم سب کو کھانا کھلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم سب ننگے ہو، سوائے اس کے جسے میں کپڑا پہناؤں، لہذا تم مجھ سے کپڑے مانگو، میں تمہیں کپڑے پہناؤں گا۔ اے میرے بندو! تم رات دن گناہ کرتے ہو اور تمہارے گناہوں کو میں ہی معاف کرسکتا ہوں، لہذا تم مجھ سے بخشش طلب کرو میں تمہارے گناہوں کو بخش دوں گا... ''

صحیح بخاری میں سیدنا ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارا پروردگار ہر رات، جبکہ آخری تیسرا حصہ باقی رہ جاتا ہے آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے، اور کہتا ہے: مجھ سے کوئی دعائیں کرے گا کہ میں قبول کروں؟ مجھ سے کوئی سوال کرے گا کہ میں عطا فرماؤں؟ مجھ سے کوئی استغفار کرے گا کہ میں اسے بخش دوں؟'' ③

① (الزمر : ٨) ② یہ حدیث کا جزء ہے۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ (٢٥٧٧)

③ صحیح بخاری، کتاب التہجد (١١٤٥، ٦٣٢١، ٧٤٩٤) صحیح مسلم، صلاۃ المسافرین (٧٥٨)

مسند احمد اور جامع ترمذی وغیرہ میں سیدنا ابوھریرہ ﷛ کے طریق سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان مروی ہے: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے زیادہ محترم اور کوئی چیز نہیں ہے'' ①

مسند ابو یعلیٰ کی ایک حدیث میں دعاء کو مومن کا ہتھیار کہا گیا ہے۔ ②

جبکہ مسند احمد اور ترمذی کی ایک حدیث جو کہ نعمان بن بشیر ﷛ سے مروی ہے، میں رسول اللہ نے فرمایا ہے: ''دعاء ہی اصل عبادت ہے'' ③

مسند ابو یعلیٰ میں باسنادِ صحیح عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً مروی ہے: ''ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگو، اگر جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ اس کا حصول آسان نہیں بنائے گا تو وہ بھی تمہیں نہیں مل سکتا''

امیر المؤمنین عمر بن الخطاب ﷛ فرمایا کرتے تھے: ''میرا کام دعا کرنا ہے، نہ کہ اس کی قبولیت کے بارہ میں سوچنا؛ کیونکہ میرا اس بات پہ یقین ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے دعا کی توفیق عنایت فرمادی تو قبولیت بھی ساتھ ہی ہوتی ہے''

عبداللہ بن عباس ﷛، اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ..... ﴾ ④ سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے: ''سب سے بہترین عبادت دعا ہے'' ⑤

مطرف بن الشخیر (علماءِ تابعین میں سے ہیں) فرمایا کرتے تھے: ''میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ تمام بھلائیوں کا سرچشمہ کیا ہوسکتا ہے، میرے سامنے بہت سی بھلائیاں مثلاً: نماز، روزہ وغیرہ آئیں، پھر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ تمام بھلائیوں کا منبع وہ چیز ہوسکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اور جو چیز اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اس تک رسائی کی ہم میں کوئی قدرت وطاقت نہیں ہے، سوائے اسکے کہ ہم اس سے مانگیں اور وہ عطا فرمادے'' (نتیجہ یہ کہ اللہ تعالیٰ سے دعاء اور سوال کرنا ہی مجمع الخیرات ہے)

قارئین کرام! قرآن وحدیث کی نصوص اور آثارِ سلف سے یہ بات ثابت ہوئی کہ ''دعا'' تمام عبادات

---

① مسند احمد (٨٧٥٦ ج٣، مسند ابی هریرة) الادب المفرد (٧١٢) سنن ترمذی ٣٣٧٠) فیض القدیر (٣٦٦/٥) ۔ البانی رحمہ اللہ نے اسے ''حسن'' کہا ہے۔

② مسند ابو یعلیٰ، امام هیثمی المجمع (١٤٧/١٠) میں فرماتے ہیں: اس کی سند میں محمد بن ابی حمید ضعیف ہے۔

③ اس کی سند جید ہے۔ مسند احمد (١٨٤١٩، ١٨٤٥٩، ١٨٤٦٣ ج٦) الادب المفرد (٧١٤) اس میں یہ الفاظ زائد ہیں'' ثم قرأ: ﴿ ادعونی استجب لکم ..... ﴾ حافظ ابن حجر نے اس کی سند کی جید کہا ہے، فتح الباری (٤٩١)

④ (غافر: ٦٠)

⑤ یہ اثر دیگر طرق کی بناء پر حسن درجہ کا ہے۔ مستدرك الحاكم (٤٩١/١) امام حاکم نے صحیح کہا ہے، اور امام ذھبی نے اسکی موافقت کی ہے۔

میں سب سے اہم اور اَجل عبادت ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محترم عبادت ہے....دعا میں اگر غیر اللہ کی شراکت شرک نہیں ہے تو اس زمین پر شرک کا کہیں کوئی وجود نہیں، اور اگر زمین پر شرک کا وجود تسلیم کرتے ہو تو دیگر عبادات کی بہ نسبت دعا میں شرک کا امکان اور وجود زیادہ ہوگا؛ کیونکہ جن مشرکین کی طرف رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا گیا ان میں پایا جانے والا سب سے بڑا شرک دعا کے تعلق سے ہی تھا۔ چنانچہ وہ ملائکہ اور انبیاء وصالحین کو پکارا کرتے، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی شفاعت حاصل کرنے کے لئے ان کے قرب کے متلاشی رہتے، یہی وجہ ہے کہ جب ان کی زندگی میں کبھی کوئی انتہائی کٹھن اور مشکل گھڑی آجاتی تو اپنے معبودوں کو بھول کر خالص اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگنا شروع کردیتے، بلکہ روایات میں یہاں تک وارد ہوا ہے کہ وہ سمندر میں سفر کے دوران جب کبھی طوفانی موجوں میں گھر جاتے تو اپنے بتوں کو پانی میں پھینک کر یا اللہ یا اللہ کا ورد شروع کردیتے؛ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان کے معبود انکی مشکل کے حل کی اور مضطر ولاچار کی تکمیلِ حاجت کی قدرت نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ ①

''بے کس کی پکار کو جب کہ وہ پکارے، کون قبول کرکے سختی کو دور کردیتا ہے؟ اور تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے، کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور معبود ہے؟ تم بہت کم نصیحت وعبرت حاصل کرتے ہو۔''

بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ان کے سمندر والے مذکورہ عمل کو ان پر حجت قائم کرکے اپنے الٰہِ حق ہونے، اور باقی تمام کا معبودِ باطل ہونا ثابت فرمایا ہے، ارشاد فرمایا:

﴿ فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ ﴾ ②

''پس جب یہ لوگ کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں، اس کیلئے عبادت کو خالص کرکے پھر جب وہ انہیں خشکی کی طرف بچالاتا ہے تو اسی وقت شرک کرنے لگتے ہیں۔''

مشرکینِ عرب اور آج کے مسلمانوں میں تقابل

اب ذرا سا توقف کرکے دورِ جاہلیت کے مشرکین اور آج کل کے مسلمانوں کے عقیدہ کے مابین تقابل کیجئے، اور فرق ملاحظہ کیجئے۔ مشرکینِ مکہ سمندر میں سوار ہوتے تو خالص اللہ تعالیٰ کو پکارتے، مگر آج کل کے

① (النمل: ٦٢)   ② (العنکبوت: ٦٥)

مسلمان، خواہ خشکی پر ہوں یا پانی میں، اپنے خودساختہ معبودوں ہی کو پکارتے ہیں، کوئی یا علی کہتا ہے، تو کوئی یا عبدالقادر، کسی کی زبان پر یا ابن علوان ہوتا ہے تو کوئی بدوی اور عیدوس کو پکارتا ہے۔ ان سے حاجات طلب کی جاتی ہیں اور مشکلات ومضرات کا حل ڈھونڈا جاتا ہے، بلکہ کچھ لوگ تو ایسے شعبدہ بازوں کا دامن تھامے بیٹھے ہیں جو اپنے بارہ میں ولایت کا دعویٰ رکھتے ہیں، اور نفع وضرر کے سلسلہ میں بڑے بڑے بول بولتے ہیں، بلکہ یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ ہم قیامت کے دن جہنم کے دروازے پر بیٹھ جائیں گے، اور جو جو ہمارے ساتھ منسلک ہوا ہوگا انہیں جہنم سے بچالیں گے۔ والعیاذ باللہ۔

اللہ تعالیٰ اپنے پاک پیغمبر ﷺ سے فرمارہا ہے: ﴿ اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ﴾ ①

''بھلا جس شخص پر عذاب کی بات ثابت ہوچکی ہے، تو کیا آپ اسے جو دوزخ میں ہے چھڑا سکتے ہیں؟''

جب نبی علیہ السلام کسی کو جہنم سے نکالنے پر قادر نہیں، تو کوئی دوسرا کیسے ہوسکتا ہے؟ بلکہ وہ شخص کیسے ہوسکتا ہے جو خود ہی اس قسم کے دعوے کرتا رہتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اپنے پیروں اور ولیوں کے تعلق سے جھوٹی کہانیاں اور حکایتیں گھڑ رکھی ہیں کہ فلاں شخص نے انہیں مشکل میں پکارا اور وہ کس طرح فوراً اسکی مدد کو پہنچے، اور مشکل کو حل کرکے چلے گئے۔

کچھ لوگ اپنا خواب سنا کر یہ انکشاف کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں جگہ فلاں ولی کی قبر دیکھی ہے، پھر فوراً اس جگہ پہنچ کر قُبہ بنا ڈالتے ہیں، اور اس پر ملمع سازی کرکے پوجا شروع کردیتے ہیں، رفتہ رفتہ ان درگاہوں اور قُبوں پر وہ تمام اعمال جاری ہوجاتے ہیں جو حاجی دورانِ حج سرانجام دیتے ہیں، مثلاً: سروں کو ننگا کرنا، منڈوانا، قبے کے کونوں کو چھونا، طواف کرنا، قربانی کرنا وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ بہت سے لوگ تو سجدے بھی کرتے ہیں، اور ان کی تعظیم بجالانے کیلئے اپنے رخسار مٹی میں رگڑتے ہیں۔ اگر کوئی حاجت درپیش ہو، یا کسی مریض کی شفا مطلوب ہو، بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط سالی کا دور دورہ ہو، کسی عورت کے بانجھ پن کا مسئلہ ہو یا دشمن کی طرف سے کسی زیادتی کا خدشہ ہو، تو قبر والے کو پکارتے ہیں کہ آقا! ہم بہت دور سے آئے ہیں، ہمیں نامراد نہ لوٹائیے، خوب روتے ہیں اور گریہ زاری کرتے ہیں.....اگر اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں اس شئ کا حصول لکھا ہو، اور وہ مل جائے تو بہت خوش ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو قبر والے کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اگر اس مطلوبہ چیز کا حصول مقدر میں نہ ہو اور وہ حاصل نہ ہو، تو قبر والے کی طرف سے یہ کہہ کر اعتذار کرتے ہیں کہ جب ہم نے قبر والے کو پکارا تھا تو وہ وہاں موجود نہیں تھا، بلکہ کسی دوسرے شخص کی حاجت کے

① (الزمر: ۱۹)

سلسلے میں گیا ہوا تھا، یا یوں کہتے ہیں کہ وہ ہماری کسی بدعملی کی بنا پر ہم سے ناخوش تھا، یا یہ کہ ابھی اس پر ہمارا اعتقاد کمزور ہے، یا یہ کہ ہم نے اس کے نام کی نذر نہیں دی، (اور اس طرح کے بہت سے خرافات۔)

دعا اور استغاثہ کے تعلق سے شرک کا ایک بہت بڑا محاذ وہ اشعار ہیں جو سید المرسلین ﷺ کی مدح کے حوالے سے کہے گئے۔ لیکن درحقیقت وہ شرکیہ اعتقادات سے لبریز ہیں، مثلاً: آپ ﷺ کو پکارنا، آپ ﷺ سے استغاثہ کرنا، آپ ﷺ کو ملاذ (پناہ گاہ) قرار دینا، آپ ﷺ سے مختلف حاجات کا سوال کرنا، بلکہ ایسا انداز اختیار کرنا کہ نعوذ باللہ خالق کی بھی ضرورت نہیں رہی، اس طرح دنیا اور آخرت کے تمام امور آپ ﷺ کے سپرد کر دینا اور اس بات کا اظہار کرنا کہ آپ ﷺ قیامت کے دن ہمارا ہاتھ پکڑ کر جنت میں پہنچا دیں گے۔

بوصیری اور بدعی وغیرہ کے اشعار میں یہ تمام چیزیں مذکور ہیں۔ بلکہ کچھ اشعار تو ایسے بھی نظر سے گزرے کہ ان میں نبی ﷺ کی طرف وہ امور منسوب کئے جن کا عیسائی عیسیٰ علیہ السلام میں موجود ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، فرق صرف یہ ہے کہ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اِلٰہ قرار دے دیا، انہوں نے اگرچہ کہ نبی ﷺ کو الٰہ نہیں کہا لیکن لب لباب اور خلاصہ وہی بنتا ہے۔ (العیاذ باللہ)

کچھ قبر پرست ایسے بھی ہیں جو قبروں میں مدفون مردوں کو مہینہ بھر کی مسافت سے بھی زیادہ دور سے پکارتے ہیں اور اپنی حوائج طلب کرتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اتنی مسافت سے بھی وہ سننے اور قبول کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ (فانا للہ وانا الیہ راجعون)

واضح ہو کہ مذکورہ بالا چند گزراشات جو پیش کی گئیں ہیں یہ دعاءِ مسئلہ سے متعلق تھیں۔ اور اب کچھ گفتگو دعاءِ عبادت کے بارہ میں ہو جائے۔

دعاءِ عبادت کا مفہوم

دعاءِ عبادت، مختلف الانواع عبادات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا نام ہے۔ مثلاً: نماز، حج، قربانی، روزہ، نذر وغیرہ.....ان عبادات کی ادائیگی میں خوف وطمع کا پہلو موجود ہو یعنی اللہ رب العزت کی رحمت کا طمع اور امید اور اس کے عذاب کا خوف اور ڈر۔ دعاءِ عبادت میں اگرچہ کوئی سوال یا طلب نہیں ہوتی، لیکن عبادت گزار جو کہ جنت کا داخلہ اور جہنم سے بچاؤ چاہتا ہے اس کی عبادت کا ہدف اور مقصد یہی ہوتا ہے۔ وہ امتثالِ امر اور اتباعِ حکم میں عبادت کئے جا رہا ہے، قصد ومراد گو کہ زبان سے طلب نہیں کر رہا لیکن فعلِ عبادت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے رہائی اور جنت کا ٹھکانہ حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے

فرمان: ﴿ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ .... ﴾ میں دعا سے مراد دعاءِ عبادت بھی لی گئی ہے اور دعاءِ مسئلہ بھی۔ دعاءِ عبادت کی صورت میں معنیٰ یوں ہوگا: یعنی "اُعْبُدُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ "تم میری عبادت کرو میں قبول کرونگا۔ اور دعاءِ مسئلہ کی صورت میں معنی یوں ہونگا: "سَلُوْنِیْٓ اُعْطِکُمْ "، یعنی تم مجھ سے مانگو میں تمہیں عطا کردونگا۔

دعاءِ عبادت کے شرک ہونے پر مذاہب اربعہ کے علماء کے اقوال

اس تمام وضاحت کے بعد واضح ہو کہ تمام علماءِ کرام اس بات پر متفق ہیں کہ جس شخص نے دعا کی دونوں قسموں یعنی دعاءِ عبادت اور دعاءِ مسئلہ میں سے کوئی ادنیٰ سی ادنیٰ چیز بھی غیر اللہ کے نام کردی تو وہ مشرک ہے، خواہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ " کا اقرار کیوں نہ کرتا ہو، بلکہ پابندِ صوم وصلوٰۃ کیوں نہ ہو؛ کیونکہ شہادتین کے اقرار کرنے والے شخص کے اسلام کے صحیح اور قابلِ قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے۔ اب جو شخص شہادتین کا اقرار کرتا ہو لیکن غیر اللہ کی عبادت بھی کرتا ہو تو اس کا اقرارِ شہادتین بے کار و بے فائدہ ہے۔ یہودی " لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ " کہتے تھے، لیکن شرک بھی کرتے تھے، تو کیا وہ مشرک قرار نہیں پائے ؟ زبان سے صرف کلمہ کا پڑھ لینا کافی نہیں ہے، جب تک باطنی عقیدہ اور ظاہری عمل اس کے مطابق نہ ہوں۔ اس بارہ میں کتاب وسنت کے محکم اور ٹھوس دلائل موجود ہیں جن میں سے کچھ گزشتہ صفحات میں مذکور ہیں۔ تاہم کچھ علماء کے اقوال بھی پیش کئے دیتے ہیں؛ کیونکہ کچھ لوگوں کا مزاج ایسا ہے کہ اگر انہیں قرآن پاک کی تمام آیات اور رسول اللہ ﷺ کی تمام احادیث سنادو، تو وہ اس وقت تک قبول نہیں کرینگے جب تک علماء کا کلام اور صراحت پیش نہ کردی جائے چنانچہ۔

امام ابوالوفاء علی ابن عقیل صاحبِ کتاب "الفنون" فرماتے ہیں: "جب جاہل اور سرکش لوگوں پر شرعی امور دشوار ہوئے، تو انہوں نے شرعی اوضاع سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور کچھ ایسی اوضاع بناڈالیں جن کی تعظیم کو وہ شریعت سمجھ بیٹھے ...ان اوضاع کی بناء پر میرے نزدیک وہ کافر ہیں۔ اور ان اوضاع میں سے قبروں کی تعظیم، مُردوں کو حوائج کے سلسلہ میں پکارنا، قبروں کے احاطہ میں پرچیاں پھینکنا جن پر لکھا ہوتا ہے: اے میرے مولیٰ میرا فلاں کام سنوار دو، اس طرح درختوں پر دھاگے اور پٹیاں لپیٹنا۔ اور یہ کام تو لات وعزیٰ کے پجاری کیا کرتے تھے...."

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ "الرسالة السنية" میں فرماتے ہیں: "جب عہدِ نبوی میں ایسے لوگ موجود تھے جو اسلام کے ساتھ تعلق کے باوجود، نیز بڑی بڑی عبادات بجالانے کے باوجود اسلام سے خارج قرار پائے

تو آج کے دور میں بھی یقیناً ایسے لوگ موجود ہیں جو اسلام کے ساتھ نسبت اور سنت کے ساتھ تعلق کے باوجود اسلام سے خارج ہیں۔اس کے بہت سے اسباب ہیں،ان اسباب میں سے ایک سبب غلو ہے،جس کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی،ارشاد ہے:﴿ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ ﴾ [1]
یعنی''اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو''

اسی طرح بزرگوں کے بارے میں غلو بھی انتہائی مذموم فعل ہے،بلکہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بارہ میں غلو،اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں غلو(سب اسی زمرے میں ہیں)

اب جو کسی نبی یا صالح بزرگ کے بارے میں غلو کا شکار ہوتا ہے اور اس کے اندر کسی نوع الوہیت کو پیدا کرتا ہے مثلاً:یوں کہتا ہے:اے میرے فلاں آقا!میری مدد کیجئے،مجھے رزق دیجئے،میری کوتاہیاں معاف کردیجئے میں آپ کی کفالت میں ہوں وغیرہ وغیرہ۔یہ سب شرک اور گمراہی ہے،حاکم وقت کی ذمہ داری ہے کہ اس عقیدہ سے متصف شخص کو سمجھائے اور توبہ کرائے،اور اگر وہ توبہ کرلے تو ٹھیک،ورنہ اسے قتل کردے؛کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو اسی لئے مبعوث فرمایا اور اپنی کتابیں اسی لئے نازل فرمائیں تاکہ اس اکیلے " وَحْدَهُ لَاشَرِيْكَ لَهُ " کی عبادت کی جائے،اور اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں مثلاً:سیدنا مسیح علیہ السلام،فرشتے،یا بت وغیرہ ان کا ان کے بارہ میں یہی عقیدہ ہے کہ وہ نہ تو مخلوق کو خلق کرسکتے ہیں،نہ بارش اتار سکتے ہیں اور نہ ہی فصل اگا سکتے ہیں....وہ تو انہیں یا ان کی صورتوں اور مورتیوں کو اس لئے پکارتے ہیں تاکہ وہ ان کے لئے شفیع(سفارشی)بن جائیں....اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل علیہم السلام مبعوث فرمائے تاکہ وہ لوگوں کو اس بات سے روکیں کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کو نہ پکاریں،خواہ وہ پکارنا برائے عبادت ہو یا برائے استغاثہ۔''

حافظ ابوبکر احمد بن علی المقریزی نے اپنی''کتاب التوحید''میں غیر اللہ کے پکارنے کے عمل کو نصاً شرک کہا ہے۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:''جس شخص نے اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان وسائط مقرر کرلئے ان پر توکل کرتا ہو،انہیں پکارتا ہو اور اپنی حاجات کا سوال کرتا ہو،اسے بالاجماع کافر قرار دیا گیا ہے۔''

اجماع کا یہ عقیدہ بالکل درست ہے اور ظاہر دین سے معلوم ہے،چاروں مذاہب کے علماء نے''حکم المرتد''کے باب میں یہ مسئلہ تحریر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والا کافر ہے جس کا معنی یہ ہے کہ جو

---

[1] (النساء : ۱۷۱)

....

....

اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت کی کسی بھی قسم میں غیر اللہ کو پوجے وہ کافر ہے، اور یہ بات قرآن، حدیث اور اجماع امت سے ثابت ہو چکی کہ دعا ایک عبادت ہے، لہذا غیر اللہ سے دعا مانگنا شرک ہوگا۔

امام ابن النحاس الشافعی ''کتاب الکبائر'' میں فرماتے ہیں: ''حجر، شجر، چشمے یا کنویں کے پاس دیئے جلانا، اور یہ عقیدہ رکھنا کہ اس سے نذر قبول ہوتی ہے یہ سب بدترین بدعات اور منکرات ہیں، جنہیں ختم کر دینا اور ان کے نشانات تک کو مٹا دینا واجب ہے؛ کیونکہ اکثر جہال ان کے نفع ونقصان پہنچانے کے قائل ہیں، اس عمل کی نذر کو وہ مریضوں کے شفایاب ہونے، اور گمشدہ افراد کے لوٹ آنے کا موجب قرار دیتے ہیں، یہ سب کا سب شرک اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے کھلم کھلی محاذ آرائی اور مقابلہ بازی ہے۔''

امام ابن القیم رحمہ اللہ ''شرح المنازل'' میں فرماتے ہیں: ''شرک کی انواع میں سے مردوں سے حاجات طلب کرنا، ان سے استغاثہ کرنا اور ان کی طرف توجہ کرنا بھی ہے، بلکہ دنیا جہان کے شرک کی اصل بنیاد یہی ہے۔ اب وہ میت جس کا اپنا عمل منقطع ہو چکا اور اپنے نفس کے لئے کسی نفع یا نقصان کا مالک نہیں وہ دوسروں کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے....اور اگر اسے اس لئے پکارا جارہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شفاعت کرے، تو یہ قانونِ شفاعت سے جہالت وناواقفیت قرار پائے گا؛ کیونکہ شفاعت کا شرعی اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کرسکتا، اور اللہ تعالیٰ کے اذن کا حصول سائل کے سوال پر نہیں، بلکہ اس کے کامل اور خالص موحد ہونے پر موقوف اور قائم ہے۔''

پھر تیسری بات یہ ہے کہ جس میت کو وہ پکار رہا ہے وہ خود اپنے لئے دعا کی محتاج ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ جب ہم قبروں کی زیارت کو جائیں تو اہل قبور پر رحم کریں، اور ان کیلئے دعائیں کریں اور اللہ تعالیٰ سے عافیت اور مغفرت کا سوال کریں۔ مگر مشرکین نے اس کے بالکل برعکس معاملہ بنالیا، وہ قبروں کی زیارت بطورِ عبادت کرتے ہیں، اور قبروں کو پوج کر انہیں بت کے حکم میں لے آئے ہیں، اور یوں وہ اپنے معبودِ حقیقی کے ساتھ شرک کرنے، اس کے دین کو تبدیل کرنے اور اہل توحید سے عداوت قائم کرنے جیسے قبیح جرائم کے مرتکب بن گئے۔ اہل توحید کی توحیدِ خالص کو وہ قبر والوں کی توہین اور گستاخی تصور کرتے ہیں، اور یہ بات نہیں جانتے کہ وہ خود خالقِ کائنات کی توہین اور تنقیص کے مرتکب بنے بیٹھے ہیں۔

انتہٰی کلامہ ملخصاً .

علماءِ احناف کے تبصرے

''الفتاویٰ البزازیہ'' جو کہ حنفی فقہ کی کتاب ہے، میں مرقوم ہے: ''مشائخ کی ارواح کو حاضر ماننے والا اوران کے غیب جاننے کا عقیدہ رکھنے والا کافر ہے۔''

شیخ صنع اللہ الحلبی الحنفی فرماتے ہیں: ''مسلمانوں کے اندر کچھ جماعتیں ایسی پیدا ہوچکی ہیں جن کا یہ عقیدہ ہے کہ اولیاءکرام اپنی زندگیوں میں اور مرنے کے بعد مختلف امور میں تصرف پر قادر ہیں، مشکلات وشدائد میں ان سے مدد مانگی جاسکتی ہے۔لہذا اس عقیدے کے تحت وہ ان کی قبروں پر حاضری دیتے ہیں، اور انہیں اپنی حاجات کی تکمیل کیلئے پکارتے ہیں۔ان کی کچھ کرامات بھی پیش کرکے ان سے استدلال کرتے ہیں، ان میں ابدال، نقباء، اوتاد اور نجباء مانتے ہیں، ستر (۷۰) اور چوالیس (۴۴) کی تعداد ذکر کرتے ہیں، اور قطب اسے قرار دیتے ہیں جو لوگوں کی ہر طرح کی مدد کرسکے، اسے اس عالم کا مدار تصور کرتے ہیں، ان اولیاء کرام کیلئے جانور ذبح کرنا اور نذریں ماننا جائز سمجھتے ہیں اور اس کا بہت زیادہ اجر وثواب ذکر کرتے ہیں......''

فرماتے ہیں: ''اس کلام میں افراط وتفریط ہے، بلکہ ابدی ہلاکت ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب ہے؛ کیونکہ ان معتقدات میں شرک کی بو پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ کتاب اللہ سے تصادم اور ائمہ کرام کے عقائد کی مخالفت اور اجماع امت کا انکار بھی......''

مزید فرماتے ہیں: ''لوگوں کا یہ کہنا کہ اولیاءکرام کو ان کی زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی حق تصرف حاصل ہے۔مردود ہے، اللہ تعالیٰ کے فرامین: ﴿ ءَاِلٰـهٌ مَّعَ اللهِ ﴾ ﴿ اَلَا لَـهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ﴾ اور ﴿ لِلّٰهِ مُـلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ اس قول کو رد کرتے ہیں؛ کیونکہ یہ تمام آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو خلق، تدبر، تصرف اور تقدیر کا حق حاصل ہے، ان امور میں کسی صورت کسی غیر اللہ کا کوئی حصہ نہیں ہے، پوری کائنات اللہ تعالیٰ کے ملک، قہر اور تصرف کے تحت ہے....''

مزید فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی ﴿ مِنْ دُوْنِهٖ ﴾ فرمایا ہے اس سے مراد ''مِنْ غَیْرِهٖ'' ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی چیز (خواہ وہ ولی ہو، جسے آپ مدد کے لئے پکاریں یا شیطان ہو) جو اپنے نفس کی مدد پر قدرت نہیں رکھتا وہ دوسروں کی کیا مدد کرسکتا ہے....؟''

مزید فرماتے ہیں: ''غیر اللہ کے لئے یہ تصور کیونکر ہوسکتا ہے، کہ وہ تصرف کرسکتا ہے، یہ بڑا گھٹیا قول اور عظیم شرک ہے۔اور مرنے کے بعد تصرف پر قادر ہونے کا عقیدہ تو اور زیادہ بدترین اور پرلے درجے کی بدعت ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴾ ①

''یقیناً خود آپ ﷺ کو بھی موت کا مزا چکھنا ہے، اور یہ سب بھی مرنے والے ہیں''

نیز فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ ﴾ ②

''اللہ تعالیٰ ہی روحوں کو ان کی موت کے وقت، اور جن کی موت نہیں آئی انہیں ان کی نیند کے وقت قبض کر لیتا ہے، پھر جن پر موت کا حکم لگ چکا ہے انہیں تو روک لیتا ہے''

نیز فرمایا: ﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ﴾ ③

''ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے''

نیز فرمایا: ﴿ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴾ ④

''ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے۔''

اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: [اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَمَلُهٗ] یعنی: ''جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے تمام عمل منقطع ہو جاتے ہیں'' ⑤

یہ تمام نصوص اس امر پر دال ہیں کہ میت کی تمام حس وحرکت ختم ہو جاتی ہے، انکے عمل منقطع ہو جاتے ہیں اور روحیں روک لی جاتی ہیں، اور وہ انکے اچھے یا برے اعمال کی مرہون ہوتی ہیں۔ تو جو اپنے نفس کی حرکت سے عاجز ہیں وہ دوسروں کیلئے کیا تصرف کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو فرمارہا ہے کہ روحیں میرے پاس ہیں، اور یہ ملحد کہتے ہیں کہ روحیں آزاد ہیں اور تصرف کرتی ہیں ﴿ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ﴾

''کیا تمہیں زیادہ علم ہے یا اللہ تعالیٰ کو؟......''

مزید فرماتے ہیں: ''ان کا یہ عقیدہ کہ یہ تصرفات پر قادر ہیں زبردست مغالطہ ہے؛ کیونکہ کرامت کا ظہور اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے ہے، جس سے مقصود اولیاء کی تکریم ہے، اس کے ظہور میں نہ تو ان کا قصد شامل ہوتا ہے نہ انہیں اس کے ظہور پر قدرت حاصل ہوتی ہے، بلکہ انہیں اس کا علم تک نہیں ہوتا، جیسا کہ مریم بنت عمران علیہا السلام اُسید بن حضیر اور ابو سلمہ خولانی کے واقعات اس پر شاہد ہیں......''

مزید فرماتے ہیں: ''ان کا یہ عقیدہ کہ شدائد و مشکلات میں ان سے پناہ مانگی جا سکتی ہے، انکے سابقہ بیان شدہ

① (الزمر: ٣٠) ② (الزمر: ٤٢) ③ (آل عمران: ١٨٥)
④ (المدثر: ٣٨) ⑤ صحیح مسلم، کتاب الوصیة (١٦٣١)

نظریہ سے بھی زیادہ قبیح اور شنیع ہے؛ کیونکہ یہ عقیدہ ظاہراً و باھراً قرآن حکیم کی اس آیت کے متصادم و متعارض ہے ﴿ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ﴾ ①

''بے کس کی پکار کو جب کہ وہ پکارے، کون قبول کر کے سختی کو دور کر دیتا ہے؟ اور تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے، کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور معبود ہے؟۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ﴾ ②

''آپ ﷺ کہئے کہ وہ کون ہے جو تم کو خشکی اور دریا کی ظلمات سے نجات دیتا ہے۔''

اس کے علاوہ اور بہت سی آیات ذکر کیں، پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں یہ بات ثابت اور طے فرمادی ہے کہ تکلیفوں کو ٹالنے والا صرف وہی ہے اور کوئی نہیں، اور مضطر اور لاچار انسانوں کی دعا وہی قبول کرسکتا ہے'' (کچھ آگے چل کر مزید فرماتے ہیں):

''جو شخص کسی غیر اللہ میں خواہ وہ نبی ہو یا ولی یا روح یہ عقیدہ رکھے کہ انہیں ازالۂ مشکلات یا قضاءِ حاجات میں کسی حد تک قدرت یا تائید حاصل ہے تو وہ بڑی خطرناک وادیٔ جہالت میں گر چکا ہے، بلکہ جہنم کے گڑھے کے کنارے پر کھڑا ہے......''

مزید فرماتے ہیں: ''ان لوگوں کا یہ کہنا کہ اولیاء کرام میں ابدال، نقباء، اوتاد اور نجباء ہوتے ہے...... یہ سب ان کے گھڑے ہوئے جھوٹ اور بہتان ہیں، جیسا کہ قاضی ابن العربی، ابن الجوزی اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ وغیرہ نے بڑی وضاحت سے ذکر کیا ہے۔'' (انتہیٰ)

اس قسم کا کلام بہت سے علماء کی تحریروں سے ملتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اہل علم ان امور کے منکر ہیں اور ان کے شرک ہونے کے قائل ہیں۔ بعض متاخرین جن کی عقل اور دین مشبوہ ہے ان میں سے بعض امور کی رخصت دیتے ہیں، لیکن ان کا رخصت دینا غلط ہے، اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ اور اجماع مسلمین کے خلاف ہونے کی وجہ سے گمراہی ہے...... ہر شخص کا قول درست ہونے کی بناء پر قابل قبول اور غلط ہونے کی بناء پر قابل رد ہوسکتا ہے، لیکن ہمارے پروردگار کا فرمان، اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان کبھی غلط نہیں ہوسکتا، لہٰذا پوری خلق پر واجب ہے کہ وہ ہر دور میں اسی کی اتباع کرتے رہیں۔ متاخرین میں سے بعض تو کیا اگر سب، ان امور کے جائز ہونے پر اجماع کرلیں تو ان کا اجماع قرآن وحدیث سے مخالف ہونے کی بناء پر =

① (النمل: ٦٢) ② (الانعام: ٦٣)

قال : ﴿ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللهِ مَالَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَإِنْ يَّمْسَسْكَ اللهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ إِلَّا هُوَ ﴾ ①

''اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت مت کرنا جو تجھ کو نہ کوئی نفع پہنچا سکے اور نہ کوئی ضرر پہنچا سکے۔ پھر اگر ایسا کیا تو تم اس حالت میں ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ اور اگر تم کو اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچائے تو بجز اس کے اور کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں ہے''

=

نا قابلِ اعتبار و التفات ہوگا؛ کیونکہ وہ اجماع غیر معصوم ہے، اور اجماعِ معصوم تو صحابہ، تابعین اور ان کے تبعین کا ہے، یہی درحقیقت ''سوادِ اعظم'' ہے، جس کی اتباع کی شریعت نے ترغیب دلائی۔ اگرچہ اتباع کرنے والے چند غرباء یعنی معاشرے کے دھتکارے ہوئے، درماندہ حال ہوں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ غَرِيْبًا كَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ" ②

''اسلام غربت و اجنبیت سے شروع ہوا، اور جس غربت اور اجنبیت سے شروع ہوا اسی پر لوٹے گا، لہٰذا غرباء کے لئے خوشخبری ہو''

یہی چند لوگ درحقیقت سوادِ اعظم ہیں، لوگوں کا کثرت میں ہونا سوادِ اعظم نہیں ہوسکتا، اور نہ ان ادوار میں پیدا ہونے والے متاخرین سوادِ اعظم ہوسکتے ہیں، جن کا منہج یہ ہے کہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں، اور جو کچھ کرتے ہیں اس کا انہیں حکم نہیں دیا جاتا۔ (واللہ المستعان)

غیر اللہ سے دعا اور استغاثہ کے شرک ہونے پر قرآن و حدیث سے استدلال

وقولہ: قول اللہ تعالیٰ: وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللهِ مَالَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ....

ابن عطیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت کریمہ میں نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کے مخاطب ہیں، جب معاملہ یہ ہے کہ نبی ﷺ کو غیر اللہ کو پکارنے سے منع کر دیا گیا اور بفرض محال اگر انہوں نے پکار لیا تو وہ ظالموں میں سے ہو جائیں گے، تو پھر دوسروں کو تو اور زیادہ ڈرنا اور بچنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ شرک کو ظلم عظیم قرار دیا گیا ہے: ﴿ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ ③

''بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے''

---

① (یونس: ۱۰۶، ۱۰۷) ② صحیح مسلم، کتاب الایمان (۱۴۵)

③ (لقمان: ۱۳)

....

....

اس آیتِ کریمہ سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن جن کو پکارا جاتا ہے، خواہ وہ انبیاء واولیاء ہی کیوں نہ ہوں، کسی نفع ونقصان کے مالک نہیں ہیں، حالانکہ جسے پکارا جائے ضروری ہے کہ وہ نفع ونقصان کا مالک ہو، تاکہ پکارنے والے کی حاجات پوری کر کے اسے نفع پہنچاسکے، اور نافرمان کی پکڑ کر سکے، اس پر صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے، کوئی غیر اللہ نہیں۔

نبی ﷺ نے سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا: ''جب سوال کرو اللہ تعالیٰ سے کرو اور جب مدد طلب کرو اللہ تعالیٰ سے کرو، اور یہ جان لو اگر پوری امت تمہیں کوئی نفع پہنچانے کیلئے جمع ہو جائے تو تمہیں کچھ نفع نہیں پہنچاسکتی، اِلَّا یہ کہ جو اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے، اور اگر پوری امت تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کیلئے اکھٹی ہو جائے، تو وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاسکتی اِلَّا یہ کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے'' ①

مذکورہ آیتِ کریمہ اس بات کی دلیل ہے کہ غیر اللہ کو پکارنے والا ظالم ہے۔ ایک اور مقام پر اسے عذاب پانے والوں میں سے قرار دیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴾ ②

''پس تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکار کہ تو بھی سزا کے قابل بن جائے''

جبکہ ایک اور مقام پر بربادیٔ عمل کی وعید ہے: ﴿ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ ③

''یقیناً تیری طرف بھی اور تجھ سے پہلے (کے تمام نبیوں) کی طرف بھی وحی کی گئی ہے کہ اگر تو نے شرک کیا تو بلاشبہ تیرا عمل ضائع ہو جائے گا، اور بالیقین تو زیاں کاروں میں سے ہو جائے گا۔''

غور کیجئے کہ شرک اگر انبیاء علیہم السلام سے صادر ہو (جو کہ ناممکن ہے) تو وہ بھی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں چھڑا سکتے، تو پھر دوسروں کا کیا ٹھکانہ؟ پس یہ بات طے ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کا قرب دلانے والی اور اس کی ناراضگی سے بچانے والی چیز صرف اسکی توحید ہے، ساتھ ساتھ ایسا عمل جو اسے پسند ہے۔ (واللہ المستعان)

① یہ حدیث حسن ہے۔ مسند احمد (۲۶۶۹، ۲۷۶۳، ۲۸۰۴ ج۱) سنن ترمذی (۵۱۶) وقال حسن صحیح "عمل الیوم واللیلة" لابن السنی (۴۲۷) معجم طبرانی کبیر (۱۲۹۸۸).

② (الشعراء: ۲۱۳)

③ (الزمر: ٦٥)

قال وقولہ :﴿ فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ ①

''پس تمہیں چاہئے کہ تم اللہ تعالیٰ ہی سے روزیاں طلب کرو، اور اسی کی عبادت کرو، اور اسی کی شکرگزاری کرو اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔''

قولہ تعالیٰ:﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غَافِلُوْنَ. وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِيْنَ ﴾ ②

''اور اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہوگا؟ جو اللہ تعالیٰ کے سوا ایسوں کو پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی دعا قبول نہ کرسکیں، بلکہ انکے پکارنے سے محض بے خبر ہوں۔ اور جب لوگوں کو جمع کیا جائے گا تو یہ انکے دشمن ہو جائیں گے، اور انکی پرستش سے صاف انکار کر جائیں گے۔''

اس آیتِ کریمہ کا اسلوبِ بیان انتہائی قابلِ غور ہے، چنانچہ "عند الله" کی "الرزق" پر تقدیم حصر کا فائدہ دے رہی ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے رزق طلب کیا جائے اور کسی سے نہیں، اور صرف اللہ تعالیٰ ہی رزق دے سکتا ہے اور کوئی نہیں؛ کیونکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی رزق کا مالک ہے اور کوئی نہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا فرمان "فَاعْبُدُوْهُ" مذکورہ حکم کی علت ہے یعنی جب رزق اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے تو پھر وہی خالص عبادت کا مستحق ہے۔

وقولہ:قولہ تعالیٰ :وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللهِ....

ان آیات کی تفسیر میں مفسرین کے کلام کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو پکارنے والے شخص سے بڑا گمراہ اور کوئی نہیں، خواہ وہ پکارنا برائے عبادت ہو یا برائے استعانت و استغاثہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ اس ذاتِ وحدہ لاشریک لہ جو کہ سمیع اور مجیب الدعوات ہے، کو چھوڑ کر انہیں پکارتے ہیں جو قیامت کے قائم ہونے تک ان کی پکار نہیں سن سکتے، جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَآءُ الْكَافِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلَالٍ ﴾ ③

''اسی کو پکارنا حق ہے۔ جو لوگ اوروں کو اس کے سوا پکارتے ہیں وہ ان (کی پکار) کا کچھ بھی جواب نہیں دیتے مگر جیسے کوئی شخص اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوئے ہو کہ اس کے منہ میں پڑ جائے حالانکہ وہ پانی اس کے منہ میں پہنچنے والا نہیں، ان منکروں کی جتنی پکار ہے سب گمراہی میں ہے'' =

① (العنکبوت: ۱۷) ② (الاحقاف: ۵،۶) ③ (الرعد: ۱٤)

﴿ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّاتَذَكَّرُوْنَ ﴾ ①

''بے کس کی پکار کو جب کہ وہ پکارے، کون قبول کر کے سختی کو دور کر دیتا ہے؟ اور تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے، کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور معبود ہے؟ تم بہت کم نصیحت وعبرت حاصل کرتے ہو۔''

=

پھر مذکورہ آیتِ کریمہ میں فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غَافِلُوْنَ ﴾ اس بات کی دلیل ہے کہ جس جس کو اللہ تعالیٰ کے سوا پکارا جاتا ہے اسے اس پکار کا کوئی علم یا شعور نہیں ہے؛ کیونکہ جنہیں پکارا جارہا ہے یا تو وہ ملائکہ ہیں جو اگرچہ زندہ ہیں لیکن وہ اپنے امور کے ساتھ مشغول ہیں، اور یا وہ انبیاء علیہم السلام وصالحین ہیں، اور وہ سب فوت ہو چکے، اور یا حجر وشجر ہیں، اور وہ سب جماد ہیں۔

اس آیتِ کریمہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا پکارا جارہا ہے وہ قیامت کے دن پکارنے والوں کے دشمن ہوں گے، یہی مضمون سورۃ مریم کی ان آیات میں ہے: ﴿ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا. كَلَّا سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴾ ②

''انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں کہ وہ ان کے لئے باعث عزت ہوں۔ لیکن ایسا ہرگز ہونا نہیں، وہ تو ان کی پوجا سے منکر ہو جائیں گے، اور الٹے ان کے دشمن بن جائیں گے۔''

سو مشرکین دونوں جہانوں میں دھتکارے ہوئے نامراد ہیں، دنیا میں اس طرح کہ جنہیں پکار رہے ہیں وہ اس پکار کو سنتے نہیں، قبول تو دور کی بات ہے، اور قیامت کے دن اس طرح کہ انہوں نے جس جس کو پکارا ہوگا وہ ان کی پکار کا منکر ہو جائے گا اور ان کا دشمن بن جائے گا۔

وقوله: قول الله تعالىٰ: اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ ....

یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ بتلایا ہے کہ شدائد اور مشکلات میں وہی پکارے جانے کے لائق ہے؛ کیونکہ صرف وہی تکلیفوں کو ٹالنے والا ہے اور اکیلا مستحق عبادت ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ مشرکین عرب بھی اس حقیقت کو جانتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ پریشانیاں لاحق ہونے پر خالصتاً اللہ تعالیٰ کو پکارا کرتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴾ ③

''پس جب یہ لوگ کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں اس کے لئے عبادت کو خالص کر کے، پھر جب وہ انہیں خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو اسی وقت شرک کرنے لگتے ہیں۔'' =

① (النمل: ٦٢) ② (مریم: ٨١، ٨٢) ③ (العنکبوت: ٦٥)

وروی الطبرانی باسنادہ :[اَنَّہٗ کَانَ فِیْ زَمَنِ النَّبِیِّ ﷺ مُنَافِقٌ یُوْذِی الْمُؤْمِنِیْنَ فَقَالَ بَعْضُھُمْ : قُوْمُوْا بِنَا نَسْتَغِیْثُ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ مِنْ ھٰذَا الْمُنَافِقِ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ اِنَّہٗ لَا یُسْتَغَاثُ بِیْ ، وَاِنَّمَا یُسْتَغَاثُ بِاللّٰہِ] ①

امام طبرانی اپنی سند سے یہ حدیث لائے ہیں: ''کہ نبی ﷺ کے دور میں ایک منافق مسلمانوں کو ایذاء پہنچایا کرتا تھا، تو کسی نے کہا چلو ہم رسول اللہ ﷺ سے اس منافق کے شر سے (بچاؤ کیلئے) مدد طلب کرتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ سے مدد طلب نہیں کی جاسکتی بلکہ مدد تو صرف اللہ تعالیٰ سے طلب کی جائے''

=

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مشرکینِ مکہ یہ بات جانتے تھے کہ ان امور پر صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے، تو آج اگر کوئی شخص کسی غیر اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ وہ سختیوں کو ٹالنے اور مضطر و بے کس کی فریاد رسی کرنے پر قادر ہے، جیسا کہ بہت سے قبر پرستوں کا عقیدہ ہے تو وہ مشرکینِ عرب کے شرک سے بڑے شرک میں مبتلا ہے۔

وقولہ:وروی الطبرانی باسنادہ : اَنَّہٗ کَانَ فِیْ زَمَنِ النَّبِیِّ ﷺ ......

یہ حدیث معجم طبرانی کے حوالے سے ہے، امام طبرانی جن کا نام سلیمان بن احمد بن ایوب الطبرانی ہے، بڑے ثقہ اور حفاظ محدثین میں شمار ہوتے ہیں، انکی تالیف کردہ تین معاجم معروف ہیں ۳۶۰ھ میں فوت ہوئے۔

اس حدیث کے راوی سیدنا عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ ہیں۔ حدیث کی سند میں ابن لہیعہ کی وجہ سے ضعف ہے۔

جو منافق مسلمانوں کی ایذاء رسانی کا سبب تھا اس کا نام مذکور نہیں، ممکن ہے وہ عبداللہ بن ابی بن سلول ہو، کیونکہ وہ ایذاء رسانی میں معروف اور پیش پیش تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس کے شر سے بچنے کے لئے نبی ﷺ سے سوال کرنا، ایک ایسا سوال ہے جس کے حل پر آپ ﷺ کو طاقت حاصل تھی، مثلاً اس طرح کہ آپ ﷺ اسے ڈانٹ دیں یا ایذاء رسانی سے روک دیں، یا کوئی سزا دے دیں وغیرہ، ایسے امور جو بندے کے اختیار میں دیئے گئے ہیں۔ لیکن آپ ﷺ نے جو جواب دیا وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حد درجہ حسنِ ادب کا مظہر ہے، چنانچہ تربیت کا یہ عالم ہونا چاہئے کہ الفاظ کے استعمال میں بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ادب کا اہتمام ہو۔ آپ ﷺ کا یہ جواب اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور توحید کی حمایت و حفاظت کا مظہر ہے، جب آپ ایسے امور کہ جن کے حل کی

① ضعیف ۔الطبرانی.

آپ ﷺ کو طاقت حاصل ہے کے لئے اللہ تعالیٰ سے استغاثہ کی تعلیم دے رہے ہیں تو پھر وہ امور جو صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں ان میں بالاً ولی اللہ تعالیٰ سے استغاثہ کرنا ضروری قرار پائے گا، اور ہر غیر اللہ سے استغاثہ شرک ہوگا، بلکہ شرکِ اکبر ہوگا، کیونکہ دعاء اصلِ عبادت ہے، اور چونکہ اس ذاتِ وحدہ لاشریک لہ کا ہر قسم کی دعا وسوال کا اکیلے مستحق ہونا اس کی الوہیت کے خصائص میں سے ہے یہی چیز "الالــہ" کے معنی سے ماخوذ ہوتی ہے، نیز دعا کو خلاصۂ توحید قرار دیا گیا ہے، لہذا غیر اللہ میں سے کسی کو دعاء کے قابل سمجھنا اسے اللہ تعالیٰ کیساتھ برابر کرنے کے مترادف ہے، اور یہی شرک ہے۔ قیامت کے دن مشرکین جہنم کے اندر اس حقیقت کا اعتراف کرلیں گے، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا:

﴿ تَاللهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍo اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ ﴾ ①

''قسم اللہ تعالیٰ کی! یقیناً ہم تو کھلی غلطی پر تھے، جبکہ تمہیں رب العالمین کے برابر سمجھ بیٹھے تھے''

قبر پرست اپنے شرکیہ امور کے اثبات کیلئے بعض احادیث کا سہارا لیتے ہیں، لیکن ان احادیث سے استدلال یا تو غلط فہم کی اساس پر ہے یا وہ احادیث باعتبارِ سند ضعیف، منکر، بلکہ بعض موضوع تک ہیں۔ واللہ المستعان



① (الشعراء : ۹۷،۹۸)

اس باب کے مسائل

(۱) دعا کا استغاثہ پر عطف ، از قبیلِ عطف العام علی الخاص ہے (اس کی تفصیل اس باب کے شروع میں گزر چکی ہے۔)

(۲) اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۳) دعاءِ غیر اللہ شرکِ اکبر ہے۔

(۴) امت کے سب سے بہترین انسان یعنی محمد رسول اللہ ﷺ بھی اگر غیر اللہ کو پکاریں گے، خواہ مقصود لوگوں کی رضا ہو، تو وہ بھی ظالموں میں شامل ہو جائیں گے (یہ استدلال اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہے: ﴿ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾

(۵) اسکے بعد والی آیت یعنی قولہ تعالیٰ ﴿ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ ... الآيه ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی ۔

(۶) دعاءِ غیر اللہ ایک تو عمل کفر ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس پکار کا دنیا میں کوئی فائدہ بھی نہیں ہے، (جیسا کہ اسی آیتِ کریمہ سے ظاہر ہے)

(۷) تیسری آیت یعنی ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...الآية ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۸) یہ بات معلوم ہوئی کہ جیسے آخرت کی سب سے بڑی نعمت، جنت کا سوال اللہ تعالیٰ سے کیا جاتا ہے، اسی طرح دنیا کی نعمتوں (رزق وغیرہ) کا سوال بھی اللہ تعالیٰ سے کیا جانا چاہئے۔

(۹) چوتھی آیت یعنی: ﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...الآية ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۱۰) یہ بات معلوم ہوئی کہ غیر اللہ کو پکارنے والا سب سے بڑا گمراہ ہے، اس سے بڑا کوئی گمراہ نہیں۔

(۱۱) اللہ تعالیٰ کے سوا جس جس کو پکارا جاتا ہے انہیں، نہ تو پکارنے والے کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی ان کی پکار کا۔

(۱۲) بلکہ ان کی پکار، ان کے معبودوں کے بغض وعداوت کا سبب بن جائے گی۔

(۱۳) غیر اللہ کو پکارنا درحقیقت ان کی عبادت ہی کرنا ہے۔

(۱۴) اللہ تعالیٰ کے سوا جن معبودوں کو پکارا جارہا ہے وہ ان کی عبادت کا انکار کردیں گے۔

(۱۵) یہ بھی ان کے گمراہ ترین ہونے کا ایک سبب ہے۔

(۱٦) پانچویں آیت ﴿ اَمَّنۡ یُّجِیۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاہُ ...الآیہ ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۱۷) یہ بڑا تعجب خیز معاملہ ہے کہ غیر اللہ کی عبادت کرنے والے اس حقیقت کو خوب پہچانتے ہیں بلکہ اس کا اقرار بھی کرتے ہیں کہ مضطرو بے کس کی دعا و پکار کو صرف اللہ تعالیٰ ہی سنتا اور پورا کرتا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ جب انہیں شدید قسم کی مشکلات درپیش ہوتی ہیں تو وہ سب کو فراموش کر کے خالص اللہ تعالیٰ کو پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔

(۱۸) نبی کریم ﷺ کا توحید کی حمایت کرنا، اور اللہ رب العزت کے ساتھ (استعمالِ الفاظ میں بھی) حسنِ ادب کا اظہار کرنا معلوم ہوا (اشارہ معجم طبرانی کی مذکورہ حدیث کی طرف ہے)



تمام معبودانِ باطلہ بے اختیار و بے بس ہیں

باب قول اللہ تعالیٰ :

﴿ اَیُشْرِکُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْئًا وَّھُمْ یُخْلَقُوْنَ ۝ وَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَھُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَھُمْ یَنْصُرُوْنَ ﴾ ①

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ''کیا ایسوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہ کرسکیں، اور وہ خود ہی پیدا کیے گئے ہوں. اور وہ ان کو کسی قسم کی مدد نہیں دے سکتے اور وہ خود اپنی بھی مدد نہیں کر سکتے''

کی تفسیر کا بیان

اس باب کو قائم کرنے سے ان لوگوں کی حالت کا بیان مقصود ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا پکارا جاتا ہے، خواہ وہ ملائکہ ہوں، انبیاء وصالحین علیہم السلام ہوں یا بزرگوں کی شکلوں پر تراشے گئے بت۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ وہ کسی نفع یا نقصان کے مالک نہیں، ان کے پاس پیدا کرنے، روزی دینے، یا اپنی اور اپنے پکارنے والوں کی مدد کا کوئی اختیار نہیں۔ اور پھر وہ خود مخلوق ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ خلاّق وعلاّم نے پیدا فرمایا...... اب ملاحظہ فرمائیے یہ سب (معبود) کس قدر ضعیف اور عاجز ہیں؟ اور جن کا یہ حال ہو، کیا وہ اِلٰہ بننے کے لائق ہیں؟ اکرم الخلائق محمد رسول اللہ ﷺ کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان غور وفکر کیلئے کافی ہے۔

مسئلۃ الباب کیلئے قرآنی آیات سے استدلال

﴿ قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا. قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللہِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا . اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللہِ وَرِسٰلٰتِہٖ ﴾ ②

''کہہ دیجئے کہ مجھے تمہارے کسی نقصان اور نفع کا اختیار نہیں۔ کہہ دیجئے کہ مجھے ہرگز کوئی اللہ تعالیٰ سے بچا نہیں سکتا اور میں ہرگز اس کے سوا کوئی جائے پناہ بھی پا نہیں سکتا۔ البتہ (میرا کام) اللہ تعالیٰ کی بات اور اسکے پیغامات (لوگوں کو) پہنچا دینا ہے''

نیز فرمایا: ﴿ قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللہُ وَلَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴾ ③

=

---

① (الاعراف : ۱۹۱،۱۹۲) ② (الجن : ۲۱تا۲۳) ③ (الاعراف : ۱۸۸)

قال وقوله تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَاۗءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۭ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۭ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴾ ①

''جنہیں تم اس کے سوا پکار رہے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار سنتے ہی نہیں، اور اگر (بالفرض) سن بھی لیں تو فریاد رسی نہیں کریں گے، بلکہ قیامت کے دن تمہارے اس شرک کا صاف انکار کر جائیں گے۔ آپ کو کوئی بھی حق تعالیٰ جیسا خبردار خبریں نہ دے گا''

=

''آپ فرما دیجئے کہ میں خود اپنی ذاتِ خاص کیلئے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا، مگر اتنا ہی کہ جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا ہو، اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیتا اور کوئی نقصان مجھ کو نہ پہنچتا۔ میں تو محض ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں''

مندرجہ ذیل فرمانِ باری تعالیٰ پر بھی غور کیجئے، اللہ تعالیٰ کے سوا پکارے جانے والے تمام شرکاء و انداد کس قدر کمزور نظر آ رہے ہیں۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَـيْـــًٔـا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ. وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ ②

''لوگو! ایک مثال بیان کی جا رہی ہے، ذرا کان لگا کر سن لو! اللہ تعالیٰ کے سوا جن جن کو تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی تو پیدا نہیں کر سکتے، گو سارے کے سارے ہی جمع ہو جائیں، بلکہ مکھی اگر ان سے کوئی چیز لے بھاگے تو یہ اسے بھی اس سے چھین نہیں سکتے، بڑا کمزور ہے طلب کرنے والا اور بڑا کمزور ہے وہ جس سے طلب کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے مرتبے کے مطابق اس کی قدر جانی ہی نہیں، اللہ تعالیٰ بڑا ہی زور و قوت والا اور غالب و زبردست ہے''

قوله: وقوله تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ.....

مفسرین کے کلام کے مطابق ان آیات میں بھی اللہ تعالیٰ ان تمام معبودوں کا عجز وضعف بیان فرما رہا ہے جنہیں اس کے سوا پکارا جاتا ہے، خواہ وہ ملائکہ اور انبیاء کرام علیہم السلام کی ذات ہی کیوں نہ ہو؛ کیونکہ ان

---

① (فاطر: ۱۳، ۱۴)　② (الحج: ۷۳)

معبودوں سے وہ تمام شرائط مفقود ومنتفی ہیں جن کا معبودِ حقیقی کے اندر پایا جانا ضروری ہوتا ہے، مثلاً ایک تو یہ کہ وہ ہر چیز کے مالک ہوں تاکہ انہیں پکارنے والا جس حاجت یا ضرورت کا سوال کرے وہ بلا روک ٹوک دے سکیں، دوسری یہ کہ وہ ہر پکارنے والی کی ہر پکار کو ہر وقت سننے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔
اور تیسری شرط یہ ہے کہ اس پکار کو قبول کرنے کی قدرت و طاقت رکھتے ہوں۔ لیکن مذکورہ بالا آیت کریمہ نے ہر ماسوی اللہ معبود سے تینوں چیزوں کی نفی کردی۔

جہاں تک مالک ہونے کا تعلق ہے تو آیتِ کریمہ نے صاف بتلا دیا کہ وہ تو ایک "قطمیر" "کھجور کی گٹھلی کے چھلکے" کے بھی مالک نہیں ہیں، مالکِ ارض وسماء ہونا تو بہت بڑی اور بہت دور کی بات ہے۔

اور سورۂ "سبا" کی آیت نمبر۲۲ میں تو یہ صراحت موجود ہے کہ وہ تمام آسمانوں اور زمینوں میں سے ایک ذرہ کے بھی مالک نہیں ہیں۔

جہاں تک سماعِ دعاء کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے ﴿ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَ كُمْ ﴾ فرما کر اس کی بھی نفی فرمادی؛ کیونکہ جنہیں پکارا جاتا ہے یا تو وہ اموات ہیں (یا جمادات) وہ بھلا کیسے سُن سکیں گے، یا وہ ملائکہ ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کی تفویض کردہ ڈیوٹیاں سرانجام دے رہے ہیں، اور اپنے احوال وامور میں منہمک ومشغول ہیں۔

واضح ہو کہ قبر پرست اس آیتِ کریمہ کو بتوں پر محمول کرتے ہیں، ان کے بقول اصنام یعنی بت سماع کی صلاحیت نہیں رکھتے، باقی انبیاء واولیاء اور ملائکہ تو سن سکتے ہیں؟ لیکن آیتِ کریمہ کا اگلا حصہ ان کے اس مفروضہ پر رد ہے، ﴿ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ﴾
"اگر بفرضِ محال سن بھی لیں تو قبول واستجابت کی طاقت نہیں رکھتے"

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ معاشرے کے جن افراد سے مخاطب ہے وہ صرف بت پرستی میں نہیں بلکہ ملائکہ، انبیاء اور صالحین سب کی عبادت کے مرتکب تھے، اللہ تعالیٰ نے بلا استثناء سب کی عبادت سے منع فرمایا اور کسی کی عبادت کی رخصت نہیں دی، نہ استقلالاً نہ وساطۃً۔ پھر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ ﴿ قیامت کے دن وہ تمہارے شرک کا انکار کردیں گے ﴾ ایک تو اس بات پر نصِ قطعی ہے کہ ان کا غیر اللہ کی عبادت کرنا (خواہ وہ کوئی بھی ہو) شرک ہے، دوسرا ان کا ان کی عبادت سے انکار کرنا، باوجودیکہ انہوں نے عبادت کی تھی اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں کچھ علم وشعور ہی نہ تھا، ان کے پوجنے کا احساس وادراک ہی نہ تھا۔ انکار کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دشمن بھی بن جائیں گے جیسا کہ سورۂ مریم میں فرمایا: =

قَالَ: وفی الصحیح :عن انس ﷺ قَالَ :شُجَّ النَّبِیُّ ﷺ یَوْمَ اُحُدٍ فَقَالَ: كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ شَجُّوْا نَبِيَّهُمْ ، فَنَزَلَتْ :﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ﴾ ①

صحیحین میں سیدنا انس بن مالک ﷺ سے مروی ہے ،فرماتے ہیں :''نبی ﷺ جنگِ احد میں زخمی ہو گئے ، پس آپ ﷺ نے فرمایا: وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جس نے اپنے نبی کو زخمی کر دیا ،اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی:

''اے پیغمبر آپ کے اختیار میں کچھ نہیں'' (آل عمران:۱۲۸)

=

﴿ كَلَّا سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴾ ②

''لیکن ایسا ہرگز ہونا نہیں ...... وہ تو ان کی پوجا سے منکر ہو جائیں گے ،اور الٹے انکے دشمن بن جائیں گے''

بلکہ اعلانیہ برأت ولاتعلقی کا اظہار بھی کر دیں گے۔

﴿ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴾ ③

''جس وقت پیشوا لوگ اپنے تابعداروں سے بیزار ہو جائیں گے اور عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور کل رشتے ٹوٹ جائیں گے''

سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ کا کلام کس قدر واضح اور مفصل ہے ،کیا یہاں کسی استدراک کی گنجائش ہے؟ افسوس صد افسوس! مشرکین کو اللہ تعالیٰ کے کلام میں کمی دکھائی دیتی ہے جو اپنے من پسند باطل عقیدوں پر مصر بھی ہیں، اور انتہائی سخیف قسم کی تاویلوں کے مرتکب بھی ہوتے رہتے ہیں۔ والعیاذ باللہ

آیتِ کریمہ ﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ﴾ سے مسئلۃ الباب کیلئے استدلال

قوله:وفی الصحیح :عن انس ﷺ قَالَ :......

یہ حدیث صحیح بخاری میں معلقاً جبکہ صحیح مسلم ،مسند احمد ، جامع ترمذی اور سنن نسائی میں موصولاً مروی ہے، ابن اسحاق نے ''کتاب المغازی'' میں اس قصہ کو قدرے تفصیل سے نقل کیا ہے ،فرماتے ہیں : نبی ﷺ کی داڑھ ٹوٹ گئی اور چہرہ زخمی ہو گیا ،آپ ﷺ کے چہرے پر خون بہہ رہا تھا ،آپ ﷺ خون صاف کر رہے تھے اور یہ فرما رہے تھے : وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کا چہرہ لہولہان کر دیا ، حالانکہ وہ نبی انہیں پروردگار کی طرف بلاتا ہے۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

① صحیح بخاری ، کتاب المغازی ۔صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر (امام بخاری نے اسے تعلیقاً ذکر کیا ہے)
② (مریم : ۸۲) ③ (البقرۃ : ۱٦٦)

ابن ہشام کی روایت کے مطابق آپ ﷺ کی نیچے کی داڑھ ٹوٹی اور نیچے کا ہونٹ زخمی ہوا۔ آپ ﷺ کو زخمی کرنے والا بدنصیب عبداللہ بن قمئہ تھا۔ ①
جس پر اللہ تعالیٰ نے ایک پہاڑی سانڈھ مسلط کر دیا جو اس وقت تک اسے ٹکریں مارتا، اور روندتا رہا جب تک اس کا پورا جسم ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو گیا۔ ②

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ واقعہ اس امر کی دلیل ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر بھی امراض و تکالیف اترتی ہیں، تاکہ وہ مزید عظیم الشان اجر وثواب کے مستحق بن سکیں، اور تاکہ ان کی اُمتوں کو بھی یہ بات معلوم ہو جائے اور بوقتِ ضرورت وہ بھی انبیاءِ کرام علیہم السلام کے اس اسوہ کو اپنا سکیں۔''

امام قرطبی فرماتے ہیں: ''اور اس لئے بھی کہ لوگ یہ جان لیں کہ انبیاءِ کرام علیہم السلام بھی بشر ہیں، ان پر بھی امتحان و آزمائشیں آتی ہیں، اور انکے مبارک اجسام بھی ان عوارض سے متأثر ہوتے ہیں، جن سے عام بشر کے اجسام متأثر ہوتے ہیں اور تاکہ لوگوں کو یقین آجائے کہ انبیاء علیہم السلام بھی مخلوق و مربوب ہوتے ہیں، ان کے ہاتھوں ظاہر ہونے والے معجزات جو محض اللہ تعالیٰ کی قدرت و توفیق سے ظاہر ہوتے ہیں سے کوئی دھوکہ نہ کھا جائے، جیسا کہ شیطانِ لعین نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے تعلق سے نصاریٰ کو اپنی تلبیس اور فریب سے گمراہ کر دیا۔

اس قصہ کے دروس میں سے پہلا درس تو یہ ہے کہ اکرم الخلائق محمد رسول اللہ ﷺ جنگِ احد کے موقعہ پر زخمی اور لہولہان ہوئے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنے نفس سے اس تکلیف کو نہ ٹال سکے، تو پھر کسی دوسرے کی تکلیف کیسے ٹال سکتے ہیں اور پھر کوئی دوسرا کسی کی تکلیف کیسے ٹال سکتا ہے؟

دوسرا درس یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان کی عدمِ فلاح کی بددُعا نہیں کی بلکہ یہ فرمادیا کہ یہ قوم فلاح نہیں پاسکتی، اللہ تعالیٰ نے اس پر بھی بذریعہ وحی یہ واضح کر دیا کہ یوں کہنے کا بھی آپ کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ان کا مالکِ امر ہے، چاہے انہیں ہلاک کر دے اور چاہے انہیں ہدایت دیکر مشرف باسلام ہونے کی توفیق عطا فرمادے، آپ تو بس دعوت و جہاد کے ذریعے اپنی ذمہ داری انجام دیتے رہیں۔
ابن اسحاق فرماتے ہیں: ''یعنی میرے بندوں پر حکم لگانے کا آپ کو کوئی اختیار نہیں، آپ تو ان کے تعلق سے صرف وہی کچھ کریں یا کہیں جو اللہ تعالیٰ حکم دے۔''

=

① یہ روایت شدید ضعیف ہے۔ ابن هشام (۳/ ۸۴، ۸۵......معلقا) ابن السکن نے اسے موصولا بیان کیا ہے، اسکی سند میں مصعب بن الاسقع ضعیف راوی ہے۔
② ضعیف۔ طبرانی کبیر (۷۵۹۶) اس کی سند میں حفص بن عمر العدنی ضعیف ہے۔

قال وفيه عن ابن عمر ﷺ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ فِي الرَّكْعَةِ الْاٰخِيْرَةِ مِنَ الْفَجْرِ ، اَللّٰهُمَّ الْعَنْ فُلَانًا وَّفُلَانًا وَفُلَانًا ، بَعْدَ مَايَقُوْلُ :سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ ، رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ ، فَاَنْزَلَ اللّٰهُ ﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ﴾ الى قوله ﴿فَاِنَّهُمْ ظَالِمُوْنَ﴾ وفي رواية: يَدْعُوْعَلٰى صَفْوَانَ بْنِ أُمَيَّةَ وَسُهَيْلِ بْنِ عَمْرٍو وَالْحَارِثِ بْنِ هِشَامٍ ، فنزلت ﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ﴾ الى قوله ﴿ فَاِنَّهُمْ ظَالِمُوْنَ ﴾ (1)

صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ،انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فجر کی نماز کی آخری رکعت میں رکوع سے سر اٹھا کر یہ کہتے ہوئے سنا: اے اللہ! فلاں ،فلاں اور فلاں پر لعنت فرما...... یہ بددعاء آپ ﷺ ،سمع الله لمن حمده ربنا ولك الحمد ، کہنے کے بعد فرماتے جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتِ کریمہ نازل فرمائی ﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ﴾ سے ﴿ فَاِنَّهُمْ ظَالِمُوْنَ ﴾ تک۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو اور حارث بن ھشام پر بددعا کرتے تھے جس پر آیتِ کریمہ ﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ﴾ نازل ہوئی۔

=

واضح ہو کہ اللہ عزوجل کے فرمان: ﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ﴾ کے شانِ نزول کے سلسلہ میں ایک اور حدیث وارد ہے، جسے مصنف رحمہ اللہ نے بھی ذکر فرمایا ہے۔

قوله: وفيه عن ابن عمر ﷺ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ......

نبی ﷺ کا فجر کی نماز میں قنوت پڑھنے اور بطور خاص تین مشرکین :صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو اور حارث بن ھشام پر لعنت کی بددعا کرنے کا واقعہ آپ ﷺ کے جنگِ احد میں زخمی ہونے اور دندانِ مبارک کے شہید ہونے کے بعد کا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے کسی پر لعنت فرمانے کا مطالبہ کرنے کا معنی یہ ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ اور اسکی رحمت سے دھتکار دیا جائے۔

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ نماز میں مشرکین کا نام لے کر بددعا کی جاسکتی ہے، اسی طرح کسی کیلئے نیک دعا مقصود ہو تو اس کا نام بھی لیا جاسکتا ہے، یہ چیز صحتِ نماز کے لئے مضر نہیں ہے۔

---

(1) صحیح بخاری ،کتاب المغازی (٤٠٦٩)

مذکورہ تین مشرکین پر بطور خاص لعنت کی بددعا کرنے کا سبب یہ ہے کہ یہ تینوں جنگِ اُحد میں رؤساءِ مشرکین شمار ہوتے تھے، آپ ﷺ کافی عرصہ بددعا کرتے رہے، مگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ کچھ اور تھا، اللہ تعالیٰ نے انہیں قبول ایمان اور سچی توبہ کی توفیق عطا فرمادی۔

اب ذرا غور کیجئے! ان کفار نے نبی ﷺ کے پیارے شہر مدینہ منورہ پر حملہ آور ہو کر اس کی حرمت کو پامال کیا، اور نبی ﷺ سے آمادۂ پیکار ہوئے، آپ ﷺ کا چہرہ مبارک شدید زخمی کر دیا، آپ ﷺ کے دندانِ مبارک شہید کر دیئے، آپ ﷺ کے کئی چچازادوں کو شہید کر دیا، آپ ﷺ کے چچا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا، کتنے انصار صحابہ کو شہید کر دیا، شہداءِ اُحد کی لاشوں کے مثلے کر دیئے، اور اپنے شرک وکفر پر اتراتے اور دندناتے پھر رہے ہیں، مگر نبی ﷺ اس قدر بے بس ہیں کہ اپنے صحابہ پر اترنے والی اس مشکل کے رفع وازالہ پر کوئی قدرت اور طاقت نہیں پاتے ......صرف ایک ہی حیلہ ہے اور وہ ہے اللہ رب العزت جو مالکِ نفع وضر ہے، کے دروازے پر دستک ...... یہ دستک آپ ﷺ نے اس طرح دی کہ فجر کا وقت جو "مَشْهُوْدٌ لَهٗ بِالْخَيْر" ہے، اور فجر کی نمازِ فرض جو بہت سے فضائل ومناقب کا منبع ہے میں ان کے نام لیکر جہراً بددعا فرمائی، اور پیچھے کھڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، ساداتِ اولیاءِ کرام رو رو کر آمین کہہ رہے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے یہ دعا بھی قبول نہ فرمائی بلکہ نبی ﷺ کو یہ بددعا کرنے سے یہ کہہ کر روک دیا کہ ﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ﴾ اور انہیں سچی توبہ کی توفیق دیکر حلقہ بگوشِ اسلام کر دیا۔

اب بتایئے! بھلا نبی ﷺ کے پاس کس کس قسم کا اختیار ہے؟ اگر کسی نفع وضر کا اختیار ہوتا تو آپ ﷺ جن مشرکین کے لئے بددعائیں فرما رہے ہیں خود ہی ان کے اعمالِ قبیحہ پر سزا دے دیتے، جس کے وہ اس وقت مستحق بھی تھے۔ اور جب اکرم الخلائق اور اشرف الانبیاء والرسل ﷺ کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے تو پھر قبر پرستوں کا اپنے بزرگوں، مجذوبوں اور فقیروں کے مالکِ نفع وضر ہونے کے عقیدہ کا کیا ٹھکانہ ہے؟ بلکہ وہ تو عملی طور پر انہیں ہر خشکی وتری اور غیبت وحضور میں پکارتے بھی رہتے ہیں۔ (والعیاذ باللہ)

ادھر اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں اپنے نبی ﷺ سے مخاطب ہے ﴿ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا○ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا○ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ﴾ ①

''کہہ دیجئے کہ، مجھے تمہارے کسی نقصان نفع کا اختیار نہیں۔ کہہ دیجئے کہ مجھے ہرگز کوئی اللہ تعالیٰ سے بچا نہیں سکتا، اور میں ہرگز اس کے سوا کوئی جائے پناہ پا بھی نہیں سکتا۔ البتہ میرا کام اللہ تعالیٰ کی بات اور اس کے پیغامات (لوگوں) کو پہنچا دینا ہے''

① (الجن: ۲۱تا۲۳)

قال وفیہ عن ابی ھریرۃ قَالَ :قَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ حِیْنَ أَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْہِ ﴿ وَأَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ ﴾ قَالَ :یَا مَعْشَرَ قُرَیْشٍ [اَوْ کَلِمَةً نَحْوَھَا] اِشْتَرُوْا اَنْفُسَکُمْ لَا اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا ، یَاعَبَّاسَ بْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ لَااُغْنِیْ عَنْکَ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا ، یَا صَفِیَّةَ عَمَّةَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ لَااُغْنِیْ عَنْکِ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا ، وَیَافَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ ﷺ سَلِیْنِیْ مِنْ مَّالِیْ مَاشِئْتِ لَااُغْنِیْ عَنْکِ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا . ①

صحیح بخاری میں ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ،فرماتے ہیں : جب اللہ نے نبی ﷺ پر آیتِ کریمہ :

﴿وَأَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ ﴾ ②

''اپنے قریبی رشتہ والوں کوڈرادیں''

نازل فرمائی۔

تو آپ ﷺ نے کھڑے ہوکرفرمایا:اے قریش کی جماعت !(یا اسی طرح کوئی دوسرا کلمۂ خطاب ارشادفرمایا)اپنی جانوں کوخریدلو ، میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے تمہاری کوئی کفایت نہ کرسکوں گا ، اے عباس بن عبدالمطلب ! میں تمہارے کسی کام نہ آؤں گا ،اے صفیہ ،رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی ! میں تمہارے کسی کام نہ آسکوں گا ،اے فاطمہ بنت محمد ﷺ ! میرے مال میں سے جو چاہو مانگ لو میں تمہارے کسی کام نہ آسکوں گا۔

صحیح بخاری کی یہ حدیث فقیہِ اُمت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ،ان کے نام کے بارے میں بہت اختلاف ہے ،اورتقریباتیس اقوال منقول ہیں ،سب سے اصح اورارجح قول یہ ہے کہ ان کا جاھلی نام عبدِشمس تھا ،اسلام قبول کرنے کے بعدعبدالرحمٰن یا عبداللہ رکھ دیا گیا ،ان کی کنیت ابوھریرۃ ، نبی ﷺ نے رکھی تھی ،ان کا یمن کے قبیلے بنودوس سے تعلق تھا ، بڑے فضلاء ،علماء ،فقہاء اورحفاظ صحابہ میں شمار ہوتے تھے ، نبی ﷺ کی سب سے زیادہ احادیث انہیں کوحفظ تھیں ،کتبِ ستہ میں ان کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار سے زائد ہے ، ۵۷ھ یا ۵۸ھ یا ۵۹ھ میں انتقال ہوا ،۷۸سال عمرپائی ،رضی اللّٰہ عنہ وارضاہ .

① صحیح بخاری ، کتاب التفسیر(٤٧٧١) صحیح مسلم ، کتاب الایمان (٢٠٦)

② (الشعراء : ٢١٤)

حدیث ''میں تمہارے کسی کام نہ آسکوں گا'' سے استدلال

مضمونِ حدیث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کو اپنی برادری کے لوگوں اور قریبی رشتہ داروں کو ڈارنے اور دعوت دینے کا حکم دیا، کیونکہ سب سے زیادہ دینی ودنیوی نیکی اور احسان کے مستحق قریبی رشتہ دار اور برادری والے ہی ہوتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ﴾ ①

''اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں''۔

آپ ﷺ تعمیل حکم بجالاتے ہوئے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ بخاری ومسلم کی ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہوکر یہ دعوت پیش فرمائی۔ ②

چنانچہ سب سے پہلے جماعتِ قریش کو خطاب فرمایا اور حکم دیا کہ اپنی جانوں کو خریدلو، خریدنے سے مراد انہیں جہنم سے بچانا ہے، قیمت خرید کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی توحید، اخلاصِ عبادت، ترکِ شرک، اور تمام اوامر ونواہی میں اس کی مکمل اطاعت!!

اس کے ساتھ ساتھ یہ واضح فرمادیا کہ اسباب وانسابِ دنیوی پر اعتماد سے کچھ حاصل نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ چیزیں جنت کے حصول اور جہنم سے بچاؤ کی قیمت نہیں بنتیں، اور نہ ہی میں محمد رسول اللہ ﷺ اکرم الخلائق، سردارِ اولادِ آدم ﷺ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچاؤ کے سلسلے میں تمہارے کسی کام آسکوں گا۔

یہاں تو حالت یہ ہے: ﴿ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴾ ③

''کہہ دیجئے! کہ مجھے تو خود اپنے رب کی نافرمانی کرتے ہوئے بڑے دن کے عذاب کا خوف لگتا ہے''

توجب آپ ﷺ اپنے نفس کے لئے کسی نفع یا نقصان کے مالک نہیں ہیں تو دوسروں کیلئے کیسے ہوسکتے ہیں؟

جہاں تک آپ ﷺ کی روزِ قیامت شفاعت کا معاملہ ہے تو اس کے بارے میں یہ بات معلوم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اذن وامر سے ہوگی، اور صرف ان لوگوں کیلئے ہوگی جن کیلئے اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ شفاعت کا معاملہ یوں ہرگز نہیں کہ آپ ﷺ جب چاہیں کرلیں اور جس کی چاہیں کرلیں۔ یہی بات آپ ﷺ نے اپنے چچا عباس، پھوپھی

---

① (تحریم: ٦)
② صحیح بخاری، کتاب التفسیر (٤٧٧٠) صحیح مسلم، کتاب الایمان (٢٠٨)
③ (الزمر: ١٣)

صفیہ اور بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہہ دی حالانکہ یہ سب وہ ہستیاں ہیں جن سے آپ ﷺ کو بے حد پیار ہے تو جب پیاروں کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو دوسروں کے ساتھ کیا نوعیت ہوگی! اور اولاد کا حق تو بہت زیادہ اور سب سے مقدم ہوتا ہے۔ البتہ آپ ﷺ نے دنیا کے تعلق سے فرمادیا کہ میرے مال میں سے جو چاہو طلب کرلو، تمہیں دے دونگا۔ مسند احمد کی ایک حدیث میں ارشاد گرامی ہے : [أَلَا إِنَّ لَكُمْ رَحِماً سَأَبُلُّهَا بِبِلَالِهَا]

''تم سب کی مجھ سے رشتہ داریاں ہیں جنہیں دنیا کے اندر میں جوڑے رکھوں گا اور نبھاتا رہونگا......''

لیکن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچاسکوں گا...... جنت میں داخل نہیں کراسکوں گا، اللہ تعالیٰ کا قرب نہیں دلاسکوں گا۔ اس تمام غایت ومرام کے حصول کے لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا ہوگی۔

نبی ﷺ کے اس مقام کی معرفت کے بعد ذرا صاحبِ ''البردۃ'' کے شعر پر غور کیجئے، کتنا تناقض وتضاد دکھائی دے گا۔

فان من جودك الدنيا وضرتها ومن علومك علم اللوح والقلم

یہ دنیا وآخرت تمام کی تمام آپ ہی کی سخاوت کا فیض ہیں، اور لوح وقلم کا مکمل علم آپ کے پاس ہے۔

(فإلى الله المشتكى)

نبی ﷺ دن رات کیا اعلان فرمارہے ہیں: ﴿ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴾ ①

''آپ ﷺ فرمادیجئے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لئے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا، اور نہ کسی ضرر کا، مگر اتنا ہی کہ جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا ہو اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کرلیتا، اور کوئی نقصان مجھ کو نہیں پہنچتا۔ میں تو محض ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں''

ان کے قلوب وعقول کس قدر پراگندگی کا شکار ہیں کہ کلام رب العالمین اور کلامِ رسولِ امین ﷺ کو چھوڑ کر محض شیطانی وساوس پر اکتفاء وارتکاز کیئے بیٹھے ہیں۔ انہیں اندازہ ہی نہیں کہ شیطان قیامت کی چال چل گیا، اس نے شرک کی کالک کو انبیاء وصالحین علیہم السلام کی محبت وتعظیم کی ملمع سازی، جبکہ توحید واخلاص کے نور کو انبیاء وصالحین کی گستاخی اور بغض کا رنگ دیکر انہیں پوری طرح اپنے جال میں پھنسالیا........ یہ لوگ بزعمِ خویش انبیاء وصالحین علیہم السلام کی تنقیص وتوہین کے ڈر سے بھاگتے ہیں لیکن انہیں پتا ہی نہیں چل پاتا کہ وہ رب الأرباب اور مالکِ ارض وسماء اللہ جل جلالہ کی توہین وتنقیص اور حق تلفی جیسے خطرناک عمل کے مرتکب ہوچکے

① (الاعراف: ۱۸۸)

ہیں، بلکہ انبیاء وصالحین علیہم السلام کی توہین کے بھی۔ اللہ تعالیٰ کی توہین یوں کہ انہوں نے مخلوق ضعیف وعاجز کو خالق ومالک وقادر جیسا قرار دیا۔ کیا خالق مخلوق جیسا ہے؟ اور ذاتِ وحدہ لاشریک کی حق تلفی یوں کہ ہر قسم کی عبادت اللہ تعالیٰ کا حق ہے، انہوں نے مختلف عبادات غیر اللہ کے نام الاٹ کردیں۔ اس طرح خالقِ کائنات کا حقِ عبادت تلف کرنے کی کوشش کی۔

انبیاء وصالحین علیہم السلام کی توہین وتنقیص یوں کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ انبیاء وصالحین علیہم السلام انکے شرک سے خوش ہیں، حالانکہ وہ ناراض ہیں اور توحیدِ خالص کا حکم دیتے ہیں، انہوں نے ان کی نافرمانی کرکے انکی تنقیص شان کی ہے، بھلا نافرمانی کرنے سے بڑی کوئی گستاخی ہے؟؟

قارئین کرام حدیثِ باب، اجتہادِ عمل وعبادت کی دعوت دیتی ہے اور یہ کہ بندہ دنیوی اسباب وانساب اور اشخاص پر بھروسہ نہ کرے۔ امام الانبیاء ﷺ نے اپنی بیٹی، چچا، پھوپھی اور پھر پوری برادری کو خطاب فرما کر یہ نکتہ ظاہر وعیاں فرمادیا کہ روزِ آخرت دنیوی علائق، حتی کہ افضل البشر محمد ﷺ کی بیٹی، چچا، پھوپھی یا دیگر تعلق دار ہونا کام نہیں آئے گا، بلکہ اخلاصِ توحید اور آپ ﷺ کی کامل اور سچی متابعت ہی نجات دہندہ ثابت ہوگی۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''فلاں شخص کی آل میرے دوست نہیں ہیں، میرے دوست تو اللہ تعالیٰ اور نیک عمل کرنے والے مسلمان ہیں'' ①

مسند عبد بن حمید کی ایک مرسل روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے اپنے انتقال سے قبل اپنے اہل بیت کو جمع کرکے فرمایا تھا: ''تم میں سے میرے دوست صرف وہ ہونگے جو پرہیزگار ہونگے۔''

نیز فرمایا تھا: کہ ''ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ قیامت کے دن اپنے سروں پر آخرت کی کمائیاں لیکر آئیں، اور تم دنیا کے بوجھ لادے چلے آؤ'' ② (والله ولي التوفيق)



① صحيح مسلم، كتاب الايمان (٢١٥)۔

② یہ حدیث مرسل ہے۔ الدر المنثور (٥/٦٩)۔

اس باب کے مسائل

(۱) سورۃ الاعراف اور سورۃ فاطر کی آیتوں کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) غزوۂ احد کا قصہ معلوم ہوا۔

(۳) سید المرسلین ﷺ کا قنوتِ نازلہ پڑھنا، اور آپ ﷺ کے پیچھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو ساداتِ اولیاء کرام ہیں کا آمین کہنا۔

(۴) جن کے لئے بددعا کی گئی وہ سب کے سب کافر تھے۔

(۵) ان کفار نے نبی ﷺ کے ساتھ وہ سلوک کیا جو دیگر کفار نہ کر سکے، مثلاً: آپ ﷺ کو زخمی کرنا، آپ ﷺ کے قتل کی کوشش کرنا، پھر شہداءِ احد کی لاشوں کا مثلہ کرنا حالانکہ وہ انکے کے چچازاد تھے۔

(۶) اس سب کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر وحی نازل کی کہ: ﴿ لَيۡسَ لَكَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَيۡءٌ ﴾ ''اس امر کا آپ کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے''

(۷) اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے ''ان کی توبہ قبول کرلے، یا انہیں مبتلائے عذاب کردے۔'' اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرلی، اور وہ ایمان لے آئے۔

(۸) حوادث ومصائب کے نزول پر قنوتِ نازلہ کا اہتمام مشروع ہے۔

(۹) نماز میں قنوتِ نازلہ میں جن پر بددعا کی جارہی ہے ان کے اور ان کے آباؤاجداد کے نام لینا جائز ہے۔

(۱۰) قنوتِ نازلہ میں کسی متعین شخص کا نام لیکر لعنت کی بددعا کی جاسکتی ہے۔

(۱۱) اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ ﴾ کے نزول کے بعد آپ ﷺ کا اپنے اقارب کو ڈرانے کا واقعہ معلوم ہوا۔

(۱۲) آپ ﷺ نے جس طرح توحیدِ خالص کی دعوت دی، اس سبب سے آپ ﷺ کو مجنون کہہ کر پکارا گیا، مگر اس کے باوجود آپ ﷺ دعوت کے لئے کوشش فرماتے رہے۔ آج بھی اگر کوئی مسلمان توحیدِ خالص کی دعوت لیکر اٹھتا ہے تو اسے ان القاب سے نوازا جاتا ہے۔

(۱۳) رسول اللہ ﷺ کا ہر دور وقریب کے رشتہ دار سے یہ کہنا کہ ''میں تمہارے کسی کام نہ آسکونگا'' حتیٰ کہ آخر میں سیدہ فاطمہ بنت محمد ﷺ سے کہہ دینا کہ ''میں تمہارے بھی کسی کام نہ آسکونگا'' بہت قابل غور ہے، جب آپ ﷺ جو کہ سید المرسلین ہیں، فاطمہ رضی اللہ عنہا سے جو کہ سیدۃ نساء الصالحین ہیں، کچھ کفایت نہیں کر سکتے ،اور ہمارا ایمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ حق کے علاوہ کچھ نہیں فرماتے ......ان تمام حقائق کے ادراک کے بعد آج کے دور میں ''خواص'' کے دلوں میں جو نظریات وامیدیں وابستہ ہیں ان پر غور کریں تو حقیقتِ توحید واضح ہوگی ،ساتھ ساتھ دین کی غربت ،اجنبیت اور بے بسی بھی عیاں ہوگی ۔(واللہ المستعان)



فرشتوں کے عجز وخوف سے استدلال توحید

باب قول اللہ تعالیٰ:

﴿ حَتّٰى إِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ قَالُوا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ﴾ ①

''یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کردی جاتی ہے تو پوچھتے ہیں تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ جواب دیتے ہیں کہ حق فرمایا، اور وہ بلند وبالا، اور بہت بڑا ہے''

کی تفسیر کا بیان

اللہ تعالیٰ کے سوا جن جن کو بھی پکارا جاتا ہے ان میں سے سب سے قوی، پُر ہیبت اور زبردست مخلوق ملائکہ ہیں۔ مصنف رحمہ اللہ اس باب میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ذرا ملائکہ کی اللہ تعالیٰ کے سامنے حالت زار ملاحظہ کیجئے، دیکھیے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور خشیت کا کیا عالم طاری ہے؟ جن کی بے بسی کی یہ کیفیت ہے، انہیں اگر کوئی پکارتا ہے تو آخر کیوں پکارتا ہے؟ جب ملائکہ کرام اس لائق نہیں کہ انہیں پکارا جائے، تو پھر دوسرے اموات واصنام جو قوت اور طاقت، بلکہ کسی بھی صفت میں ملائکہ کے قریب تک نہیں پھٹکتے، کیسے پکارے جانے کے قابل ہو سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ. لَا يَسْبِقُوْنَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُوْنَ. يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُوْنَ ﴾ ②

''(مشرک لوگ) کہتے ہیں کہ رحمٰن کی اولاد ہے (غلط ہے) اس کی ذات پاک ہے بلکہ وہ سب اس کے باعزت بندے ہیں۔ کسی بات میں اللہ تعالیٰ پر پیش دستی نہیں کرتے بلکہ اس کے فرمان پر کاربند ہیں۔ وہ انکے آگے پیچھے کے تمام امور سے واقف ہے، وہ کسی کی بھی سفارش نہیں کرتے بجز انکے جن سے اللہ تعالیٰ خوش ہو، وہ تو خود ہیبت سے لرزاں وترساں ہیں''

اب جبکہ ملائکہ کی یہ حالت وصفت ہے تو ان کا ربوبیت والوہیت میں کیا حصہ ہوسکتا ہے؟ جب ان کا کوئی حصہ نہیں تو کسی دوسرے کا کیا حصہ ہوسکتا ہے؟

نزولِ وحی کے وقت فرشتوں کا خوف

اس آیتِ کریمہ میں اللہ رب العزت نے ملائکہ کے دلوں سے جس گھبراہٹ کے زائل ہونے کا ذکر کیا ہے، یہ وہ گھبراہٹ ہے جو انہیں اللہ تعالیٰ کے وحی فرمانے یا کسی امر کو جاری فرمانے پر لاحق ہوتی ہے۔ =

① (سبا: ۲۳) ② (الانبیاء: ۲۶، ۲۸)

قال :فی الصحیح عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قَالَ : " اِذَا قَضَی اللّٰہُ الْاَمْرَ فِی السَّمَاءِ ضَرَبَتِ الْمَلَائِکَۃُ بِاَجْنِحَتِھَا خُضْعَانًا لِقَوْلِہٖ ، کَاَنَّہٗ سِلْسِلَۃٌ عَلٰی صَفْوَانٍ یَنْفُذُھُمْ ذٰلِکَ ﴿حَتّٰی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِھِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّکُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَھُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ﴾ فَیَسْمَعُھَا مُسْتَرِقُ السَّمْعِ ، وَمُسْتَرِقُ السَّمْعِ ھٰکَذَا بَعْضُہٗ فَوْقَ بَعْضٍ ، وَصَفَہٗ سُفْیَانُ بِکَفِّہٖ فَحَرَّفَھَا وَبَدَّدَ بَیْنَ اَصَابِعِہٖ فَیَسْمَعُ الْکَلِمَۃَ فَیُلْقِیْھَا اِلٰی مَنْ تَحْتَہٗ ثُمَّ یُلْقِیْھَا الْاٰخَرُ اِلٰی مَنْ تَحْتَہٗ حَتّٰی یُلْقِیْھَا عَلٰی لِسَانِ السَّاحِرِ وَالْکَاھِنِ فَرُبَمَا اَدْرَکَہُ الشِّھَابُ قَبْلَ اَنْ یُّلْقِیَھَا وَرُبَمَا اَلْقَاھَا قَبْلَ اَنْ یُّدْرِکَہٗ فَیَکْذِبُ مَعَھَا مِئَۃَ کَذِبَۃٍ فَیُقَالُ اَلَیْسَ قَدْ قَالَ لَنَا یَوْمَ کَذَا وَکَذَا فَیُصَدَّقُ بِتِلْکَ الْکَلِمَۃِ الَّتِیْ سُمِعَتْ مِنَ السَّمَاءِ . "[1]

صحیح بخاری میں سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ آسمانوں میں کسی فیصلے کو صادر فرماتا ہے تو ملائکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے شدتِ رعب وہیبت کی بناء پر اپنے پر مارتے ہیں، جس سے ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسی کسی صاف اور ملائم پتھر پر زنجیر کے ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے، (پھر) اللہ رب العزت اپنا وہ فیصلہ ملائکہ کے دلوں میں القاء فرما دیتا ہے ''پھر جب ان کے دلوں سے خوف اور گھبراہٹ کے آثار چھٹ جاتے ہیں تو وہ پوچھتے ہیں تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ (پھر) کہتے ہیں کہ پروردگار نے حق فرمایا، اور وہ بڑا بلند، اور بہت بڑا ہے''

=

''ملائکہ کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وہیبت کے جاگزیں ہونے کے تعلق سے یہ ایک بڑا عظیم مقام ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ جب اپنی وحی کلام فرماتا ہے تو تمام آسمان والے اللہ تعالیٰ کا وہ کلام سنتے ہیں اور ہیبت کی وجہ سے ان پر رعدہ یعنی کپکپی طاری ہو جاتی ہے حتی کہ بے ہوشی کی سی کیفیت بن جاتی ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیتِ کریمہ کا یہی مفہوم بیان فرمایا ہے۔''

پھر جب ملائکہ کی غشی کی وہ کیفیت چھٹتی ہے تو پوچھتے ہیں: پروردگار نے کیا فرمایا ہے؟ دوسرے ملائکہ جواب دیتے ہیں: پروردگار نے حق فرمایا ہے۔ تو اس آیتِ کریمہ سے اللہ تعالیٰ کی اس ہیبت وتعظیم کا اندازہ ہوتا ہے جو ملائکہ کے دلوں میں پیوست ہے۔ آیتِ کریمہ کا یہ مفہوم بہت سی احادیث میں مذکور ہے مصنف رحمہ اللہ نے دو احادیث ذکر فرمائی ہیں:

[1] صحیح بخاری ، کتاب التفسیر (۴۷۰۱)

پس (ملائکہ جب اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کی بابت گفتگو کر رہے ہوتے ہیں) تو اسے وہ شیاطین سنتے ہیں جو آوازوں کو اُچکنے اور چُرانے کے لئے وہاں بیٹھے ہوتے ہیں۔اور یہ آوازوں کو اُچکنے اور چُرانے والے شیاطین اوپر تلے نیچے بیٹھے ہوتے ہیں۔سفیان (راوی حدیث) نے اپنے ہاتھ کو موڑ کر اور ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر یہ بات بتائی۔شیاطین اس کلمے کو سن کر اپنے سے نیچے والوں کو بتاتے ہیں،حتی کہ یہ سلسلہ چلتے چلتے زمین پر موجود ساحر اور کاہن تک پہنچ جاتا ہے۔بعض اوقات جادوگروں پر القاء سے قبل ہی شہابِ ثاقب (دہکتا ہوا انگارہ) انہیں دبوچ لیتا ہے اور بعض اوقات شہابِ ثاقب کے پہنچنے سے قبل وہ اس بات کو جادوگروں تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، پھر وہ جادوگر اس میں سو جھوٹ شامل کر کے لوگوں کو بتاتے ہیں۔لوگ ان کے بارے میں یہ بات کہتے ہیں کہ اس جادوگر نے فلاں دن فلاں بات کہی تھی جو سچ نکلی، چنانچہ آسمان سے سنی ہوئی اس ایک سچی بات کی بناء پر ان کے تمام جھوٹوں کی تصدیق کر دی جاتی ہے۔''

قوله :وفي الصحيح عن ابي هريرة ﷺ عن النبي ﷺ قَالَ :......

اس حدیث میں بھی ملائکہ کے اس خوف و ہیبت کا ذکر موجود ہے جو اللہ تعالیٰ کے وحی فرمانے کے موقعہ پر ان کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ابوداؤد کی ایک حدیث جو سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷺ سے مرفوعاً مروی ہے، میں یہ الفاظ ہیں ''جب اللہ تعالیٰ وحی کلام فرماتا ہے تو آسمانِ دنیا والے ایک آواز سی سنتے ہیں جیسی سنگِ مرمر پر زنجیر مارنے سے پیدا ہوتی ہے وہ آواز سنتے ہی فرشتے بے ہوش ہو جاتے ہیں....'' (الحدیث) ①

فرشتوں کے خوف سے توحید پر استدلال

ملائکہ سب سے طاقتور مخلوق ہے اور ان کے خوف و ہیبت کا یہ عالم ہے تو پھر یہ معبود کیسے ہو سکتے ہیں؟

ہوش میں آنے کے بعد ملائکہ پوچھتے ہیں کہ پروردگار نے کیا فرمایا، دوسرے ملائکہ جواب دیتے ہیں کہ حق فرمایا، کیونکہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حق کے سوا کچھ نہیں فرماتا۔

ان کا یہ اعتراف بھی ان کے خوف کا مظہر ہے، دوسری طرف انسانوں کی جرأت و جسارت انتہائی افسوسناک ہے جو محض مذہبی تعصبات کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر دوسروں کی آراء کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس حدیث میں دوسرا مسئلہ یہ مذکور ہے کہ جب ملائکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے ایک دوسرے کو آگاہ کرتے

① اس کی سند صحیح ہے۔سنن ابی داؤد (٤٧٢٣) الفتح (٤٥٦/١٣)۔

نیں تو وہاں موجود شیاطین اسے اُچکنے کی کوشش کرتے ہیں، مزید تفصیل یوں وارد ہوئی ہے کہ ملائکہ بادلوں میں اترتے ہیں اور اس امر کا تذکرہ کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسمانوں میں صادر ہوا، اور شیطان وہاں سے اُچکنے کی کوشش کرتے ہیں ①

جس کا معنی یہ ہوا کہ شیاطین ملائکہ کی گفتگو بادلوں میں سنتے ہیں، شیاطین یہ گفتگو اس لئے سنتے ہیں تاکہ زمین پر موجود اپنے چیلوں یعنی کاہنوں اور جادگروں کو اس سے آگاہ کریں اور ان کا مقصد چونکہ فساد فی الارض اور تضلیلِ خلق ہوتا ہے، لہذا وہ سینکڑوں جھوٹ شامل کر کے لوگوں کے عقائد پر وار کرتے ہیں۔

مسند احمد، صحیح مسلم، ترمذی اور نسائی وغیرہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ''ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کچھ صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک ستارہ گرا جس سے کچھ روشنی پیدا ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم جاہلیت میں اس طرح ستارہ گرنے سے کیا مراد لیتے تھے؟'' صحابہ نے عرض کیا: جب کبھی کوئی ستارہ گرتا تو ہم کہا کرتے: یا تو کوئی عظیم انسان پیدا ہوا ہے یا کوئی عظیم انسان فوت ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ یہ ستارہ کسی کے مرنے یا پیدا ہونے پر نہیں گرتا بلکہ ہمارا پروردگار جب کسی امر کا فیصلہ فرماتا ہے تو حاملین عرش ملائکہ تسبیح میں مشغول ہو جاتے ہیں، پھر وہ فرشتے تسبیح کرنے لگتے ہیں جو حاملین عرش کے قریب ہوتے ہیں، پھر وہ قریب والے فرشتے حاملینِ عرش فرشتوں سے پوچھتے ہیں: پروردگار نے کیا فرمایا؟ تو حاملینِ عرش فرشتے انہیں اللہ کے فیصلے سے آگاہ کرتے ہیں، اسی طرح ہر آسمان والے فرشتے دوسرے آسمان والے فرشتوں کو بتاتے ہیں، حتی کہ یہ خبر آسمانِ دنیا تک پہنچ جاتی ہے، وہاں سے شیاطین سن کر زمین تک وہ خبر پہنچاتے ہیں، پس جو خبر بعینہ پہنچا دیں وہ حق ہوتی ہے، مگر وہ تو اس خبر میں تبدیلیاں بھی کرتے ہیں اور اضافے بھی'' ②

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ دورِ جاہلیت کے حوالے سے خبر ہے، پھر جب نبی ﷺ کی بعثت ظہور میں آگئی تو معاملہ سخت پہرے میں دیدیا گیا۔''

واضح ہو کہ ستاروں کے گرائے جانے کی خبر اس بات کی دلیل ہے کہ وہ جس مقصد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں وہی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے بھی (مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ) فرما کر یہ واضح کر دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے امر کے تابع اور مسخر ہیں۔

① صحيح بخاري، كتاب بدء الخلق، رقم (٢٢١٠)۔
② صحيح مسلم، كتاب السلام، رقم (٢٢٩)۔

....

....

....

....

....

....

....

....

اس تفصیل سے مقصود ان نجومیوں کا رد ہے جو خیر وشر اور عطاء ومنع کو ستاروں کی طرف منسوب کرتے ہیں، چنانچہ کچھ کو نیک بختی کی علامت قرار دیتے ہیں اور کچھ کو نحوست کی۔ اسی طرح ستاروں کی برجوں کو موافق یا مخالف قرار دیکر فیصلے صادر کرتے ہیں۔

مذکورہ تمام احادیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ زمین پر موجود ساحر و کاہن شیاطین کے دوست ہیں جو باہم ملکر اللہ تعالیٰ کے بندوں کو گمراہ اور مبتلائے فتنہ کرنے کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اور لوگ، جو (کتاب وسنت کے علم سے عاری ہوتے ہیں) ان کے ہر صدق وکذب کی تصدیق کر کے خوب دھوکا کھاتے رہتے ہیں۔

نبی ﷺ نے کاہنوں کی تصدیق کرنے والوں کی جملہ عبادات کے مردود ہونے کی وعید شدید سنائی ہے۔

یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ کاہنوں کی کسی بات کا درست نکل آنا ان کے علم غیب جاننے کی دلیل نہیں ہے، بلکہ وہ درستگی ان کے دوست شیاطین کی اچکی ہوئی خبر کی بناء پر ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

یارسول اللہ ﷺ یہ کاہن بعض اوقات کوئی خبر دیتے ہیں اور وہ سچ نکلتی ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ سچ جنوں کی اُچکی ہوئی خبر کی بناء پر ہے جسے وہ کاہن کے کان میں ڈالتے ہیں اور کاہن اس میں سو جھوٹ ملا دیتا ہے'' ①

اس سے ثابت ہوا کہ اگر کسی چیز میں قدرے حق نظر آرہا ہو تو وہ اس کے مکمل حق ہونے کی دلیل نہیں ہے، مکمل حق تو وہ ہے جس کی شریعت سے موافقت ہو۔

---

① صحیح بخاری، کتاب الادب، رقم (٦٢١٣) صحیح مسلم، کتاب السلام، رقم (٢٢٢٨)

وعن النواس بن سمعان ﷺ قال :قال رسول الله ﷺ :"إذا أراد الله تعالى أن يوحي بالأمر تكلم بالوحي أخذت السموات منه رجفة [أو قال رعدة] شديدة خوفا من الله عز وجل فإذا سمع ذلك أهل السموات صعقوا وخروا لله سجدا، فيكون أول من يرفع رأسه جبريل، فيكلمه الله من وحيه بما أراد ثم يمر جبريل على الملائكة، كلما مر بسماء يسأله ملائكته ماذا قال ربنا ياجبريل ؟ فيقول جبريل :قال :الحق وهو العلي الكبير قال :فيقولون كلهم مثل ما قال جبريل، فينتهي جبريل بالوحي إلى حيث أمره الله عز وجل " ①

نواس بن سمعان ﷺ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جب اللہ تعالیٰ کسی امر کی وحی کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اس وحی کا کلام فرماتا ہے جسے سن کر آسمان اللہ تعالیٰ سے شدتِ خوف کی بناء پر کانپنے لگتے ہیں، پھر جب آسمان کے فرشتے سنتے ہیں تو ان پر بے ہوشی طاری ہوجاتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کیلئے سجدے میں گر جاتے ہیں، پھر سب سے پہلے جبریل امین اپنا سر اٹھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جو وحی چاہتا ہے، کلام فرماتا ہے، پھر جبریل امین اس وحی کو لیکر ملائکہ کے پاس سے گزرتے ہیں اور جس آسمان سے گزرتے ہیں وہاں کے فرشتے پوچھتے ہیں: ہمارے پروردگار نے کیا فرمایا: جبریل امین فرماتے ہیں: حق فرمایا، اور وہ بلند اور بڑا ہے، پھر تمام فرشتے وہی الفاظ دہراتے ہیں جو جبریل امین نے کہے ہوتے ہیں، پھر جبریل امین اس وحی کو لیکر وہاں پہنچتے ہیں جہاں پہنچنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہوتا ہے۔‘‘

حدیثِ نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ اور اس کی شرح

یہ حدیث اللہ رب العزت اور اس کی وحی کی عظمت اور ہیبت کی زبردست دلیل ہے، یعنی اس کے ارادہ وحی سے آسمانوں پر کپکپاہٹ طاری ہوجاتی ہے۔

ابن ابی حاتم میں عکرمہ کا قول ہے کہ، زمین اور پہاڑ بھی کانپ اٹھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ فرشتوں کا بے ہوش ہونا اور سجدے میں گر جانا بھی اللہ تعالیٰ کے امر کی عظمت وہیبت کی دلیل ہے۔

اب ملائکہ اتنی قوی اور عظیم مخلوق ہیں، بلکہ جن جن کو اللہ کے سوا پکارا جاتا ہے ان میں سب سے اقوی، اشد اور اعظم ملائکہ ہیں، ملائکہ کی قوتِ عظیمہ کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے

① ضعیف. رواہ ابوزرعة في تاریخه (۱/ ۶۲۱) اس کی سند میں نعیم بن حماد ضعیف ہے، اور ولید بن مسلم مدلس ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''میں نے جبریل امین کو ان کی اصل صورت میں دیکھا انکے چھ سو پر تھے، ہر پر اُفق کو ڈھانپے ہوئے تھا...'' (الحدیث) ①

جب سب سے اقوی مخلوق کے خوف، خضوع وہیبت کا یہ عالم ہے تو پھر کون ہے جو عبادت کے لائق ہو؟ پھر مشرکین انہیں کیوں پکارتے ہیں؟ اور ان سے عند اللہ شفاعت کے کیوں امیدوار ہوتے ہیں؟ اور غور کریں کہ ملائکہ زندہ ہیں، بولتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے مقرب ہیں، ان تمام حقیقتوں کے باوجود انہیں پکارنا اور ان کی شفاعت کا امیدوار ہونا، باطل ہے تو پھر وہ جو مردہ ہیں، سن نہیں سکتے اور کسی نفع ونقصان کے مالک نہیں ہیں، انہیں پکارنا کیسے جائز اور قرین عقل ہوسکتا ہے؟

ملائکہ کی شفاعت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴾ ②

''اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی مگر یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خوشی اور اپنی چاہت سے جس کے لئے چاہے اجازت دیدے۔''



① مسند احمد (٤٣٩٦، ج٢) صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق (٣٢٣٢) صحیح مسلم، کتاب الایمان (١٧٤) بخاری ومسلم میں یہ الفاظ ہیں "ان النبی ﷺ رأى جبريل له ستة مائة جناح"

② (النجم: ٢٦)

اس باب کے مسائل

(۱) سورۂ سبأ کی آیت کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) اس آیت کے تعلق سے یہ زبردست حجت سامنے آئی کہ بالخصوص نیک لوگوں کے تعلق سے شرک کتنا بڑا باطل ہے۔اس آیت کریمہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ دل سے شرک کی جڑیں کاٹنے والی ہے

(۳) اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۴) فرشتوں کا یہ پوچھنا کہ ''تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا'' کا سبب معلوم ہوا

(۵) جبریل امین فرشتوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ، یہ فیصلہ فرمایا ہے۔

(۶) یہ بات معلوم ہوئی کہ سجدے سے سب سے پہلے جبریل امین اپنا سر اٹھاتے ہیں، (جو ان کی افضلیت کی دلیل ہے)۔

(۷) یہ بات معلوم ہوئی کہ جبریل امین تمام آسمانوں کے تمام فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی وحی سے آگاہ کرتے ہیں، کیونکہ ان سے تمام فرشتے سوال کرتے ہیں۔

(۸) یہ بات معلوم ہوئی کہ تمام آسمانوں کے تمام فرشتے بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

(۹) اللہ تعالیٰ کے کلام سے آسمانوں کا لرزنا اور کانپنا معلوم ہوا۔

(۱۰) یہ بات معلوم ہوئی کہ وحی پہنچانے پر جبریل امین مامور ہیں۔

(۱۱) یہ بات معلوم ہوئی کہ شیاطین آسمان کی خبروں کو چراتے ہیں۔

(۱۲) یہ بات معلوم ہوئی کہ شیاطین خبروں کو اُچکنے کیلئے کس طرح ایک دوسرے پر سوار ہوتے ہیں۔

(۱۳) شیاطین پر شہابِ ثاقب کا چھوڑا جانا معلوم ہوا۔

(۱۴) یہ بات معلوم ہوئی کہ بعض اوقات شہابِ ثاقب، شیطان کو کاہن تک خبر پہنچانے سے قبل دبوچ کر جلا ڈالتا ہے، اور بعض اوقات شیطان، شہابِ ثاقب کے پہنچنے سے قبل کاہن کے کان میں خبر القاء کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

(۱۵) یہ بات معلوم ہوئی کہ بعض اوقات کاہن بھی سچ بول جاتا ہے۔

(۱۶) یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ ایک سچی خبر کے ساتھ سو جھوٹ ملاتا ہے۔

(۱۷) کاہن کے تمام جھوٹوں کی تصدیق صرف ایک سچی بات کی بناء پر کی جاتی ہے جو آسمانوں سے سنی جاتی ہے۔

(۱۸) لوگ باطل پر کس قدر اعتماد کرتے ہیں اور کتنی جلدی قبول کر لیتے ہیں، چنانچہ صرف کاہن کے بولے ہوئے ایک سچ کو پکڑے رہتے ہیں اور اس کے سو جھوٹوں کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ (لیکن قرآن وحدیث جو کہ مرقعِ حق ہیں کی طرف کوئی التفات نہیں) فإلی اللہ المشتکیٰ۔

(۱۹) شیطانوں اور کاہنوں کا ایک دوسرے سے آسمانوں سے سنی ہوئی وہ بات حاصل کرنا، اسے یاد کر لینا اور اس کے ساتھ استدلال کرنا معلوم ہوا۔

(۲۰) اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا اثبات سامنے آیا، (مثلاً صفتِ ارادہ، صفتِ کلام وغیرہ) اشاعرہ اور معطلہ ان صفات کو نہیں مانتے۔

(۲۱) آسمانوں پر لرزہ اور فرشتوں پر غشی طاری ہونا، اللہ تعالیٰ کے خوف کی بناء پر ہے

(۲۲) یہ بات معلوم ہوئی کہ تمام فرشتے اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدے میں گر جاتے ہیں۔



باب الشفاعة

شفاعت کا بیان

مشرکین کا اصل شرک شفاعت کے تعلق سے ہے

دورِ قدیم وجدید کے مشرکین کے مبتلائے شرک ہونے کا ایک بہت بڑا سبب ان کا شفاعت کے ساتھ تعلق ہے، جس کا مفہوم ان کے نزدیک یہ ہے کہ غیراللہ کو اس نظریہ سے پکارنا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری شفاعت یعنی سفارش کرے، جیسا کہ بادشاہ تک رسائی کے لئے وزیر کی شفاعت کا سہارا درکار ہوتا ہے۔
مؤلف رحمہ اللہ اس باب میں انتہائی ٹھوس دلائل کے ساتھ یہ ثابت کرینگے کہ یہ شفاعت عینِ شرک ہے، باطل اور ناجائز ہے، اور جو شفاعت شرعاً ثابت اور درست ہے اس سے مراد وہ شفاعت ہے جس کی اللہ تعالیٰ اپنے کچھ بندوں کو اجازت دے گا، اپنی مرضی سے ابتداءً کسی بندہ کو شفاعت کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔
شفاعت کی مذکورہ باطل صورت میں مشرکینِ مکہ مبتلا تھے، جس کا اللہ تعالیٰ نے رد فرمایا اور رسول اللہ ﷺ نے پوری زندگی اس کی تفنید فرمائی (یعنی قلع قمع کیا)۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاءُ نَا عِنْدَ اللهِ ﴾ ①

''اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچا سکیں، اور نہ ان کو نفع پہنچا سکیں، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔''

ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللهِ زُلْفَى ﴾ ②

''اور جن لوگوں نے اس کے سوا اولیاء بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں) کہ ہم ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نزدیکی کے مرتبہ تک ہماری رسائی کر دیں''

اللہ تعالیٰ نے اس مزعومہ سفارش کے تعلق سے مشرکین کے وابستہ مطمع کو جڑ سے کاٹ دیا، اسے شرک قرار دیا اور اپنی ذات کی تنزیہ و پاکیزگی بیان فرمادی۔

قائلینِ شفاعت کا ایک شبہ اور اس کا ازالہ

قائلینِ شفاعت کا ایک شبہ یہ ہے کہ جب ہم اللہ تعالیٰ کی طرف کسی سفارشی کو پیش کرتے ہیں تو ہمارا مقصود اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہوتا ہے کہ وہ اتنی بڑی ذات ہے کہ اس تک شفعاء کے بغیر رسائی ممکن نہیں ہے پھر یہ کیونکر شرک ہوسکتا ہے؟

---

① (یونس: ۱۸) ② (الزمر: ۳)

اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے قصد سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ وہ واقعی اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہو، کتنے ہی لوگ کسی شخص کی تعظیم کا دعویٰ کرتے ہیں مگر وہ درحقیقت اس کی تنقیص کررہے ہوتے ہیں، مشہور مثال ہے کہ ''بے وقوف دوست سے دانا دشمن بہتر ہے'' نادان دوست جو نقصان پہنچا دیتے ہیں وہ عقلمند دشمن نہیں پہنچا پاتا۔ چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے شفعآء وانداد مقرر کرنا اس کے حقِ ربوبیت اور عظمتِ الوہیت پر وار کرنے کے مترادف ہے، نیز رب العالمین کے ساتھ بدگمانی بھی ہے، اور اللہ رب العزت نے اپنے بارے میں بدگمانی رکھنے والوں کو شدید ترین عذاب کی وعید سنائی ہے؛ کیونکہ یہی بدگمانی درحقیقت انہیں مبتلائے شرک کرگئی، اگر وہ اچھا گمان رکھتے تو ضرور اللہ تعالیٰ کا حقِ توحید بجالاتے، اسی لئے اللہ رب العزت نے مشرکین کی بابت ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللهَ حَقَّ قَدْرِهِ ﴾ ① ''کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کما حقہ قدر نہیں کی''

چنانچہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کی کیا قدر کرے گا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ انداد وشفعآء مقرر کرلے، ان سے محبت کرنے لگے، ان سے ڈرنے لگے، ان سے امیدیں وابستہ کرلے، ان کی ناراضگی سے گھبرانے لگے، ہر معاملے میں ان کی پسندیدگی کو ترجیح دینے لگے، پھر انہیں پکارنے لگے، ان کیلئے نذریں اور منتیں ماننے لگے اور ان کے نام جانور ذبح کرنے لگے۔ اب یہ تمام امور جو عملاً مشرکین سے سرزد ہورہے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا کونسا پہلو ہے؟ وہ تو اپنے شفعآء وانداد کو اللہ رب العالمین کے برابر ٹھہرارہے ہیں جس کا انہیں آج ادراک حاصل نہیں لیکن قیامت کے دن احساس ہوجائے گا، چنانچہ جہنم کے اندر جاکر وہ اس حقیقت کا اعتراف کرینگے:

﴿ تَاللهِ إِنْ كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ○ إِذْ نُسَوِّيكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾ ②

''اللہ کی قسم یقیناً ہم کھلی غلطی پر تھے جبکہ ہم تمہیں رب العالمین کے برابر سمجھ بیٹھے تھے''

یہ بات معلوم ہے کہ انہوں نے اپنے انداد وشفعآء کو اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال کے برابر نہیں کیا، بلکہ محبت، تعظیم اور عبادت کے اعتبار سے برابری کے عقیدۂ باطلہ میں مبتلا ہوگئے، اور یہ سب اللہ رب العزت کے حقِ ربوبیت والوہیت میں تنقیص ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں سوءِ ظنی بھی ہے۔

کیا اللہ تعالیٰ امرِ عالم کی تدبیر کے لئے کسی وزیر یا مددگار کا محتاج ہے؟

کیا اللہ تعالیٰ کی قدرت، شفیع کی قدرت سے ملکر پوری ہوتی ہے؟

کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی حاجات کو براہ راست جاننے پر قادر نہیں ہے کہ شفیع بتلائے گا تو جان پائے گا؟

---

① (الانعام: ۹۱) ② (الشعراء: ۹۷......۹۸)

....

....

کیا اللہ تعالیٰ شفیع کی سفارش کے بغیر اپنے بندوں پر رحم کرنے پر قادر نہیں؟

کیا اللہ تعالیٰ دنیا کے بادشاہوں جیسا ہے کہ جب تک ان کے وزراء ان تک لوگوں کی حاجات نہ پہنچائیں وہ جان نہیں سکتے۔

درحقیقت یہی وہ نکتہ ہے جو بندوں کے مبتلائے شرک ہونے کی اصل اساس اور بنیاد ہے، جس میں اللہ رب العزت کی تنقیصِ شان کا پہلو بھی موجود ہے کہ اسے دنیا کا بادشاہ سمجھ لیا گیا جو نہ تو براہِ راست اپنے بندوں کی طلب سن سکتا ہے، اور نہ شفیع کی سفارش کے بغیر ان کی کفایت کرسکتا ہے، بلکہ اس معاملے میں توسل کا محتاج ہے، اس سے بڑھ کر اللہ رب العزت کے حقِ ربوبیت پر کیا وار ہوسکتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۤءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ ①

''اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچا سکیں اور نہ ان کو نفع پہنچا سکیں، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ کو معلوم نہیں نہ آسمانوں میں اور نہ زمینوں میں، وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے۔''

دوسرا شبہ اور اس کا ازالہ

قبر پرستوں کی طرف سے شفاعت کے حوالے سے ایک شبہ یہ بھی وارد کیا جاتا ہے کہ شرک کا حکم تو اس شخص پر منطبق ہوسکتا ہے جو شفعاء کی عبادت کرے، لیکن جو شخص انہیں صرف شفاعت کے لئے پکارتا ہے، اس نے ان کی عبادت تو نہیں کی، لہذا یہ عمل شرک قرار نہیں پاسکتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال اصلاً فضول اور باطل ہے کیونکہ پکارنا عینِ عبادت ہے، لہذا یہ عمل شرک ہی ہوگا، چنانچہ اگر کسی شخص نے کسی کو شفاعت کیلئے پکارا تو اس نے ان کی عبادت ہی کی خواہ وہ اس بات کو تسلیم کرے یا نہ کرے، دوسری بات یہ ہے کہ شفعاء پکڑنا اللہ رب العزت کی تنقیصِ شان ہے (جیسا کہ ابھی گذرا ہے) اور یہ تنقیصِ شان شرک کا لازمہ ہے، لہذا مشرک خواہ اس بات کو تسلیم کرے یا نہ کرے اس کا یہ عمل عینِ شرک ہے۔

....

① (یونس: ۱۸)

وقوله تعالیٰ ﴿ وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴾ ①

''اور ایسے لوگوں کو ڈرائیے جو اس بات سے اندیشہ رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس ایسی حالت میں جمع کیے جائیں گے کہ جتنے غیر اللہ ہیں، (ان میں سے) نہ کوئی ان کا مددگار ہوگا اور نہ کوئی شفیع ہوگا، اس امید پر کہ وہ ڈر جائیں۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیتا ہے کہ آپ ﷺ اس قرآن پاک کے ذریعے ان لوگوں کو ڈرائیں جن کے دلوں میں اپنے پروردگار کی خشیت موجود ہے، اور جو یوم الحساب اس کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتے ہیں اور وہی درحقیقت ایسے قلوب کے مالک ہیں جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے لبریز ہوتے ہیں، اور وہی درحقیقت شریعت کے مقصود ومنظور ہیں۔ اور یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ رب العزت لوگوں کی صورتیں اور مال نہیں دیکھتا بلکہ ان کے دلوں کو دیکھتا ہے، چنانچہ ایسے لوگوں کو ڈرانے کا اور یہ بتانے کا حکم دیا گیا ہے کہ قیامت کے دن ان کا کوئی دوست اور سفارشی نہیں ہوگا، اس اطلاع کا مقصد (لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ) ہے، یعنی ممکن ہے کہ وہ یہ اطلاع سن کر ڈر جائیں اور دنیا کی زندگی میں وہ عمل کر جائیں جو ان کیلئے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات کا سبب بن جائیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین سے اپنے سوا ہر ولی اور شفیع کی نفی فرمادی، لہذا جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو شفیع بنائے گا وہ مؤمنین کے گروہ سے نہیں ہوسکتا، اور نہ ہی اسے قیامت کے دن شفاعت حاصل ہوگی۔

واضح ہو کہ یہ آیت کریمہ شفاعت کی نفی نہیں کر رہی، بلکہ اھلِ کبائر کیلئے قیامت کے دن شفاعت کا حاصل ہونا تو کتاب وسنت کے محکم دلائل سے ثابت ہے، اس آیت کا مدلول یہ ہے کہ مؤمنین کسی کو اللہ تعالیٰ کے ہاں شفیع نہیں بناتے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی شفیع نہیں بن سکتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ ②

''اسکی اجازت کے بغیر کوئی اس کے پاس سفارش کرنے والا نہیں ایسا اللہ تعالیٰ تمہارا رب ہے سو تم اس کی عبادت کرو، کیا تم پھر بھی نصیحت نہیں پکڑتے''

---

① (الانعام: ٥١)

② (یونس: ٣)

﴿ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ﴾ ①

''کہہ دیجئے کہ تمام سفارش کا مختار اللہ تعالیٰ ہی ہے''

تمام شفاعت کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے

مصنف رحمہ اللہ نے اس آیت کریمہ کا اتنا ہی حصہ نقل فرمایا ہے، ہم اس کا مکمل سیاق وسباق ذکر کرتے ہیں تا کہ معنی پوری طرح واضح ہو جائے ﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ ②

''کیا ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا (اوروں) کو سفارشی مقرر کر رکھا ہے؟ کہہ دیجئے کہ گو وہ کچھ بھی اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ عقل رکھتے ہوں۔ کہہ دیجئے کہ تمام سفارش کا مختار اللہ تعالیٰ ہی ہے، تمام آسمانوں اور زمین کا راج اسی کے لئے ہے، تم سب اسی کی طرف پھیرے جاؤ گے''

شفاعت کی شرائط

ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ مشرکین کے عقیدۂ باطلہ کی خبر دے رہا ہے کہ انہوں نے اپنے لئے شفعآء مقرر کر لئے، ''اَم'' کلمہ استفہام برائے انکار ہے جسکا معنی یہ ہے کہ مشرکین کے خود ساختہ شفعآء انکی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی سفارش نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ''سورۃ الزمر'' کی آیت نمبر (۳) میں انہیں انکے اسی عمل کی بناء پر جھوٹا اور کافر قرار دیا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شفیع تو وہ بن سکتا ہے جس میں دو شرطیں پائی جائیں، ایک یہ کہ اسے اللہ تعالیٰ کا اذن حاصل ہو، اور دوسری یہ کہ جس کی وہ سفارش کریں وہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ ہو، جس سے یہ ثابت ہوا کہ ہر قسم کی سفارش کا صرف اللہ تعالیٰ ہی مالک ومختار ہے، بلکہ وہ تو تمام آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے، اسکے اذن اور رضا کے بغیر کوئی کچھ کلام نہیں کر سکتا، چہ جائے کہ شفاعت۔ لھذا کسی بھی بندے کا اپنی مرضی اور اختیار سے شفیع مقرر کرنا، خواہ وہ کسی کو مقرر کرے، باطل ہوا آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ یعنی: ''تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے''؛ جسکا معنی یہ ہے کہ وہاں تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارے بنائے ہوئے سفارشی کوئی سفارش نہیں کر سکتے، انہیں پکارنے کی تمہاری ہر کوشش بے کار رہوئی، بلکہ وہ تمہارے خلاف بولیں گے اور تم سے اظہار براءت کر دینگے جیسا کہ اللہ پاک کا فرمان ہے:

﴿ كَلَّا سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴾ ③

''وہ تو ان کی پوجا سے منکر ہو جائیں گے، اور الٹے ان کے دشمن ہو جائینگے'' =

① (الزمر: ٤٤) ② (الزمر: ٤٣، ٤٤) ③ (مریم: ٨٢)

قولہ تعالیٰ ﴿ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ﴾ ①

''کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کر سکے''

=

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ وَیَوۡمَ نَحۡشُرُہُمۡ جَمِیۡعًا ثُمَّ نَقُوۡلُ لِلَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا مَکَانَکُمۡ اَنۡتُمۡ وَشُرَکَآؤُکُمۡ فَزَیَّلۡنَا بَیۡنَہُمۡ وَقَالَ شُرَکَآؤُہُمۡ مَّا کُنۡتُمۡ اِیَّانَا تَعۡبُدُوۡنَ o فَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًۢا بَیۡنَنَا وَبَیۡنَکُمۡ اِنۡ کُنَّا عَنۡ عِبَادَتِکُمۡ لَغٰفِلِیۡنَ ﴾ ②

''اور وہ دن بھی قابلِ ذکر ہے جس روز ہم ان سب کو جمع کریں گے پھر مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے شریک اپنی جگہ ٹھہرو، پھر ہم ان کے آپس میں پھوٹ ڈال دینگے، اور ان کے وہ شرکاء کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے، سو ہمارے تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ کافی ہے گواہ کے طور پر، کہ ہمیں تمہاری عبادت کی خبر بھی نہ تھی''

شفاعتِ باطلہ کی قرآن سے تردید

وقولہ:قولہ تعالیٰ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ....

یہ آیت کریمہ ان مشرکین کا رد ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے کسی اذن کے بغیر ملائکہ، انبیاء علیہم السلام اور نیک لوگوں کی صورتوں پر تراشے ہوئے بتوں کو، اللہ تعالیٰ کی طرف شفیع مقرر کر دیا، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں انکی سفارش کے امیدوار بن بیٹھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم ملکوت وکبریائی کا ذکر فرمایا: ﴿ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ﴾ ③

''آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے'' اسکے حکم کے بغیر سفارش تو کیا کوئی کسی قسم کی بات تک نہیں کر سکے گا۔

جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَا یَتَکَلَّمُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَہُ الرَّحۡمٰنُ ﴾ ④

''وہ بات تک نہیں کر سکیں گے مگر جنہیں رحمٰن اجازت دے گا''

نیز فرمایا: ﴿ یَوۡمَ یَاۡتِ لَا تَکَلَّمُ نَفۡسٌ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ﴾ ⑤

''اس دن لوگ آئیں گے، اور کوئی نفس اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کلام نہیں کر پائے گا''۔ (لھذا یہ خودساختہ تمام شفاعتیں باطل ہیں)

① (البقرۃ: ۲۵۵) ② (یونس: ۲۸،۲۹) ③ (النساء: ۱۷۱)
④ (النبأ: ۳۸) ⑤ (ھود: ۱۰۵)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكَمْ مِّنْ مَلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَرْضٰى ﴾ ①

''اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں ہیں جنکی سفارش کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی مگر یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خوشی اور چاہت سے جس کیلئے چاہے اجازت دے دے۔''

ابوحیان فرماتے ہیں: ''کم'' خبریہ ہے، اور تکثیر کا معنی دے رہا ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ ملائکہ کی کثیر تعداد کی شفاعت بھی کچھ کفایت نہیں کر سکے گی، جب تک اللہ تعالیٰ کا اذن حاصل نہ ہو۔ مقامِ غور ہے کہ وہ ملائکہ جو اللہ تعالیٰ کے انتہائی فرمانبردار اور مقرب ہیں، اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر شفاعت نہیں کر سکتے اور اگر کرینگے تو وہ شفاعت کچھ فائدہ مند نہ ہوگی، تو پھر انسانوں کے خودساختہ شفعاء کی شفاعت کیا فائدہ دے سکتی ہے۔ یہ آیتِ کریمہ ان لوگوں کا بھی رد کر رہی ہے جو ملائکہ یا صالحین کو پوجتے یا پکارتے ہیں، خواہ وہ پکارنا طلبِ شفاعت کے لئے ہی کیوں نہ ہو؛ کیونکہ اول وہ پکار سن نہیں سکتے، دوئم وہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر شفاعت کر نہیں سکتے تو پھر اس پکارنے یا پوجنے کا کیا فائدہ؟ (الٹا نقصان یہ کہ وہ مشرک قرار پا کر ہمیشہ کے لئے جہنم کا ایندھن بن جائیں گے) والعیاذ باللہ۔

بلکہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کو رب بنانے کے عمل کو کفر کہا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰۗىِٕكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ ②

''اور یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ تمہیں فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لینے کا حکم کرے کیا وہ تمہارے مسلمان ہونے کے بعد بھی تمہیں کفر کا حکم دے گا؟''

پھر یہ ملائکہ اور انبیاء و صالحین علیہم السلام روزِ قیامت اپنے پوجنے یا پکارنے والوں سے اظہارِ براءت کر کے انہیں بالکل تنہا، بے آسرا اور بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے، چنانچہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کے مابین ہونے والا مکالمہ اس پر شاہدِ عدل ہے، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ، اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''روزِ قیامت اعلانِ براءت کرنے والوں میں وہ ملائکہ بھی ہونگے جنہیں مشرکین نے دنیا میں پکارا ہوگا۔''

اس آیت کریمہ پر بھی خوب غور کیجئے: ﴿ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اَهٰٓؤُلَاۗءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ. قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴾ ③

① (النجم: ٢٦) ② (آل عمران: ٨٠) ③ (سبا: ٤٠،٤١)

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيْرٍ . وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ﴾ ①

''کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن جن کا تمہیں گمان ہے سب کو پکار لو، نہ ان میں سے کسی کو آسمانوں اور زمینوں میں سے ایک ذرہ کا اختیار ہے، نہ ان کا ان میں کوئی حصہ ہے، نہ ان میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کا مددگار ہے، اور درخواستِ شفاعت بھی اسکے پاس کچھ نفع نہیں دیتی بجز انکے جن کیلئے اجازت ہو جائے''

=

''اور ان سب کو اللہ تعالیٰ اس دن جمع کر کے فرشتوں سے دریافت فرمائے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے وہ کہیں گے تیری ذات پاک ہے، اور ہمارا ولی تو تو ہے نہ کہ یہ، بلکہ یہ لوگ جنوں کی عبادت کرتے تھے ان میں اکثر کو انہی پر ایمان تھا۔''

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مشرکینِ اولین اور محمد رسول اللہ ﷺ کے مابین مرکزی اختلافی نکتہ، شفاعت ہی کا تھا، وہ لوگ ملائکہ اور صالحین کی صورتوں پر تراشے ہوئے بتوں کو اس نظریہ سے پکارتے کہ وہ عند اللہ ہماری سفارش کرینگے، اور رسول اللہ ﷺ انکے اس نظریہ کا رد اور ابطال فرماتے، اس عقیدہ کے حاملین کی تکفیر فرماتے، اور انہیں انتہائی گمراہ اور بے وقوف قرار دیتے، اور ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان فرماتے کہ از خود کسی کو شفیع مقرر کرنا جائز نہیں ہے بلکہ ﴿ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ﴾''

''تمام شفاعت کا مالک ومختار صرف اللہ رب العزت ہے۔''

قرآن کی ایک آیت جس نے ہر قسم کے شرک کی جڑ کاٹ دی

وقولہ:قولہ تعالیٰ: قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللهِ....

علماء کرام فرماتے ہیں کہ ''یہ آیتِ کریمہ بندے کے دل سے شرک کی جڑیں کاٹ دینے والی ہے، بشرطیکہ بندہ پورے انصاف اور اخلاص کے ساتھ غور کرے۔''

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے ان تمام اسباب کو جڑ سے کاٹ

① (سبا: ۲۲،۲۳)

دیا ہے جن کا مشرکین سہارا لیتے ہیں، اگر وہ کما حقہ اس آیتِ کریمہ پر غور کرلیں تو ان پر واضح ہوگا کہ شرک کا سارا معاملہ محض تارِ عنکبوت ہے ﴿ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ﴾ (۱)

''اور سب سے کمزور گھر مکڑی کا ہوتا ہے''

کیونکہ مشرک جسے اپنا معبود بناتا ہے اس سے کسی نفع کا امیدوار ہوتا ہے، اور نفع وہ پہنچا سکتا ہے جس میں ان چار خصائل میں سے کوئی خصلت پائی جائے، یا تو وہ اس چیز کا مالک ہو جو پکارنے والا طلب کررہا ہے، اور اگر مالک نہیں ہے تو جو مالک ہے اس کا شریک اور حصہ دار ہو، اور اگر حصہ دار نہیں ہے تو اس چیز میں اس کا معاون و مددگار ہو، اور اگر یہ بھی نہیں ہے تو اس کے پاس اس کی سفارش چلتی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ان چاروں مراتب کی نفی کردی ہے، چنانچہ تمام بنائے گئے شرکاء وشفعاء کے بارہ میں مذکورہ ترتیب کے ساتھ فرمادیا کہ ان کے پاس نہ تو ملکیت ہے، نہ شراکت، نہ معاونت اور نہ ہی اختیارِ شفاعت۔

تو گویا یہ آیاتِ کریمہ وضاحتِ توحید اور اصولِ شرک کی بیخ کنی کیلئے نور و برہان اور زبردست حجت کی حیثیت رکھتی ہیں، اس موقع پر مؤلف رحمہ اللہ نے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا کلام نقل فرمایا ہے جس کا ترجمہ ومفہوم درج ذیل ہے:

''اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے بنائے ہوئے تمام معبودوں سے ان تمام چیزوں کی نفی فرمادی جنہیں سہارا سمجھ کر وہ ان سے متعلق ومنسلک ہوئے رہتے ہیں، چنانچہ پہلے ہر غیر اللہ کے کسی بھی چیز کے مالک ہونے کی نفی فرمائی اور فرمایا: ﴿ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ﴾

یعنی ''وہ تو آسمانوں اور زمینوں میں ایک ذرہ کے بھی مالک نہیں ہیں'' (چہ جائیکہ تمہاری ان تمام حاجات وضروریات کے مالک ہوں جو تم ان سے طلب کرتے ہو)

تو جو ایک ذرہ کا مالک نہیں ہے وہ پکارے جانے کا اہل کیسے بن سکتا ہے۔

اس کے بعد ہر غیر اللہ سے کسی بھی چیز میں کسی بھی قسم کی شراکت اور حصہ داری کی نفی فرمادی، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ ﴾

یعنی ''جنہیں تم پکارتے ہو ان کے پاس زمین وآسمان کی کسی بھی چیز میں کوئی حصہ داری بھی نہیں ہے''

تو جو نہ مالک ہیں نہ مالک کے شریک یا پارٹنر ہیں وہ کیسے پوجا یا پکار کے اہل ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد ہر غیر اللہ سے آسمان وزمین کی کسی بھی چیز کی تیاری میں اللہ تعالیٰ کی مدد ومعاونت کی نفی فرمادی، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيْرٍ ﴾

① (العنکبوت: ٤١)

یعنی ''اللہ تعالیٰ کے سوا جن جن کو تم پکارتے ہو ان میں سے کوئی بھی، کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کا مددگار نہیں ہے''
تو جو نہ مالک ہیں، نہ حصہ دار ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے مددگار ہیں وہ معبود ہونے کے اہل کیسے ہو سکتے ہیں۔
اس کے بعد ایک ہی چیز باقی بچتی ہے، اور وہ یہ کہ ان کی مالک کے پاس سفارش چلتی ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی نفی فرما دی، اور اس حقیقت کو آشکارا کر دیا کہ شفاعت صرف روزِ قیامت چلے گی، صرف ان کی جنہیں اللہ تعالیٰ کا اذن حاصل ہو جائے گا، اور صرف ان کے لئے جن کے لئے صرف اللہ تعالیٰ چاہے گا، جیسا کہ اس کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ ﴾ ①
یعنی ''شفاعت کرنے والے صرف ان کی سفارش کر سکیں گے جن کی شفاعت پر اللہ تعالیٰ راضی ہو''
ثابت ہوا کہ وہ شفاعت جو مشرکین نے مقرر کر رکھی ہے، اور جس سے وہ امیدیں وابستہ کئے بیٹھے ہیں، وہ از روئے قرآن و حدیث باطل اور منفی ہے، اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ آلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مِن شَيْءٍ لَّمَّا جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَمَا زَادُوهُمْ غَيْرَ تَتْبِيبٍ ﴾ ②
''اور انہیں ان کے معبودوں نے کوئی فائدہ نہ پہنچایا جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کے سوا پکارا کرتے تھے جبکہ تیرے پروردگار کا حکم آ پہنچا، بلکہ ان کا نقصان اور انہوں نے بڑھا دیا''
ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُم مَّا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ ۖ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ ۚ لَقَد تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنكُم مَّا كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴾ ③
''اور تم ہمارے پاس تنہا تنہا آ گئے جس طرح ہم نے اول بار تم کو پیدا کیا تھا، اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا اس کو اپنے پیچھے ہی چھوڑ آئے، اور ہم تمہارے ہمراہ تمہارے ان شفاعت کرنے والوں کو نہیں دیکھتے جن کی نسبت تم دعویٰ رکھتے تھے کہ وہ تمہارے معاملہ میں شریک ہیں، واقعی تمہارا آپس میں تو قطع تعلق ہو گیا اور وہ تمہارا دعویٰ دھرے کا دھرا رہ گیا''
اکرم الاولین والاخرین، امام الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ روزِ قیامت شفاعت فرمائیں گے، لیکن کس طرح؟ صحیح بخاری و مسلم میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے مطابق، آپ ﷺ مؤمنین کی دو قطاروں کے اندر اپنے پروردگار کی طرف جائیں گے، اور آپ ﷺ اپنے پروردگار پر داخل ہونے کا اذن طلب کریں گے، اذن حاصل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے سربسجود ہو جائیں گے، طویل ترین حمد و ثناء

① (الانبیاء: ۲۸) ② (ھود: ۱۰۱) ③ (الانعام: ۹۴)

بیان فرمائیں گے، پھر اللہ رب العزت آپ ﷺ سے کہے گا: اپنا سر اٹھاؤ، بات کہو، سنی جائے گی، شفاعت کرو، قبول کی جائے گی، سوال کرو، عطا کیا جائے گا۔ آپ ﷺ کا بیان ہے (پھر میں اپنا سر اٹھادونگا) اور پھر اپنے پروردگار کی حمد وثناء میں مشغول ہو جاؤنگا، جو میرا رب مجھے اسی وقت سکھائے گا، پھر میں شفاعت کرونگا، پھر اللہ رب العزت میرے لئے بندوں کی ایک حد متعین فرمائے گا جنہیں میں جنت میں داخل کردونگا۔ حدیث میں اس طرح چار دفعہ شفاعت کرنا مذکور ہے، یعنی آپ ﷺ چار دفعہ اپنے پروردگار کی طرف جائیں گے، چاروں دفعہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سربسجود ہوکر طویل حمد بیان کرینگے، پھر اللہ رب العزت کے امر سے سر اٹھائیں گے، اور اس کے اذن سے شفاعت کرینگے، اور اس کی متعین کردہ حد کے مطابق لوگوں کو جنت میں داخل کردینگے۔ اس حدیث سے واضح ہوا کہ آپ ﷺ بھی ابتداءً شفاعت نہیں کرسکیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذنِ شفاعت جاری ہونے کے بعد شفاعت کرینگے، اور صرف ان کی شفاعت کرینگے جن کی شفاعت اللہ تعالیٰ چاہے گا اور حد متعین فرمائے گا۔ ①

سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے پوچھا، یارسول اللہ ﷺ! وہ کون خوش نصیب لوگ ہیں جو قیامت کے روز آپ کی شفاعت سے بہرہ مند ہونگے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن میری شفاعت ان خوش نصیبوں کو حاصل ہوگی جنہوں نے دل کے اخلاص کے ساتھ "لَاالِٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کہا ہوگا'' ②

ایک اور حدیث میں یہ الفاظ ہیں: ''میری شفاعت انہیں حاصل ہوگی جنہوں نے مخلص ہوکر "لَاالِٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی گواہی دی، اس طرح کہ ان کا دل ان کی زبان کی، اور ان کی زبان ان کے دل کی تصدیق کرتے ہوں'' ③

تو یہ نبی ﷺ کی شفاعت ہے جو اہلِ اخلاص اور اہلِ توحید کو حاصل ہوگی، جو شخص جتنا زیادہ اخلاص میں کامل واکمل ہوگا وہ اسی قدر زیادہ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے سعادت بخت ہوگا، جبکہ شرک کرنے والوں کیلئے رسول اللہ ﷺ کی شفاعت میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ صحیح بخاری ومسلم کی ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''ہر نبی کو ایک دعائے مستجاب دی گئی ہے، ہر نبی اپنی اپنی دعائے مستجاب کرچکا ہے، میں نے اپنی وہ دعا محفوظ کرلی تاکہ قیامت کے دن اپنی امت کی شفاعت کی صورت میں اس دعا کا حق استعمال کرسکوں، یہ شفاعت میری امت کے صرف اس شخص کو نصیب ہوگی جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہ کیا ہو اور اسی (توحید) پر مرگیا ہو'' ④

① صحیح بخاری، کتاب التوحید (۷٤۱۰) صحیح مسلم، کتاب الایمان (۱۹۳)
② صحیح بخاری، کتاب الرقاق (٦٥٧٠)
③ مسند احمد (۸۰۷٦، ۱۰۷۱۸ ج ۳) صحیح ابن حبان (۲٥۹٤) اس کی سند ضعیف ہے۔
④ صحیح مسلم، کتاب الایمان رقم (۱۹۹) صحیح بخاری، کتاب الدعوات (مختصرا) (٦۳۰٤)

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس حدیث پر غور کیجئے کس طرح توحیدِ خالص کو حصولِ شفاعت کا مرکزی سبب قرار دیا گیا ہے، لیکن شرک میں ملوث لوگوں کا عقیدہ اس سے کس قدر مختلف ہے کہ وہ شفعاء وانداد سے تعلق وموالات کو حصولِ شفاعت کا طریق شمار کرتے ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس معاملے کو دنیوی بادشاہوں کے معاملات پر قیاس کرتے ہیں۔''

ہم اس بحث کو سمیٹتے ہوئے شفاعت کے تعلق سے تین قواعد قولِ فصل کے طور پر تحریر کئے دیتے ہیں، ہدایت کی توفیق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

شفاعتِ حق کے تین قواعد

پہلا قاعدہ: شافع کے بارہ میں ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکتا، اور نہ کر سکے گا، اس کی دلیل اللہ پاک کا فرمان: ﴿ مَنْ ذَاالَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ ①

یعنی: ''کون ہے جو اس کے اذن کے بغیر اس کے پاس سفارش کر سکے''

دوسرا قاعدہ: مشفوع لہ کے بارہ میں اور وہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت صرف ان لوگوں کی شفاعت کی اجازت دے گا جن کے قول وعمل سے راضی ہو، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى ﴾ ②

یعنی ''شفاعت کرنے والے صرف ان کی شفاعت کریں گے جنہیں اللہ تعالیٰ کی رضاء اور پسندیدگی حاصل ہو۔''

تیسرا قاعدہ: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور پسندیدگی صرف ان لوگوں کو میسر ہوگی جنہیں توحیدِ خالص کی نعمتِ عظمیٰ حاصل ہے، اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے: ''قیامت کے دن میری شفاعت سے وہ لوگ بہرہ منداور فیض یاب ہونگے جنہوں نے دل کے مکمل اخلاص کے ساتھ "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہا'' (مکمل اخلاص کا معنی یہی ہے کہ ان کی توحید میں کسی قسم کے شرک کی ملاوٹ نہ ہو)

اقسامِ شفاعت

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کی چھ اقسام ذکر فرمائی ہیں، جو درج ذیل ہیں۔

(۱) شفاعتِ کبریٰ: اس سے مراد وہ شفاعت ہے جو خلق کو مقامِ موقف سے راحت دلانے

① (البقرة : ۲۵۵) ② (الانبیاء : ۲۸)

کیلئے کی جائے گی، یہ وہی شفاعت ہے جس کی طلب کے لئے لوگ باری باری مختلف انبیاء علیہم السلام کے پاس جائیں گے اور پروردگار کے دربار میں شفاعت کرنے کا مطالبہ کریں گے کہ ہمارا رب ہمیں موقف کے کرب سے نجات دے، اور حساب وکتاب شروع فرمائے، لیکن تمام انبیاء کرام علیہم السلام منع فرمادینگے، بالآخر یہ معاملہ امام الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ تک پہنچایا جائے گا، اور آپ ﷺ فرمائیں گے: اس شفاعت کے لئے میں ہوں۔ یہ شفاعت آپ ﷺ کے ساتھ مختص ہوگی اس میں دوسرا کوئی شریک نہیں ہوگا۔

(۲) دوسری قسم یہ کہ آپ ﷺ کا اہلِ جنت کے جنت میں داخلے کی سفارش کرنا، یہ قسم صحیح بخاری ومسلم میں بروایت سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ ایک طویل حدیث میں مذکور ہے۔

(۳) آپ ﷺ کا اپنی امت کے بعض گناہ گاروں کہ جو اپنے لئے جہنم واجب کرچکے تھے کے لئے سفارش کرنا، سفارش یہ ہوگی کہ یہ لوگ جہنم میں داخل نہ ہوں۔

(۴) آپ ﷺ کا ان نافرمان موحدین کی سفارش فرمانا جو اپنے گناہوں کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوچکے ہونگے، شفاعت کی یہ قسم متواتر احادیث سے ثابت ہے جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تمام اہل السنۃ کا اجماع منقول ہے اور اس شفاعت کے منکر کو علماء ومحدثین نے مبتدع اور گمراہ قرار دیا ہے۔

(۵) آپ ﷺ کا بعض اہل جنت کے ثواب کی زیادتی اور درجات کی بلندی کے لئے شفاعت فرمانا، اس قسم میں کسی کا کوئی اختلاف منقول نہیں ہے۔

(۶) آپ ﷺ کا بعض کفار کے لئے جہنم کے عذاب میں تخفیف کی شفاعت فرمانا، یہ قسم ابوطالب کیلئے خاص ہے۔

حقیقتِ شفاعت

شیخ الاسلام فرماتے ہیں: ''شفاعت کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ رب العزت خالص اہلِ توحید پر اپنا فضل وکرم فرماتے ہوئے انہیں ان لوگوں کی دعاؤں کی برکت سے معاف فرمادے گا جن لوگوں کو اس نے شفاعت کی اجازت دے رکھی ہوگی، انہیں شفاعت کی اجازت دینے سے مقصود ان کی تکریم واعزاز ہے، اور یہ بھی کہ وہ مقامِ محمود کو پالیں (یہ مقام رسول اللہ ﷺ کیلئے مخصوص ہے، اس کو پالینے پر خالق جل وعلا اور تمام خلائق آپ ﷺ کی تعریف بیان کرینگے) شفاعت کی اس حقیقت سے واضح ہوا کہ اس کے بارہ میں جہال کے تمام نظریات باطل ہیں، یعنی ان کا یہ کہنا کہ ہمارے شفعاء ابتداءً شفاعت کرنے پر قادر ہیں نیز وہ جس کی چاہیں شفاعت کردیں، جسے چاہے جنت میں داخل کردیں اور جسے چاہیں جہنم سے نجات دے دیں، پھر انہی مفروضوں کی بنیاد پر وہ قبروں کی زیارتیں کرتے ہیں اور قبر والوں سے شفاعت کا سوال کرتے ہیں، اور ان کی رضا حاصل کرنے کیلئے مختلف شرکیہ

امور بجالاتے ہیں ۔ چوں کہ یہ شفاعت بہت سے شرکیہ امور پہ مشتمل ہے، لھذا قرآن حکیم نے جا بجا اس کی نفی کردی، اور یہ خبر دے دی کہ یہ شفاعت کبھی متحقق نہیں ہوگی، اور صرف وہ شفاعت متحقق اور کارگر ہوگی جسے کتاب وسنت نے ثابت کیا ہے، یعنی جو اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوگی، اور وہ صرف اہل توحید واخلاص کیلئے ہوگی ۔''



اس باب کے مسائل

(۱) شفاعت کے حوالے سے مختلف آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر واضح ہوئی۔

(۲) اس شفاعت کی حقیقت وکیفیت واضح ہوئی جس کی شریعت نے نفی کی ہے

(۳) اس شفاعت کی صورت وحقیقت واضح ہوئی جسے شریعت نے ثابت کیا ہے۔

(۴) شفاعتِ کبریٰ کی حقیقت واضح ہوئی، اور یہ کہ یہی مقامِ محمود ہے جس پر رسول اللہ ﷺ فائز ہونگے۔

(۵) آپ ﷺ کے شفاعت فرمانے کی کیفیت وصورت واضح ہوئی، یعنی آپ ﷺ ابتداءً از خود شفاعت نہیں فرما سکیں گے، بلکہ پہلے اللہ رب العزت کے سامنے سجدہ ریز ہونگے پھر جب آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذنِ شفاعت حاصل ہوگا تو شفاعت فرمائیں گے۔

(۶) یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ کون خوش نصیب ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ کی شفاعت حاصل ہوگی۔ (حدیثِ ابوھریرۃ میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔)

(۷) جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا ہو اسے رسول اللہ ﷺ کی شفاعت ہرگز حاصل نہیں ہوگی۔

(۸) شفاعت کی حقیقت معلوم ہوئی۔ (اس کیلئے شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کا کلام ملاحظہ کیجئے)



ہدایت صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے

باب قولِ الله تعالیٰ :

﴿ اِنَّکَ لَاتَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ ﴾ ①

''اللہ تعالیٰ کے فرمان (تم جسے چاہو ہدایت نہیں دے سکتے''

کی تفسیر کا بیان

اس باب کو قائم کرنے سے مصنف رحمہ اللہ کا مقصود قبر پرستوں کا رد ہے، جو انبیاء و صالحین علیہم السلام کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ نفع و نقصان کے مالک ہیں، چنانچہ اس عقیدے کے تحت وہ ان سے گناہوں کی بخشش، تکلیفوں سے چھٹکارا اور دلوں کی ہدایت کا سوال کرتے رہتے ہیں، ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ یہ لوگ مرنے کے بعد علی سبیل الکرامۃ تصرف پر قدرت رکھتے ہیں۔

یہ لوگ اس آیت کریمہ اور اس کے نزول کے پس منظر پر غور کریں، نیز یہ بھی دیکھیں کہ یہ آیتِ کریمہ کس کے بارے میں اُتری، اس طرح ممکن ہے کہ انہیں اپنے مذکورہ عقیدے کا باطل اور فاسد ہونا سمجھ میں آ جائے (واللہ ولی التوفیق)

نبی ﷺ اپنے چچا کو ہدایت نہ دے سکے

رسول اللہ ﷺ جو تمام خلق میں سب سے افضل ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے اقرب ہیں اور اس کے ہاں باعتبارِ جاہ سب سے اعظم ہیں، اپنے چچا ابو طالب کی ہدایت پر حریص بھی ہیں اور بہت کوشاں بھی، انہیں زندگی بھر دعوت دیتے رہے، اور اس کی موت کے وقت بھی دعوت دی لیکن اسے ہدایت نصیب نہ ہوئی، جس کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ کسی کو ہدایت دینے پر قادر نہیں ہیں، پھر آپ ﷺ نے اس کی موت کے بعد اس کے لئے استغفار شروع کر دیا لیکن اسے بخشش نہ مل سکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو استغفار کرنے سے بھی روک دیا، تو یہ کتنی واضح اور قوی برہان اس بات پر ہے کہ نبی ﷺ بھی نفع و ضرر اور منع و عطاء کے مالک نہیں ہیں، یہ سارا معاملہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کے ہاتھ میں ہے، جسے چاہے ہدایت دیدے اور جسے چاہے گمراہ کر دے، جسے چاہے مبتلاءِ عذاب کر دے، اور جسے چاہے مستحقِ رحمت قرار دیدے، جسے چاہے کسی تکلیف میں مبتلا فرما دے اور جس سے چاہے تکلیف منکشف فرما دے، اگر اس کے علاوہ کسی کے پاس ہدایتِ قلوب،

---

① (القصص: ٥٦)

مغفرتِ ذنوب یا ازالہ مشکلات کا اختیار ہوتا تو اس کے سب سے بڑے مستحق محمد رسول اللہ ﷺ ہوتے، اور آپ ﷺ سب سے پہلے اپنے چچا کو ہدایت سے سرفراز فرماتے جو آٹھ سال کی عمر سے آپ ﷺ کی کفالت کر رہا تھا، اور آپ ﷺ کے اعلانِ نبوت کے بعد بھی آٹھ سال تک مسلسل آپ ﷺ کے ساتھ رہا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ قُلْ لَّا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ ①

''آپ ﷺ فرما دیجئے کہ میں خود اپنی ذاتِ خاص کیلئے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا، اور نہ کسی ضرر کا، مگر اتنا ہی کہ جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا ہو، اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیتا، اور کوئی نقصان مجھ کو نہ پہنچتا، میں تو محض ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں''

ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿ قُلْ لَّا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَايُوْحٰى اِلَيَّ ....الآية ﴾ ②

''میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں، (سنو!) میں غیب کا علم بھی نہیں رکھتا، نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف جو کچھ میرے پاس وحی آتی ہے اس کا اتباع کرتا ہوں....''

ان آیاتِ کریمہ کو بغور پڑھ لینے کے بعد کسی شاعر کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ کیجئے، اور اندازہ کیجئے کہ کس قدر شریعت سے محاذ آرائی اور کھلم کھلا مقابلہ بازی ہے:

فان من جودك الدنيا وضرتها ومن علومك علم اللوح والقلم

یہاں شاعر نبی ﷺ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے: یہ دنیا اور آخرت آپ ﷺ ہی کے جود و کرم کا فیض ہے، اور آپ ﷺ کا علم لوح و قلم تک محیط ہے۔ کیا مذکورہ آیات پر ایمان اور اس شعر پر ایمان ایک دل میں جمع ہو سکتے ہیں؟

مترجم کا چشم دید واقعہ

(مجھے ایک دعوتی پروگرام میں شرکت کے لئے لاہور جانے کا اتفاق ہوا، لاہور ایئر پورٹ سے پروگرام کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں ایک جلوس دیکھا، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس جلوس کے شرکاء ایک سائن بورڈ ہٹانے کا مطالبہ کر رہے تھے، وہ سائن بورڈ ایک موحد ساتھی نے لکھوایا تھا جس پر قرآنِ حکیم کی مذکورہ آیتِ =

① (الاعراف: ۱۸۸) ② (الانعام: ۵۰)

قول اللہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ﴾ ①

''آپ ﷺ جسے چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہے ہدایت کرتا ہے۔ ہدایت والوں سے وہی خوب آگاہ ہے''

= کریمہ ﴿ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ...الآیة ﴾ لکھی تھی، جلوس کے شرکاء کا کہنا یہ تھا کہ یہ آیت ہمارے عقیدے کے خلاف ہے، لھذا ہٹائی جائے۔ سائن بورڈ والے ساتھی نے جب ہٹانے سے انکار کر دیا اور معاملہ تھانے تک پہنچا تو بالآخر اس بات پر مفاہمت ہوئی کہ آیت برقرار رہے اور اس کا ترجمہ ہٹا دیا جائے)
(لاحول ولا قوۃ الا باللہ)

وقوله: قول اللہ تعالیٰ: اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ ....

اس آیت کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ سے فرما رہا ہے: اے محمد ﷺ آپ جسے چاہتے ہیں اسے سرفرازِ ہدایت نہیں فرما سکتے (خواہ آپ کو اس سے کتنی ہی محبت اور لگاؤ کیوں نہ ہو) آپ ﷺ کا کام صرف پہنچا دینا ہے، ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، جسے چاہے ہدایت عطا فرما دے، اس کی حکمت مکمل اور حجت قوی ہے (وہ جانتا ہے کہ کون ہدایت کے لائق ہے اور کون نہیں ہے) یہ مضمون اور بہت سے مقامات پر مذکور ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لَیْسَ عَلَیْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ﴾ ②

''انہیں ہدایت پر لا کھڑا کرنا تیرے ذمہ نہیں بلکہ ہدایت اللہ تعالیٰ دیتا ہے جسے چاہتا ہے''

ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴾ ③

''گو آپ ﷺ لاکھ چاہیں لیکن اکثر لوگ ایمان دار نہ ہونگے''

صحیحین کی روایت سے ثابت ہے کہ یہ آیتِ کریمہ ابو طالب کے بارے میں اتری۔ (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے)

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

شبہ: یہاں ایک شبہ وارد کیا جاتا ہے کہ آیتِ کریمہ ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ ...الآیة ﴾ کا مضمون ایک دوسری آیت کے خلاف ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴾ =

① (القصص: ٥٦)　② (البقرة: ٢٧٢)　③ (یوسف: ١٠٣)

وفی الصحیح عن ابن المسیب عن ابیه رضی الله عنه قَالَ لَمَّا حَضَرَتْ أَبَا طَالِبٍ الوَفَاةُ جَاءَهُ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَعِنْدَهُ عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ ابی اُمَیَّةَ وَابُوْ جَھْلٍ فَقَالَ لَهُ یا عَمِّ ! قُلْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ کَلِمَةً اُحَاجُّ لَكَ بِھَا عِنْدَ اللّٰہِ . فَقَالَا لَهُ: اَتَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ ؟ فَاَعَادَ عَلَیْهِ النَّبِیُّ ﷺ فَاَعَادَا . فَکَانَ اٰخِرُ مَا قَالَ : ھُوَ عَلٰی مِلَّةِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ . وَاَبٰی اَنْ یَّقُوْلَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ . فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ :لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ مَا لَمْ اُنْهَ عَنْكَ . فَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ: مَا کَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِکِیْنَ وَلَوْ کَانُوْا اُولِیْ قُرْبٰی . . . الآیة وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ فِی اَبِیْ طَالِبٍ: اِنَّكَ لَاتَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ . (۱)

صحیحین میں ابن المسیب اپنے والد (مسیّب بن حزن رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت قریب ہوا تو رسول اللہ ﷺ اسکے پاس تشریف لے گئے ، اس وقت عبداللہ بن ابی امیہ اور ابوجہل بھی وہاں بیٹھے تھے ، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے چچا ”لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ“ کہہ دو میں (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ کے پاس گواہی دونگا ، ان دونوں نے کہا: کیا عبدالمطلب کے دین سے منہ پھیر لوگے؟ نبی ﷺ نے اپنی دعوت پھر دہرائی ، ان دونوں نے بھی اپنی بات دہرادی ، ابو طالب نے آخری بات یہی کہی کہ میں تو عبدالمطلب کے دین پر ہوں ۔ اور اس نے ”لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ“ کہنے سے انکار کر دیا۔

=

یعنی ”آپ ﷺ صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دیتے ہیں“

ازالہ: اس کا جواب یہ ہے کہ ہدایت کی دو قسمیں ہیں :

(۱) ہدایتِ ارشاد یعنی کسی کو راستہ دکھانا۔

(۲) ہدایت توفیق یعنی کسی کو منزلِ مقصود تک پہنچا دینا۔

جس آیتِ کریمہ میں آپ ﷺ کے ہدایت دینے کا ذکر ہے وہاں ہدایت سے مراد پہلی قسم یعنی ہدایتِ ارشاد ہے، اور جس آیت میں آپ ﷺ کے ہدایت دینے کی نفی وارد ہے وہاں ہدایت سے مراد دوسری قسم یعنی ہدایتِ توفیق ہے، جس پر کسی کو کوئی قدرت نہیں دی گئی ، یہ معاملہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری ، کتاب التفسیر (۴۷۷۲) صحیح مسلم، کتاب الایمان (۲۴) مسند احمد (۸۰۰۲ج۱)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں تمہارے لئے جب تک روک نہ دیا جاؤں، استغفار کرتا رہونگا، تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْا أُولِىْ قُرْبٰى ... الآية ﴾ ①

''پیغمبر ﷺ کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکین کیلئے مغفرت کی دعا مانگیں اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہوں اس امر کے ظاہر ہو جانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں'' اور اللہ تعالیٰ نے ابو طالب کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ... ﴾ ②

''آپ ﷺ جسے چاہے ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہے ہدایت کرتا ہے۔''

قوله:وفی الصحیح عن ابن المسیب عن ابیه رضی الله عنه قَالَ لَمَّا حَضَرَتْ ......

یہ حدیث سعید بن المسیب کے طریق سے ہے، جسے وہ اپنے والد مسیّب بن حزن رضی اللہ عنہما سے روایت کر رہے ہیں، سعید بن المسیب کا شمار انتہائی ثقہ علماء میں ہوتا ہے، بڑے بلند پایہ فقیہ، حافظ الحدیث اور عابد وزاھد تھے، کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں، ان کی اکثر بلکہ تقریباً تمام روایات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہیں، ان کی مراسیل صحیح قرار دی گئی ہیں، علی بن مدینی رحمہ اللہ کا قول ہے: علماء تابعین میں ان سے زیادہ وسیع علم والا کوئی نہیں، اسی سال کی عمر میں ۹۰ھ کے بعد فوت ہوئے، ان کے والد مسیّب صحابی تھے جو خلافت عثمان رضی اللہ عنہ تک زندہ رہے، ان کے دادا حزن بھی صحابی تھے جو جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔

ابو طالب کی وفات کا قصہ

اس حدیث میں جو قصہ منقول ہے اس کی تفصیل یوں ہے کہ جب آپ ﷺ کے چچا ابو طالب پر علاماتِ موت ظاہر ہوئیں تو آپ ﷺ اس کے پاس تشریف لائے، جس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی مشرک کی عیادت کرنا جائز ہے بشرطیکہ اسے اسلام کی دعوت دینا مقصود ہو، اور اس کے اسلام قبول کرنے کی اُمید ہو، چنانچہ آپ ﷺ نے اسے اسلام کی دعوت دی اور فرمایا: " يَا عَمِّ قُلْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ "، یعنی اے چچا! "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" پڑھ لو، جس سے یہ ثابت ہوا کہ اب عمل کا کوئی امکان نہیں، لیکن اگر آپ یہ کلمہ معنی کو سمجھتے ہوئے اور اس کے مطابق عقیدہ بناتے ہوئے پڑھ لیں گے تو اس کا فائدہ ہو سکتا ہے، اس طرح کہ " أُحَاجُّ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللّٰهِ " یعنی میں اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کے کلمہ پڑھنے کی گواہی دیکر آپ کو بخشوانے کی کوشش کرونگا۔ ہم نے گواہی کا ترجمہ

① (التوبة : ۱۱۳) ② (القصص : ۵۶)

اس لئے کیا کہ ایک حدیث میں "اَشْهَـدُ لَكَ بِهَـا" کے الفاظ وارد ہیں، جبکہ ایک دوسری حدیث میں "أُجَـادِلُ لَكَ بِهَـا" کے الفاظ بھی ہیں، جس کا معنی یہ ہوگا کہ میں جھگڑا کر کے آپ کو بخشوانے کی کوشش کرونگا۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے؛ کیونکہ ابو طالب کو اس حالت میں کلمہ پڑھنے کی دعوت دینا اس بات کی دلیل ہے کہ اگر وہ پڑھ لیتا تو اسے ضرور فائدہ ہوتا، اور اسے نبی ﷺ کی شفاعت بھی فائدہ دیتی اگرچہ عمل کا موقع نہیں ہے۔ جو شخص کافر ہو اور کلمہ کا منکر ہو اگر وہ موت کے وقت کلمہ پڑھ لے تو اس پر اسلام کے احکام جاری ہونگے، اور اس کے دل کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہوگا، البتہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی شہادت کے ساتھ ساتھ "محمد رسول اللہ" کی شہادت بھی ضروری ہے۔

اس قصہ سے استدلالِ توحید

جس وقت نبی ﷺ نے ابو طالب کو دعوت دی، ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے ابو طالب کو "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" کے اقرار سے روکا، اور جو ملعون حجت پیش کی وہ وہی ہے جو ہر دور کا مشرک پیش کرتا رہتا ہے یعنی آباؤ اجداد اور بزرگوں کی تقلید، چنانچہ انہوں نے کہا کہ کیا تم عبد المطلب کے دین سے پھر جاؤ گے؟ نبی ﷺ نے اپنی دعوت بار بار دہرائی، جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ اپنے چچا کے اسلام کے کس قدر متمنی اور حریص تھے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ اسے مشرف باسلام کرنے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلانے پر قادر نہ ہو سکے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اگر نبی ﷺ کے پاس ہدایتِ قلوب کا اختیار ہوتا تو آپ ﷺ کے چچا اسلام کے اولین مستحق تھے، اور جب آپ ﷺ کے پاس یہ اختیار نہیں ہے تو کسی دوسرے کے پاس کیسے ہو سکتا ہے؟

ابو طالب نے "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" پڑھنے سے انکار کر دیا اور اسکے برعکس "هُـوَ عَـلٰى مِلَّةِ عَبْدِ الْـمُـطَّـلِـب" کہہ دیا، نبی ﷺ نے اپنے چچا کے لئے استغفار کرتے رہنے کا عزم کر لیا الا یہ کہ اللہ تعالیٰ منع فرما دے، اس کے بعد ابو طالب مر گیا اس کا انتقال مکہ مکرمہ میں ہجرت سے کچھ دن قبل ہوا اس وقت نبی ﷺ کی عمر پچاس برس کے قریب تھی، اس کے انتقال کے آٹھ دن بعد ام المؤمنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو ابو طالب کیلئے استغفار کرنے سے روک دیا، اور یہ آیت نازل فرمادی: ﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْا اُولِيْ قُرْبٰى .... ﴾

''پیغمبر ﷺ کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکین کے لئے مغفرت کی دعا مانگیں اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہوں اس امر کے ظاہر ہو جانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں''

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ مشرکین کیلئے استغفار کو حرام قرار دیتی ہے، اسی طرح ان کے ساتھ تعلق، دوستی اور محبت کو بھی ناجائز قرار دیتی ہے؛ کیونکہ جب ان کیلئے استغفار ناجائز ہے تو ان کے ساتھ محبت اور موالات بطریق اولیٰ ناجائز ہے۔



اس باب کے مسائل

(۱) آیتِ کریمہ ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) آیتِ کریمہ ﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِیْنَ ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۳) اور یہ مسئلہ بڑا عظیم الشان ہے یعنی نبی ﷺ کے فرمان "قُلْ لَاۤ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه" کی حقیقت کی معرفت، گویا "لَاۤ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" محض نطق (اقرار) تک محدود نہیں بلکہ اس کے معنی کا فہم اور اس کے مطابق عقیدہ بنانا ضروری ہے۔ علم کے بڑے بڑے دعویدار اس نکتہ کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

(۴) ابوجہل اور اس کے ساتھی نبی ﷺ کی ابوطالب کو دی گئی کلمہ پڑھنے کی دعوت کا معنی سمجھتے تھے، تب ہی انہوں نے ابوطالب کو "لَاۤ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" پڑھنے سے روکا، تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا بیڑہ غرق کرے جن سے ابوجہل اسلام کو زیادہ سمجھتا تھا۔

(۵) یہ بات معلوم ہوئی کہ نبی ﷺ نے اپنے چچا کے اسلام کے لئے کس قدر کوشش کی۔

(۶) یہ حدیث ان لوگوں پر بھی رد ہے جو عبدالمطلب اور ان کے اسلاف کے اسلام کے دعویدار ہیں

(۷) آپ ﷺ نے اپنے چچا کے لئے استغفار کیا مگر اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کے چچا کو معاف نہیں کیا بلکہ آپ ﷺ کو آئندہ استغفار کرنے سے روک دیا۔

(۸) یہ بات واضح ہوئی کہ برے دوستوں کی صحبت کس قدر نقصان دہ ہے (یعنی ابوطالب کو "لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" پڑھنے سے اس کے بُرے دوستوں نے روکا)

(۹) اسلاف و اکابر کی غیر شرعی تعظیم کس قدر نقصان دہ ہے۔

(۱۰) بزرگوں کے عمل سے استدلال جاہلیت کی رسم اور شیوا ہے۔

(۱۱) یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے؛ کیونکہ ابوطالب اگر آپ ﷺ کی دعوت قبول کر کے کلمہ پڑھ لیتا تو اسے ضرور فائدہ ہوتا۔

(۱۲) انتہائی قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ مشرکین کے دلوں میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ کلمہ "لَاۤ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ" اصل جھگڑے کی بنیاد ہے، چنانچہ نبی ﷺ اپنے چچا کو بار بار "لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" پڑھنے کی تلقین فرما رہے تھے اور وہ بار بار "لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" پڑھنے سے روک رہے تھے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس کلمہ کی عظمت سے واقف تھے اور کلمہ کا معنی بھی بڑی وضاحت کے ساتھ جانتے تھے، چنانچہ یہ کلمہ ہی درحقیقت حدِ فاصل بن گیا، اور مشرکین نے اسی کلمہ کی اساس پر برائے مخالفت تمام امور اور معاملات قائم کر لئے۔

باب

ماجاء ان سبب کفر بنی آدم وترکھم دینھم ھو الغلوفی الصالحین

بنی آدم کا کفروشرک میں مبتلا ہونے اور صحیح دین سے منحرف ہونے کا سبب بزرگوں کے معاملہ میں غلو کرنا ہے

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ﴾ ①

''اے اہل کتاب! اپنے دین کے بارے میں حد سے نہ گزر جاؤ اور اللہ تعالیٰ پر بجز حق کے اور کچھ نہ کہو''

سابقہ ابواب میں مصنف رحمہ اللہ نے قبر پرستوں کے کچھ شرکیہ افعال جو کہ وہ مردوں کے ساتھ بجالاتے ہیں ذکر فرمائے ہیں۔اس باب میں اس کے مرکزی سبب کا ذکر کیا ہے، تاکہ شرک میں مبتلا ہونے کے اس بڑے سبب سے آگاہی حاصل ہوجائے، اور اس خطرناک امر سے بچاؤ حاصل کرنے کا راستہ ہموار ہو جائے۔ واضح ہو کہ یہ خطرناک سبب غلو ہے، بالخصوص نیک بزرگوں کے تعلق سے۔ یہ غلو دورِ قدیم وجدید میں شرک کی اصل جڑ قرار پایا ہے؛ کیونکہ انسانی نفوس بزرگوں سے قرب کے خواہش مند رہتے ہیں، اور شیطان اس قرب کو محبت وتعظیم کے قالب میں ظاہر کرتے کرتے بالآخر غلو کی وادی میں دھکیل دیتا ہے۔

(واللہ المستعان)

غلو کی تردید قرآنی آیت سے

علماء فرماتے ہیں: غلو سے مراد کسی شیئ کی مدح یا مذمت میں حد سے بڑھ جانا ہے۔ غلو کا ضابطہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے جو احکام ارشاد فرمائے ہیں ان سے تجاوز وتعدی اختیار کر لینا، اسے طغیان بھی کہتے ہیں، جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، جیسا کہ فرمان ہے:

﴿ وَلَا تَطْغَوْا فِيهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِي ﴾ ②

''اور اس میں حد سے آگے نہ بڑھو، ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا''

آیتِ مذکورہ بالا میں اللہ تعالیٰ اہل کتاب سے مخاطب ہے، اور انہیں ''غُلُوّ فی الدین'' سے روک رہا ہے، جس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جملہ اوامر ونواہی کی جو حدود متعین فرما دی ہیں، پس انہیں پھلانگنے کی کوشش نہ کرو۔

① (النساء: ۱۷۱) ② (طہ: ۸۱)

....

....

....

....

اہل کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں، نصاریٰ بہت زیادہ غالی واقع ہوئے تھے، چنانچہ انہوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں اس قدر غلو کیا کہ انہیں مرتبۂ نبوت سے منتقل کر کے مرتبۂ الوہیت پر فائز کر دیا، اور ان کی اللہ تعالیٰ کی طرح عبادت شروع کر دی۔ انہوں نے تو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں میں بھی غلو کا ارتکاب کر ڈالا، چنانچہ انہیں معصوم قرار دے کر ان کی ہر بات کے خواہ وہ حق ہو یا باطل پیروکار بن گئے۔ یہودیوں کا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں غلو اس سے بالکل برعکس تھا، انہوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ اس قدر گھٹایا کہ انہیں نعوذ باللہ ولد الزنا قرار دے دیا۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس امت میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو یہود و نصاریٰ کا تشبہ اختیار کرتے ہوئے افراط یا تفریط کی صورت میں غلو کے مرتکب ہوئے، جیسے خوارج، روافض، قدریہ، جہمیہ، معتزلہ اور اشاعرہ وغیرہ'' (انتھیٰ باختصار) شیخ الاسلام مزید فرماتے ہیں: جب نبی ﷺ کے دور میں اسلام سے نسبت رکھنے والے کچھ لوگ اپنی عظیم تر عبادت کے باوجود اسلام سے خارج قرار پائے تو اس دور میں بھی بہت سے اسلام اور سنت کے نام لیوا اسلام سے خارج قرار پا سکتے ہیں، اس خروج کے بہت سے اسباب ہیں جن میں ایک غلو ہے، جس کی اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مذمت فرمائی، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ ﴾ ①

''اے اہل کتاب! اپنے دین کے بارے میں حد سے نہ گزر جاؤ'' (انتھیٰ کلامه)

واضح ہو کہ یہ نہی یہود و نصاریٰ کے ساتھ مختص نہیں ہے، بلکہ ہم پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴾ ②

''پس آپ جمے رہئے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے، اور وہ لوگ بھی جو آپ کے ساتھ توبہ کر چکے ہیں، خبردار! تم حد سے نہ بڑھنا، اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے''

① (النساء: ۱۷۱)
② (هود: ۱۱۲)

وفی الصحیح عن ابن عباس ﷺ فی قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴾ ① قَالَ هٰذِهٖ اسماء رِجَالٍ صَالِحِيْنَ مِنْ قَوْمِ نُوْحٍ ، فَلَمَّا هَلَكُوْا أَوْحَى الشَّيْطَانُ اِلٰى قَوْمِهِمْ أَنِ انْصِبُوْا اِلٰى مَجَالِسِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا يَجْلِسُوْنَ فِيْهَا أَنْصَابًا وَسَمُّوْهَا بِأَسْمَائِهِمْ فَفَعَلُوْا وَلَمْ تُعْبَدْ حَتّٰى اِذَا هَلَكَ اُوْلٰئِكَ وَنُسِّىَ الْعِلْمُ عُبِدَتْ . ②

صحیح بخاری میں ہے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ الآیۃ ﴾ یعنی ''انہوں نے کہا نہ چھوڑ و اپنے معبودوں کو اور نہ چھوڑ و ودکو اور نہ ہی سواع کو اور نہ یغوث ، یعوق اور نسر کو'' کے متعلق فرماتے ہیں: یہ قومِ نوح کے نیک لوگوں کے نام ہیں ، جب یہ انتقال کر گئے تو شیطان نے ان کی قوم کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ جن جگہوں پر یہ بیٹھتے تھے وہاں ان کے یادگاری پتھر نصب کر دو اور ان پتھروں کو ان کے نام دے دو ، انہوں نے ایسا ہی کیا ، لیکن انہوں نے ان کی عبادت نہیں کی ، حتی کہ یہ لوگ بھی فوت ہو گئے اور انکی اولادیں اور نسلیں آ گئیں جو ان کی یادگاروں کے تعلق سے صحیح علم فراموش کر چکی تھیں ، انہوں نے ان کی پوجا شروع کر دی۔

قومِ نوح کے پانچ نیک افراد کا ذکر اور غلو کا رد

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''بہت سے علماء سلف کا کہنا ہے کہ جب قومِ نوح کے پانچوں بزرگ مر گئے تو لوگوں نے انہیں دفن کر کے ان کی قبروں کی مجاورت اختیار کر لی ، پھر ان کی تصویریں بنا ڈالیں ، اور پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد ان کی عبادت شروع کر دی۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس ﷺ کا قومِ نوح کے ان پانچوں بزرگوں کے بارہ میں مزید قول صحیح بخاری میں مذکور ہے فرماتے ہیں: ''قومِ نوح کے یہ پانچوں بت عرب کے پاس آ گئے ۔ ود ، دومۃ الجندل میں قبیلہ ''بنوکعب'' کے پاس ۔ سواع ، ھذیل کے پاس ۔ یغوث ، بنومراد اور پھر بنوغطیف کے پاس ۔ یعوق ، ھمدان کے پاس ۔ اور نسر حمیر یعنی آل ذی الکلاع کے پاس۔''

ابن جریر نے اپنی سند سے محمد بن قیس کا قول نقل کیا ہے: ''یغوث ، یعوق اور نسر اولادِ آدم میں سے نیک

---

① (نوح : ۲۳)

② یہ ایک حدیث کا جزء ہے۔ صحیح بخاری ، کتاب التفسیر (۴۹۲۰) فتح الباری (۶۶۷/۸) .

لوگ تھے، ان کے بہت سے اتباع موجود تھے، جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے اتباع نے کہا کہ اگر ہم ان کی تصویریں بنا کر رکھ لیں تو انہیں دیکھ کر ہمارے عبادت کے شوق و رغبت میں مزید اضافہ ہوجایا کرے گا، چنانچہ انہوں نے ان کی مورتیوں کی شکل میں تصویریں بنا کر رکھ لیں، جب یہ بھی مرگئے تو ان کی ذریت کو ابلیس نے یہ کہہ کر بہکا دیا کہ تمہارے آباء واَجداد تو ان کی پوجا کرتے تھے بلکہ انہیں ان کی پوجا کی برکت سے بارش عطاء ہوتی تھی، پس یہ ذریت ان کی عبادت شروع کر بیٹھی۔''

عکرمہ کا قول ہے کہ'' آدم اور نوح کے درمیان دس صدیوں کا طویل عرصہ تھا، اور اس طویل عرصہ میں تمام لوگ اسلام پر قائم تھے (گویا ان پانچ بزرگوں کے معاملے میں غلو سے شرک کا آغاز ہوا)''

سہیل کا قول ہے:'' پہلے لوگ ان سے دعا کرانے کو باعثِ برکت تصور کرتے تھے، پھر ان کے فوت ہونے پر ان کی مورتیاں بنالی گئیں، اور شروع شروع میں صرف ان کو چھونا باعثِ برکت خیال کیا جاتا تھا، پھر شیطانی وساوس سے رفتہ رفتہ ان کی عبادت کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور وہیں سے یہ سلسلہ دورِ جاہلیت کے عرب میں پہنچا۔''

رسول اللہ ﷺ کی احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ عرب میں اس سلسلۂ شرک کا موجد اور بانی عمرو بن ربیعہ تھا، جو عمرو بن لحی بھی کہلاتا تھا، یہ شخص قبیلہ خزاعہ کا سردار تھا، اور اس سے قبل تمام عرب دینِ ابراہیمی پر قائم تھے اس شخص نے صائبہ، بحیرہ اور حامی وغیرہ تماثیل سے شرک کے سلسلے کا آغاز کیا۔

صحیحین میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:'' میں نے عمرو بن لحی کو جہنم میں دیکھا اس کی آنتیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور وہ انہیں زمین پر گھسیٹتا پھر رہا تھا'' ①

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے صحابی اُکثم بن الجون ﷺ سے فرمایا:'' عمرو بن لحی شکل وصورت میں تمہارے بہت ہی مشابہ تھا جس پر اکثم نے دریافت کیا کہ یہ مشابہت مجھے نقصان تو نہیں دے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل نہیں تم مومن ہو اور وہ کافر تھا'' ②

مذکورہ بالا تمام تصریحات سے واضح ہوا کہ شرک کی ابتداء نیک لوگوں کی شان میں غلو تھا، جس کی ترتیب یہ تھی کہ نیک لوگوں سے لوگوں کو عقیدت ہوتی جس سے انکی تعظیم شروع ہوئی، اور انکے مرنے پر ان کی مورتیاں تراشی گئیں، ان مورتیوں کو چھونا باعثِ برکت گردانا گیا اور پھر رفتہ رفتہ پوجا شروع کردی گئی۔ آج کے دور

① صحیح بخاری، کتاب المناقب(٣٥٢١) صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها(٢٨٥٦).
② اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔ مستدرك حاكم (٤/ ٦٠٥).

کے قبر پرستوں کو شیطان نے جو تعلیم دی ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ نیک لوگوں کی قبروں پر قبے اور عمارتیں بنا کر ان کی مجاورت کرنا، انکی حد درجہ محبت اور تعظیم کا مظہر ہے، اس کے بعد وہاں دعائیں مانگنا انتہائی درجہ قبولیت کا باعث ہے، حتیٰ کہ مساجد سے بھی بڑھکر، بلکہ مسجدِ حرام سے بڑھ کر، اور جب لوگ اس امر کے عادی ہوگئے تو شیطان نے انہیں اگلے انتہائی خطرناک مرحلے میں منتقل کر دیا، یعنی ان کے واسطے سے دعائیں مانگنا اور ان کی قسمیں اللہ کو دینا۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''شرک کا یہ مرتبہ پچھلے ذکر کردہ مرتبہ سے زیادہ خطرناک ہے۔''

پھر جب وہ اس شرک کے بھی عادی ہوگئے تو شیطان نے انہیں اگلے خطرناک مرحلے میں منتقل کر دیا اور وہ انہی کو پکارنے اور عبادت کرنے کا ہے، نیز ان سے سوالِ شفاعت کا ہے اور ان کی قبروں کو پوجا گاہ بنانے کا ہے، ان قبروں پر قندیلیں اور دیئے روشن کرنے کا ہے، ان قبروں پر چادر لٹکانے کا ہے، ان کے طواف واستلام وتقبیل کرنے کا ہے نیز ان قبروں پر بہت سے امورِ حج انجام دینے اور جانور ذبح کرنے کا ہے۔ پھر جب وہ اس کے بھی عادی بن جاتے ہیں تو شیطان انہیں ایک چوتھے خطرناک مرحلے میں منتقل کر دیتا ہے، اور وہ ان کی قبروں پر میلے اور عرس کا انعقاد کرنے کی دعوت دینے کا ہے، پھر لوگ بھی یہ عقیدہ بنا لیتے ہیں کہ ان کے ساتھ تعلق ہی ان کی دنیا وآخرت کے لئے نفع بخش ہے۔ (لاحول ولا قوة الا باللہ)

قرآن وحدیث کے واضح براھین اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ سارے معاملات اس دعوت اور تعلیم کے قطعی خلاف ہیں جسے عطا فرما کر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا، دینِ اسلام تو اللہ تعالیٰ کی خالص توحید کا داعی اور متقاضی ہے، دینِ اسلام تو اس بات پر مصر ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کی جائے۔ پھر جب شیطان دیکھتا ہے کہ لوگ اس مرتبہ کے بھی عادی ہو چکے ہیں، اور مراکزِ شرک کی خوب خوب دعوت دے رہے ہیں تو پھر وہ انہیں ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جو ان کے اس کام کی مخالفت کرے گا اور شرک سے باز رہنے کی تلقین کرے گا اسے ان بلند مرتبہ بزرگوں کے گستاخ ہونے کے ساتھ متہم کیا جائے، چنانچہ یہ انہی شیطانی وساوس کا شاخسانہ ہے کہ شرک کی دلدل میں پھنسے ہوئے یہ نام نہاد مسلمان توحید خالص کے حاملین کو اپنے بغض وعداوت کا نشانہ بنانے اور ان پر مختلف مغلظات اور تہمتیں تراشنے میں ہمیشہ سرگرداں وکوشاں رہتے ہیں، دوسرے لوگوں کو اہل توحید سے متنفر کرتے ہیں، اور مشرکوں سے محبت اور دوستی کی پینگیں بڑھاتے ہیں۔ واللہ المستعان.

وعن عمر ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ :"لَاتُطْرُوْنِی کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی ابنَ مَرْیَمَ اِنَّمَا اَنَا عَبْدٌ فَقُوْلُوْا: عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ" (اخرجاہ) ①

امیر المؤمنین عمرؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے (جھوٹی تعریف کے ذریعے) میری حد سے نہ بڑھاؤ جیسا کہ نصاریٰ نے عیسیٰ ابن مریم کو بڑھا دیا تھا، میں تو صرف اس کا بندہ ہوں پس مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہا کرو۔''

یہ حدیث امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب بن نفیل بن عبد العزی بن ریاح بن عبداللہ بن قرط بن رزاح بن عدی بن کعب القرشی العدوی ؓ کی روایت سے ہے، جو ابوبکر الصدیق ؓ کے بعد تمام صحابہ میں سب سے افضل تھے، ساڑھے دس سال تک مسندِ خلافت پر متمکن رہے، اور پوری دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دیا، انہیں کے دور میں کسریٰ اور قیصر کی سلطنتیں فتح ہوئیں ۲۳ھ ماہِ ذی الحج میں مرتبہ شہادت پایا۔ رضـــی اللہ عنہ وارضاہ.

فرمانِ رسول ''مجھے میری حد سے نہ بڑھاؤ'' کی وضاحت

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا جو ارشاد گرامی ہے وہ تفنیدِ شرک کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے، آپ ﷺ فرما رہے ہیں کہ میری ایسی مدح ہرگز نہ کرو جس میں غلو کا عنصر ہو جیسا کہ نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں غلو کے مرتکب ہوئے، اور ان کے رب اور الٰہ ہونے کے مدعی بن گئے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: کہ میرا تم وہی وصف بیان کرو جو میرے پروردگار نے بیان کیا ہے یعنی ''عبد اللہ اور رسول اللہ'' لیکن افسوس! کہ قبر پرست طبقہ نبی ﷺ کے اس فرمان کو قبول کرنے پر آمادہ اور تیار نہیں ہے، وہ محض اس قدر کو نبی ﷺ کی تنقیص گردانتے ہیں، چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ کو ان کی منزلت ومرتبہ سے بڑھانے کی کوشش کی اور نبی ﷺ کے بارہ میں وہ دعوے کر دیئے جو عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں کئے تھے حتی کہ وہ نبی ﷺ سے گناہوں کی مغفرت اور پریشانیوں کا ازالہ طلب کرتے ہیں۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اپنی ''کتاب الاستغاثۃ'' میں لکھا ہے کہ ''ہمارے دور کے بعض لوگ رسول اللہ ﷺ سے تمام امور میں استغاثہ کو جائز قرار دیتے ہیں ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ آپ ﷺ کو تمام مفاتیح الغیب کا علم حاصل تھا۔''

شیخ الاسلام رحمہ اللہ کچھ اور لوگوں کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ ''کچھ لوگ جو منصبِ تدریس وافتاء پر فائز ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ نبی ﷺ وہ تمام چیزیں جانتے ہیں جو اللہ جانتا ہے، اور آپ ﷺ ان تمام چیزوں پر قادر ہیں

① صحیح بخاری، کتاب الانبیاء (۳۴۴۵).

جن پر اللہ تعالیٰ قادر ہے، اور یہ بھید آپ ﷺ سے حسن رضی اللہ کی طرف منتقل ہوا پھر اولادِ حسن میں سے ابوالحسن الشاذلی تک آ پہنچا۔ کچھ لوگ ﴿ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَّأَصِيلًا ﴾ ① کا معنی یوں کرتے ہیں کہ (نبی ﷺ کی صبح وشام تسبیح کی جائے) جبکہ کچھ لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول دونوں کی عبادت کرتے ہیں۔ پچھلے صفحات میں بصیری کا شعر گزرا:

فان من جودك الدنيا وضرتها   ومن علومك علم اللوح والقلم

اس شعر میں اس نے دنیا وآخرت کی تخلیق کو نبی ﷺ کی سخاوت قرار دیا ہے، اور یہ عقیدہ بھی بیان کیا کہ آپ ﷺ وہ کچھ جانتے ہیں جو لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ واضح ہو کہ یہ سب کفرِ صریح ہے۔

کفر وشرک کی یہ ساری صورتیں جو شیطان نے پیدا کی ہیں، ان سب کو وہ نبی ﷺ کی محبت اور تعظیم ومتابعت کا نام دیتا ہے۔ شیطانِ لعین کا ہمیشہ یہی طریقِ واردات رہتا ہے، وہ حق وباطل کو مخلوط کر کے پیش کرتا ہے تاکہ کم از کم عامۃ الناس جن کے سینے نورِ وحی سے منور نہیں ہیں دھوکے میں آ جائیں۔

نبی ﷺ کی تعظیم کی حقیقت

بھلا ان امور میں نبی ﷺ کی تعظیم کہاں؟ تعظیم تو ایک فعل ہے، جس کا محل قلب، زبان اور اعضاء ہیں، قلب کی تعظیم یہ ہے کہ آپ ﷺ کے ''عبداللہ ورسول اللہ'' ہونے کا عقیدہ رکھا جائے اور آپ ﷺ کی محبت کو اپنے نفس، اولاد، والدین اور تمام لوگوں پر مقدم کیا جائے، اس محبت کی تصدیق دو چیزیں کرتی ہیں:

(۱) بندے کی توحید خالص؛ کیونکہ آپ ﷺ توحیدِ خالص کی دعوت پر سب سے زیادہ حریص تھے حتی کہ آپ ﷺ نے ہر پہلو سے شرک کے تمام اسباب ووسائل کاٹ کر رکھ دیئے اگر کسی نے "مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ" کہا تو آپ ﷺ نے فوراً ٹوکا اور فرمایا تم نے مجھے اللہ کا شریک اور مثیل بنا دیا، صرف " مَاشَاءَ اللّٰهُ" کہو۔ ②

اسی طرح آپ ﷺ نے غیر اللہ کی قسم سے روکا اور اسے شرک قرار دیا، اسی طرح آپ ﷺ نے قبر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے سے نیز قبر کو سجدہ یا قبلہ گاہ بنانے سے نیز اس پر چراغ روشن کرنے سے منع فرما دیا، یہی توحیدِ خالص آپ کے دین کا اصل اور مدارِ نجات ہے، لہٰذا اگر کسی نے آپ کی تعظیم کرنی ہے تو ان باتوں کو قبول کر کے تعظیم کرے نہ کہ مخالفت ومناقضت کے ساتھ۔

---

① (الاحزاب: ٤٢)

② الادب المفرد (٧٨٣) مسند احمد (١٨٣٩، ج١) سنن ابن ماجه (٢١١٧) سلسلة الأحاديث الصحيحة، رقم: (١٣٦، ١٣٩، ١٠٩٣)

(۲) دوسری چیز جو نبی ﷺ کی سچی محبت کی دلیل ہے، آپ ﷺ کی سچی اور خالص متابعت ہے، ہر چھوٹے بڑے کام اور تمام اصول وفروع دین میں آپ ﷺ کی تحکیم ہے، اور اس متابعت اور فرمانبرداری کا معیار یہ ہو کہ آپ ﷺ کے ہر فیصلے پر راضی ہو، تسلیم کرنے والا ہو، اور کسی تنگی وخلجان کے بغیر انقیاد وامتثال کا مظاہرہ کرنے والا ہو، اس کے ساتھ ساتھ ہر اس چیز سے اعراض کرنے والا ہو جو آپ ﷺ کے قول وعمل کے خلاف ہو، بلکہ آپ ﷺ کے خلاف جو بھی ہو اس کی طرف کسی قسم کا التفات نہ کرے۔ اس طرح آپ ﷺ کا حق تعظیم ادا ہو جائے گا۔

باقی رہا آپ ﷺ کی زبان سے تعظیم کرنا تو اس کا حق یوں ادا ہو گا کہ آپ ﷺ کی مدح وثناء ان امور کے ساتھ کی جائے جن امور کے ساتھ اللہ رب العزت نے مدح وتعریف فرمائی ہے، یہ راستہ ہر قسم کے غلو وتقصیر سے پاک ہے، اور آپ ﷺ کی مدح اللہ تعالیٰ سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا۔

اعضاء سے آپ ﷺ کی تعظیم کی صورت یہ ہے کہ آپ ﷺ کی اطاعت ہو، آپ ﷺ کے دین کی دعوت کیلئے سعی ہو، آپ ﷺ کے دین کی مدد ہو، اور آپ ﷺ کے مخالف سے جہاد ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آپ ﷺ کی تعظیم کا حق اس طرح ادا ہو گا کہ آپ ﷺ کی دی ہوئی ہر خبر کی تصدیق کی جائے، آپ ﷺ کے ارشاد فرمائے ہوئے ہر امر کی اطاعت کی جائے، اور آپ ﷺ کے منع فرمائے ہوئے ہر کام سے باز رہا جائے۔ آپ ﷺ کا دین ہی ولاء وبراء اور محبت وبغض کی اساس بن جائے، آپ ﷺ ہی کی تحکیم کو مانا جائے، اور ہر فیصلے کو بشرح صدر قبول کیا جائے، اور دوسروں کی جو بات آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق ہے اسے قبول کرلیا جائے اور جو بات آپ ﷺ کے فرمان کے خلاف ہے اسے رد کردیا جائے، اِلا یہ کہ وہ بات کسی صحیح تاویل کے ذریعے موافق حق ہو جائے، بصورت دیگر اعراض ہی ضروری ہے۔ لیکن اللہ شاہد ہے کہ قبر پرستوں اور موحدین کے دشمنوں کا ہرگز یہ کردار نہیں ہے۔ (واللہ المستعان)

وقال: قال رسول الله ﷺ: "اِیَّاکُمْ وَالْغُلُوَّ فَاِنَّمَا اَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ" ①

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''غلو سے بچو تم سے پہلی قوموں کو غلو ہی نے برباد کر دیا۔''

ولمسلم عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ. قالها ثلاثًا" ②

صحیح مسلم میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تکلف کرنے والے ہلاک ہو گئے۔ یہ بات تین بار ارشاد فرمائی۔''

غلو کا خطرناک انجام دو احادیث کی روشنی میں

وقوله: و قال رسول الله ﷺ: "اِیَّاکُمْ وَالْغُلُوَّ ......

یہ حدیث مسند احمد، سنن ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے ہے، اس حدیث کی شرح میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: '' نبی ﷺ نے ہر قسم کے غلو خواہ اس کا تعلق عقیدہ سے ہو یا عمل سے منع فرما دیا ہے، کیونکہ یہ غلو پہلی قوموں کی بربادی کا سبب بنا لہذا ہمیں اس خطرناک مرض سے متنبہ کر دیا گیا تا کہ ہم تباہ و برباد ہونے سے بچ سکیں۔''

وقوله: ولمسلم عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ. ......

امام خطابی فرماتے ہیں: ''متنطعین جن کی بربادی کی خبر آپ ﷺ نے دی وہ لوگ ہیں جو کسی چیز میں بلا ضرورت تعمق کریں اور متکلمین کے طریقے سے بحث کا تکلف کریں، ایسی چیزوں میں غور و خوض کریں جو ان کیلئے بے مقصد ہیں اور ان کی عقول بھی ان تک نہیں پہنچ سکتیں۔''

ابو السعادات کے قول کے مطابق ''متنطعین وہ لوگ ہیں جو گفتگو میں تعمق، تکلف اور غلو کا راستہ اختیار کرتے ہیں، اس کا استعمال عمل میں تکلف کرنے والے پر بھی ہوتا ہے۔''

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ''متنطعین وہ ہیں جو عبادات میں اس قدر غلو اختیار کرتے ہیں کہ وہ قوانین شرعیہ سے ہٹ جاتے ہیں۔''

یہ تمام تفسیریں درست ہیں، اور قول و فعل کے ہر تکلف اور تعمق کو باعث بربادی قرار دیا جائیگا۔

---

① اس کی سند صحیح ہے۔ مسند احمد (۳۲۴۸ ج ۱) سنن النسائی (۲۶۸/۵) سنن ابن ماجه (۳۰۲۹).

② صحیح مسلم، کتاب العلم (۲۶۷۰).

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس وعید کی لپیٹ میں وہ لوگ بھی آتے ہیں جو لچھے دار گفتگو کرنے اور فصاحت کا تکلف کرنے اور نامانوس اور دقیق الفاظ استعمال کرنے کے شوقین ہوتے ہیں۔''

نبی ﷺ نے یہ بات تین بار ارشاد فرمائی، جو جہاں غلو کے خوفناک ہونے کی دلیل ہے، وہاں آپ ﷺ کے تعلیم وتربیت کے حریص ہونے کا بھی مظہر ہے۔ اللہ رب العزت آپ ﷺ پر صلاۃ وسلام کی بارشیں برسادے کیونکہ آپ ﷺ نے جنت میں پہنچانے والا اور جہنم سے بچانے والا ہر عمل ہمیں بتادیا، لیکن اکثر لوگ ان احادیث کی مخالفت کرکے اور غلو اور تکلف جیسے خطرناک امراض میں مبتلا ہوکر گمراہی کا شکار ہوگئے۔ کیا ہی خوب ہو کہ یہ لوگ صرف اسی چیز پر قناعت کریں اور اکتفاء کریں جو پروردگار کی طرف سے رسول اللہ ﷺ پر اتری، یہ کس قدر سلامتی اور سعادت کا راستہ ہے، اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ ①

''کیا انہیں یہ کافی نہیں؟ کہ ہم نے آپ ﷺ پر کتاب نازل فرمادی جو ان پر پڑھی جارہی ہے اس میں رحمت بھی ہے، اور نصیحت بھی ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان دار ہیں''



① (العنکبوت:۵۱)

اس باب کے مسائل

(۱) جو شخص اس باب کو اور اس کے بعد آنے والے دو ابواب کو ٹھیک سے سمجھ لے گا اس پر یہ بات واضح ہو گی کہ اسلام پر کس قدر غربت، اجنبیت اور مظلومیت کا دور دورہ ہے، نیز وہ شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اسکے لوگوں کے دلوں کو پھیر دینے کے تعلق سے عجیب وغریب نشانیاں دیکھے گا (یہ اشارہ قومِ نوح کے پانچ بزرگوں کے تعلق سے لوگوں کے عقائد ونظریات میں رفتہ رفتہ پیدا ہونے والے تغیر کی طرف ہے۔) (واللہ اعلم)

(۲) زمین میں رونما ہونے والا پہلا شرک، بزرگوں کی شان میں غلو کے سبب سے تھا۔

(۳) یہ بات بیان ہوئی کہ پہلی چیز جو تغیر کا شکار ہوئی وہ انبیاءِ کرام علیہم السلام کا دین تھا، اس تغیر کا سبب غلو فی الصالحین تھا، حالانکہ قوموں کو اس بات کا علم تھا کہ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا ہے، لہذا ان کی دعوت مبنی برحق ہے، اور اس میں کسی تغیر کی کوئی مجال نہیں ہے۔

(۴) یہ بات بیان ہوئی کہ لوگوں نے بدعات وخرافات بہت جلد قبول کرلیں، حالانکہ انبیاءِ کرام علیہم السلام کی شریعتیں اور فطرتِ سلیمہ ان بدعات کا سختی سے رد کرتی ہیں۔

(۵) سابقہ اقوام میں شرک کے پیدا ہونے کا سبب حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کر دینا تھا، چنانچہ جہاں تک پہلی چیز یعنی حق کا تعلق ہے تو وہ نیک لوگوں کی محبت ہے، اسے دوسری چیز یعنی باطل کے اندر مختلط کر دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان نیک لوگوں کی محبت کے تعلق سے بعد میں آنے والے لوگوں نے شرکیہ امور انجام دینا شروع کر دیئے، انہوں نے اپنے سے پہلے لوگوں کے امور کو بھی اسی چیز پر محمول کیا، یوں حق و باطل آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔

(۶) سورۂ نوح کی آیت کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۷) آدمی کی جبلت وخصلت بھی کس قدر عجیب واقع ہوئی ہے کہ حق کا معاملہ کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جاتا ہے اور باطل بڑھتا جاتا ہے۔

(۸) اس باب میں ذکر کردہ دلائل، علماءِ سلف سے منقول ایک قول کی تائید کرتے ہیں، ان کا قول ہے کہ "بدعات کا ارتکاب کفر کا سبب بن سکتا ہے۔"

(۹) شیطان اس بات کو جانتا ہے کہ بدعت کا انجام کتنا خطرناک ہے، خواہ بدعتی کی نیت کتنی ہی نیک ہو۔ (لیکن اس کا انجام کار بربادی کے سوا کچھ نہیں، اس بات سے شیطان بخوبی آگاہ ہے)

(۱۰) غلو کا ناجائز ہونا، ایک قاعدۂ کلیہ ہے، جس کی معرفت اس باب سے حاصل ہوئی نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ غلو کا انجام انتہائی مہلک ہے۔

(۱۱) قبر کی مجاورت حد درجہ نقصان دہ ہے، خواہ مقصود کسی عمل صالح کی انجام دہی ہی کیوں نہ ہو۔

(۱۲) اس بات کی معرفت حاصل ہوئی کہ مورتیاں بنانا ایک ناجائز فعل ہے، نیز مورتیوں کو مٹانا اور ختم کرنا شرعی مطلوب ہے۔ مورتیوں کو مٹانے کی حکمت بھی معلوم ہوئی جو یہ ہے کہ یہ رفتہ رفتہ شرک کو جنم دیتی ہیں۔

(۱۳) قومِ نوح کے پانچ بزرگوں کے تعلق سے جو قصہ مذکور ہوا اس کی عظمت کی معرفت حاصل ہوئی، لوگوں کو اس قصہ کے معرفت کی شدید ضرورت ہے مگر وہ اس کے برعکس غفلت کا شکار ہیں۔

(۱۴) یہ حقیقت حد درجہ افسوس ناک اور تعجب خیز ہے کہ لوگ یہ واقعہ کتبِ تفسیر وحدیث میں بذاتِ خود پڑھتے ہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا معنی بھی بخوبی جانتے ہیں کہ ''وہ لوگوں اور ان کے دلوں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے'' اس کے باوجود انہوں نے یہ عقیدہ بنالیا کہ قومِ نوح کا مذکورہ فعل سب سے بہترین عبادت ہے (اگر ان سے کہا جائے کہ یہ شرک ہے اور شرک سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے تو ان کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ) اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نہی جس بارہ میں وارد ہے وہ تو وہ ''کفر'' ہے جو خون اور مال کو مباح کرنے والا ہے۔

(۱۵) اس بات کی تصریح کہ ان کا نیک لوگوں کی مورتیوں سے مقصود ان کی شفاعت حاصل کرنا تھا (یہ مقصود بھی ناجائز ہے جیسا کہ شفاعت کے باب میں وضاحت مذکور ہے)

(۱۶) پھر ان کا یہ گمان کہ جن علماء نے ان نیک لوگوں کی تصویریں بنائیں ان کا بھی یہی مقصود تھا۔

(۱۷) نبی ﷺ کا یہ فرمان "لَا تُطْرُوْنِیْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰى ابْنَ مَرْيَمَ" کتنا عظیم الشان بیان ہے جو عقیدہ توحید کا مظہر ہے، آپ ﷺ پر اللہ رب العزت کی رحمتیں اور سلامتیاں نازل ہوں کہ آپ ﷺ نے اس قدر وضاحت کے ساتھ توحید واضح فرمائی۔

(۱۸) نبی ﷺ کا ہمیں نصیحت فرمانا کہ متنطعین یعنی قول وعمل میں غلو اور تکلف پیدا کرنے والے بربادی کا شکار ہوتے ہیں۔

(۱۹) یہ بات واضح ہوئی کہ قوم نوح کے بزرگوں کی پوجا اس وقت شروع ہوئی جب ان کے تعلق سے صحیح علم محو ہو چکا تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ صحیح علم کا وجود کتنا عظیم المنفعت ہے جب کہ علم کا مفقود ہو جانا انتہائی نقصان دہ ہے۔

(۲۰) فقدانِ علم کا سب سے بڑا سبب علماء کی موت ہے۔

باب ما جاء من التغليظ فيمن عبد الله عند قبر رجل صالح فكيف اذا عبده؟

اس شخص کے متعلق وعیدِ شدید کا بیان جو کسی صالح بزرگ کی قبر کے پاس کھڑا ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے، تو جو اس صالح بزرگ ہی کی عبادت کرنے لگے، اس کے متعلق وعید کا کیا عالم ہوگا؟۔

فِی الصَّحِيح عن عائشة أن أم سلمة رضی اللہ عنہا ذَكَرَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ كَنِيْسَةً رَأَتْهَا بِأَرْضِ الْحَبْشَةِ وَمَا فِيْهَا مِنَ الصُّوَرِ فَقَالَ :أُوْلٰئِكَ إِذَا مَاتَ فِيْهِمِ الرَّجُلُ الصَّالِحُ أَوِالْعَبْدُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهٖ مَسْجِدًا ، وَصَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ ، أُوْلٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ . فَهٰؤُلَاءِ جَمَعُوْا بَيْنَ الْفِتْنَتَيْنِ :فِتْنَةَ الْقُبُوْرِ وَفِتْنَةَ التَّمَاثِيْلِ . ①

قبر پرستی کے مرض میں مبتلا عناصر کی سوچ کا عالم یہ ہے کہ وہ قبر کے تعلق سے اپنے قبیح اور شنیع قسم کے اعمال کو بھی اچھا تصور کرتے ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پوری طرح منطبق ہوتا ہے:

﴿ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ﴾ ②

''کیا وہ شخص جس کیلئے اسکے بُرے اعمال مزین کر دیئے گئے ہیں پس وہ انہیں اچھا سمجھتا ہے''

یہاں سے مصنف رحمہ اللہ کچھ ایسے قبیح اعمال کا تذکرہ فرمائیں گے جو غیر شرعی تعلق بالقبور سے جنم لیتے ہیں، یہ مسائل مختلف ابواب میں بکھیر دیئے گئے ہیں، تاکہ وقتاً فوقتاً پڑھنے سے اچھی طرح دل میں جاگزین ہو جائیں، اور ان اعمال سے خوف کرنے اور بچ کر رہنے کا درس ملتا رہے۔ ان قبیح اعمال میں سے ایک اولیاء وصالحین کی قبور کا قصد کرنا، ان کی عبادت کے لئے نہیں بلکہ وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت بجالانے کیلئے، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ شریعت میں اس امر کی بھی نہی اور وعیدِ شدید وارد ہے، تو پھر مقامِ غور ہے کہ اس شخص کا فعل کتنا خطرناک، ہیبت ناک اور تباہ کن قرار پائے گا جو اللہ تعالیٰ کی بجائے قبر یا کسی قبر والے کی عبادت کرے، اور اس شخص کا عمل کتنا مہلک قرار پائے گا جو یہ کام ہر ہفتے یا مہینے یا سال میں بار بار انجام دے۔ والعیاذ باللہ

---

① صحيح بخاری، كتاب الصلوٰة (٤٢٧) صحيح مسلم، كتاب المساجد (٥٢٨).

② (فاطر: ٨)

صحیحین میں ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ام سلمۃ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے ایک گرجے کا ذکر کیا جو انہوں نے سرزمینِ حبشہ میں دیکھا تھا اور جو اس میں تصاویر تھیں، (ان کی بابت بھی آپ ﷺ کو بتایا) تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان لوگوں کا کوئی نیک آدمی جب فوت ہو جاتا تو اس کی قبر پر مسجد تعمیر کر لیتے، اور اس میں تصاویر رکھ لیتے، ''قیامت کے دن اللہ کے نزدیک یہ سب سے بدترین مخلوق ہوگی۔'' ان لوگوں نے دو فتنے جمع کر رکھے تھے، ایک قبروں پر مسجدیں بنانے کا فتنہ، اور دوسرا تصاویر کا فتنہ تھا۔

قوله: في الصحيح عن عائشة أن أم سلمة ذَكَرَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ كَنِيْسَةً ......

ایک دوسری حدیث میں صراحت ہے کہ ام المؤمنین ام سلمۃ رضی اللہ عنہا نے نبی علیہ السلام کو یہ بات آپ ﷺ کے مرض الموت میں بتائی تھی۔ ①

ایک اور روایت میں یہی بات اُم المؤمنین اُم حبیبۃ رضی اللہ عنہا سے بھی منقول ہے۔ ②

مسئلۃ الباب کیلئے حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا سے استدلال

اس حدیث میں اہل حبشہ کے دو انتہائی قبیح عمل مذکور ہیں، ایک قبر پر مسجد بنانا اور ظاہر ہے مسجد اللہ تعالیٰ کی عبادت کا گھر ہے۔

امام بیضاوی نے لکھا ہے: ''وہ لوگ مسجد میں نماز پڑھتے تھے اور قبلہ ان صالحین کی قبروں کو بناتے تھے، اسی عمل پر نبی ﷺ نے انہیں ملعون قرار دیا۔''

دوسرا قبیح عمل تصویر سازی کا تھا، امام قرطبی فرماتے ہیں: ''اس قوم کے پہلے لوگوں نے اپنے صالحین کی تصاویر بنا کر اس غرض سے مسجد میں رکھی تھیں کہ وہ ان تصاویر کو دیکھ کر ان کے نیک اعمال یاد کریں، اور ان کی اقتداء کریں نیز یہ کہ ان کی قبروں کے پاس اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، پھر جو ان کی ناخلف اولادیں پیدا ہوئیں وہ ان تصاویر کے تعلق سے اپنے اسلاف کے مقاصد بھلا بیٹھیں، شیطان نے ان کے دلوں میں یہ وسوسہ پیدا کیا کہ تمہارے آباء واجداد تو ان تصاویر کی تعظیم اور عبادت کرتے تھے، نبی ﷺ نے قبروں کے پاس کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت سے بھی منع فرما دیا تا کہ اس فعلِ شنیع کا مکمل سدِ باب، ہو جائے، جس فعلِ شنیع نے سابقہ قوموں کو غارت کر دیا۔''

---

① (صحیح بخاری)

② (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

دونوں فتنوں کو جمع کرنے کا مذکورہ قول شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا ہے۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے قبور اور تصاویر کو فتنہ اس لئے قرار دیا کہ یہ دونوں چیزیں درحقیقت غیر اللہ کی عبادت کا سبب بنیں، چنانچہ لات، ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر وغیرہ نیک بزرگوں کی عبادت کا نقطۂ آغاز یہی تھا (یعنی تصاویر کا معاملہ)

شیخ الاسلام رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں: ''اسی علت کی وجہ سے شریعت نے قبروں پر مسجد بنانے سے روک دیا؛ کیونکہ اس عمل نے بہت سی امتوں کو شرک، بلکہ شرکِ اکبر کی دلدل میں پھنسا دیا، ویسے بھی طبائع انسانی بزرگوں کی تصاویر کو بزعم خویش طلاسم کواکب سمجھتے ہوئے جلد مبتلاءِ شرک ہو جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ کسی نیک آدمی کی قبر پر جو شرک کی صورت ہوتی ہے وہ لکڑی یا پتھر کے حوالے سے ہونیوالے شرک سے کہیں زیادہ اور أَقْرَب إِلَى النفوس ہوتی ہے، اسی لئے بعض لوگ قبر پر اس انداز سے عبادت کرتے، اور خشیت وتضرع کرتے دیکھے گئے ہیں، کہ اس انداز کی عبادت وہ اللہ تعالیٰ کے گھروں میں بھی نہیں کرتے بلکہ وقتِ سحر بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح نہیں گڑگڑاتے، اور بعض تو ان قبروں کو سجدہ کر بیٹھتے ہیں، جبکہ اکثریت تو قبروں پر کھڑے ہوکر نماز اور دعا تو اللہ تعالیٰ کیلئے سرانجام دیتے ہیں، لیکن قبروں کے قرب سے اُس برکت کے امیدوار ہوتے ہیں جو انکے زعم فاسد کے مطابق مساجد میں حاصل نہیں ہوسکتی، لھذا نبی ﷺ نے اس مفسدہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور قبرستان میں کسی بھی جگہ نماز ادا کرنے سے منع فرمادیا، خواہ نماز پڑھنے والے کی نیت میں قبروں کی برکت کا حصول مقصود نہ بھی ہو۔ اس بات کو یوں سمجھیں کہ نبی ﷺ نے طلوع وغروب آفتاب کے وقت نماز ادا کرنے سے منع فرمادیا جس کی وجہ یہ بیان کی کہ ان اوقات میں مشرکین یعنی سورج کے پجاری سورج کو سجدہ کرتے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے ان اوقات میں نماز پڑھنے سے ہی روک دیا خواہ کوئی شخص کتنا بڑا موحد ہی کیوں نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ یہ راستہ جو آگے چل کر شرک پر منتج ہوسکتا ہے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔''

شیخ الاسلام مزید فرماتے ہیں: ''جو شخص قبروں کے پاس، قبروں کی برکت کے حصول کی نیت سے نماز پڑھے تو اس کا یہ عمل اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی عین عداوت اور مخالفتِ دین قرار پائے گا، اس شخص نے ایک ایسا دین گھڑ لیا جس کی اللہ تعالیٰ نے قطعاً اجازت نہیں دی، بلکہ مسلمانوں کا تو یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ قبروں کے پاس نماز پڑھنا حرام ہے، اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر مساجد بنانے والوں کو لعنتوں اور پھٹکاروں کا مصداق قرار دیا، قبروں کے پاس نماز پڑھنا یا قبروں پر مسجد بنانا سب سے بڑی بدعت اور سب سے قوی سببِ شرک ہے۔'' انتھی باختصار.

ولهما عنها قالت: لَمَّا نزَلَ بِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ طَفِقَ يَطْرَحُ خَمِيْصَةً لَهٗ عَلٰى وَجْهِهٖ، فَاِذَا اغْتَمَّ بِهَا كَشَفَهَا فَقَالَ، وَهُوَ كَذٰلِكَ: لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ. يُحَذِّرُ مَا صَنَعُوْا، وَلَوْلَا ذٰلِكَ أُبْرِزَ قَبْرُهٗ غَيْرَ أَنَّهٗ خُشِيَ أَنْ يُّتَّخَذَ مَسْجِدًا. ①

اور صحیحین میں ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرماتی ہیں: جب رسول اللہ ﷺ پر (ملک الموت) نازل ہوا تو آپ ﷺ اپنی چادر اپنے چہرۂ انور پر ڈال لیتے اور جب دم گھٹنے لگتا تو ہٹا دیتے، اس موقعہ پر آپ ﷺ نے فرمایا: یہود ونصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کہ انہوں نے انبیاء کی قبروں کو مساجد بنالیا، آپ ﷺ اپنی اُمت کو اس فعل قبیح سے ڈرا رہے تھے، ام المؤمنین فرماتی ہیں: اگر آپ ﷺ کی تحذیر اور یہود ونصاریٰ پر لعنت نہ ہوتی تو آپ ﷺ کی قبر گھر سے باہر بنا کر لوگوں کے لئے ظاہر کر دی جاتی، لیکن آپ ﷺ ڈر گئے کہ ان کی قبر کو سجدہ گاہ نہ بنالیا جائے۔

اس حدیث سے واضح ہوا کہ نبی ﷺ نے جس بنا پر یہود ونصاریٰ کو ملعون قرار دیا وہ ان کا انبیاء وصالحین علیہم السلام کی قبروں پر مساجد بنانا تھا، یہود ونصاریٰ اپنی عبادت گاہوں کو مسجد کا نام نہیں دیتے بلکہ کنیسہ (گرجا) وغیرہ کہتے ہیں، جہاں وہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں، نبی ﷺ نے ان کی عبادت گاہوں کو مساجد کہا تو مقصود نام نہیں بلکہ معنیٰ ہے، اور یہ حکم ان قبوں اور مشاہد پر لگے گا جو انبیاء وصالحین علیہم السلام کی قبروں پر تعمیر ہوتے ہیں، قبر پرست عناصر اگر چہ انہیں مسجد نہیں کہتے لیکن حکماً وہ مساجد ہی قرار پائیں گی جنہیں قبروں پر بنانے والا مستحق لعنت قرار پایا ہے، اور مقام غور ہے کہ جب انبیاء علیہم السلام کی قبروں پر مساجد بنانے والا ملعون ہے تو دوسروں کی قبروں پر مساجد کی تعمیر کتنا خطرناک عمل ہوگا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''معاملے کی پوری بیخ کنی کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نبی ﷺ کی قبر کے تعلق سے یہ توفیق دی کہ انہوں نے اس کی دیواریں بہت اونچی کر دیں، اور ان دیواروں تک پہنچنے کے تمام راستے بند کر دیئے، پھر انہیں یہ خوف ہوا کہ آپ ﷺ کی قبر لوگوں کی نماز کا قبلہ نہ بن جائے اس محذور کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے قبر کے دونوں شمالی کناروں سے دو دیواریں اٹھائیں، اور انہیں اس طرح ٹیڑھا کیا کہ وہ دونوں دیواریں شمال کی طرف سے ایک مثلث زاویے پر آملیں، اس طرح قبر کی طرف کسی کا چہرہ ہونا ممکن نہ رہا۔''

① صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ (٤٣٦) صحیح مسلم، کتاب المساجد (٥٢٩)

ولمسلم عن جندب بن عبد الله قال: سَمِعْتُ النَّبِیَّ ﷺ قَبلَ أَنْ یَّمُوْتَ بِخَمْسٍ وَهُوَ یَقُوْلُ: اِنِّی أَبْرَأُ إِلَى اللهِ أَنْ یَّکُوْنَ لِیْ مِنْکُمْ خَلِیْلٌ، فَإِنَّ اللهَ قَدِ اتَّخَذَنِیْ خَلِیْلًا کَمَا اتَّخَذَ إِبْرَاهِیْمَ خَلِیْلًا، وَلَوْ کُنْتُ مُتَّخِذًا مِنْ أُمَّتِیْ خَلِیْلًا لَاتَّخَذْتُ أَبَا بَکْرٍ خَلِیْلًا، أَلَا وَإِنَّ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَانُوْا یَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ أَنْبِیَائِهِمْ مَسَاجِدَ، أَلَا فَلَا تَتَّخِذُوْا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ، إِنِّیْ أَنْهَاکُمْ عَنْ ذٰلِكَ فَقَدْ نَهٰی عَنْهُ وَهُوَ فِیْ آخِرِ حَیَاتِهِ، ثُمَّ أَنَّهُ لَعَنَ [وَهُوَ فِی السِّیَاقِ] مَنْ فَعَلَهُ، وَالصَّلَاةُ عِنْدَهَا مِنْ ذٰلِكَ، وَإِنْ لَمْ یُبْنَ مَسْجِدًا، وَهُوَ فِیْ مَعْنٰی قَوْلِهَا: خَشِیَ أَنْ یُّتَّخَذَ مَسْجِدًا، فَإِنَّ الصَّحَابَةَ لَمْ یَکُوْنُوْا لِیَبْنُوْا حَوْلَ قَبْرِهٖ مَسْجِدًا. وَکُلُّ مَوْضِعٍ قُصِدَتِ الصَّلَاةُ فِیْهِ فَقَدِ اتُّخِذَ مَسْجِدًا، بَلْ کُلُّ مَوْضِعٍ یُصَلّٰی فِیْهِ یُسَمّٰی مَسْجِدًا کَمَا قَالَ ﷺ: جُعِلَتْ لِیَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَّطُهُوْرًا. ①

صحیح مسلم میں سیدنا جندب بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی وفات سے پانچ روز قبل یہ فرماتے ہوئے سنا: میں اس چیز کا انکار کرتا ہوں کہ تم میں سے کوئی میرا خلیل ہو کیونکہ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے خلیل بنالیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراھیم علیہ السلام کو خلیل بنایا تھا، اور اگر اپنی اُمت میں سے مجھے کسی کو خلیل بنانا ہوتا تو میں ضرور ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کو بنالیتا۔ خبردار! تم سے قبل جو لوگ گزرے ہیں وہ انبیاء کی قبروں پر مساجد بنایا کرتے تھے، خبردار! تم قبروں پر مساجد نہ بنانا، میں تمہیں اس عمل سے سختی سے روکتا ہوں۔ نبی ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ کے آخری دنوں میں قبروں پر مساجد کی تعمیر سے منع فرمایا، اس کے بعد آپ ﷺ جب موت وحیات کی کشمکش میں تھے تو ایسا کرنے والوں پر لعنت فرمائی۔ قبروں کے پاس نماز پڑھنا بھی اسی قبیل سے ہے خواہ مسجد نہ بھی بنائی جائے، ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے فرمان ''آپ ﷺ اس بات سے ڈر گئے کہ آپ ﷺ کی قبرِ مبارک مسجد نہ بنادی جائے'' کا یہی معنیٰ ہے؛ کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ وہ آپ ﷺ کی قبر کے اردگرد مسجد بناتے۔ اور ویسے بھی ہر وہ جگہ جہاں نماز کا قصد کیا جائے اسے مسجد ہی بنانا ہے، بلکہ ہر وہ جگہ جہاں نماز پڑھ لی جائے اسے مسجد کہا جاسکتا ہے، جیسا کہ نبی علیہ السلام کا فرمان ہے:

''میرے لئے پوری زمین مسجد اور پاک بنائی گئی ہے''

---

① صحیح مسلم، کتاب المساجد (۵۳۲)۔

جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال

اس حدیثِ مبارک میں نبی ﷺ نے دو باتیں بیان فرمائی ہیں: ایک یہ کہ آپ ﷺ نے لوگوں میں سے کسی کو خلیل بنانے سے منع فرما دیا، خلیل اس دوست کو کہا جاتا ہے جس سے انتہائی درجہ کی محبت ہو، جس کی دوستی میں کسی قسم کا کوئی خلل نہ ہو۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''آپ ﷺ نے لوگوں میں سے کسی کو خلیل بنانے سے اس لئے منع فرمایا کہ آپ ﷺ کا دل اللہ تعالیٰ کی محبت اور تعظیم ومعرفت سے لبریز ہو چکا تھا؛ لہذا اس دل میں کسی دوسرے کی خلت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔''

آپ ﷺ کا فرمانا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیل بنالیا ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ مقامِ خلّت، مقامِ محبت سے اعلیٰ واکمل ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کچھ کج فکر لوگوں کا یہ کہنا کہ مقامِ محبت، مقامِ خلّت سے زیادہ اکمل وارفع ہے، نیز یہ کہ سیدنا ابراھیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں، اور محمد ﷺ حبیب اللہ ہیں، انتہائی غلط اور مبنی بر جھل ہے؛ کیونکہ جب خلّت اور محبت میں تقابل کریں گے تو معلوم ہوگا کہ خلّت ایک خاص مقام ہے جبکہ محبت عام، بلکہ محبت کی انتہاء خلّت کی ابتداء ہے۔ نبی ﷺ نے جو یہ خبر دی کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیل بنایا ہے، لھذا وہ لوگوں میں سے کسی کو خلیل نہیں بنا سکتے، بھی اسی بات کی دلیل ہے، پھر یہ بات معلوم ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی محبت کی خبر بہت سوں کو دی، مثلاً: عائشہ رضی اللہ عنہا، انکے والد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے بھی بہت سوں سے محبت کرنے کی خبر دی مثلاً: توابین، متطھرین اور صابرین وغیرہ، جب کہ اللہ تعالیٰ کی خلّت صرف دو خلیلوں کے ساتھ خاص ہے، ایک سیدنا ابراھیم علیہ السلام اور دوسرے سید الاولین والآخرین محمد ﷺ۔'' واللہ اعلم۔

یہ حدیث خلیفۃ الرسول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تمام صحابہ میں سب سے افضل ہونے کی زبردست دلیل ہے؛ کیونکہ آپ ﷺ نے یہ صراحت فرمائی تھی کہ اگر میں اپنے پروردگار کے علاوہ کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا اسی طرح یہ حدیث رافضہ اور جہمیہ پر رد ہے، جن کے دلوں میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عداوت بھری ہوئی ہے، اسی طرح یہ حدیث سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلیفۃ الرسول ہونے کی بھی دلیل ہے؛ کیونکہ جس شخص سے آپ ﷺ کی محبت سب سے زیادہ ہو، وہی آپ ﷺ کی نیابت کا سب سے بڑا حقدار ہے، اسی لئے نبی ﷺ

نے اپنی زندگی میں اپنے مرض الموت کے دوران سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نمازوں کی جماعت پر مامور فرمایا تھا، بلکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے جماعت کرانے پر آپ ﷺ غضبناک ہو گئے۔ فرضی اللہ عنہم وارضاهم۔

قبروں پر مساجد اور قبوں کی تعمیر کی حرمت

دوسری بات قبروں پر مساجد یا عبادت گاہیں بنانے کے تعلق سے ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے قبروں پر مساجد کی تعمیر سے منع فرمادیا، اور اس فعل کو سابقہ اقوام کے مشرکین کا فعل قرار دیا، اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس عمل سے اپنی وفات سے پانچ دن قبل منع فرمایا، پھر جب آپ ﷺ سیاقِ موت میں تھے تو ان لوگوں جو قبروں پر مساجد بنایا کرتے تھے، پر اللہ تعالیٰ کی لعنت برسائی، یہ یہود و نصاریٰ تھے۔

امام خلخالی فرماتے ہیں: ''نبی ﷺ کے یہود و نصاریٰ کے اس فعل کے انکار کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی قبروں پر ان کی تعظیم کے لئے سجدہ کرتے تھے، اور دوسرا یہ کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی قبروں پر عبادت تو اللہ تعالیٰ کی کیا کرتے تھے، لیکن توجہ قبروں کی طرف مرکوز رکھتے جس سے ان کا مقصود انبیاء علیہم السلام کی حد درجہ تعظیم ہوتا تھا، پہلی صورت شرک جلی کی ہے اور دوسری صورت شرک خفی کی، دونوں صورتوں میں وہ مستحق لعنت ہیں، نیز اگر وہ یہ عمل مساجد اور قبے بنا کر کریں تو بھی، یا بنائے بغیر کریں تو بھی مستحق لعنت ہیں۔''

اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے قبروں کے درمیان اور قبروں کی طرف نماز پڑھنے سے منع فرمادیا، قبروں کے اندر نماز پڑھنے کی ممانعت کی دلیل سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے، جس میں آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''پوری زمین مسجد ہے سوائے قبرستان اور حمام کے'' یہ حدیث مسند احمد اور سنن اربعہ میں موجود ہے، امام ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے، اور حاکم نے بہت سے طرق سے روایت کر کے اسے شیخین کی شرط پر قرار دیا ہے۔

قبروں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت کی دلیل ابو مرثد الغنوی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قبروں پر مت بیٹھو، اور قبروں کی طرف نماز بھی نہ پڑھو'' اسے امام مسلم نے کتاب الجنائز میں روایت کیا ہے۔

صحیح بخاری میں بسند حسن معلقاً یہ روایت ہے کہ امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو قبر کے پاس نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو چیخ کر فرمایا: قبر ہے، قبر ہے۔[1]

[1] صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب(۴۸) معلقا، سنن الکبریٰ بیہقی (۲/۴۳۵)۔

یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں نبی ﷺ کا مذکورہ فرمان خوب راسخ اور مستقر تھا، تب ہی تو امیر المؤمنین نے منع فرمایا، اور سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا قبر کے قریب نماز پڑھنا اس بناء پر نہیں تھا کہ وہ اس کے جواز کا عقیدہ رکھتے تھے بلکہ اس بناء پر تھا کہ انہوں نے اس قبر کو دیکھا ہی نہیں تھا یا انہیں وہاں قبر کی موجودگی کا علم نہیں تھا، اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے متنبہ کرنے پر رُک گئے۔

کچھ لوگ قبروں کے پاس نماز پڑھنے کی ممانعت کو نجاست پر محمول کرتے ہیں، لیکن یہ تاویل نبی ﷺ کے مقاصد سے انتہائی بعید ہے، آپ ﷺ کا اس عمل سے منع کرنا اس خوف کی بناء پر تھا کہ آپ ﷺ کی اُمت اس راہ پہ چل کے اس شرک کی دلدل میں نہ پھنس جائے جس میں یہود و نصاریٰ اور لات وعزیٰ کی پرستش کرنے والے بُری طرح پھنس چکے تھے۔ اور نبی ﷺ نے تو یہود و نصاریٰ پر اس لئے لعنت فرمائی کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کی قبروں پر مساجد بنائیں، تو کیا انبیاء علیہم السلام کی قبریں نجس ہوتی ہیں؟ ہرگز نہیں، وہ تو دنیا کی پاکیزہ ترین جگہیں ہوتی ہیں، اور اللہ رب العزت نے مٹی پر ان کے مبارک جسم کو کھانا حرام کر دیا ہے، پس ان کے جسم قبروں میں بالکل تر و تازہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ نبی ﷺ نے قبروں پر چراغ جلانے والوں کو بھی ملعون قرار دیا، چراغ جلانے کی ممانعت بھی اسی علت پر محمول ہوگی، یعنی یہ عمل ذریعۂ شرک ہے، نہ کہ نجس ہونا اس کی علت ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو شخص شرک اور اسکے اسباب و ذرائع سے واقف ہے، اور نبی ﷺ کے فرامین کے مقاصد سے بھی آگاہ ہے تو وہ جزماً، قطعاً اور حتماً یہی بات کہے گا کہ آپ ﷺ کا قبروں میں ادائیگی نماز سے منع فرمانا بوجہ نجاست نہیں، بلکہ بوجہ نجاستِ شرک ہے، آپ ﷺ کا مقصد حمایت وصیانتِ توحید ہے، اس کے ساتھ ساتھ اپنی امت کو شرک سے بچانا ہے؛ تا کہ وہ کسی کو اپنے پروردگار کے برابر قرار دیکر اس کے غیظ وغضب کا نشانہ نہ بن جائیں، لیکن افسوس! شرک کرنے والوں نے اس تعلق سے آپ ﷺ کے اوامر کو ٹھکرا دیا اور نواھی کو اپنا لیا، یوں مشائخ وصالحین کی قبروں کی تعظیم کی حجت لئے شیطان کے جھانسے میں آ گئے اور شرک کی دلدل میں بُری طرح پھنس گئے، شیطان کا جھانسہ یہ ہے کہ جس قدر ان قبور و اصحابِ قبور کی تعظیم میں شدت ومبالغہ پیدا ہوگا اسی قدر ان کا قرب نصیب ہوگا، اور ان کے دشمنوں سے دوری حاصل ہوگی۔ اللہ کی قسم! شیطان اسی دروازے سے یغوث، یعوق اور نسر کے پجاریوں پر داخل ہوا، اسی دروازے سے دیگر بت پرستوں پر داخل ہوا اور قیامت تک ہوتا رہے گا۔ اب شرک کرنے والے دو خطرناک وعیدوں کی لپیٹ میں ہیں، ایک انبیاء وصالحین علیہم السلام کے ساتھ غلو کے تعلق سے وعید اور دوسری ان انبیاء وصالحین علیہم السلام کے طریق مستقیم جو سراسر توحید =

ولاحمد بسند جید عن ابن مسعود مرفوعا " اِنَّ مِنْ شِرَارِ النَّاسِ مَنْ تُدْرِكُهُمُ السَّاعَةُ وَهُمْ أَحْيَاءٌ وَالَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ" ورواه ابو حاتم فی صحیحه ①

مسند احمد میں سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷛ سے بسند ثابت مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک وہ لوگ انتہائی بدترین ہیں جو قیامت کے قائم ہونے کے وقت زندہ ہوں اور جو لوگ قبروں پر مساجد بنا لیتے ہیں'' ابو حاتم نے بھی اسے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

=

رب الخلائق پر قائم ہے کی مخالفت کے تعلق سے وعید۔ اللہ تعالیٰ نے اہل توحید کو انبیاء و صالحین ﷧ کی پاکیزہ تعلیمات مبنی بر توحید رب العالمین کو اپنانے کی اور ہر قسم کے شرک سے بچے رہنے کی توفیق عطا فرمادی۔''

قبروں کے تعلق سے جابر بن عبداللہ ﷠ کی روایت سے درج ذیل حدیث بھی آج کے معاشرے کو غور وفکر کی دعوت دیتی ہے، ''رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو پختہ کرنے، قبروں پر بیٹھنے اور قبروں پر قبہ یا عمارت بنانے سے منع فرمایا'' ②

اسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت فرمایا ہے جبکہ سنن ابوداؤد اور مستدرک حاکم میں یہ الفاظ بھی وارد ہیں کہ ''آپ ﷺ نے قبروں پر لکھنے سے بھی منع فرمایا'' ③

قوله: ولاحمد بسند جید عن ابن مسعود مرفوعا " اِنَّ مِنْ شِرَارِ النَّاسِ ......

قیامت کے قائم ہونے سے مراد نفخ صور کی گھڑی ہے، چنانچہ صور کے پھونکے جانے کے وقت جو لوگ زندہ ہونگے انتہائی بدترین و بد بخت ہونگے، صحیح مسلم کی ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے [لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلٰى شِرَارِ النَّاسِ] یعنی ''قیامت انتہائی برے لوگوں پر قائم ہوگی'' اس مسئلہ کی کچھ وضاحت اگلے صفحات میں آئے گی۔ (ان شاء اللہ)

اس حدیث میں دوسرے نمبر پر ان لوگوں کو انتہائی بدترین قرار دیا گیا ہے جو قبروں پر مساجد کی تعمیر کرتے ہیں، عمارتیں اور قبے بناتے ہیں، ان کے قریب یا ان کی طرف نمازیں ادا کرتے ہیں۔ ان امور کی ممانعت نبی ﷺ سے تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ نبی ﷺ کا انہیں بدترین قرار دینا محض اس لئے ہے کہ اس وعیدِ شدید کو

......

① اسکی سند جید ہے۔ مسند احمد (٤١٤٣،٣٨٤٤ ج٢) صحیح ابن خزیمه (٨٧٩) صحیح ابن حبان (٣٤١،٣٤٠).

② صحیح مسلم، کتاب الجنائز (٩٧٠).

③ سنن ابوداؤد (٣٢٢٦) سنن ترمذی (١٠٥٢) مستدرك حاكم (١/٣٧٠) اس کی سند صحیح ہے۔

سن کر لوگ اس عمل سے باز آجائیں، آپ ﷺ کا یہ فرمان اُمت پر انتہائی درجہ شفقت کی دلیل ہے، مبادا یہ عمل اُمت کے افراد کو شرک کی وادی میں نہ دھکیل دے، جیسا کہ یہود و نصاریٰ کو دھکیل دیا تھا۔

انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ قبر پرست اس معنیٰ کی احادیث کو یا تو پس پشت ڈال دینے کی روش اختیار کیئے ہوئے ہیں یا پھر من مانی تاویلیں کر کے ان احادیث کی روح کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ اس سے مراد عام قبریں ہیں، جب کہ انبیاء و صالحین علیہم السلام کی قبروں پر قبے اور مساجد بنانے کا حکم ان سے جدا ہے یعنی انبیاء و صالحین علیہم السلام کی قبروں پر قبے اور مساجد بنانا، اور ان کے درمیان اور ان کی طرف نماز پڑھنا جائز ہے تاکہ ان کے عواطفِ روحانیہ ہم تک پہنچتے رہیں۔ بلاشبہ یہ رکیک تاویل اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی کھلی مخالفت قرار پائے گی، کیونکہ صحیحین میں مروی ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں بڑی صراحت کے ساتھ آپ ﷺ نے ان لوگوں کو مستحقِ لعنت قرار دیا جو کہ انبیاء و صالحین علیہم السلام کی قبروں پر مساجد بناتے ہیں، دوسروں کی قبروں پر مساجد بنانا تو بالاولیٰ ناجائز اور موجب لعنت عمل ہوگا۔ پھر اس کے علاوہ دیگر بہت سی احادیث کا عموم بھی اس فعل کی حرمت کی دلیل ہے۔ اور یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ سے سب سے بڑی عداوت اور محاذ آرائی کی علامت یہ ہے کہ ان سے وارد فرامین کو ان کی منشاء و مراد کے خلاف محمول کیا جائے، بلکہ جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہو، اور انکے مرتکبین کو لعنت و پھٹکار کا مستحق قرار دیا ہو ان چیزوں کو مباح اور جائز قرار دے دیا جانا کتنا بڑا مُہلک ہے؟

قبروں پر مساجد اور قبوں کی تعمیر کی حرمت میں علماء کے اقوال

واضح ہو کہ ان صحیح اور صریح احادیث کی روشنی میں علماءِ امت کا بھی اس بات پر اجماع ہے کہ قبروں پر عمارتیں یا قبے وغیرہ بنانا مطلقاً حرام عمل ہے، اور اگر متاخرین میں سے کسی سے کوئی جواز کا قول ملتا ہے تو وہ شذوذ پر محمول کیا جائے گا۔

امام ابومحمد بن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قبروں پر مساجد بنانا ناجائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر مساجد بنانے والے یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائی۔ ①

اور کیونکہ قبروں کے پاس نماز پڑھنا بت پرستوں کے اس فعل کے ساتھ تشبہ ہے جو وہ اپنے بتوں کے پاس

① صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ (٤٣٦) صحیح مسلم، کتاب المساجد (٥٢٩)۔

سجدہ وغیرہ کی صورت میں بجالاتے ہیں، اور یہ بات معلوم ہے کہ مُردوں کی تصویر سازی ان کی قبروں کو چھونا اور ان قبروں کے پاس کھڑے ہوکر عبادت کرنا ہی درحقیقت بت پرستی کا نکتۂ آغاز تھا۔''

شیخ الاسلام ﷫ فرماتے ہیں: ''قبروں پر مساجد بنانے کو تمام مذاہب کے علماء نے احادیثِ صحیحہ کی بناء پر ممنوع اور حرام لکھا ہے...''

مزید فرماتے ہیں: ''اس عمل کی قطعی حرمت میں کوئی شک نہیں...''

مزید فرماتے ہیں: ''قبور پر بنے ہوئے قبوں کا ازالہ ایک امرِ متعین ہے، اور اس بارے میں علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں۔''

یہی بات حافظ ابن قیم ﷫ نے لکھی ہے، اور فرمایا ہے: ''قبروں پر بنے ہوئے قبے رسول اللہ ﷺ کی معصیت ہے۔''

امام شافعی ﷫ فرماتے ہیں: ''مخلوق کی تعظیم اس معنی میں قطعی ناجائز ہے کہ ان کی قبروں کو مساجد بنالیا جائے...''

مزید فرماتے ہیں: ''قبریں تو سطح زمین کے تقریباً برابر ہونی چاہییں، نہ اونچی ہوں اور نہ ہی ان پر کوئی قبہ تعمیر ہو۔''

امام نووی ﷫ نے بھی ''شرح المهذب'' میں قبروں پر کسی قسم کی تعمیر کو مطلقاً حرام لکھا ہے۔

امام قرطبی ﷫ نے حدیثِ جابر ﷛ کہ ''نبی ﷺ نے قبروں کو پختہ کرنے یا قبروں پر عمارت یا قبہ بنانے سے منع فرمایا'' ① کو ذکر کرکے فرمایا: ''امام مالک ﷫ کا مسلک بھی ظاہرِ حدیث کے مطابق ہے۔''

علماءِ حنفیہ میں سے امام زیلعی ﷫ ''شرح الكنز'' میں فرماتے ہیں: ''قبر پر قبہ بنانا حرام ہے''

نیز ''الخلاصه'' میں فرماتے ہیں: ''قبروں کو پختہ کرنا بھی حرام ہے۔ بہرحال ائمہ اربعہ کے متبعین سے قبروں کو پختہ کرنے، قبروں کو اونچا کرنے اور قبروں پر کسی قسم کی عمارت بنانے کی حرمت وارد ہے''

ان اقوال کو نقل کرنے سے ہمارا مقصود یہ بتانا ہے کہ علماءِ کرام کے اقوال بھی احادیثِ صحیحہ مذکورہ کے موافق ہیں۔

قبروں پر تعمیر قبوں اور عمارتوں کے سترہ مفاسد

واضح ہو کہ قبروں پر قبوں اور عمارتوں کی تعمیر کی وجہ سے بہت سے مفاسد پیدا ہو چکے ہیں، جن کی تفصیل کا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا، ان میں سے کچھ مفاسد درج ذیل ہیں۔

① صحيح مسلم، كتاب الجنائز (۹۷۰)

(۱) ان قبوں کی وجہ سے لوگوں کا قبروں کے پاس نماز پڑھنے کا عادی ہو جانا، جبکہ نبی ﷺ نے قبروں کے پاس نماز پڑھنے سے روکا ہے۔

(۲) ان قبوں سے متاثر ہو کر قبروں کے پاس دعائیں کرنا، یہ بدترین قسم کی بدعت ہے، اور اب تو لوگ اس قسم کی باتیں بھی کرتے ہیں کہ فلاں قبر کے پاس کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا باعثِ قبولیت ہے، اور فلاں قبر تریاق اور مجرب ہے، اور فلاں قبر کو دفعِ بلاء اور جلبِ نعمت میں خصوصی مقام حاصل ہے، اور فلاں شہر کے لوگوں کی تکلیفیں فلاں بزرگ کی قبر کی وجہ سے ٹل جاتی ہیں۔ اس قسم کے تمام عقائد کتاب وسنت اور اجماعِ امت کے خلاف ہیں۔ یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ بیت المقدس میں کتنے انبیاء علیہم السلام اور صالحین کی قبریں ہیں، مگر وہاں کے رہنے والوں پر کتنے مصائب ٹوٹ رہے ہیں؟ بلکہ مدینہ منورہ میں امام الانبیاء ﷺ کی قبرِ مبارک ہے، پھر عام الحرۃ میں اس مقدس شہر میں ہونے والی لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا کیا مفہوم ہوگا؟

(۳) تیسرا مفسدہ یہ ہے کہ قبروں پر عمارت بنانے والے اس لعنت و پھٹکار کے مستحق قرار پاتے ہیں جس کا مذکورہ حدیث میں یہود و نصاریٰ کے حوالے سے ذکر ہے، اس حدیث میں وہ لوگ بھی ملعون قرار پائے جو قبروں پر چراغاں کرتے ہیں۔

(۴) قبروں پر مشاہد (عمارت یا قبہ) کی تعمیر کی وجہ سے قبریں آباد ہو گئیں اور مساجد ویران پڑ گئیں۔

(۵) ایک بہت بڑا مفسدہ یہ ہے کہ زیارتِ قبور و مشاہد عورتوں اور مردوں کے بدترین اختلاط کا ذریعہ بن گئی، نتیجہ یہ کہ فواحش و منکرات کا خطرناک سیلاب امڈ آیا اور لوگ فرض نماز تک سے غافل ہو گئے۔ بلکہ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ زیارتِ مشاہد کے موقع پر ہونے والے فواحش کا صاحبِ قبر متحمل ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض مشاہد کی زیارت کے موقع پر بغرضِ حصولِ ثواب فاحشہ عورتیں اجرت وصول نہیں کرتیں، جیسا کہ بدوی کی قبر پر یہ بات معروف ہے۔ یہ بے دینی کی انتہاء نہیں ہے؟

(۶) قبروں پر عمارتوں کی تعمیر سے ایک مفسدہ یہ بھی پیدا ہوا کہ انہیں نفیس قسم کے کڑھائی کیئے ہوئے ریشمی کپڑوں سے ڈھانپنے کا عمل شروع ہو گیا۔

(۷) ان مزاروں کے تعلق سے اوقاف قائم کر دیئے گئے جو لوگوں کا مال ہتھیانے کا ذریعہ ہیں۔

(۸) مزاروں اور انکے مجاوروں کے لئے اموال کے نذرانے شروع ہو گئے، اور یہ بات معلوم ہے کہ جھوٹے قصوں کا سہارا لیکر لوگوں کو گمراہ کرنے میں ان مجاوروں کا انتہائی گھناؤنا کردار رہا ہے، اور یہ مجاور کفارِ مکہ کے بتوں کے مجاوروں سے تشبہ رکھتے ہیں۔

(۹) لوگ مزاروں کو دیکھ کر صاحبِ قبر کے لئے سربسجود ہو جاتے ہیں، اور یہ عمل کتاب وسنت اور اجماعِ امت کے دلائل سے کفر ہے۔ (واللہ المستعان)

(۱۰) ان مشاہد کے پاس کھڑے ہو کر دعا کرنے والے اللہ تعالیٰ کو صاحبِ قبر کی قسم یا واسطہ دیکر دعا کرتے ہیں، صاحبِ قبر کے لئے نذریں مانتے ہیں، اپنے مال کا کچھ حصہ یا اولاد میں سے کسی کو وقف کر دیتے ہیں (بعینہ یہی گھناؤنا کردار مشرکینِ مکہ کا بھی تھا البتہ وہ اپنی اولاد کو اپنے اوثان کے پاس فروخت نہیں کیا کرتے تھے)۔

(۱۱) اس مزار میں مدفون بزرگ کی ہیبت دل میں اس قدر پیوست ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر انکا خوف پیدا ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی قبر پرست کے لئے اللہ تعالیٰ کی سچی یا جھوٹی ہر قسم کی قسم کھالینا آسان ہے، لیکن اگر اسے قبر والے بزرگ یا بابے کی قسم دی جائے تو جھوٹی قسم کھانے پر کبھی آمادہ نہیں ہوگا، حالانکہ مشرکینِ مکہ کا شرک اس حد تک نہیں پہنچا تھا، ان کے ہاں سب سے بڑی قسم اللہ أحکم الحاکمین کی تھی، جیسا کہ کتبِ حدیث میں مذکور قصۂ قسامہ سے ثابت ہوتا ہے۔

(۱۲) ان مزاروں پر کھڑے ہو کر صاحبِ قبر سے قضائے حاجات اور ازالۂ مصائب ومشکلات کا سوال بھی ایک عظیم مفسدہ کی شکل اختیار کر چکا ہے، بلکہ قبروں کے پاس تضرع اور خشیت وبکاء کی جو کیفیت دیکھنے میں آتی ہے مساجد میں اللہ تعالیٰ کے سامنے دکھائی نہیں دیتی۔

(۱۳) ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ مزاروں کو مساجد سے زیادہ افضل اور مستحقِ تعظیم قرار دے دیا گیا حالانکہ نبی ﷺ نے مساجد کو روئے زمین کا سب سے افضل حصہ قرار دیا۔

(۱۴) زیارتِ قبور کی اجازت میں شریعتِ مطہرہ کا جو مقصد پنہاں ہے وہ اپنی موت اور آخرت کو یاد کرنا ہے، نیز صاحبِ قبر پر بصورتِ دعائے رحمت ومغفرت احسان کرنا ہے، اس طرح شرعی طور پر زیارتِ قبور کے دو فائدے ہوئے، ایک فائدہ زائر کو کہ وہ آخرت کی طرف متوجہ ہو جائے اور دوسرا فائدہ صاحبِ قبر کو کہ وہ زائر کی دعاؤں سے مالا مال ہو جائے۔ لیکن افسوس آج معاملہ الٹ ہو چکا ہے، چنانچہ ان مشاہد کا رخ کرنے والا وہاں کھڑا ہو کر صاحبِ قبر کو پکارنے لگا یا اس کے واسطے سے دعائیں کرنے لگا، اور اس کیلئے رحمت ومغفرت کی دعا کرنے کی بجائے (حالانکہ وہ اس کی دعا کا محتاج ہے) اپنی ذات کیلئے مانگنے لگا۔ اس کی یہ روش اس کیلئے بھی اور صاحبِ قبر کیلئے بھی نقصان دہ بن گئی، اس کیلئے اس طرح کہ وہ تذکرۂ آخرت کے

عظیم ثمرہ سے محروم ہوگیا، اور شرک کی سیاہی سے اپنے دامن کو سیاہ کر کے لوٹ آیا، اور صاحبِ قبر کیلئے اس وجہ سے کہ وہ اس کی دعاؤں سے محروم ہوگیا۔

(۱۵) ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ مزاروں کی زیارت کرنے والے وہاں ایسی ایسی حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں کہ وہ حرکات بذاتِ خود قبر والوں کیلئے ایذاء رسانی کا سبب بن جاتی ہیں، جیسا کہ قرآنِ پاک میں مذکور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے واضح ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ انبیاء علیہم السلام وصالحین قیامت کے دن ببانگِ دہل ان کے تمام کاموں سے بیزاری اور برأت کا اعلان کر دینگے۔

(۱۶) قبروں پر قبہ سازی کا عمل اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے کھلی عداوت، مخالفت اور مناقضت کا مظہر ہے۔

(۱۷) قبروں کے زائرین لمبے چوڑے سفر کر کے جاتے ہیں، زرِ خطیر صرف کرتے ہیں، اور تھکاوٹ سے چور ہو جاتے ہیں۔ لیکن حاصل یہ کہ شرک وبدعت اور فسق وفجور کی ایک بڑی بوجھل گٹھڑی سر پہ لادے لوٹ آتے ہیں۔ (واللہ المستعان)

یہ تمام تر مفاسد انہی قبروں پر رونما ہوتے ہیں جن پر عمارتیں یا قبے بنے ہوتے ہیں جبکہ ایسی قبروں کا کہ جن پر قبوں کا وجود نہ ہو بہت کم لوگ رخ کرتے ہیں۔

اللہ رب العزت عالم الغیب والشہادۃ چونکہ قبوں کے تعلق سے رونما ہونے والے ان تمام مفاسد سے باخبر تھا لھذا اس نے اپنے پیغمبرِ برحق محمد ﷺ کی زبان مبارک سے ان کی شدید مخالفت بیان فرمائی اور قبے بنانے والوں کو مستوجبِ لعنت قرار دے دیا، لہذا تمام تر خیر وہدایت اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہے جبکہ اس کی نافرمانی ہر شر وضلالت کا منبع ہے (نسأل اللہ الهدى والتقى والعافية فى الدنيا والآخرة)



اس باب کے مسائل

(۱) رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کو کہ جو انبیاء علیہم السلام وصالحین کی قبروں کے پاس اللہ تعالیٰ کی عبادت کی غرض سے مسجد تعمیر کرتا ہے، شدید ترین وعید سے نوازا، جس سے یہ ثابت ہوا کہ یہ عمل حرام ہے، خواہ مسجد تعمیر کرنے والے کی نیت کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہو۔

(۲) یہ بات معلوم ہوئی کہ بزرگوں کی صورتوں پر مورتیاں اور مجسمے بنانا ایک ناجائز عمل ہے، نیز اس عمل کی شدید ترین وعید بھی معلوم ہوئی۔

(۳) قبروں اور مجسموں کے مذکورہ فتنوں سے رسول اللہ ﷺ کا انتہائی شد و مد اور مبالغہ آمیز طریقہ سے روکنا، عبرت ونصیحت کا زبردست پہلو رکھتا ہے، چنانچہ پہلے تو آپ ﷺ زندگی بھر گاہے بگاہے اس عمل سے روکتے رہے پھر آپ ﷺ نے اپنی وفات سے پانچ دن قبل اس شرکیہ عمل سے انتہائی سختی سے روکا اور جب آپ ﷺ سکرات الموت میں تھے تو ایک بار پھر اس عمل سے منع فرمایا، اور اس سے قبل متعدد بار روکنے کو کافی نہ سمجھا۔

(۴) آپ ﷺ نے اپنی قبر مبارک کے پاس اس قسم کے عمل کی سختی سے ممانعت فرمادی، حالانکہ آپ ﷺ کی قبر ابھی وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔

(۵) انبیاء علیہم السلام وصالحین کی قبروں پر مساجد کی تعمیر یہود ونصاریٰ کا طریقہ ہے۔

(۶) ان کے اسی عمل کی بناء پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں مستحقِ لعنت قرار دیا۔

(۷) اس سے رسول اللہ ﷺ کا اصل مقصود اپنی اُمت کو متنبہ کرنا تھا کہ وہ آپ ﷺ کی قبر پر اس قسم کا کوئی فعل نہ کریں۔

(۸) آپ ﷺ کی قبر کو نمایاں نہ کرنے کی علت بھی یہی ہے۔

(۹) قبروں کو مساجد بنانے کا معنی ومفہوم بھی واضح ہوا۔

(۱۰) رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو مساجد بنانے والوں کو اور ان لوگوں کو جو قیامت کے قائم ہونے کے وقت زندہ ہونگے ایک ہی حدیث اور ایک ہی سیاق میں جمع فرمایا، اور یہ فرمایا کہ ''یہ دونوں سب سے بدترین لوگ ہیں''، اس طرح آپ ﷺ نے شرک کے وقوع سے قبل ہی اس کا سبب وذریعہ اور اس کا انجام ذکر فرمادیا۔

(۱۱) رسول اللہ ﷺ کا اپنی موت سے پانچ دن قبل اپنے خطبے میں ان افعال کی ممانعت فرمانا دو گمراہ فرقوں پر رد ہے، یہ دونوں فرقے اہلِ بدعت میں سب سے بدترین ہیں، بلکہ بعض اہلِ علم نے انہیں بہتر (۷۲) فرقوں سے بھی خارج کر دیا ہے، ایک روافض اور دوسرے جہمیہ، بلکہ روافض کی وجہ سے اس امت میں شرک اور قبر پرستی شروع ہوئی، اور یہی وہ پہلا گروہ ہے جنہوں نے قبروں پر مساجد کی تعمیر کا سلسلہ شروع کیا۔

(۱۲) یہ چیز بیان ہوئی کہ نبی ﷺ کو شدتِ نزع کا سامنا کرنا پڑا۔

(۱۳) یہ بات معلوم ہوئی کہ نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خلّت کے مقام سے نواز کر آپ ﷺ کو انتہائی تکریم دی۔

(۱۴) یہ بات بھی واضح ہوئی کہ مقامِ خلت، مقامِ محبت سے اعلیٰ و برتر ہے۔

(۱۵) یہ بات صراحت سے بیان ہوئی کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ باقی تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے افضل ہیں۔

(۱۶) اور اس باب میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کی طرف بھی اشارہ ہے۔



باب

ما جاء ان الغلو في قبور الصالحين يصيرها أوثاناتعبد من دون الله

صالحین کی قبروں میں غلو کا مظاہرہ انہیں وہ اوثان (بت) بنادیتا ہے، جن کی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی جاتی ہے۔

قال:روى مالك في المؤطا [اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ :اَللّٰهُمَّ لَاتَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُّعْبَدُ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰى قَوْمٍ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ] ①

امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں روایت کیا ہے کہ، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ! میری قبر کو وثن نہ بنادینا کہ جسے لوگ پوجنے لگیں، ان قوموں پر اللہ تعالیٰ کا شدید غضب نازل ہوا جنہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو مساجد (یعنی عبادت گاہ) بنالیا۔''

اس باب کے انعقاد کا مقصد

مصنف رحمہ اللہ اس باب میں چند امور کی وضاحت فرمانا چاہتے ہیں۔

(۱) صالحین کی قبروں میں غلو کے ارتکاب سے متنبہ کرنا۔

(۲) قبروں میں غلو کا نتیجہ بالآخر ان کی عبادت ہوتا ہے۔

(۳) جب قبروں کی عبادت شروع ہوجائے تو وہ ''اوثان'' یعنی بت کہلاتی ہیں، خواہ وہ صالحین کی قبریں ہی کیوں نہ ہوں۔

(۴) اور قبروں پر عمارت بنانے یا انہیں مساجد بنانے کے منع ہونے کی علت۔

''اوثان'' وہ معبود کہلاتے ہیں جن کی کوئی شکل وصورت نہ ہو، جیسے قبریں، درخت، ستون، دیواریں اور پتھر وغیرہ، ''اوثان'' وثن کی جمع ہے، بعض لوگ وثن کا معنی صنم یعنی بت کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

نبی ﷺ کی دعا ''اے اللہ میری قبر کو پوجا گاہ نہ بنانا'' کی شرح اور مسئلۃ الباب کیلئے وجہ استدلال

قوله:روى مالك في المؤطا :اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ :اَللّٰهُمَّ لَاتَجْعَلْ قَبْرِيْ ......

① اس کی سند صحیح ہے۔مسند احمد (۷۳۶۲ج۳) المؤطا (۱۷۲/۱)۔

یہ حدیث موصولاً و مرسلاً بہت سے طرق سے مروی ہے، اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی ایک دعا مذکور ہے، یعنی ''اے اللہ میری قبر کو وثن یعنی بت نہ بنا دینا کہ لوگ یہاں آ کر قبر کی عبادت کرنے لگیں۔''

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی یہ دعا قبول فرمالی ہے، چنانچہ آپ ﷺ کی قبر کا اس طرح تین دیواریں احاطہ کئے ہوئیں ہیں کہ اس تک پہنچنا ممکن نہیں ہے'' یہ حدیث اس بات پر بڑی صراحت سے دلالت کر رہی ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کی قبر بھی پوجی جائے گی تو وہ بھی وثن بن جائے گی، دوسروں کی قبر کا کیا ذکر۔ ان قبروں کے حوالے سے اصلاح کے نظریہ سے اگر غلو کے ارتکاب سے روکا جائے تو قبر پرست عناصر شدید ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں، ان کے دل تنگ ہو جاتے ہیں اور نفوس کبر و تعلی سے لبریز ہو جاتے ہیں، اصلاح کی بات کرنے والوں کو مغلظات سے نوازا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ یہ بلند رتبہ ہستیوں کی تنقیص و توہین کے مرتکب ہیں۔ (واللہ المستعان)

اس حدیث سے یہ استدلال بھی کیا جا سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام و صالحین کے آثار و نشانات مثلاً ان کی قبریں، ان کے بیٹھنے کی جگہیں، ان کی نماز پڑھنے کی جگہیں یا ان کے دعاء مانگنے کے مقامات کی تلاش اور تتبع ممنوع ہے، یہ چیز بدعات میں شمار ہوتی ہے، سلف صالحین، صحابہ و تابعین اس کا انکار کرتے تھے، سلف میں سے کسی سے ایسا کرنا یا ایسا کرنے کی اجازت دینا منقول نہیں ہے، صرف سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کچھ چیزیں نقل کی جاتی ہیں، لیکن ان چیزوں میں ان کا مقصود نبی ﷺ کے ساتھ تشبہ ہوتا تھا۔ کسی صحابی سے ان کی موافقت کرنا ثابت نہیں بلکہ ان کے باپ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی مخالفت کی تاکہ یہ معاملہ شرک کی حدود تک نہ پہنچ جائے۔ امام مالک رحمہ اللہ اس درخت کی تلاش سے روکا کرتے تھے جس کے نیچے ''بیعت رضوان'' ہوئی تھی، سیدنا امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا کہ لوگ اس درخت کے نیچے نماز ادا کر رہے ہیں تو فتنے کے خوف سے اسے کاٹنے کا حکم صادر فرمایا۔ سیدنا امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ سے اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ منقول ہے، چنانچہ معرور بن سوید کا بیان ہے کہ میں نے مکہ کے راستے میں ان کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی، آپ (رضی اللہ عنہ) نے فجر کی نماز میں ﴿ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ ﴾ اور ﴿ لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ ﴾ کی تلاوت فرمائی، پھر آپ نے دیکھا کہ لوگ مختلف راستوں پر چلے جا رہے ہیں، پوچھا یہ سب کہاں جا رہے ہیں؟ بتایا گیا، امیر المؤمنین یہاں کسی مقام پر رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی تھی یہ لوگ وہاں نماز پڑھنے کیلئے جا رہے ہیں، فرمایا: اس قسم کے عمل نے تم سے پہلی قوموں کو برباد کر دیا وہ اپنے انبیاء علیہم السلام کے آثار و نشانات ڈھونڈا کرتے اور انہیں گرجا بنا لیتے۔ جو شخص کسی ایسی مسجد میں کہ جہاں نبی ﷺ نے نماز پڑھی،

نماز کا وقت پالے وہ وہاں ضرور نماز پڑھ لے، ورنہ اپنا سفر جاری رکھے، اور ان مقامات کا قصد نہ کرے۔ ①

قصہ دانیال علیہ السلام

مغازی ابن اسحاق میں یہ قصہ منقول ہے کہ خالد بن دینار فرماتے ہیں: ہمیں ابو العالیہ نے بتایا کہ جب ہم نے تُستر کا علاقہ فتح کیا تو ھرمزان کے بیت المال میں ایک چارپائی دیکھی جس پر ایک شخص کی لاش تھی جس کے سر کے پاس ایک مصحف رکھا ہوا، تھا ہم نے وہ مصحف سیدنا امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچا دیا، جنہوں نے کعب کو بلا کر اس کا عربی ترجمہ کروایا، عرب میں سب سے پہلے میں نے اسے پڑھا، اور یوں پڑھا جیسے قرآن کی تلاوت کرتا ہوں، خالد بن دینار نے ابو العالیہ سے پوچھا کہ اس مصحف میں کیا تھا؟ فرمایا: تمہاری سیرت، مختلف امور اور کلام کے الحان، نیز یہ کہ آئندہ کیا ہونیوالا ہے؟ میں نے پوچھا اس لاش کا کیا کیا؟ فرمایا: ہم نے دن میں مختلف جگہوں پر تیرہ قبریں کھودیں اور جب رات ہوئی تو اسے کسی ایک قبر میں دفن کر کے باقی قبروں کو برابر کر دیا، مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو پتہ نہ چل سکے کہ وہ لاش کس قبر میں مدفون ہے۔ میں نے پوچھا ان لوگوں کو اس لاش سے کیا امیدیں وابستہ تھیں؟ فرمایا: جب آسمان سے بارش نہ برستی تو لوگ اس کی چارپائی کو باہر لے آتے جس سے فوراً بارش شروع ہو جاتی۔ میں نے پوچھا تمہارے خیال میں وہ لاش کس کی ہو سکتی ہے؟ فرمایا: اس شخصیت کا نام دانیال ہے۔ میں نے پوچھا تقریباً کتنا عرصہ پہلے اس کا انتقال ہوا؟ فرمایا: تین سو سال قبل۔ میں نے پوچھا: ان کے جسم کی کوئی چیز تبدیل ہوئی؟ فرمایا: نہیں سوائے گردن کے چند بالوں کے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا گوشت زمین نہیں کھاتی۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس قصہ میں انصار و مہاجرین نے ان کی قبر کو چھپانے کا جو عمل کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ مبتلائے فتنہ نہ ہو جائیں، ان کبار صحابہ نے ان کی قبر کو دعاء اور تبرک کے لئے ظاہر نہیں کیا، اگر یہ چارپائی متأخرین کو مل جاتی تو وہ اپنی تلواریں لیکر ٹوٹ پڑتے اور اس کی پوجا شروع کر دیتے۔''

شیخ الاسلام فرماتے ہیں: ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس کی قبر کو چھپا دینا قبروں پر غلو کے ارتکاب سے انکار کے مترادف ہے'' (انتھیٰ ملخصاً)

حدیث مذکور کا دوسرا جملہ یہ ہے: کہ ''کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے شدید ترین غضب کے مستحق بنے جس کا سبب صرف یہ تھا کہ انہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا'' جس سے ان کا مقصود توسل تھا، لیکن
=

① اس کی سند صحیح ہے۔ سنن سعید بن منصور، الاقتضاء ص ٤٧٦۔

قال: ولابن جرير بسنده عن سفيان عن منصور عن مجاهد : ﴿ أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى ﴾ قال :كَانَ يَلُتُّ لَهُمُ السَّوِيقَ فَمَاتَ فَعَكَفُوْا عَلٰى قَبْرِهٖ ۔ وَكَذَا قَالَ اَبُوْ الجوزاءِ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ كَانَ يَلُتُّ السَّوِيْقَ لِلْحَاجِّ . ①

ابن جریر اپنی سند سے سفیان ثوری سے، اور وہ منصور بن المعتمر سے، اور وہ مجاہد سے ﴿ أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى ﴾ کی تفسیر میں روایت کرتے ہیں: ''اللات'' حاجیوں کیلئے ستو بنایا کرتا تھا، وہ مرا تو لوگوں نے اس کی قبر پر مجاورت اختیار کر لی۔ یہی بات ابوالجوزاء نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ حاجیوں کے لئے ستو بنایا کرتا تھا۔

=

آگے چل کے وہ اوثان بن گئے جن کی پوجا شروع ہوگئی۔ اس حدیث سے ایک بات تو یہ ثابت ہوئی کہ قبروں پر عمارت یا قبہ بنانا حرام ہے، دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ قبروں کے پاس نماز پڑھنا بھی حرام ہے۔

مشرکین کے بت ''اللات'' کا نکتہ آغاز غلو ہی تھا

قوله: ولابن جرير بسنده عن سفيان عن منصور عن مجاهد :......

''اللات'' کا اصل نام ''صرمۃ بن غنم'' بتایا گیا ہے، یہ شخص ستو، مکھن اور پنیر وغیرہ کا خلطہ بنا کر آنے جانے والوں کو کھلایا کرتا تھا، جس کے بارے مشہور تھا کہ اسے تناول کرنے والا صحت مند اور توانا ہو جاتا ہے، جب اس کا انتقال ہوا تو لوگوں نے اس کی قبر پر مجاورت اختیار کی، اور پھر رفتہ رفتہ عبادت شروع کر دی۔ ''اللات'' کے بارے میں مزید کچھ باتیں (باب من تبرك بشجرة ....) میں گزر چکی ہیں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اللات کی عبادت کا نکتہ آغاز اس کی قبر میں غلو تھا۔ قومِ نوح کے صالحین ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کی عبادت بھی اسی غلو سے شروع ہوئی۔ آج بھی قبروں اور مردوں کی پوجا کرنے والے پہلے پہل غلو کا ارتکاب کرتے ہیں پھر ان کی قبروں پر قبے اور مساجد بنا لیتے ہیں، اور پھر انہیں تکمیل حاجات کا مرکز قرار دے دیتے ہیں، لہذا غلو ہی تمام اولین کے مرتکب شرک ہونے کی اصل اساس رہا ہے، اور قیامت تک آنے والوں کے شرک کی بنیا د رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے اولیاء سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے، نیز یہ کہ ہم ان کے اندر خصائصِ الوہیت پیدا کرنے کے بجائے انہیں مرتبۂ عبودیت تک محدود رکھیں، یہی ان کی حد درجہ تعظیم وتکریم ہے، نہ تو انہیں ان کے مرتبہ سے اونچا کیا جائے، نہ انکے مقام سے نیچے گرایا جائے۔ =

① صحيح بخاری، كتاب التفسير(٤٨٥٩).

قال : وعن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھما قَالَ :[لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ ، وَالْمُتَّخِذِ یْنَ عَلَیْھَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرجَ] (رواہ اھل السنن) ①

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ،فرماتے ہیں :''رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر، نیز قبروں پر مساجد بنانے والوں اور چراغاں کرنے والوں پر لعنت فرمائی ہے'' (اسے اہل سنن نے روایت کیا ہے)

چونکہ غلو ظہورِ شرک کا مرکزی سبب ہے لھذا یہ فسادِ عظیم کا باعث ہے۔قبر پرست لوگ ہدایت وسنت کے صحیح راستے سے یکسر غافل ہوکر ان بزرگوں کی قبروں کے مجاور بن کر انکی جھوٹی تعظیم میں مصروف ہیں ،جھوٹی تعظیم اسلئے کے صالحین کی تعظیم کا یہ طریقہ یقیناً ان کے افعال کے خلاف ہے ،تو ان کی تعلیمات کو ٹھکرانے والا کون سی تعظیم کررہا ہے؟ انبیاء علیہم السلام وصالحین کا حقِ تعظیم ومحبت تو اس طرح ادا ہوتا ہے کہ جو علم نافع اور عمل صالح وہ لیکر آئے اس میں ان کی پوری پوری اتباع کی جائے ،اوران کے نقشِ قدم کا سچا پیروکار بنا جائے ......نہ کہ ان کی اوران کی قبروں کی پوجا کی جائے ،اور بت پرستوں کی طرح ان کی مجاورت کی جائے ،اوروہاں عرس اورمیلوں کا انعقاد کیا جائے ،اوران کی آڑ میں گھناؤنے فواحش ومنکرات کا ارتکاب کیا جائے ،اورنماز تک نہ پڑھی جائے ۔اس کے برعکس اگر آپ ان کی تعلیمات پر عمل کریں گے تو آپ کا عمل کرنا ان کے اضافہ اجر وثواب کا باعث ہوگا......اوراگر ان کی تعلیمات چھوڑ کر غیر شرعی امور کا ارتکاب کریں گے تو خود بھی اجر سے محروم اورانہیں بھی محروم کردینگے!! تو یہ کیسا احترام اورکیسی تعظیم ہے؟؟

قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں کا مستحقِ لعنت ہونا

قولہ: وعن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھما قَالَ : لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ ......

اس حدیث میں بیان شدہ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ۔آپ ﷺ کا لعنت فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ عورتوں کا قبروں کی زیارت کرنا حرام ہے۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور بہت سے علماء کا یہی مذہب ہے۔

عورتوں کیلئے زیارتِ قبور کی حرمت کی بہت سی وجوہات بیان کی گئی ہیں ،جن میں ان کا جزع فزع کرنا، ندبہ اورنوحہ کرنا ،قبروں کو دیکھ کر مبتلائے فتنہ ہونا ،اور بعض اوقات اپنے رونے دھونے سے میت کی ایذاء کا

① اس کی سند منقطع ہے۔مسند احمد(۲۰۳۰، ۲۶۰۳، ۲۹۸۶، ۳۱۱۸ ج۱)۔

سبب بننا وغیرہ قابل ذکر ہیں ...... گویا عورتوں کا قبروں کی زیارت کرنا بہت سے حرام امور کا سبب اور مظنہ بن سکتا ہے ...... اور یہ شرعی اصل معلوم ہے کہ جب کسی ممنوع امر کی حکمت مخفی ہو تو وہ مظنہ حکمت پر معلق ہوگی، لھذا حرام قرار پائے گی تا کہ معاملہ اس پر موقوف ہو جائے ...... اور کوئی خاتون میت کے لئے دعا مانگنے، یا عبرت ونصیحت کی غرض سے زیارت قبور کا جواز ڈھونڈے تو اسے کہا جائے کہ یہ دونوں کام گھر میں بھی ہو سکتے ہیں۔ گویا زیارت قبور کی مصلحت اور مفسدت میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

مسند احمد، سنن ابن ماجہ اور مستدرک حاکم میں حسان بن ثابت ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔'' ①

ان روایات میں اور صحیح مسلم کی حدیث " كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا " ②

یعنی ''میں تمہیں قبروں کی زیارت سے روکتا تھا اب زیارت کرلیا کرو''

میں کوئی تعارض نہیں ہے؛ کیونکہ اولاً: یہ خطاب مردوں سے ہے۔

ثانیاً: اگر اس میں عورتوں کا داخل ہونا تسلیم کرلیا جائے تو پھر بھی یہ حدیث عام، اور سابقہ احادیث خاص قرار پائیں گی، اور قاعدہ مسلمہ ہے کہ خاص، عام پر مقدم ہوتا ہے۔ نیز مردوں کے خطاب میں عورتوں کے داخل ہونے کے متعلق اہل اصول کا اختلاف بھی مدِ نظر رہے۔

اس حدیث میں بیان شدہ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قبروں پر مساجد بنانے والا بھی ملعون ہے اس مسئلہ کی مفصل شرح مع بیان العلۃ پچھلے باب میں گزر چکی ہے۔

قبروں پر چراغ و دیئے جلانا شرک کی مختلف انواع واقسام کا منبع ہے

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ قبروں پر چراغ یا دیئے جلانے والا بھی لعنت کا مستحق ہے۔

ابو محمد المقدسی فرماتے ہیں: ''اگر قبر پر چراغ روشن کرنا جائز ہوتا، تو پھر چراغ جلانے والے کو بھی لعنت کا مستحق قرار نہ دیا جاتا ...... اس فعل میں بلا مقصد مال کا ضیاع ہے، نیز قبروں کی تعظیم میں افراط وغلو کا ارتکاب ہے، اور یہ اس تعظیم کے مشابہ ہے جو مشرکین اپنے بتوں کی کرتے ہیں۔''

امام ابن القیم رحمہ اللہ قبروں پر مساجد تعمیر کرنے اور چراغ روشن کرنے کو کبیرہ گناہ قرار دیتے ہیں۔

① یہ حدیث طرق اور شواہد کی بناء پر حسن ہے۔ مسند احمد (١٥٦٥٧ ج٥) سنن ابن ماجہ (١٥٧٤) مستدرک حاکم (٣٧٤/١) سنن ترمذی (١٠٥٦) مصنف عبد الرزاق (٥٦٩/٣)۔

② حدیث کا جزء ہے۔ صحیح مسلم، کتب الجنائز (٩٧٧).

(مترجم کہتا ہے قبروں پر دیئے یا چراغ جلانا تو شرک کی بہت سی انواع واقسام کا منبع ہے؛ کیونکہ چراغ جلانے سے مقصود صاحبِ قبر کی رضا جوئی ہے اور یہ شرک ہے، پھر چراغ روشن کرنے والے کا لازماً یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ صاحبِ قبر اس کے چراغ روشن کرنے کے عمل سے واقف ہے، اور ظاہر ہے اس عمل سے آگاہ ہوگا تو راضی ہوگا......سو اس کے جاننے اور آگاہ ہونے کا عقیدہ رکھنا بھی شرک ہے کیونکہ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔تیسری بات یہ ہے کہ چراغ روشن کرنے والا شخص اپنے اس عمل سے قبر والے کو اس لئے خوش کرنا چاہتا ہے کہ وہ اس کی حاجت پوری کردے، اس کی بگڑی بنادے، اور یہ بھی عین شرک ہے۔)

(واللہ المستعان)



اس باب کے مسائل

(۱) اوثان کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) عبادت کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۳) نبی ﷺ نے اس چیز سے پناہ طلب فرمائی ہے جس کے وقوع کا اندیشہ اور خطرہ ہو۔(اشارہ آپ ﷺ کی اس دعا کی طرف ہے''اے اللہ میری قبر کو پوجا کا وثن (پوجا گاہ) نہ بنانا''

(۴) آپ ﷺ نے اپنی اس دعا''میری قبر کو پوجا گاہ نہ بنانا'' کو یہود ونصاریٰ کے اس فعل بد کہ ''انہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا''، کے ساتھ جوڑ کر بیان فرمایا، (اور ظاہر ہے کہ یہ اُمت سابقہ امتوں کی ہو بہو پیروی کرے گی)۔

(۵) اللہ تعالیٰ کے غضب کی شدت کا ذکر (اور یہ غضب کی شدت ان لوگوں کے لئے مذکور ہے جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا)

(۶) یہ مسئلہ سب سے اہم ہے کہ "اللات" جو عرب کا سب سے بڑا بت ہے کی عبادت کیسے شروع ہوئی (یعنی "اللات" کی عبادت کا نکتہ آغاز اس کی قبر کے تعلق سے غلو کا ارتکاب ہے)۔

(۷) یہ ایک نیک شخص کی قبر تھی (نیک شخص کی قبر کی بھی اگر پوجا ہوگی تو وہ وثن (بت، پوجا گاہ) بن جائے گی)

(۸) "اللات" صاحب قبر کا نام تھا، اس کے نام کی وجہ تسمیہ معلوم ہوئی۔

(۹) رسول اللہ ﷺ کا ان عورتوں پر لعنت فرمانا معلوم ہوا جو قبروں کی زیارت کرتی ہیں۔

(۱۰) رسول اللہ ﷺ کا ان لوگوں پر لعنت فرمانا معلوم ہوا جو قبروں پر چراغ جلاتے ہیں۔



باب ماجاء فی حمایة المصطفی ﷺ

جناب التوحید وسدہ کل طریق یوصل الی الشرك

نبی مصطفیٰ ﷺ کا حفاظتِ توحید کیلئے، نیز شرک کی طرف جانے والے ہرراستے کو بند کرنے کیلئے بے پناہ کوششیں فرمانا

قال:وقوله تعالیٰ: ﴿ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴾ ①

''تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں جن پر تمہیں تکلیف دینے کی بات نہایت گراں گزرتی ہے جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں، ایمان داروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔ پھر اگر روگردانی کریں تو آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ میرے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے، اسکے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور وہ بڑے عرش کا مالک ہے''

عقیدۂ توحید کی حفاظت وحمایت کے تعلق سے آپ ﷺ نے جو جدوجہد و مساعی صرف فرمائیں ان کا سابقہ ابواب میں گاہے بگاہے ذکر ہوتا رہا ہے۔ اب مصنف رحمہ اللہ چاہتے ہیں کہ ایک مستقل، مکمل اور علیحدہ باب میں امام الانبیاء ﷺ کی حمایتِ توحید اور تنفیذِ شرک کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کا ذکر کیا جائے، چنانچہ اس سلسلہ میں آپ ﷺ نے کس قدر محنتِ شاقہ فرمائی، اپنی قوم کو شرک کی تباہ کاریوں سے کتنا ڈرایا، خاص وعام مجالس میں دعوتِ توحید پیش فرمائی، اور یوں ملتِ حنیفیت جو سماحت ووسعت سے پُر ہے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا فرمائی تھی، کی حفاظت وحمایت کا حق ادا فرما دیا۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہمارا دین حنیفیت اور سماحت دونوں کا مرقع ہے، حنیفیت عقیدہ کے اعتبار سے، اور سماحت عمل کے اعتبار سے۔

بعض علماء کا قول ہے: ''ہماری شریعت توحید کی دعوت اور شرک کی مذمت وشناعت میں سب سے سخت ہے، جبکہ عملی پہلو سے سب سے زیادہ سماحت ووسعت کی حامل ہے۔''

---

① (توبہ: ۱۲۸، ۱۲۹)

قرآن سے استدلال

قولہ: قولہ تعالیٰ: لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُولٞ مِّنۡ أَنفُسِكُمۡ عَزِيزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ ....

اس آیتِ مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ کے کچھ برگزیدہ اوصاف اور اعلیٰ قسم کے محاسن کا بیان ہے جن میں سرِفہرست خوبی امت کے لئے ناصح اور خیرخواہ ہونے کی ہے، جس کا طریق یہ ہے کہ آپ ﷺ نے مکمل دین پہنچا کر، ایک ایک لفظ کی وضاحت فرما کر اور ہر ہر قدم پر اپنی امت کی راہنمائی فرمائی۔ چنانچہ معجم طبرانی کبیر میں صحیح سند کے ساتھ سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس حال میں چھوڑا کہ پھڑ پھڑانے والے پرندے کے متعلق بھی رہنمائی فرما گئے۔ ①

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی مروی ہے کہ جنت سے قریب کرنے والی اور جہنم سے دور کرنے والی کوئی چیز باقی نہیں بچی جسے میں نے بیان نہ کر دیا ہو۔ ②

صحیح مسلم میں سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے الاؤ روشن کیا، جب آس پاس روشنی پھیل گئی تو پروانے اس آگ میں داخل ہونے کیلئے پہنچ گئے، وہ شخص انہیں اس آگ سے دور کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ پروانے باز نہ آئے، اور آگ میں داخل ہو گئے، یہی میری اور تمہاری مثال ہے میں تمہیں تمہاری پشتوں سے کھینچ کر آگ سے بچا رہا ہوں کہ آگ سے بچ جاؤ، آگ سے بچ جاؤ لیکن تم مجھ پر غالب آجاتے ہو اور آگ میں کود جاتے ہو۔ ③

ان تمام احادیث سے رسول اللہ ﷺ کا امت کے حق میں خیرخواہ ہونے کا واضح ثبوت فراہم ہوتا ہے، اور چونکہ سب سے بنیادی مسئلہ توحید ہے، اور سب سے خطرناک حقیقت شرک میں مبتلا ہونا ہے لھذا رسول اللہ ﷺ کا جانبِ توحید کی حفاظت وصیانت اور شرک کی ہر راہ کا سدِباب، بطریقِ اولیٰ شدید ترین عنایت اور حمایتِ توحید کا مظہر ہے، چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ کی نشاندہی کرنے والی ہستی نے اپنی امت کو شرک کی دلدل سے بچانے اور نکالنے کیلئے کس انداز سے کوشش کی ہوگی؟ اور چونکہ شرک کا مبدأ اور آغاز سفر ہونے میں قبریں سرِفہرست ہیں۔ چنانچہ قدیم وجدید ہر دور میں قبروں کے سلسلے میں غلو، شرک میں مبتلا ہونے کا شاخسانہ رہا ہے، =

---

① اس کی سند حسن ہے۔ طبرانی کبیر (١٦٤٧) امام هيثمي المجمع (٢٦٣/٨) میں فرماتے ہیں: اس کے تمام راوی صحیح بخاری کے ہیں، سوائے محمد بن عبداللہ بن یزید المقری کے اور وہ بھی ثقہ ہے۔

② صحيح بخاري، كتاب الرقاق (٦٤٨٣)

③ صحيح مسلم، كتاب الفضائل (١٨/٢٢٨٤)

قال :عن ابی ھریرة رضی اللہ عنہ قال :" قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لاتَجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ قُبُوْرًا ، وَلاتَجْعَلُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا ، وَصَلُّوْا عَلَیَّ فَاِنَّ صَلاتَکُمْ تَبْلُغُنِیْ حَیْثُ کُنْتُمْ "

رواہ ابو داؤد باسناد حسن ، رواتہ ثقات ①

سیدنا ابوھریرة رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، اور میری قبر کو میلہ گاہ نہ بناؤ، اور مجھ پر درود پڑھو، بے شک تمہارا درود تم جہاں بھی ہو مجھے پہنچ جاتا ہے۔ (اسے ابوداؤد نے بسندِ حسن روایت کیا ہے، اور اس کے تمام روات ثقہ ہیں)

لھذا یقینی طور پر رسول اللہ ﷺ نے قبروں کے سلسلے میں ہولناکیوں اور فتنہ پردازیوں کا ذکر فرمایا، اور اس پہلو سے جانبِ توحید کی مکمل حفاظت کی خاطر اپنی قبرِ مبارک کا جو کہ اشرف القبور ہے بطور خاص ذکر فرمایا، جیسا کہ گزشتہ باب میں آپ ﷺ کی یہ دعا ذکر کی گئی کہ ''اے اللہ! میری قبر کو پوجا و پرستش کا بت نہ بنانا۔''

اس باب میں مصنف رحمہ اللہ نے اسی قبیل کی ایک اور حدیث ذکر کی ہے جس سے آپ ﷺ کا عقیدۂ توحید کی غایت درجہ حفاظت اور رعایت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ حدیث ملاحظہ ہو۔

حدیثِ ابوھریرة رضی اللہ عنہ سے استدلال

قولہ :عن ابی ھریرة رضی اللہ عنہ قال :" قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لاتَجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ قُبُوْرًا ، ......

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے کئی احکام ارشاد فرمائے، جن کا بیان درج ذیل ہے

(۱) ''گھروں کو قبرستان نہ بناؤ'' شیخ الاسلام فرماتے ہیں: ''کہ گھروں کو نماز، دعا اور قرأتِ قرآن سے خالی نہیں رکھنا چاہئے، کیونکہ خالی رکھنے سے وہ بمنزلہ قبرستان ہو جاتے ہیں۔ اس حدیث میں گھروں کے اندر عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور قبرستان کے اندر کسی بھی قسم کی عبادت کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے ''کہ اپنی نمازوں کا کچھ حصہ گھروں میں ادا کیا کرو، اور گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔'' ②

① مسند احمد (۷۸۲۶، ۸۴۵۱، ۸۲۹۴، ۹۰۵۲ ج۳) سنن ابی داؤد (۲۰۴۲) امام نووی نے "الاذکار" (ص۹۳) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

② صحیح بخاری ، کتاب الصلوٰة (۴۳۲) صحیح مسلم ، کتاب صلوٰة المسافرین (۷۷۷) الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔

صحیح مسلم میں سیدنا ابوھریرۃ ﷜ کی ایک مرفوع حدیث کے یہ الفاظ بھی ہیں کہ ''تم گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے، جس گھر میں سورہ بقرۃ کی تلاوت ہوتی ہو۔'' ①

اس حدیث میں انتہائی صراحت کے ساتھ یہ مسئلہ موجود ہے کہ قبرستان میں نماز پڑھنا جائز نہیں، اور اسکی حکمت امت کو مظنہ ہائے شرک سے دور رکھنے کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے۔

(۲) اس حدیث میں بیان شدہ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی قبر پر عرس اور میلوں کے انعقاد سے منع فرمادیا۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں: ''کہ عید اس اجتماع عام کو کہتے ہیں جو طے شدہ پروگرام کے مطابق بار بار منعقد ہو خواہ ہر سال ہو یا ہر مہینہ یا ہر ہفتے۔''

حافظ ابن قیم ﵀ فرماتے ہیں'' کہ اس کا اطلاق زمان ومکان دونوں پر ہوتا ہے، اسلام سے پہلے مشرکین زمانی ومکانی دونوں قسم کی عیدیں منایا کرتے تھے، اسلام نے آکر ان سب کو باطل قرار دیا اور ان کے بدلے عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی صورت میں زمانی عیدیں دیں اور بیت اللہ شریف میں منی، مزدلفہ اور عرفہ کی صورت میں مکانی عیدیں دیں۔''

حدیث زیرِ بحث میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی قبر کو میلہ گاہ بنانے سے منع فرمایا جس سے بعض باطل پرست اور ملحدانہ ذہنیت رکھنے والے لوگوں نے یہ تلبیس اور شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی کہ سال بسال میلہ لگانے سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ قبر کے پاس رہو، اور اس کی مجاورت اختیار کرو، اور سال میں ایک بار آنے پر اکتفا نہ کرو۔

حافظ ابن قیم ﵀ اس شبہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ'' یہ بات رسول اللہ ﷺ کے مقصود ومطلوب کے ساتھ کھلی دشمنی ہے، حقیقت کو مسخ کرنے اور رسول اللہ ﷺ کی جانب تلبیس وتدلیس کی نسبت کرنے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ ان باطل پرست عناصر کا ستیاناس کرے کہ یہ کس قسم کے اختراعات اور تخرصات سے کام لیتے ہوئے دین کے حقائق کی تبدیلی کے جرم عظیم کے مرتکب ہورہے ہیں، ہمیشہ سے اس قسم کے لوگوں نے انبیاء ﷩ کے ادیان کو تغیر وتبدل کی زد میں رکھا۔ اور اگر رسول اللہ ﷺ کے دین کی حفاظت کیلئے اللہ تعالیٰ انصار واعوان پیدا نہ فرماتا تو اس دین پر بھی وہی گزرتی جو سابقہ ادیان پر گزر چکی ہے۔ ان دجال صفت لوگوں نے اس حدیث سے جو کچھ سمجھا ہے اگر وہی چیز مرادِ رسول ہوتی تو آپ ﷺ انبیاء ﷩ کی قبروں کو مساجد بنانے سے نہ روکتے، اور ایسا کرنے والوں پر لعنت نہ فرماتے، لیکن جب انبیاء ﷩ کی قبروں

① صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین (۷۸۰)

کو مساجد بنا کر ان میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا ملعون قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر مستقل قبروں کی مجاورت وملازمت اختیار کرنے والے کا کیا ٹھکانہ ہوگا۔ جس پیغمبر ﷺ نے انبیاء علیہم السلام کی قبروں پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے مسجدیں بنانے سے روک دیا ہو، اور جس پیغمبر نے اپنی قبر کے پرستش گاہ نہ بنائے جانے کی دعا کی ہو، اور جس پیغمبر نے اندیشۂ فتنہ کی بناء پر اپنی قبر کو ظاہر نہ کرنے کا حکم دیا ہو اس پیغمبر سے کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ قبر کی ہمیشہ کے لئے مجاورت اختیار کرنے کا حکم صادر فرمائے؟ پھر اسی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بطور خاص یہ بات ارشاد فرمائی کہ ''تم جہاں بھی ہو مجھ پر درود بھیجو'' اور انتہائی قابل غور بات یہ ہے کہ جو نکتہ ان گمراہ لوگوں نے سمجھا وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہل بیت رسول کیوں نہ سمجھ پائے؟''

بہر حال یہ قول صریح باطل ہے، اور جو چیز اس حدیث سے سمجھ میں آرہی ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خاص طور سے قبرِ مبارک کی زیارت سے منع فرما دیا، اسی طرح کسی وقت کی تخصیص کر کے عرس و میلے کے انعقاد سے بھی منع فرما دیا، اور جب آپ ﷺ کی قبر مبارک پر عرس و میلے کا انعقاد ناجائز ہے تو پھر کسی دوسرے کی قبر پر بھلا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ جبکہ شرعی دلائل سے یہ بات معلوم ہے کہ اس کائنات میں سب سے افضل قبر محمد رسول اللہ ﷺ کی قبر ہے۔

(۳) تیسرا مسئلہ یہ ہے ''کہ آپ ﷺ نے بکثرت درود پڑھنے کا حکم دیا'' اور اس سلسلہ میں فرمایا ''کہ تم دنیا کے کسی بھی کونے سے مجھ پر درود پڑھو گے وہ مجھ تک پہنچ جائے گا''

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ حدیث کے اس حصہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''کہ رسول اللہ ﷺ یہاں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تمہارا درود وسلام مجھ تک پہنچ جائے گا، خواہ قبر کے پاس پڑھو یا دور سے بھیجو، لھذا قبر کے پاس آکر میلہ لگانے کی ضرورت نہیں۔''

اس معنی کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ قبرِ مبارک کے قریب آکر درود وسلام پڑھنے کی کوئی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ درود قریب سے ہو یا دور سے، آپ ﷺ تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ حسن ابن الحسن نے بعض لوگوں کو قبر کے قریب درود پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمانے لگے: ''تم اور اندلس میں درود پڑھنے والے برابر ہیں۔''

اس سلسلہ میں ایک حدیث بطور دلیل پیش کی جاتی ہے، جس سے قریب و دور کا فرق معلوم ہوتا ہے۔
حدیث کے الفاظ یہ ہیں: "مَنْ صَلَّى عَلَيَّ عِنْدَ قَبْرِي سَمِعْتُهُ وَمَنْ صَلَّى عَلَيَّ غَائِبًا بُلِّغْتُهُ" ①

① اس حدیث میں شدید ضعف ہے۔ الضعفاء للعقیلی (۱۹۸) الموضوعات لابن الجوزی (۱/۳۰۲)

قال :و عن علی بن حسین اَنَّہٗ رَأی رَجُلًا یَجِیْءُ اِلٰی فُرْجَۃٍ کَانَتْ عِنْدَ قَبْرِ النَّبِیِّ ﷺ فَیَدْخُلُ فِیْھَا فَیَدْعُوْ ، فَنَھَاہُ . وَقَالَ :اَلَا اُحَدِّثُکُمْ حَدِیْثًا سَمِعْتُہٗ مِنْ اَبِیْ عَنْ جَدِّیْ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: لَا تَتَّخِذُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا ، وَلَا بُیُوْتَکُمْ قُبُوْرًا ، وَصَلُّوْا عَلَیَّ فَاِنَّ تَسْلِیْمَکُمْ یَبْلُغُنِیْ اَیْنَ کُنْتُمْ . رواہ فی المختارۃ

سیدنا علی بن حسین رضی اللہ عنہما نے ایک شخص کو دیکھا جو رسول اللہ ﷺ کی قبر کے پاس ایک سوراخ میں داخل ہو کر دعاء مانگا کرتا تھا، آپ نے اسے منع کر دیا اور فرمایا: کیا میں تمہیں ایک حدیث نہ سناؤ جو میں نے اپنے باپ اور انہوں نے اپنے باپ اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری قبر کو میلہ گاہ نہ بناؤ، اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، بیشک تمہارا سلام مجھ تک پہنچ جاتا ہے خواہ تم کہیں بھی ہو۔'' (اس حدیث کو حافظ ضیاء المقدسی نے اپنی کتاب ''المختارہ'' میں روایت کیا ہے)

=

یعنی: ''جس نے مجھ پر میری قبر کے پاس درود بھیجا، اس کا درود میں خود سن لونگا اور جس نے دور سے درود بھیجا، وہ مجھے پہنچا دیا جائے گا''

یہ حدیث بیہقی وغیرہ میں سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابو عبدالرحمٰن محمد بن مروان السدی ہے، جو سدی صغیر کے وصف سے متعارف ہے۔ یحیٰ بن معین اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''یہ ثقہ نہیں ہے'' جوزجانی نے اسے ذاھب الحدیث اور امام نسائی رحمہ اللہ نے متروک الحدیث کہا ہے۔

اسی قسم کا تبصرہ ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ اور رازدی نے کیا ہے، صالح بن محمد کا کہنا ہے کہ یہ حدیثیں گھڑا کرتا تھا......الخ۔

لھذا جس حدیث کی سند میں اس قسم کا راوی ہو اس حدیث سے کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہوسکتا۔ اور بفرضِ محال اگر اس حدیث کی صحت ثابت بھی کردی جائے، جسے ہم تسلیم بھی کرلیں تو بھی اس پر عمل کرنا ممکن نہیں رہا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی قبر کے قریب پہنچنا ممکن ہی نہیں، جیسا کہ پچھلے صفحات میں گزرا کہ آپ ﷺ کی قبرِ مبارک پر تین دیواریں اس طرح بنادی گئی ہیں کہ کسی شخص کا قریب جانا ممکن ہی نہیں رہا۔ لھذا قبر کے قریب کھڑے ہو کر درود پڑھنے کی خصوصیت باقی نہیں رہی۔

حدیثِ علی رضی اللہ عنہ سے استدلال

قولہ :و عن علی بن حسین اَنَّهٗ رَأٰی رَجُلًا یَجِیْءُ اِلٰی فُرْجَةٍ کَانَتْ......

واضح ہو کہ یہ اور اس سے پہلے والی حدیث ''حسن الاسناد'' ہے، بلکہ پہلی حدیث کثرتِ شواہد کی وجہ سے صحت کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے ،اور دوسری حدیث کے بھی بہت سے شواہد ہیں ۔اس حدیث کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی سند اہل بیتِ رسول پر مشتمل ہے۔

مسند سعید بن منصور میں ہے کہ سھیل بن ابی سھیل کہتے ہیں: کہ مجھے حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بلایا، اس وقت میں قبرِ مبارک کے پاس تھا اور وہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں رات کا کھانا تناول فرمارہے تھے، مجھے بھی کھانے کی دعوت دی میں نے عرض کیا کہ اس وقت کھانے کی طلب نہیں ہے، پھر کہنے لگے قبر کے پاس کیوں کھڑے ہوئے تھے؟ میں نے کہا: نبی ﷺ پر سلام کہنے کی غرض سے، فرمانے لگے کہ جب تم مسجد میں داخل ہوا کرو تو اس وقت سلام کہہ لیا کرو، پھر کہا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''کہ میری قبر کو میلہ گاہ نہ بناؤ، اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، اور مجھ پر درود پڑھا کرو، بے شک تمہارا درود مجھ تک پہنچ جاتا ہے خواہ تم جہاں بھی ہو، اللہ تعالی یہودیوں پر لعنت برسائے کہ انہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو مساجد بنالیا''

پھر کہنے لگے کہ تم اور اندلس میں دورد پڑھنے والے دونوں ہی برابر ہو۔

یہ حدیث اور اس مفہوم کی دیگر احادیث کی دلالت یہ ہے کہ قبور و مشاہد کا دعاء یا نماز کی خاطر قصد کرنا ناجائز ہے، اور سیدنا علی بن حسین رضی اللہ عنہ کے فہم کے مطابق میلہ لگانے کے مترادف ہے، اسی لئے انہوں نے اس آدمی کو نبی ﷺ کی قبر پر دعاء کی غرض سے آنے سے روک دیا۔ تو پھر کسی دوسرے کی قبر کی کیا حیثیت ہے۔

اس حدیث کی یہ بھی دلالت ہے کہ اگر کسی کا مسجدِ رسول میں آنا مطلوب نہ ہو تو اس کا صرف قبرِ رسول پر آنا ممنوع ہے۔ (اس کیلئے شدِ رحال والی حدیث ملاحظہ ہو، جو اگلے صفحات میں ذکر کی جائے گی) ان شاء اللہ۔

اس کے متعلق شیخ الاسلام فرماتے ہیں: ''کہ میری معلومات کے مطابق علماءِ سلف میں سے کسی نے بھی اسے جائز نہیں کہا، لھذا اسے بھی اتخاذِ عید کے زمرے میں شمار کیا جائے گا''

امام مالک رحمہ اللہ اہل مدینہ کے لئے کہ جب بھی وہ مسجد میں داخل ہوں، قبرِ نبی ﷺ پر آنے کو ناپسند کرتے تھے، کیونکہ سلف ایسا نہیں کرتے تھے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: ''کہ اس امت کا آخری دور اسی چیز سے بہتر ہوسکتا ہے جس چیز نے پہلے دور کو بہتر بنایا۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین مسجد نبوی میں آیا کرتے تھے، اور ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کی اقتداء میں نماز پڑھا کرتے تھے، اور نماز سے فارغ ہو کر یا تو وہیں بیٹھ کر ذکر و اذکار کرتے رہتے یا مسجد سے چلے جاتے، قبرِ مبارک پر سلام کہنے کے لئے نہیں آتے تھے، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ نماز کے اندر پڑھا ہوا درود وسلام ہی اکمل وافضل ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے قبرِ مبارک کے پاس جا کر درود یا سلام کے لئے بیٹھے رہنے کو مشروع قرار نہیں دیا گیا، بلکہ آپ ﷺ نے انہیں اس فرمان کے ذریعے منع فرما دیا "لَا تَتَّخِذُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا، وَصَلُّوْا عَلَیَّ فَاِنَّ صَلَاتَکُمْ تَبْلُغُنِیْ"

یعنی "میری قبر کو میلہ گاہ نہ بناؤ اور مجھ پر درود پڑھا کرو بے شک تمہارا درود مجھ تک پہنچ جاتا ہے۔"

اور اسی بناء پر آپ ﷺ نے انبیاء علیہم السلام کی قبور پر مساجد بنانے والوں کو ملعون قرار دیا۔ اس وقت جس حجرہ میں آپ ﷺ کی قبر تھی اس میں بذریعہ دروازہ داخل ہونا ممکن تھا، کیونکہ عائشہ رضی اللہ عنہا وہیں رہتی تھی، لیکن اس کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قبر تک نہیں جایا کرتے تھے، نہ درود وسلام کے لئے، نہ اپنے یا کسی غیر کے حق میں دعاء کرنے کیلئے، نہ کسی حدیث یا مسئلہ کے دریافت کرنے کے لئے۔ اور نہ ہی شیطان ان پر کسی فریب کاری کی وجہ سے غلبہ حاصل کر سکا، مثلاً انہیں کوئی کلام یا سلام سنا کر اس وہم میں مبتلا کرتا کہ آپ ﷺ نے قبر سے کلام فرمایا ہے، یا کوئی فتوی دیا ہے، یا کوئی حدیث بیان کی ہے، یا سلام کا جواب دیا ہے، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ٹھوس عقیدے کے حامل مسلمان تھے، لھذا شیطان اس پہلو سے انہیں ورغلانے میں کامیاب نہیں ہوسکا، حالانکہ اس نے دوسری قبروں کے بارے میں بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے، چنانچہ بہت سے لوگ قبروں سے اس معنی میں فیوض حاصل کرنے کے قائل ہیں، اور اس عقیدے کے حامل ہیں کہ قبر والا قبر سے امر و نہی یا کوئی فتوی وغیرہ صادر کر سکتا ہے، اور اس قسم کے اور بہت سے گمراہ نظریات ہیں۔

بہر حال مقصد یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قبرِ مبارک کے پاس جا کر درود وسلام پڑھنے کے عادی نہیں تھے، البتہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارہ میں اتنا منقول ہے کہ جب وہ کسی سفر سے آتے تو قبرِ مبارک کے پاس آ کر نبی ﷺ، سیدنا ابو بکر صدیق اور اپنے باپ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کو سلام کہا کرتے تھے۔ لیکن آج عوام الناس نے قبر پر حاضری دینے کو اپنی عادت بنالیا ہے، اس کے متعلق شیخ الاسلام فرماتے ہیں": کہ جب اس قسم کی روش صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے ثابت نہیں تو پھر یہ بدعت ہوئی۔"

"المبسوط" میں ہے کہ: امام مالک رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:" کہ قبر مبارک کے پاس کھڑے رہنے کا میں قائل نہیں ہوں، آدمی صرف سلام کرے اور گزر جائے۔"

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ کے بارہ میں منصور کا ایک واقعہ لکھا ہے، ''کہ منصور نے امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا کہ میں مسجد نبوی میں قبلہ کی طرف رخ کر کے دعاء مانگوں، یا رسول اللہ ﷺ کی طرف رخ کر کے؟ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: کہ تم نبی ﷺ کی طرف سے اپنا چہرہ کیسے پھیر سکتے ہو، حالانکہ وہ تمہاری دعاء کا وسیلہ ہیں، اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے دربار میں تمہارے باپ آدم علیہ السلام کا وسیلہ بھی ہونگے، بلکہ تم نبی ﷺ کی طرف رخ کرو ان کی شفاعت طلب کرو اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں ان کی شفاعت قبول فرمائے گا۔''

یہ روایت ضعیف بلکہ موضوع ہے، اسکی سند میں ''متہم بالکذب'' اور ''مجہول الحال'' راوی ہیں۔ جبکہ امام مالک رحمہ اللہ کے بہت سے شاگردوں سے قبلہ رخ ہو کر دعاء مانگنا منقول ہے، یہی قول امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی ثابت ہے۔

اس حدیث میں آپ ﷺ کی قبر مبارک یا کسی دوسرے کی قبر کیلئے شدِ رحال کی ممانعت کی بھی دلیل ہے، کیونکہ یہ چیز بھی میلہ گاہ بنانے کے مترادف ہیں، بلکہ شرک کے وقوع کے عظیم ترین اسباب میں سے ہیں، جیسا کہ قبر پرستوں کی روش سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ شیخ الاسلام نے اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ جمہور کی رائے یہی ہے کہ محض انبیاء علیہم السلام وصالحین کی قبروں کی زیارت کی خاطر سفر کرنے کیلئے جانا ناجائز ہے۔

صحیحین میں سیدنا ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''لَا تَشُدُّوا الرِّحَالَ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ، الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِیْ هٰذَا وَالْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی'' ①

یعنی ''مسجد حرام، مسجدِ نبوی اور مسجدِ اقصی، ان تینوں مساجد کے علاوہ کسی مسجد کی طرف سفر کر کے نہیں جانا چاہئے۔''

لہذا تمام قبور و مشاہد اس نہی کے زمرے میں داخل ہونگے۔

موطأ امام مالک اور سنن اربعہ میں ہے کہ بصرہ بن ابی بصرہ الغفاری رضی اللہ عنہ کو جب سیدنا ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کے کوہِ طور سے واپس آنے کا علم ہوا تو فرمایا: ''اگر تمہارے جانے سے پہلے مجھے تمہاری روانگی کا علم ہوتا تو تم ہرگز نہ جا پاتے۔ کیونکہ'' نبی ﷺ نے مسجدِ حرام، مسجدِ نبوی اور مسجدِ اقصی کے علاوہ کسی بھی جگہ کے سفر سے منع فرمایا ہے'' ②

مسند احمد وغیرہ میں قزعہ کہتے ہیں: کہ میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور طور جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے شدِ رحال والی حدیث پڑھ کر فرمایا: کہ طور جانے کا ارادہ چھوڑ دو۔

① صحیح بخاری، کتاب فضل الصلوۃ فی مکۃ والمدینۃ (۱۱۹۷) صحیح مسلم، کتاب الحج (۸۲۷)

② اس کی سند صحیح ہے۔ موطا مالک (۱۰۸/۱، ۱۱۰) مسند احمد (۲۳۹۰۹، ۲۳۹۱۱ ج۹) سنن النسائی (۱۱۳/۳)۔

اور مسند احمد میں ہے، شہر بن حوشب کہتے ہیں کہ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس کوہِ طور میں نماز پڑھنے کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے حدیثِ مذکورہ پڑھ کر سفر کر کے جانے کی مخالفت کی۔ ①

ان آثار سے واضح ہوا کہ کوہِ طور میں سفر کر کے جانے کو حدیثِ شدِ رحال کے تحت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ممنوع قرار دیتے تھے، جس سے ثابت ہوا کہ اس منع کا اطلاق صرف مساجد پر نہیں ہوتا، بلکہ ہر اس جگہ پر ہوتا ہے جس کی زیارت یا حصولِ برکت کی خاطر سفر کرنا مقصود ہو، بلکہ جب حدیث کے ظاہری الفاظ کی روشنی میں مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی دوسری مسجد میں سفر کر کے جانا ممنوع ہے تو دوسرے مقامات پر سفر کر کے جانا بالاولیٰ ممنوع ہوگا۔ اب کوہِ طور کی مثال لیجئے اسے اللہ تعالیٰ نے وادی مقدس اور بقعہ مبارکہ قرار دیا، وہاں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہم کلامی سے نوازا لیکن اتنے شرف کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیثِ رسول کے پیشِ نظر وہاں کیلئے شدِ رحال کی اجازت نہیں دی۔ اسی لئے ائمہ اربعہ کا متفق علیہ فتوی ہے کہ کوئی شخص کسی نبی کی قبر یا کسی دوسرے نشان کی طرف سفر کی نذر مانے تو ایسی نذر کو پورا کرنا ضروری نہیں، بلکہ اگر کسی دور دراز کے شہر سے مسجدِ قباء کی طرف سفر کرنے کی نذر مانی تو اسے غیر مشروع قرار دیا جائے گا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ ہر ہفتے کے روز پیدل مسجدِ قباء تشریف لایا کرتے تھے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور بعض دوسرے علماء سے منقول ہے کہ کوئی شخص مدینہ منورہ کے سفر کی نذر مانتا ہے اور اس کا مقصود مسجدِ نبوی میں نماز پڑھنا ہے تو وہ اپنی نذر پوری کرے، اور اگر مقصود قبرِ مبارک کی زیارت ہے نماز پڑھنا نہیں، تو پھر وہ اپنی نذر پوری نہیں کر سکتا، اور دلیل کے طور پر شدِ رحال والی حدیث ذکر کی۔ بہر حال قبور و مشاہد کی زیارت کی خاطر سفر کرنا بدعت ہے۔

بعض لوگ ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"مَنْ زَارَنِیْ بَعْدَ وَفَاتِیْ فَکَاَنَّمَا زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ"

یعنی "میری وفات کے بعد میری زیارت کرنا زندگی میں زیارت کرنے کی طرح ہے"

اس معنی کی کوئی حدیث صحیح نہیں، بلکہ یا تو ضعیف ہے، یا موضوع ہے۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تو سب کے موضوع ہونے کا دعوی کیا ہے، اور اسباب وضع بھی بیان کیئے ہیں۔ اور بیشتر احادیث میں تو صرف زیارت کا ذکر ہے جسے زیارت شرعیہ پر محمول کیا جائے گا، یعنی ایسی زیارت جو شرک اور شدِ رحال سے خالی ہو۔



① ضعیف۔ مسند احمد (۱۱۶۰۹ ج ٤) اس کی سند میں شہر بن حوشب "مضطرب الحدیث" ہے۔

اس باب کے مسائل

(۱) سورہ برأت کی آیت ﴿ لَقَدْ جَاءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْكُمْ ....الایة ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) امت کو حدودِ شرک سے دور رکھنے کا بیان ہوا۔

(۳) یہ بات معلوم ہوئی کہ آپ ﷺ کس قدر ہماری ہدایت کے حریص اور شفیق ومہربان تھے۔

(۴) آپ ﷺ کا مخصوص طرز پر اپنی قبر کی زیارت سے روکنا، حالانکہ اگر یہ مشروع ہوتا تو آپ کی قبر کی زیارت انتہائی افضل عمل تھا۔

(۵) قبرِ مبارک کی بکثرت زیارت سے روکنا۔

(۶) نفلی نماز گھر میں ادا کرنے کی ترغیب۔

(۷) تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک یہ بات واضح اور محقق تھی کہ قبرستان میں نماز پڑھنا ناجائز ہے۔

(۸) آپ ﷺ کا قبرِ مبارک پر آنے سے یہ کہہ کر روک دینا کہ آدمی کا درود وسلام دور سے بھی مجھ پر پہنچ جائے گا، لھذا قریب آکر پڑھنے والوں کے وہم میں جو خصوصیت وافضلیت سمائی ہوتی ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں ۔

(۹) یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ آپ ﷺ حیاتِ برزخی میں ہیں، اور امت کا آپ پر درود وسلام پڑھنا آپ پر پیش کیا جاتا ہے۔



باب ما جاء ان بعض هذه الامة يعبد الاوثان

اس چیز کا بیان کہ امتِ محمدیہ ﷺ کے کچھ افراد بتوں کی عبادت کے سبب شرک میں مبتلا ہو جائیں گے۔

قال :قول الله تعالىٰ : ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا سَبِيْلًا ﴾ ①

''کیا آپ نے انہیں نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ ملا ہے؟ جو بت کا اور باطل معبود کا اعتقاد رکھتے ہیں، اور کافروں کے حق میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ ایمان والوں سے زیادہ راہ راست پر ہیں۔''

اس باب کے انعقاد کا مقصد

اس باب کے انعقاد سے مصنف رحمہ اللہ کا قبر پرستوں کے ایک واہمے اور شبہ کا رد مقصود ہے، ان کا کہنا ہے کہ کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کہنے والے اس امت کے کسی فرد سے شرک صادر نہیں ہو سکتا۔ مصنف رحمہ اللہ نے قرآن وحدیث کے دلائل سے اس امت میں شرک کی بہت سی صورتوں کا باقی رہنا اور بہت سے افراد کا مبتلائے شرک ہوتے رہنا ثابت کیا ہے، اگرچہ شرعی اَدلہ سے ایک جماعت کا ہمیشہ حق پر قائم رہنا بھی ثابت ہے، اس جماعت کو قیامت قائم ہونے تک کوئی شخص کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

اس مسئلہ پر قرآن سے استدلال

قوله :قول الله تعالىٰ : اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتَابِ....

اس آیت کریمہ میں اہل کتاب یعنی یہودیوں کے بارے میں بات کی گئی ہے، مسند احمد میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے اس آیت کریمہ کا شان نزول مروی ہے، فرماتے ہیں: ''ایک بار کعب بن اشرف مکہ مکرمہ آیا (ابن ابی حاتم کی ایک روایت میں اسکے ساتھ حیی بن اخطب کا آنا بھی مذکور ہے) تو قوم قریش ان کے ارد گرد جمع ہو گئی، اور کہنے لگی: ذرا اس شخص کو دیکھو جس کا نہ کوئی والی وارث ہے، اور نہ ہی کوئی نسل، اور وہ اپنے آپ کو ہم سے بہتر اور افضل خیال کرتا ہے، حالانکہ ہم حج کے منتظم اور حجاج کے خادم اور ساقی ہیں (اور ابن ابی حاتم کی روایت کے مطابق، ہم صلۂ رحمی کرنے والے، اور بڑے مہمان نواز ہیں، جبکہ یہ شخص یعنی محمد ﷺ رشتوں کو کاٹنے والا ہے، اور =

① (النساء : ٥١)

قـول اللّٰه تعالیٰ : ﴿ قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِنْ ذٰلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ ﴾ ①

''کہہ دیجئے کہ کیا میں تمہیں بتاؤں؟ کہ اس سے بھی زیادہ بُرے اجر پانے والا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون ہے؟ وہ جس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی اور اس پر وہ غصہ ہوا، اور ان میں سے بعض کو بندر اور سور بنا دیا اور جنہوں نے معبودان باطل کی پرستش کی۔''

=

بنی غفار کے بہت سے چور اور ڈاکو اس کے حلقے میں شامل ہو چکے ہیں تو پھر کون بہتر ہوا، ہم یا وہ؟) جواب میں یہودیوں نے کہا: کہ تم بہتر ہو اور بالکل سیدھے راستے پر ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ②

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کا گمراہ عقیدہ بیان فرمایا ہے کہ وہ ''جبت'' اور ''طاغوت'' پر ایمان لانے والے ہیں۔ امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب ﷛ فرماتے ہیں ''جبت سے مراد ''سحر'' یعنی جادو، اور طاغوت سے مراد شیطان ہے۔'' ③

عبد اللہ بن عباس ﷛ فرماتے ہیں کہ ''جبت'' حبشی زبان کا لفظ ہے جو شیطان پر بولا جاتا ہے، نیز یہ لفظ شرک اور اصنام پر بھی مستعمل ہے۔

عامر الشعبی نے ''جبت'' کا معنی کاہن بیان فرمایا ہے۔

مشہور لغوی جوہری کا کہنا ہے کہ ''جبت'' ایک ایسا لفظ ہے جو مذکورہ تمام چیزوں پر بولا جا سکتا ہے، چنانچہ صنم، کاہن اور ساحر سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے ''اَلطِّيرَةُ وَالْعِيَافَةُ وَالطَّرْقُ مِنَ الْجِبْتِ'' ④

یعنی ''بدفالی جبت میں سے ہے''

(بہر حال اس آیت کریمہ نے یہودیوں کے ایمان بالجبت والطاغوت یعنی شرک میں مبتلا ہونے کی خبر دی ہے)

ایک اور آیتِ کریمہ سے استدلال

وقوله :قول اللّٰه تعالیٰ : قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِنْ ذٰلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ ....

یہ آیت کریمہ بھی یہودیوں کے ہولناک انجام اور انتہائی قبیح عقیدے اور کردار کے ذکر پر مشتمل ہے، =

① (المائدة : ٦٠)　② اس کی سند صحیح ہے۔ ابن جریر (٢١٣/٣٠) تفسیر ابن کثیر (٥٥٩/٤).

③ صحیح بخاری، کتاب التفسیر باب (١٠) معلقاً۔ ابن حجر رحمه الله فتح الباری (٢٥٢/٨) میں فرماتے ہیں: اسکی سند قوی ہے۔

④ ضعیف۔ سنن ابوداؤد (٣٩٠٧) سنن الکبری للبیهقی (١٣٩/٨) اس کی سند میں قبیصہ بن المخارق ضعیف ہے۔

قول اللہ تعالیٰ :﴿ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴾ [1]

''جن لوگوں نے ان کے بارے میں غلبہ پایا وہ کہنے لگے ہم تو ان پر مسجد بنالیں گے۔''

=

ان لوگوں نے دین توحید کو اپنے لہو ولعب کا نشانہ بنایا اور اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت چھوڑ کر طاغوت کے پجاری بن گئے (جو ان کے مبتلائے شرک ہونے کی دلیل ہے) ان باطل عقائد ونظریات کی بناء پر انہیں اللہ رب العزت نے ملعون بھی قرار دیا، اور مستحقینِ غضب بھی، نیز یہ بھی خبر دی کہ ان میں سے بہت سے لوگ بندروں اور خنزیروں کی شکل میں مسخ کر دیے گئے۔

انہیں ملعون قرار دینے سے مراد، رحمت سے ہمیشہ کیلئے دھتکار دینا ہے، اور ان کے مستحقِ غضب ہونے کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے کبھی راضی نہیں ہوگا (اس آیتِ کریمہ کو اس باب میں شامل کرنے سے مصنف رحمہ اللہ کا مقصود یہودیوں کے بارے میں یہ واضح کرنا ہے کہ وہ شرک کے مرتکب تھے۔)

سورۃ الکہف کی آیت سے استدلال

وقولہ:قول اللہ تعالیٰ : قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ ....

اصحابِ کہف کی قبروں پر عبادت گاہیں بنانے کا تصور ان لوگوں نے پیش کیا جنہیں ان کے معاملے میں کچھ غلبہ حاصل تھا۔ ابن جریر کی روایت کے مطابق یہ بات کہنے والے کچھ مسلمان تھے۔ ایک اور روایت میں یہ بات مشرکین کی طرف منسوب ہے۔ بہر حال یہ بات کسی نے بھی کی ہو انتہائی مذموم ہے، چونکہ رسول اللہ ﷺ نے صحیحین کی روایت کے مطابق یہود ونصاریٰ کو محض اس لئے اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق قرار دیا کہ انہوں نے اپنے انبیاء وصالحین کی قبروں کو عبادت گاہیں بنالیا تھا، اور ان کا یہ فعل ان کے مبتلائے شرک ہونے پر منتج ہوا، یہی کردار اس امت کے کچھ افراد اپنا کر رہیں گے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے یہ پیش گوئی فرما دی ہے کہ تم یہود ونصاریٰ کی ہو بہو پیروی کرو گے۔

مصنف رحمہ اللہ نے سابقہ تمام آیات جن سے یہود کا مبتلائے شرک ہونا ثابت ہو رہا ہے اسی نکتہ کے تحت استشہاداً پیش فرمائی ہیں، اور اب اس حدیث کو ذکر فرما رہے ہیں جس میں اس امت کا یہود ونصاریٰ کی مکمل پیروی کرنے کا ذکر ہے۔

[1] (الکہف : ۲۱)

عن ابی سعید رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قَالَ: لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حَذْوَ الْقُذَّةِ بِالْقُذَّةِ حَتّٰى لَوْدَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَدَخَلْتُمُوْهُ قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اليَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى؟ قَالَ: فَمَنْ؟ ①

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں کی مکمل پیروی کروگے جس طرح تیر کے پر آپس میں بالکل مطابق ہوتے ہیں، حتی کہ اگر وہ لوگ سانھے کے بل میں داخل ہوئے ہونگے تو تم بھی داخل ہوکر رہوگے، لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ پہلے لوگوں سے مراد یہوذ ونصاریٰ ہیں؟ فرمایا: تو اور کون؟۔ (بخاری ومسلم)

حدیثِ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے استدلال

وقوله: عن ابی سعید رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قَالَ: لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ......

مصنف رحمہ اللہ نے اس حدیث کو بخاری ومسلم کی طرف منسوب کیا ہے، جس سے ان کی مراد اصلِ حدیث ہے نہ کہ لفظِ حدیث۔

جبکہ بخاری ومسلم میں جس لفظ سے یہ حدیث وارد ہوئی ہے اس میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ ''تم سابقہ قوموں کی طرح ہو بہو جیسے ایک آدمی کی دونوں ہاتھوں کی بالشت یا دونوں بازو پوری طرح ایک دوسرے کے مطابق ہوتے ہیں... الی آخر'' ①

مستدرک حاکم کی ایک حدیث میں یہ بھی مروی ہے کہ ان میں سے اگر کسی شخص نے راستے میں کھڑے ہوکر اپنی بیوی سے جماع کیا ہوگا تو تم بھی ایسا کروگے۔ ②

اولاً: یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں سے ہے، جو آپ ﷺ کی صدق نبوت کی روشن دلیل ہے، اور وہ اس طرح کہ آپ ﷺ نے اس امت کے کچھ افراد کے سابقہ قوموں کی پیروی کرنے کی خبر دی، اب اس امت کا سابقہ قوموں کی پیروی کرنا ایک انتہائی تعجب خیز معاملہ ہے، کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ ہماری شریعت نے سابقہ تمام شریعتوں کو منسوخ کردیا ہے، پھر اس کے باوجود سابقہ اقوام کی پیروی کرنا چہ معنی دارد۔

① صحيح بخارى، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة (٧٣٢٠) صحيح مسلم، كتاب العلم (٢٦٦٩) مزید دیکھئے: مسند احمد ٣٢٧/٢، ٨٤/٣، ٨٩۔ سنن ابن ماجه، رقم ٣٩٩٤، ظلال الجنة ٧٢، ٧٤، ٧٥ تخريج إصلاح المساجد: ٣٨۔

② دیکھئے مستدرک حاکم ٣٧/١، رقم: ١٠٦، یاد رہے کہ مستدرک حاکم کی حدیث کے یہ لفظ نہیں ہیں۔ بلکہ مستدرک کے الفاظ یہ ہیں: "لتتبعن سنن من قبلكم باعًا فباعًا، وذراعًا فذراعًا، وشبرًا فشبرًا، حتى لو دخلوا حجر ضب لدخلتموه معهم، قال: قيل يارسول الله! اليهود والنصارىٰ؟ قال: "فمن"

مگر رسول اللہ ﷺ نے خبر دی کہ ایسا ہو کر رہے گا، اور یہ خبر درست ثابت ہوئی جیسا کہ اگلی سطور میں واضح ہوگا، تو یہ چیز بھی نبی ﷺ کی نبوت کی صداقت وحقانیت کی ایک روشن دلیل بن گئی۔

ثانیاً: اب یہود ونصاریٰ کے بعض اعمال وعقائد ملاحظہ ہوں، انہوں نے مساجد کی ملمع سازی کی، قبروں کی تعظیم کی، قبروں پر مساجد تعمیر کیں اور پھر ان قبروں اور قبر والوں کی پوجا شروع کردی، نیز اپنے ''احبار ورھبان'' کو اس طرح رب مانا کہ تحلیل وتحریم میں ان کی پوری اطاعت کی اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا، انواع واقسام کے جادو اور باطل فلسفہ وکلام سے تعلق جوڑ لیا، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کیا اور بہت سے نقائص وعیوب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کردیئے۔

اب غور کیجئے! اس امت کے بہت سے افراد یہ تمام عقائد واعمال انجام دے رہے ہیں، مزید برآں ان کی عادات واطوار، لباس اور دیگر شعارات ومعاملات میں ان کی پیروی کرنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ فصدق رسول اللہ ﷺ۔

واضح ہو کہ یہ حدیث اگرچہ ایک خبر کے سیاق سے وارد ہے لیکن اس سے مراد نہی ہے، مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس امت کے بعض افراد کے یہود ونصاریٰ کی مطابقت میں مبتلا ہونے کی خبر دی ہے جس سے آپ ﷺ کا مقصود اس مطابقت ومتابعت سے روکنا ہے، اور ہمیں یہ سمجھانا ہے کہ دین اسلام کے علاوہ کسی کے دین، شعار، عادت اور عقیدے کی طرف قطعاً کوئی التفات نہ کیا جائے۔

فائدہ: یہ بات یاد رہے کہ جب اسلوب خبری ہو، اور مراد اس سے نہی ہو تو کسی کام سے منع کرنے کیلئے یہ اندازِ نہی انتہائی بلیغ ہے، اور وہ کام حرام ہوتا ہے نہ کہ مکروہ وغیرہ۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ حدیث سیاق خبر سے وارد ہے لیکن مقصود اس فعل کی مذمت ہے'' بہت سے علماء کا بیان ہے کہ یہود کا کفر اس جہت سے تھا کہ ان کے پاس حق کا علم تھا، اتباع نہیں تھی، نہ قولاً اور نہ عملاً، جبکہ نصاریٰ کا کفر اس جہت سے تھا کہ وہ عمل کرتے تھے اور بہت سی عبادات میں محنت کرتے تھے لیکن سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کی معرفت کے بغیر تھا، ہماری امت میں دونوں طرح کے افراد موجود ہیں، کچھ تو حق کی معرفت رکھتے ہیں لیکن قبول نہیں کرتے، وجہ کچھ بھی ہو، اور کچھ عبادات کرکے تھک جاتے ہیں لیکن وہ تمام جدوجہد شریعت سے ثابت نہیں ہوتی۔ سفیان بن عیینہ کا قول ہے'' علماء میں سے کسی عالم کا منحرف ہونا یہودیوں کی مشابہت ہے، جبکہ عباد میں سے کسی عابد کا انحراف وفساد نصاریٰ کے ساتھ مشابہت ہے۔''

=

ولمسلم عن ثوبان ﷺ: " اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ:اِنَّ اللّٰہ زَوٰی لِی الْاَرْضَ فَرَأَیْتُ مَشَارِقَھَا وَمَغَارِبَھَا ، وَاِنَّ اُمَّتِی سَیَبْلُغُ مُلْکُھَا مَازُوِیَ لِیْ مِنْھَا ، وَاُعْطِیْتُ الْکَنْزَیْنِ: الاَحْمَرَ وَالْاَبْیَضَ ، وَاِنِّی سَأَلْتُ رَبِّی لِاُمَّتِی اَنْ لَا یُھْلِکَھَا بِسَنَةٍ عَامَّةٍ ، وَأَنْ لَّا یُسَلِّطَ عَلَیْھِمْ عَدُوًّا مِنْ سِوٰی اَنْفُسِھِمْ فَیَسْتَبِیْحُ بَیْضَتَھُمْ ، وَاِنَّ رَبِّی قَالَ: یَا مُحَمَّدُ ! اِذَا قَضَیْتُ قَضَاءً فَاِنَّہٗ لَا یُرَدُّ وَاِنِّی اَعْطَیْتُکَ لِاُمَّتِکَ أَنْ لَّا اُھْلِکَھُمْ بِسَنَةٍ عَامَّةٍ ، وَأَنْ لَّا اُسَلِّطَ عَلَیْھِمْ عَدُوًّا مِنْ سِوٰی اَنْفُسِھِمْ یَسْتَبِیْحُ بَیْضَتَھُمْ وَلَوِ اجْتَمَعَ عَلَیْھِمْ بِاَقْطَارِھَا ، حَتّٰی یَکُوْنَ بَعْضُھُمْ یُھْلِکُ بَعْضًا وَیَسْبِی بَعْضُھُمْ بَعْضًا . " ①

صحیح مسلم میں جناب ثوبان ﷺ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے میرے لیے تمام زمین سمیٹ دی جس سے میں نے زمین کے مشرق ومغرب دیکھ لئے ، اور بے شک میری امت کی حکومت وہاں تک پہنچے گی جہاں تک میرے لئے زمین سمیٹی گئی ہے، اور مجھے دو خزانے عطا کئے گئے ، ایک سرخ اور دوسرا سفید، اور میں نے اپنے پروردگار سے اپنی امت کی بابت سوال کیا کہ اسے عام قحط سالی سے ہلاک نہ کیجئے گا ، اور نہ ہی ان پر کوئی دوسرا دشمن مسلط فرمائیے گا ، جو کہ ان کی اکثریت کو تباہ کرنے کے در پے ہو جائے ، تو میرے پروردگار نے فرمایا: اے محمد ﷺ میں جب کوئی فیصلہ صادر کر دیتا ہوں تو وہ نا قابلِ تردید ہوتا ہے میں آپ کی دعا قبول کرتے ہوئے انہیں عام قحط سالی سے ہلاک نہیں کرونگا ، اور نہ ہی کوئی دوسرا دشمن ان پر مسلط کرونگا جو ان کی جمعیت کو تباہ کرنے کے در پے ہو...... اگر چہ ان کے دشمن دنیا کے گوشے گوشے سے اکٹھے ہو کر آ جائیں جب تک یہ خود ایک دوسرے کی ہلاکت اور ایک دوسرے کو قیدی بنانے کے در پے نہ ہو جائیں۔''

=

اس حدیث سے مؤلف رحمہ اللہ کا مقصود یہ استدلال ہے کہ اس امت کے افراد خواہ وہ کم ہوں یا زیادہ مبتلاء شرک ہوں گے ، کیونکہ اس امت کے افراد سابقہ امتوں کے پیروکار بنیں گے ، اور سابقہ امتوں میں واضح طور پر انواع واقسام کے شرک موجود تھے ۔ امرِ واقع سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔

حدیثِ ثوبان رضی اللہ عنہ سے استدلال

وقولہ: لمسلم عن ثوبان ﷺ: " اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اِنَّ اللّٰہَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ......

یہ حدیث ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں باختلافِ الفاظ مروی ہے ، اس حدیثِ مبارک میں رسول

① صحیح مسلم ، کتاب الفتن ، باب هلاك هذه الأمة بعضهم بعضا ، الرقم: (۷۲۵۸)

ورواه البرقانی فی صحیحه وزاد :"وَإِنَّمَا اَخَافُ عَلٰی أُمَّتِیْ الاَئِمَّةَ الْمُضِلِّیْنَ" وَإِذَا وَقَعَ عَلَیْهِمُ السَّیْفُ لَمْ یُرْفَعْ إِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ وَلَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یَلْحَقَ حَیٌّ مِنْ أُمَّتِیْ بِالْمُشْرِکِیْنَ ، وَحَتّٰی تَعْبُدَ فِئَامٌ مِنْ أُمَّتِیْ الْاَوْثَانَ ، وَإِنَّهٗ سَیَکُوْنُ فِیْ أُمَّتِیْ کَذَّابُوْنَ ثَلَاثُوْنَ کُلُّهُمْ یَزْعَمُ اَنَّهٗ نَبِیٌّ وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ ، وَلَاتَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِیْ عَلَی الْحَقِّ مَنْصُوْرَةً لَایَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰی یَأْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی " ①

اس حدیث کو حافظ ابو بکر البرقانی نے بھی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’مجھے اپنی امت میں گمراہ کن اماموں (اور لیڈروں) کا خوف ہے‘‘ اور جب ان میں تلوار چل پڑی تو قیامت تک بند نہیں ہوگی ، اور اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک میری امت کی ایک جماعت مشرکین سے الحاق نہیں کرے گی ، اور جب تک میری امت کی کچھ جماعتیں بت پرست نہ ہو جائیں گیں ، اور عنقریب میری امت میں تیس کذاب پیدا ہونگے جن میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نبی ہے، حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا ، اور میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم و ثابت رہے گی ، مدد و نصرت ان کا مقدر ہوگا ، انہیں بے آسرا چھوڑنے والا کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا ، یہاں تک کہ بصورت قیامت اللہ تعالیٰ کا امر آن پہنچے گا‘‘

اللہ ﷺ نے جو زمین کے سمیٹے جانے کا ذکر فرمایا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ زمین کے دور دراز کے حصوں کو اتنا قریب کر دیا گیا کہ آپ ﷺ نے انتہائی قریب سے مشاہدہ فرما لیا ، اور بقول امام قرطبی ’’اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی قوتِ بصارت کو انتہائی تیز کر دیا ، اور درمیان میں حائل تمام موانع ختم کر دیئے ، جس سے اقطار مشرق و مغرب کا نظارہ سہل ترین ہو گیا۔‘‘

اس قسم کا واقعہ معراج سے واپسی پر بھی پیش آیا تھا ، چنانچہ آپ ﷺ بیت المقدس کو دیکھتے جاتے ، اور کفارِ قریش کو اس کی آیات اور نشانیاں بتلاتے جاتے۔

بعض لوگ اسے تمثیلی مشاہدہ پر محمول کرتے ہیں ، مگر پہلا مفہوم زیادہ بہتر ہے۔

① صحیح مسلم ، کتاب الفتن (۲۸۸۹) مسند احمد (۲۲۴۵۸ ج۸) سنن ابی داؤد، کتاب الفتن (۴۲۴۴) اور سنن ابن ماجه (۳۹۵۲).

اس حدیث میں جناب صادق المصدوق ﷺ نے اقطارِ مشرق ومغرب تک اسلامی حکومت کے پھیلنے کی خبر دی۔امام قرطبی رحمہ اللہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''آپ ﷺ کے بیان کے عین مطابق اس حدیث کی صداقت وحقانیت ظاہر ہو چکی ہے، جو کہ صدق نبوت کی انتہائی محکم اور ٹھوس دلیل ہے، چنانچہ اسلامی حکومت کا دائرہ فتوحات بحرِ طنجہ تک پہنچ چکا ہے جو کہ مغرب کے آخری کنارے پر واقع ہے، جب کہ مشرقی سمت خراسان، ماوراء النہر، ہند، سندھ اور صغد کے علاقوں پر اسلامی پرچم لہرا چکا ہے، اور چونکہ حدیث میں شمال وجنوب کی سمتوں کا ذکر نہیں، لہذا ان اطراف میں اسلامی فتوحات کو وہ وسعت حاصل نہیں ہو سکی جو مشرق ومغرب کی سمتوں کو حاصل ہوئی۔''

حدیث میں مذکور سرخ خزانے سے مراد بادشاہِ روم قیصر کا خزانہ ہے کیونکہ وہاں سونے کی بہتات تھی، جبکہ سفید خزانے سے بادشاہِ فارس کسریٰ کا خزانہ مراد ہے کیونکہ وہاں چاندی اور دیگر جواہرات بکثرت پائے جاتے تھے۔اس حدیث کا مصداق، فاتح اعظم امیر المؤمنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ مبارک میں ہی حاصل ہو گیا تھا، جب آپ کی بھیجی ہوئی افواج نے قیصر وکسریٰ کو تاخت وتاراج کر کے انکے خزانوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی اللہ تعالیٰ سے دو دعائیں مذکور ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے شرفِ قبولیت سے نوازا: (۱) یہ کہ آپ کی امت کو عام قحط سالی سے ہلاک نہ کیا جائے۔

(۲) دسری یہ کہ آپ کی امت پر کسی دوسرے دشمن کو مسلط نہ کیا جائے جو ان کی سرزمین یا جمعیت کی بربادی کے درپے ہو۔

اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کلی طور پر تمام مسلمانوں یا ان کے تمام علاقوں میں دشمن کو مسلط نہیں کرے گا، خواہ دشمن ان پر چہار جانب سے اپنی قوت کو مجتمع کر کے حملہ آور کیوں نہ ہو۔البتہ یہ تب تلک ہے جب تک مسلمان حدیثِ مذکور میں ذکر کردہ شرائط پر قائم وثابت رہیں، یعنی آپس میں ایک دوسرے کے قتل کے درپے نہ ہوں، اور نہ ہی ایک دوسرے کو قید کرنے کے درپے ہوں، اگر ایسا ہوا تو پھر کفار کے تسلط کا امکان رد نہیں کیا جا سکتا، بہت سے تاریخی شواہد اس امر کی تصدیق کے لئے کافی ہیں۔چنانچہ ساتویں صدی ہجری میں جب مشرقی سمت کے مسلمان حکمرانوں میں اختلاف نمودار ہوا تو تاتاریوں نے خراسان کے بیشتر علاقوں نیز عراق اور سرزمین روم پر تسلط حاصل کر لیا، اور خلیفہ سمیت بڑے بڑے بادشاہوں اور علماء کو قتل کر دیا۔بعینہ اسی طرح حکمرانانِ مغرب میں اختلاف وافتراق کی گمراہ کن صورتیں ابھریں تو فرنگی تمام سرزمین اندلس اور آس پاس کے تمام جزیروں پر قابض ہو گئے، اور یہ علاقے آج تک ان کے زیر تسلط ہیں، بلکہ شام کے بعض علاقوں پہ قبضہ جمائے بیٹھے رہے جنہیں سلطان صلاح الدین ایوبی وغیرہ نے آزاد کروالیا۔

واضح ہو کہ حدیث کا یہاں تک کا سلسلہ صحیح مسلم کا روایت کردہ ہے، جبکہ اس کے بعد کے الفاظ محدث کبیر حافظ ابوبکر محمد بن احمد بن غالب الخوارزمی البرقانی التوفی ۴۳۶ھ کی "الصحیح" سے نقل کئے گئے ہیں، انکی یہ کتاب مسند کے نام سے زیادہ معروف ہے، خطیب بغدادی بھی اسے مسانید کی فہرست میں لائے ہیں۔

حدیث ثوبان کا موجودہ دور پر انطباق

چنانچہ مسند کے حوالے سے اس حدیث کا جو حصہ نقل کیا گیا ہے وہ بہت سے مسائل پر مشتمل ہے جنہیں بالترتیب یہاں بیان کیا جاتا ہے، اور بطور خاص وہ حصہ بالتفصیل بیان کیا جائے گا جس کی زیر بحث حدیث سے مطابقت ہے۔

سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے گمراہ کن ائمہ، علماء، امراء اور صوفیوں سے لاحق خوف وخدشہ کا اظہار فرمایا جن کے ظاہری جاہ ومنصب کو دیکھتے ہوئے لوگ انہیں اپنا راہنما ومقتدیٰ مان لیں گے، مگر درحقیقت وہ خود گمراہ ہونگے، اور دوسروں کی گمراہی کا سبب بنیں گے، ان کے فیصلے اور فتوے کتاب وسنت سے عدم معرفت پر مبنی ہونگے۔ قرآن پاک کے بیان کے مطابق بہت سے لوگوں کے جہنم میں جانے کا سبب یہی لوگ ہیں۔

﴿ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ﴾ ①

"یہاں تک کہ جب اس میں سب جمع ہو جائیں گے تو پچھلے لوگ پہلے لوگوں کی نسبت کہیں گے کہ ہمارے پروردگار ہم کو ان لوگوں نے گمراہ کیا تھا سو ان کو دوزخ کا عذاب دگنا دے۔"

ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿ رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴾ ②

"اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی مانی جنہوں نے ہمیں راہ راست سے بھٹکا دیا"

یہی وجہ ہے اس حکیم مطلق نے ہمیں ہمیشہ ائمہ ہدایت کے نقش قدم پر چلنے کی دعا مانگتے رہنے کا حکم دیا، وہ ائمہ ہدایت کہ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعامات کی بارش برسادی، وہ انبیاء صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس "الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" اور "وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کی راہ سے بچے رہنے کی دعا کرنے کی تلقین کی؛ کیونکہ دونوں کا راستہ گمراہ کن ہے "مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" تو جانتے بوجھتے ہوئے عمل نہیں کرتے،

① (الاعراف: ۳۸) ② (الاحزاب: ۶۷)

جبکہ ''الضَّـالِیْنَ '' ایسے عمل کرتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ کی شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، بلکہ ان کے اعمال خواہشاتِ نفسانی کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔ بہرحال انعام یافتہ لوگوں کا راستہ وہ ہے جس میں بیک وقت یہ چیزیں مجتمع ہوں: (۱) ہدایت (کتاب وسنت کا علم) (۲) اس علم کے مطابق عمل۔

یہ وہ حقیقت حق آشنا ہے جس کا ذکر رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس فرمان میں فرمایا جس میں امت کے تہتر فرقوں میں تقسیم ہونے کی خبر دی۔ آپ ﷺ نے انتہائی صراحت کے ساتھ اعلان کر دیا کہ ان تہتر فرقوں میں سے صرف ایک فرقہ جنت میں جائے گا، باقی تمام جہنم میں جائیں گے، جب جنتی فرقے کی بابت پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ لوگ ہیں جو اس پُر ہدایت طریقہ پر ثابت قدم رہیں جس طریقہ پر آج میں اور میرے صحابہ قائم ودائم ہیں''

اس طریقہ کا عامل شخص امامِ ہدایت ہے، جب کہ جو اس کے خلاف ہے وہ چاہے کوئی بھی ہو اور کچھ بھی، امامِ ضلالت ہے۔ اور گمراہ اور گمراہ کن پیروں اور ناعاقبت اندیش مولویوں نے کیسے کیسے فاسد اور ناپاک نظریات کے ساتھ عوام الناس کو اپنے نرغے میں لیا ہوا ہے، کوئی اپنے مریدوں سے کہتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد اپنی تمام حاجات اور ضروریات میری قبر پر لے آیا کرنا، میں ان سب کو پورا کر دوں گا، بھلا وہ پیر کس کام کا جسے چند بالشت مٹی اپنے مریدوں سے چھپا کر رکھ دے۔ استغفر اللہ۔

کوئی اپنے ارادت مندوں کو جہنم سے بچانے کا جھانسہ دیتا ہے، اور ان کے اعتقاد کی صورت میں دنیوی تکالیف کا ازالہ اور انکار کی صورت میں مختلف طریقوں سے ایذاء رسانی کا دعویدار ہے، اور وہ تمام شعبدہ بازیوں کو اپنی کرامات تصور کرتا ہے۔

کسی کو دیکھو تو وہ برہنہ بازاروں میں گھوم پھر رہا ہے، نماز کی اسے ضرورت نہیں اور نہ ہی ذکرِ الٰہی سے اسے دلچسپی ہے، علماءِ شریعت کی یہ کہہ کر توہین کرتا ہے کہ یہ تو محض ظاہر پرست ہیں، جبکہ اپنے بارہ میں کہتا ہے کہ میں تو علمِ باطن کا مالک ہوں۔ کسی کا گمراہ کن نظریہ ہے کہ اب ہمیں شریعتِ محمدی کی پابندی کی قطعاً ضرورت نہیں، جیسا کہ خضر علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کی شریعت سے آزاد و بے نیاز تھے۔ کتنا مبنی بر کفر عقیدہ ہے۔

کوئی اولیاء کے نفع ونقصان اور جملہ تصرفات کے مالک ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، چنانچہ ان کے آگے دعا واستغاثہ کو جائز قرار دیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ انہیں لوحِ محفوظ کا علم حاصل ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ تمام لوگوں کے دلوں کے اسرار اور بھید بھی جانتے ہیں، انبیاء وصالحین کی قبروں پر مساجد بنانا ان میں چراغ اور

شمعیں روشن کرنا اور ریشم و دیباج سے ان قبروں کو ڈھانپنا روا سمجھتے ہیں، اور علماءِ قرآن وسنت کو گمراہ کن خیال کرتے ہیں۔ اسی قسم کے اِمامانِ گمراہی کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لئے انتہائی خطرناک قرار دیا ہے۔ ذیل میں قرآن پاک کی دو آیات درج کی جاتی ہیں جو اِمامانِ ہدایت، اور اِمامانِ گمراہی کے درمیان فرق کے اعتبار سے ضابطہ کا درجہ رکھتی ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ . قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ ①

''کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعوی رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا، اور تمہارے گناہوں کو بخشش دے گا، اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا انتہائی رحم کرنے والا ہے۔ کہہ دیجئے تم اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرو، اگر تم (ان کی پیروی سے) منہ پھیر لوگے تو اللہ تعالیٰ کافروں کو دوست نہیں رکھتا''

ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنے والے ہی درحقیقت اَئمہ ہدایت بننے کے اہل ہیں، جبکہ اطاعت نہ کرنے والے اَئمہ ضلالت ہیں، لہذا اپنے پروردگار سے حق کو سمجھتے ہوئے انتہائی بصیرت کی راہ اختیار کرو، اور آگاہ رہو کہ کسی شخص کی ظاہری جلالت وعظمت تمہیں کسی دھوکہ میں مبتلا نہ کر دے، اللہ رب العالمین ہی سب سے بڑی ذات ہے، اور اس کی اور اس کے رسول کی پیروی ہی فرض و متعین ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی معصوم بھی نہیں ہے، دلوں میں جو کچھ ہے اسے پروردگار خوب جانتا ہے، ممکن ہے کہ تم کسی کو اِمامِ ہدایت سمجھتے ہوئے اس کی پیروی شروع کر دو اور حقیقت میں ایسا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بھی یہی ہدایت ارشاد فرمائی:

﴿ ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ ②

''پھر ہم نے آپ کو ایک شریعت پر مقرر فرما دیا اسی کی اتباع کرتے رہو، اور ایسے لوگوں کی خواہشات کے پیچھے مت لگو جو بے علم ہیں''

لہذا جو شخص کتاب وسنت کے خلاف کوئی چیز لائے گا تو وہ بے علموں کی خواہشات ہی کہلائے گی، اور اصل حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی رسول ﷺ کی پیروی نہیں کرتا وہ اپنی خواہشات کا پیروکار ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَاءَهُمْ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ

① (آل عمران: ۳۲،۳۱) ② (الجاثیہ: ۱۸)

هُدًى مِنَ اللهِ إِنَّ اللهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ ﴾ ①

''اگر یہ لوگ آپ کی بات نہیں مانتے تو پھر آگاہ رہو کہ وہ اپنی خواہشات کے پیروکار ہیں، اور اس شخص سے بڑا گمراہ کون ہوسکتا ہے جو اپنی خواہش کی پیروی کرے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے بغیر، بے شک اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا''

ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿ اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَاءَ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ ②

''تم لوگ اس کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے آئی ہے، اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے رفیقوں کا اتباع مت کرو تم لوگ بہت ہی کم نصیحت مانتے ہو''

زیاد بن حدیر کہتے ہیں کہ مجھ سے امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کیا تمہیں علم ہے کہ اسلام کو ڈھا دینے والی کیا چیز ہے؟ میں نے کہا: نہیں، آپ نے فرمایا: ایک عالم کی لغزش، دوسرا منافق کا قرآنی آیات کے ذریعے جھگڑنا اور تیسرا گمراہ کن اماموں کے فتوے اور فیصلے۔ ③

یزید بن عمیرہ کہتے ہیں کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کسی بھی مجلس ذکر میں بیٹھتے ہوئے یہ کہا کرتے تھے کہ حاکم عادل تو اللہ تعالیٰ ہی ہے اس میں شک کرنے والے تباہ و برباد ہوگے۔ پھر فرمایا کرتے کہ: دانا انسان کی کج روی سے بچ کر رہا کرو؛ کیونکہ بعض اوقات شیطان دانا اور حکیم شخص کی زبان سے گمراہی کی باتیں اگلوا دیتا ہے، جبکہ منافق کبھی کبھی کلمہ حق کہہ جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے اس مسئلے کی اچھی طرح سمجھ نہیں آئی تو آپ نے فرمایا: دانا انسان کے مشتبہات سے بچے رہا کرو جن کے بارہ میں کہا جائے یہ کیا ہے؟ لیکن اس بنیاد پر اس سے دوری بھی اختیار نہ کرو، کیونکہ ہوسکتا ہے وہ حق کی طرف رجوع کر لے، اور جب حق مل جائے تو اسے فوراً قبول کرلو، کیونکہ حق پر موجود نور تمہیں اپنی طرف متوجہ کرلے گا۔ ④

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کیا خوب فرمایا کرتے تھے:

وهل أفسد الدين الا الملوك　　　واحبار سوء ورهبانها

''دین کو بگاڑنے والے صرف بادشاہ، علماءِ سوء اور صوفی ہیں۔''

① (القصص: ٥١)　② (الاعراف: ٣)

③ اس کی سند صحیح ہے، الفريابی فی صفة المنافق (ص ٧١) سنن الدرامی (٧١/١)

④ اس کی سند صحیح ہے۔ سنن ابی داؤد (٤٦١١) "المعرفة والتاريخ للفسوی "(٣٢٠/٢، ٧١٩)۔

دوسرا مسئلہ اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب اس امت میں قتل وغارتگری کا سلسلہ چل نکلا تو قیامت تک ختم نہ ہوگا، اور فعلاً ایسا ہو چکا ہے، چنانچہ امیر المؤمنین جناب عثمان ﷛ کی شہادت کے بعد سے آج تک فتنہ وقتال جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا، گو کبھی کم اور کبھی زیادہ، اور کبھی کسی مقام پر اور کبھی دوسرے مقام پر ہو۔

اس کے بعد اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے چند مزید پیش گوئیاں فرمائیں۔

(۱) یہ کہ قیامت سے پہلے پہلے آپ کی امت کا ایک قبیلہ یا دوسری روایات کے مطابق چند قبائل مشرکین کے ساتھ الحاق کر لیں گے جس کا معنی یہ ہے کہ وہ مرتد ہو کر انکی سرزمین میں انکے ساتھ شمولیت اختیار کر لیں گے۔

(۲) دوسری پیش گوئی یہ ہے کہ اس امت کی بہت سی جماعتیں اور ایک حدیث کے الفاظ کے مطابق بہت سے قبائل بت پرست بن جائیں گے۔

حدیث کا یہی حصہ مصنف ﷫ کے قائم کردہ باب سے مطابقت رکھتا ہے، چنانچہ یہ حدیث ان قبر پرستوں کی تردید کے لئے کافی ہے جو اس امت میں وقوع شرک کا انکار کرتے ہیں، اس معنی کی ایک حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بھی ہے جو ابو ہریرہ ﷛ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَضْطَرِبَ أَلْيَاتُ نِسَاءِ دَوْسٍ عَلٰى ذِي الْخَلَصَة" ①

''اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوسکتی جب تک قبیلہ دوس کی عورتوں کے سرین ذوالخلصۃ پر حرکت نہ کریں''

واضح ہو کہ ذوالخلصۃ قبیلہ دوس کا ایک طاغوت ہے جسے دورِ جاہلیت میں پوجا جاتا تھا۔ ابن حبان میں ہے، معمر کہتے ہیں کہ ''وہاں ایک گھر بنا ہوا ہے، جو بند رہتا ہے۔''

صحیح مسلم میں سیدہ عائشہ صدیقہ ﷞ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"لَايَذْهَبُ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ حَتّٰى تُعْبَدَ اللَّاتُ وَالْعُزّٰى"

''اس وقت تک یہ دنیا ختم نہیں ہوگی جب تک کہ ''لات وعزیٰ'' کی دوبارہ عبادت نہ کی جائے''

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ طائف میں عبداللہ بن عباس کے نام سے منسوب جو قبر ہے وہ درحقیقت لات کی قبر ہے، جس کی لوگ عبادت کرتے رہے ہیں، اس قبر کا طواف بھی کرتے رہے ہیں، چڑھاوے بھی چڑھاتے رہے ہیں، اس کے نام کی نذریں بھی مانتے رہے ہیں، اور قضائے حاجات اور ازالۂ تکالیف کی بابت سوال بھی کرتے رہے ہیں۔

① صحیح بخاری، کتاب الفتن (۷۱۱۶) صحیح مسلم، کتاب الفتن (۲۹۰۶) یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔

(۳) تیسری پیش گوئی یہ ہے کہ اس امت میں تیس ایسے شخص پیدا ہو گے جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرینگے۔ ایک حدیث میں ستائیس کی تعداد بھی مذکور ہے لیکن حدیث زیرِ بحث اس سے اصح یعنی زیادہ صحیح اور اقویٰ ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ کے دور سے لیکر اب تک جو لوگ اس دعویٰ نبوت میں مشہور ہوئے اور جن کے کچھ پیروکار رہنے، اسے دیکھتے ہوئے اس تعداد کی صحت ثابت ہو جاتی ہے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے ''کہ اس حدیث کا مصداق رسول اللہ ﷺ کے دور ہی میں ظاہر ہو چکا تھا، چنانچہ مسیلمہ کذاب نے یمامہ میں، اور اسود العنسی نے یمن میں نبوت کا دعویٰ کیا۔''

حافظ ابن حجر نے جھوٹے مدعیان نبوت کے کچھ اور نام بھی گنوائے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کذابین کے مقابلے میں اپنے خاتم النبیین ہونے کا اعلان فرمایا، چنانچہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، اور اگر کسی نے دعویٰ نبوت کیا تو وہ بمصداق حدیث ھذا دجال وکذاب ہوگا۔ واضح ہو کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا آخری دور میں آنا جو کہ کتاب وسنت سے ثابت ہے، آپ ﷺ کے خاتم النبین ہونے کے متصادم نہیں ہے کیونکہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام آپ سے پہلے مبعوث ہوئے، اور پھر آسمانوں کی طرف اٹھا لئے گئے، اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ آنا اس لئے بھی اس حدیث کے مخالف نہیں کیونکہ وہ آپ ہی کی شریعت کے مطابق فیصلے فرمائیں گے اور آپ ﷺ ہی کے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں گے، لہذا وہ آپ کی امت کے ایک فرد کی حیثیت سے نازل ہونگے۔

طائفہ منصورہ سے مراد جماعتِ اہلحدیث ہے

حدیث کے آخر میں رسول اکرم ﷺ نے ایک جماعت کے ہمیشہ حق پر قائم ومستمر رہنے کی خبر دی جسے اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید حاصل ہوگی، اور کسی کی مخالفت اس کیلئے ضرر رساں نہ ہوگی۔ اس جماعت کے بارہ میں یزید بن ھارون اور امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں: ''اِنْ لَمْ يَكُوْنُوْا اَهْلَ الْحَدِيْثِ فَلَااَدْرِیْ مَنْ هُمْ'' یعنی ''اگر اس جماعت سے مراد اہل الحدیث نہیں تو پھر ہمیں معلوم نہیں کہ وہ جماعت کون سی ہے۔''

اس جماعت کے اہل حدیث ہونے کا قول عبداللہ بن مبارک، علی بن المدینی، احمد بن سنان اور امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ سے بھی مروی ہے۔ اور یہ بات واضح ہے، چنانچہ ''منصور علی الحق'' وہی ہوسکتا ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا صحیح اور سچا پیروکار ہو، اور یہ شان ان کی ہرگز نہیں ہوسکتی جنہیں حدیث کی معرفت حاصل نہیں، اس شان کا صحیح مصداق اہل حدیث ہیں، خواہ وہ عرب میں ہوں یا عجم میں، اگرچہ ایک روایت میں علی ابن المدینی رحمہ اللہ نے اس جماعت کیلئے اہل عرب ہونے کا قول اختیار کیا ہے مگر یہ برائے تمثیل ہے،

برائے حصر نہیں، یعنی اگر عرب کتاب وسنت پر عمل کرنے میں مستقیم رہیں تو وہ بھی طائفہ منصورہ ہیں۔

حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ جماعت ''امر اللہ'' کے آنے تک اس دنیا میں موجود رہے گی، اس ''امر اللہ'' سے مراد اُس عمدہ ہوا کا آنا ہے جو مؤمنین کی ارواح کو قبض کر لے گی۔ چنانچہ مستدرک حاکم میں ایک روایت ہے جس کا اصل صحیح مسلم میں موجود ہے کہ عبدالرحمٰن بن شماسہ کہتے ہیں کہ ایک بار عبداللہ بن عمرو بن العاص ﷛ نے یہ ارشاد فرمایا ''کہ قیامت اہل جاہلیت سے بھی زیادہ بدترین لوگوں پر قائم ہوگی'' تو عقبہ بن عامر ﷛ نے یہ سن کر عبداللہ بن عمرو ﷛ سے کہا کہ ذرا سوچ کر کہو، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث سنی ہے ''کہ میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر لڑتی رہے گی، اور غالب رہے گی، ان کا مخالف انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا حتی کہ اس حال پر قیامت آجائے گی''

تو عبداللہ بن عمرو ﷛ نے فرمایا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجے گا جس کی خوشبو (مشک) کستوری جیسی اور چھونے میں ریشم جیسی ہوگی، وہ ہر ایسے شخص کی روح قبض کرے گی جس کے دل میں ایک دانے کے برابر ایمان ہو، پھر بدترین لوگ باقی رہ جائینگے اور انہیں پر قیامت قائم ہوگی۔ ①

اس سے واضح ہوا کہ تا قیامِ قیامت ایک جماعت کے حق پر قائم رہنے سے مراد وہ وقت ہے جب ہوا نازل کر کے مومنین کی ارواح کو قبض کرلیا جائے گا، یہ بات حافظ ابن حجر ؒ نے لکھی ہے، اور یہی قابلِ اعتماد معلوم ہوتی ہے۔

اس جماعت کے محل اور مرکز کے بارہ میں علماء کے درمیان اختلاف ہے، ابن بطال قیامِ قیامت کے وقت اس کا مرکز بیت المقدس بتاتے ہیں، اور دلیل میں طبری کی روایت کردہ حدیث پیش کرتے ہیں جو ابوامامہ ﷛ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ یہ جماعت کہاں ہوگی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''بیت المقدس میں'' ②

جبکہ معاذ بن جبل کی روایت کے مطابق یہ جماعت شام میں ہوگی۔ اکثر شارحین کا یہی قول ہے۔ اور طبری کے کلام سے واضح ہوتا ہے کہ ضروری نہیں کہ یہ جماعت دجال سے قتال تک ہمیشہ شام یا بیت المقدس ہی میں موجود رہے، بلکہ زمین کے کسی دوسرے حصہ میں بھی یہ جماعت پائی جاسکتی ہے، کیونکہ حدیث کا مصداق یہی ہے کہ زمین کبھی اس جماعت سے خالی نہیں رہے گی، اور یہی بات حق ہے، کیونکہ شام میں ایک

① صحيح مسلم، كتاب الإمارة (١٩٢٤)

② ضعيف ۔مسند احمد (٢٢٣٨٣) اس کی سند میں عمرو بن عبداللہ الشیبانی ہے جس کو امام ذھبی رحمہ اللہ نے مجہول کہا ہے۔

زمانہ سے ان صفات کی حامل کوئی جماعت موجود نہیں ہے، بلکہ وہاں تو قبر پرستوں کا راج ہے، فاسق وفاجر قسم کے لوگوں کی بہتات ہے، بھلا ایسے لوگ طائفہ منصورہ کیسے ہوسکتے ہیں، پھر کافی عرصہ سے وہ کفار سے جہاد بھی نہیں کررہے بلکہ آپس میں لڑرہے ہیں۔الغرض جن روایات میں بیت المقدس یا شام کا ذکر ہے تو ان کا محمل یہ ہے کہ کسی دور میں وہ طائفہ منصورہ ان علاقوں میں بھی موجود ہوگا۔اور امرِ واقع بھی یہی ہے۔

واللہ اعلم



اس باب کے مسائل

(۱) سورہ نساء کی آیت ﴿ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ ....الخ ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) سورہ مائدہ کی آیت ﴿ قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ...الاية ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۳) سورہ کہف کی آیت ﴿ وَقَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۴) اور سب سے اہم مسئلہ کہ جبت اور طاغوت پر ایمان لانے کا معنی ومفہوم کیا ہوسکتا ہے، کیا اس ایمان سے مراد قلبی اعتقاد ہے، یا اس سے مراد بت پرستوں کے ساتھ موافقت کرنا ہے، خواہ دل میں ان کے لئے بغض ہی کیوں نہ ہو اور ان کے باطل ہونے کی مکمل معرفت ہی کیوں نہ ہو (ہر دور میں جبت وطاغوت کے ساتھ تعلق گمراہی ہے)

(۵) یہودیوں کی اسلام دشمنی ان کی اس بات سے واضح ہوگئی کہ وہ کفار کو کفر پر سمجھنے کے باوجود انہیں مومنوں سے زیادہ ہدایت یافتہ قرار دیتے تھے۔

(۶) اور یہ مسئلہ قائم کردہ باب سے مطابقت رکھتا ہے کہ شرک اور قبر پرستی اس امت میں ضرور پائی جائے گی، چنانچہ ذکر کردہ آیات کی تفسیر سمجھ لینے کے بعد سیدنا ابوسعید خدری ﷺ کی حدیث پر غور کرنے سے یہ حقیقت ثابت ہوجائے گی (یعنی ذکر کردہ تینوں آیات میں یہود ونصاریٰ کے بعض شرکیہ اعمال کی خبر دی گئی ہے، اور حدیثِ ابوسعید کا مضمون یہ ہے کہ اس امت کے افراد یہود ونصاریٰ کی ہو بہو پیروی کرینگے، جس سے ثابت ہوا کہ یہود نصاریٰ کی طرح اس امت کے بہت سے افراد مبتلائے شرک ہونگے)

(۷) حدیث میں اس بات کی صراحت ہے کہ اس امت کی بہت سی جماعتیں بت پرستی اور قبر پرستی میں مبتلا ہونگی۔

(۸) انتہائی عجیب بات کہ اس امت میں نبوت کے جھوٹے دعویدار پیدا ہونگے، مثلاً مختار بن ابی عبید الثقفی جو شہادتین کے اقرار اور اسی امت کے ایک فرد ہونے کی صراحت اور رسول اللہ ﷺ کے برحق ہونے کے اعتقاد اور قرآن پاک کے برحق ہونے کے اعتراف کے باوجود نبوت کا دعویٰ کر بیٹھا۔

(۹) اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین ہیں، ان تمام باتوں کے باوجود اور واضح تضاد ہوتے ہوئے بھی کئی لوگوں نے اس کی تصدیق کر ڈالی، اور باوجود یہ کہ مختار صحابہ کے آخری دور میں ظاہر ہوا بہت سی جماعتوں نے اس کی پیروی کی۔

(۱۰) اس بشارت کا علم ہوا کہ اس امت سے حق کلی طور سے زائل نہیں ہوگا، جیسا کہ سابقہ امتوں سے زائل ہوگیا تھا، بلکہ ایک جماعت حق پر قائم رہے گی۔

(۱۱) رسول اللہ ﷺ کی ایک پیش گوئی ایک بہت بڑی نشانی کی صورت میں معلوم ہوئی کہ اس طائفہ منصورہ کو قلتِ تعداد کے باوجود ان کی مخالفت کرنے والا اور انہیں بے آسرا چھوڑنے والا کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

(۱۲) طائفہ منصورہ کی بابت یہ شرط قیامت تک قائم رہے گی۔

(۱۳) حدیثِ مذکورہ بڑی بڑی نشانیوں پر مشتمل ہے، جن میں رسول اللہ ﷺ کی پہلی خبر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرق ومغرب کو آپ کے لئے سمیٹا اور آپ ﷺ نے یہ خبر دی کہ مشرق ومغرب میں جہاں تک مسلمانوں کی حکومت جائے گی وہاں تک کا آپ ﷺ نے مشاہدہ کیا، جیسی آپ ﷺ نے خبر دی ویسا ہی ہوا، چنانچہ اسلامی فتوحات کا جو دائرہ مشرق ومغرب میں پھیلا وہ شمال وجنوب میں نہیں پھیل سکا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ خبر دی کہ آپ ﷺ کو قیصر وکسریٰ کے خزانے دیئے گئے ہیں، پھر آپ ﷺ نے یہ خبر دی کہ آپ کی امت کی بابت اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دو دعائیں قبول فرمالیں۔ (یعنی ایک یہ کہ اس امت کو عام قحط سالی سے ہلاک نہیں کیا جائے گا، اور دوسری یہ کہ اس امت پر کلی طور پر کسی دشمن کو مسلط نہیں کیا جائے گا) اور پھر آپ ﷺ نے یہ خبر دی کہ تیسری دعا کی قبولیت سے روک دیا گیا (یعنی اس امت کا آپس میں قتل وغارت گری کا بازار گرم کرنا اور ایک دوسرے کو یرغمال بنانے کے درپے ہونا) پھر آپ ﷺ نے یہ خبر بھی دی کہ اس امت میں تلوار چلے گی اور وہ تلوار جب چل پڑی تو قیامت تک بند نہیں ہوگی۔ نیز آپ ﷺ نے اس امت میں جھوٹے مدعیانِ نبوت کے ظہور کی خبر دی۔ اسکے علاوہ آپ ﷺ نے طائفہ منصورہ کے ہمیشہ قائم رہنے کی خبر دی۔ ان تمام اخبار میں ہر خبر بظاہر عقل سے بعید معلوم ہوتی ہے (لیکن پھر بھی ان کا وقوع، صدق نبوتِ محمدی پر زبردست دلیل ہے۔)

(۱۴) آپ ﷺ نے اپنی امت پر صرف گمراہ کن اماموں، عالموں اور لیڈروں کے ذریعے تباہی کے خوف وخدشہ کا اظہار فرمایا۔

(۱۵) بت پرستی کے معنی ومفہوم کی واضح نشاندہی ہوئی۔



باب ماجاء فی السحر

جادو کا بیان

سحر کا لغوی معنی کوئی مخفی چیز اور ایسی چیز ہے جس کا سبب لطیف وخفیف ہو۔ اسی لئے حدیث میں ہے کہ:

"اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا" ①

''بے شک بعض تقریریں بھی جادو بھری ہوتیں ہیں''

اور ''سحور'' کو ''سحور'' اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ رات کی آخری حصہ میں بڑی خفی واقع ہوتی ہے۔ اور قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ سَحَرُوْا اَعْيُنَ النَّاسِ ﴾ کا معنی یہی ہے ''کہ انہوں نے ان کا علم لوگوں سے مخفی کردیا۔''

اس باب کا کتاب التوحید سے تعلق

کیونکہ جادو شرک کی انواع میں سے ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ شرکیہ افعال کے بغیر جادو نہیں ہوسکتا، اور حدیث میں بھی ہے کہ "مَنْ سَحَرَ فَقَدْ اَشْرَكَ" ②

''جس نے جادو کیا اس نے شرک کیا''

بنابریں مصنف رحمہ اللہ نے جادو کے بیان کو کتاب التوحید میں شامل فرمالیا ہے، تاکہ شرک کی دیگر انواع واقسام کی طرح جادو کی تباہ کاریوں کو بھی واضح کردیا جائے۔

ابو محمد المقدسی نے اپنی کتاب ''الکافی'' میں جادو کے متعلق لکھا ہے کہ جادو ایسے تعویذات اور دم جھاڑ کا نام ہے جو قلوب وابدان میں اثر کرتا ہے، چنانچہ اس سے انسان مختلف بیماریوں کی لپیٹ میں آجاتا ہے، جادو انسان کی ہلاکت کا سبب بھی بن جاتا ہے نیز میاں بیوی کے درمیان تفریق پیدا کرنے کے لئے بھی جادو کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ﴾ ③

''پھر لوگ ان سے وہ سیکھتے جس سے خاوند اور بیوی میں جدائی ڈال دیتے''

جادو کی حقیقت وتاثیر مسلّم ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے جادو سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی ہے، جیسا کہ قرآن =

① حدیث کا جزء ہے، صحیح بخاری، کتاب الطب (۵۷۶۷) صحیح مسلم، کتاب الجمعة (۸۶۹)۔

② اس کی سند ضعیف ہے۔ سنن النسائی (۱۱۲/۷) اس میں عباس بن میسرة ''لین الحدیث'' ہے۔ مصنف عبد الرزاق (۱۹۷۷۲) کی سند صحیح ہے، لیکن مرسل ہے۔

③ (البقرة: ۱۰۲)

قال اللہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴾ ①

''اور بیشک انہیں اس چیز کا علم تھا کہ جس نے اس جادو کو حاصل کیا، اس کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔''

=

کریم کی ''سورۃ الفلق'' سے واضح ہوتا ہے۔ صحیح بخاری شریف میں مروی سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ کو جادو کیا گیا، حتی کہ آپ کو یہ وہم ہوتا کہ آپ کچھ کر رہے ہیں، حالانکہ آپ ﷺ کچھ نہ کر رہے ہوتے۔ اور ایک دن نبی ﷺ نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''کہ میرے پاس دو فرشتے آئے، ان میں سے ایک میرے سر کے پاس اور دوسرا ٹانگوں کے پاس بیٹھ گیا، ایک نے دوسرے سے پوچھا ان کو کیا تکلیف ہے، دوسرے نے کہا یہ مسحور ہیں... الحدیث'' ②

بعض معتزلہ کا جادو کے بارہ میں نظریہ یہ ہے کہ یہ حقیقت کے بجائے تخیل ہے، لیکن یہ اطلاق صحیح نہیں بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ کچھ جادو تخیل پر مبنی ہوتا ہے، اور کچھ کی حقیقت ہوتی ہے۔ جیسا کہ سابقہ بحث سے یہ بات اچھی طرح مفہوم ہو رہی ہے۔

جادو کا حکم قرآن کی روشنی میں

قولہ: قال اللہ تعالیٰ: وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ....

اس آیتِ کریمہ میں ان یہودیوں کے کردارِ بد کا ذکر ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب اور انبیاء علیہم السلام کی متابعت کے عوض میں جادو کو حاصل کر لیا تھا، ان کی مذمت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ جادوگر کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور حسن بصری رحمہ اللہ تو اسے دین سے خارج قرار دیتے ہیں۔

یہ آیت جادوگری کی حرمت پر صریح دلیل ہے، بلکہ سابقہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے دین میں اسے حرام قرار دیا گیا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴾ ③

''جادوگر جہاں بھی ہو کامیاب نہیں ہو سکتا''

بلکہ مذکورہ آیت میں ﴿ لَمَنِ اشْتَرَاهُ ﴾ کے عموم سے بعض علماء نے جادوگر کے کافر ہونے پر استدلال کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے تلامذہ بھی جادو سیکھنے اور سکھانے کو کفر شمار کرتے تھے۔ مصنف عبد الرزاق

---

① (البقرۃ: ۱۰۲)
② صحیح بخاری، کتاب الادب، (۶۰۶۳) صحیح مسلم، کتاب السلام (۲۱۸۹) مسند احمد (۲۱۲۱۱ ج ۸)
③ (طٰہٰ: ۹۶)

....

....

....

....

....

میں صفوان بن سُلیم سے مرسل روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے جادو سیکھا خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، تو وہ اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ آخری عہد ہوگا'' ①

بہر حال جادوگر کے کفر کے سلسلہ میں علماء سے مختلف آراء منقول ہیں۔ امام مالک، ابوحنیفہ اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ وغیرہم اس کے کفر کے قائل ہیں، جبکہ بعض علماء اس صورت میں کفر کے قائل ہیں جب اس کے جادو میں شرک شامل ہو، یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ اور انکے ساتھیوں سے منقول ہے، اور حقیقت میں دونوں اقوال میں کوئی تعارض نہیں ہے، چونکہ جو تکفیر کے قائل نہیں ان کے خیال میں شرک کے عمل دخل کے بغیر بھی جادو ممکن ہے، حالانکہ ایسا ممکن نہیں، جادو جو کہ شیاطین کی طرف سے آتا ہے، وہ شرک اور شیاطین اور کواکب کی عبادت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ قرآن حکیم کی ان دو آیات سے جادو کا کفر ہونا واضح ہوتا ہے: ﴿ إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ﴾ ②

''ہم تو ایک آزمائش ہیں تو کفر نہ کر''

﴿ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا ﴾ ③

''سلیمان علیہ السلام نے تو کفر نہ کیا تھا، بلکہ یہ کفر تو شیطانوں کا تھا''

علاوہ ازیں رزین کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ ''اَلسَّاحِرُ كَافِرٌ'' ④

یعنی ''جادوگر کافر ہے۔''

ابو العالیہ سے بھی جادو کا کفر ہونا کا قول منقول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت: ﴿ إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ﴾ کی جو تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا ہے اس سے بھی جادو کا کفر ہونا معلوم ہوتا ہے۔

ابن جریج کہتے ہیں کہ ''جادو کرنے کی جرأت صرف کافر ہی کرسکتا ہے۔''

① مصنف عبد الرزاق (۱۸۷۵۳) اس کی سند میں ابراھیم بن محمد بن ابی یحیٰ الاسلمی کذاب ہے۔
② (البقرۃ: ۱۰۳)
③ (البقرۃ: ۱۰۳)
④ مصنف نے رزین کا حوالہ دیا ہے، لیکن یہ روایت رزین میں نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

قال تعالیٰ : ﴿ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ ﴾ ①

قال عمر ﷺ:اَلْجِبْتُ ، اَلسِّحْرُ ، وَالطَّاغُوْتُ ، اَلشَّيْطَانُ . ②

وقال جابر ﷺ: اَلطَّوَاغِيْتُ كُهَّانٌ ، كَانَ يَنْزِلُ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فِي كُلِّ حَيٍّ وَاحِدٌ . ③

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ''وہ جبت اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں'' سیدنا عمر ﷺ کا قول ہے کہ یہاں ''الجبت'' سے مراد جادو ہے، اور ''الطاغوت'' سے مراد شیطان ہے۔

سیدنا جابر بن عبد اللہ ﷺ کا قول ہے کہ ''طواغیت'' وہ کاہن ہیں جن پر شیاطین نازل ہوا کرتے تھے، ہر قبیلہ کا الگ الگ کاہن تھا۔

وقوله:قال تعالیٰ : يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ....

یہاں آیتِ کریمہ کا جو حصہ ذکر کیا گیا ہے اس کی مکمل تفصیل پچھلے باب میں گزر چکی ہے، یہاں ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جادو ''جبت'' ہی ہے۔ چنانچہ مصنف ﷫ اس آیت کی تفسیر میں سیدنا عمر بن خطاب ﷺ کا قول لائے ہیں کہ یہاں ''جبت'' سے مراد جادو ہے، اور ''طاغوت'' سے مراد شیطان ہے۔ جبکہ ''طاغوت'' کے سلسلہ میں سیدنا جابر بن عبد اللہ ﷺ کا قول ہے کہ ''طواغیت وہ کاہن ہیں جن پر شیطان نازل ہوا کرتے تھے، ہر قبیلہ کا الگ الگ کاہن تھا۔''

ان کے اس قول سے مراد یہ ہے کہ کہان بھی طاغوت ہیں، یہ مراد نہیں کہ طاغوت ہی کہان ہیں، اور کوئی طاغوت نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر قبیلہ کا الگ الگ کاہن تھا جس کے پاس اس قبیلے کے لوگ غیب کی خبریں پوچھنے جایا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے یہ وباء عام تھی، اسلام نے آکر اسے یکسر باطل قرار دیا، اور شہابِ ثاقب کے ذریعے آسمان کی حفاظت کی۔

مصنف ﷫ یہ اقوال اس باب میں اس لئے لائے کہ جب کاہن کو طاغوت کہا گیا ہے تو پھر ساحر یعنی جادوگر بالاولی طاغوت ہوگا، کیونکہ ساحر، کاہن کی نسبت زیادہ خبیث اور بدترین ہے۔

---

① (النساء : ٥١)

② صحیح بخاری ، کتاب التفسیر، معلقا ،ابن حجر ﷫ نے اس کی سند کو قوی کہا ہے۔فتح الباری (٢٥٢/٨)۔

③ صحیح بخاری، کتاب التفسیرباب (١٠) معلقاً۔ حافظ ابن حجر ﷫ فتح الباری (٢٥٢/٨) میں فرماتے ہیں: اسکی سند قوی ہے۔

عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ! وَمَا ھُنَّ قَالَ: "اَلشِّرْكُ بِاللّٰہِ ، وَالسِّحْرُ ، وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ ، وَأَكْلُ الرِّبَا ، وَأَكْلُ مَالِ الْیَتِیْمِ ، وَالتَّوَلِّیْ یَوْمَ الزَّحْفِ ، وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ" ①

سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سات مہلک چیزوں سے دور رہو، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ وہ کیا ہیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، جادو کرنا، کسی نفس کو بلاحق شرعی قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جنگ میں پیٹھ دکھانا، اور فواحش سے دور رہنے والی پاک دامن مومن عورتوں پر تہمت لگانا۔''

اس حدیث میں سات تباہ کن گناہوں کا ذکر ہے، دوسری حدیث میں انہیں کبائر بھی کہا گیا ہے۔ انہیں مہلک اس لئے کہا گیا ہے کہ ان کے ارتکاب پر دنیا میں سزا اور آخرت میں عذاب کی وعید مرتب ہوتی ہے۔ بعض احادیث میں سات (۷) کی جگہ نو (۹) کا بھی ذکر ہے، دو زائد چیزیں یہ ہیں: حرم میں الحاد کرنا اور والدین کی نافرمانی۔ ②

بعض احادیث میں سحر کی جگہ جھوٹی قسم کا ذکر ہے۔ ③

بعض احادیث میں دس کی تعداد بھی وارد ہوئی ہے، چنانچہ مصنف رحمہ اللہ کی روایت کردہ حدیث کی سات چیزوں پر جن تین کا اضافہ ہے، وہ یہ ہیں۔ (۱) والدین کی نافرمانی (۲) جھوٹی قسم (۳) اور شراب نوشی۔ ایک حدیث میں ہجرت کے بعد بادیہ نشینی اختیار کرنے کو بھی کبائر میں شمار کیا گیا ہے، نیز جماعت سے فراق اور بیعت کو توڑنا بھی اس حدیث کی فہرست میں مذکور ہے، اسکے علاوہ بھی کئی گناہوں کا کبیرہ ہونا احادیث سے واضح ہوتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ سات یا نو یا دس کا عدد برائے حصر نہیں ہے، ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو پہلے مذکورہ کبائر سے باخبر کیا گیا ہو اسکے بعد مزید کبائر کی خبر دی گئی ہو۔ اس حدیث میں ان لوگوں کی واضح تردید کی گئی ہے جو کبیرہ گناہ کی تعریف میں یہ کہتے ہیں کہ ''کبیرہ گناہ وہ ہیں جن پر دنیا میں حد واجب ہو''

① صحیح بخاری، کتاب الوصایا (۲۷۶۶) کتاب الحدود (۶۸۵۷) صحیح مسلم، کتاب الایمان (۸۹) الفاظ بخاری کے ہیں۔

② حدیث کا جزء ہے "الادب المفرد" (ص ۵۲ رقم ۸) یہ روایت موقوف صحیح ہے۔

③ مصنف عبد الرزاق.

اس تعریف کا بطلان اس حدیث سے واضح ہو رہا ہے، کیونکہ حدیث میں ذکر کردہ بیشتر کبائر ایسے ہیں جن پر کوئی شرعی حد نہیں ہے۔

اس حدیث میں پہلا کبیرہ گناہ شرک باللہ ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کے ہمسر و ہم مثل قرار دے کر اللہ تعالیٰ کی طرح اسے پکارا جائے، اس سے اُمیدیں وابستہ کی جائیں اور ان سے اللہ تعالیٰ جیسا خوف رکھا جائے۔ اس گناہ کو سب سے پہلے ذکر کر کے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ یہ سب سے بڑا گناہ ہے اسی لئے اسے اکبر الکبائر کہا جاتا ہے، اور صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷛ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہ تم کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراؤ، حالانکہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔ ①

حدیث میں ذکر کردہ دوسرا کبیرہ گناہ جادو ہے، جس کی تعریف اور حکم وغیرہ بیان ہو چکے۔ اور اس حدیث کو اس باب میں لانے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ جادو کبیرہ گناہ ہے۔

تیسرا کبیرہ گناہ کسی شخص کو ناحق قتل کرنا ہے، قتل کرنے کے شرعی حق صرف تین ہیں، مرتد ہونا، شادی شدہ آدمی کا زنا کرنا، کسی قاتل کو (قصاص میں) قصداً قتل کرنا۔ اس کے علاوہ کسی مسلمان کا قتل بہت بڑا گناہ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ﴾ ②

''جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کر ڈالے، اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اور اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے''

چوتھا کبیرہ گناہ سود خوری ہے، اس پر بھی اللہ تعالیٰ نے جہنم کی وعید سنائی ہے:

﴿ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴾ ③

''سود خور لوگ نہ کھڑے ہوں گے مگر اسی طرح جس طرح وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان چھو کر خبطی بنا دے،

① صحیح البخاری، کتاب التفسیر (٤٧٦١)۔
② (النساء: ٩٣)
③ (البقرة: ٢٧٥)

....

....

....

یہ اس لئے کہ یہ کہا کرتے تھے کہ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے، اور سود کو حرام، جو شخص اپنے پاس آئی ہوئی اللہ تعالیٰ کی نصیحت کو سن کر رک گیا اس کیلئے وہ ہے جو گزرا اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، اور جس نے پھر بھی کیا، وہ جہنمی ہے، ایسے لوگ ہمیشہ ہی اس میں رہیں گے''

ابن دقیق العید فرماتے ہیں: ''کہ یہ بالکل مجرب بات ہے کہ سود خور کا خاتمہ انتہائی بُرا ہوتا ہے۔''

پانچواں کبیرہ گناہ یتیم کا مال کھانا ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ اس کے مال کے استعمال میں زیادتی اور حد سے تجاوز کا شکار ہونا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴾ ①

''جو لوگ ناحق ظلم سے یتیم کا مال کھا جاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ ہی بھر رہے ہیں، اور عنقریب وہ دوزخ میں جائیں گے''

اس کے بعد جس کبیرہ گناہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ کفار سے جنگ کے وقت میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگنا ہے۔ اس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ . وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ ②

''اے ایمان والو! جب تم کافروں سے دوبدو مقابل ہو جاؤ تو ان سے پشت مت پھیرنا۔ اور جو شخص ان سے اس موقع پر پشت پھیرے گا مگر ہاں جو لڑائی کے لئے پینترا بدلتا ہو یا جو (اپنی) جماعت کی طرف پناہ لینے آتا ہو وہ مستثنیٰ ہے۔ باقی اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے غضب میں آجائے گا، اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا، وہ بہت ہی بری جگہ ہے''

سب سے آخر میں جس کبیرہ گناہ کا ذکر ہے، وہ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا ہے، خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا باکرہ (کنواری) اس مسئلہ پر تمام علماء کا اجماع ہے۔

....

① (النساء: ۱۰)

② (الانفال: ۱۵، ۱۶)

قال:عن جندب مرفوعا :"حَدُّ السَّاحِرِ ضَرْبُہٗ بِالسَّیْفِ" (رواہ الترمذی وقال والصحیح انہ موقوف)

جناب جندب ﷛ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جادوگر کی حد اسے تلوار سے قتل کردینا ہے۔'' (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے، اور کہا ہے کہ اسکا موقوف ہونا زیادہ راجح ہے)

جادو کی سزا

قولہ:عن جندب مرفوعا :"حَدُّ السَّاحِرِ ضَرْبُہٗ بِالسَّیْف......

اس حدیث کو امام ترمذی ﷫ نے اپنی جامع میں اسماعیل بن مسلم المکی کے طریق سے روایت کیا ہے، اور کہا ہے کہ مرفوعاً اس کی یہی ایک سند ہے، اور اسماعیل بن مسلم المکی اپنے حافظہ کے اعتبار سے ضعیف فی الحدیث ہے الخ۔ امام ترمذی ﷫ نے کہا ہے کہ اس کا موقوف ہونا زیادہ صحیح ہے۔

امام ذہبی ﷫ نے بھی ''کتاب الکبائر'' میں اسے جندب ﷛ کا قول قرار دیا ہے۔

مغلطائی نے لکھا ہے کہ ''اگرچہ یہ حدیث ضعیف ہے لیکن کثرت طرق کی وجہ سے اس میں قوت پیدا ہوگئی ہے''

اسے بغوی، طبرانی اور بزار وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے۔ امام بخاری ﷫ نے اس حدیث کو اسماعیل کی وجہ سے "لاشیئ" قرار دیا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ جادوگر کی حد قتل بالسیف ہے، یہ مذہب بہت سے صحابہ، تابعین اور ائمہ میں سے امام ابوحنیفہ، امام مالک، اور امام احمد ﷫ سے منقول ہے، امام شافعی ﷫ مطلقاً اس کے قتل کے قائل نہیں تا آنکہ اس کا جادو حدِ کفر تک نہ پہنچ جائے، لیکن پہلا مذہب زیادہ راجح ہے، کیونکہ حدیث مذکور اس کی تائید کرتی ہے، نیز صحابہ کرام ﷢ میں سے امیر المؤمنین سیدنا عمر، عثمان غنی، عبداللہ بن عمر، حفصہ، جندب بن عبداللہ، جندب بن کعب اور قیس بن سعد ﷢ سے بھی یہی قول مروی ہے۔ اس کے علاوہ عمر بن عبدالعزیز ﷫ بھی جادوگر کے قتل کے قائل تھے۔

مصنف ﷫ نے صحابہ کرام ﷢ کے کچھ آثار بھی نقل کئے ہیں جن سے جادوگروں کا واجب القتل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ وہ آثار درج ذیل ہیں۔

قال:وفی صحیح البخاری عن بجالة بن عبدة قَالَ : كَتَبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ أَنِ اقْتُلُوْا كُلَّ سَاحِرٍ وَسَاحِرَةٍ ـ قَالَ فَقَتَلْنَا ثَلاثَ سَوَاحِرَ. ①

قَالَ :وَصَحَّ عَنْ حَفْصَةَ أَنَّهَا أَمَرَتْ بِقَتْلِ جَارِيَةٍ لَهَا سَحَرَتْهَا فَقُتِلَتْ . ②

قَالَ :وكَذَا عَنْ جُنْدِبٍ .

قَالَ اَحْمَدُ عَنْ ثَلاثَةٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ . ③

صحیح بخاری میں ہے، بجالہ بن عبدہ کہتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لکھا ہے کہ جادوگر مرد وعورت کوقتل کروتو ہم نے تین جادوگرنیوں کوقتل کیا۔

ام المؤمنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے اپنی اس لونڈی کوقتل کرنے کا حکم دیا، جس نے ان پر جادو کیا تھا، چنانچہ اسے قتل کردیا گیا۔

سیدنا جندب رضی اللہ عنہ سے بھی بسند صحیح جادوگر کا قتل کرنا ثابت ہے۔

سیدنا احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں :''گویا قتل ساحر تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہوگیا ،یعنی سیدنا عمر سیدہ حفصہ اور جندب رضی اللہ عنہم۔''

قوله: وفی الصحیح البخاری...... إلی: قال أحمد :عن ثلاثة ......

جندب سے مراد جندب بن کعب بن عبداللہ الأزدی رضی اللہ عنہ ہے، جو جندب الخیر کے نام سے معروف تھے، ان کے جادوگر کوقتل کرنے کا قصہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں ابوعثمان النہدی کی روایت سے اسطرح نقل کیا ہے: ولید کے پاس ایک شخص تھا جوکرتب اسطرح دکھاتا کہ ایک شخص کولوگوں کے سامنے ذبح کرکے اس کا سردھڑ سے جدا کردیتا، اور کچھ دیر بعد سر کو دھڑ کے ساتھ واپس لگادیتا، ہم اس کا یہ عمل دیکھ کر سخت تعجب کرتے لیکن صحابی جندب رضی اللہ عنہ تشریف لائے، اور اسے قتل کردیا۔

بیہقی دلائل النبوۃ میں اسی واقعہ کوقدرِ تفصیل سے لائے ہیں، جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب اس نے سر کو دھڑ کے ساتھ ملادیا تو کچھ لوگوں نے کہا سبحان اللہ! یہ تو مُردوں کوزندہ کرتا ہے، چنانچہ اگلے روز جب یہ کرتب دکھانے دوبارہ آیا تو صحابی رسول اس کے لئے تیار بیٹھے تھے، تلوار کا وار کرکے اس کی گردن تن سے

---

① یہ ایک حدیث کا جزء ہے۔ مسنداحمد (۱/ ۱۹۰) سنن ابوداؤد کتاب الخراج والفیء (۳۰۴۱) اسکی سندحسن ہے۔

② اس کی سند صحیح ہے مؤطا امام مالک، بلاغاً (۲/ ۸۷۱) سنن الکبریٰ للبیهقی (۱۳۶/۸، موصولا عن عبد اللّٰه بن عمر.

③ اس کی سند صحیح ہے۔التاریخ الکبیر لامام البخاری رحمہ اللہ (۲/ ۲۲۲) ۔

جدا کردی، اور فرمایا'' اگر یہ سچا ہے تو اپنے آپ کو بھی زندہ کر کے دکھائے'' چنانچہ ولید نے انہیں جیل میں ڈال دیا۔

البتہ قتل سے قبل توبہ کر لینے کے بارہ میں سلف کے درمیان اختلاف ہے۔ایک قول یہ ہے کہ اس سے توبہ نہیں لی جائے گی، یہ قول امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ سے بھی مشہور روایت یہی ہے، ان کا طرز استدلال یہ ہے کہ صحابہ کرام نے کسی ساحر سے قتل سے پہلے توبہ نہیں کرائی، نیز جادو کے علم کا جرم توبہ سے زائل نہیں ہوگا، بلکہ اس پر حد قائم کرنا ضروری ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ سے دوسری روایت یہ بھی منقول ہے کہ اس سے توبہ کرائی جائے گی، اگر اس نے توبہ کر لی تو اسے قبول کر کے اسے آزاد کر دیا جائے گا، یہی مذہب امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی ہے، اوران کا طرز استدلال یہ ہے کہ گناہِ سحر کی شناعت شرک سے زیادہ نہیں ہے، تو جب مشرک سے توبہ لی جا سکتی ہے تو ساحر سے بھی لی جانی چاہئے۔ اسکے علاوہ بھی کچھ دلائل ہیں مثلا: اہل کتاب کے ایک ساحر نے اسلام قبول کرلیا تھا، اسی طرح فرعون کے جادوگروں کا ایمان لے آنا بھی اس کی دلیل ہے۔لیکن پہلا قول راجح ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل صراحت سے ثابت ہے، اگر توبہ طلب کرنا واجب ہوتا صحابہ ایسا ضرور کرتے یا اس کا بیان ضرور فرماتے۔لھذا اسے مشرک پر قیاس کرنا صحیح نہیں کیونکہ ساحر فساد اور تشبیہ کے اعتبار سے مشرک سے چند قدم آگے ہی ہے۔اہل کتاب یا فرعون کے ساحروں سے استدلال بھی درست نہیں کیونکہ اسلام قبول کرنے کے بعد بحالت کفر کئے ہوئے گناہ مٹ جاتے ہیں۔



اس باب کے مسائل

(۱) سورۃ بقرہ کی آیت ﴿ وَلَقَدْ عَلِمُوْا.....الایة ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) سورۃ نساء کی آیت ﴿ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی

(۳) جبت اور طاغوت کا معنی، اوران دونوں کا فرق واضح ہوا۔

(۴) یہ بات واضح ہوئی کہ بعض اوقات طاغوت جنوں میں سے ہوتا ہے، اور بعض اوقات انسانوں میں سے۔

(۵) سات مہلک گناہوں کی معرفت حاصل ہوئی جنکی بطور خاص ممانعت وارد ہوئی ہے۔

(۶) جادوگر کا کافر ہونا معلوم ہوا۔

(۷) یہ بات معلوم ہوئی کہ جادوگر کو بلا توبہ کئے قتل کیا جائے گا۔

(۸) یہ بات معلوم ہوئی کہ امیر المؤمنین عمر بن خطاب ؓ کے دور میں جادوگر موجود تھے، تو اس کے بعد والے ادوار کا کیا حال۔



بیان شی ء من انواع السحر

جادو کی اقسام کا بیان

جادو کے حکم سے متعلق تفصیلی بحث سے فارغ ہو کر مصنف رحمہ اللہ اس کی چند اقسام بیان کرنا چاہتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جادو کا وقوع انتہائی کثرت وعمومیت اختیار کرتا جا رہا ہے، اور اس کی بیشتر صورتیں لوگوں پر مخفی ہیں، چنانچہ لوگوں کے اعتقاد کا عالم یہ ہے کہ وہ جادو کی ان صورتوں کو کرامات اور جادوگروں کو اولیاء اللہ سمجھتے ہیں۔ بلکہ اب تو نوبت بایں جا رسید کہ نفع وضرر کی بیشتر توقعات انہی سے وابستہ رکھتے ہوئے ان کی پوجا و پرستش تک شروع ہو چکی ہے۔ انہی سے حفاظت ونصرت کے امیدوار رہتے ہیں، چاہے وہ زندہ ہوں یا مردہ، بلکہ بہت سے لوگ تو ان کے متعلق تصرفِ تام کے اعتقادِ فاسد میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ لھذا ضروری ہے کہ وہ ضابطہ ومعیار ہمیشہ مؤمن کے پیش نظر رہے جس کے ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء کے درمیان اور نجومیوں، ساحروں، کاہنوں اور فال نکالنے والے اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے درمیان فرق پیدا کر سکے۔ چنانچہ کسی شخص کے ہاتھوں خرقِ عادت امور انجام پانے کو ولایت کی سب سے بڑی علامت سمجھا جاتا ہے، جب کہ یہ چیز نہ تو ولایت کا حصہ ہے اور نہ ہی کسی کے ولی ہونے کی شرط یا دلیل ہے، کیونکہ جادوگروں، شعبدہ بازوں اور ان نجومیوں اور کاہنوں، (جو شیطانوں کی چرائی ہوئی بعض غیبی خبروں کی نشاندہی کرتے ہیں) کے ہاتھوں انجام پانے والے بیشتر امور خرقِ عادت ہی ہوتے ہیں۔ تو کیا یہ شیطان اور بدعقیدہ وبد کردار عناصر اولیاء اللہ ہو سکتے ہیں؟ (حاشا وکلا)

حقیقت یہ ہے کہ دینداری اور عبادت وریاضت کا لبادہ اوڑھ کر کچھ خرقِ عادت امور انجام دینے والے لوگ شیطانی کردار کے مالک ہیں، اور مکمل طور پر شیطان کے زیرِ اثر ہیں، چنانچہ شیطان ان لوگوں کو اپنے اس پرفریب جال میں پھنسانے کے لئے صوفیوں اور راہبوں کا انتخاب کرتا ہے، اور ان کے ذریعے کچھ ایسے کام کرواتا ہے جو انسان کے دائرہ اختیار سے بعید ہوتے ہیں، مثلاً: کسی کو ہوا میں اڑانا، یا پانی پر چلانا، یا کھانا، پانی اور پیسے وغیرہ حاضر کرنا، جنہیں دیکھ کر لوگ ان کے صاحبِ کرامات اور صاحبِ اختیارات ہونے کے اعتقاد میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی شعبدہ بازیاں بعض اوقات تعویذوں، شیطانی دم جھاڑ، دواؤں یا مختلف حیلوں کی مدد سے بھی ظہور پذیر ہوتی ہیں، مثلاً: بعض لوگوں کا دوائیں مل کر آگ میں داخل ہونا۔ بعض اوقات خواب، فال، علم الرمل اور کنکریاں مارنا بھی ان شعبدہ بازیوں کا مصدر ومنبع بنا لئے

....

....

جاتے ہیں۔ بہرحال بنی آدم کی تذلیل کے لئے شیطان کے پاس بہت زیادہ طرق واحوال موجود ہیں جن سے دھوکا کھاتے ہوئے کسی کی ولایت کا اعتقاد کر لینا گمراہی، جہالت اور نادانی کی بدترین مثال ہے۔

اگر انسان اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب مقدس سے اولیاء اللہ کی تعریف اور صحیح مقام ومنصب دریافت کر لے تو وہ گمراہی کے اس عمیق گڑھے اور خوفناک قسم کی دلدل سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوسکتا ہے، اس وحدہ لاشریک لہ کی لا ثانی ھدایت کا اتباع اور اعتصام ہی درحقیقت عافیت وسعادت کی ضمانت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلاَ اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰهِ لاَخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلاَهُمْ یَحْزَنُوْنَ . اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴾ ①

’’آگاہ رہو، اولیاء اللہ پر نہ تو کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ ہی وہ مبتلائے غم ہونگے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ وپرہیزگاری کی راہ پر قائم ومستمر رہے‘‘

آیتِ کریمہ نے بابانگ دہل یہ اعلان کرکے کہ ولایت کے لئے صرف ایمان اور تقویٰ ہی شرط ہے، دماغوں پر مسلط اس نظریہ فاسد کو پاش پاش کر دیا کہ ولی وہی ہوسکتا ہے جو خرق عادت امور کی انجام دہی پر قادر ہو۔ چنانچہ آیت کی دلالت یہی ہے کہ انسان مومن اور متقی ہو تو وہ ولی ہے، خواہ زندگی بھر اس سے کوئی کرامت ظاہر نہ ہوئی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا: ﴿ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴾ ②

’’کہہ دیجئے! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا، اور تمہارے گناہ معاف فرمادے گا، اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔‘‘

واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء ومحبوبین صرف وہی ہیں جو اعتقادی وعملی، ظاہری وباطنی طور پر رسول اللہ ﷺ کے تابع فرمان ہیں۔ لہذا جو رسول اللہ ﷺ کے فرامین کا مخالف اور نافرمان ہے اس کا ولی ہونا تو بڑی دور کی بات ہے وہ تو مومن ہی نہیں۔

اس آیتِ کریمہ کے مصداق انسانوں سے اللہ تعالیٰ نے کیوں محبت کی؟ اس لئے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے مکمل دوستی کی، اور ان کی دوستی کا طریق کار کیا ہے؟ طریق کار صرف یہ ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے پسند

① (یونس: ۶۲، ۶۳) ② (آل عمران: ۳۱)

....

....

فرمائی اسے انہوں نے پسند کرلیا، اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے ناپسند فرمایا، اسے انہوں نے ناپسند کرلیا، جس چیز میں اللہ تعالیٰ کی رضا تھی وہ ان کا عمل وکردار بن گیا، اور جس چیز میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی تھی اس سے نہایت درجہ متنفر ہوگئے، اللہ تعالیٰ کے احکام و مامورات کی دعوت اور اس کی منہیات سے روکنا ان کا مشن بن گیا، جہاں خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کی محبت کا باعث ہے وہاں خرچ کرکے خوش ہوتے ہیں، اور جہاں خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ ممانعت فرمادے وہاں قطعاً خرچ نہیں کرتے۔ یہی باوفا کردار، باوفا دوستی کی شناخت و پہچان ہے، جس سے انسان اپنے پروردگار کے قریب ہوجاتا ہے، اس کا محبوب بن جاتا ہے، اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اللہ کا ولی بن جاتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات سے انحراف کرنے والے اگرچہ بڑے بڑے شعبدوں کے ذریعے اپنی کرامتوں کا سکہ منوانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، لیکن وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے دشمن اور مبغوض ترین انسان ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اولیاء اللہ وہ محبوبین ومقربین خداوند ہیں جو فرائض ونوافل کی ادائیگی، محرمات سے اجتناب، توحید سے مکمل محبت اور شرک سے کلی نفرت کا عملی ثبوت فراہم کریں، خواہ زندگی بھر ان سے کوئی کرامت یا خرق عادت کام ظاہر نہ ہوا ہو، بلکہ ان خوارق کا ظہور اگر ولایت کی دلیل ہوتا تو تمام کاہن، جادوگر، نجومی بلکہ یہود ونصاریٰ کے پادری وراہب اور بت پرست، سب کے سب اولیاء اللہ ہوتے، کیونکہ ان سے ہزاروں قسم کے خرقِ عادت کام رونما ہوتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ سب شیطان کے ہتھکنڈے ہیں جو اس قماش کے انسانوں پر نازل ہوتے ہیں، اور ان کے ہاتھوں مختلف شعبدہ بازیوں کے اظہار کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی تضلیل وتکفیر کا سبب بنتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِيْنُ. تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيْمٍ ﴾ ①

''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں۔ وہ ہر ایک جھوٹے پر اترتے ہیں''

نیز فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ﴾ ②

''اور جو شخص رحمٰن کی یاد سے غفلت کرے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کردیتے ہے، وہی اس کا ساتھی رہتا ہے''

① (الشعراء : ۲۲۲،۲۲۳) ② (الزخرف : ۳۶)

....

....

آیت بالا سے ثابت ہوا کہ شیطان خصلت انسانوں پر شیطان نازل ہوتا ہے، اور ان کے کتاب وسنت سے انحراف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اپنا دوست بنالیتا ہے، پھر حسبِ حال مختلف لوگوں کی شعبدہ بازیوں کے ذریعے لوگوں کے اعتقادات پر ڈاکے ڈالتا ہے، چنانچہ ان فریب خوردگانِ کرامت کے دل ودماغ میں یہ اعتقادات رچ بس جاتے ہیں، کہ فلاں بزرگ اگر کسی کی طرف انگلی اٹھائے تو وہ مرجاتا ہے، فلاں بزرگ فضاء میں خالی لوٹا بلند کرکے اسے پانی سے بھر دیتا ہے، فلاں بزرگ غیبی خبریں دیتا ہے، فلاں بزرگ لوگوں کے مسروقہ مال کی خبر دے دیتا ہے، اور فلاں بزرگ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے، یا کسی گمشدہ یا بیمار شخص کے احوال بتادیتا ہے، یا فلاں بزرگ کو مشکل کے وقت پکارا گیا تو وہ دوڑا ہوا بنفس نفیس آیا، اور اس مصیبت کو حل کرکے چلا گیا۔

اس قسم کے تمام اعتقادات گمراہی پر مبنی ہیں، اور اس قسم کے شعبدہ بازوں کا ولی اللہ ہونا تو دور کی بات ہے یہ تو مسلمان بھی نہیں ہوسکتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سچے ولی تو اس بات پر متفق ہیں کہ ایک شخص اگر فضاؤں میں اڑتا اور پانی پر چلتا نظر آئے تو اس کی ان شعبدہ بازیوں سے دھوکا نہ کھایا جائے، بلکہ اس کی تمام امور میں رسول اللہ ﷺ کی متابعت اور آپ ﷺ کی امر ونہی کی موافقت دیکھی جائے، جبکہ امرِ واقع یہ ہے کہ اس قماش کے بیشتر لوگ وضوء تک نہیں کرتے، فرضی نماز تک ادا نہیں کرتے، اور پاک صاف نہیں رہتے، بلکہ گندگیوں، غلاظتوں ونجاستوں میں ڈوبے اور کتوں میں گھرے رہتے ہیں، گندگی کے ڈھیروں پر آکر بیٹھ جاتے ہیں، انتہائی مکروہ اور خبیث قسم کی بدبو میں لپٹے رہتے ہیں، مختلف فواحشات کا ارتکاب کرتے ہیں، شیطان کی خوشی کی خاطر سانپ اور بچھو اور دیگر خباثتیں اور غلاظتیں تک کھا جاتے ہیں، بازاروں میں ننگے گھومتے پھرتے ہیں، غیر اللہ کو سجدہ کرکے شرک یا جہراً کفر باللہ کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں، قرآن سننا انہیں گوارا نہیں ہوتا اور مختلف قسم کے گانے اور قوالیاں اور شرکیہ اشعار سن کر مست ہوتے ہیں۔

افسوس! صد افسوس! ان لوگوں پر جو کتاب وسنت کی پاکیزہ تعلیمات سے صرفِ نظر کرکے ان خبیث النفس، خبیث الجنس اور خبیث العقیدہ لوگوں کی شعبدہ بازیوں کی وجہ سے انہیں ولی اللہ سمجھتے ہوئے ان کے اشاروں پر ناچتے ہیں، اور ان کی پوجا وپرستش اور دعاء واستغاثہ کی وجہ سے کفر وشرک کے گھپ اندھیروں

....

....

....

اور عمیق واتھاہ وادیوں میں حیران وگرداں اور غیظ وغضبِ خداوندی کی گٹھڑیاں سروں پر اٹھائے کشاں کشاں جہنم کی جانب بڑھتے چلے جارہے ہیں۔

جادواور کرامت میں فرق

اب یہاں ایک سوال قائم کرکے اس کے جواب کا ذکر کرنا انتہائی مفید ہوگا، سوال یہ ہے کہ کرامت اور شعبدہ بازی میں فرق کیوں کر ممکن ہے؟

جواباً گزارش ہے کہ ویسے تو گزشتہ بحث میں فرق واضح ہو چکا ہے، تاہم تفہیم کی خاطر دوبارہ کہے دیتے ہیں کہ شریعت کی خلاف ورزی کرنے والے شخص کے ہاتھوں اگر کسی خرقِ عادت کام کا ظہور ہوتا ہے تو وہ کرامت قطعاً نہیں ہوسکتی، بلکہ اسے یا تو استدراج اور یا پھر شیطانی عمل کہا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی کرامت نہیں ملتی، لھذا بدکردار لوگوں کے کرتب وشعبدہ بازیاں کراماتِ رحمانیہ کے بجائے احوالِ شیطانیہ ہی کہلائیں گی۔ اور مشاہدہ میں یہی بات آئی ہے کہ انسان جس قدر کتاب وسنت سے دور ہوگا اس کے ہاتھوں شیطانی خوارق اُسی قدر زیادہ انجام پائیں گے، چنانچہ کافرانہ اوصاف رکھنے والوں کے ہاتھوں ظاہر ہونے والی خوارق کی کثرت اس حقیقت کی جیتی جاگتی دلیل ہے۔ رہی کرامت تو وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت، تقرب، توحید کے کامل تحقق، کتاب وسنت کے ساتھ تمسک اور محرمات سے اجتناب کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اس فرق پر تمام علماء متفق ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر آپ کو اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے حصول کے اسباب کا علم ہو جائے، (جن کا بیان پچھلے صفحات میں ہو چکا) تو پھر اولیاء اللہ کی معرفت یقینی ہو جائے گی، اور جب اولیاء اللہ کی پہچان حاصل ہوگئی تو پھر انہی کا اہلِ کرامت ہونا واضح طور پر معلوم ہو جائے گا۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ایک کتاب حق بیان لکھی ہے جس کا نام "الفرقان بین اولیاء الرحمٰن واولیاء الشیطان" ہے، اس کا مطالعہ کافی مفید ثابت ہوگا۔

قَالَ اَحْمَدُ :حَدَّثَنَا مَحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ حَدَّثَنَا عَوْفٌ حَدَّثَنَا حبَّانُ بْنُ العلاء حدثنا قطن بن قبيصة عن ابيه انه سمع النبی ﷺ قَالَ :"اِنَّ الْعِيَافَةَ وَالطَّرْقَ وَالطِّيَرَةَ مِنَ الْجِبْتِ" قَالَ عَوْفٌ: أَلْعِيَافَةُ: زَجْرُالطَّيْرِ ، وَالطَّرْقُ: اَلْخَطُّ يُخَطُّ بِالْاَرْضِ ، وَالْجِبْتُ: قَالَ الْحَسَنُ رَنَّةُ الشَّيْطٰنِ (اسناده جيد ولابی داؤد والنسائی وابن حبان فی صحيحه المسند منه) ①

قبیصہ بن مخارق ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو سنا آپ فرماتے تھے: ''پرندوں کو اڑا کر فال لینا اور زمین پر خط کھینچنا ''جبت'' ہے'' عوف کہتے ہیں: عیافۃ کا معنی پرندے لیکر اڑانا ہے، جبکہ ''طرق'' وہ خط ہے جو زمین پر کھینچا جائے ،اور ''جبت'' کے بارے میں حسن کا قول ہے کہ یہ شیطانی آواز کو بولتے ہیں۔ (مسند احمد کی روایت کردہ اس حدیث کی سند جید ہے، جبکہ ابوداؤد، نسائی اور صحیح ابن حبان میں اس حدیث کا بیان شدہ مرفوع حصہ موجود ہے)

جادو کی کچھ اقسام احادیث کی روشنی میں

قولہ:قال اَحْمَدُ :حَدَّثَنَا مَحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ حَدَّثَنَا عَوْفٌ......

اس حدیث میں چند چیزوں کو ''جبت'' یعنی جادو کے اعمال بتایا گیا ہے، چنانچہ پہلی چیز ''العیافۃ'' ہے جس کے بارے میں حدیث کے راوی عوف بن ابی حمیلہ العبدی البصری کی تفسیر نقل کی گئی ہے، یعنی ''پرندے اڑانے کو عیافہ بولتے ہیں۔''

ابوالسعادات نے لکھا ہے کہ ''پرندے اڑانے سے مقصود فال حاصل کرنا ہے''

چنانچہ ان کے ناموں یا آوازوں کی مختلف کیفیتوں یا دائیں یا بائیں اڑ کر جانے کو نیک یا بد فال تصور کیا جاتا تھا، اہل عرب اس عادت بد میں بہت زیادہ ملوث تھے، رسول اللہ ﷺ نے اس کو ''جبت'' یعنی شیطانی آواز یا سحر کی ایک قسم قرار دیکر باطل قرار دے دیا۔

"الطرق" کی تفسیر عوف نے اس خط سے کی ہے جو زمین پر کھینچا جاتا ہے، یہ خط کشیدگی علم نجوم کی ایک فرع ہے، تو مقام غور ہے کہ جب علمِ نجوم کی ایک فرع کو جبت شمار کیا گیا ہے تو پھر مکمل علمِ نجوم کی شناعت و برائی کا کیا عالم ہوگا۔

① یہ روایت حسن درجہ کی ہے۔ مصنف عبد الرزاق (١٩٥٠٢) مسند احمد (٢٠٦٢٦، ٢٠٦٢٧ ج٧) سنن ابی داؤد (٣٩٠٧) سنن الکبریٰ للبیهقی (١٣٩/٨) امام نووی ؒ نے ریاض الصالحین (١٦٧٨) میں اسے حسن کہا ہے۔

قال :وعن ابن عباس قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَنِ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ النُّجُوْمِ فَقَدِ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِّنَ السِّحْرِ زَادَ مَازَادَ (رواہ ابو داؤد واسنادہ صحیح) ①

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے علم نجوم کا ایک باب سیکھا اس نے جادوگری کا ایک باب سیکھ لیا، اب وہ جتنا چاہے بڑھالے۔ (اسے ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

قال :وللنسائی من حدیث ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ مَنْ عَقَدَ عُقْدَةً ثُمَّ نَفَثَ فِيْهَا ، فَقَدْ سَحَرَ ، وَمَنْ سَحَرَ فَقَدْ اَشْرَكَ ، وَمَنْ تَعَلَّقَ شَيْئًا وُكِّلَ اِلَيْهِ . ②

سنن نسائی میں سیدنا ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''جس نے گرہیں باندھ کر ان میں پھونکا اس نے جادو کیا، اور جس نے جادو کیا اس نے شرک کیا، اور جس نے کوئی چیز، (اپنے گلے وغیرہ میں) لٹکائی، وہ اس کے بھروسے پر چھوڑ دیا گیا۔''

قولہ :وعن ابن عباس رضی اللہ عنہ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَنِ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ النُّجُوْمِ ......

شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ'' اس حدیث سے معلوم ہوا کہ علمِ نجوم جادوگری کا ایک حصہ ہے، اور جادوگروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴾ ③

''جادوگر کہیں سے بھی آئے کامیاب نہیں ہوتا''

نجومیوں پر بھی یہی بات مکمل طور پر صادق آتی ہے، چنانچہ امر واقع یہ ہے کہ نجومی بیچارے نہ دنیا میں فلاح وسعادت کی زندگی بسر کرسکتے ہیں، اور نہ ہی آخرت میں کامیاب ہوسکیں گے''

اس حدیث سے یہ بھی واضح ہوا کہ انسان جس قدر علم نجوم حاصل کرتا رہے گا اسی قدر جادوگری کا گناہ اور وبال اس کے سر چڑھتا رہے گا، کیونکہ نجومی اللہ تعالیٰ کے خزانہ غیب میں ہاتھ ڈالنے کی انتہائی مذموم جسارت کے مرتکب ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ علمِ نجوم کی تاثیر بھی باطل ہے، اور اسکے مدعی و مقتضی پر عمل بھی حرام ہے۔

① شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ مسند احمد (۲۸۴۱) سنن ابی داؤد، کتاب الکھانۃ (۳۹۰۶)۔

② اس کی سند ضعیف ہے۔ سنن النسائی (رقم: ۴۰۷۹) اس میں عباس بن میسرۃ "لین الحدیث" ہے۔ مصنف عبدالرزاق (۱۹۷۷۲) کی سند صحیح ہے۔ لیکن مرسل ہے۔ یاد رہے کہ اس حدیث سے جملہ "ومن تعلق شیئا و کل إلیه" ثابت ہے، دیکھئے: سنن ترمذی، رقم (۲۱۶۷) التعلیق الرغیب (۵۱/۴)

③ (طہ: ۶۹)

قولہ :وللنسائی من حدیث ابی ہریرۃ ﷺ مَنْ عَقَدَ عُقْدَۃً ثُمَّ نَفَثَ فِیْھَا ......

یہ حدیث سنن نسائی میں سیدنا ابوھریرۃ ﷺ سے مرفوعاً مروی ہے، اور ابن مفلح نے اسے ''حسن'' کہا ہے، لیکن امام ذہبی فرماتے ہیں کہ ''صحیح'' نہیں ہے۔

اس حدیث میں سب سے پہلے ان لوگوں کی تردید کی گئی ہے جو دھاگے، رسی یا کپڑے وغیرہ میں گرہیں باندھ کر پھونکتے ہیں، یہ طریقہ عام طور پر جادوگر ہی استعمال کرتے ہیں جس سے ان کے جادو کی غرض منعقد ہو جاتی ہے، انہی عناصر کے شر سے اللہ تعالیٰ نے پناہ مانگنے کا حکم دیا:

﴿ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ﴾ ①

''اور میں گرہوں میں پھونکنے والی جادوگر عورتوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں''

"نفث" اس پھونک کو کہتے ہیں جس میں تھوک کی آمیزش بھی ہو، چنانچہ جادوگر شخصِ مسحور کے ساتھ جس خباثت یا شرارت کا ارادہ کر لیتے ہیں اسی طرح کے سانچے میں ڈھل کر ارواحِ خبیثہ کی مدد لیتے ہوئے ان گرہوں میں مذکورہ طریقہ سے پھونک مارتے ہیں، چنانچہ ان کے اس انتہائی خبیث اور ناپاک سانس کے ساتھ نکلی ہوئی پلید اور نجس پھونک میں وہ شیطانی عنصر شامل ہوتا ہے جو شخص مسحور کی ایذاء رسانی اور تکلیف دہی کیلئے اللہ تعالیٰ کے اذنِ کونی سے بصورت جادو اس کو لاحق ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمانا: " وَمَنْ سَحَرَ فَقَدْ اَشْرَكَ " جادوگر کے مشرک ہونے پر نص ہے، کیونکہ بدون شرک جادو ہو ہی نہیں سکتا۔

اس حدیثِ مبارک میں بیان شدہ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جسم کے کسی حصے (مثلاً: گلے، بازو، پیٹ یا ران) وغیرہ میں کوئی چیز لٹکانے یا باندھنے والا اس باندھی ہوئی چیز کے بھروسے پر چھوڑ دیا جاتا ہے، اسکے برعکس اگر انسان اپنے رب کے ساتھ تعلق جوڑے اور مولائے کائنات، ربِ کائنات اور مالکِ کائنات پر کلی بھروسہ کرے تو پروردگارِ عالم اس کی حفاظت و کفایت فرمائے گا، کیونکہ سب سے بہترین دوست و مددگار وہی ہے۔

اس ذاتِ اعلیٰ و اقدس کو چھوڑ کر شعبدہ بازوں، جادوگروں اور شیطان کے آلہ کاروں کے مشرکانہ تعویذ گنڈوں پر یقین و انحصار کرنے والے ایک ایسے دھارے پر بہہ رہے ہیں کہ وہ انجام کار کے اعتبار سے دنیا و آخرت کی بربادی پر پہنچ گئے ہیں، ان کا انجام ان کی بربادی پر منتج ہوگا۔ لھذا اللہ تعالیٰ کے علاوہ، چاہے وہ کوئی بھی ہو، اور کچھ بھی ہو، پر بھروسہ کرنے والے کو مبتلائے شر و فساد قرار دینا ایک ایسی سنتِ الٰہیہ ہے جس =

① (الفلق: ٤)

قـال :وعن ابن مسعود ﷺ ان رسـول الله ﷺ قـالَ :"أَلا أُنَبِّئُكُمْ مَا الْعَضْهُ ؟هِيَ النَّمِيْمَةُ أَلْقَالَةُ بَيْنَ النَّاسِ " (رواه مسلم) ①

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خبردار! کیا میں تمہیں بتاؤں ''عضہ'' کیا ہے؟ یہ لوگوں کے درمیان کثرت سے کی جانے والی چغلی ہے۔'' (مسلم)

=

میں تبدیل وتحویل کا کوئی امکان نہیں ہے۔نصوص قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ احوالِ خلق کا مشاہدہ ومعائنہ بھی اس حقیقتِ ناقابل تردید کی ایک اٹل اور ٹھوس دلیل ہے۔

قوله :وعن ابن مسعود ﷺ ان رسول الله ﷺ قَالَ :"أَلا أَنَبِّئُكُمْ ما الْعَضْهُ ؟......

اس حدیث میں ''عضہ'' کو ''نمیمہ'' یعنی چغلی کہا گیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ ''نمیمہ'' کذب بیانی اور بہتان طرازی سے خالی نہیں ہو سکتی۔

مصنف رحمہ اللہ کا اس حدیث کو اس باب میں لانے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ "عضہ" کا بمعنی ''سحر'' استعمال بھی ثابت ہے، کیونکہ حدیث مذکور میں ''نمیمہ'' کے ''سحر'' ہونے کا امکان بتلایا گیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: " كَادَتِ النَمِيْمَةُ اَنْ تَكُوْنَ سِحْرًا "

''قریب تھا کہ چغلی کو جادو قرار دیا جاتا''

یہ روایت ''مکارم الاخلاق'' میں بسند ضعیف موجود ہے۔

ابن عبدالبر نے یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''چغل خوری وکذاب ایک پل میں جو بگاڑ پیدا کر سکتے ہیں وہ جادوگر پورے سال میں نہیں پیدا کر سکتے۔''

ابو الخطاب نے ''عیون المسائل'' میں لکھا ہے کہ ''چغل خور کے ذریعے لوگوں کے درمیان فساد برپا کرنے کی کوشش کرنا بھی جادو ہی کی ایک قسم ہے''۔

اور ''الفروع'' میں اس قول کی توجیہ یوں بیان کی گئی ہے: ''چونکہ چغل خور بتلائے فتنہ وفساد کرنے کے لئے اپنی پرفریب گفتگو اور تمام حیلہ سازیوں کو بروئے کار لاتا ہے، لہذا اس کا یہ عمل جادو ہی سے مشابہ ہوا۔''

بہر حال ثابت یہ ہوا کہ چغل خور اور کذاب کا حکم جادوگر والا تو نہیں کہ جادو کی طرح عام چغل خوری کو بھی کفر قرار دیا جائے، البتہ یہ ضرور کہا جائے گا کہ ہر مکروفریب جادوگری کا شاخسانہ ہوتا ہے، بالکل اسی جیسی

=

① صحيح مسلم ،كتاب البر والصلة (٢٦٠٦)

قال :ولهما عن ابن عمر ان رسول الله ﷺ قَالَ :"اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا" ①

صحیح بخاری و مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کچھ بیان بھی جادو ہوتے ہیں۔''

=

حیلہ سازیاں چغلی کو مؤثر بناتی ہیں۔ (تو گویا طریقہ کار اور تاثیر کے اعتبار سے ان دونوں میں گہری مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے۔)

اس حدیث سے چغل خوری کی حرمت کا بھی علم ہوا، اور اس بات پر تمام علماء کا بھی اجماع ہے۔

حافظ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''ضروری نصیحت و خیر خواہی کے علاوہ (جو کہ ایک اعلیٰ مصلحت ہے) غیبت اور چغل خوری کی حرمت پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔''

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چغل خوری کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔

قوله :ولهما عن ابن عمر رضی اللہ عنہ ان رسول الله ﷺ قَالَ :"اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا"

بیان سے مراد ایسی گفتگو اور تقریر ہے جو فصاحت و بلاغت سے پر ہو۔

اس حدیث کے بہت سے مطالب بیان کئے گئے ہیں، لیکن سب سے صحیح مفہوم یہی ہے کہ کوئی فصیح و بلیغ انسان اپنی قادر الکلامی اور زور بیانی سے کام لیتے ہوئے ناحق کو حق ثابت کرنے کیلئے ایسی مؤثر اور بلیغ گفتگو کرے کہ لوگ اس کی بلاغت اور زور خطاب سے متاثر ہو کر اسے حق اور سچ سمجھنے لگیں ...... ایسی گفتگو کو جادو اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ بھی جادو کی طرح دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ فصاحت و بلاغت یا حسن بیان، جو مبالغہ آرائی کی حد تک نہ پہنچے اپنے اصل کے اعتبار سے ایک قابل تعریف وصف ہے، لیکن ایسا بیان جو مبالغہ آرائی کی حد تک پہنچ جائے یا جس میں باطل کی ایسی تصویر کشی ہو کہ وہ حق معلوم ہونے لگے، جادو کہلائے گا۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ کا ایک دوسری حدیث میں ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ اس فصیح و بلیغ انسان سے نفرت فرماتا ہے جو اپنی زبان کی تیزی و طراری سے سب کچھ نگل جاتا ہے، جس طرح کہ گائے اپنی زبان سے اپنے چارے کا صفایا کر دیتی ہے۔'' ②

یہ حدیث مسند احمد اور سنن ابو داؤد میں ہے، جبکہ ابو داؤد ہی کی ایک اور حدیث میں ہے کہ ''مجھے گفتگو میں اختصار کا پہلو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ اختصار میں ہی بھلائی ہے۔'' ③

---

① یہ ایک حدیث کا جزء ہے، صحيح بخاری ، كتاب الطب(٥٧٦٧) صحيح مسلم ، كتاب الجمعة (٨٦٩) .

② صحيح .مسنداحمد (٦٥٥٤، ٦٧٧٠ ج ٢) سنن ابوداؤد ، كتاب الادب(٤٩٩٥) سنن الترمذی (٢٨٥٣). الفاظ ابوداؤد کے ہیں۔ ③ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے "حسن الإسناد" قرار دیا ہے۔ سنن ابو داؤد، کتاب الادب (٤٩٩٨) .

اس باب کے مسائل

(۱) یہ بات معلوم ہوئی کہ عیافة ،طرق اور طیرہ جن کی تعریفیں گزر چکی ہیں ،سب " جبت " کی اقسام ہیں۔

(۲) عیافہ اور طرق کی تشریح معلوم ہوئی۔

(۳) علم نجوم بھی جادو کی ایک قسم ہے۔

(۴) گرہ لگا کر اس میں پھونکنا بھی جادو ہے۔

(۵) چغلی بھی جادو ہی کی ایک قسم ہے۔

(٦) بعض فصاحت و بلاغت سے بھرپور بیان بھی جادو کہلاتے ہیں۔



باب ماجاء في الكهان ونحوهم

کاہنوں کا بیان

قال :وروى مسلم في صحيحه عن بعض أزواج النبي ﷺ عن النبي ﷺ قال: مَنْ اَتٰى عَرَّافًا فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْئٍ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةُ أَرْبَعِيْنَ [لَيْلَةً] ①

صحیح مسلم میں ہے رسول اللہ ﷺ کی ایک زوجہ محترمہ (حفصہ رضی اللہ عنہا) سے مروی ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کسی نجومی کے پاس آکر کوئی بات پوچھے اور اس کی تصدیق بھی کر دے تو اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہیں کی جائیں گی۔''

مصنف رحمہ اللہ نے سحر اور اس کے متعلقات کی بحث کے بعد کاہنوں او نجومیوں کے متعلق باب قائم فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کاہن اور نجومی جادوگروں سے کافی حد تک مشابہت اور مماثلت رکھتے ہیں۔

کہانت کا معنی

کہانت ایک ایسا فن ہے کہ جس میں علم غیب اور مستقبل کی خبریں بتانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، اس کی بنیاد وہ خبر ہوتی ہے جو جن، فرشتوں کے کلام سے چرا کر کاہن کے کان میں ڈال دیتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ فی زمانہ موجود تو ہیں لیکن دورِ جاہلیت کے مقابلہ میں ان کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شہابِ ثاقب کے ذریعے آسمانی خبروں کی حفاظت فرمادی ہے، البتہ جنوں کا اپنے دوست انسانوں کو غیب کی خبریں دینا اس زمانہ میں کافی حد تک موجود ہے، ایسے لوگ عام طور پر ولایت اور کشف کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ کاہن ہیں، شیاطین کے بھائی ہیں، اور ولایت سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔

امام خطابی رحمہ اللہ کاہنوں کے بارے میں فرماتے ہیں: ''کہ تیز طرار، شریر، خبیث النفس اور ناری طبیعتیں رکھنے والی قوم ہے، جنوں سے ان کا رابطہ ہوتا ہے، اور مختلف حوادث وواقعات کی بابت ان سے استفسار کرتے رہتے ہیں، چنانچہ وہ انہیں کچھ خبریں بتا دیتے ہیں جن کے ذریعے وہ لوگوں کی گمراہی کا سبب بن جاتے ہیں۔''

قوله :وروى مسلم في صحيحه عن بعض أزواج النبي ﷺ......

واضح ہو کہ کاہنوں اور نجومیوں کے پاس جانا ناجائز ہے، جیسا کہ معاویہ بن حکم السلمی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے

① صحیح مسلم، کتاب السلام (٢٢٣٠) مسند احمد (١٦٦٣٨، ٢٣٢٨٢ ج ٥)۔

....

....

واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خدمت میں حاضر ہوکر یہ گزارش کی تھی کہ ہمارے کچھ افراد کاہنوں کے پاس جاتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم مت جایا کرو'' ①

لہذا معلوم ہوا کہ کاہنوں کے پاس سوال کی غرض سے جانا بھی ممنوع اور حرام ہے۔ خواہ اس کے جواب کی تصدیق کرے یا شک کرے، کیونکہ تصدیق کرنا تو صریح کفر ہے، کیونکہ یہ تصدیق ان کے غیب جاننے کے اعتقاد کو مستلزم ہے، یہی حکم شک کرنے کی صورت میں ہوگا، کیونکہ کاہن کی خبر سن کر شک کرنا ان کے غیب جاننے میں شک کرنے کو مستلزم ہے، اور یہ اعتقاد بھی غلط اور موجب وعید ہے۔ صحیح اعتقاد یہ ہے کہ انتہائی جزم، قطعیت اور یقین کے ساتھ یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا غیب کوئی نہیں جانتا۔

اس حدیث میں کاہن کے پاس آنے کی وعید شدید مذکور ہے، کہ وہ چالیس دن کی نمازوں کے ثواب سے یکسر محروم ہوجائے گا، گو اسکا فریضہ ادائیگی نماز ادا ہوجائے گا، لیکن اجر وثواب سے مکمل محرومی کی سزا ضرور ملے گی۔ (یہ امام نووی رحمہ اللہ کے کلام کا ملخص ہے) چنانچہ انہوں نے نجومی کے پاس جانے والے شخص کی نمازوں کو اس شخص کی نمازوں پر قیاس کیا ہے جو کسی غصب شدہ زمین پر نماز پڑھتا ہے۔ اور یہ ایک معروف فقہی مسئلہ ہے جس کے حکم میں فقہاء کے درمیان کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے بیشتر علماء کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے، کہ ایسی نمازوں کی فرضیت تو ساقط ہوجائے گی، لیکن ثواب نہیں ملے گا جس کا معنی یہ ہے کہ ان نمازوں کا اعادہ ضروری نہیں ہے۔

جبکہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مذہب کی مشہور روایت یہ ہے کہ ایسی نمازوں کی فرضیت ساقط نہیں ہوتی بلکہ ان کا اعادہ ضروری ہوگا۔ بہر حال اس حدیث میں نجومی یا کاہن کے پاس جانے کی شدید ممانعت وارد ہوئی ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے، کہ '' قانونی محتسب اگر تعزیزات قائم کرنے کی قدرت رکھتا ہو تو اسے ان کاہنوں اور ان کے پاس جانے والوں کو ضرور سزا دینی چاہیئے، بعض باتوں میں ان کی صداقت سے وہ قطعاً دھوکے میں نہ آئے، اور نہ ہی اس بات سے دھوکہ کھائے کہ فلاں کاہن تو بڑا مرجع خلائق ہے اور اس کی بڑی علمی شہرت ہے، ایسے لوگوں کا علم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ وہ جاہل ہوتے ہیں، اور پھر سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ ان کے پاس جانے کی شرعی ممانعت اور اس کی وعید موجود ہے۔''

① یہ ایک حدیث کا جزء ہے۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب تحریم الکھانة وإتیان الکھانة (۲۲۲۷/۵۳۷)

قال:عن ابی هريرة عن النبی ﷺ قال :" مَنْ أَتٰی کَا هِنًا فَصَدَّقَهٗ بِمَا یَقُوْلُ فَقَدْ کَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ ﷺ " (رواه ابو داؤد) ①

وللاربعة والحاكم وقال : صحيح على شرطهما عن(ابی هريرة مرفوعا)" مَنْ أَتٰی عَرَّافًا أَوْکَا هِنًا فَصَدَّ قَهٗ بِمَا یَقُوْلُ فَقَدْ کَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ ﷺ ۔" ②

ولابی یعلٰی بسند جید عن ابن مسعود مثله موقوفا ۔③

ابوھریرۃ ؓ سے مروی ہے۔کہ نبی ﷺ نے فرمایا:''جوکسی کاہن کے پاس آئے اوراس کی باتوں کی تصدیق کرے تواس نے محمد ﷺ پرنازل شدہ وحی (قرآن وحدیث) کاانکارکردیا''

اورسنن اربعہ اور مستدرک حاکم میں حدیث ہے جسے حاکم نے شیخین کی شرط پر صحیح کہا ہے،کہ ابوھریرۃ ؓ سے مروی ہے،کہ''جوکسی کاہن کے پاس آکراس کی باتوں کی تصدیق کرے تواس نے محمد ﷺ پرنازل شدہ وحی کاانکارکیا''

اس معنی کی ایک روایت مسند ابویعلٰی میں بسند جید عبداللہ بن مسعود ؓ سے مرفوعا مروی ہے۔

وقوله:وعن ابی هريرة...... إلى ولابی یعلٰی بسند جید......

واضح ہوکہ مصنف ؒ نے بحوالہ ابوداؤد جس پہلی حدیث کا ذکرکیا ہے،اس کامکمل مضمون یہ ہے،کہ جو کسی کاہن کے پاس آکراس کی باتوں کی تصدیق کرے یا حائضہ عورت سے مجامعت کرے یاعورت کی دبر میں مجامعت کرے تووہ محمد ﷺ کی وحی سے بری ہوگیا۔

کاہنوں کے پاس جانے کی شرعی وعیدیں

اس حدیث کوابوداؤد کے علاوہ ترمذی،نسائی اورابن ماجہ نے بھی انہی الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔

امام ترمذی نے لکھاہے کہ''امام بخاری ؒ نے باعتبار سند اس حدیث کوضعیف کہا ہے۔''

امام بغوی اورحافظ ذہبی ؒ سے بھی اس حدیث کاضعیف الاسناد ہونا منقول ہے۔

ابوالفتح العمری نے اس کے متن کے منکر ہونے کا دعوٰی کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ باعتبار سند ضعیف ہے مگراس کے تمام حصوں کے صحیح شواہد موجود ہیں،جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کاہن کے پاس جانے والا مردیا

① اس کی سند صحیح ہے۔مسنداحمد (٩٢٠٢) سنن ابو داؤد (٣٩٠٤) سنن ترمذی (١٣٥) فیض القدیر (٨٢٥٨) ۔

② مسنداحمد (٩٥٠٢) مستدرك الحاكم (٨/١) سنن الكبرىٰ للبيهقی (١٣٥/٨) واسناده صحيح۔

③ اس کی سند صحیح ہے۔طبرانی کبیر(١٠٠٠٥)امام هیثمی کہتے ہیں: طبرانی اور بزار کے راوی ثقہ ہیں۔

عورت سے غیر فطری مجامعت کرنے والا کفر کی اس وعید کا نشانہ بنتا ہے۔ البتہ حدیث کا وہ حصہ جس میں حائضہ عورت سے مجامعت پر کفر کی وعید مذکور ہے، عدمِ شواہد کی بناء پر منکر کا حکم لگائے جانے کے قابل ہوسکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

مصنف رحمہ اللہ کی ذکر کردہ دوسری حدیث جو سنن اربعہ اور حاکم کے حوالے سے بروایت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ مذکور ہے، بقول امام عراقی صحیح ہے، اور حافظ ذہبی نے بھی اسے قوی الاسناد قرار دیا ہے۔

ان دونوں حدیثوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نجومیوں اور کاہنوں کے پاس جا کر سوال کرنے والا اور ان کی تصدیق کرنے والا کافر ہے، کیونکہ وہ ان کے عالم الغیب ہونے کا کفریہ عقیدہ رکھتا ہے، خواہ اس عقیدے کی بنیاد الہام پر ہو یا شیطانی القاء پر ہو۔

طبرانی میں بروایت سیدنا واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ یہ حدیث ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کسی کاہن کے پاس آ کر کوئی سوال کرے تو اس پر چالیس دن کے لئے توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، اور اگر ان کی تصدیق کر دے تو کافر ہو جاتا ہے'' ①

اس حدیث کو اگرچہ امام منذری نے ضعیف کہا ہے ② لیکن احادیثِ مذکورہ، طبرانی کی اس حدیث کے مکمل مضمون کے صحت کی شہادت دیتی ہیں، چنانچہ حفصہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے چالیس دن کی نماز کی عدم قبولیت ثابت ہوگئی۔ اور ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث سے کاہن کی تصدیق کرنے والے کا کافر ہونا ثابت ہوگیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کاہن اور ساحر بوجہ ادّعاء علم الغیب کافر ہیں، اور ان کی تصدیق کرنے والا بوجہ ان کی غیب دانی کے دعوے کی تصدیق کے کافر ہے۔

① امام ہیثمی نے مجمع الزوائد (۱۱۸/۵) میں کہا ہے کہ اس میں سلیمان بن احمد الواسطی ''متروک'' ہے۔ ابن معین نے اسے ''کذاب'' کہا ہے، دیکھئے: لسان المیزان (۷۲/۳) کشف الأستار (البزار) رقم: ۳٤٥، طبرانی کبیر رقم: ۱٦۹، مسند ابی یعلیٰ، رقم: ٥٤٠٨۔

② الترغیب والترہیب ۳٤٨/۲، رقم: ٤٤٧٦ طبع دار البیان العربی۔

قال :وعن عمران بن حصین مرفوعاً [لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَطَيَّرَ أَوْتُطِيِّرَ لَهُ أَوْ تَكَهَّنَ لَهُ، أَوْسَحَرَأَوْسُحِرَلَهُ ، وَمَنْ أَتٰى كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُوْلُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﷺ (رواه البزار باسناد جید ، ورواه الطبرانی باسناد حسن من حدیث ابن عباس دون قوله "ومن أتى الى اخره" ①

عمران بن حصین ؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں، کہ "وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو خود فال لے یا اس کے واسطے فال لی جائے، یا خود کہانت کرے یا اس کیلئے کہانت کی جائے، یا خود جادو کرے یا اس کے واسطے جادو کیا جائے اور جو کاہن کے پاس آ کر اس کی تصدیق کر دے تو اس نے محمد ﷺ پر نازل شدہ شریعت کے ساتھ کفر کیا" (اس حدیث کو امام بزار نے اچھی سند کے ساتھ روایت کیا ہے، نیز امام طبرانی ؒ نے (الاوسط) میں بسند حسن عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے، لیکن طبرانی کی روایت میں [ومن اتی کاھنا . . .] سے آخر تک کے الفاظ نہیں ہیں۔)

قوله :قال البغوی : اَلْعَرَّافُ الَّذِیْ یَدَّعِیْ مَعْرِفَةَ الْاُمُوْرِ بِمُقَدَّمَاتٍ یُسْتَدَلُّ بِھَا عَلَی الْمَسْرُوْقِ وَمَکَانَ الضَّالَّةِ وَنَحْوِ ذٰلِكَ ، وَقِیْلَ :ھُوَالْکَاھِنُ ، وَالْکَاھِنُ ھُوَالَّذِیْ یُخْبِرُ عَنِ الْمُغَیَّبَاتِ فِی الْمُسْتَقْبِلِ ، وَقِیْلَ :اَلَّذِیْ یُخْبِرُ عَمَّا فِی الضَّمِیْرِ -

وَقَالَ اَبُوالْعَبَّاسِ بْنُ تَیْمِیَّةَ :اَلْعَرَّافُ اِسْمٌ لِلْکَاھِنِ ، وَالْمُنَجِّمِ وَالرَّمَّالِ وَنَحْوِھِمْ ، مِمَّنْ یَتَکَلَّمُ فِیْ مَعْرِفَةِ الْاُمُوْرِ بِھٰذِهِ الطُّرُقِ

وقوله :وعن عمران بن حصین مرفوعاً لَيْسَ مِنَّا ......

یہ حدیث بھی چند افراد کے حق میں وعیدِ شدید پر مشتمل ہے، چنانچہ فال لینے والا، یا کسی کو اپنے لئے فال طلب کرنے پر مامور کرنے والا، نیز کاہن یا کسی کو اپنے لئے کہانت طلب کرنے پر مامور کرنے والا، نیز جادوگر یا کسی کو اپنے لئے جادو کی طلب پر مامور کرنے والا ان تینوں کی بابت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ "ان کا ہماری جماعت یا ہمارے متبعین سے کوئی تعلق یا واسطہ نہیں ہے"

علاوہ ازیں یہ حدیث بھی کاہن کی تصدیق کرنے والے کے کافر ہونے کی انتہائی صریح دلیل ہے۔

① یہ حدیث شواہد کی بناء پر حسن ہے۔ مجمع الزوائد (۱۱۷/۵) الترغیب للمنذری (۳۴۸/۲) رقم: ۴۴۴۷،طبع دار البیان العربی۔

امام بغوی ﷫ فرماتے ہیں: کہ ''عراف وہ شخص ہے جو ایسے امور کی معرفت کا دعویدار ہو جس کے قرائن کے ذریعہ وہ مال مسروق کی نشاندہی کر سکے یا یہ بتلا سکے کہ گمشدہ سامان کہاں رکھا ہوا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بعض لوگوں کے نزدیک عراف کا اطلاق کاہن پر ہوتا ہے، جب کہ کاہن وہ ہے جو دل کے راز بتلائے اور مستقبل کی غیبی چیزیں بتائے۔

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں: کاہن، نجومی رمل شناس اور اس قبیل کے دیگر تمام افراد کو جو کہ قرائن اور دیگر ذرائع سے مختلف امور و حالات کو جاننے کا دعویٰ رکھتے ہیں، عرّاف ہی کہا جاتا ہے۔

وقوله :قال البغوی...... إلی : وقال ابو العباس ابن تیمیة......

اقوالِ علماء

اس عبارت میں مصنف ﷫ نے بعض علماء کے حوالے سے عراف، کاہن، رمال اور نجومی کی تعریف بیان فرمائی ہے، مقصدِ بیان یہ ہے کہ جو شخص کسی غیبی علم کی معرفت کا دعویدار ہے وہ یا تو کاہن ہے، یا پھر معنوی طور پر کاہن کے دائرہ عمل میں شریک اور شامل ہے۔ اور غیبی علم کی معرفت کے مختلف ذرائع اور طرق اختیار کر لئے جاتے ہیں مثلاً: کشف (جو عام طور پر شیطان کی طرف سے ہوتا ہے) اس کے علاوہ فال، پرندے اڑانا، کنکریوں کا استعمال، زمین پر خط کشیدگی، علمِ نجوم، علمِ کہانت، جادوگری اور اس قسم کے دیگر جاہلی علوم ہیں۔

جاہلیت سے ہماری مراد وہ شخص ہے جو انبیاء اور رسل ﷩ کی تعلیمات کی پیروی کی بجائے دوسرے لوگوں کی راہوں کا پیروکار ہو، مثلاً: فلسفی، کاہن، نجومی یا زمانہ جاہلیت کے وہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل موجود تھے۔

بہر حال مذکورہ تمام امور و علوم کا حامل شخص کاہن و عراف وغیرہ ہی کہلائے گا، لہذا جو ان کے پاس جا کر ان کی ان باتوں کی تصدیق کرے گا وہ احادیث مذکور میں ذکر شدہ تمام وعیدوں کا نشانہ بنے گا۔

فی زمانہ ان شیطانی علوم کے وارث جگہ جگہ نظر آئیں گے، جو غیب دانی کے دعویدار ہیں، حالانکہ علمِ غیب تو صرف اللہ تعالیٰ کا خزانہ ہے، پھر اپنی اس غیب دانی کو کرامت کے روپ میں پیش کر کے اپنی ولایت کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں۔ جبکہ خوب اچھی طرح اس ناقابل تردید اور لاریب حقیقت کا ادراک ہونا چاہئے کہ جو شخص اپنے آپ کو ولی کہے اور اس کی دلیل یہ پیش کرے کہ وہ بہت سی غیبی خبریں بتلا سکتا ہے تو وہ شیطان کا ولی ہے، رحمان کا ولی ہرگز نہیں ہو سکتا، کیونکہ کرامات کا معاملہ مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، جنہیں وہ متقی اور مومن بندوں کے ہاتھوں ان کی دعاء یا اعمالِ صالحہ کی برکت سے ظاہر فرماتا ہے، اس میں اولیاء کی

قدرت واختیار کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لیکن جو اپنی ولایت کے خود دعویدار ہیں وہ لوگوں سے کہتے پھرتے ہیں کہ ہم غیب جانتے ہیں (گویا وہ اپنے آپ کو صاحب تصرف واختیار بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں جو بذات خود ان کے کذب کی صریح دلیل ہے) اولیاء اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ اپنی ولایت کا خود ہی دعویٰ کریں اور لوگوں کے دلوں میں اپنا مرتبہ ومقام پیدا کرنے کی کوشش کریں، اور اس کے نتیجہ میں لوگوں کا مال ودولت خوب لوٹیں۔ اولیاء اللہ کی شان تو یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو گناہ گار وعیب دار سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں، چنانچہ صحابہ وتابعین جو کہ تمام اولیاء اللہ کے سردار ہیں کی سیرت وکردار ہمارے لئے کافی وشافی مشعل راہ ہے، کیا ان میں سے کسی ایک کی طرف سے اس قسم کے لغو دعاوی وخرافات منقول ہیں؟ واللہ! ہرگز نہیں، بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہمیشہ روتے رہتے تھے۔

جیسا کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تلاوت قرآن کے وقت رویا کرتے تھے۔ ①

امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب نماز پڑھتے تو پچھلی صفوں میں ان کے رونے کی آواز سنی جاتی تھی۔ ②

علاوہ ازیں اپنے رات کے ورد میں ایک آیت کے پڑھنے سے اتنا خوف طاری ہوا کہ کئی دن شدید بیمار رہے، اور لوگ باقاعدہ عیادت کے لئے آتے رہے تھے۔

سیدنا تمیم داری رضی اللہ عنہ اپنے بستر میں کروٹیں بدلتے رہتے اور جہنم کے خوف سے رات کو بہت کم سو پاتے، رات کا بیشتر حصہ نماز پڑھتے ہوئے گزار دیتے۔

اولیاء اللہ کی صفات کی معرفت مطلوب ہو تو قرآن پاک میں ''سورۃ الرعد''، ''سورۃ المؤمنون''، ''سورۃ الذاریات''، اور ''سورۃ الطور'' وغیرھا کا مطالعہ وتلاوت کی جائے، ان صفات کے حامل افراد صحیح معنوں میں اولیاء اللہ ہیں، نہ کہ یہ مفتری اور کذاب لوگ جو اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی اور اس کے خزانہ غیب میں ہاتھ ڈالنے کی ناپاک جسارت کرتے ہیں، جن کا عظیم ضرر یہ ہے کہ انہوں نے مشرکین سے شیطانی علوم حاصل کر کے اندھی بصیرت رکھنے والوں کو اپنی طرف سے کرامات ولایت کے انتہائی پر فریب جال میں مکمل طور پر بند کیا ہوا ہے۔ (نسأل الله السلامة والعافية فى الدنيا والاخرة)

علم الخط جو کہ کہانت سے منسلک ہے کے بارے میں یہ اعتراض پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ علم کہانت کیسے ہوسکتا ہے، جبکہ مسند احمد وصحیح مسلم میں معاویہ بن حکم کی روایت کردہ حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ ایک نبی خط کھینچا =

① صحیح بخاری، کتاب الاذان (٧١٦).
② صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب (٧٠) (معلقاً).

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فِي قَوْمٍ يَكْتُبُوْنَ أَبَاجِدَ يَنْظُرُوْنَ فِي النُّجُوْمِ، "مَاأَرٰى مَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ لَهٗ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ خَلَاقٍ" ①

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ان لوگوں کے متعلق جو علم ابجد کے حساب لکھتے ہیں اور علمِ نجوم میں نظر رکھتے ہیں، فرماتے ہیں: ''کہ ایسا کرنے والوں کیلئے اللہ تعالیٰ کے ہاں فضل ورحمت کا کوئی حصہ نہیں ہے۔''

=

کرتا تھا، اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ جس کا خط اس نبی کے خط کے موافق ہو گیا وہ درست ہے'' ②

اس کے جواب میں امام نووی فرماتے ہیں: ''کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خط کھینچے کا جواز صرف اسی صورت میں ہے جب اس نبی کے خط سے موافقت کا یقین ہو، جبکہ ہمارے پاس موافقت کے یقینی علم کا کوئی راستہ نہیں ہے، لہذا جائز نہیں ہے۔''

بعض علماء نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ اس نبی کا خط کھینچنا اس کا معجزہ تھا جو اس کی نبوت کی صداقت کا نشان تھا، اب چونکہ اس کی نبوت منقطع ہو چکی ہے تو یہ خط حرام قرار پائے گا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس کی کوئی تعلیم نہیں دی۔ خلاصہ جواب یہ ہے کہ اس نبی کا خط کھینچنا حرام نہیں تھا، لیکن ہمارے لئے خط کھینچنا ناجائز ہے۔

مذکورۃ الصدر تمام تعریفات وتوضیحات کے بعد اس حقیقت کا بھی بخوبی علم ہونا چاہئے کہ امام احمد بن حنبل کاہن وعراف کی بابت فرماتے ہیں: ''کہ انہیں بلوا کر توبہ کروائی جائے، اگر وہ توبہ کرلیں تو درست ہے وگرنہ انہیں قتل کر دیا جائے۔''

وَقوله: قال ابْنُ عَبَّاسٍ فِي قَوْمٍ يَكْتُبُوْنَ أَبَاجِدَ يَنْظُرُوْنَ فِي النُّجُوْمِ......

علم ابجد کے متعلق عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس اثر سے علمِ ابجد، جسے علم الحروف بھی کہا جاتا ہے کی بخوبی مذمت ہوتی ہے، کیونکہ اسے سیکھنا علمِ غیب کی معرفت کے دعویٰ کا محرک بنتا ہے، اور بعض مبتدعین نے اس علم پر مبنی بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، بہر حال شرعی نقطۂ نگاہ سے اس علم کا حصول ناجائز ٹھہرا، اسی طرح علم نجوم بھی، جس کا بیان آئندہ صفحات میں آرہا ہے۔ اس اثر میں یہ درس بھی پایا جاتا ہے کہ اہل باطل کے علوم ومعارف سے قطعاً متاثر نہ ہوا جائے، اور نہ ہی دھوکہ کھایا جائے۔

......

① اس کی سند صحیح ہے۔ مصنف عبد الرزاق (١٩٨٠٥) البیہقی (١٣٩/٨)

② صحيح مسلم، كتاب السلام، باب تحريم الكهانة وإتيان الكهان (٥٣٧) مسند احمد ٣٩٤/٢ رقم: ٩٠٩٢، سنن أبي داؤد، كتاب الطب، رقم: ٣٩٠٩.

اس باب کے مسائل

(۱) کاہن کی باتوں کی تصدیق اور ایمان بالقرآن، یہ دونوں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

(۲) یہ بات بصراحت معلوم ہوئی کہ کاہن کی باتوں کی تصدیق کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔

(۳) یہ بات بھی مذکور ہوئی کہ جو شخص خود کہانت نہ کرے بلکہ کسی دوسرے کو اپنے لئے کسی کہانت پر مامور کرے، تو وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی جماعت سے خارج ہے۔

(۴) وہ شخص بھی آپ ﷺ کی جماعت سے خارج ہے جو کسی کو اپنے لئے فال نکالنے کا حکم دے۔

(۵) اس شخص کا بھی ذکر ہوا جو اپنے لئے جادو کے طلب کرنے پر کسی کو مامور کرے، وہ شخص بھی آپ ﷺ کے حلقہ متبعین سے خارج قرار پایا۔

(۶) ابجد کا حساب سیکھنے کی مذمت و شناعت ذکر کی گئی۔

(۷) کاہن و عراف کے درمیان فرق بیان ہوا۔



باب ماجاء فى النشرة

جادواتارنے کا بیان

قَالَ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ سُئِلَ عَنِ النُّشْرَةِ ، فَقَالَ:" هِىَ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَا ن . "

(راوه احمدبسند جيد، وابوداؤد)

وَقَالَ :سُئِلَ اَحْمَدُ عَنْهَا فَقَالَ :ابْنُ مَسْعُوْدٍ يَكْرَهُ هٰذَا كُلَّهٗ . ①

جابر ﷛ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے "نُشْرہ" کا حکم دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ شیطانی کام ہے'' اسے امام احمد نے بسند جید، نیز ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

اور امام احمد سے "نُشْرہ" یعنی جادو اتارنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا: کہ عبداللہ بن مسعود ﷛ ہر قسم کے "نشرہ" کو ناپسند کرتے تھے۔

سحر و کہانت کے ذکر کے بعد مصنف ﷫ نے "نُشْرہ" یعنی جادو اتارنے کا باب ذکر فرمایا ہے۔ آئندہ ذکر کی جانے والی تفصیلات سے واضح ہوگا کہ جادو اتارنے کی کچھ صورتیں تو خالصتاً شیطانی ہیں اور توحید کے منافی ہیں جبکہ بعض صورتیں جائز اور مباح ہیں۔

"نُشْرہ" تعویز نویسی کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

حسن بصری کے قول سے واضح ہوتا ہے کہ جائز'' نُشرہ '' کی صورت یہ ہے کہ جادو وغیرہ میں مبتلی شخص کو قرآنی آیات مثلاً (معوذتین وغیرہ) پڑھ کر (رقیہ) یعنی دم کردیا جائے۔

ابوالسعادات کا قول ہے'' کہ "نُشْرہ" عام طور پر اس شخص کے علاج کو کہا جاتا ہے کہ جس کے بارے میں جنوں کے سائے کا گمان ہو۔''

حافظ ابن جوزی ﷫ نے لکھا ہے کہ ''شخصِ مسحور کے سحر کو اتارنے کا نام "نُشْرہ" ہے، اور یہ کام وہی شخص کرتا ہے جو خود جادوگر ہو۔''

قوله: عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ سُئِلَ عَنِ النُّشْرَةِ......

سیدنا جابر ﷛ کی اس حدیث سے ثابت ہوا کہ "نُشْرہ" یعنی جادو اتارنا شیطانی عمل ہے۔ آئندہ کی تفصیلات سے ثابت ہوگا کہ جادو کو جادو سے اتارنا دراصل شیطانی کام ہے اور آیات قرآنیہ یا شرعی تعوذات سے جادو اتارنا جائز ہے، عبداللہ بن مسعود ﷛ کے قول کا یہی محمل ہوگا۔

① اسکی سند صحیح ہے۔ مسنداحمد (١٣٧ ج٥) سنن ابوداؤد، کتاب الطب(٣٨٦٢) المشكاة (٤٥٥٣).

قال :وفی البخاری عن قتادة قُلْتُ لِابْنِ مُسَيِّبٍ :رَجُلٌ بِهٖ طِبٌّ اَوْيُوْخَذُ عَنْ اِمْرَأَتِهٖ أَيُحَلُّ عَنْهُ أَوْيُنْشَرُ ؟قَالَ :لَابَأْسَ بِهٖ، اِنَّمَا يُرِيْدُوْنَ بِهِ الْاِصْلَاحَ ، فَاَمَّا مَايَنْفَعُ فَلَمْ يُنْهَ عَنْهُ . (1)

صحیح بخاری میں قتادہ رحمہ اللہ سے (تعلیقاً) مروی ہے کہ ''سعید بن میتب سے میں نے دریافت کیا کہ ایک شخص کو جادو ہے، یا اس کو اس کی بیوی کے پاس جانے سے (بذریعہ جادو) روکا جاتا ہے، تو کیا اس سے جادو اتارنا جائز ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: کہ اس میں کوئی حرج نہیں، جادو اتارنے والے صرف اصلاح چاہتے ہیں، لہٰذا جو چیز فائدہ مند ہو اس سے روکا نہیں جا سکتا۔''

قال :روی عن الحسن انه قال :لَايَحُلُّ السِّحْرَ اِلَّاسَاحِرٌ۔

''حسن رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جادو کو صرف جادوگر ہی اتار سکتا ہے۔''

قال ابن القیم رحمہ اللہ :اَلنُّشْرَةُ حَلُّ السِّحْرِ عَنِ الْمَسْحُوْرِ ، وَهِيَ نَوْعَانِ ، اَحَدُهُمَا:حَلٌّ بِسِحْرٍ مِثْلِهٖ ، وَهُوَ الَّذِيْ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ، وَعَلَيْهِ يُحْمَلُ قَوْلُ الْحَسَنِ رحمہ اللہ فَيَتَقَرَّبُ النَّاشِرُ وَالْمُنْتَشِرُ اِلَى الشَّيْطَانِ فَيُبْطِلُ عَمَلَهٗ عَنِ الْمَسْحُوْرِ ، وَالثَّانِي اَلنُّشْرَةُ بِالرُّقْيَةِ وَالتَّعَوُّذَاتِ وَالْاَدْوِيَةِ وَالدَّعْوَاتِ الْمُبَاحَةِ ، فَهٰذَا جَائِزٌ .

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''"نُشْـــرہ" کا معنی یہ ہے کہ جادو کئے گئے شخص کا جادو اتارنا، اس کی دو اقسام ہیں: پہلی صورت یہ ہے، کہ جادو کو جادو کے ذریعے سے اتارنا، یہ سراسر شیطانی کام ہے، اور حسن بصری کا قول مذکور اسی پر محمول کیا جائے گا، چنانچہ جادو کو جادو سے اتارنے کی صورت میں دونوں یعنی اتارنے والا اور جس کا اتارا جا رہا ہے شیطان کی مرضی کا شکار ہونے کی وجہ سے اس کے مقرب بن جائیں گے، لہٰذا یہ عمل باطل ہوا (یا یوں کہہ لیں کہ جادو اتارنے کی یہ صورت ناجائز ہے) اور دوسری صورت یہ ہے، کہ جادو کو تعوذ پر مشتمل آیات یا شرعی دم جھاڑ یا جائز قسم کی دواؤں سے اتارا جائے، یہ بلا شبہ جائز ہے۔''

وقوله : :وفی البخاری عن قتادة قُلْتُ لِابْنِ مُسَيِّبٍ : ......

سعید بن میتب کے اس قول کی وضاحت آئندہ بحث سے ہو جائے گی۔

(1) صحیح بخاری، کتاب الطب، باب هَلْ يُسْتَخْرَجُ السِّحْرُ (معلقاً).

و قوله :وروى عن الحسن انه قال :لاَيَحُلُّ السِّحْرَاِلاَّسَاحِرٌ .

جادو اتارنے کی جائز اور نا جائز صورتیں حدیث اور اقوالِ علماء کی روشنی میں

حسن بن ابی الحسن البصری الانصاری جو کہ بڑے تابعین میں سے ہیں، کا یہ قول ابن الجوزی رحمہ اللہ نے جامع المسانید میں بلاسند ذکر کیا ہے۔اس قول سے واضح ہوتا ہے کہ سحر اتارنے کا علم صرف جادوگر ہی کو ہوتا ہے، لہذا جائز نہیں، جبکہ سعید بن میتب اسے اصلاح قرار دیتے تھے، اور اس کے جواز کے قائل تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ ''اللہ تعالیٰ نے نقصان دہ چیزوں سے روکا ہے نفع بخش چیزوں سے نہیں روکا۔''

اب ان دونوں متعارض اقوال کے درمیان بطورِ فیصلہ مصنف رحمہ اللہ نے حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کا قول ذکر فرمایا ہے۔(جو کہ متن کتاب میں موجود ہے)

شارح فرماتے ہیں: کہ سعید بن میتب کی بھی یہی مراد ہے وگرنہ یہ بات انتہائی بعید ہے کہ وہ جادو کو جادو سے اتارنے کے قائل ہوں۔اور اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے "نُشـــرہ" کے جواز کا جو قول ملتا ہے وہ بھی اسی بات پر محمول ہوگا، ان کے بارے میں یہ گمان رکھنا کہ وہ "نُشُرہ بِالسِّحُر" کے جواز کے قائل تھے انتہائی بعید اور ناممکن سی بات ہے، جبکہ یہ بات بھی معلوم ہے کہ وہ جابر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے بھی راوی ہیں جس میں "نُشُرہ بِـالسِّحُر" کو شیطانی عمل قرار دیا گیا ہے۔بہر حال لفظ "نُشُرہ" ایک مشترک لفظ ہے جو جائز بھی ہے اور نا جائز بھی۔(جیسا کہ ابھی ذکر ہوا)



اس باب کے مسائل

(۱) "نُشرہ" کے ناجائز ہونے کا علم ہوا۔

(۲) وہ "نُشرہ" جو کہ ناجائز ہے اور وہ "نُشرہ" جو جائز ہے کے درمیان ایسا فرق واضح کر دیا گیا ہے جس سے تمام اشکالات زائل ہو جاتے ہیں۔



باب ماجاء فی التطیر

بدشگونی لینے کا بیان

قال اللہ تعالیٰ: ﴿ أَلَآ إِنَّمَا طَٰٓئِرُهُمْ عِندَ ٱللَّهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴾ ①

''یادرکھو کہ ان کی نحوست اللہ تعالیٰ کے پاس ہے لیکن ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے''

لفظ '' تطیر '' طیر سے ہے، جس کا معنی پرندہ ہے، دورِ جاہلیت میں کسی لمبے سفر یا اہم کام کے آغاز میں پرندے کو اڑایا جاتا تھا، اگر وہ پرندہ دائیں طرف کو اڑ کے جاتا تو اس مشروع کو بابرکت اور کامیاب سمجھتے ہوئے جاری رکھا جاتا، جبکہ اسکے بائیں جانب پرواز کرنے کی صورت میں اس پروگرام کو منحوس اور ناکام تصور کر کے چھوڑ دیا جاتا۔ شریعت نے اسکی بھرپور نفی کی اور اسے باطل محض قرار دیتے ہوئے ہمیں اس حقیقت سے باخبر کر دیا کہ جلبِ نفع یا دفعِ ضرر میں اس چیز کی کوئی تاثیر نہیں ہے (ہر قسم کے نفع و نقصان کا مالک تو اللہ تعالیٰ ہے)

چونکہ فال لینا بصراحت شرک ہے اور کمالِ توحید کے منافی ہے جس کی وجہ بالکل واضح ہے، کہ یہ شیطانی الہام اور وسوسے کا نتیجہ ہے، لھذا مصنف رحمہ اللہ نے اس میں انسان کے ملوّث اور مبتلا ہو جانے سے بچانے کیلئے اور توکل علی اللہ کے ذریعے کمالِ توحید کے زیور سے آراستہ کرنے کیلئے اس مسئلہ کو کتاب التوحید میں بطور خاص ذکر کیا۔

یہ بات معلوم ہے کہ جو فال کے چکروں میں گرفتار ہو جاتا ہے، اس کا شرک کی جانب سفر اس سیلاب سے بھی زیادہ تیز ہو جاتا ہے جو اونچائی سے نیچائی کی طرف بہہ رہا ہو، ہر شنیدنی و دیدنی چیز میں اسکے سامنے وسوسوں کے دروازے کھل جاتے ہیں، پھر اس مخبوط الحواس شخص کو شیطان لفظی اور معنوی میدان میں قریب و بعید کی مناسبت سے ایسے اندیشوں میں مبتلا کر دیتا ہے جو اس کے دین کو بھی بگاڑ دیتے ہیں، اور دنیوی عیش کو بھی مکدر و بدمزا بنا دیتے ہیں، لھذا انسان کو ہمیشہ توکل علی اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے رہنا چاہئے، اور اس کے مقاصد میں کسی قسم کی فال یا بدشگونی حائل نہ ہو، جو اسے شرک کی ہیبت ناک دلدل میں دھکیل دے۔

بدشگونی کے ابطال پر قرآن سے استدلال

اس مذکورہ بالا آیت کا ابتدائی حصہ یوں ہے: ﴿ فَإِذَا جَآءَتْهُمُ ٱلْحَسَنَةُ قَالُوا۟ لَنَا هَٰذِهِۦ ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا۟ بِمُوسَىٰ وَمَن مَّعَهُۥٓ ﴾ ②

---

① (الاعراف: ۱۳۱) ② (الاعراف: ۱۳۱)

....

....

....

....

....

....

''جب ان پرخوش حالی آجاتی تو کہتے یہ تو ہمارے لئے ہونا ہی چاہئے، اور اگر ان کو کوئی بدحالی پیش آتی تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے''

اس آیتِ کریمہ میں آل فرعون کا ذکر ہو رہا ہے، چنانچہ جب آلِ فرعون کو کوئی آسائش مثلاً: رزق کی کشادگی، صحت وعافیت وغیرہ حاصل ہوتی تو وہ فوراً کہتے کہ ہم اس آسائش کے مستحق تھے، اور اگر کوئی سختی مثلاً: قحط سالی، تنگی رزق وغیرہ پہنچتی تو کہنے لگتے کہ یہ سب موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے رفقاء کی وجہ سے ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: کہ ان کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، لھذا انہیں پہنچنے والی تکلیف اللہ تعالیٰ کے قضاء وقدر کی وجہ سے ہے، جس کا محرک وباعث ان کے اپنے کفریہ اعمال ہیں، اور اصل تکلیف تو عذابِ جہنم کی صورت میں اگلے جہان میں لاحق ہونے والی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ ①

یعنی ''اگر منافقین کو غنیمت کی صورت میں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور اگر انہیں کوئی گزند پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ آپ کی طرف سے ہے، کہہ دیجئے رنج وراحت ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے''

آیت کے اخیر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی ان کی اکثریت جاہل ہونے کی وجہ سے سمجھنے سے قاصر ہے، اگر فہم وادراک کی تھوڑی سی بصیرت ہوتی تو انہیں اس حقیقت کا ادراک ہو جاتا کہ موسیٰ علیہ السلام جو کچھ بھی اپنے پروردگار سے لائے ہیں، اس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو بدشگونی کی متقاضی ہو۔

① (النساء: ۷۸)

قولہ تعالیٰ: ﴿ قَالُوْا طَائِرُكُمْ مَّعَكُمْ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴾ ①

''انہوں نے کہا تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہے، کیا اس لئے کہ تم کو نصیحت کی گئی بلکہ تم ایسے لوگ ہو جو حد سے تجاوز کرنے والے ہو''

اس آیتِ کریمہ میں ذکر شدہ قول، اللہ تعالیٰ کے ان تین نیک بندوں کا ہے جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے حوارِیین میں سے تھے، یہ بات انہوں نے اپنی گمراہ قوم کو مخاطب کر کے کہی، جس کا معنی یہ ہے کہ تمہاری اچھی یا بری شگون تمہارے ساتھ ہی ہے، لھذا تمہیں پہنچنے والی برائی تمہاری اپنی بداعمالیوں اور مخالفتوں کے نتیجہ سے ہے، چنانچہ تم جہاں بھی جاؤ گے یہ نحوست اور بدشگونی تمہارے ساتھ جائے گی، جس کا سبب تمہاری اپنی حرکتیں ہیں، رسول کی شریعت میں ایسی کوئی چیز نہیں ہوتی جو متقاضیٔ نحوست ہو، وہ تو صرف خیر و بھلائی ہوتی ہے جس میں شر کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، مبنی بر اصلاح ہوتی ہے فساد کا کوئی عنصر نہیں ہوتا، اعلیٰ درجے کی حکمت ہوتی ہے عیب کی کوئی جھلک نہیں ہوتی، سراسر رحمت ہی رحمت ہوتی ہے ظلم و تعدی کا کوئی پہلو نہیں ہوتا، لھذا اس کے دین کو باعثِ نحوست قرار دینے والوں کے پاس فہمِ سلیم اور عقلِ سلیم کا کچھ حصہ ہوتا تو وہ دین کو باعثِ بدشگونی سمجھنے کے بجائے اپنے شرکیہ اور کفریہ عقائد کو اپنے لئے منحوس قرار دیتے، کیونکہ اگرچہ خیر و شر سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے لیکن انسان کے اچھے برے اعمال اس کا باعث و محرک بنتے ہیں۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے قولہ تعالیٰ: ﴿ طَائِرُكُمْ مَّعَكُمْ ﴾ یعنی: تمہاری بدشگونی تمہارے ساتھ ہے'' کا ایک مفہوم یہ بھی بتلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین جو سراسر خیر و برکت اور رحمت کا منبع ہے، مگر تم نے اسے اپنے لئے باعثِ بدشگونی قرار دیا، تو یہ بدشگونی بطورِ انجام، نتیجہ اور قصاص کے تم پر لوٹ کر رہے گی (اور دنیا و آخرت میں عذاب کی صورت تم ہر قسم کے شر کے مستحق قرار پاؤ گے۔)

گزشتہ دونوں آیات کی مقصودِ باب سے مطابقت اور مناسبت بالکل واضح ہے، کیونکہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دشمنوں کے حوالے سے شگون کا ذکر فرمایا ہے اور اسے مذموم فعل قرار دیا ہے، لھذا یہ شگون کوئی اسلامی چیز تو نہ ہوئی، بلکہ سراسر جاہلیت کا سامان ہوا۔

(اس لئے ان آیات سے استدلال کرتے ہوئے مصنف رحمہ اللہ نے شرک سے تحذیر یعنی ڈرایا اور توحید کی طرف راہنمائی فرمائی ہے۔)

---

① (یٰس: ۲۱)

قال: عن ابی ھریرة ﷛ ان رسول اللہ ﷺ قال: "لَاعَدْوٰی وَلَاطِیَرَةَ وَلَاھَامَّةَ وَلَاصَفَرَ." اخرجاه زاد مسلم: "وَلَانَوْءَ وَلَاغَوْلَ" ①

سیدنا ابوھریرة ﷛ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہ تو کسی کو دوسرے کی بیماری لگتی ہے، اور نہ ہی بدشگونی کوئی چیز ہے، اور نہ ہی اُلّو کے بولنے کی کوئی تاثیر ہے، اور نہ صفر کی کوئی حقیقت ہے۔'' اسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے، اور صحیح مسلم میں مزید یہ بھی ہے کہ ''اور نہ ہی پچھتر ہے، اور نہ ہی بھوت''

اس حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بعض چیزوں کی نفی اور ممانعت وارد ہے جن کا تفصیلی بیان لکھا جاتا ہے۔

مرض کا متعدی ہونا

(۱) سب سے پہلے "عَــدْوٰی" کی نفی ہے، جو کہ ''اعداء'' کا اسم ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ کسی بیمار کی بیماری کا دوسرے میں سرایت کر جانا، مثال کے طور پر کوئی اونٹ کھجلی (خارش) کے مرض میں مبتلا ہو جائے تو صحت مند اونٹوں کو اس سے اس خدشے سے دور رکھا جائے کہ کہیں اس کی کھجلی دوسرے اونٹوں تک سرایت نہ کر جائے۔ چنانچہ اس حدیث کی بعض روایات میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے نظریۂ تعدیٔ امراض کی نفی فرمائی، تو ایک دیہاتی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ایک مقام پر صحیح سالم اور بالکل صاف کھال اور جلد والے اونٹ ہوتے ہیں، اور جب ان میں ایک کھجلی والا اونٹ داخل ہوتا ہے تو سب کو خارش زدہ بنا دیتا ہے؟ جس سے ثابت ہوا کہ کوئی مرض دوسرے میں سرایت کر سکتا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھے بتاؤ کہ پہلے والے خارش زدہ اونٹ میں کس اونٹ کے مرض نے سرایت کی؟'' اس مُسکت جواب کو سن کر وہ دیہاتی خاموش ہو گیا۔ ②

واضح ہو کہ صحیح مسلم میں ہے کہ سیدنا ابوھریرة ﷛ پہلے اس حدیث کو روایت کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک اور حدیث بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "لَایُوْرِدُ الْمُمْرِضُ عَلَی الْمُصِحِّ" یعنی ''کسی بیمار کو کسی تندرست پر داخل نہ کیا جائے''

(اس حدیث کا مضمون پہلی حدیث کے مضمون کے خلاف ہے) پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ سیدنا ابوھریرة ﷛ صرف اس دوسری حدیث کو بیان کرنے لگے، اور پہلی حدیث کی روایت ترک کر دی، لوگوں

---

① صحیح بخاری، کتاب الطب (۵۷۵۷) صحیح مسلم، کتاب السلام (۲۲۲۰)، (۲۲۲۲).

② صحیح بخاری، کتاب الطب (۵۷۱۷) صحیح مسلم، کتاب السلام (۱۰۱/ ۲۲۲۰) الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔

نے اس بارے میں رجوع کیا اور انہیں یاد دلایا کہ آپ پہلے والی حدیث بھی روایت کرتے تھے (جس میں مرض متعدی ہونے کی نفی ہے) تو سیدنا ابوھریرۃ ﷛ نے اسے ماننے سے انکار کردیا۔ اس حدیث کو سیدنا ابوھریرۃ ﷛ سے روایت کرنے والے ابوسلمہ فرماتے ہیں: ''اب مجھے معلوم نہیں کہ سیدنا ابوھریرۃ ﷛ کو نسیان ہوگیا ہے یا ایک قول نے دوسرے قول کو منسوخ کردیا ہے؟'' ①

لیکن "لَاعَدْوٰی ......" الخ والی حدیث کے اثبات کیلئے سیدنا ابوھریرۃ ﷛ کا نسیان ہرگز نقصاندہ نہیں ہے، کیونکہ اس حدیث کو رسول اللہ ﷺ سے صحابہ کی ایک بڑی جماعت نے روایت کیا ہے، جن میں انس بن مالک، جابر بن عبداللہ، اور عبداللہ بن عمر وغیرھم ﷢ کی روایات قابل ذکر ہیں، لھذا سیدنا ابوھریرۃ ﷛ کا نسیان ثبوتِ حدیث میں قطعی اثرانداز نہیں ہوسکتا۔

لیکن قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ حدیث زیر بحث میں تو تعدیٔ امراض کی نفی کی گئی ہے اور اس قسم کے اعتقاد کی مخالفت وممانعت کی گئی ہے، لیکن آپ ﷺ کی بعض دیگر احادیث سے ثابت ہورہا ہے کہ کچھ امراض کا اثر دوسروں میں سرایت کرسکتا ہے، جیسا کہ سطورِ بالا میں سیدنا ابوھریرۃ ﷛ کی حدیث ہے کہ جس میں رسول اللہ ﷺ نے کسی بیمار شخص کو تندرست پر داخل نہ کرنے کی ہدایت فرمائی، جس سے تعدی کا علم ہوا۔

نیز ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: "فِرَّمِنَ الْمَجْذُوْمِ كَمَاتَفِرُّمِنَ الْاَسَدِ" ②

یعنی: ''کسی ''جزام'' کے مریض سے اس طرح دور بھاگو جس طرح شیر کو دیکھ کر دور بھاگتے ہو''

اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ مجذوم کا مرض تندرست انسان میں سرایت کرسکتا ہے۔ احادیث کے اس ظاہری تعارض کو ختم کرنے کے لئے علماء کرام سے مختلف خیالات وتوجیہات منقول ہیں۔

بعض تو "لَاعَـدْوٰی" والی حدیث کو مرجوح اور قابل ترک قرار دیتے ہیں، جس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا ابوھریرۃ ﷛ نے اس حدیث کو روایت کرنا چھوڑ دیا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں ''بیماری والوں سے بچ کر رہنے'' کی احادیث بکثرت وارد ہوئی ہیں لھذا "لَاعَـدْوٰی" کا ترک ہی اولیٰ اور افضل ہے۔ لیکن یہ قول اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا، چنانچہ حدیث "لَاعَـدْوٰی" کو محض سیدنا ابوھریرۃ ﷛ کے رجوع یا نسیان کی بناء پر مرجوح سمجھنا غلط ہے، کیونکہ اس حدیث کو سیدنا ابوھریرۃ ﷛ کے علاوہ بھی بہت سے صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت فرمایا ہے۔ (کما تقدم)

بعض دیگر علماء نے اس کے بالکل برعکس قول اختیار کیا ہے، چنانچہ انہوں نے حدیث "لَاعَـدْوٰی" کو راجح

① صحیح مسلم، کتاب السلام (١٠٤/٢٢٢١).

② صحیح بخاری، کتاب الطب، باب الجذام (٥٧٠٧).

اور قابل اعتماد قرار دیتے ہوئے مخالف معنی کی تمام احادیث کو رد کر دیا ہے۔ اور بعض کو شذوذ کی بناء پر معلول قرار دیا ہے۔ ان حضرات کا حدیث "لَا عَـدْوٰی" کو ترجیح دینے کی ایک بنیاد یہ بھی ہے کہ سیدہ عائشہ ﷝ نے ''مجذوم'' سے دور بھاگنے والی حدیث کا انکار کیا تھا، اور فرمایا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات کبھی نہیں ارشاد فرمائی، بلکہ آپ ﷺ نے تو یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ''کسی کا مرض دوسرے کو نہیں لگتا'' سیدہ عائشہ صدیقہ ﷝ نے یہ فرمایا تھا، ''کہ میرا ایک غلام جذام کے مرض میں مبتلا تھا، وہ میرے برتنوں میں کھاتا پیتا تھا، وہ میرے بستر پر سو بھی جاتا تھا'' (ابن جریر)

لیکن یہ اطلاق بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ بعض مریضوں سے دور ہو کر رہنے کی احادیث بھی ثابت ہیں جن کا یوں انکار ممکن نہیں ہے۔

علماء کی تیسری جماعت نے ان مختلف احادیث میں تطبیق کی راہ اختیار کی ہے، چنانچہ انہوں نے "عَـدْوٰی" کے اثبات ونفی کو دو مختلف حالتوں پر محمول کیا ہے، یعنی جن احادیث میں عدوی کی نفی وارد ہوئی ہے ان کا محمل وہ شخص ہے جس کا یقین وتوکل پختہ ہو کہ کسی بیماری کے لاحق ہونے پر اسے اپنے بارہ میں عدوی کے اعتقاد میں گرفتار ہونے کا کوئی شبہ نہ ہو، جیسا کہ لوگوں کی اکثریت تو بدشگونی کے عقیدہ فاسد میں گرفتار ہے، لیکن ایک صحیح العقیدہ اور مضبوط توکل والا شخص ایسے ہر واہمہ کی نفی کر دیتا ہے۔

اسکے برعکس جن احادیث میں "عَـدْوٰی" کا اثبات ہے، اور مجذوم وغیرہ سے دور رہنے کا حکم ہے تو ان کا محمل وہ شخص ہے جس کا ایمان وتوکل کمزور سا ہو کہ مریضوں سے اختلاط کی صورت میں کسی بیماری کے لاحق ہونے پر فوراً یہ کہہ اٹھے کہ فلاں کا مرض مجھ میں سرایت کر گیا ہے۔ تو ایسے ضعیف الاعتقاد شخص کو مجذوم وغیرہ سے دور ہی رہنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ وہ تعدیٔ امراض کے تعلق سے غلط عقیدے کا شکار ہونے سے بچ جائے۔

امام مالک ﷫ سے جب مجذوم سے بھاگنے کی حدیث کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''مجذوم سے اختلاط کی کراہت وناپسندیگی میرے علم میں تو نہیں ہے البتہ احادیث میں اس سے دور رہنے کا حکم اس اندیشہ کے تحت آیا ہے کہ کہیں مومن کے دل میں یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ اسے لاحق ہونے والا مرض فلاں مریض سے اختلاط کی وجہ سے لاحق ہوا ہے۔''

اس کا معنی یہ ہوا کہ عدوی درحقیقت کچھ بھی نہیں ہے لیکن مجذوم وغیرہ سے دور بھاگنے کا حکم محض اس وجہ سے ہے کہ عدوی کے اعتقاد میں گرفتار ہونے کے تمام ذرائع بند کر دیئے جائیں کہ کہیں کوئی شخص اس وہم میں گرفتار نہ ہو جائے کہ مجھ پر اس بیماری کا حملہ فلاں مریض کے سبب سے ہوا، چنانچہ اس وہم سے وہ عدوی کے

اثبات کا شکار ہو جائے گا، جس کی شریعت نے نفی کی ہے۔ یاد رہے کہ تطبیق کے اس اسلوب کو ابو عبید، ابن جریر اور طحاوی نے بھی پسند کیا ہے۔

صاحب "تیسیر العزیز الحمید" فرماتے ہیں: ''کہ ان تمام توجیہات سے بہتر وہ توجیہ ہے جو امام بیہقی رحمہ اللہ نے بیان کی ہے اور جسے ابن الصلاح، ابن القیم، ابن رجب اور ابن مفلح رحمہم اللہ وغیرہم نے بھی پسند کیا ہے۔''

چنانچہ وہ فرماتے ہیں: کہ جن احادیث میں عدوی کی نفی ہے ان کا معنیٰ یہ ہے کہ جاہلی اعتقاد کے طریقے پر عدوی کی کوئی حقیقت نہیں ہے، چنانچہ اہل جاہلیت کا اعتقاد یہ تھا کہ کسی مریض کے مرض کا دوسرے میں سرایت کر جانا ایک طبعی امر ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کا کوئی دخل نہیں ہے، گویا وہ اس فعل کی نسبت غیر اللہ کی طرف کرتے تھے، چونکہ یہ عقیدہ غلط ہے لھذا شریعت نے اس قسم کا اعتقاد رکھنے والوں کے عقیدۂ عدوی کی نفی فرما دی۔ اور جن احادیث میں عدوی کا اثبات ہے اس کا معنی یہ ہے کہ ایک صحیح اور تندرست شخص میں مجذوم وغیرہ سے اختلاط کی صورت میں اس کا مرض سرایت کر سکتا ہے، مگر یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہے، گویا مخالطتِ مریض بھی بیماری کے الحاق کا سبب ہے، لیکن اس کے سبب کا حدوث اللہ تعالیٰ کی مشیت و امر سے ہے......لھذا اسبابِ مرض سے بچنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے مجذوم سے بھاگنے کا حکم دیا۔ ایک حدیث میں طاعون والے علاقے میں جانے سے منع فرما دیا، اور ایک تیسری حدیث میں ارشاد فرمایا: کہ ''کسی مریض کو تندرست پر داخل نہ کیا جائے۔'' اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اس اعرابی سے فرمایا تھا کہ پہلے والے اونٹ کو کھجلی زدہ کس نے کیا تھا؟ ظاہر ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت سے تھا، لھذا اگر تندرست اونٹوں کے اسکے ساتھ اختلاط کی صورت میں کھجلی کا مرض لاحق ہو جائے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اسکی قضاء و قدر سے ہوگا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾ ①

''نہ کوئی مصیبت دنیا میں آتی ہے نہ (خاص) تمہاری جانوں میں، مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے، یہ کام اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے''

نیز مذکورہ حدیثِ اعرابی میں آپ ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے کہ: "خَلَقَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ وَكَتَبَ حَيَاتَهَا وَمَصَائِبَهَا وَرِزْقَهَا" ②

① (الحدید: ۲۲) ② مسند احمد (۴۱۹۸ ج ۲) سنن الترمذی (۲۱۴۳) ، سلسلة الصحیحة (۱۱۵۲)

''ہر جان کو اللہ تعالی نے پیدا کیا، اور اس کی زندگی اور تکلیف اور رزق وغیرہ بھی اس نے لکھ دیا ہے''

قصہ مختصر کہ مجذوم سے فرار کا حکم، بیمار کو تندرست پر وارد کرنے یا طاعون زدہ علاقے میں جانے کی ممانعت یہ سب کچھ ان اسباب سے بچاؤ کے لئے ہے جن اسباب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، اور انہیں بندے کی بیماری یا ہلاکت کا سبب ٹھہرایا، اور ظاہر ہے کہ انسان کو اسباب شر سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے، اب جیسے اسے آگ یا پانی میں کود جانے سے روکا گیا ہے، کیونکہ معلوم ہے کہ یہ اقدام ہلاکت یا ایذاء کا سبب ہے، اسی طرح مجذوم یا طاعون زدہ علاقہ کے قریب جانے سے روک دیا گیا کیونکہ یہ قرب بھی مرض یا موت کے اسباب میں سے ہے، بہرحال ان اسباب اور ان کے مسببات کا خالق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔

انسان کا توکل علی اللہ انتہائی مضبوط ہو اور قضاء وقدر پر ایمان پختہ ہو، تو وہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے اور یہ امید رکھتے ہوئے کہ کوئی نقصان نہیں ہوگا، بعض اسباب کے ساتھ اختلاط کر دیتا ہے، ایسی صورت میں بظاہر کوئی حرج نظر نہیں آتا، اور خاص طور پر جب ایسا کرنے میں کوئی خاص یا عام مصلحت پنہاں ہو۔

اس لئے ابوداؤد اور ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مجذوم کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے برتن میں رکھ دیا اور اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا اور فرمایا:

"كُلْ بِاسْمِ اللهِ ثِقَةً بِاللهِ وَتَوَكُّلًا عَلَى الله" ①

''اللہ کا نام لیکر اس پر اعتماد کرتے ہوئے اور بھروسہ رکھتے ہوئے کھاؤ''

اس حدیث کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے مجذوم کے ساتھ اختلاط کے جواز کی دلیل بنایا ہے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے امیر المؤمنین سیدنا عمر، سیدنا عبداللہ بن عمر اور سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہم سے بھی یہی مروی ہے۔ اور مثال کے طور پر سیدنا خالد بن ولید کے زہر کھانے کا واقعہ اور سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور ابو مسلم الخولانی کا اپنے لشکروں سمیت سمندر کے اندر چلنے کا واقعہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

نحوست کا تفصیلی بیان

(۲) اس حدیث میں دوسرے نمبر پر جس چیز کی نفی وارد ہے وہ شگون ہے، خواہ اچھا ہو یا بُرا۔ "تطیر" کا ماخذ و مفہوم پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے، اور یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ یہ نظریہ دورِ جاہلیت کی پیداوار ہے،

① ضعيف۔ سنن الترمذي، كتاب الأطعمة (١٨١٧) سنن ابوداؤد، كتاب الطب (٣٩٢٥) سنن ابن ماجه، كتاب الطب (٣٥٤٢)

چنانچہ وہ کسی اہم پروگرام سے قبل پرندے کو اڑا کر فال لیا کرتے تھے، اس کی دائیں طرف کی پرواز کو مبارک اور بائیں طرف کی پرواز کو منحوس تصور کرتے، اور اس مشن سے باز آجاتے تھے۔صحیح مسلم میں معاویہ بن حکم السلمی ﷛ کی روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: کہ ہماری قوم کے کچھ لوگ پرندوں سے فال لیتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "ذَاكَ شَيئٌ يَجِدُهُ اَحَدُكُمْ فِي نَفْسِهِ فَلَايَصُدَّنَّكُمْ" ①

''یہ ایک ایسی چیز ہے جو تمہارے لوگ اپنے دلوں میں پاتے ہیں، لھذا بدشگونی تمہیں تمہارے مقاصد وعزائم کی تکمیل سے نہ روکے''

اس فرمان میں رسول اللہ ﷺ نے واضح فرمادیا کہ بدشگونی کا اصل مرکز ومنبع لوگوں کے اپنے نفوس اور عقائد ہیں نہ کہ وہ چیز جسے بدشگونی کا باعث سمجھا جاتا ہے۔لھذا اس کا اپنا وہم، خوف اور شرکیہ عقیدہ اسے کسی چیز کی بدشگونی پر آمادہ کرتا ہے، ورنہ درحقیقت مرئی یا مسموع چیز بدشگونی کا باعث نہیں ہوتی۔

غور کیجئے! رسول اللہ ﷺ نے کیسی وضاحت وصراحت کے ساتھ بدشگونی کے فساد کو بیان فرمادیا، تاکہ لوگوں کو اچھی طرح علم ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی چیز پر بدشگونی کی علامت یا نشانی نہیں لگائی، لھذا کسی اندیشہ یا خوف میں گرفتار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تاکہ بندوں کے دل اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر مطمئن ہوجائیں، وہ وحدانیت جس کی خاطر انبیاء ورسل ﷩ کو مبعوث فرمایا، کتابیں نازل فرمائیں اور پھر اس کی خاطر زمین وآسمان خلق فرمائے، اور اس عقیدۂ توحید پر جنت اور جہنم کی آبادکاری منتج ہوگی۔

لھذا اس واضح اور غیر مبہم اعلان کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ نے دلوں سے شرک کے تمام علائق کو کاٹ کر رکھ دیا ہے، جو اس فرمان کو قبول کر کے توحید کے مضبوط سہارے کو تھام کر صرف ایک اللہ تعالیٰ پر توکل کرلیگا وہ بدشگونی کے تمام وساوس وتوہمات کو استقرار سے پہلے کاٹ پھینکے گا، اور یہی چیز جہنم سے نجات اور جنت کے حصول کی ضمانت ہے۔عکرمہ فرماتے ہیں'' کہ ہم عبداللہ بن عباس ﷠ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، کہ ایک پرندہ چیختا ہوا گزرا، تو ایک شخص نے کہا اچھا شگون ہے، اچھا شگون ہے، تو سیدنا عبداللہ بن عباس ﷛ نے فوراً فرمایا: نہ اچھا شگون ہے، اور نہ برا ہے۔

چنانچہ اس صحابی رسول نے اس کی بات کو فوراً کاٹ دیا تاکہ لوگ خیر وشر میں اس کی تاثیر کے اعتقادِ بد میں نہ گرفتار ہوجائیں۔

اسی طرح طاؤس ﷫ ایک شخص کو اپنے ساتھ سفر پر لے کر نکلے تو ایک کوّا چیخنے لگا، تو اس شخص نے کہا: یہ

① حدیث کا جزء ہے۔صحیح مسلم، کتاب السلام (۵۳۷).

اچھا شگون ہے، یہ سن کر طاؤس رحمہ اللہ فرمانے لگے: ''اس بے چارے کے پاس کا ہے کی بھلائی ہے'' پھر فرمایا: ''تم میرے رفیقِ سفر نہیں ہو سکتے۔''

ان واقعات سے سلف صالحین کے پاکیزہ اعتقاد کی نشاندہی ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ کچھ احادیث ایسی بھی ملتی ہیں جن سے بعض لوگوں کو بدشگونی لینے کے جواز کا وہم ہوا ہے، مثلاً رسول اللہ ﷺ کا فرمان مبارک ہے: "اِنَّمَا الشُّوْمُ فِی ثَلَاثَۃٍ :فِیْ الْمَرْأَۃِ وَالْفَرَسِ وَالدَّارِ" ①

''نحوست تین چیزوں میں ہو سکتی ہے، عورت، سواری کا جانور اور گھر میں''

ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں ''اگر کسی چیز میں نحوست ہو سکتی تو ان تین چیزوں میں ہوتی، یعنی گھوڑا، بیوی اور گھر'' ② یہ دونوں حدیثیں صحیح بخاری میں ہیں۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس حدیث کو اس طرح قبول کرنے پر تیار نہیں تھیں، بلکہ فرمایا کرتی تھیں، کہ مجھے اس ذات کی قسم ہے کہ جس نے ابوالقاسم ﷺ پر قرآن پاک نازل فرمایا، جس نے اس حدیث کو روایت کیا وہ جھوٹا ہے، ان کا کہنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ یوں فرمایا کرتے تھے: کہ ''زمانہ جاہلیت کے لوگ کہا کرتے تھے کہ عورت، سواری اور گھر میں نحوست ہوتی ہے''

پھر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: ﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ﴾ ③

''نہ کوئی مصیبت دنیا میں آتی ہے نہ (خاص) تمہاری جانوں میں، مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے، یہ (کام) اللہ تعالیٰ پر (بالکل) آسان ہے''

ان کا یہ قول مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم میں موجود ہے۔ ④

امام خطابی اور حافظ ابن قتیبہ رحمہما اللہ اس حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''کسی چیز سے بدشگونی اور نحوست لینا تو منع ہے، لیکن یہ تین چیزیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔''

چنانچہ گھر اس وقت باعثِ نحوست ہے جب انسان اس میں رہنے کو ناپسند سمجھے اور عورت اس وقت جب آدمی اس کے ساتھ زندگی بسر کرنا ناپسند خیال کرے اور اسی طرح سواری کا جانور یا خادم بھی باعثِ نحوست

① صحیح بخاری، کتاب الجہاد (۲۸۵۸) صحیح مسلم، کتاب السلام (۲۲۲۵/۱۱۶) الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔
② یہ حدیث کا جزء ہے۔ صحیح مسلم، کتاب السلام (۲۲۲۵/۱۱۶) صحیح بخاری، کتاب الجہاد (۲۸۵۹)
③ (الحدید: ۲۲)
④ صحیح۔ مسند احمد (۲۵۹۱۲، ۲۵۹۶۶) مستدرک حاکم (۴۷۱/۲) سنن الکبریٰ للبیہقی (۱۴۰/۸)

ہیں جب وہ کسی ناپسندیدگی کا شکار ہو جائے ، اس ناپسندیگی اور کراہت کی صورت میں ان سب سے علیحدگی اختیار کر لینا چاہئے ، جس کا طریقہ یہ ہے کہ بیوی کو طلاق دیدے اور گھر اور سواری کو فروخت کر دے ، تکلیف دہ اور کراہت پر مبنی زندگی بسر نہ کرے کہ یہ چیز نحوست کا باعث ہوسکتی ہے ۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ ان تین چیزوں کا باعثِ نحوست ہونا ان لوگوں کیلئے ہے جو انہیں باعثِ نحوست اور بدشگونی سمجھتے ہوں ، لیکن جس شخص کا بھروسہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو اور وہ ان چیزوں کو نحوست و بدشگون کا باعث نہ سمجھتا ہو ، اس کیلئے قطعاً منحوس نہیں ہونگی ۔ ان کا کہنا ہے کہ سیدنا انس بن مالک ﷺ کی حدیث :"اَلطِّيَرَةُ عَلٰى مَنْ تَطَيَّرَ" ①

ہمارے بیان کردہ مفہوم کی واضح اور صریح دلیل ہے ، چنانچہ انسان کا کسی چیز کو بدشگونی یا نحوست کا باعث سمجھنا اس کے لئے بہت سے مصائب و تکالیف کے نزول کا سبب بن جاتا ہے اور اس کے برعکس اگر اس کا اللہ تعالیٰ پر توکل ہو ، اس کی عظمت اور ہیبت و کبریائی کا خوف ہو اور اس کی رحمت کی امید ہو تو گویا تکالیف ومصائب کے ازالے کا سب سے بڑا وسیلہ اور ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہے ۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کی نفیس گفتگو

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے اس موضوع پر بڑی نفیس گفتگو فرمائی ہے ، جس کا خلاصہ یہ ہے ، '' کہ رسول اللہ ﷺ کا ان تین چیزوں میں نحوست کے پائے جانے کی خبر دینا اس بدشگونی کو قطعاً ثابت نہیں کرتا جس کی نفی اللہ پاک نے فرمادی ہے ، بلکہ اس مسئلہ کی حقیقت وغایت صرف اتنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کچھ اجسام ایسے پیدا فرماتا ہے کہ جن کا قرب باعث نحوست ہوتا ہے ، اور کچھ اجسام ایسے پیدا فرماتا ہے کہ جن کا قرب باعث خیر و برکت بن جاتا ہے ۔ اس حقیقت کو یوں سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ بعض والدین کو نیک و بابرکت اولاد عطاء فرمادیتا ہے ، جن کی پیشانی پر خیر نظر آتی ہے ، جبکہ کچھ والدین کو ایسا بُرا لڑکا ملتا ہے کہ انہیں اس کے چہرے پر انتہائی بُرے آثار دیکھائی دیتے ہیں ۔ بعینہ یہی چیز گھر اور عورت اور گھوڑے کے بارے میں ہے ۔ اب ہر قسم کے خیر و برکت یا شر و نحوست کا خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے ، اچھی چیزوں کے قرب سے خیر و برکت کا حصول بھی اس کے فیصلے سے ہے ، اور بُری چیزوں کے قرب سے مصیبت و شر کا حصول بھی اسی کے قضاء وقدر سے ہے ۔ تمام اسباب اور ان کے مسببات کا خالق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے ۔ اس نے کستوری کو پیدا فرما کر اس میں

① صحیح ابن حبان (١٤٢٨) اس کی سند میں ''عتبہ بن حمید'' راوی ہے جس کو امام احمد نے ضعیف کہا ہے۔

عمدہ قسم کی خوشبوں ڈال دی جس سے اس کے قریب جانے والے کے لئے لذت وسرور کا سامان پیدا کر دیا ، جبکہ بد بودار چیزوں کو لوگوں کی تکلیف وایذاء کا باعث بنا دیا۔ چنانچہ ان دونوں چیزوں کا فرق حسی طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اب بعینہ یہی بات عورت، گھر اور گھوڑے کے سلسلے میں سمجھ لیجئے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ بالکل الگ رنگ ہے، جبکہ شرکیہ بدشگونی دوسرا رنگ۔''

اس لئے تو عورت، لونڈی یا سواری کے استفادہ سے پیشتر رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے ان کی ہر خیر کے سوال اور ہر شر سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی۔ ①

اور یہی تعلیم ہر شخص کے لئے ہے جو سکون کے ارادے سے کسی نئے گھر میں منتقل ہو۔

اب یہاں یہ سوال باقی رہ گیا کہ یہ بات تو ہر منحوس چیز پر مرتب ہو سکتی ہے تو پھر ان تین چیزوں کو بطورِ خاص ذکر کیوں کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ عام طور پر بدشگونی کا وقوع انہی تین چیزوں پر ہوتا ہے، لہٰذا ان کا بطور خاص ذکر کیا گیا۔

ایک سوال: ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ گھر اور عام وبائی مقام میں کیا فرق ہوا؟ کہ گھر کے منحوس ہونے کی صورت میں اسے چھوڑ کر دوسری جگہ کوچ کرنا جائز ہے جبکہ عام وبائی مقام سے نکل کر بھاگنا ممنوع ہے؟

جواب: جواب یہ ہے کہ اس معنی کے اعتبار سے تمام امور کی تین اقسام ہیں۔

(۱) پہلی قسم: وہ امر جن کی بدشگونی نادر الوقوع ہے، یعنی بکثرت یا بتکرار نہیں ہوتی، مثلاً: سفر کے موقع پر کوّے کا بولنا، یا گھر میں چیخ کر اُلّو کا بولنا، یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں اہل جاہلیت بدشگونی کا باعث قرار دیتے ہیں اس کی شریعت نے بھی نفی کر دی ہے۔

(۲) دوسری قسم: وہ امور جو بتکرار تو نہیں ہوتے لیکن جب ظاہر ہوتے ہیں تو اس کا اثر کسی ایک فرد کی بجائے عمومی قسم کا ہوتا ہے، جیسے کسی مقام پر کسی وبائی مرض کا پھیل جانا۔ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ ایسے مقام پر نہیں جانا چاہئے اور اگر وہاں موجود ہو تو پھر بھاگنا نہیں چاہئے۔

(۳) تیسری قسم: وہ امور جن کا اثر عمومی نہیں ہوتا بلکہ کوئی خاص فرد اس کا شکار ہوتا ہے، اور لمبے ساتھ کی وجہ سے نقصان کا اندیشہ قائم رہتا ہے مثلاً: منحوس عورت، گھر یا گھوڑا۔ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ چاہو تو ان کو بدل لو اور چاہو تو خیالات وساوس کی کوئی پرواہ کیئے بغیر اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر ساتھ رکھو۔

---

① سنن ابی داؤد، کتاب النکاح (۲۱۶۰) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو ''حسن'' کہا ہے۔ سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، رقم: ۲۲۵۲، تخریج الاحیاء (۳۲۸/۱).

''ھامۃ'' کی وضاحت

(۳) حدیث پاک میں تیسرے نمبر پر جس کی نفی کی گئی ہے وہ" ھامہ " ہے۔فراء کا کہنا ہے کہ " ھامہ" رات کا ایک پرندہ یعنی اُلو ہے۔

ابن الاعرابی فرماتے ہیں کہ'' اہل جاہلیت الو کے گھر میں آنے کو باعث نحوست سمجھا کرتے تھے، چنانچہ جب کوئی اُلو ان میں سے کسی کے گھر پر بیٹھ کر بولتا تو کہتے کہ یہ میری یا میرے گھر کے کسی فرد کی موت کا پیغام لیکر آیا ہے۔''

ابوعبید کا فرمانا ہے کہ'' اہل جاہلیت کا خیال تھا کہ میت کی ہڈیاں الو بن کر اڑنے لگتی ہیں۔''

یہی خیال ابن رجب کا بھی ہے،اور ابنِ رجب نے یہ بھی لکھا ہے کہ'' ان کا یہ عقیدہ اہلِ تناسخ کے عقیدہ سے ملتا جلتا ہے جو مردوں کی روحوں کے حیوانوں کے جسموں میں منتقل ہو جانے کے قائل ہیں۔''

بہرحال یہ سب کچھ باطل اعتقادات پر مبنی ہے،اور اسلام ان اعتقادات کے ابطال اور تکذیب کے لئے آیا ہے،جیسا کہ اس حدیث میں اس کی واضح نفی موجود ہے۔

''صفر'' کی تفصیل

(۴) چوتھے نمبر پر جس چیز کی نفی ہے وہ صفر ہے۔جس کی تفسیر میں علماء سے مختلف اقوال منقول ہیں،بعض علماءِ کرام کی تفسیر کے مطابق یہ پیٹ کا ایک کیڑا ہے جو مویشیوں کی اور لوگوں کی ہلاکت کا سبب بنتا ہے،اہلِ عرب اسے کھجلی سے بھی زیادہ متعدی خیال کرتے تھے،اس تفسیر کے لحاظ سے اس کی نفی کا سبب ان کا اسے عدوی سمجھنے کا عقیدہ رکھنا ہے،اگر چہ عدوی کی نفی پہلے ہو چکی ہے،لیکن عدوی کے بعد اس کی بطور خاص نفی کرنا ''عطف الخاص علی العام'' کے باب سے ہے۔یہ تفسیر سفیان بن عیینہ،احمد بن حنبل،امام بخاری اور ابن جریر طبری رحمہم اللہ سے منقول ہیں۔

جبکہ دیگر علماء کے نزدیک صفر سے مراد وہ مخصوص مہینہ ہے جو محرم کے بعد اور ربیع الاول سے پہلے آتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی نفی کا سبب یہ ہے کہ اہل جاہلیت محرم کے مہینے کو حلال سمجھ لیتے تھے اور اس کی جگہ صفر کے مہینے کو حرمت والا قرار دیدیتے تھے۔لیکن یہ قول محل نظر ہے۔جبکہ ابوداؤد میں محمد بن راشد اپنے کسی استاد کے حوالے سے کہتے ہیں کہ'' دراصل اہل جاہلیت صفر کے مہینے کو منحوس تصور کرتے تھے،جس کی نفی کر کے رسول اللہ ﷺ نے ان کے نظریہ کو باطل قرار دیدیا۔''

ابن رجب فرماتے ہیں کہ'' یہ قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، چنانچہ بہت سے جاہل اب بھی صفر کے مہینے کو

منحوس سمجھتے ہیں اور ممکن ہے کہ اس مہینے میں سفر کرنے سے بھی منع کرتے ہوں۔ لھذا اس مہینہ کو منحوس سمجھنا بدشگونی ہے، جس کی رسول اللہ ﷺ نے نفی فرمادی اسی طرح بعض لوگ بدھ کے دن کو منحوس سمجھتے ہیں، اور اسی طرح اہلِ جاہلیت شوال کے مہینے میں نکاح کرنے کو منحوس خیال کرتے تھے۔'' (یہ تمام توہمات وخیالات باطل ہیں)

(۵) پانچویں نمبر پر جس چیز کی نفی فرمائی وہ ''نوء'' یعنی پچھتر ہے، جس کی جمع انواء آتی ہے۔ اسکی مفصل بحث ایک مستقل باب ''باب ماجاء فی استقاء بالانواء'' میں آئے گی۔

''غول'' کی وضاحت

(۶) چھٹے نمبر پر جس چیز کی نفی منقول ہے وہ "غَول" ہے۔ ابوالسعادات فرماتے ہیں: کہ "غَول" واحد ہے اس کی جمع غیلان ہے (اغوال بھی آتی ہے) یہ شیطان اور جنوں کی ایک جنس ہے جن کے بارے میں اہلِ عرب کا خیال تھا کہ جنگلوں میں مختلف رنگ بدل کر اور مختلف شکلیں بنا کر لوگوں کو دکھائی دیتے ہیں، اور انہیں راستے سے بھٹکا کر (ایک قسم کا اغواء کرکے) ہلاک کردیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی نفی فرما کر اس نظریہ کو باطل قرار دیا۔

واضح ہو کہ اس حدیث میں "غَول" کے وجود کی نفی نہیں ہے بلکہ "غَول" کے متعلق اہل عرب کے اس خیال کی نفی ہے کہ وہ رنگ اور صورتیں تبدیل کرکے لوگوں کو اچک لیتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی اس نفی کا مقصد یہ ہے کہ غول میں کسی شخص کو راستے سے بھٹکانے اور اچکنے کی کوئی طاقت نہیں ہے۔ آپ ﷺ کی ایک دوسری حدیث اس مفہوم کی تائید کرتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ: ''غول کی کوئی حقیقت نہیں، البتہ جنوں میں کچھ جادوگر ہیں'' ① جو تلبیس وتخییل کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب غول تمہیں بھٹکانے یا اچکنے کی کوشش کریں تو فوراً اذان کہہ کر انکے شر کو دفع کرلیا کرو'' ② ان احادیث سے "غَول" کا وجود تو ثابت ہوگیا، لیکن اس کے بارے میں اہل جاہلیت کے اعتقاد کی نفی بھی ہوگئی۔

① صحیح مقطوع. سنن ابی داؤد، کتاب الکهانة (۳۹۰۹).
② مسند احمد (۱٤۲۸۱ ج۵).

قال :ولهما عن انس ﷺ قال : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ :لَاعَدْوٰى وَلَاطِيَرَةَ وَيُعْجِبُنِيْ الْفَأْلُ قَالُوْا وَمَا الْفَأْلُ ؟قَالَ كَلِمَةٌ طَيِّبَةٌ . ①

صحیحین میں سیدنا انس ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہ تو ایک کی بیماری دوسرے کو لاحق ہوتی ہے، اور نہ ہی بدشگونی کوئی چیز ہے، اور مجھے فال پسند ہے، صحابہ کرام ﷺ نے پوچھا: فال کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ کلمہ خیر ہے'' (جو کسی آدمی کے منہ سے سنتا ہے۔)

فال کی وضاحت اور اس کا حکم

اس حدیث میں نظریۂ تعدیٔ امراض اور بدشگونی کی نفی ہے۔ اسکے بعد رسول اللہ ﷺ نے فال کی پسندیدگی کا اظہار فرمایا...... واضح ہو کہ فال کا اطلاق ہر اچھے اور برے شگون پر ہوتا ہے، جب کہ ''طیرہ'' کا استعمال صرف بدشگونی کے لئے ہے، لیکن کبھی کبھی اچھے شگون کے لئے بھی ہوتا ہے۔

''فال'' یا ''تفاؤل'' کا اصل مفہوم اس مثال سے سمجھنا آسان ہو جائے گا، مثال کے طور پر ایک شخص بیمار ہے اور کوئی دوسرا شخص اس کے نزدیک بیٹھا گفتگو کر رہا ہے، وہ دوران گفتگو یا "سالم" یعنی ''اے تندرست'' کا لفظ استعمال کر جاتا ہے، اور وہ بیمار شخص اس کی زبان سے اس لفظ کو سن کر اسے نیک فال پر محمول کرتے ہوئے اپنی تندرستی اور صحت وعافیت کی امید قائم کر لیتا ہے، یا اسی طرح کوئی شخص اپنی کوئی گمشدہ چیز تلاش کر رہا ہے تو کسی شخص کی گفتگو سے "یا واجد" (یعنی اے اپنے گمشدہ سامان کو پانے والے) کا لفظ اس کے کانوں تک پہنچتا ہے تو وہ اس کلمہ خیر کو اپنے لئے نیک فال اور باعثِ خیر و برکت سمجھتے ہوئے اپنی گمشدہ چیز کے مل جانے کی امید قائم کر لے۔ یہ تفاؤل کہلاتا ہے، اسے رسول اللہ ﷺ نے پسند فرمایا ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ سے ایک امید قائم رہتی ہے جو انسان کے حق میں ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ جب کہ اسکے برعکس ''تشاؤم'' یعنی بدشگونی کی صورت میں انسان اپنے پروردگار کے ساتھ سوءِ ظنی کا شکار ہو جاتا ہے، اور اسکی رحمت و برکت کی امید کے تمام سہارے توڑ کر بلاء ومصیبت کی توقع اور انتظار میں بیٹھ رہتا ہے، جو اس کے حق میں شر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن نیک فال میں چونکہ اس کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک امید قائم ہو جاتی ہے اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اسے پسند فرمایا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کا تفاؤل کو پسند فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا "طیرۃ" سے کوئی تعلق نہیں ہے، جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

حافظ ابن القیم ﷫ فرماتے ہیں: ''کہ فال کی پسندیدگی میں شرک کا کوئی عنصر شامل نہیں ہے، =

① صحيح بخاری ، كتاب الطب (٥٧٧٦)، صحيح مسلم ، كتاب السلام (٢٢٢٣/١١٢)۔ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں۔

قال :ولأبی داؤد بسند صحیح عن عقبة بن عامر قَالَ : ذُكِرَتِ الطِّيَرَةُ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: "اَحْسَنُهَا الْفَأْلُ وَلَاتَرُدُّمُسْلِمًا . فَإِذَا رَأَى اَحَدُكُمْ مَايَكْرَهُ فَلْيَقُلْ : اَللّٰهُمَّ لَايَاْتِىْ بِالْحَسَنَاتِ اِلَّااَنْتَ ، وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّاٰتِ اِلَّا اَنْتَ ، وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّابِكَ " ①

ابوداؤد میں سیدنا عقبہ بن عامر ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے بدشگونی کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس میں فال ہی سب سے بہتر ہے ،اور کسی مسلمان کو بدشگونی اس کے مقاصد سے نہ روکے ، جب کوئی شخص کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے تو کہہ لیا کرے : کہ اے اللہ ! اچھائیوں کو لانے والا صرف تو ہی ہے ،اور برائیوں کو ٹالنے والا بھی صرف تو ہی ہے ،اور تیری توفیق کے بغیر نہ کوئی بھلائی حاصل کی جاسکتی ہے ،اور نہ ہی کسی برائی سے بچا جاسکتا ہے ۔''

=

بلکہ یہ پسندیدگی طبیعت کا وہ اقتضاء اور فطرتِ انسانی کی وہ پسندیدگی ہے جس کی بناء پر انسانی فطرت اپنے موافق اور مناسب چیزوں کی طرف میلان اختیار کرتی ہے ،جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں سامانِ دنیا میں سے عورت اور خوشبو کی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ایک دوسری حدیث میں مٹھاس اور شہد کا بھی ذکر ہے ۔علاوہ ازیں تلاوت قرآن اور اذان کیلئے خوبصورت آواز سے بھی آپ کو محبت تھی ۔اور بلند اخلاق بھی پسندیدہ تھے ۔الغرض ہر کمال اور بھلائی سے آپ ﷺ محبت فرمایا کرتے تھے ۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے لوگوں کے طبائع میں خوبصورت نام سننے اور اس سے محبت رکھنے کی عادت ودیعت فرمائی ہے اور اسی طرح کامیابی، سلامتی ،خوشخبری اور مبارک بادی جیسے نام سن کر خوشی حاصل کرنے کو بھی ایک طبعی امر بنا دیا ہے ،چنانچہ اس قسم کے اسماء جب سماعت سے ٹکراتے ہیں تو طبیعت کی خوشی ،انشراح صدر اور قوتِ قلب کا باعث بن جاتے ہیں ، اور جب اس کے برعکس اسماء انسان سن لیتا ہے تو غمگین ہوجاتا ہے اور طبیعت میں خوف اور انقباض کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں ، پھر یہی چیز دنیوی ضرر یا ایمان کے نقص یا شرک کے ارتکاب کا پیش خیمہ بن جاتی ہے ۔''

حلیمی کا قول ہے کہ آپ ﷺ کو تفاؤل پسند تھا ،جس کی وجہ یہ ہے کہ بدشگونی میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بلا وجہ بدگمانی ہے ،جبکہ تفاؤل میں حسن ظن ہے ،اور مومن ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن قائم رکھنے پر مامور ہے ۔

وقوله :ولأبی داؤد بسند صحیح عن عقبة بن عامر ؓ قَالَ : ذُكِرَتِ الطِّيَرَةُ ......

=

① ضعیف. سنن ابی داؤد ،کتاب الطب (۳۹۱۹) سنن الکبریٰ للبیھقی (۱۳۹/۸) **اس کی سند میں حبیب بن ابی ثابت مدلس ہے اور '' عن'' سے روایت کررہا ہے۔**

=

یہ حدیث کتاب التوحید کے تمام نسخوں میں سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے، جبکہ صحیح یہ ہے کہ عروۃ بن عامر القرشی سے مروی ہے (احمد وابوداؤد)

ان کی صحابیت میں علماء سے مختلف اقوال منقول ہیں، بعض ان کو صحابی شمار کرتے ہیں جبکہ بعض نے انہیں ثقہ تابعین کی فہرست میں ذکر کیا ہے۔ اس حدیث میں بھی فال کی پسندیدگی کا بیان ہے۔

ترمذی میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی اہم مشن پر روانہ ہوتے تو آپ ﷺ "یَانُجَیْحُ" (اے کامیاب) "یَارَاشِدُ" (اے ہدایت یافتہ) قسم کے الفاظ سننا پسند کرتے۔ ①

ابوداؤد میں سیدنا بریدۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کسی چیز سے بدشگونی نہیں لیا کرتے تھے، جب کسی عامل کو بھیجتے تو اس کا نام پوچھا کرتے اگر نام پسندیدہ ہوتا تو خوش ہوتے، اور ناپسندیدہ ہوتا تو کراہت آپ کے چہرے پہ نمایاں ہو جاتی۔ ②

اس حدیث میں بھی تفاؤل کی پسندیدگی کا اظہار ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے یہ خبر دی ہے کہ فال، "طیرۃ" ہی سے ہے لیکن "طیرۃ" باطل ہے اور فال اگرچہ "طیرۃ" سے ہے لیکن اس سے بہتر اور پسندیدہ ہے۔ اس سے فال اور طیرۃ کا آپس کا تعلق اور فرق واضح ہو گیا۔''

اس حدیث میں کسی ناپسندیدہ چیز کو دیکھ کر ایک دعاء کی تعلیم فرمائی جس میں یہ درس ہے کہ کسی ناپسندیدہ چیز کی بدشگونی کی طرف التفات کے بجائے توکل علی اللہ کا سہارا لینا چاہیے، یہی بھلائیوں کے حصول اور پریشانیوں کے ازالہ کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ چنانچہ اس دعاء میں انسان اس امر کا اعتراف کرتا ہے، کہ طیرۃ نہ تو کوئی اچھائی دے سکتی ہے، اور نہ ہی کسی برائی کو دفع کر سکتی ہے، یہ کام صرف اللہ رب العزت کا ہے، اور اچھائیوں کا حصول اور برائیوں سے بچاؤ صرف اس کی توفیق وقدرت سے ممکن ہے۔

① اس کی سند صحیح ہے۔ سنن ترمذی، کتاب الأضاحی (۱۶۱۶).

② صحیح۔ مسند احمد (۷٤۷/۵) سنن ابی داؤد، باب الکھانۃ (۳۹۲۰) ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اسے "الفتح (۲۲۵/۱۰) میں ''حسن'' کہا ہے، مزید دیکھئے: سلسلۃ الصحیحۃ (۷٦۲).

قال :وعن ابن مسعود مرفوعا :"اَلطِّیَرَۃُ شِرْکٌ وَمَامِنَّا اِلاَّ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یُذْھِبُہٗ بِالتَّوَکُّلِ"

(رواہ ابوداؤد ، والترمذی وصححہ وجعل آخرہ من قول ابن مسعود) ①

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بدفالی شرک ہے۔ اور ہم سے کوئی شخص ایسا نہیں کہ جس کے دل میں بدفالی کی کچھ نہ کچھ آمیزش نہ ہو، لیکن اللہ تعالیٰ اسے توکل کے ذریعے ختم فرما دیتا ہے۔'' (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے، اور ترمذی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے، اور اس کے آخری حصہ کو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول قرار دیا ہے)

قال ولاحمد من حدیث ابن عمرو "مَنْ رَدَّتْہُ الطِّیَرَۃُ مِنْ حَاجَتِہٖ فَقَدْ اَشْرَکَ قَالُوْا :فَمَا کَفَّارَۃُ ذٰلِکَ قَالَ :اَنْ تَقُوْلَ اَللّٰھُمَّ لاَخَیْرَ اِلاَّ خَیْرُکَ وَلَاطَیْرَ اِلاَّ طَیْرُکَ وَلاَاِلٰہَ غَیْرُکَ" ②

مسند احمد میں بروایت سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما مروی ہے، کہ جس شخص کو کوئی بدشگونی اسکے کام سے روک دے، اس نے شرک کیا۔ لوگوں نے پوچھا: کفارہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کہا کرو کہ ''اے اللہ تیری بھلائی کے علاوہ کوئی بھلائی نہیں اور یہ پرندہ بھی تیری ہی مخلوق ہے تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔''

یہ حدیث بدشگونی کے حرام اور شرک ہونے کی صریح دلیل ہے، اس کے شرک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غیر اللہ کے ساتھ قلبی تعلق پیدا ہوجاتا ہے، اور لوگوں کا اعتقاد بھی یہی ہے کہ "تطیر" جلبِ منفعت یا دفعِ مضرت کا باعث بنتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ سراسر شرکیہ عقیدہ ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بتقاضاً بشریت انسان کے دل میں بدفالی کا خیال آہی جاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ پر پختہ توکل اس خیال کو ختم کردیتا ہے اور دل کو سنت اور اتباعِ حق پر برقرار رکھ دیتا ہے۔

وقولہ: ولاحمد من حدیث ابن عمرو رضی اللہ عنہما "مَنْ رَدَّتْہُ الطِّیَرَۃُ مِنْ حَاجَتِہٖ فَقَدْ اَشْرَکَ ......

اس حدیث سے یہ بات بصراحت معلوم ہوئی کہ کسی مرئی یا مسموع چیز کی بدشگونی کی بناء پر اپنے سفر وغیرہ سے لوٹ آنا یا اپنے عزائم سے باز آجانا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے کے مترادف ہے، کیونکہ اس صورت میں انسان توکل علی اللہ سے بری ہوجاتا ہے، اور اپنے لئے خوف اور تعلق بغیر اللہ کا دروازہ کھول لیتا ہے اور یہ بات مقامِ توحید کے سراسر منافی ہے۔ =

① اس کی سند صحیح ہے۔ سنن ابوداؤد، کتاب الطب (۳۹۱۰) سنن ترمذی (۱۶۱۴) امام ترمذی نے اسے "حسن صحیح" کہا ہے، اور فرمایا کہ امام بخاری نے کہا ہے: سلیمان بن حرب ان الفاظ کو (وما منا الا ولکن اللہ یذھبہ بالتوکل) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول کہتے تھے۔ سنن ابن ماجہ، رقم: ۳۵۳۸.

② احمد شاکر فرماتے ہیں: اس کی سند صحیح ہے، مسند احمد (۲/۲۲۰) رقم: ۷۹۵، مجمع الزوائد (۵/۱۰۵)

قولہ :من حدیث الفضل بن العباس رضی اللہ عنہما "اِنَّمَا الطِّیَرَةُ مَاأَمْضَاكَ أَوْرَدَّكَ" ①

مسند احمد میں فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث بھی ہے ''طیرۃ کی حد یہ ہے کہ کوئی چیز تمہیں سفر جاری رکھنے یا واپس لوٹ آنے پر مجبور کرے۔''

=

اس حدیث میں بدشگونی پیدا ہونے کا کفارہ بیان کیا گیا ہے جو یہ ہے کہ اپنے رب پر توکل کرتے ہوئے اپنے سفر یا عزم کو جاری رکھے اور اپنی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف کرے کہ ہر قسم کی بھلائی خواہ وہ دنیا کی ہو یا آخرت کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور پرندہ جو عام طور پر نیک فالی یا بدفالی کا محرک بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق و مملوک ہے اور اس حقیقت کا بھی دل و جان سے اعتراف کرے کہ الوہیت کے منصب پر ایک اللہ تعالیٰ ہی فائز ہے، کوئی نبی یا فرشتہ اس منصب میں کسی شراکت کے اہل ہونے کے لائق نہیں، تو پھر ان کوے اور اُلّو کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے، جن سے انسان بدشگونی لیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے اس منصب میں ان کی شراکت کے جرم عظیم کا ارتکاب کرتا ہے۔

وقوله: من حديث الفضل......

اس حدیث میں اس حد کا بیان ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان "تطیر" کا نشانہ بن جاتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ شرک کی دلدل میں پھنس جاتا ہے، چنانچہ وہ حد یہ ہے کہ مثلاً: اپنے سفر سے قبل کسی اچھی چیز کو دیکھتا یا اچھی آواز کو سنتا ہے تو اسے نیک شگون تصور کرتے ہوئے اسی کے اعتماد پر اپنے سفر کو جاری رکھے، اور توکل علی اللہ کو فراموش کر بیٹھے، یا پھر سفر سے قبل ناپسندیدہ مسموع یا مرئی چیز کا سامنا ہوتے ہی اسے بدشگون سمجھتے ہوئے اپنا سفر ختم کر کے واپس آ جائے۔ یہ چیز وہ طیرۃ ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے حرام و شرک قرار دیا ہے۔



① احمد شاکر فرماتے ہیں: اس کی سند ضعیف ہے۔ مسند احمد (۱۸۲۴ ج ۱).

اس باب کے مسائل

(۱) اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ إِنَّمَا طَائِرُهُمْ عِندَ اللهِ ....الاية ﴾ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ طَائِرُكُمْ مَعَكُمْ ﴾ کی حقیقت پر غور نیز ان دونوں مقامات کی صحیح ،اور واضح تفسیر وتعبیر معلوم ہوئی۔

(۲) ایک کا مرض دوسرے میں سرایت کرنے کی نفی۔

(۳) بدشگونی کی نفی۔

(۴) ھامہ، یعنی اُلّو کی آواز سے بدشگونی کی نفی۔

(۵) ماہ صفر کی نحوست کے اعتقاد کی نفی۔

(۶) یہ بات واضح کی گئی کہ نیک فال "طیرة" کی طرح ممنوع نہیں ہے، بلکہ مستحب ہے

(۷) فأل کی تشریح بیان ہوئی۔

(۸) بدشگونی ، ناپسندیدہ چیز ہے اس کے باوجود اس کا اتفاقاً دل میں آجانا نقصان دہ نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ توکل کے ذریعے اسے دفع کردیتا ہے۔

(۹) جس شخص کے دل میں بدشگونی کا وسوسہ آئے تو وہ کیا کلمات کہے۔

(۱۰) بدشگونی کے شرک ہونے کی صراحت کی گئی۔

(۱۱) "الطیرة" کے مذموم حصہ، جسے بدشگونی کہا جاتا ہے کی تفسیر معلوم ہوئی۔



باب ماجاء فی التنجیم

علمِ نجوم کا بیان

اس باب کے انعقاد کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ ستاروں کے علم سے جائز اور ناجائز قدر کیا ہے، نیز یہ کہ علم نجوم کے سلسلہ میں شریعت میں کس قسم کی وعید وارد ہوئی ہے۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''احوالِ فلکیہ کے ذریعے حوادثِ ارضیہ پر استدلال کرنا علمِ نجوم کہلاتا ہے۔''

امام خطابی فرماتے ہیں: ''کہ جس علمِ نجوم سے روکا گیا ہے اس سے مراد نجومیوں کے وہ دعوے ہیں جو وہ مختلف حادثات کے علم کے سلسلے میں کرتے ہیں جو زمانہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونگے۔ (یعنی مستقبل کے واقعات کا علم) مثلاً: ہواؤں کے چلنے، بارش کے برسنے، یا گرمی اور سردی کے ظہور اور اسی طرح قیمتوں کے اتار اور چڑھاؤ اور اسی قسم کے دیگر امور کی اطلاع۔ اور نجومیوں کا زعم یہ ہے کہ وہ ستاروں کی گردش اور ان کے اجتماع و افتراق سے یہ باتیں معلوم کر لیتے ہیں، ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ستاروں کی حرکات کا نظامِ ارضی پر اثر ہوتا ہے، بلکہ نظامِ ارضی ستاروں کی گردش کے تقاضوں کے مطابق چلتا ہے۔ ان کا یہ کہنا اللہ تعالیٰ کے علم الغیب کے خزانے پر کہ جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، تحکم اور دست درازی کے مترادف ہے۔''

علمِ نجوم کی جائز اور ناجائز صورتیں

واضح ہو کہ ستاروں کا علم تین قسموں پر ہے:

(۱) پہلی قسم، جس سے مراد یہ ہے کہ عالمِ سفلی کی تمام موجودات کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ یہ ستاروں اور روحانیات کی تاثیر سے مرکب ہے، اور یہ کہ ستارے نظامِ ارضی کے مکمل مختار کار ہیں۔

یہ عقیدہ بالاجماع کفر ہے، یہ عقیدہ ان بے دین نجومیوں میں پایا جاتا ہے جن کی طرف ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا، چنانچہ وہ لوگ سورج، چاند اور ستاروں کی غایت درجہ تعظیم کرتے، اور ان کے آگے سجدہ ریز ہوتے، اور خاص قسم کی تسبیحات پڑھتے، اور ان سے ایسی دعائیں مانگتے جو ان کے خالق، اللہ وحدہ لاشریک لہ کیلئے لائق ہیں۔ نیز ہر ستارے کا ہیکل بناتے، ہیکل سے مراد یہ ہے کہ ایک مخصوص جائے عبادت بنا کر اس کے اندر اس ستارے کی تصویر رکھ دیا کرتے، پھر اسے عبادت و تعظیم کا مرکز بنا لیتے، ان کا زعمِ فاسد یہ تھا کہ ان ستاروں کی روحانیت ان پر نازل ہوتی ہے، گفتگو کرتی ہے اور ضروریات بھی پوری کرتی ہے۔ یہ روحانیات درحقیقت شیاطین ہیں جو ان پر نازل ہو کر کلام بھی کرتے تھے اور انکی حاجات بھی پوری کرتے تھے۔ =

قوله :قال البخاری فی صحیحه :قال قتادة : ﴿ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ ﴾ (١) خَلَقَ اللّٰهُ هٰذِهِ النُّجُوْمَ لِثَلَاثٍ ، زِيْنَةً لِّلسَّمَاءِ ، وَرُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ ، وَعَلَامَاتٍ يُّهْتَدٰى بِهَا ، فَمَنْ تَأَوَّلَ فِيْهَا غَيْرَ ذٰلِكَ أَخْطَأَ وَأَضَاعَ نَصِيْبَهٗ وَكَلَّفَ مَالَا عِلْمَ لَهٗ بِهٖ .

امام بخاری رحمہ اللہ اپنی صحیح میں فرماتے ہیں: کہ قتادہ ﴿ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ ﴾ ''بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے زینت والا بنا دیا'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے ان ستاروں کو تین اغراض کیلئے پیدا فرمایا ہے، آسمان کی زینت، شیطان کو مارنا اور راستے معلوم کرنے کی علامت۔ جس نے ان تینوں اغراض کے علاوہ کچھ اور سمجھا تو اس نے زبردست غلطی کی، اور اپنا آخرت کا حصہ بھی کھو دیا، اور ایسی بات کا تکلف کیا جس کا اسے کوئی علم نہیں۔''

=

(۲) علم نجوم کی دوسری قسم یہ ہے کہ ستاروں کی گردش یا ان کے اجتماع وافتراق سے حوادث ارضیہ پر استدلال کرنا، یہ کام کرنے والے گو ان حوادث کو اللہ تعالیٰ کی تقدیر ومشیت کا تابع قرار دیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بھی اس علم کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں۔ علماءِ متاخرین نے اس قسم کا علم رکھنے والوں کے کفر میں اختلاف کیا ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ ان کے کفر کا قطعی حکم لگایا جائے، کیونکہ اس قسم کا علم رکھنا اس علم الغیب میں دست درازی کے مترادف ہے جو اللہ تعالیٰ کا ایسا خزانہ ہے کہ اسے اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

(۳) علمِ نجوم کی تیسری قسم مختلف منازل کا علم حاصل کرنا ہے، جس کا مصنف نے اس باب میں ذکر کیا ہے اور اس کی مفصل بحث عنقریب آئے گی۔

قوله :قال البخاری فی صحیحه :قال قتادة :......

قتادہ رحمہ اللہ کا یہ قول صحیح بخاری میں معلقاً مروی ہے۔ اس قول میں ستاروں کی تخلیق کی تین حکمتیں بیان کی گئی ہیں اور یہ تینوں حکمتیں قرآنی آیات سے ماخوذ ہیں، چنانچہ ستاروں کے آسمان کی زینت ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مبارک ہے: ﴿ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ ﴾ ①

''بے شک ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے زینت والا بنا دیا''

اور ستاروں کے شیطان کے مار ہونے کی دلیل یہ ہے: ﴿ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيَاطِيْنِ ﴾ ①

''اور انہیں (ستاروں کو) شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بنا دیا''

① (الملك: ٥)

اور راستے معلوم کرنے کی علامت ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مبارک ہے:

﴿ وَعَلَامَاتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ﴾ ①

''اور بھی بہت سی نشانیاں مقرر فرمائیں، اور ستاروں سے بھی لوگ راہ حاصل کرتے ہیں''

اور ایک مقام پر فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ﴾ ②

''اور وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لئے ستاروں کو پیدا کیا تاکہ تم ان کے ذریعے سے اندھیروں میں، خشکی میں اور دریا میں راستہ معلوم کرسکو''

ستاروں کی تخلیق کی یہ تینوں اغراض قرآن حکیم میں مذکور ہیں، لہذا قتادہ رحمہ اللہ کے قول کے مطابق جو اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ ان تین حکمتوں کے علاوہ کچھ اور سمجھنے کی کوشش کرے گا وہ سخت غلطی پر ہے۔

علامہ داؤدی، قتادہ کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''یہ قول درست ہے، مگر قتادہ کا یہ کہنا ''کہ وہ غلطی پر ہے اور اس نے اپنا حصہ ضائع کردیا'' بہت چھوٹا سا حکم ہے، اس عقیدہ کے حامل شخص کو تو صریح کافر کہنا چاہئے۔''

اگر یہاں یہ سوال کیا جائے کہ بعض اوقات نجومیوں کی بات سچ اور صحیح ثابت ہو جاتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا بعض اوقات سچ بولنا کاہنوں کے سچ کی طرح ہے، جو ایک بار سچ بولتے ہیں اور سو بار جھوٹ بولتے ہیں، لہذا کاہنوں کی طرح ان کے ایک بار کے سچ سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کا علم صحیح ہے۔

علمِ نجوم کے ماہرین کے استدلالات اور ان کے شافی جوابات

پہلا استدلال: بعض نجومیوں نے علمِ نجوم کی صحت کو ثابت کرنے کے لئے بعض آیات سے استدلال کیا ہے مثلاً: ﴿ وَعَلَامَاتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ﴾ ③

''اور بھی بہت سے نشانیاں مقرر فرمائی، اور ستاروں سے بھی لوگ راہ حاصل کرتے ہیں''

وجہ استدلال یہ بیان کرتے ہیں کہ ستاروں کو علمِ غیب کی ایسی علامات قرار دیا گیا ہے کہ لوگ ان کے ذریعے علم غیب معلوم کرلیتے ہیں۔

جواب: جواب یہ ہے کہ اس آیت کا یہ مقصود ہرگز نہیں، بلکہ ستاروں کے علامات ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ کی قدرت و وحدانیت کے دلائل ہیں۔ بعض مفسرین آیت کریمہ: ﴿ وَعَلَامَاتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ

① (النحل: ١٦) ② (الانعام: ٩٧) ③ (النحل: ١٦)

یَہۡتَدُوۡنَ﴾ ① کو اس سے پہلی آیت کا تتمہ قرار دیتے ہیں، وہ آیت یہ ہے: ﴿ وَاَلۡقٰی فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ اَنۡ تَمِیۡدَ بِکُمۡ وَاَنۡہٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ .وَعَلٰمٰتٍ وَبِالنَّجۡمِ ہُمۡ یَہۡتَدُوۡنَ ﴾ ②

''اور اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیئے ہیں تاکہ تمہیں ہلا نہ دیں، اور راہیں بنادیں تاکہ تم منزل مقصود کو پہنچو۔ اور نشانیاں ......''

تو پہلی آیت کا معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے اور چھوٹے پہاڑوں کی صورت میں زمینی راستے شناخت کرنے کے لئے تمہیں علامات مہیا کر دی ہیں۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ﴿ وَعَلٰمٰتٍ ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اس سے مراد دن کے وقت راستے معلوم کرنے کے نشانات ہیں۔''

اور ﴿ وَبِالنَّجۡمِ ہُمۡ یَہۡتَدُوۡنَ ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ''سمندری سفروں میں ستاروں کے ذریعے راستہ پہچاننے کی مدد ملتی ہے۔''

اسی قسم کے اقوال اس آیت کریمہ کی صحیح تفسیر ہیں۔

اب اس آیت سے علمِ نجوم کی صحت پر استدلال کرنا، جانتے بوجھتے ایک ایسی چیز کے ثابت کرنے کے مترادف ہے جس کا فساد شرعی دلائل سے واضح اور معلوم ہے، یہ استدلال کی فاسد ترین صورت ہے، کیونکہ احادیث سے علمِ نجوم کا ابطال اور شدید ترین مذمت و شناعت معلوم ہوئی ہے، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں حدیث گزر چکی ہے ''کہ جس نے علمِ نجوم کا کوئی بھی باب سیکھا تو اس نے گویا جادو کا ایک باب سیکھ لیا'' ③

نیز عبداللہ بن محیریز رحمہ اللہ جو کہ ایک بہت بڑے تابعی ہیں کو سلیمان بن عبدالملک نے بلا کر کہا: کہ کاش آپ علمِ نجوم بھی سیکھ لیں، تاکہ آپ کا علمی خزانہ مزید بڑھ جائے۔ اس پر انہوں نے فرمایا: کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''کہ مجھے اپنی امت پر تین چیزوں کا سب سے زیادہ خوف ہے، حکام کا ظلم، تقدیر کا جھٹلانا، علمِ نجوم پر ایمان اور اس کی تصدیق کرنا'' ④

یہی حدیث رجاء بن حیوۃ نے بھی نبی ﷺ سے روایت کی ہے۔ دو مختلف سندوں سے وارد ہونے والی یہ دونوں مرسل احادیث ثبوتِ حدیث کی دلیل ہیں۔ اسکے علاوہ ابو محجن سے بھی اس معنی کی ایک حدیث مرفوعا مروی ہے، جسے ابن عساکر نے روایت کیا ہے، اور سیوطی نے اسے حسن کہا ہے۔ نیز سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے

① (النحل: ۱٦) ② (النحل: ۱۵، ۱٦)
③ مسند احمد (۲۸٤۱) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ''حسن'' کہا ہے، سنن ابی داؤد (۳۹۰٦) الفاظ ابوداود کے ہیں۔
④ الجامع لابن عبد البر (۳۹/۲) امام مناوی رحمہ اللہ نے اسے فیض القدیر (۲۰٤/۱) میں حسن لغیرہ کہا ہے۔

ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اپنے بعد اپنی امت پر دو خطرے ہیں، ایک تو تقدیر کے جھٹلانے کا اور دوسرا علمِ نجوم پر ایمان لانے کا''

اس حدیث کو ابو یعلیٰ اور ابن علی وغیرہ نے روایت کیا ہے، اور علامہ سیوطی نے اسے حسن کہا ہے۔

مسند احمد اور صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"مَفَاتِيحُ الْغَيْبِ خَمْسٌ لَايَعْلَمُهَا اِلَّااللّٰهُ ، لَايَعْلَمُ مَاتَغِيْضُ الْاَرْحَامُ اِلَّا اللّٰهُ ، وَلَايَعْلَمُ مَا فِي غَدٍ اِلَّااللّٰهُ ، وَلَايَعْلَمُ مَتٰى يَأْتِي الْمَطَرُ اَحَدٌ اِلَّااللّٰهُ ، وَلَاتَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِلَّااللّٰهُ وَلَايَعْلَمُ مَتٰى تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّااللّٰهُ" ①

''غیب کی پانچ کنجیاں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا (۱) کل کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا (۲) رحم میں جو کچھ ہے اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا (۳) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو علم نہیں ہے کہ بارش کب ہوگی (۴) کسی انسان کو یہ علم نہیں ہے کہ اس نے کس زمین میں فوت ہونا ہے (۵) اللہ تعالیٰ کے سوا یہ کوئی نہیں جانتا کہ قیامت کب قائم ہوگی۔''

نیز سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جزیرہ عرب کو اللہ تعالیٰ نے شرک سے پاک اور صاف کر دیا ہے، تا آنکہ علم نجوم ان کی گمراہی کا سبب بن جائے (ابن مردویہ) ②

نیز عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ستاروں کے علم سے صرف اتنا ہی حاصل کرو کہ جس کی مدد سے تم بر و بحر کی تاریکیوں میں اپنا راستہ معلوم کر سکو، پھر بس کر دو'' ③

نیز سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے ستاروں میں نظر کرنے سے منع فرمایا ہے'' (ابن مردویہ، خطیب بغدادی) ④

اس کے علاوہ بھی بہت سی احادیث و آثار ہیں جو علم نجوم کو باطل ثابت کرتی ہیں۔ جس سے واضح ہوا کہ ان احادیث کے ہوتے ہوئے بھی مذکورہ آیت سے علمِ نجوم کی صحت پر استدلال کرنا استدلال کی سب سے فاسد قسم ہے۔

---

① صحیح بخاری، کتاب التوحید (۷۳۷۹) مسند احمد (۶۰۴۳،۵۱۳۳،۴۷۶۶)۔

② امام ہیثمی نے مجمع الزوائد (۱۱۴/۱۹) میں اس حدیث کی نسبت طبرانی اوسط، اور ابو یعلیٰ کی طرف کی ہے، اور کہا ہے کہ ابو یعلیٰ کی سند حسن ہے۔

③ ضعیف۔ابن مردویہ، الخطیب فی النجوم۔ امام مناوی فیض القدیر میں کہتے ہیں کہ عبدالحق نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند قابل حجت نہیں ہے۔ اور ابن القطان نے کہا ہے: اس کی سند میں ایسا راوی ہے جسے میں نہیں جانتا۔

④ ضعیف۔الخطیب فی التاریخ (۱۳۳/۶) اس کی سند میں عقبہ بن عبداللہ بن الاصم ضعیف راوی ہے۔

دوسرا استدلال: نجومی علمِ نجوم کی صحت کے لئے اس آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں:

﴿ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِى النُّجُوْمِ فَقَالَ اِنِّىْ سَقِيْمٌ ﴾ ①

''اب ابراہیم نے ایک نگاہ ستاروں کی طرف اٹھائی۔ اور کہا میں تو بیمار ہوں''

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ علمِ نجوم کی صحت پر کہاں سے اور کس طرز سے دلیل بن رہی ہے؟ کیا کسی شخص کا ستاروں کی طرف دیکھنا علمِ نجوم کی صحت کی دلیل بن سکتا ہے؟ جبکہ تمام انسان ستاروں کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر اس آیت سے علمِ نجوم کی صحت پر استدلال کرنے والے اتنا نہیں جانتے کہ ابراہیم علیہ السلام کو انہی بے دین نجومیوں کے عقائد کی تردید وابطال کے لئے بھیجا گیا تھا۔

ایک اور اعتراض: اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ستاروں کی طرف دیکھنے کا کیا فائدہ؟

جواب: جواب یہ ہے کہ ان ستاروں کی طرف دیکھنا ''معاریض الافعال'' سے تعلق رکھتا ہے، تاکہ اس طریقہ کار کو اپنا کر اپنی اصل غرض یعنی بتوں کے توڑنے کو پالیں۔ جس طرح کہ ابراہیم علیہ السلام نے خود بتوں کو توڑ کر اپنی قوم سے کہا تھا: ﴿ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا ﴾ ②

''بلکہ اس کام کو ان کے بڑے نے کیا ہے''

اس کا تعلق بھی معاریض سے ہے۔ جو شخص یہ گمان رکھے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کو دیکھنا، ان کے احکام واحوال کے استنباط کے لئے تھا یا یہ گمان رکھے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کو دیکھ کر یہ جان لیا تھا کہ اس وقت ان کا ستارہ نحوست کی نشاندہی کر رہا ہے، تو وہ شخص بہت بڑا گمراہ ہے۔ اسی لئے حدیث شفاعت میں ہے ابراہیم علیہ السلام اپنے ان تین جھوٹوں کو (جو درحقیقت معاریض ہیں) یاد کر کے پریشان ہونگے۔ ③

ان تین جھوٹوں کو علماء نے ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کی روشنی میں شمار کیا ہے جو یہ ہیں۔

(۱) ان کا ﴿ اِنِّىْ سَقِيْمٌ ﴾ کہنا۔ (۲) ان کا ﴿ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا ﴾ کہنا۔ (۳) ان کا اپنی بیوی سارہ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ میری بہن ہے۔ ④

اب قابل غور بات یہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنا قول ''اِنِّىْ سَقِيْمٌ'' اگر ستاروں سے حاصل کیا تھا تو پھر قیامت کے دن اسے جھوٹ سمجھ کر اعتذار کیوں فرمائیں گے، جس سے واضح ہوا کہ ان کا یہ قول ''بَلْ

① (الصافات: ۸۸،۸۹) ② (الانبیاء: ۶۳)

③ صحیح بخاری، کتاب التوحید (۷۴۱۰) صحیح مسلم، کتاب الایمان (۱۹۳)۔

④ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء (۳۳۵۸) صحیح مسلم، کتاب الفضائل (۲۳۷۱)۔

قال : وَكَرِهَ قَتَادَةُ تَعَلُّمَ مَنَازِلِ الْقَمْرِ، وَلَمْ يُرَخِّصْ ابْنُ عُيَيْنَةَ فِيْهِ، ذَكَرَهُ حَرْبٌ عَنْهُمَا، وَرَخَّصَ فِيْ تَعَلُّمِ الْمَنَازِلِ اَحْمَدُ وَاِسْحٰقُ .

قتادۃ نے چاند کی منازل کا سیکھنا مکروہ بیان کیا ہے، سفیان بن عیینہ نے بھی اس کی رخصت نہیں دی، ان دونوں سے یہ روایت حرب نے ذکر کی ہے۔ اور امام احمد اور اسحٰق نے چاند کی منازل کو سیکھنے کی رخصت بیان کی ہے۔

=

فَعَلَهُ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا" کی طرح معاریض الافعال کے باب سے تعلق رکھتا ہے۔ اس آیت کو صحیح سمجھنے کے لئے اہلِ عرب کے عادات ومحاورات کو بھی سامنے رکھنا پڑے گا، چنانچہ قتادۃ کہتے ہیں: کہ جو شخص کسی سوچ میں ڈوبا ہوا ہو تو اسے دیکھ کر اہل عرب کہتے ہیں "نَظَرَ فِی النُّجُوْمِ" (یعنی وہ ستاروں میں ڈوبا ہوا ہے۔) جس سے واضح ہوا کہ ابراھیم علیہ السلام کا ستاروں کی طرف دیکھنے کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے انتہائی سوچ کر قوم سے کہا کہ میں بیمار ہوں۔ (ابراھیم علیہ السلام نے یہ سوچا کہ اس وقت پوری قوم تہوار منانے کی غرض سے یہاں سے جانے والی ہے لہذا بیماری کا عذر تراش کر ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دینا مناسب ہے، کیونکہ ان کی عدم موجودگی میں ان کے بتوں کو توڑنا بہت ہی آسان ہو جائے گا۔)

چاند کی منازل جاننے کا حکم

وقوله : وَكَرِهَ قَتَادَةُ تَعَلُّمَ مَنَازِلِ الْقَمْرِ......

واضح ہو کہ یہاں سے مصنف رحمہ اللہ نے علم نجوم کی تیسری چیز کا بیان شروع کیا ہے جو یہ ہے، کہ سورج اور چاند کی منازل کو سیکھنا تا کہ اس کے ذریعے قبلہ کی درستگی، نماز کے اوقات اور مختلف موسموں کی آمد و درفت کا علم ہو سکے۔ مصنف رحمہ اللہ کی تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ اس علم کو بھی سیکھنے میں علماءِ سلف کے درمیان اختلاف پایا جاتا تھا، تو پھر پہلی دو قسموں کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے؟

چاند کی اٹھائیس منزلیں ہیں ہر رات وہ ایک منزل طے کرتا ہے، قتادۃ اور سفیان بن عیینہ نے ان منازل کو سیکھنا ناپسند قرار دیا ہے، جبکہ احمد بن حنبل اور اسحٰق بن راھویہ جواز کے قائل تھے۔

امام خطابی فرماتے ہیں کہ "علمِ نجوم کا وہ حصہ جس کا ادراک مشاہدہ اور خبر سے ممکن ہے وہ نہی کے زمرے میں نہیں آتا، مثلاً: زوال شمس کی معرفت اور اس کے ذریعے جہتِ قبلہ کا تعین وغیرہ۔"

قال :وعن ابی موسی ﷛ قال : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ :" ثَلَاثَۃٌ لَایَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ مُدْمِنُ الْخَمْرِ ، وَقَاطِعُ الرَّحِمِ ، وَ مُصَدِّقٌ بِالسِّحْرِ " (رواہ احمدوابن حبان فی صحیحہ) ①

ابوموسی اشعری ﷛ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ تین شخص جنت میں داخل نہیں ہوسکتے ، ہمیشہ شراب پینے والا ، قطع رحمی کرنیوالا اور جادو کی تصدیق کرنے والا ۔''

علماءِ سلف میں سے امام مجاہد بھی چاند کی منازل سیکھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے ، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس حد تک کے علم میں شرک یا کفر میں مبتلا ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے ۔ ابراھیم النخعی کا قول ہے کہ ''انسان علمِ نجوم سے صرف اتنا حصہ حاصل کرسکتا ہے جس کے ذریعے وہ راستے معلوم کرسکے ۔''

بہرحال جمہور علماء کے نزدیک راستوں کی نشاندہی اور قبلہ کی معرفت کی حد تک علمِ نجوم کا سیکھنا جائز ہے ، اور اس سے زیادہ کچھ حاصل کرنا باطل ہے ۔ جمہور کا یہ قول بالکل صحیح ہے ، مذکورہ بالا آیات اور ان احادیث کی دلالت بھی یہی ہے ۔

حافظ ابن القیم ﷫ نے لکھا ہے کہ ''چاند اور سورج گرہن کے وقت کا تعین بھی جائز ہے ۔''

وقولہ :وعن ابی موسی ﷛ قال : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ :" ثَلَاثَۃٌ ......

یہ حدیث نصوصِ وعید میں سے ہے جن کی تاویل کو علماءِ سلف ناپسند سمجھا کرتے تھے ، ان کا کہنا تھا کہ ان احادیث کو جس مفہوم کے ساتھ وارد ہوئی ہیں برقرار رکھو ۔ جس کا معنی یہ ہے کہ یہ تین کام کرنے والے کبھی جنت میں داخل نہیں ہوسکیں گے ۔ اور احادیث میں موحدین کے جہنم سے نکالے جانے اور جنت میں داخل کئے جانے کا جو ذکر ہے اس سے یہ افراد مستثنیٰ ہے ، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''یہ افراد جنت میں داخل ہو ہی نہیں سکتے'' جبکہ بیشتر علماء نے اس کی تاویل کی ہے ، چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ یا تو یہ وعید ان لوگوں کے حق میں ہے جو ان کاموں کو حلال سمجھتے ہوئے انجام دیں ، پھر تو واقعتاً خلود فی النار ہے ، اور یا پھر اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ ایسے لوگ ابتداءً جنت میں داخل نہیں ہوسکتے بلکہ اپنے جرم کی سزا پاکر ہی جنت میں جاسکیں گے ، اور یہ اس صورت میں ہے جب وہ توبہ کیئے بغیر مرجائیں ۔ مصنف کا میلان پہلے قول کی طرف ہے ۔ (واللہ اعلم)

① مسند احمد (١٩٤٦١) اس کو امام حاکم (٤/ ١٤٦ ، ١٤٧) نے صحیح کہا ہے، اور امام ذھبی نے اس کی موافقت کی ہے، اور ابن حبان (١٣٨٠) نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ سنن نسائی (٢٥٦١) سلسلة الصحيحة (٦٧٣،٦٧٤،٩٧٥)۔

علمِ نجوم کا جادو سے تعلق

اس حدیث کو اس باب میں لانے کا مقصد علمِ نجوم کی حرمت اور اسے سیکھنے کی وعید بیان کرنا ہے، چنانچہ یہ وعید رسول اللہ ﷺ کے فرمان: "مُصَدِّقٌ بِالسِّحْرِ" یعنی''جادو کی تصدیق کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوسکتا'' میں موجود ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ علمِ نجوم جادو ہی کا ایک حصہ ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جس نے علمِ نجوم کا ایک باب سیکھا اس نے جادو کا ایک باب سیکھ لیا۔''

نتیجہ یہ نکلا کہ نجومی بھی جنت میں نہیں جا سکتے۔



اس باب کے مسائل

(۱) ستاروں کی تخلیق کی حکمت معلوم ہوئی۔

(۲) ستاروں کی تخلیق کی جو حکمتیں بیان کی گئی ہیں ان کے سوا کسی اور حکمت کا سمجھنا باطل اور مردود ہے۔

(۳) چاند کی منازل کا علم سیکھنے کے متعلق علماءِ سلف کے درمیان پایا جانے والا اختلاف ذکر کیا گیا۔

(۴) جو شخص کسی قسم کے جادو کی تصدیق کرے اس کی وعیدِ شدید یعنی جنت میں کبھی نہ جانے کا بیان ہوا، اگر چہ وہ شخص جادو کے باطل ہونے کو جانتا بھی ہو مگر پھر بھی کسی قسم کے جادو کی تصدیق اس وعید شدید کا نشانہ بنا دیتی ہے۔



باب ماجآء فی الاستسقاء بالانواء

پچھتر یعنی ستاروں کی منازل سے بارش طلب کرنے کا حکم

قال :وقول اللہ تعالیٰ :﴿ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ ①

''اور اپنے حصے میں یہی لیتے ہو کہ جھٹلاتے پھرو''

اس باب کے انعقاد کا مقصد اس وعید شدید کا بیان ہے، جس کا وہ لوگ نشانہ بنیں گے جو بارش کی نسبت منازلِ قمر کی طرف کرتے ہیں ۔ابو السعادات نے لکھا ہے کہ'' چاند کی اٹھائیس منزلیں ہیں، چاند ہر رات ان منازل میں کسی ایک منزل میں ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ ﴾ ②

''اور چاند کی ہم نے منزلیں مقرر کر رکھی ہیں''

ہر تیرہ راتوں کے بعد مغرب میں طلوع فجر کے وقت ایک منزل گر جاتی ہے، اور اسکے مقابلہ میں اسی وقت مشرق میں دوسری منزل طلوع ہو جاتی ہے، اس طرح ایک سال کی مدت میں تمام منازل طے ہو جاتی ہیں ۔

اہل عرب کا خیال یہ تھا کہ ایک منزل کے گرنے اور دوسری کے ابھرنے کے ساتھ بارش ہوتی ہے، چنانچہ وہ انہی منازل کی طرف بارش کی نسبت کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے :'' مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا ''

''ہمیں فلاں ستارے یا منزل (پچھتر) سے بارش دی گئی ہے''

آیتِ قرآنی سے استدلال

قوله :وقول اللہ تعالیٰ : وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ....

یعنی :تم اپنے شکر کا اظہار اس صورت میں کرتے ہو کہ تم جھٹلاتے ہو۔

اس آیت کی یہ تفسیر رسولِ اللہ ﷺ سے منقول ہے، چنانچہ مسند احمد، ترمذی اور المختارۃ وغیرہ میں ہے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا:''وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ [الواقعة:۸۲] يَقُوْلُ شُكْرَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ يَقُوْلُوْنَ مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا وَبِنَجْمِ كَذَا وَكَذَا '' ③

=

① (الواقعة : ۸۲) ② (یس : ۳۹)

③ مسند احمد (۸٤۹،٦۷۷) ترمذی (۳۲۹۵) امام ترمذی نے اسے ''حسن غریب صحیح ''کہا ہے۔ابن جریر نے (۲۷/ ۱۱۹/ ۱۲۰) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی روایت موقوفا روایت کی ہے، اور اس کی سند صحیح ہے۔اور مسند احمد میں بھی یہ روایت برقم (۸۵۰) سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے ''احمد شاکر رحمہ اللہ نے اسے '' صحیح الإسناد ''قرار دیا ہے''ابن کثیر (٤/ ۲۹۹) اور ابن حجر (الفتح،۲/ ۵۲۲) نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔

قال عن ابی مالك الاشعری ﷺ ان رسول الله ﷺ قال :" اَربَعٌ فِی اُمَّتِی مِنْ اَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ لَايَتْرُكُونَهُنَّ ، اَلْفَخْرُ بِالْاَحْسَابِ ، وَالطَّعْنُ فِی الْاَنْسَابِ ، وَالْاِسْتِسْقَاءُ بِالنُّجُومِ ، وَالنِّيَاحَةُ . وَقَالَ: اَلنَّائِحَةُ اِذَالَمْ تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِهَا تُقَامُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِّنْ قَطِرَانٍ وَدِرْعٌ مِّنْ جَرَبٍ"(رواہ مسلم) ①

سیدنا ابو مالک الاشعری ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت میں جاہلیت کی چار باتیں ایسی ہیں جنہیں وہ کبھی بھی نہ چھوڑیں گے ۔(۱) اپنے حسب ونسب پر فخر (۲) دوسروں کے نسب پر طعنہ زنی (۳) ستاروں سے بارش کا اعتقاد رکھنا (۴) نوحہ خانی ۔''

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ نوحہ کرنے والی عورت اگر موت سے پہلے توبہ نہ کرسکی تو اسے قیامت کے دن اس حال میں کھڑا کیا جائے گا کہ اس پر تارکول کا کرتا اور خارش کی زرہ لپٹی ہوگی ۔''

=

یعنی اس آیت میں رزق بمعنی شکر ہے، چنانچہ معنی یوں ہوگا '' کہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں اظہار شکر کا یہ طریقہ اپناتے ہو کہ تم اس نعمت کا من جانب اللہ ہونے کا انکار کرتے ہو، کہ ہمیں فلاں ستارے یا فلاں نچھتر سے بارش دی گئی ہے ۔''

اس آیت کریمہ سے واضح ہوا کہ بارش کی نسبت اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ستاروں وغیرہ کی طرف کرنا اسبابِ کفر وشرک میں سے ہے ۔اور مصنف رحمہ اللہ کا اس باب کے انعقاد سے یہی مقصود تھا جو بدرجہ اتم پورا ہو چکا ۔

ایک انتہائی توجہ طلب حدیثِ رسول ﷺ

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے چار نافرمانیوں کا ذکر فرمایا جو ہمیشہ امت میں موجود رہیں گی خواہ وہ نافرمانیاں ان سے انجانے میں سرزد ہوں یا جانتے بوجھتے ہوں ،رسول اللہ ﷺ نے نافرمانیوں کو امورِ جاہلیت قرار دیا ہے ۔جاہلیت سے مراد آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے کا دور ہے ، نیز ہر وہ چیز جاہلیت ہے جو انبیاء ومرسلین کی تعلیمات کے خلاف ہو ، چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے خلاف جو بھی اقوال واعمال ہونگے ، انہیں بنانے والا بھی جاہل اور اپنانے والا بھی جاہل ،اور دینِ اسلام جس چیز کو امرِ جاہلیت قرار دے دے اس سے اس کا مقصود اظہارِ مذمت وشناعت ہوتا ہے ۔وہ چار چیزیں درج ذیل ہیں ۔

① صحيح مسلم ، كتاب الجنائز (٩٣٤).

(۱) اپنے آباؤ اجداد کے فضائل اور مناقب اور ان کے کارناموں پر فخر کرنا، اور انہیں اپنے لئے شرف کا باعث سمجھنا، یہ بہت بڑی جہالت ہے، کیونکہ انسان کے لئے ذاتی شرف کا باعث اس کا اپنا تقویٰ اور عملِ صالح ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَآ اَمۡوَالُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ بِالَّتِیۡ تُقَرِّبُكُمۡ عِنۡدَنَا زُلۡفٰۤی اِلَّا مَنۡ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ﴾ ①

''اور تمہارے مال اور اولاد ایسی چیزیں نہیں جو تمہیں ہم سے قریب کردیں، ہم سے قریب تو وہ ہے جو ایمان لے آیا اور عمل صالح کی زندگی گزار گیا''

ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿ اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰٮكُمۡ ﴾ ②

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم سب سے بڑا معزز وہی ہے جو سب سے بڑا پرہیز گار ہو''

ابوداؤد میں سیدنا ابوہریرۃ ﷛ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کا غرور اور آباؤاجداد کے ساتھ فخر کو تم سے اٹھالیا، اب انسان یا تو مومن اور پرہیز گار ہے، اور یا پھر فاجر اور بدبخت ہے، تمام انسان اولاد آدم ہیں اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، لوگوں کو چاہیے کہ وہ ان اقوام کے ساتھ فخر کرنا چھوڑ دیں جو جہنم کا کوئلہ بن چکی ہیں وگرنہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناک سے گندگی دھکیلنے والے کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہوجائیں گے۔'' ③

(۲) اس حدیث میں امر جاہلیت کے سلسلے میں جس دوسری چیز کا بیان ہے وہ دوسروں کے نسب میں عیب جوئی اور طعنہ زنی ہے، جیسے کسی شخص کا یہ کہنا کہ فلاں شخص فلاں کی ذریت سے نہیں ہے۔ یا کسی شخص کا کسی انسان کو اس کے آباؤاجداد میں پائے جانے والے عیوب ومطاعن کا ذکر کے طعنہ دینا۔ ایک موقعہ پر سیدنا ابوذر ﷛ نے ایک شخص کو اس کی ماں کے عیب کو ذکر کے عار دلائی تو رسول اللہ ﷺ نے ابوذر ﷛ سے فرمایا:
"أَعَيَّرْتَهُ بِأُمِّهِ ؟اِنَّكَ اِمْرُؤٌ فِيْكَ جَاهِلِيَّةٌ" ④

یعنی: ''کیا تم نے اسے اس کی ماں کی عار دلائی ہے؟ بے شک تمہارے اندر جاہلیت پائی جاتی ہے''

شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ ''اس حدیث سے پتا چلا کہ کسی کو اس کے نسب کی عار دلانا جاہلیت کے اخلاق وخصائل میں سے ہے، اور یہ بھی پتا چلا کہ انسان بعض اوقات اپنے علم وفضل اور دین کے باوجود جاہلیت کی اس خصلت کا شکار ہوجاتا ہے جس سے اس کا کفر یا فسق ہرگز لازم نہیں آتا۔''

① (سبا: ۳۷) ② (الحجرات: ۱۳)

③ مسند احمد (۸۷۴۴) سنن ابوداؤد (۵۱۱۶) سنن ترمذی (۳۹۵۵) امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔

④ حدیث کا جزء ہے۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان (۳۰) صحیح مسلم، الایمان (۱۶۶۱) الفاظ صحیح بخاری کے ہیں۔

(۳) اس حدیث میں بیان شدہ جاہلیت کی تیسری خصلت ستاروں سے بارش کا اعتقاد رکھنا ہے۔ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس اعتقاد میں امت کے بکثرت ملوث ہونے کے خدشہ کا اظہار فرمایا۔ ①

واضح ہو کہ ستاروں سے بارش کے اعتقاد کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم یہ ہے کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ بارش کو اتارنے والا صرف ستارہ ہے۔اس قسم کا اعتقاد بالکل ظاہر اور واضح کفر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا خالق نہیں ہے، مشرکین مکہ بھی اس حقیقت کا ادراک واعتراف رکھتے تھے کہ بارش برسانے والا ایک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ﴾ ②

''اور اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمان سے پانی کس نے اتارا ہے، اور پھر اس کے ذریعے بنجر زمین کو زرخیز کر دیا، تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے''

بہرحال ستاروں کے بارے میں بارش برسانے کا عقیدہ رکھنے والا کافر ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے اُسکے اس امت میں ہمیشہ رہنے کی خبر دی ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ بارش کے نزول کی نسبت تو ستارے کی طرف ہو، لیکن دوسری طرف یہ عقیدہ ہو کہ اس بارش کو برسانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے فلاں ستارے کے ظہور کو بارش کے نزول کا سبب بمنزلۂ عادت بنا دیا ہے۔اگرچہ اس کے جواز یا عدم جواز میں علماءِ سلف کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس عقیدے کو اپنانا بھی حرام ہے، کیونکہ اس قسم کا اعتقاد شرکِ خفی کے زمرے میں آتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی قسم کو "استسقاء بالنجوم" ستاروں کی منازل سے بارش طلب کرنا'' قرار دیا ہے، اور اسے امرِ جاہلیت قرار دیا ہے، یہی سابقہ مشرکین کا عقیدہ تھا اور آج تک اس امت میں پایا جاتا ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ جب ستاروں کی طرف بارش کی نسبت کرنا ایک حرام کام ہے تو پھر براہ راست مردوں کو پکار کر ان سے رزق، نصرت اور عافیت کا سوال کرنا بالاولیٰ حرام ہوگا، اور یقیناً حرام ہے، کیونکہ یہ فعل سراسر شرکِ اکبر ہے خواہ براہ راست ان سے طلب کرے یا انہیں سفارشی کی حیثیت سے پیش کرے، ان دونوں کا شرک ہونا قرآن وحدیث کے محکم اور قطعی نصوص سے معلوم ہے۔

① حسن لغیرہ۔ابن عبدالبر رحمہ اللہ "الجامع"(۲/۳۹) فیض القدیر (۱/۲۰۴)
② (العنکبوت: ۶۳)

(۴) چوتھے نمبر پر نوحہ خوانی کو امرِ جاہلیت قرار دیا گیا ہے۔نوحہ کا معنی یہ ہے کہ کسی کے انتقال پر بلند آواز سے آہ و بکاء کرنا، کیونکہ اس طرح رونے دھونے میں اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر سے ناراضگی اور مخالفت ومعارضت کا اظہار ہوتا ہے، نیز اللہ رب العزت کے ساتھ سوءِ ادب کا پہلو بھی ہے، لہذا رسول اللہ ﷺ نے اسے امر جاہلیت قرار دیکر انتہائی معیوب اور قابلِ مذمت حرکت قرار دیا، ایسا معاملہ تو ایک غلام بھی اپنے آقا کے ساتھ روا نہیں رکھتا، چہ جائیکہ اس پروردگار کے ساتھ جو خالق و مالک ہے جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں جس کا ہر فیصلہ عدل وانصاف پر مبنی ہے۔

نوحہ خوانی کے قابلِ مذمت ہونے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے وہ اجر وثواب جو صبر کرنے کی صورت میں ملتا ہے جاتا رہتا ہے، گویا صدمہ بھی لاحق ہوگیا اور اجر وثواب بھی نہ مل سکا۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے نوحہ خواں عورت جو توبہ کے بغیر ہی مرجائے کا ہیبت ناک اور دردناک انجام بیان فرمایا۔جس میں اس امر کی دلیل ہے کہ جو شخص اپنے گناہ سے سچی توبہ کرلے تو وہ وعید اور مذمت کا نشانہ بننے سے بچ جاتا ہے۔اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے جس پر کوئی شرعی وعید وارد ہے، تو اس شخص معین پر اس شرعی وعید کے لاحق ہونے کا فتویٰ لگانا یا فیصلہ صادر کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ گناہوں کی سزاؤں کا ختم ہوجانا ممکن ہے، جس کی کئی صورتیں ہیں، ممکن ہے اس نے توبہ کرلی ہو یا ایسی نیکیاں کرلی ہوں کہ جن کی وجہ سے اس کا وہ گناہ مٹا دیا گیا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ﴾ ①

''یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کردیتی ہیں''

یا پھر اس پر کچھ ایسے مصائب نازل ہوئے ہوں جو اس کے گناہوں کا کفارہ بن گئے ہوں، پھر مزید برآں مومنوں کا ایک دوسرے کے حق میں مغفرت ورحمت کی دعائیں کرنا بھی بخشش کا سبب بن سکتا ہے، نیز نبی ﷺ کی شفاعت یا پھر سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا عفو و درگزر بھی مغفرت ذنوب کے اسباب میں سے ہے۔

اس حدیث میں موت سے پہلے توبہ کا ذکر ہے جس کے صحیح وقت کی نشاندہی ایک دوسری حدیث میں ہے، چنانچہ مسند احمد اور ترمذی وغیرہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

=

① (هود: ١١٤)

قـال :ولهما عن زيدبن خالد قال: صَلّٰى لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةَ الصُّبْحِ بِالْحُدَيْبِيَّةِ عَـلٰى اِثْرِسَمَاءٍ كَانَتْ مِنَ اللَّيْلِ فَلَمَّا انْصَرَفَ اَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ :"هَلْ تَدْرُوْنَ مَاذَا قَـالَ رَبُّكُمْ؟ قَالُوْا: اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ، قَالَ :أَصْبَحَ مِنْ عِبَادِيْ مُؤْمِنٌ بِيْ وَكَافِرٌ ، فَاَمَّا مَـنْ قَـالَ :مُـطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهٖ فَذٰلِكَ مُؤْمِنٌ بِيْ كَافِرٌ بِالْكَوْكَبِ ، وَاَمَّامَنْ قَالَ: مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا ، فَذٰلِكَ كَافِرٌ بِيْ مُؤْمِنٌ بِالْكَوْكَبِ "①

بخاری ومسلم میں زید بن خالد الجہنی المدنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن ہمیں حدیبیہ کے مقام پر فجر کی نماز پڑھائی جبکہ اس رات کو بارش بھی ہوئی تھی ، سلام پھیر کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا:

=

''کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتا ہے جب تک اس کی جان اس کے حلق میں نہ پھنس جائے۔'' ②

اس حدیث مبارک میں نوحہ خواں عورت کے جس دردناک انجام کا ذکر ہے وہ یہ ہے کہ اسے جب قبر سے اٹھایا جائے گا تو اس کے جسم پر تارکول یا پگھلے ہوئے تانبے اور خارش کا لباس لپٹا ہوگا، اس سے اس نوحہ کی مذمت وشناعت اور اس کے انتہائی قابل نفرت گناہ ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ علامہ ثعلبی اپنی تفسیر میں لائے ہیں کہ ''امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک نوحہ خواں عورت کی آواز سن کر اس کے پاس گئے، اور اسے کوڑے سے مارنا شروع کر دیا حتیٰ کہ اس کی چادر گرگئی، کہا گیا: امیر المؤمنین یہ عورت ہے اور بے پردہ ہو چکی ہے تو آپ نے جواب دیا: کہ یہ کسی حرمت وعزت کی مستحق نہیں ہے۔''

سفرِ حدیبیہ میں پیش آنے والے ایک قصہ کی تفسیر (دعوتِ غور وفکر)

وقوله :ولهما عن زيدبن خالد قال: صَلّٰى لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ......

یہ ایک حدیث قدسی ہے، جسے بقول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے بالواسطہ یا بلا واسطہ حاصل کیا ہے۔

---

① صحيح بخارى، كتاب الاستسقاء (١٠٣٨) صحيح مسلم، كتاب الايمان (٧١) الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔

② حسن ـ مسنداحمد (٦١٦٨، ٦٤١٧) سنن ترمذی (٣٥٣٧) امام ترمذی نے اسے "حسن غریب" کہا ہے۔ سنن ابن ماجه (٤٢٥٣) التعليق الرغيب (٤/٧٥) المشكاة (٢٣٤٣/ التحقيق الثانى) ابن جرير (٤/٢٠٥)۔

اس کا علم اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ہی کو ہے، فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میرے بندوں میں سے کچھ نے ایمان لاتے ہوئے، اور کچھ نے کفر اختیار کرتے ہوئے آج صبح کی ہے۔ جس شخص نے یہ کہا کہ ہمیں اللہ کے فضل و رحمت سے یہ بارش دی گئی ہے تو وہ مجھ پر ایمان لے آیا، اور ستاروں کے تصرف کا انکاری ہوگیا، اور جس نے یوں کہا کہ ہمیں فلاں اور فلاں ستارے سے بارش دی گئی ہے تو اس نے میرے ساتھ کفر کیا اور ستارے پر ایمان لے آیا۔''

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ نے بارش کے تعلق سے دو قسم کے ذہن پیش کئے۔ کچھ تو اس بارش کے نزول کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت قرار دیتے ہیں، اور اپنے عقیدے اور اپنے ایمان کو برباد ہونے سے بچا لیتے ہیں، جبکہ کچھ لوگ اس بارش کو ستاروں کی طرف منسوب کردیتے ہیں جس سے کفرانِ نعمت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرنے کا گناہ لازم آتا ہے۔

واضح ہو کہ حدیث زیر بحث اور اس معنی کی دیگر بہت سی احادیث کے مطالعہ اور ان کے اسلوب پر غور وفکر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ستاروں کو محض سبب قرار دینا کفر ہے، اگر ایسے شخص کا عقیدہ یہ ہو کہ بارش برسانے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے، یہ کفرِ اصغر ہے جبکہ یہ عقیدہ رکھنا کہ ستارے ہی بارش برسانے والے ہیں کفرِ اکبر ہے۔ بعض لوگ اس حدیث کا محمل یہی قرار دیتے ہیں کہ اس حدیث میں بارش کا خالق ستاروں کو ماننے والا کافر بتلایا گیا ہے، لیکن یہ محمل غلط ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کافروں کا قول یوں نقل کیا جاتا کہ فلاں ستارے نے ہم پر بارش نازل کی، حالانکہ حدیث کے الفاظ ہیں: ''کہ فلاں ستارے کے سبب سے ہمیں بارش دی گئی''، جس کا معنی یہ ہے کہ وہ ستاروں کو بارش کا صرف سبب قرار دیتے تھے، خالق اور مالک اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہی قرار دیتے تھے اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتقاد پر کفر کا اطلاق فرمایا۔ ثابت ہوا کہ بارش کے نزول کو اللہ تعالیٰ کی تخلیق سمجھنے والا اگر اس بارش کی نسبت ستارے کی طرف کردے تو اس نے کفر کا ارتکاب کیا، لیکن یہ شرک اصغر ہے، جبکہ ستاروں ہی کو بارش کا خالق و فاعل ماننا کفرِ اکبر ہے۔

امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اہل جاہلیت ستاروں کو بارش کے نزول کا واسطہ ٹھہراتے تھے، یا تو اس نظریہ کے ساتھ کہ یہ بارش ستاروں ہی کی پیدا کردہ ہے اور یا پھر اس نظریہ کے ساتھ کہ فلاں ستارے کا طلوع ہونا بارش کے نزول کی علامت ہے۔ شریعت نے ان کے اس قول کو یکسر باطل قرار دیا اور اسے کفر کہا۔ لہذا اگر تو بارش کے سلسلے میں ستاروں کا اعتقاد رکھنے والے کا نظریہ یہ ہے کہ ستارے ہی اس بارش کو بنانے اور برسانے والے ہیں، تو ایسے شخص کا یہ کفر، کفرِ شرک کہلائے گا، اور اگر وہ ستاروں کو بارش کا خالق تو نہیں

سمجھتا لیکن یہ ضرور کہتا ہے کہ میرا تجربہ کہتا ہے کہ فلاں ستارے کا طلوع ہونا بارش کے نزول کا سبب ہے، تو یہ قول کفر اور شرک کے زمرے میں تو نہیں آتا، البتہ کفرانِ نعمت مراد لیتے ہوئے ایسے شخص کو کافر ہی کہا جائے گا، کیونکہ اس حدیث کے کسی بھی طریق میں کفر اور شرک کے درمیان کوئی واسطہ مذکور نہیں ہے۔ لہذا حدیث میں بیان کردہ کفر کو ان دونوں معنوں پر محمول کیا جائے گا۔''

امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ''جس شخص نے "مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا" کہا اور اس کی مراد یہ ہے کہ ہمیں فلاں ستارے کے طلوع کے وقت بارش دی گئی، تو یہ کفر نہیں ہوگا، لیکن اس قسم کی بات کہنا میرے نزدیک کوئی زیادہ پسندیدہ نہیں ہے۔''

امام شافعی رحمہ اللہ کے اس قول کو اس قسم کا جملہ کہنے کے جواز کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا، کیونکہ ان کا یہ فرمانا، کہ ''ایسا کہنا کفر نہیں ہے'' سے مراد یہ ہے کہ کفرِ شرک نہیں ہے، جبکہ ایسا کہنے کو انہوں نے پسند بھی نہیں کیا۔

بہر حال ستاروں کی طرف بارش کی نسبت کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ حدیث میں اسی نسبت کی ممانعت کی گئی ہے، اگر چہ یوں کہنے والے کا عقیدہ یہی ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی بارش برسانے والا ہے۔ یہ چیز الفاظ کے اعتبار سے شرکِ خفی ہے۔ جبکہ بارش کے نزول کا سبب اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کو قرار دینا اور اسی ذاتِ وحدہ لاشریک لہ کو مستحقِ حمد سمجھنا اور یہی اعتقادِ جازم رکھنا، پختہ ایمان کی علامت ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک اور حدیث میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: " فَأَمَّا مَنْ حَمِدَنِي عَلَى سُقْيَايَ وَأَثْنٰى عَلَيَّ فَذَاكَ مَنْ آمَنَ بِي "

''جو میری بارش سے سیراب کرنے کی نعمت پر میری حمد و ثناء بیان کرے، اس کے ایمان میں تازگی اور بہار آ گئی۔''

لہذا مخلوق کو ہر نعمت، خالقِ حقیقی کی طرف منسوب کرنی چاہئے اور غیر اللہ کی طرف منسوب کرنے سے خوب اجتناب و احتراز کرنا چاہئے، کیونکہ یہ چیز شرکِ خفی کے زمرے میں آتی ہے...... جبکہ بالخصوص بارش کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا عقیدۂ توحید کا زبردست مظہر ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ بندہ بارش اور بارش سے پیدا ہونے والی تمام نعمتوں کا فاعل، خالق اور مسبب صرف اللہ تعالیٰ کو قرار دیتا ہے۔

قال :ولهما من حديث ابن عباس رضی اللہ عنہما معناه . وفيه قَالَ بَعْضُهُمْ : لَقَدْ صَدَقَ نَوْءُ كَذَا وَكَذَا ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ هٰذِهِ الْآيَةَ : ﴿ فَلَآ أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ .... تُكَذِّبُوْنَ ① ﴾ ②

بخاری شریف و مسلم شریف میں مذکورہ حدیث کے معنی کی ایک روایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، اس روایت میں یہ بھی ہے کہ بارش کے نزول پر بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ فلاں فلاں ستارے سچے ثابت ہوئے، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائی: ''میں ستاروں کے گرنے کی قسم کھاتا ہوں، اور یہ قسم اگر تم سمجھو تو بہت بڑی ہے۔ بے شک یہ عزت وشان والا قرآن ہے، محفوظ کتاب میں ہے، جسے صرف پاک فرشتے ہی چھو سکتے ہیں، اور یہ رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے، کیا تم اس بات سے سستی کرتے ہو اور اپنا شکر یہ جھٹلانے کی صورت میں کرتے ہو''

آیت ﴿ فَلَآ أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ .... ﴾ کی تفسیر وشانِ نزول

وقوله :ولهما من حديث ابن عباس رضي الله عنهما معناه ......

اس حدیث کو یہاں پیش کرنے کا مقصد آیتِ کریمہ ﴿ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ کے تعلق سے ہے، جس کا معنی ومفہوم گزر چکا ہے۔ یہاں شان نزول کا بیان مقصود ہے، جو یہ ہے کہ بارش کے نزول کے بعد بعض لوگوں نے بعض ستاروں کے سچا ثابت ہونے کا عقیدہ ظاہر کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا۔

ان آیات کا معنی عام یہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے "مواقع نجوم" کی قسم بیان فرمائی، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے کسی بھی مخلوق کی قسم بیان کرسکتا ہے، یہ قسم مُقسم بہ کے ساتھ ساتھ مُقسم علیہ یعنی مابعد مذکور مسئلہ کے شرف وعظمت کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کو ایک بڑی قسم قرار دیا ہے، اور جوابِ قسم یہ ذکر فرمایا: کہ یہ قرآن پاک بڑی عزت اور شان والی کتاب ہے جس کی خیر وبرکت بے شمار اور بے اندازہ ہے اور جو ایک انتہائی پاکیزہ دفتر یعنی ''لوح محفوظ'' میں بحفاظت موجود ہے۔

" کتاب مکنون" سے بعض مفسرین نے وہ کتاب بھی مراد لی ہے جو فرشتوں کے ہاتھوں میں ہے اور جس کا ذکر قرآن کی ان آیات میں بھی ہے:

﴿ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ . مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ . بِأَيْدِيْ سَفَرَةٍ . كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴾ ③

''یہ تو پر عظمت صحیفوں میں ہے، جو بلند وبالا اور پاک صاف ہے، ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہے جو بزرگ اور پاک باز ہیں۔''

① (الواقعة : ٧٥تا٨٢) ② صحيح مسلم، كتاب الإيمان(٧٣). ③ (عبس: ١٣تا١٦)

اور اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آگے فرمایا کہ اسے صرف فرشتے ہی چھو سکتے ہیں۔ پھر یہ قرآن پاک اللہ رب العالمین کی تنزیل ہے، لہذا مشرکین کا اسے جادو یا کہانت یا شعر قرار دینا غلط ہوا۔

واضح ہو کہ ستاروں کی قسم کے بعد مُقسم علیہ یعنی قرآن پاک کے ذکر کرنے میں بڑی لطیف مناسبتیں اور حکمتیں ہیں، جنہیں امام ابن القیم رحمہ اللہ نے بڑے مؤثر پیرائے میں تحریر فرمایا ہے، ان کے کلامِ نفیس کا خلاصہ یہ ہے:

''ستاروں اور قرآن مجید میں اول الذکر کو بطور قسم اور ثانی الذکر کو بطور مقسم علیہ ذکر کرنے میں پہلی مناسبت یہ ہے کہ جس طرح ستاروں کو اللہ تعالیٰ نے ظلماتِ بر و بحر میں راہنمائی کا نشان و معیار قرار دیا ہے، اسی طرح قرآن حکیم کو ضلالات و جہالات کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں ہدایت کا مینارۂ نور قرار دیا ہے، گویا ستارے حسی ظلمات میں ہدایت و راہنمائی کا جبکہ قرآن (وسنت) معنوی ظلمات میں ہدایت و راہنمائی کا کام کرتے ہیں۔

دوسری مناسبت یہ ہے کہ جگمگاتے ستارے اس عالم فانی کے ظاہری حسن و زینت کا باعث بنتے ہیں، جبکہ قرآن مجید باطنی زینت کا شاہکار ہے کہ اسے پڑھنے اور سمجھنے والے کا دل نور و حلاوتِ ایمانی سے منور و معطر ہو جاتا ہے۔

تیسری مناسبت یہ ہے کہ ستارے ان شیاطین پر کہ جو آسمانی خبریں اچک کر اپنے زمینی چیلوں اور گماشتوں کے ساتھ مل کر الحاد پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں پر وار کر کے حفاظت دین کا کردار ادا کرتے ہیں، اور قرآن حکیم کی آیاتِ بینہ اور دلائل باھرہ تمام شیاطین جن و انس کے عزائم مکروھہ واھواءِ باطلہ وضالہ پر ضربِ کاری کا کام کرتے ہیں۔

چوتھی مناسبت یہ ہے کہ ستارے اللہ تعالیٰ کی مرئی و دیدنی آیات ہیں جن کا مشاہدہ و نظارہ نگاہوں کی تسکین کا باعث ہے، جبکہ قرآن مجید کی آیات متلو اور مسموع ہیں، جن کی تلاوت زبان میں اور سماعت کانوں میں حلاوت کا رس گھولتی ہے۔ پھر ستاروں کے مواقعِ غروب بڑی عبرتوں کے حامل ہیں اور قرآن مجید کے مواقع نزول بھی عِبَر و نصائح کا مرقع ہیں۔''



اس باب کے مسائل

(۱) سورۂ واقعہ کی آیت ﴿ وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ..... ﴾ کی تفسیر بیان ہوئی۔

(۲) ان چار امور کا ذکر کیا گیا جو دورِ جاہلیت سے متعلق ہیں۔

(۳) ان امور میں سے بعض امور میں کفر کی نشاندہی بھی کی گئی۔

(۴) یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ کچھ کفر ایسے ہیں جو انسان کو دین سے خارج نہیں کرتے (جیسا کہ کفر نعمت کا بیان کیا گیا ہے۔)

(۵) رسول اللہ ﷺ کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرمانا: ''کہ آج میرے بندوں میں سے کچھ مومن اور کچھ کافر ہو گئے'' اس کا سبب بارانِ رحمت کا نزول ہے۔ (مقصد یہ ہے کہ بعض اوقات رحمت اور نعمت کا نزول کچھ بندوں کے مبتلائے کفر ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔)

(۶) اس حدیث میں ایمان کے ذکر کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے۔

(۷) نیز اس حدیث میں جس کفر کا ذکر ہے اسے بھی بخوبی سمجھنا چاہئے۔ (یہاں ایمان سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اسی کی طرف منسوب کر کے اس کا شکر بجالانا، جبکہ کفر سے یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو غیر اللہ مثلاً: ستاروں وغیرہ کی طرف منسوب کرنا۔)

(۸) مشرکین کے اس قول "لَقَدْ صَدَقَ نَوْءُ كَذَا وَكَذَا" کا مفہوم اچھی طرح سمجھنا چاہئے (یعنی بارش کے نزول پر مشرکین کہا کرتے تھے کہ فلاں ستارہ سچا ثابت ہوا، اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس ستارے کے طلوع کو بارش کے نزول کا سبب سمجھتے تھے، چنانچہ جب بارش ہوتی تو وہ اس بارش کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق سمجھتے، اس کے باوجود ستارے کی طرف منسوب کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی بجائے ستارے کی تعریف میں مشغول ہو جاتے)

(۹) یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک عالم کسی مسئلہ کی تعلیم کے لئے استفہامی اسلوب پیش کر سکتا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا تھا کہ ''تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟''

(۱۰) نوحہ کرنے والی عورت کی سزا معلوم ہوئی۔



باب

اللہ تعالیٰ کی محبت دین کی بنیاد ہے

قول اللہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللهِ أَنْدَاداً يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللهِ ﴾ ①

''کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے دوسروں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہم مثل بنالیا، اور ان سے اللہ تعالیٰ جیسی محبت کرنے لگ گئے، اور وہ لوگ جو ایمان لائے سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے ہیں۔''

اس باب کے انعقاد سے مصنف رحمہ اللہ کا مطمع نظر یہ ثابت کرنا ہے کہ تمام انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی محبت فرضیت و وجوب کا درجہ رکھتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت دین اسلام کی اصل اور بنیاد ہے، اس کی تکمیل سے ایمان مکمل ہو جاتا ہے جبکہ اس میں ذرہ برابر نقص سے انسان کی توحید اور ایمان میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث میں اللہ تعالیٰ کی محبت کو واجب قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ سے محبت کرو! کہ وہ تمہیں نعمتیں عطا فرماتا ہے۔'' ②

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے: ''اپنے مکمل دلوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے محبت کرو'' ③۔

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آپ ﷺ کی یہ دعا مذکور ہے ''وَأَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ يُقَرِّبُنِي إِلَى حُبِّكَ'' (رواه الترمذی وصححه) ④

''اور میں تجھ سے تیری محبت کا سوال کرتا ہوں، اور ان لوگوں کی محبت کا بھی سوال کرتا ہوں جو تجھ سے محبت رکھتے ہیں، نیز ایسے عمل کی محبت کا بھی طلب گار ہوں جو تیری محبت سے قریب تر کر دے''

اللہ تعالیٰ کی محبت کے متعلق امام ابن قیم رحمہ اللہ کا انتہائی نفیس کلام

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کی محبت کے بارہ میں کیا خوب فرمایا ہے: ''اللہ تعالیٰ کی محبت ایک ایسا مقام ہے کہ جس میں تمام رغبت کرنے والے رغبت کرتے رہے ہیں، اس کی خاطر تمام سبقت لیجانے والے

---

① (البقرة: ۱٦٥)

② ضعیف: تاریخ الکبیر، للبخاری (۱/۸۳) سنن ترمذی (۳۷۸۹) مستدرك حاكم (۳/۱٤۹) حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ لیکن اس کی سند میں عبد بن سلیمان النوفلی راوی مجہول ہے۔ المیزان (۲/٤۳۲) الضعفاء (۲۱۹۸)۔

③ مرسل، ضعیف: دلائل النبوة، للبیهقی۔ دیکھیئے الدر المنثور (۳/٦۷)۔

④ سنن ترمذی (۳٤۹۰) مستدرك حاكم (۲/٤۳۳) سلسلة الصحيحة (۷۰۷)۔

مستعد و کمر بستہ رہتے ہیں، اور اسی بلند مرتبہ پر قائم و فائز رہ کر محبت کرنے والوں نے اپنی زندگیوں کو فنا کر دیا، یہ قلوب و ارواح کی غذا ہے، اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اور یہ ایک ایسی زندگی ہے کہ اس سے محروم رہنے والے کا شمار مُردوں میں ہوتا ہے، یہ ایک ایسا نور ہے کہ جسے کھو دینے والا ہمیشہ تاریکیوں کے سمندر میں غوطے کھاتا رہتا ہے، ایک ایسی شفاء ہے کہ جس کے نہ ہونے سے تمام بیماریاں دل پر حملہ آور ہوتی جاتی ہیں، اور یہ ایک ایسی لذت ہے جو اسے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا اس کی پوری زندگی ہموم وغموم اور تکالیف وآلام کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت ایمان واعمال اور مقامات واحوال کی روح ہے کہ اس سے محروم رہنے والی ہر چیز اس جسم کی مانند ہے جس میں روح نہ ہو، یہ محبت راہ چلتوں کے بوجھ اٹھا کر انہیں باآسانی منزلِ مقصود پر پہنچا دیتی ہے، اور ایسے منازل تک پہنچانے کے شرف سے مشرف کرتی ہے کہ اگر محبت نہ ہوتی تو وہاں تک پہنچنے کا کوئی تصور نہ ہوتا، اور یہ محبت جنت میں ایسے مقام پر پہنچا دیتی ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں جنت کا داخلہ ناممکن ہوتا۔

اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ سے سچی محبت کرنے والے دنیا وآخرت کے شرف کے خزانے سمیٹ گئے، اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت اور حکمت بالغہ کے ساتھ اسی دن یہ فیصلہ فرما دیا تھا جس دن تمام خلائق کی تقدیریں لکھیں کہ انسان قیامت کے دن اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ دنیا میں محبت کی ہوگی۔ تو محبینِ صادقین کے لئے یہ کتنی عظیم الشان نعمت ہے'' ......الخ

(حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کے تفصیلی کلام کیلئے ''مدارج السالکین'' جو ان کی عظیم الشان کتاب ہے، میں محبت کے باب کا مطالعہ کیجئے)

اقسامِ محبت کا بیان

واضح ہو کہ محبت کی دو قسمیں ہیں (۱) مشترک محبت (۲) خاص محبت۔

(۱) مشترک محبت کی پھر تین اقسام ہیں:

(۱) طبعی محبت، جیسا کہ بھوکے کو کھانے سے اور پیاسے کو پانی سے محبت ہوتی ہے۔ اس قسم کی محبت کسی تعظیم کو مستلزم نہیں۔

(۲) دوسری شفقت ورحمت کی محبت، جیسے باپ کو بیٹے سے محبت ہوتی ہے، یہ محبت بھی مستلزم تعظیم نہیں ہے۔

(۳) تیسری انسیت والفت کی محبت، جیسا کہ ان لوگوں کی محبت جو کسی صنعت یا تجارت وغیرہ میں مشترک ہوتے ہیں یا جیسے بھائی کو دوسرے بھائی سے محبت ہوتی ہے۔

مشترک محبت کی یہ تینوں اقسام مخلوق میں پائی جاتی ہیں، اور ان کا مخلوق میں پایا جانا اللہ تعالیٰ کی محبت میں شرک نہیں کہلائے گا۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ مٹھاس اور شہد سے محبت کیا کرتے تھے۔ ①

اور اپنی بیویوں سے بھی محبت کرتے تھے اور بیویوں میں سے سب سے زیادہ ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے محبت کیا کرتے تھے۔ اپنے صحابہ سے بہت زیادہ محبت کرتے، اور پھر صحابہ میں سب سے زیادہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے محبت کیا کرتے تھے۔ ②

(۲) خاص محبت سے مراد وہ محبت ہے جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے لئے جائز نہیں، چنانچہ اگر کسی شخص نے محبتِ خاصہ کا حق اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو دیا تو یہ شرک ہوگا، جسے اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرماتا۔ اس خاص محبت سے مراد محبتِ عبودیت ہے جو اس کے سامنے ذلت، عاجزی، تعظیم، کمالِ اطاعت اور اسے ہر ایک پر تقدیم و ترجیح دینے کو مستلزم ہے۔

اس محبت کا غیر اللہ کے ساتھ تعلق جوڑنا قطعی ناجائز ہے، چنانچہ مشرکین کے اسباب شرک میں سے ایک انتہائی نمایاں سبب یہ تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اپنے معبودان باطلہ کے درمیان ایک جیسی محبت پیدا کی ہوئی تھی۔

چنانچہ مصنف رحمہ اللہ جس آیتِ کریمہ کو بطور ترجمۃ الباب لائے ہیں اُس میں اسی حقیقت کا بیان ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ ﴾ ③

''کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے دوسروں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہم مثل بنالیا اور ان سے اللہ تعالیٰ جیسی محبت کرنے لگ گئے۔''

آیت ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ.... ﴾ کی تفسیر میں امام ابن کثیر رحمہ اللہ کا کلام

اس آیت کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''یہاں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی دنیا کی حالت اور آخرت کی وعید وسزا کی خبر دی ہے، چنانچہ ان کی دنیوی حالت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے کئی معبودانِ باطلہ کو اللہ تعالیٰ کا ہمسر و ہم مثل بنالیا ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ ان کی پوجا شروع کردی، ان سے ایسی محبت کرنے لگے کہ جیسی محبت اللہ تعالیٰ سے کرنی چاہئے، جس محبت و تعظیم کا اللہ تعالیٰ مستحق تھا وہ غیر اللہ کو دیکر اسے اللہ تعالیٰ کے برابر کردیا۔ اسی لئے قیامت کے دن مشرکین جہنم میں اپنے معبودوں سے کہیں گے:

① صحيح بخاري، كتاب الطلاق (٥٢٦٨) صحيح مسلم، كتاب الطلاق (١٤٧٤/٢١)۔

② صحيح بخاري، كتاب فضائل الصحابة (٣٦٦٢، ٢٣٨٤) ③ (البقرة : ١٦٥)

﴿ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ .اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ ﴾ ①

''کہ اللہ کی قسم ہم بڑی گمراہی میں تھے، جبکہ ہم نے تمہیں اللہ تعالیٰ کے برابر کر دیا''

اللہ تعالیٰ کے برابر کرنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ایک، تخلیق، رزق اور تدبیر امور میں برابری، حالانکہ مشرکین میں ایسا کوئی نہیں تھا جو ان امور میں اپنے بتوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھتا ہو۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ مشرکین اپنے معبودوں سے ایسی محبت رکھا کرتے تھے جیسی مومنوں کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے۔

شیخ الاسلام نے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے، اور دوسرے معنی کو بوجہ تناقض غلط قرار دیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''مومنوں کو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت ہے''، لھذا مشرکین کی اپنے بتوں سے محبت مومنوں کی اللہ تعالیٰ سے محبت جیسی کیسے ہو سکتی ہے۔

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوا کہ جس شخص نے کسی سے اللہ تعالیٰ جیسی محبت کی اس نے اسے اللہ تعالیٰ کا ہم مثل بنا دیا، جو کہ شرک اکبر ہے۔اسی طرح اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ محبتِ خاصہ کا حقدار صرف اور صرف ایک اللہ تعالیٰ ہے اور اسی کو ہی محبتِ خاصہ کا حقدار سمجھنا چاہئے، یہی توحیدِ الوہیت ہے بلکہ خلق وامر اور ثواب وعذاب اسی محبت سے اور اسی محبت کی بناء پر پیدا ہوئے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی محبت ایک ایسی حقیقت ہے جس کی وجہ سے آسمان وزمین کا خلق عمل میں آیا، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر امر ونہی کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے، یہی محبت اس کے اِلٰہ ہونے کا راز ہے۔اس کی محبت میں وحدانیت کا برقرار رکھنا درحقیقت ''لا الٰہ الا اللہ'' کی گواہی دینا ہے۔

کیا مشرکین اللہ تعالیٰ کو رب اور خالق نہیں مانتے تھے؟ یقیناً مانتے تھے اور یہ اقرار کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ تو کوئی رب ہے اور نہ ہی کوئی خالق۔لیکن وہ توحیدِ الوہیت کا اقرار نہیں کرتے تھے حالانکہ توحیدِ الوہیت ہی ''لا الٰہ الا اللہ'' کی اصل حقیقت ہے کیونکہ وہ الٰہ جسکے سامنے مومنوں کے دل محبت وذلت، خوف ورجاء اور تعظیم واطاعت سے سرشار ہیں، وہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریك له کی ذات ہے، چنانچہ ''الـٰـہ'' بمعنی ''مالوہ ''یعنی محبوب، اور اس کا اصل '' تـالـہ ''یعنی '' تعبد '' ہے، چنانچہ وہ معبود یعنی محبوب ہوا، جس سے ثابت ہوا کہ محبت ہی عبودیت کی اصل حقیقت ہے۔

=

① (الشعراء:۹۷، ۹۸)

قال: وقوله تعالیٰ: ﴿ قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴾ ①

''اے محمد ﷺ کہہ دیجئے! اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے افراد وہ مال جو تم کماتے ہو، اور وہ تجارت جسکے بند ہونے سے ڈرتے ہو، اور مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ سے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے سے تمہیں زیادہ محبوب ہوں تو ٹھہرے رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (عذاب) بھیجے، اور اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا''

=

اس آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کو پہنچانتے بھی تھے اور اس سے محبت بھی رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود جو چیز ان کے کفر کا موجب بنی وہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنے معبودوں کو محبت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا ہم مثل بنالیا تو جب اللہ تعالیٰ جیسی دوسروں سے محبت رکھنا کفر ہے تو پھر اس شخص کا کیا عالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر دوسروں سے محبت رکھتا ہے؟ اور اس شخص کا کیا عالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ سے اصلاً محبت ہی نہیں بلکہ تمام تر محبت صرف اپنے ان معبودوں سے رکھتا ہے جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کا ہم مثل قرار دیتا ہے۔

وقوله: وقوله تعالیٰ: قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ....

اس آیتِ کریمہ کے اصل مخاطب ایماندار ہیں، چنانچہ آٹھ چیزوں یعنی باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں، رشتہ دار، مال، تجارت اور مکانات کا ذکر کر کے فرمایا: ''اگر ان تمام چیزوں یا ان میں سے کسی ایک چیز کو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ یا اس کی راہ میں جہاد کرنے سے بہتر اور راجح سمجھ لیا تو پھر عذابِ الٰہی کے انتظار میں بیٹھ جانا جو کہ اس کے قہر وغضب کا آئینہ دار ہوگا۔

آیتِ کریمہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اس کردار کے لوگوں کو فاسقین میں شامل فرمایا ہے، ان سے رشد وہدایت کی نفی فرمادی ہے جو کہ شدید ترین وعید ہے، جس کی تباہ کاریوں سے وہی لوگ محفوظ و مامون رہ سکتے ہیں جو صحیح الایمان ہوں اور ظاہر اور باطنی طور پر اللہ رب العزت کے لئے مخلص ہوں، جن کی اللہ تعالیٰ کیساتھ

① (التوبة: ٢٤)

محبت سچی اور کھری ہو، جس کا تقاضا صرف یہ ہے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ومحبت کو مذکورہ بالا آٹھوں اشیاء پر تقدیم اور فوقیت دیں، اور کسی لحہ بھی اس عظیم المرتبت تقاضہ سے بہکنے یا غفلت کرنے کی کوشش نہ کریں۔

واضح ہو کہ یہ آیتِ کریمہ قرآن پاک کی ایک دوسری آیت سے کافی حد تک مشابہت ومماثلت رکھتی ہے، وہ دوسری آیت یہ ہے:

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ ①

''کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کے دعویدار ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں محبوب بنالے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمادے گا، بے شک اللہ تعالیٰ خوب بخشنے والا رحم کرنے والا ہے''

وجہ مشابہت یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ سے محبت کے دعویداروں سے اپنی محبت کی صداقت پر دلیل قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے، کیونکہ محبت کے دعویدار تو بہت ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اپنے دعویٰ کی صداقت ثابت کرنے کیلئے دلیل مہیا کرنے میں کون کامیاب ہوتا ہے۔ چنانچہ آیتِ زیرِ بحث کے بمصداق جو اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ رکھے لیکن مذکورہ آٹھ چیزوں میں سے کسی چیز کو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول پر تقدیم وترجیح دے تو وہ اپنے دعویٔ محبت میں جھوٹا ہے۔ بعینہ اسی طرح سورۂ بقرۂ کی آیتِ بالا کے بمصداق جو اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ رکھے لیکن رسول اللہ ﷺ کا متبع فرمان نہ ہو تو وہ بھی اپنے دعویٔ محبت میں جھوٹا ہے، کیونکہ اس دعویٰ کی سچائی کی دلیل صرف رسول اللہ ﷺ کی خالص اور مکمل پیروی ہے۔

آیت ﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ.... ﴾ کا شانِ نزول

مبارک بن فضالہ جناب حسن سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں بعض لوگوں نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم اپنے پروردگار سے شدید ترین محبت رکھتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اس محبت کو پرکھنے کی ہمیں کوئی ظاہری علامت اور کسوٹی مہیا کی جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ کو اپنی محبت کی کسوٹی اور معیار بنا کر نازل فرمادیا:

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ ①

جس سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت ودلیل رسول اللہ ﷺ کی اتباع ہے۔

لیکن آج بہت سے دعویدارانِ محبت، محبتِ مذکورہ بالا کے اصل تقاضے کو یکسر فراموش کرکے ایسی خلافِ شرع روش پر چل پڑے ہیں جس نے انہیں ایسی عادات پر مجبور کردیا ہے جو کہ سراسر مقامِ عبودیت کے منافی

① (آل عمران : ۳۱)

ہیں، بلکہ کچھ لوگوں نے تو ایسے دعوے کرڈالے جو انبیاء علیہم السلام کی حدود سے بھی تجاوز کر گئے اور اللہ تعالیٰ سے ایسی چیزوں کے طالب بن گئے جو کہ کسی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو زیب نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی شایانِ شان ہیں۔ ان خرافات کا اصل سبب یہ ہے کہ یہ عناصر محبت کا اصل مفہوم جو کہ خالص عبودیت کے اظہار ہی میں پنہاں ہے، سمجھنے سے قاصر ہیں، بلکہ سرے سے اس عقل سلیم کے زیور ہی سے محروم ہیں جو محبت کے صحیح مفہوم کو سمجھنے اور اپنانے کا اصل کردار ادا کرتی ہے۔ محبت کے سلسلہ میں بعینہ اس فسادِ فکری اور کج فہمی کا شکار یہود و نصاریٰ بھی ہوئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سے سچی محبت کے ایسے دعویدار بنے کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے پیارے اور بیٹے کہنے اور سمجھنے لگے:

﴿ نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ﴾ ①

''ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں'' (والعیاذ باللّٰہ)

گویا انہوں نے بھی محبت کی اصل متقاضیات و متطلبات کو فراموش کر دیا تھا، بعینہ انکے نقش قدم پر چلتے ہوئے آج کے دعویدارانِ محبت بھی اصل تقاضوں کو بھول چکے ہیں۔

محبت کے باب میں وارد شرعی نصوص کو سامنے رکھا جائے تو کمالِ محبت کی یہی ایک شرط نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ ہر کام میں محبوب کی موافقت ہی اصلِ محبت ہے، چنانچہ جو چیز محبوب کو پسند ہو وہ آپ کو بھی پسند ہو اور جو چیز اسے مکروہ اور ناگوار محسوس ہو وہ آپ کے نزدیک بھی ناپسندیدہ بن جائے اور بس!

لیکن آج اللہ تعالیٰ کی پناہ، ولیوں اور بزرگوں کے روپ میں بیٹھے ہوئے شیطان خصلت انسان ڈٹ کر گناہ کرتے ہیں اور پھر بڑی ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ ہم چونکہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اس لئے ان گناہوں کا ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور دیگر شرعی فرائض کی طرف کوئی توجہ نہیں، اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی محبت کی ایسی حدوں کو چھو چکے ہیں کہ ہم سے یہ تمام فرائض و واجبات ساقط ہو چکے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ کی محبت کا یہی مفہوم ہے؟ اس قسم کے کذبات اور مفتریات ایک مومن سے ممکن نہیں، بلکہ یہ سب کافرانہ ذہنوں کی پیداوار ہیں۔ کیا انبیاء اور مرسلین علیہم السلام، صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ نے اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں کی؟ انہوں نے تو ایسی محبت کی کہ وہ تو تمام محبت کرنے والوں کے سردار بن گئے تو کیا محبت کے سلسلے میں اس قسم کا کوئی دعویٰ ان میں سے کسی سے منقول ہے؟ قطعاً نہیں!

=

① (المائدة: ۱۸)

قال :عن انس رضی اللہ عنہ ان رسول اللّٰہ ﷺ قال :"لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ " (بخاری ومسلم)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ مجھے اپنی اولاد، ماں باپ اور تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ رکھے''

=

لھذا اے اللہ کے بندو! ہوشیار اور خبردار رہو، اور خصوصاً ان نادان اور جاہل صوفیوں اور پیروں سے بچ کر رہو، جو شب وروز اس قسم کے افتراءات تراشنے میں مصروف رہتے ہیں، بلکہ بعض مشہور مشائخ کے ساتھ بھی اس قبیل کی حکایات اور افسانے منسوب کیئے ہوئے ہیں جو یا تو ان پر جھوٹا الزام ہیں، اور یا پھر فی الواقع اگران سے ثابت ہیں تو خلاف شرع اور غلط ہیں، اور قطعاً نا قابلِ قبول ہیں، کیونکہ عصمت صرف رسول اللہ ﷺ کا حق ہے، آپ ﷺ کے علاوہ کوئی بھی ہو غیر معصوم ہے اس سے عملی طور پر غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں اور قیامت تک ہوتی رہیں گی۔

رسول اللہ ﷺ سے محبت کے وجوب کا بیان

وقوله :عن انس ان رسول اللّٰہ ﷺ قال :"لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ ......

صحیحین کی اس حدیث میں نہایت ہی صریح اور واشگاف الفاظ میں ایسے شخص کے ایمان کی نفی کر دی گئی ہے جو اپنے ماں باپ، اہل وعیال الغرض دنیا کی ہر چیز سے زیادہ رسول اللہ ﷺ سے محبت نہ رکھتا ہو، بلکہ اپنی جان سے بھی بڑھ کر آپ ﷺ سے محبت نہ رکھنا بھی دولتِ ایمان سے محروم ہونے کی دلیل اور علامت ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! '' آپ میرے نزدیک سوائے میری جان کے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا ، حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْكَ مِنْ نَّفْسِكَ"

''مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جب تک اپنی جان سے بھی زیادہ مجھے محبوب نہیں مانو گے اس وقت تک تم مومن نہیں ہو سکتے''

تو اس پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فوراً بولے: ''اللہ تعالیٰ کی قسم! اب آپ میرے نزدیک میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں''

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"اَلْآنَ يَا عُمَر "اے عمر رضی اللہ عنہ! اب (تم نے حق کہا۔)

واضح ہو کہ ان احادیث میں جس ایمان کی نفی ہے اس سے مراد وہ ایمان ہے جو بلا عذاب دخول جنت کا باعث وسبب ہوتا ہے اور جس کا تارک مذمت کا مستحق ہو جاتا ہے۔

تو گویا رسول اللہ ﷺ پر دوسروں کی محبت کو ترجیح دینے والا انتہائی مذموم راہ پر چل رہا ہے، اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب کا نشانہ بنے گا۔

اب جبکہ رسول اللہ ﷺ کی محبت کا حکم واضح ہو گیا، اور یہ ثابت ہو گیا کہ تمام مخلوقات سے بڑھ کر آپ ﷺ سے محبت کرنا فرض ہے تو اس محبت کا اصل طریقہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے، جو یہ ہے کہ آپ ﷺ کی سچی اور مکمل تابعداری کی جائے۔ چنانچہ جو شخص امام الانبیاء ﷺ سے اپنی جان مال، ماں باپ، اولاد اور تمام افرادِ کائنات سے زیادہ محبت کا دعویدار ہے اس پر لازم ہے کہ وہ عمل اور بھر پور متابعت کے ذریعے اس دعویٰ پر مہر تصدیق بھی ثبت کرے ورنہ محبت کا دعویٰ جھوٹا ہوگا۔ قرآن پاک سے یہ بات جزم وقطعیت کے ساتھ ثابت ہوتی ہے کہ دل میں پائی جانے والی محبت کی صداقت کیلئے اسکے مطابق ظاہری عمل کا ہونا ایک لازمی اور اساسی شرط ہے: ﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ ①

''اے محمد (ﷺ)! کہہ دیجئے: اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگ جائے گا، اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا نہایت مہربان ہے''

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ ②

''کہتے ہیں: ہم اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے، اور ان کا حکم مان لیا، پھر اس کے بعد ان میں سے ایک فرقہ پھر جاتا ہے اور یہ لوگ صاحب ایمان ہی نہیں ہیں''

نیز ایک مقام پر فرمایا: ﴿ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ ③

''مومنوں کی تو یہ بات ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف بلائیں جائیں تا کہ وہ انکے درمیان فیصلہ کریں تو کہیں ہم نے (حکم) سن لیا ہے، اور مان لیا ہے، اور یہی لوگ فلاح پانیوالے ہیں''

ان آیات پر غور کیجئے! ایک طرف نہایت صراحت کے ساتھ ان لوگوں کے ایمان کی نفی کی گئی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور فرماں برداری سے روگردانی کرتے ہیں، جب کہ دوسری طرف مومن انہیں کہا گیا جو =

① (آل عمران: ٣١) ② (النور: ٤٧) ③ (النور: ٥١)

قال :ولهما عنه قال :قال رسول الله ﷺ " ثَلاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلاوَةَ الْإِيمَانِ: أَنْ يَكُونَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا ، وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ، وَأَنْ يَكْرَهَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْقَذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ "
وفی رواية " لَا يَجِدُ أَحَدٌ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ حَتَّى ..الخ "

صحیح بخاری و مسلم میں سیدنا انس ﷺ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص میں تین خصلتیں پائی گئیں اس نے ایمان کی مٹھاس کو پالیا (۱) ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اسکا رسول ﷺ اسکے نزدیک دوسری ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو۔ (۲) یہ کہ کسی شخص سے محض اللہ تعالیٰ کے واسطے محبت کرے۔ (۳) اور یہ کہ وہ کفر میں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسے بچالیا ہے، دوبارہ لوٹ جانے کو اتنا ہی ناپسند سمجھے جتنا آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند سمجھتا ہے۔'' ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں ''کہ اس وقت تک ایمان کی حلاوت نہیں پا سکتا جب تک (مذکورہ بالا تین چیزیں نہ ہوں) الخ''

=

اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی ہر دعوت پر لبیک کہتے ہوئے سمع واطاعت کے اقرار اور اعتراف اور عملی مظاہرہ پر ہمہ وقت کمربستہ ومستعد رہتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ عمل اور مخلصانہ پیروی، ایمان اور محبت کے لوازمات میں سے ہے، تاہم ہر مسلمان کا اسکے اسلام کے بقدر محبّ ہونا ضروری ہے، لھذا الشخصِ مذکور کی بابت دائرہ اسلام سے کلیۃً خروج کا حکم لگانا نصوصِ کتاب وسنت سے کہیں معلوم یا مفہوم نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔

وقوله :ولهما عنه قال :قال رسول الله ﷺ " ثَلاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ ......

اس حدیث سے محبت رسول ﷺ کے واجب ہونے کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں، چنانچہ سب سے سرفہرست غور طلب بات یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی محبت کی یہ شان ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی محبت کا کیا عالم ہوگا؟
یہ حدیث عمل کے جزوِ ایمان ہونے کی بھی زبردست دلیل ہے کیونکہ محبت ایک عمل ہے جس کے نہ ہونے سے ایمان کی نفی لازم آتی ہے، جس سے واضح ہوا کہ عمل، ایمان کی تعریف وحقیقت میں داخل ہے

ایمان کی مٹھاس

اس حدیث مبارک میں تین خصائل کا ذکر ہے جن کی وجہ سے ایمان کی لذت وحلاوت نصیب ہوتی ہے۔
ابن ابی جمرہ فرماتے ہیں: ''ایمان کی حلاوت کا ذکر اس وجہ سے کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک فرمان میں ایمان کو ایک درخت سے تشبیہ دی ہے۔''

فرمایا: ﴿ ضَرَبَ اللهُ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ ﴾ ①

''اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ بات کی مثال ایک پاکیزہ درخت کے ساتھ دی ہے''

اور درخت کے پھل بھی ہوتے ہیں اور پھل میں مٹھاس کا ہونا بھی ضروری ہے، یہی صورتِ حال ایمان کے درخت کی بھی ہے کہ اس درخت پر پھل کا آنا بھی ضروری ہے، اور پھل میں مٹھاس کا پایا جانا بھی ضروری ہے، اب یہ مٹھاس کسی مومن کو نصیب ہوتی ہے اور کسی کو نہیں، اور جسے نصیب ہوتی ہے وہ صرف وہ خوش نصیب ہے جو اس حدیث میں مذکور تینوں خصائل کو اعتقاداً وعملاً اپنانے کا حق ادا کردے۔

ان خصائل کی وضاحت درج ذیل ہے:

پہلی خصلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو زیادہ محبوب رکھے۔

اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے کے متعلق قاضی بیضاوی کا کلام اور اس کا رد

قاضی بیضاوی ؒ نے اس محبت کو محبتِ عقلی قرار دیا ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ عقلِ سلیم کے تقاضوں کو ہمیشہ ترجیح دے اگرچہ وہ خواہشِ نفس کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں جیسا کہ مریض طبعی طور پر دوا سے نفرت کرتا ہے لیکن بمقتضائے عقل اس کے فوائد کے پیش نظر اس کے استعمال کی طرف میلان کرتا ہے، اسی طرح اگر انسان تدبر سے کام لے تو اسے معلوم ہوگا کہ شارع کا ہر امر ونہی دنیوی واخروی صلاح کا باعث ہے، چنانچہ جب وہ اس حقیقت کا ادراک کر لیتا ہے تو پھر وہ ان احکام کو عملاً اپنانے کا اس طرح عادی ہو جاتا ہے کہ اس کی خواہشات بھی اس کے تابع ہو جاتی ہیں، جس سے اسے عقلی طور پر لذت اور مٹھاس حاصل ہو جاتی ہے...الخ''

لیکن قاضی بیضاوی ؒ کی یہ ساری گفتگو ''فرقہ جہمیہ'' کے قواعد پر پوری اترتی ہے جو مومنین کی پروردگار سے محبت کی نفی کے قائل ہیں، جو کہ خلافِ حق ہے، جبکہ حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول انسان کے نزدیک قلبی محبت کے اعتبار سے دوسری ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوں، بلکہ بعض احادیث میں تو رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے: "أَحِبُّوا اللهَ بِكُلِّ قُلُوبِكُمْ"

یعنی ''اپنے تمام تر دلوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھو''

چنانچہ یہ دل کلیۃً اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح مائل ہو کہ وہی ذاتِ واحد محبوب ومعبود بن جائے اور اس کے سوا کسی دوسرے سے اگر محبت ہو، تو وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے ہو۔ مثلاً: انبیاء ومرسلین علیہم السلام یا ملائکہ وصالحین وغیرہ سے محبت رکھنا محض اس وجہ سے ہو کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت رکھتا ہے۔

① (ابراهيم: ٢٤)

اب اللہ تعالیٰ کی یہ محبت انسان کے لئے ہر اس چیز کی پسندیدگی کا موجب ہوگی جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہو اور ہر اس چیز کو ناپسند کرنے کا موجب ہوگی جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو۔ اس طرح یہ محبت ہر ماسوا پر اس کی پسندیدگی کی ترجیح و تقدیم کو لازم قرار دے دیگی۔ اور وہ انسان اپنی استطاعت کے بقدر ہر ایسے کام اپنانے میں کوشاں رہے گا جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہوں اور ہر ایسے کام کے ترک کی سعی کرتا رہے گا جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہوں۔ یہ سب کچھ محبت صادقہ کی علامات ولوازمات ہیں۔

اس پر بحث کرتے ہوئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ یہ تین چیزیں جس شخص میں موجود ہوں، اس نے ایمانی حلاوت اور مٹھاس کو پالیا، کیونکہ کسی شئی کی حلاوت درحقیقت اس کی محبت کے تابع ہے چنانچہ جو شخص کسی چیز کی محبت و چاہت رکھتا ہے تو اسے حاصل کر لینے کے بعد وہ اس کی حلاوت، لذت وسرور میں جھوم اٹھتا ہے۔ یہ لذت ایک ایسی حقیقت ہے جو محبوب اور مرغوب چیز کے حصول کے بعد ہی محسوس ہوتی ہے، لھذا ایمان کی حلاوت کی لذت کا حصول اس صورت میں ممکن ہے کہ جب انسان اپنے پروردگار سے کمال محبت کا عملی مظاہرہ کرے۔ اور کمال محبت تین چیزوں پر موقوف ہے (۱) محبت کی تکمیل (۲) محبت کی تفریع (۳) اس محبت سے ٹکرانے والی ہر چیز کا دفع وازالہ۔ چنانچہ تکمیل محبت کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اس کے نزدیک ہر دوسری چیز سے زیادہ محبوب ہوں۔ تکمیلِ محبت کے لئے صرف اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ سے محبت رکھنا ہرگز کافی نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ یہ محبت دنیا کی ہر شئی کی محبت پر غالب اور حاوی ہو۔ (جس کی صورت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر پسند وناپسند میں مکمل موافقت ہو)۔

تفریعِ محبت یہ ہے کہ کسی انسان سے محض اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت رکھے۔ (چنانچہ وہ کسی شخص سے اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت رکھے گا اور اس میں کوئی دوسری غرض شامل نہیں ہوگی تو یہ اللہ تعالیٰ سے کمال محبت کی دلیل ہوگی، کیونکہ اپنے محبوب کے محبوب سے محبت رکھنا، محبوب کی محبت کو پورا کرنے کے مترادف ہے۔ لھذا اللہ تعالیٰ کے انبیاء علیہم السلام واولیاء سے بھی اس وجہ سے محبت کرنا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پسند پر قائم وعامل ہیں اور اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں، اور صرف یہی غرض ہو دوسری کوئی غرض نہ ہو تو گویا اس شخص نے ان سے اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کی۔)

اس محبت سے ٹکرانے والی ہر چیز کے دفع وازالہ کی صورت یہ ہے کہ ایمان کی ضد یعنی کفر میں لوٹ جانے کو اتنا ہی ناپسند سمجھے جتنا کہ آگ میں جلنے کو ناپسند سمجھتا ہے۔''

ان تینوں چیزوں کے اجتماع سے کمالِ محبت کا درجہ ومرتبہ حاصل ہوجاتا ہے، اور جسے کمالِ محبت کا مرتبہ

نصیب ہو جائے اسے ایمان کی مٹھاس اور لذت حاصل ہو گی۔ چنانچہ یہی کمالِ محبت قیامت کے دن انسان کو اس کے محبوب کے ساتھ ملا دے گا۔

چنانچہ صحیحین میں سیدنا انس ﷛ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے اس کیلئے کیا تیاری کی ہے؟'' اس نے جواب دیا: کچھ زیادہ (نفلی) نماز، روزے یا صدقہ کا ذخیرہ تو نہیں کر سکا، لیکن اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ سے شدید محبت رکھتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم قیامت کے دن اسی کے ساتھ ہو گے جس کے ساتھ تم نے شدید محبت کی ہو گی۔''

صحیح بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ سے صحابہ کرام ﷢ نے دریافت کیا، کیا یہ خوشخبری ہمارے لئے بھی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! کیوں نہیں۔ سیدنا انس ﷛ کہتے ہیں: یہ سن کر ہمیں انتہائی زیادہ خوشی حاصل ہوئی۔''

واضح ہو کہ اس حدیث سے بہت سے فوائد سامنے آتے ہیں مثلاً: یہ کہ مومنین اللہ تعالیٰ سے اور اللہ تعالیٰ مومنین سے محبت رکھتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ ﴾ ①

''اللہ تعالیٰ ان سے محبت رکھتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں''

اس حدیث سے بعض لوگوں کی تردید بھی ہوتی ہے، جن کا نظریہ یہ ہے کہ اسلام کی حالت میں پیدا ہونے والا شخص اس شخص سے کہیں زیادہ بہتر ہے جو پہلے کافر ہو اور بعد میں اسلام لے آیا ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ جو حدیث میں بیان شدہ امور کے ساتھ متصف ہو، وہی بہتر ہے اس شخص سے جو ان امور سے متصف نہ ہو۔ اس وجہ سے السابقون الاولون صحابہ کرام ﷢ ان لوگوں سے بھی افضل ہیں جن کی پیدائش بحالت اسلام ہوئی۔

یہ حدیث ان غالیوں کا بھی رد ہے جو بندے سے گناہ کے صدور کو اسکے حق میں مطلقاً نقص تصور کرتے ہیں۔ جبکہ حق بات یہ ہے کہ جو گناہ سے توبہ نہ کرے اسکے حق میں نقص ہے۔

اس حدیث سے مشرکین سے حد درجہ بغض و عداوت قائم رکھنے کی بھی دلیل مہیا ہوتی ہے، کیونکہ جو شخص کسی چیز سے بغض رکھے گا تو وہ یقیناً اس شخص سے بھی بغض رکھے گا جس میں وہ چیز پائی جاتی ہے، لھذا جس کے نزدیک کفر اتنی مبغوض چیز ہو کہ اس میں لوٹ جانے کو جہنم میں جلائے جانے کے برابر سمجھتا ہو، تو جن لوگوں میں یہ کفر و شرک پایا جاتا ہے وہ بھی اسی درجہ بغض و نفرت کے قابل ہو نگے۔

① (المائدۃ: ٥٤)

قال :وعن ابن عباس ﷺ قَـالَ:"مَـنْ أَحَبَّ فِي اللّٰهِ، وَأَبْغَضَ فِي اللّٰهِ، وَوَالَى فِي اللّٰهِ، وَعَـادٰى فِـى اللّٰهِ فَإِنَّمَا تُنَالُ وِلَايَةُ اللّٰهِ بِذٰلِكَ ، وَلَنْ يَّجِدَ عَبْدٌ طَعْمَ الْإِيْمَانِ وَإِنْ كَثُرَتْ صَلَاتُهُ وَصَوْمُهُ حَتّٰى يَكُوْنَ كَذٰلِكَ وَقَدْ صَارَتْ عَامَّةُ مُوَاخَاةِ النَّاسِ عَلٰى أَمْرِ الدُّنْيَا وَذٰلِكَ لَا يُجْدِىْ عَلٰى أَهْلِهِ شَيْئًا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''جس نے اللہ تبارک وتعالیٰ کیلئے کسی سے محبت کی اور اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کے لئے نفرت کی ،اور اللہ تعالیٰ کے لئے عملاً دوستی اور دشمنی کو قائم رکھا تو وہ اِن مذکورہ اعمال کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی دوستی کو حاصل کرلے گا ۔اور کوئی شخص ایمان کی لذت اور سرور کو اس وقت تک نہیں پا سکتا جب تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر دوستی اور دشمنی کی لذت سے آشنا نہ ہو، خواہ وہ کتنی ہی نمازیں پڑھ لے اور کتنے ہی روزے رکھ لے، عام لوگوں کی دوستی اور بھائی چارہ دنیوی اغراض پر قائم ہے اس کا انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا ۔'' (ابن جریر) (۱)

حدیثِ رسول ﷺ "اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ" کی تشریح

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی ولایت اور دوستی کے منصبِ عالی کے حصول کیلئے چار چیزوں کا ذکر ہے۔

(۱) جملہ مسلمانوں سے محض اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر محبت رکھے ۔ (۲) محبت صرف دل میں نہ ہو بلکہ اس محبت کے عملی تقاضوں کو بھی پورا کرے جو محبت کا لازمہ ہیں ،مثلاً: انکی مدد ،احترام واکرام اور ظاہراً و باطناً محبوبین کیساتھ رہنا ۔ (۳) تیسری چیز یہ ہے کہ کفار اور فاسقین سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے بغض اور عداوت رکھے ،اور اس بغض اور عداوت کی وجہ صرف یہ ہو کہ وہ پروردگار کی مخالفت اور نافرمانی کرتے ہیں ،خواہ یہ لوگ رشتے کے اعتبار سے قریب ترین ہی کیوں نہ ہوں ،جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ﴾ (۲)

''تمہیں ایسے لوگ نہیں ملیں گے جو اللہ تبارک وتعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور اللہ تبارک

(۱) یہ اثر ضعیف ہے: "الزهد" لابن مبارك (۳۵۳) "الحلية" لابی نعيم (۱/۳۱۲ عن ابن عباس مرفوعا) طبرانی (۳۵۳۷ عن ابن عمر موقوفا) کیونکہ تینوں سندوں کا مدار لیث بن ابی سلیم ضعیف راوی پر ہے۔
(۲) (المجادلة: ۲۲)

وتعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ کے دشمنوں کو دوست بھی رکھتے ہوں، خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔''

(۴) چوتھی چیز یہ ہے کہ کفار ومشرکین سے بغض ونفرت صرف دل ہی میں نہ ہو، بلکہ بالفعل اس عداوت کا اظہار کرے، جو جہاد وقتال اور اظہارِ برأت ولاتعلقی نیز ظاہری وباطنی طور پر ان سے دور رہنے میں ممکن ہے۔

جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سیدنا ابراهیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ ﴾ ①

''(مسلمانو!) تمہارے لئے سیدنا ابراهیم علیہ السلام میں اور ان کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے، جبکہ ان سب نے اپنی قوم سے برملا کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو ان سب سے بالکل بیزار ہیں۔ ہم تمہارے عقائد کے منکر ہیں جب تک تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان نہ لاؤ ہم میں تم میں ہمیشہ کے لئے بغض وعداوت ظاہر ہوگئی''

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے فرمان کے مطابق ان چار چیزوں کے بغیر مقام ولایت کا حصول ناممکن ہے، یہی بات مسند احمد اور طبرانی کی ایک حدیث میں مذکور ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انسان اس وقت تک ایمانِ خالص کی لذت سے ہمکنار نہیں ہوسکتا جب تک اللہ تبارک وتعالیٰ کیلئے دوستی اور دشمنی نہ پیدا کرے، جب اسکی دوستی بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے اور دشمنی بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کیلئے ہو جائے تو وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ولایت کا مستحق ہوجاتا ہے۔'' ②

طبرانی کی ایک اور حدیث میں آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے کہ ''ایمان کی سب سے زیادہ مضبوط کڑی اللہ تبارک وتعالیٰ کیلئے محبت کرنا، اور اس کی خاطر دشمنی رکھنا ہے'' ③

اور جس سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر محبت پیدا ہو جائے، اسکے پاس جا کر اس محبت کا اظہار کرنا نہایت ہی

① (الممتحنة : ٤)
② ضعیف : مسنداحمد (١٥٥٤٩) امام ہیثمی فرماتے ہیں: اس کی سند میں رشدین بن سعد، راوی ضعیف ہے۔ مجمع الزوائد (١/٨٩).
③ حسن : مسنداحمد (١٨٥٤٩ ج ٦) الطیالسی (٧٤٧) شعب الایمان (١/ ٣٣٩) سنن ابی داؤد (٤٥٩٩) طبرانی کبیر (١٠٥٣١) طبرانی صغیر (١/٢٢٣) مستدرك حاكم (٢/٤٨٠).

مستحب ہے، چنانچہ ''مسند احمد بن حنبل'' اور ''المختارۃ للضیاء المقدسی'' میں سیدنا ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول ﷺ کا یہ فرمان مروی ہے، کہ ''تم میں سے جب کسی شخص کو اپنے دوست سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر محبت ہو جائے تو اس کے گھر جا کر اسے بتانا چاہئے کہ مجھے تم سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر محبت ہے'' ①

اور امام بیہقی نے ''شعب الایمان'' سیدنا میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے کہ ''اس سے اس کے دل میں بھی اس کی محبت کے جذبات پیدا ہو جائیں گے'' ②

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے مزید فرمایا کہ ''انسان خواہ کتنا ہی پابندِ صوم وصلوۃ ہو، لیکن اس وقت تک اسے ایمان کی لذت اور مٹھاس نصیب نہیں ہوگی جب تک اس کی محبت وعداوت، موالات ومعادات اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر نہ ہو جائیں۔''

انس رضی اللہ عنہ کی مذکورۃ الصدر حدیث سے یہ نکتہ بخوبی معلوم ہو رہا ہے۔

نیز ابوداؤد میں سیدنا ابو امامۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ" ③

''جس نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر دوستی کی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر دشمنی کی، اور اس کی خاطر دیا، اور اس کی خاطر روکا، اس نے اپنا ایمان پورا کرلیا''

آخر میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: کہ آج کل عام طور پر لوگوں کی محبتوں اور دوستیوں کی بنیاد دنیوی اغراض ہوتی ہیں، جو قطعاً بے فائدہ ہیں، بلکہ الٹا نقصان کا سبب بن جاتی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا: ﴿ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴾ ④

''پرہیزگاروں کے علاوہ، اس دن تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے''

معلوم ہوا کہ جو دوستی اور محبت اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر نہیں بلکہ دنیا کی خاطر ہوگی، وہ قیامت کے دن عداوت اور ندامت میں بدل جائے گی۔ جب کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر قائم محبت اور دوستی قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ کے انتہائی قرب کا باعث بن جائے گی۔

① حسن: مسند احمد (۲۱۵۷۰، ۲۱۳۵۲) الزهد لابن المبارك (۷۱۲) امام ہیثمی نے اسکی سند کو حسن کہا ہے۔ مجمع الزوائد (۲۸۱/۱۰).

② ضعیف: "شعب الایمان" للبیهقی۔ اس کی سند میں عبداللہ بن ابی مرہ ہے، جسے امام ذھبی نے مجہول کہا ہے۔

③ حسن: سنن ابی داؤد (٤٦٨١) طبرانی کبیر (٧٦١٣) شرح السنة (٥٤/١٣) مسند احمد (١٥٦١٧) سنن ترمذی (٢٥٢١).

④ (الزخرف: ٦٧

چنانچہ میدان محشر کی سختیوں سے بچا کر جن سات قسم کے انسانوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے سائے کے نیچے جگہ دے گا، ان میں دو آدمی وہ بھی ہیں کہ جنہوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر آپس میں محبت کی، ان کا ملنا اور بچھڑنا غرضیکہ ہر کام اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر ہی ہوا کرتا تھا۔ ①

مؤطا امام مالک اور صحیح ابن حبان میں حدیث قدسی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

"وَجَبَتْ مُحَبَّتِى لِلْمُتَحَابِّيْنَ فِيَّ وَلِلْمُتَجَالِسِيْنَ فِيَّ ، وَلِلْمُتَزَاوِرِيْنَ فِيَّ ، وَلِلْمُتَبَاذِلِيْنَ فِيَّ" ②

''میری خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنے والوں، اور میری ہی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے والوں، اور میری ہی خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرنے والوں، اور میری ہی خاطر ایک دوسرے پر مال خرچ کرنے والوں کے لئے میری محبت واجب ہو چکی ہے''

واضح ہو کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بات اپنے دور کی صورتِ حال کا مشاہدہ کر کے کہی، اگر وہ آج کے دور کا مشاہدہ کر لیتے جس میں دوستیاں اور محبتیں بدعت اور فسق و فجور بلکہ کفر پر قائم ہیں تو ان کے کیا الفاظ و جذبات ہوتے؟ اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے دور میں حالات کافی تبدیل ہو چکے تھے، کیونکہ نبی ﷺ کے دور میں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی لوجہ اللہ محبت مثالی تھی۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''نبی ﷺ کے دور میں ہم اپنے درہم و دینار پر اپنے دوست کا حق زیادہ سمجھتے تھے۔'' ③

اللہ تعالیٰ نے اس معاشرے کی تصویر اس طرح کھینچی:

﴿ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ ④

''وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں چاہے خود کو کتنی ہی سخت حاجت ہو''

یہی محبت قیامت کے دن محبتِ نافعہ قرار پائے گی۔

ایک حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا ''میرے جلال کی خاطر محبت کرنے والے کہاں ہیں؟ آج میں انہیں اپنے سائے تلے بٹھاؤں گا'' ⑤

---

① (بخاری ومسلم)

② صحیح: مؤطا امام مالک (۲/۹۵۳) مسند احمد (۲۲۱۹۲) مستدرك حاكم (۴/۱۶۸) امام حاکم نے اسے صحیح کہا ہے، اور علامہ ذھبی نے موافقت کی ہے۔

③ حسن۔ طبرانی کبیر (۱۳۵۸۳) الحلية (۱/۳۱۳،۳/۳۱۸)۔

④ (حشر: ۹)

⑤ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة (۲۵۶۶)

قال المصنف:وقال ابن عباس ﷺ:فی قوله تعالیٰ ﴿وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ﴾ قال: المودة .①

سیدنا عبداللہ بن عباس ﷺ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ''اس سے مراد محبت ومودت ہے۔''

وقوله:وقال ابن عباس ﷺ : فی قوله تعالیٰ ......

یعنی وہ محبت جو دنیا میں ان کے درمیان قائم تھی وہ آخرت میں ٹوٹ جائے گی۔اوراس دن جب کہ ایک دوسرے کی انتہائی ضرورت ہوگی آپس میں اظہارِ عداوت وبرأت کردینگے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراھیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا:

﴿ قَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللهِ اَوْثَانًا مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَّمَاْوٰكُمُ النَّارُ وَمَالَكُمْ مِنْ نّٰصِرِيْنَ ﴾ ②

''(سیدنا ابراھیم علیہ السلام نے کہا:) کہ تم نے جن بتوں کی پرستش اللہ کے سوا کی ہے انہیں تم نے آپس کی دنیوی دوستی کی بناء پر ٹھہرالیا ہے،تم سب قیامت کے دن ایک دوسرے سے کفر کرنے لگو گے اور ایک دوسرے پر لعنت کرنے لگو گے اورتمہارا سب کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا اور تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا''

یہ آیت اگر چہ ان بت پرست مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اپنے معبودانِ باطلہ سے اللہ تعالیٰ کی طرح محبت کرتے تھے لیکن اسے عموم پر ہی محمول کیا جائے گا، کیونکہ قاعدہ مشہور ہے: "العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب"

''اعتبارعمومِ لفظ کا ہوتا ہے خصوصِ سبب کا نہیں۔''

بہرحال دنیا کے تمام تعلقات اور ساری کی ساری محبتیں اور سب کی سب دوستیاں قیامت کے دن یکسر عداوت میں بدل جائیں گی اور لوگ ایک دوسرے کو طعن وملامت کا ہدف بنالیں گے۔یہ اس دوستی کا حال ہے جو اللہ تعالیٰ کی خاطر نہ ہو بلکہ کسی اور بنیاد پر استوار ہو،لھذا دوستی اور محبت کے سلسلہ میں انتہائی محتاط رہنا پڑے گا،اوراسے خالصتاً اللہ تعالیٰ کی مرضی پر استوار کرنا پڑے گا تاکہ وہ قیامت کے دن عداوت میں تبدیل ہوکر نقصان دہ ہونے کے بجائے رفعتِ درجات اوراللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا باعث بن جائے۔

---

① یہ اثر شدید ضعیف ہے۔ابن جریر(۲/۴۳) مستدرك حاكم (۲/۲۷۲)اسکی سند میں عیسیٰ بن ابی عیسیٰ راوی متروک ہے۔
② (العنكبوت: ۲۵)

اس باب کے مسائل

(۱) سورۂ بقرۃ کی آیت ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللهِ اَنْدَادًا.... ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) سورۂ توبہ کی آیت ﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآءُ كُمْ ...الاية ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۳) محمد رسول اللہ ﷺ کی محبت کا فرض ہونا، اور اس کا لازمی طور پر نفس، مال اور اہل کی محبت پر مقدم اور غالب ہونا معلوم ہوا۔

(۴) یہ بات بھی واضح ہوئی کہ نصوص میں ایمان کی نفی وارد ہو تو اس سے مراد کلیۃً دائرہ اسلام سے خروج نہیں ہے۔

(۵) یہ نکتہ بھی حاصل ہوا کہ ایمان کی ایک خاص مٹھاس ہوتی ہے، جسے انسان کبھی تو پالیتا ہے اور کبھی حاصل نہیں کر پاتا۔

(۶) دل کے چار ایسے اعمال بیان ہوئے جن پر اللہ تعالیٰ کی ولایت، اور ایمان کی لذت، اور سرور کا حصول موقوف ہے۔

(۷) صحابی رسول (سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما) امرِ واقع کو کس طرح سمجھ گئے، جبھی تو انہوں نے فرمایا کہ عام طور پر لوگوں کی دوستی کی بنیاد دنیاوی اغراض پر ہوتی ہے۔

(۸) آیتِ کریمہ ﴿ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۹) یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ بعض مشرکین اللہ تعالیٰ سے شدید محبت رکھا کرتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللهِ ﴾

(۱۰) اس شخص کی وعید معلوم ہوئی جو آیت (سورۂ توبہ) میں مذکور آٹھ چیزوں کو اپنے دین سے زیادہ محبوب رکھے۔

(۱۱) کسی غیر اللہ سے اتنی محبت رکھنا کہ اس کی محبت اللہ تعالیٰ کے برابر ہو جائے، شرک اکبر ہے۔



باب
خوفِ الٰہی کی حقیقت

قول اللہ تعالیٰ: ﴿ إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴾ ①

''یہ خبر دینے والا شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے تم ان کافروں سے نہ ڈرو اور میرا خوف رکھو، اگر تم مؤمن ہو''

اس دینِ متین میں خوف کا مقام انتہائی افضل، برگزیدہ اور جلیل القدر ہے، اسی لیئے مصنف رحمہ اللہ نے صرف اور خالص اللہ تبارک وتعالیٰ کا خوف پیدا کرنے کی فرضیت کو بیان کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں خوف کا اپنے انتہائی مقربین مثلاً: ملائکہ، اولیاء اللہ اور صالح کردار لوگوں کی صفت کے طور پر ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ يَخَافُونَ رَبَّهُم مِّن فَوْقِهِمْ ﴾ ②

''فرشتے اپنے پروردگار سے جو ان کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں''

نیز فرمایا: ﴿ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ﴾ ③

''وہ اس کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں''

اس کے بعد نیک اور صالح انسانوں کے متعلق فرمایا:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ هُم مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ﴾ ④

''جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں''

انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿ الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ ﴾ ⑤

''اور جو اللہ تعالیٰ کے پیغام کو پہنچاتے، اور اس سے ڈرتے، اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے''

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ پاک میں کئی مقامات پر خالصتاً اپنے آپ سے ڈرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ﴾ ⑥

''اور خاص مجھ ہی سے ڈرو''

---

① (آل عمران: ۱۷۵) ② (النحل: ۵۰) ③ (الانبیاء: ۲۸)
④ (المؤمن: ۵۷) ⑤ (الاحزاب: ۳۹) ⑥ (البقرة: ۴۰)

نیز فرمایا:﴿ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ ﴾ ①

''پس لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ہی ڈرو''

نیز فرمایا:﴿ اَفَغَيْرَ اللهِ تَتَّقُوْنَ ﴾ ②

''کیا تم اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا دوسروں سے ڈرتے ہو''

خوف کی اقسام

واضح ہو کہ خوف کی تین اقسام ہیں:

(ا) سری اور مخفی خوف، جس کا معنی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا دوسروں سے ڈرتے رہنا کہ کہیں وہ اپنی قدرت اور طاقت سے مجھے کوئی بیماری یا فقر وفاقہ اور موت نہ دے دیں، خواہ نظریہ یہ ہو کہ وہ شفاعت کے ذریعے یہ سب کچھ کروا سکتے ہیں، یا بذاتِ خود سب کچھ کرنے پر قادر ہیں۔

اس خوف کا کسی غیر اللہ کے ساتھ تعلق جوڑنا قطعاً جائز نہیں ہے کیونکہ یہ صرف الوہیت کے خصائص ولوازم میں سے ہے۔ لھذا جس نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا کسی دوسرے سے اس قسم کا خوف رکھا تو وہ مشرک ہے۔ بلکہ غیر اللہ کے خوف کے سلسلہ میں یہی عقیدہ مشرکینِ مکہ کا اپنے بتوں اور جھوٹے معبودوں کے متعلق تھا، چنانچہ وہ خود تو ڈرتے ہی تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو بھی اپنے بتوں کے قہر وغضب سے ڈرایا کرتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراھیم علیہ السلام کے واقعہ کی حکایت فرمائی ہے کہ انہوں نے سیدنا ابراھیم علیہ السلام کو اپنے معبودوں سے ڈرایا تو انہوں نے جواباً یہ فرمایا:

﴿ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا أَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا فَأَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ ③

''اور جن چیزوں کو تم اس کا شریک بناتے ہو میں ان سے نہیں ڈرتا، ہاں! جو میرا پروردگار کچھ چاہے، میرا پروردگار باعتبار علم کے احاطہ کیئے ہوئے ہے، تم نصیحت کیوں نہیں قبول کرتے۔ بھلا میں ان چیزوں سے جن کو تم اللہ تعالیٰ کا شریک بناتے ہو کیونکر ڈروں، جبکہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے، جس کی اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی اب دونوں فریق میں سے کون سا فریق امن کا مستحق ہے اگر سمجھ رکھتے ہو تو بتاؤ''

① (المائدۃ: ٤٤) ② (النحل: ٥٢) ③ (الانعام: ٨٠، ٨١)

اس طرح سیدنا ھود علیہ السلام اوران کی قوم کے واقعہ کو بھی نقل فرمایا ہے، چنانچہ سیدنا ھود علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا: ﴿اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ قَالَ اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِیْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ﴾ ①

''بلکہ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تو ہمارے کسی معبود کے بُرے جھپٹے میں آ گیا ہے، اس نے جواب دیا کہ میں اللہ تعالیٰ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ جن کو تم اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے بیزار ہوں، لھذا تم سب ملکر میرے بارے میں جو تدبیر کرنی چاہو کرلو اور مجھے مہلت بھی نہ دو''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ﴾ ②

''اور یہ لوگ تجھے ان لوگوں سے ڈراتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا (ان کے معبود) ہیں''

بہرحال مشرکین نہ صرف یہ کہ خود اپنے بتوں سے ڈرتے تھے بلکہ اہلِ ایمان کو بھی ڈراتے رہتے تھے، چنانچہ انکے اسبابِ شرک میں سے ایک سبب یہ قرار فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں سے ڈرتے رہتے تھے۔

آج کے دور کا جائزہ لیتے ہوئے پتا چلے گا کہ قبر پرستوں میں خوف کی یہ قسم بدرجہ اتم موجود ہے، چنانچہ وہ بزرگوں بلکہ طاغوتوں سے اس طرح ڈرتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ ڈرتے ہیں۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی موقع پر کسی مسئلہ میں کسی قبر پرست سے اللہ تعالیٰ کی قسم مانگی جائے تو وہ فوراً قسم اٹھانے پر تیار ہوجاتا ہے، خواہ وہ قسم سچی ہو یا جھوٹی۔ اور اگر کہا جائے کہ فلاں بابے یا فلاں قبر والے کی قسم کھاؤ تو وہ جھوٹی قسم کھانے کی کبھی جرأت نہیں کرتا، جس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر قبر والوں کا خوف سمایا ہوا ہے۔ واللہ! پرانے مشرکین (ابوجہل، ابولہب وغیرہ) کا شرک اس حال کو نہیں پہنچا تھا کیونکہ ان کے ہاں سب سے بڑی اور آخری قسم اللہ تعالیٰ کی قسم ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح اگر کسی قبر پرست پر کوئی ظلم ہوجاتا ہے تو وہ اس کا ازالہ قبر والوں ہی سے طلب کرتا ہے، اور اگر قبر پرست کسی پر ظلم کرنے پر آمادہ ہو تو شخصِ مظلوم اگر اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے تو وہ اس کی اس بات کی کوئی پروا نہیں کرتا اور اگر کسی قبر والے یا اس کی تربت کا واسطہ دیکر پناہ مانگے تو فوراً اس ظلم سے باز آجاتا ہے اور کسی بھی تکلیف کے درپے نہیں ہوتا۔

① (هود: ٥٤، ٥٥)
② (الزمر: ٣٦)

یہ سب کفریہ اور شرکیہ عقائد ہیں، انسان اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک خوف کی اس قسم کو اللہ تعالیٰ کیلئے خالص نہ رکھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف اس کے دل میں نہ ہو۔

(۲) خوف کی دوسری قسم: یہ ہے کہ انسان اپنے واجبات مثلاً: جہاد اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کی ادائیگی بلا عذر محض لوگوں کے ڈر کی وجہ سے چھوڑ دے، یہ بھی حرام ہے۔ اس سلسلہ میں عنوانِ بالا کی آیت ﴿ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَاءَهٗ....الخ ﴾ نازل ہوئی، جس کی تفصیل عنقریب پیش کی جائے گی، اور اس کے متعلق ایک حدیث میں آیا ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ لِلْعَبْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ :مَامَنَعَكَ اِذْ رَأَيْتَ الْمُنْكَرَ اَنْ لَا تُغَيِّرَهٗ؟ فَيَقُوْلُ :يَا رَبِّ! خَشِيْتُ النَّاسَ ، فَيَقُوْلُ:اِيَّايَ كُنْتَ اَحَقَّ اَنْ تَخْشٰى "(رواہ احمد) ①

''اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ایک شخص سے کہے گا: کہ تو فلاں برائی کو دیکھ کر اسے مٹانے سے کیوں باز رہا؟ وہ کہے گا: اے میرے پروردگار! میں لوگوں سے ڈر گیا تھا، تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: تجھے تو صرف مجھ ہی سے ڈرنا چاہئے تھا''

(۳) خوف کی تیسری قسم: یہ ہے کہ نافرمانوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ سزاؤں اور وعیدوں سے ڈرتے رہنا۔ اس قسم کا خوف ایمان کے انتہائی بلند ترین مراتب میں شمار ہوتا ہے، اس لیئے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اہلِ جنت کے اوصاف اور خصائل میں انتہائی نمایاں طور پر یہ خوبی بیان فرمائی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وعید سے ڈرتے رہتے ہیں۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ﴾ ②

''یہ ان کیلئے ہے جو میرے سامنے کھڑے ہونے کا ڈر رکھیں، اور میری وعید سے خوف زدہ رہیں''

نیز فرمایا: ﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ ﴾ ③

''اور اس شخص کیلئے جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا، دو دو جنتیں ہیں''

لیکن یہ خوف اتنا زیادہ نہیں ہونا چاہیئے کہ انسان اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت سے قنوطیت اور مایوسی کا شکار ہوجائے، اسی لیئے شیخ الاسلام نے فرمایا ہے، کہ'' اللہ تبارک وتعالیٰ کی وعیدوں سے ڈرتے رہنے کی حد صرف اتنی ہے کہ تم اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانیوں سے باز آجاؤ، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔''

---

① حسن: مسند احمد (۱۱۱۹۴، ۱۱۳۷۸، ۱۱۸۰۷، ۱۱۶۳۹) سنن ابن ماجہ (۴۰۰۸) ابونعیم فی الحلیة (۴/۳۸۴)۔

② (ابراھیم: ۱۴) ③ (الرحمن: ۴۶)

خوفِ طبعی کا بیان

(۴) یہاں خوف کی ایک اور قسم کا بیان رہ گیا ہے، جو خوفِ طبعی کہلاتا ہے، مثلاً دشمن یا درندے یا غرق ہونے وغیرہ کا خوف، یہ خوف قابلِ مذمت نہیں ہے جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ،

﴿ فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَّتَرَقَّبُ ﴾ ①

''پس سیدنا موسیٰ علیہ السلام وہاں سے خوفزدہ ہو کر دیکھتے بھالتے نکل کھڑے ہوئے''۔

قوله: قول الله تعالىٰ: إِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوْهُمْ.....

مصنف رحمہ اللہ نے اس باب کیلئے جس آیت کریمہ کا بطورِ عنوان انتخاب فرمایا ہے، وہ سورۃ آل عمران کی ہے، چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ ②

''یہ خبر دینے والا شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے تم ان کافروں سے نہ ڈرو اور میرا خوف رکھو، اگر تم مؤمن ہو''

مطلب یہ کہ شیطان اپنے دوستوں کی ہیبت وشدت سے مؤمنین کو ڈراتا ہے، تاکہ اس ڈراوے کے ذریعہ وہ مؤمنین کو ان سے جہاد اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی سے روکے رہے اسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے سراسر شیطانی چال اور مکر وفریب قرار دیا ہے، اور ہمیں شیطان کے دوستوں کا خوف مسلط کرنے سے روک دیا، جس کی صورت یہ ہے کہ صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کا خوف اپنے دل میں بٹھایا جائے کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا خوف ہر ایک کے خوف سے بے پروا کر دیتا ہے، جب انسان صحیح معنی میں اللہ تبارک وتعالیٰ پر بھروسہ کرے، تو پھر شیطانی وساوس کے تمام اندیشے مٹ جاتے ہیں، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ پر توکل کرنے والا اس حقیقت کو جانتا ہے کہ اب اللہ تبارک وتعالیٰ میرا حامی اور ناصر ہے، لھذا یہ اولیاء الشیطان میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهِ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ٥ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُّضِلٍّ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ٥ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ قُلْ أَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ إِنْ أَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهِ أَوْ أَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهِ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴾ ③

① (القصص: ۲۱) ② (آل عمران: ۱۷۵) ③ (الزمر: ۳۶تا۳۸)

''کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کیلئے کافی نہیں؟ یہ لوگ آپ کو اللہ تعالیٰ کے سوا اوروں سے ڈرا رہے ہیں اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کردے اسکی راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں۔ اور جسے وہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، کیا اللہ تعالیٰ غالب اور بدلہ لینے والا نہیں ہے؟ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان وزمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یقیناً وہ یہی جواب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے، آپ ان سے کہئے کہ اچھا یہ بتاؤ جنہیں تم اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہو اگر اللہ تعالیٰ مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو کیا یہ اسکے نقصان کو ہٹا سکتے ہیں؟ یا اللہ تعالیٰ مجھ پر مہربانی کا ارادہ کرے تو کیا یہ اس کی مہربانی کو روک سکتے ہیں؟ آپ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے، توکل کرنے والے اسی پر توکل کرتے ہیں''

پھر اولیاء الشیطان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ فَقَاتِلُوْا اَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴾ ①

''پس اولیاء الشیطان سے جنگ اور لڑائی کرو بے شک شیطان کا مکروفریب انتہائی کمزور ہے''

آیتِ مذکورہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ ②

''تم ان کافروں سے نہ ڈرو اور میرا خوف رکھو، اگر تم مؤمن ہو''

اس آیت نے یہ بات واضح کردی کہ بندے کے دل میں جس قدر ایمان پختہ ہوگا اس قدر اولیاء الشیطان کا خوف کمزور ہوگا، اور جس قدر ایمان کمزور ہوگا اس قدر اولیاء الشیطان کا خوف پختہ اور مضبوط ہوگا۔

اس آیتِ کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان کی درستگی اور صحت کیلئے اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں رکھنا ایک انتہائی لازمی شرط ہے، جو شخص اعتقاداً اور عملاً خوفِ خداوندی کا مظاہرہ نہ کرسکا وہ ایمانِ واجب کی دولت سے محروم ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کیلئے اخلاصِ خوف فرائض میں سے ہے۔

① (النساء: ٧٦)

② (آل عمران: ١٧٥)

قال :وقوله تعالیٰ: ﴿ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللهَ ﴾ ①

''اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کی رونق وآبادی توان کے حصہ میں ہے جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں، نماز کے پابند ہوں ،زکوٰۃ دیتے ہوں، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں ،توقع ہے کہ یہی لوگ یقیناً ہدایت یافتہ ہیں''

آیت ﴿ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللهِ .....﴾ کی تفسیر

اس آیت کریمہ میں ان لوگوں کے اوصاف بیان کیئے گئے ہیں جو صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ کے گھروں (مساجد) کو آباد رکھتے ہیں ،اور یہ آباد رکھنا ان کیلئے نفع بخش اور فائدہ مند بھی ہوگا۔ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین سے مساجد کو آباد رکھنے کی نفی فرمادی ہے:

﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسَاجِدَ اللهِ ﴾ ②

''یہ بات مناسب نہیں کہ مشرک اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو آباد کریں''

معلوم ہوا کہ شرک کے ہوتے ہوئے مساجد کا آباد کرنا قطعاً مفید نہیں ہے؛ کیونکہ اہلِ شرک کی تمام نیکیاں "هبآء منثوراً"، یعنی کہ برباد ہیں، بلکہ شرک ایک ایسی آگ ہے جو تمام نیکیوں کو جلا کر راکھ بنا دیتی ہے،لھذا اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے وہ اوصاف وشرائط بیان فرمائے ہیں جن کے حامل افراد کو مساجد میں جانے اور انہیں آباد رکھنے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا فائدہ حاصل ہوگا، وہ شرائط یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ پر صحیح اور کامل ایمان (۲) روزِ آخرت پر ایمان (۳) اقامتِ صلوٰۃ (۴) ادائیگی زکوٰۃ (۵) اورصرف اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کے سوا کسی طاغوت کا خوف دل میں نہ رکھنا۔

مصنف رحمہ اللہ کا اس آیت کو یہاں لانا درحقیقت اس آخری شرط کو واضح کرنا ہے، چنانچہ آیتِ کریمہ سے انتہائی صراحت کے ساتھ یہ حقیقت آشکارہ ہوتی ہے کہ شرک سے نجات کیلئے ضروری ہے کہ ایک اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں بٹھاتے ہوئے ہر غیر اللہ کے خوف کی نفی کردی جائے ،اور اگر یہ بات نہیں تو پھر شرک کی آلودگی سے دامن پاک نہیں ہوسکتا۔

شرک فی ذاتہ ایک ایسی آگ ہے جو تمام اعمال کو جلا کر راکھ بنا دیتی ہے، کیونکہ خوف بھی حافظ ابن القیم رحمہ اللہ =

① (التوبہ: ۱۸) ② (التوبة: ۱۷)

قال: وقوله تعالیٰ: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ①

''اور بعض لوگ ایسے ہیں جو زبانی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ کی راہ میں کوئی مشکل آن پڑتی ہے تو لوگوں کی ایذاء دہی کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کی طرح بنا لیتے ہیں، ہاں اگر اللہ تعالیٰ کی مدد آجائے تو پکار اٹھتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھی ہی ہیں کیا دنیا جہان کے دلوں میں جو کچھ ہے اس سے اللہ تعالیٰ باخبر نہیں ہے۔''

=

کے قول کے مطابق ایک قلبی عبادت ہے جیسا کہ تذلل، انابت، محبت، توکل اور امید وغیرہ یہ سب قلبی عبادتیں ہیں، لھذا جس طرح ان تمام قلبی عبادتوں کا مستحق صرف ایک اللہ تعالیٰ ہے، اسی طرح خوف وخشیت بھی ایک ایسی عبادت ہے جو صرف اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ کے لائق ہے، اور کسی بھی غیر اللہ کی طرف یہ حق منتقل کرنا شرک شمار ہوگا۔

آیت ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ..... ﴾ کی تفسیر

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی حالتِ زار کی خبر دی ہے، جو محض زبانی کلامی ایمان کے دعوے رکھتے ہیں، اور ان کے دل ایمان کے ثبوت اور رسوخ سے مکمل عاری ہیں، چنانچہ جب انہیں ذرا سا کسی دنیوی آزمائش سے جھنجھوڑا جاتا ہے، تو وہ اُسے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سمجھتے ہوئے اسلام سے مرتد ہو جاتے ہیں''

اس قسم کی تفسیر سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کی طرف انبیاء ومرسلین علیہم السلام کو مبعوث فرماتا ہے تو ان کی دعوت کو لوگ سن کر دو طرح کی روش اپنا لیتے ہیں، کچھ تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، اور کچھ ان میں سے ایمان قبول نہیں کرتے، اپنے کفر اور گناہوں سے آلودہ زندگی پر مستمر رہتے ہیں۔

اب ایمان کا دعویٰ رکھنے والوں کو اللہ تعالیٰ مختلف تکالیف کے ساتھ آزماتا ہے، تاکہ جھوٹے سچے اور

---

① (العنکبوت: ۱۰)

....

کھوٹے کھرے کی مشاہدۂ تمیز اور پہچان ہو جائے۔اور جو ایمان نہیں لاتے (وہ آزمائشوں کے نہ ہونے کی وجہ سے) قطعاً یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو عاجز کر دیا ہے، اور ہم اس کی گرفت سے بچ جائیں گے۔

اب انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے اور ان کی فرماں برداری کرنے والے اشخاص کے دوسرے لوگ یقیناً دشمن بن جائیں گے، اور پھر دشمنی قائم ہونے کے بعد انہیں مختلف تکالیف و آلام کا نشانہ بنائیں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش ہے، جب کہ ایمان نہ لانے والے پہلے پہل کچھ دنیوی لذات و مفادات سے متمتع ہونگے اور پھر دنیا و آخرت کی سزاؤں کا نشانہ بن جائیں گے، بلکہ ان کی سزائیں انتہائی سخت اور دائمی ہونگی۔

الغرض کوئی ایمان لائے یا نہ لائے تکلیف ضرور اٹھائے گا، فرق صرف یہ ہے کہ مؤمن پہلے پہل مختلف آزمائشوں اور فتنوں کی صورت میں تکلیف اٹھائے گا، پھر دنیا میں اس کا انجام بالآخر بہتر ہو جائے گا، جبکہ اخروی نعمتیں تو یقیناً حاصل ہونگی۔ اور ایمان سے اعراض کرنے والا ابتداءً کچھ لذتوں سے ہمکنار ہو سکتا ہے، لیکن بالآخر دائمی عذاب اُس کا مقدر بن جائے گا......

مذکورہ آیت کے متعلق امام ابن القیم رحمہ اللہ کا کلام

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

''مذکورہ آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اُس شخص کی حالتِ زار ذکر فرمائی ہے جو بلا بصیرت ایمان میں داخل ہوتا ہے، اب تکلیفوں کا آنا ایک طبعی امر ہے، چنانچہ اسے جونہی کوئی تکلیف لاحق ہوتی ہے تو وہ اس قدر خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ لوگوں کی اُس معمولی اور عارضی تکلیف کو اللہ تعالیٰ کے شدید اور دائمی عذاب کی طرح سمجھ بیٹھتا ہے نتیجۃً ایمان سے منحرف ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال اُس شخص جیسی ہے جو گرم ریت سے بچنے کیلئے آگ کا سودہ کر لیتا ہے، جو ایک گھڑی کی تکلیف سے بچنے کیلئے دائمی عذاب کا خریدار بن جاتا ہے۔ ایک مؤمن جو توحید کی برکت سے قوی الایمان بن جاتا ہے، وہ اپنی کمالِ بصیرت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب الیم سے بچنے کی فکر میں مبتلا رہتا ہے، اور اس راہ میں آنے والی دنیا کی معمولی تکالیف کو برداشت کر لیتا ہے۔'' (انتہی ملخصا)

اس آیتِ کریمہ کا خوف کے اس باب سے تعلق واضح ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص محض لوگوں کی آزمائشوں اور فتنوں سے ڈر کر ایمان اور توحید سے انحراف اختیار کر لیتا ہے تو اسکا یہ خوف، غیر اللہ کے خوف کے قبیل سے ہے، جبکہ امرِ مطلوب یہ ہے کہ صرف اللہ رب العزت کا خوف دلوں میں راسخ ہونا چاہیئے، اس یقین کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کی ضرور مدد فرماتا ہے۔

قال:عن أبي سعيد ﷺ مرفوعا:"إِنَّ مِنْ ضُعْفِ الْيَقِيْنِ أَنْ تَرْضَى النَّاسَ بِسَخَطِ اللّٰهِ، وَأَنْ تَحْمَدَهُمْ عَلٰى رِزْقِ اللّٰهِ، وَأَنْ تَذُمَّهُمْ عَلٰى مَالَمْ يُؤْتِكَ اللّٰه، إِنَّ رِزْقَ اللّٰهِ لَايَجُرُّهُ حِرْصُ حَرِيْصٍ، وَلَا يَرُدُّهُ كَرَاهِيَةُ كَارِهٍ" ①

سیدنا ابوسعید الخدری ﷺ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے لوگوں کو راضی کرنا، ضعفِ یقین سے ہے، نیز اللہ تعالیٰ کے رزق کو پاکر لوگوں کا شکریہ ادا کرنا یا اللہ تعالیٰ کا رزق حاصل نہ ہونے کی صورت میں لوگوں کی مذمت کرنا (بھی کمزور یقین کی نشانی ہے) بلاشبہ کسی حریص اور لالچی شخص کی حرص اللہ تعالیٰ کے رزق کو کھینچنے کا سبب نہیں بنتی، نہ ہی کسی ناپسند کرنے والے کی ناپسندیدگی اللہ تعالیٰ کے رزق کو روکنے کا سبب بن سکتی ہے''

تین چیزیں ضعفِ ایمان کی علامت ہیں

اس حدیث کو حافظ ابونعیم الاصبہانی نے ''الحلیة'' میں روایت کیا ہے، امام بیہقی نے بھی ''شعب الایمان'' میں اسے ذکر کیا ہے، اور اس حدیث کو محمد بن مروان السدی اور عطیہ العوفی کی وجہ سے معلول قرار دیا ہے۔ مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کی سند ضعیف ہے لیکن معنیٰ صحیح ہے۔

یہ حدیث قوتِ یقین کا درس دیتی ہے، اس کی تائید سیدنا عبد اللہ بن مسعود ﷺ کے اس قول سے ہوتی ہے: "اَلْيَقِيْنُ الْاِيْمَانُ كُلُّهُ وَالصَّبْرُ نِصْفُ الْاِيْمَانِ" ②

''یقین تو مکمل ایمان ہے اور صبر آدھا۔''

اس حدیث میں تین چیزوں کو ضعفِ ایمان و یقین کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

(۱) ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رضاء پر لوگوں کی رضاء کو ترجیح و تقدیم دی جائے، جس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص محض لوگوں کو خوش کرنے کیلئے (یا اُن کے شر سے بچنے کیلئے) اللہ تعالیٰ کی کسی نافرمانی کا ارتکاب کرلے، یہ کیفیت ضعفِ یقین ہی سے پیدا ہوتی ہے، جبکہ جس بندے کا یقین قوی ہوتا ہے وہ اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہوتا ہے کہ نافع اور ضار صرف اللہ رب العزت کی ذات ہے، کسی غیر اللہ کے پاس خواہ وہ کوئی بھی ہو کسی قسم کا کوئی امر نہیں، لھذا وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے ڈرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا، یہی بات

---

① حلية الأولياء(٥/١٠٦)، (١٠/٤١) شعب الايمان (١/١٥١) سنن الكبرىٰ للبيهقي(٩/٤٣٦)۔

② اس کی سند صحیح ہے۔ اس کے پہلے حصے کو امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الایمان میں تعلیقا ذکر کیا ہے، ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسے طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ (الفتح(١/٤٨) الترغيب والترهيب (٤/٢٧٧) مجمع الزوائد(١/٥٧)۔

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی: ﴿ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَداً إِلَّا اللهَ وَكَفَىٰ بِاللهِ حَسِيباً ﴾ ①

''اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ حساب لینے کیلئے کافی ہے''

(۲) دوسری چیز جو کمزور یقین کی علامت ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رزق پر لوگوں کی تعریف کی جائے، یعنی رزق یا نعمت کو لوگوں کی طرف منسوب کیا جائے، اور منعم حقیقی اللہ رب العالمین کو بھلا دیا جائے۔ البتہ اگر کسی شخص کو کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے اور اس کے بعد اُس شخص کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے جو اُس نعمت کے حصول کا باذن اللہ سبب بنا تو یہ شرعی مقاصد کے خلاف نہیں ہے، بلکہ حدیثِ رسول ﷺ: "مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَا يَشْكُرِ اللّٰهَ" ② کے بمصداق ایسا کرنا ضروری ہے۔

(۳) تیسری چیز جسے ضعفِ یقین کی نشانی بتایا گیا ہے، یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں سے کسی چیز کا سوال کرے اور لوگ اسے وہ چیز نہ دیں تو وہ اُن کی مذمت شروع کر دے، اگر اُسے یہ پختہ یقین ہو کہ کسی چیز کی عطاء یا منع اللہ تعالیٰ کے امر سے ہے اور مخلوق تو اپنے نفس کیلئے کسی نفع یا نقصان کی مالک نہیں تو پھر وہ یقیناً لوگوں کو بُرا بھلا کہنے سے گریز کرے گا۔ یہی نکتہ قرآنِ حکیم میں ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہے: ﴿ مَا يَفْتَحِ اللهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ ③

''اللہ تعالیٰ جو رحمت لوگوں کیلئے کھول دے سو اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں، اور جس کو بند کر دے سو اس کے بعد اس کا کوئی جاری کرنے والا نہیں اور وہی غالب حکمت والا ہے''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یقین کا ایک مقام تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کی ادائیگی اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین ہو۔ دوسرا مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر، تدبیر اور تخلیق پر یقین ہو، اگر آپ اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے لوگوں کو راضی کریں گے تو آپ کو نہ تو اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین ہے نہ رزق عطاء فرمانے پر؛ کیونکہ انسان لوگوں کی رضاء کا اس وقت طالب ہوتا ہے جب ان کے ہاتھوں میں موجود کسی چیز کا لالچ ہو، دریں صورت وہ اللہ تعالیٰ کے امر کی ادائیگی سے غافل ہو کر لوگوں کی رضاء جوئی پر قائم ہو جاتا ہے، یا پھر یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر اس کا یقین وتصدیق کمزور ہو۔ حالانکہ بندہ اگر صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کے راستے پر گامزن ہو جائے تو اللہ رب العزت اس کی مدد بھی فرمائے گا، رزق بھی عطا فرمائے گا اور مخلوق سے مستغنی بھی کر دے گا'' (انتھیٰ ملخصا)

① (الاحزاب: ۳۹) ② صحیح: سنن ابو داؤد، باب فی شکر المعروف، رقم (۴۸۱۱) سنن ترمذی (۲۰۳۷)
③ (الفاطر: ۲)

قال: وعن عائشة أن رسول الله ﷺ قال: "مَنِ الْتَمَسَ [رِضَى] اللهِ بِسَخطِ النَّاسِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَأَرْضَى عَنْهُ النَّاسَ، وَمَنِ الْتَمَسَ رِضَى النَّاسِ بِسَخطِ اللهِ سَخَطَ اللهُ عَلَيْهِ وَأَسْخَطَ عَلَيْهِ النَّاسَ" (رواه ابن حبان فی صحیحه) ①

اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص لوگوں کو ناراض کر کے اللہ تعالیٰ کی رضاء کا طالب ہو، اللہ تعالیٰ اُس سے راضی ہو جائے گا، اور لوگوں کو بھی اُس سے راضی کر دے گا، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے لوگوں کی رضاء کا طالب ہو گا اللہ تعالیٰ اُس پر ناراض ہو جائے گا، اور لوگوں کو بھی اُس پر ناراض کر دے گا۔ (صحیح ابن حبان)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو نصیحت (حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا)

اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہ حدیث سیدنا امیر معاویہ ﷺ کو اپنے ایک خط میں لکھ کر بھیجی تھی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس حدیث کو دین کی ایک بہت بڑی فقہ قرار دیا ہے، چنانچہ حقیقی تقویٰ کی اساس یہی ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی رضاء جوئی میں مصروف و مستمر رہے، اور لوگوں کی ناراضگی سے بے خوف و بے پرواہ ہو جائے ﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا. وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ ②

''اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کیلئے چھٹکارے کی شکل نکال دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہ ہو''

ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ بھی راضی ہو جائے گا اور لوگوں کے دلوں میں بھی اپنے اس بندہ کی محبت اور رضا ڈال دے گا، اور وہ رضا بھی ایسی ہو گی جو دنیوی اغراض سے پاک ہو گی۔

اور اس کے برعکس اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے لوگوں کو راضی کرے گا تو وہ ہمیشہ پچھتاوے کا شکار رہے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے ساتھ ساتھ لوگوں کی ناراضگی کا بھی اُسے سامنا رہے گا۔ اس کیفیت کا محرک مخلوق کا خوف ہے، اور اگر صرف خالقِ حقیقی کا خوف ہو گا تو بندہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے مخلوق کو راضی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ کا خالص خوف پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ بندہ تمام مخلوقات کو عاجز اور فقیر سمجھے نیز یہ عقیدہ

① صحیح ابن حبان (۱۵۴۲،۱۵۴۱) سنن ترمذی (۲۴۱۴) الزهد لأحمد (ص ۱۶۴) سلسلة الأحاديث الصحيحة (۲۳۱۱)

② (الطلاق: ۲،۳)

بنالے کہ مخلوقات کو کسی نفع وضر کا کوئی اختیار نہیں، بلکہ اُن کے پاس جو کچھ بھی ہے اللہ تعالیٰ کی عطاء ہے، جب یہ عقیدہ بن جائے گا تو ایک مؤحدِ مخلص اللہ تعالیٰ کی رضا پر، مخلوق کی رضا کو قطعی ترجیح نہ دے گا۔

اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں مخلوقات کے خوف میں مبتلا ہونا تو منافقین کا شیوہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَأَنتُمْ أَشَدُّ رَهْبَةً فِي صُدُورِهِم مِّنَ اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ﴾ ①

''(مسلمانو! یقین مانو) کہ تمہاری ہیبت ان کے دلوں میں بہ نسبت اللہ تعالیٰ کی ہیبت کے بہت زیادہ ہے، یہ اس لیئے کہ یہ بے سمجھ لوگ ہیں''

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ کا مختصر مگر عظیم کلام

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا ہے:

''جس شخص کو معلوم ہو کہ مٹی پر موجود ہر چیز درحقیقت مٹی ہی ہے تو پھر وہ ایک مٹی کی اطاعت کو رب الأرباب کی اطاعت پر کیسے مقدم کرسکتا ہے؟ یا اللہ رب العزت کو ناراض کرکے مٹی کی رضا کا کیسے طالب بن سکتا ہے۔ (اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ) ''

اللهم إنا نعوذ برضاك من سخطك، وبعفوك من عقوبتك، وبك منك، لانحصي ثناء عليك أنت كما أثنيت على نفسك.



① (الحشر:١٣)

اس باب کے مسائل

(۱) سورۂ آل عمران کی آیت کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) سورۂ التوبہ کی آیت کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۳) سورۂ العنکبوت کی آیت کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۴) یہ بات واضح ہوئی کہ یقین کمزور بھی ہوتا ہے، اور مضبوط بھی۔

(۵) کمزور یقین کی تین علامات بیان ہوئیں۔

(۶) صرف اللہ تعالیٰ کا خوف، فرائض دین میں سے ہے۔

(۷) صرف اللہ تعالیٰ کا خوف اختیار کرنے والوں کا ثواب ذکر ہوا۔

(۸) اللہ تعالیٰ کے خوف کی بجائے مخلوق کا خوف اختیار کرنے والوں کی سزا اور وعید ذکر ہوئی۔



باب
اللہ تعالیٰ پر توکل کا بیان

﴿ وَعَلَى اللهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ ①

''اور صرف اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کرو، اگر تم مؤمن ہو''

توکل کا معنی

ابو السعادات (ابن الأثیر) نے ''توکل'' کی لغوی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے ''کہ جب کوئی شخص اپنا کام انجام دینے سے عجز اور ضعف محسوس کرے، پھر کسی دوسرے شخص پر بھروسہ اور اعتماد کرتے ہوئے اپنا وہ کام اس یقین کے ساتھ اُسے سونپ دے کہ وہ یہ کام ضرور پورا کردے گا، توکل کہلاتا ہے۔''

توکل ایک ایسی فرض عبادت ہے جس کا اللہ تعالیٰ کیلئے خالص ہونا ضروری ہے، بلکہ توکل کا افضل ترین عبادت، اور اعلیٰ ترین مقاماتِ توحید میں شمار ہوتا ہے۔ خواص مؤمنین ہی کما حقہ، توکل علی اللہ کا صحیح مظاہرہ کرپاتے ہیں۔ جن ستر ہزار افراد نے بلا حساب وعذاب جنت میں داخل ہونا ہے اُن کا نمایاں وصف توکل علی اللہ ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی بے شمار آیات میں توکل کا حکم ارشاد فرمایا، آپ کو یہ حکم دیگر بہت سے فرائض سے کہیں زیادہ ملے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے توکل کو صحتِ ایمان اور اسلام کی شرط قرار دیا ہے، چنانچہ آیتِ مذکورہ جس پر مؤلف رحمہ اللہ نے توکل کا عنوان قائم فرمایا ہے، سے واضح ہو رہا ہے کہ توکل علی اللہ کے نہ ہونے سے بندے کا ایمان منتفی ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَعَلَى اللهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ ①

''اور صرف اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کرو، اگر تم مؤمن ہو''

نیز فرمایا: ﴿ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴾ ②

''اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو تو صرف اُسی پر توکل کرو اگر ہو تم مسلمان''

اس کے علاوہ بہت سے مقامات پر بصیغۂ امر توکل کا حکم دیا، چنانچہ فرمایا:

﴿ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ ③

''اسی کی عبادت کر اور اسی پر توکل کر''

---

① (المائدة: ٢٣) ② (یونس: ٨٤) ③ (هود: ١٢٣)

نیز فرمایا:﴿ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآاِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلاً ﴾ ①

''مشرق اور مغرب کا پروردگار ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، تم اسی کو اپنا کارساز بنالو''

نیز فرمایا:﴿ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلاً ﴾ ②

''تم میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ''

نیز فرمایا:﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَايَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ﴾ ③

''اس ہمیشہ زندہ اللہ تعالیٰ پر توکل کریں جسے کبھی موت نہیں، اور اسکی تعریف کے ساتھ پاکیزگی بیان کرتے رہیں، وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے کافی خبردار ہے''

نیز فرمایا:﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآاِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴾ ④

''پھر اگر روگردانی کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میرے لیئے اللہ تعالیٰ کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے میں نے اسی پر توکل کیا اور وہ بڑے عرش کا مالک ہے''

رسول اللہ ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے: "لَوْ اَنَّكُمْ تَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ تَغْدُوْا خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا" ⑤

یعنی: ''اگر تم اللہ تعالیٰ پر کماحقہ توکل کرلو تو وہ تمہیں اس طرح روزی دے گا، جیسے پرندے کو دیتا ہے کہ وہ صبح اپنے گھونسلے سے خالی پیٹ نکلتا ہے، اور شام کو بھرے پیٹ لوٹتا ہے۔''

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''توکل، فعلِ قلب ہے۔''

ابو اسماعیل الانصاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''توکل اصل مالک کی طرف معاملے کو سونپنے، اور اس کی وکالت پر مکمل بھروسہ کرنے کا نام ہے۔''

واضح ہو کہ آیتِ مذکورہ جس پر مؤلف رحمہ اللہ کا باب قائم ہے (وَعَلَى اللهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ) پر غور کرنے سے مزید حقیقتِ توکل نکھرے گی۔ اس آیتِ کریمہ میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے، جو اپنی

① (المزمل: ٩) ② (الاسراء: ٢)

③ (الفرقان: ٥٨) ④ (التوبه: ١٢٩)

⑤ صحیح: الزهد لإبن المبارك (٥٥٩) مسند أبو داؤد الطيالسي (٥٠) مسند احمد ١/ ٣٧٠،٢٠٥ سنن الترمذى (٢٣٤٤) صحيح ابن حبان (٥٤٨) مستدرك حاكم (٣١٨/٤) امام حاکم نے اسکی تصحیح کی ہے اور امام ذھبی نے اسکی موافقت کی ہے) سنن ابن ماجه (٤١٦٤) اور امام مناوی نے "التيسير" (٣٠٦/٢) میں اس کی تصحیح کی ہے۔

قوم کو ارضِ مقدسہ (جس میں داخل ہونے کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا تھا) میں داخل ہونے کا حکم دے رہے ہیں، اور یہ فرمارہے ہیں کہ اگرچہ وہاں انتہائی ظالم اور سرکش قوم آباد ہے جس کا تمہیں خوف ہے، مگر تم ان سے ڈرے بغیر صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے قدم بڑھاتے جاؤ، اور اللہ تعالیٰ کے وعدۂ نصرت کو بالکل حق اور سچ مان لو تو اس توکل علی اللہ کے عظیم الشان مظاہرہ پر اللہ تعالیٰ تمہاری ضرور مدد فرمائے گا۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہاں اللہ تعالیٰ نے توکل علی اللہ کو صحتِ ایمان کیلئے شرط قرار دیا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ توکل علی اللہ نہ ہونے سے ایمان کی نفی ہوجاتی ہے۔

جبکہ دوسری آیتِ کریمہ: ﴿ قَالَ مُوسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴾ ①

''اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو تو صرف اُسی پر توکل کرو اگر ہو تم مسلمان''

میں توکل کو صحتِ اسلام کیلئے شرط قرار دیا ہے (جس کا معنی یہ ہے کہ توکل علی اللہ کے نہ ہونے سے اسلام باقی رہتا ہے نہ ایمان)

ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ ②

''ایمان والے صرف اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کریں''

یہاں ایمان کے وصف کا بطورِ خاص ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ بندے کا ایمان اپنی صحت برقرار رکھنے کیلئے توکل کا متقاضی ہے۔

بندے کا قوی توکل، قوی ایمان کی، جبکہ ضعیف توکل، ضعیف ایمان کی علامت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں توکل کو کہیں تو ایمان کے ساتھ ذکر کیا ہے، کہیں تقویٰ کے ساتھ، کہیں اسلام کے ساتھ اور کہیں ہدایت کے ساتھ، جو اس بات کی دلیل ہے کہ توکل تمام مقاماتِ ایمان واحسان اور جملہ اعمالِ اسلام کو شامل ہے، اور توکل کا بقیہ امورِ دین کے ساتھ وہی تعلق ہے جو جسم کا سر کے ساتھ ہے۔ جس طرح سر، صرف جسم پر قائم ہوتا ہے، اسی طرح ایمان اور اس کے تمام مقومات توکل کے مضبوط ستون پر قائم ہیں۔''

واضح ہو کہ جب توکل علی اللہ کا عبادت ہونا، نیز اس کا فرائضِ دین میں داخل ہونا ثابت ہوگیا تو پھر توکل علی غیر اللہ شرک ہوگا۔

---

① (یونس: ٨٤)

② (ابراهيم: ١١)

....

....

....

....

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو شخص کسی مخلوق کے پاس جائے، اوراس پر توکل کرے، تو وہ اللہ تعالیٰ کے بارہ میں بدگمانی کا شکار ہے اور مشرک ہے، اور مشرک کا انجام کیا ہے: ﴿ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴾ ①

''اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرنے والا گویا آسمان سے گر پڑا، اب یا تو اُسے پرندے اُچک لے جائیں گے یا ہوا کسی دور دراز کی جگہ پھینک دے گی''

توکل علی غیر اللہ کی دو صورتیں

واضح ہو کہ توکل علی غیر اللہ کی دو صورتیں ہیں:

(۱) ایک یہ کہ کوئی شخص کسی مخلوق پر اُن امور کے سلسلہ میں توکل کرے جن کے عطاء فرمانے پر صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے، جیسے مُردوں اور طاغوتوں پر نصرت، حفاظت، رزق یا شفاعت جیسے مطالب کے حصول کے سلسلہ میں توکل کر لینا ...... تو یہ شرک اکبر ہے، کیونکہ ان تمام امور کی عطاء پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو قدرت حاصل نہیں ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ ظاہری اور عادی اسباب کے سلسلہ میں کسی پر بھروسہ کرنا جیسے کوئی امیر یا بادشاہ جس کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کے خزانے رکھے ہیں، یا دفعِ مظالم کی طاقت رکھی ہے، تو حصولِ مال یا ازالۂ ظلم کیلئے ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، مگر اس میں بھی شرط یہ ہے کہ اصل توکل اللہ تعالیٰ ہی پر ہو، اور ان کی مدد کو اللہ تعالیٰ کی توفیق وتیسیر قرار دے۔ بصورتِ دیگر یہ صورت شرکِ خفی کے زمرے میں آجائے گی۔ (واللہ المستعان)

① (الحج: ۳۱)

قال :وقوله ﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ إِذَا ذُكِرَ اللهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾ ①

''بس ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو انکے قلوب ڈر جاتے ہیں''

مؤمنین کی صفات

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: چونکہ منافقین کے دل، ادائیگی فرائض کے وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خالی ہوتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی آیات پر ایمان بھی نہیں رکھتے، اللہ تعالیٰ پر توکل بھی نہیں کرتے، تنہا ہوں تو نماز بھی نہیں پڑھتے اور نہ اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، تو پھر یہ مؤمن کیسے ہو سکتے ہیں، جبکہ مؤمنین کے اوصاف تو یہ ہیں:

﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ إِذَا ذُكِرَ اللهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهُ زَادَتْهُمْ إِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ . الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ . أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ﴾ ①

''بس ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلوب ڈر جاتے ہیں، اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ لوگ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ جو کہ نماز کی پابندی کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو کچھ دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ سچے ایمان والے یہی لوگ ہیں''

پہلا وصف یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو وہ خوف کے مارے کانپ اُٹھتے ہیں، پھر نتیجۃً اللہ تعالیٰ کے فرائض و اوامر کو بجالانے اور زواجر و نواہی سے اجتناب کرنے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ خوف کا لازمی تقاضا اور نتیجہ یہی ہے کہ بندہ اطاعت و فرمانبرداری کے منہج پر قائم ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى . فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى ﴾ ②

''ہاں جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا ہوگا، اور اپنے نفس کو خواہش سے روکا ہوگا تو اس کا ٹھکانہ جنت ہی ہے''

امام سدی آیتِ کریمہ (إِذَا ذُكِرَ اللهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ ....) کی تفسیر میں فرماتے ہیں: '' اس سے مراد وہ شخص ہے جو کسی گناہ کا ارادہ کرتا ہے، اس سے کہا جاتا ہے: ''اِتَّقِ اللهَ'' (اللہ تعالیٰ سے ڈر جا) تو اللہ تعالیٰ کا نام سنتے ہی وہ کانپ اُٹھتا ہے، اور اس گناہ سے باز آجاتا ہے۔ ''

=

① (الانفال: ۲ تا ٤) ② (النازعات: ٤٠، ٤١)

قال و قوله تعالیٰ: ﴿ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ ①

''اے نبی (ﷺ)! تجھے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور ان مؤمنوں کو جو تیری پیروی کر رہے ہیں''

=

دوسرا وصف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو سن کر ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام اس آیتِ کریمہ سے ایمان کی کمی وزیادتی کا استدلال کیا کرتے تھے (یہی اہل الحدیث کا عقیدہ ہے ولله الحمد والمنّة)

عمر بن حبیب (الصحابی) فرماتے ہیں: ''ایمان زیادہ اور کم ہوتا ہے، کسی نے پوچھا: کیسے؟ جواب دیا: جب ہم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی خشیت کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں تو ایمان بڑھ جاتا ہے، اور جب ذکر اللہ سے غافل ہوں اور اللہ تعالیٰ کو بھلا دیں تو ایمان کم ہو جاتا ہے۔''

ایمان قول وعمل کا نام ہے اور اس پر امام شافعی، احمد اور ابو عبید رحمہم اللہ وغیرہ نے اجماع نقل فرمایا ہے۔

تیسرا وصف یہ ہے کہ وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں: ''جس کا معنی یہ ہے کہ اپنے تمام امور اللہ وحدہ لاشریک کو سونپ کر اپنے دلوں سے حقیقۃً اس کی ذات پر توکل کر لیتے ہیں، اس کے سوا کسی سے امیدیں وابستہ نہیں کرتے، نہ کسی کا قصد کرتے ہیں، اور نہ ہی اُسے چھوڑ کر کسی اور کی طرف راغب ہوتے ہیں، علماً وعقیدۃً ان پر یہ بات روشن اور عیاں ہے کہ جو صرف اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، اور جو اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا وہ قطعاً نہیں ہو پاتا، وہ اپنی بادشاہت میں اکیلا ہی تصرف کرنے والا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔''

آیت ﴿ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ .... ﴾ کی صحیح تفسیر

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات بیان فرمائی ہے کہ اے نبی (ﷺ)! اللہ تعالیٰ تجھے کافی ہے، اور تیرے تمام پیروکاروں کو کافی ہے، لھذا آپ کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا محتاج نہیں ہونا چاہیئے۔

بعض لوگ اس آیت کا معنی یوں کرتے ہیں: اے نبی (ﷺ)! اللہ تعالیٰ اور مؤمنین تجھے کافی ہیں۔

(امام ابن القیم رحمہ اللہ) فرماتے ہیں: یہ معنی بالکل غلط ہے اس معنی پر اس آیتِ کریمہ کو محمول کرنا ہرگز جائز نہیں ہے؛ کیونکہ کافی ہونا صرف اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہے۔ جیسے توکل، تقویٰ اور عبادت اللہ تعالیٰ کیلئے ہے، اسی طرح طلبِ کفایت بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے، چنانچہ اس آیتِ کریمہ پر غور کیجئے: ﴿ وَإِنْ يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللهُ هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ ﴾ ②

① (الانفال: ٦٤)　② الانفال: ٦٢)

''اگر وہ تجھ سے دغا بازی کرنا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ تجھے کافی ہے، اسی نے اپنی مدد سے مؤمنوں سے تیری تائید کی ہے''

یہاں (حَسْبُكَ) یعنی کافی ہونا، خاص اللہ تعالیٰ کیلئے مذکور ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ کسی کیلئے مطلق طور پر کافی ہونا یا کسی کے جملہ امور کی کفایت کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ جہاں تک تائید کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق: ﴿ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ ①

اللہ تعالیٰ اپنی نصرت اور مؤمنین کے ساتھ، اپنے پیغمبر کی تائید فرماتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ان موحد بندوں کی تعریف بیان فرمائی جن کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمیں صرف اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ ②

''وہ لوگ کہ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ کافروں نے تمہارے مقابلے میں لشکر جمع کر لئے ہیں، تم ان سے خوف کھاؤ تو اس بات نے انہیں ایمان میں اور بڑھا دیا، اور کہنے لگے ہمیں اللہ کافی ہے، اور وہ بہت اچھا کارساز ہے''

یہاں غور کیجئے کہ ان مؤمنین موحدین نے ''حَسْبُنَا اللّٰهُ'' کہا ہے، ''حَسْبُنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ'' نہیں کہا، تو پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ مؤمنین تو اپنے لیئے رسول اللہ ﷺ کا کافی ہونا ذکر نہ کریں، مگر اللہ تعالیٰ اپنے رسول کیلئے مؤمنین کو کافی قرار دے دے۔ لھذا یہ مفہوم قطعی محال اور باطل ہے۔

اس نکتہ کو مزید سمجھنے کیلئے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر بھی غور کیجئے: ﴿ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗ اِنَّا اِلَى اللّٰهِ رَاغِبُوْنَ ﴾ ③

''اور کہہ دیتے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل سے دے گا، اور اس کا رسول ﷺ بھی، ہم تو اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف رغبت کرنے والے ہیں''

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ''ایتاء'' یعنی دینے کی نسبت اپنی، اور اپنے رسول ﷺ کی طرف فرمائی؛ کیونکہ رسول ﷺ اس فرمان کے بموجب کچھ دیتے ہیں، جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ وَمَاۤ اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ﴾ ④ =

① (الانفال: ٦٢) ② (آل عمران: ١٧٣)
③ التوبة: ٥٩) ④ (الحشر: ٧)

قال: وقولہ: ﴿ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ﴾ ①

''اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے کافی ہوگا''

=

''اور تمہیں جو کچھ رسول دے لے لو''

لیکن اسی آیتِ کریمہ میں جب ''حَسْبُ'' یعنی کافی ہونا، ذکر ہوا تو یہ خاص اللہ رب العزت کیلئے ذکر ہوا، جس سے یہ واضح ہوا کہ یہ خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اسی طرح اس آیتِ کریمہ کے آخر میں ﴿ إِنَّا إِلَى اللهِ رَاغِبُونَ ﴾ کیونکہ رغبت بھی اللہ تعالیٰ کیلئے خاص ہے،

جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَإِلَى رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴾ ②

''اور اپنے پروردگار کی طرف رغبت کریں''

لھذا رغبت، توکل، انابت اور حسب یعنی کافی ہونا، اللہ رب العزت کے ساتھ ہے، جیسے عبادت، تقویٰ، سجدہ، نذر اور قسم وغیرہ اللہ رب العزت کیلئے خاص ہیں۔ ''

ہماری اس تقریر سے آیتِ کریمہ: ﴿ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللهُ..... ﴾ کی توکل کے باب سے مناسبت واضح ہوگئی، اور وہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہی اپنے رسول اور جملہ مؤمنین کیلئے کافی ہے تو پھر وہی ذات توکل اور بھروسے کے لائق ہے۔ ﴿ فَنِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴾

توکل کی فضیلت کی زبردست دلیل

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکل کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کیلئے کافی ہوگا، اور جس کیلئے اللہ تعالیٰ کافی ہوگا اسے اسکا کوئی دشمن یا کوئی موذی چیز نقصان نہ دے سکے گی۔''

مزید فرماتے ہیں: ''یہ آیتِ کریمہ توکل کی زبردست فضیلت ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ جو توکل کرے گا، اسے یہ اجر دونگا، بلکہ یہ فرمایا جو مجھ پر توکل کرے گا، میری ذات اس کیلئے کافی ہے، جس کا معنی یہ ہوا کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ پر کما حقہ توکل کرے گا، آسمان اور زمین کی ہر چیز اسکے خلاف سازش پر مجتمع ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسے مخرج مہیا فرما دے گا؛ کیونکہ اس کیلئے اللہ تعالیٰ کی ذات کافی اور وافی ہے۔''

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الزھد" میں وھب بن منبہ کا یہ اثر نقل فرمایا ہے: =

① (الطلاق: ٣) ② (الانشراح: ٨)

قال: عن ابن عباس رضی الله عنهما:قال: ﴿ حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ قَالَهَا إِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ حِيْنَ أُلْقِيَ فِي النَّارِ، وَقَالَهَا مُحَمَّدٌ ﷺ حِيْنَ قَالُوْا ﴿ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيْمَانًا....الآية ﴾ (١)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ﴿ حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ یہ کلمہ سیدنا ابراھیم علیہ السلام نے اس وقت کہا تھا جب انہیں آگ میں ڈالا گیا تھا، اور یہ کلمہ محمد ﷺ نے اس وقت فرمایا تھا جب (جنگِ اُحد کے موقع پر) آپ کو یہ خبر دی گئی کہ ''دشمنوں کا ایک جمِ غفیر آپ سے لڑنے کیلئے جمع ہو رہا ہے......''

=

'' اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی سابقہ کتاب میں فرمایا ہے: جو بندہ مجھ پر توکل کر لے تو خواہ ساتوں آسمان اور زمینیں اور ان کی جملہ مخلوقات اس کے خلاف مکر کریں، مگر میں اُسے مخرج مہیا کر دونگا، اور جو بندہ مجھ پہ بھروسہ نہ کرے، اُس کے دونوں ہاتھ آسمانی اسباب سے کاٹ دونگا، اور اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لونگا، اور اسے ہوا میں معلق کر کے اسی کے سپرد کر دونگا......الخ ''

یہ آیتِ کریمہ فضیلتِ توکل کی بہت بڑی دلیل ہے، اور یہ واضح کر رہی ہے کہ منفعتوں کے حصول اور مضرتوں کے ازالہ کیلئے توکل سب سے بڑا سبب ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے توکل کو اپنے کافی ہونے کا سبب قرار دیا ہے، یہ نکتہ شیخ الاسلام نے ذکر فرمایا ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے اس مقام پر ایک اور انتہائی نفیس نکتہ ذکر فرمایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ توکل کے ساتھ ساتھ اختیارِ اسباب بھی ضروری ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاتَّقُوا اللهَ وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ (٢)

''اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور مؤمنوں کو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیئے''

اس آیتِ کریمہ میں قیام بالتقویٰ کو حصولِ توکل کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

سیدنا ابراھیم علیہ السلام کی دعا جب انہیں آگ میں ڈالا گیا

'' حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ'' وہ عظیم الشان کلمہ ہے جو اس عظیم عقیدے کو متضمن ہے کہ ہمیں صرف اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے، لھذا اس کے علاوہ کسی سے التجاء کرنا یا کسی پر بھروسہ کرنا جائز نہیں ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے مذکورہ قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کے دو ''اولوالعزم'' انبیاء علیہم السلام نے انتہائی

(١) (بخاری، کتاب التفسیر، الرقم (٤٥٦٣) (٢) (المائدة:١١)

اہم مواقع پر یہ کلمہ کہا، چنانچہ سیدنا ابراھیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اس وقت کہا جب انہیں آگ میں پھینکا گیا، اور یہ قصہ قرآنِ حکیم میں مذکور اور مشہور ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ کلمہ اس وقت کہا جب آپ ﷺ کو جنگِ اُحد کے ختم ہونے کے بعد اطلاع ملی کہ ابوسفیان دوبارہ حملے کا ارادہ رکھتا ہے، تو نبی ﷺ ستر صحابہ کرام کے ساتھ جن میں ابوبکر، عمر، عثمان، علی، زبیر، سعد، طلحہ، عبدالرحمٰن بن عوف، حذیفہ بن الیمان، عبداللہ بن مسعود اور ابوعبیدۃ بن جراح رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے، نکلے اور مدینہ منورہ سے تین میل باہر حمراء الاسد کے مقام پر رُک کر اس کا انتظار کرنے لگے، مگر ابوسفیان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے خوف اور رُعب ڈال دیا، اور وہ مکہ واپس پلٹ گیا، اسے جاتے ہوئے راستے میں عبدالقیس کا ایک قافلہ ملا، اس نے پوچھا: کہاں جارہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: مدینہ منورہ۔ ابوسفیان نے کہا: محمد (ﷺ) کو میرا ایک پیغام پہنچا دینا کہ ہم عنقریب واپس آئینگے، اور تمہیں اور تمہارے باقی ماندہ ساتھیوں کو تہس نہس کردینگے۔ وہ قافلہ حمراء الاسد کے مقام پر ہی نبی ﷺ کو ملتا ہے، اور ابوسفیان کا پیغام پہنچا دیتا ہے، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ"

ان دو جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کا سختی کے ان مواقع پر یہ کلمہ کہنا اسکی فضیلت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

آیتِ کریمہ میں (فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا) سے مشہور مفسر امام مجاہد رحمہ اللہ نے ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کا استدلال کیا ہے۔ نیز یہ بات ثابت ہوئی کہ انسان کی بظاہر ایک ناپسندیدہ چیز باعتبارِ انجام بہتر ہوسکتی ہے، اور یہ بات بھی نکھر کے سامنے آئی کہ دنیا وآخرت میں حصولِ خیر اور دفعِ شر کا سب سے بڑا سبب توکل علی اللہ ہے۔



اس باب کے مسائل

(۱) توکل، فرائضِ دین میں سے ایک فریضہ ہے۔

(۲) توکل، صحتِ ایمان کیلئے شرط ہے۔

(۳) سورۃ الانفال کی آیت کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۴) آیت کے آخری جملے ﴿ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴾ کی تفسیر (بطورِ خاص) واضح ہوئی۔

(۵) سورۃ الطلاق کی آیت کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۶) کلمہ ﴿ حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ کی عظمتِ شان واضح ہوئی، اور یہ بات معلوم ہوئی کہ سیدنا ابراهیم علیہ السلام اور محمد ﷺ نے انتہائی سختی کے مواقع پر یہ کلمہ کہا تھا۔



باب

خوف ورجاء کا بیان

قول اللہ تعالیٰ: ﴿ أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللهِ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ﴾ ①

اس باب کے انعقاد کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ ایک مؤمن بندے کا ایمان ہمیشہ خوف ورجاء کے مابین رہتا ہے۔خوف سے مراد اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے عذاب کا ڈر، جبکہ رجاء سے مراد اللہ تعالیٰ کی رحمت اور محبت کی امید ہے۔ان دونوں حقیقتوں کو اپنے اندر ہمیشہ جمع رکھنا انبیاء علیہم السلام وصدیقین کا شیوہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ﴾ ②

''جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں خود وہ اپنے رب کے تقرب کی جستجو میں رہتے ہیں کہ ان میں سے کون زیادہ نزدیک ہوجائے وہ خود اسکی رحمت کی اُمید رکھتے، اور اس کے عذاب سے خوف زدہ رہتے ہیں، (بات بھی یہی ہے) کہ تیرے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہی ہے''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ ﴾ ③

''یہ بزرگ لوگ نیک کاموں کی طرف جلدی کرتے تھے، اور ہمیں لالچ ،طمع اور ڈر وخوف سے پکارتے تھے اور ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ﴿ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ﴾ ④

''اور میں ان چیزوں سے جن کو تم اللہ تعالیٰ کیساتھ شریک بناتے ہو نہیں ڈرتا، ہاں! اگر میرا پروردگار ہی کوئی امر چاہے، میرا پروردگار ہر چیز کو اپنے علم میں گھیرے ہوئے ہے، کیا تم پھر بھی خیال نہیں کرتے''

سیدنا شعیب علیہ السلام کے متعلق خبر دیتے ہوئے فرمایا: ﴿ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجَّانَا اللهُ مِنْهَا وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللهُ رَبُّنَا ﴾ ⑤

''ہم تو اللہ تعالیٰ پر بڑی جھوٹی تہمت لگانے والے ہوجائیں گے اگر ہم تمہارے دین میں آجائیں اس

---

① (الاعراف: ۹۹) ② (الاسراء: ۵۷) ③ (الانبیاء: ۹۰)
④ (الانعام: ۸۰) ⑤ (الاعراف: ۹۹)

کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے نجات دی، اور ہم سے ممکن نہیں کہ تمہارے مذہب میں پھر آ جائیں اِلاّ یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی نے جو ہمارا مالک ہے مقدر کیا ہو۔''

چنانچہ سیدنا ابراھیم علیہ السلام اور سیدنا شعیب علیہ السلام دونوں نے پورا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جو خوف ورجاء کی دلیل ہے۔

ملائکہ کے بارے میں فرمایا: ﴿ يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴾ ①

''اور اپنے رب سے جو اُن کے اوپر ہے ڈرتے رہتے ہیں اور جو حکم مل جائے اس کی تعمیل کرتے ہیں''

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "فَوَاللّٰهِ إِنِّي لَأَعْلَمُهُمْ بِاللّٰهِ وَأَشَدُّهُمْ لَهُ خَشْيَةً" ②

''اللہ کی قسم مجھے سب سے زیادہ اللہ کی معرفت حاصل ہے، اور میں سب سے زیادہ اپنے پروردگار سے ڈرنے والا ہوں''

بندے کا ایمان جس قدر قوی ہوگا، اسی قدر اس کا اللہ تعالیٰ سے خوف ورجاء کا معاملہ قوی اور مستحکم ہوتا جائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ﴾ ③

''اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں''

نیز فرمایا: ﴿ إِنَّ الَّذِينَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُونَ . وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ . وَالَّذِينَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ . وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَى رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ ﴾ ④

''یقیناً جو لوگ اپنے رب کی ہیبت سے ڈرتے ہیں۔ اور جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔ اور جو لوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل ڈرتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں''

مسند احمد وغیرہ میں ہے کہ اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ان آیات کے تعلق سے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یہاں جن لوگوں کے ڈرنے کا ذکر ہے، کیا اُن سے مراد وہ لوگ ہیں جو زنا اور چوری کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بھی ڈرتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے صدیق کی بیٹی! نہیں، یہاں اُن لوگوں کا ذکر ہے جو نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، صدقات دیتے ہیں اور انہیں یہ خوف اور خدشہ دامن گیر رہتا ہے کہ ہماری یہ نیکیاں قبول نہیں ہو رہی ہیں؟ ⑤

① (النحل: ٥٠) ② (صحیح بخاری، کتاب النکاح، رقم: (٥٠٦٣)

③ (الفاطر: ٢٨) ④ (المؤمنون: ٥٧تا٦٠)

⑤ مسنداحمد (٢٥٧٦٣،٢٥٣١٨/٩) سنن الترمذی (٣١٧٥) سنن ابن ماجہ (٤١٩٨) سلسلة الأحاديث الصحيحة (١٦٢)

امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کا خوف، طریقِ ہدایت کی عظیم منزل ہے، خواص کے دل میں، عوام کی بنسبت زیادہ خوف ہوتا ہے بلکہ خواص تو زیادہ خوف کے محتاج ہیں، اور مبتلائے خوف رہنا وہ ضروری بھی قرار دیتے ہیں، اور یہ ان کے لائقِ شان بھی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ بندے وہ ہوتے ہیں جو استقامت پر قائم ہوتے ہیں اور کچھ استقامت سے ہٹے ہوئے۔ جو لوگ استقامت سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں، انہیں اپنے اس انحراف پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف دامن گیر رہتا ہے، اور خوف کی یہ کیفیت ضروری ہے کیونکہ اسکے بغیر بندے کا ایمان صحیح متصوّر نہیں ہوگا۔

گناہوں پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف تین چیزوں سے لاحق ہوتا ہے:

(۱) ایک یہ کہ بندے کو گناہ اور اسکی خطورت وقباحت کا علم ہے۔

(۲) دوسری یہ کہ وہ اس وعید کو سچ تصور کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس گناہ پر مرتب فرمائی ہے۔

(۳) تیسری یہ کہ اُسے یہ خطرہ بھی لاحق ہے کہ شاید اس گناہ پر توبہ کا موقع میسر نہ آسکے۔ اور اسکے اور توبہ کے درمیان کوئی مانع حائل ہو جائے۔

یہ تینوں امور جس قدر قوی یا ضعیف ہونگے بندے کا خوف بھی اسی قدر قوی یا ضعیف ہوگا۔ خوف کی یہ تینوں صورتیں گناہ کے ارتکاب سے قبل لاحق ہوتی ہیں، لیکن جب بندہ گناہ کر بیٹھتا ہے تو اس کا خوف مزید شدت اختیار کر لیتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس بندے کے دل میں آخرت کی فکر اور اس کی جزاء وسزا کا معاملہ راسخ ومستقر ہو، اور وہ گناہ اور اسکی سنگینی سے بھی آگاہ ہو، اور اسے خالص توبہ نہ کر سکنے کا اندیشہ بھی لاحق ہو، تو اس بندے کا دل بوجۂ خوف بے قرار رہے گا، اور جب تک خوف کی یہ کیفیت شاملِ حال ہے تب تک گناہوں سے نجات کی بھر پور اُمید موجود ہے۔

واضح ہو کہ جن بندوں کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ مستقیم ہے ان کے ہمہ وقت خوف کی وجہ ان کا یہ اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو مقلب القلوب ہے ہمارے دلوں کو ضلالت کی طرف نہ پھیر دے۔ کیونکہ مسند احمد وغیرہ کی صحیح حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے بیچ میں ہیں اگر وہ انہیں سیدھا رکھنا چاہتا ہے تو سیدھا رکھتا ہے، اور اگر ٹیڑھا رکھنا چاہتا ہے تو ٹیڑھا کر دیتا ہے'' (۱)

(۱) صحیح الاسناد: مسند احمد (۱۷٦٤۷/٦) سنن ابن ماجه (۱۹۹) صحیح ابن حبان (۲٤۱۹) مستدرك حاكم (۲۸۹/۲) امام حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے اور امام ذھبی نے ان کی موافقت کی ہے۔

اس خوف کی وجہ سے نبی ﷺ کی قسم کے الفاظ اکثر یوں ہوتے: "لَا ، وَمُقَلِّبِ الْقُلُوْبِ " ①
''مجھے دلوں کے پھیر دینے والے کی قسم !''

اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہی کافی ہے:
﴿ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ ﴾ ②

''اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ آدمی کے اور اس کے قلب کے درمیان آڑ بن جایا کرتا ہے''

اس فرمان کے علم کے بعد کوئی بندہ خوف سے خالی رہ کر قرار پانے کا تصور کر سکتا ہے؟ یہ فرمان تو ہر حال میں خوف کا متقاضی ہے۔ '' (انتهى كلام ابن القيم رحمه الله ملخصًا)

قوله: قول الله تعالىٰ: أَفَأَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ...

واضح ہو کہ مؤلف رحمہ اللہ نے اپنا یہ باب اس آیت پر قائم فرمایا ہے:
﴿ أَفَأَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُوْنَ ﴾ ③

''کیا پس وہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بے فکر ہو گئے ہیں، سو اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بجز اُن کے جن کی شامت ہی آ گئی ہو اور کوئی بے فکر نہیں ہوتا''

یہاں اللہ تعالیٰ نے اُن بستیوں کا حال بیان فرمایا ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی تکذیب کی، ان کی اس تکذیب کی وجہ ان کا اللہ تعالیٰ اور اس کے عذاب سے بے خوف ہو جانا تھا۔

چنانچہ اس آیت سے قبل فرمایا:
﴿ أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرٰى أَنْ يَّأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَائِمُوْنَ. أَوَ أَمِنَ أَهْلُ الْقُرٰى أَنْ يَّأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴾ ④

''کیا ان بستیوں کے رہنے والے اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب شب کے وقت آن پڑے جس وقت وہ سوتے ہوں۔ اور کیا ان بستیوں کے رہنے والے اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آ پڑے جس وقت کہ وہ اپنے کھیلوں میں مشغول ہوں؟''

اللہ تعالیٰ کی کما حقہ معرفت کا نہ ہونا، نیز اللہ تعالیٰ کی ابتلاءات، ڈھیل اور دیگر تدبیروں کے معاملے کو سنجیدگی سے نہ لینا اس بے خوفی کا باعث ہے...... مذکورہ بالا آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بصراحت فرما دیا کہ اس کی تدبیروں سے وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جو ہلاکت اور خسارہ پائیں گے۔ =

① صحيح بخاري، كتاب الأيمان والنذر، رقم: ٦٦١٧
② (الانفال: ٢٤)
③ (الاعراف: ٩٩)
④ (الاعراف: ٩٧، ٩٨)

قولہ :قال اللّٰہ: ﴿ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴾ ①

''اپنے رب تعالیٰ کی رحمت سے ناامید تو صرف گمراہ اور بھکے ہوئے لوگ ہوتے ہیں''

حسن بصری اور قتادہ رحمہما اللہ کا قول

حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے:

''جس شخص کو اللہ تعالیٰ وسیع رزق عطاء فرمائے ،اور وہ اسے اپنے خلاف اللہ تعالیٰ کی تدبیر نہ گردانتا ہو تو وہ انتہائی احمق انسان ہے۔اسی طرح وہ شخص بھی بے وقوف ہے جسے اللہ تعالیٰ تنگی رزق سے آزمائے اور وہ صبر و رضاء کے ساتھ ،اللہ تعالیٰ کی تدبیر کی اس صورت سے سرخرو نہ ہو سکے۔

قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے:

''اللہ تعالیٰ نے بیشتر قوموں کو نعمتوں سے پروردگی اور فارغ البالی کے عالم میں پکڑا ہے......''

مسند احمد کی ایک حسن حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اِذَارَأَيْتَ اللّٰهَ يُعْطِي الْعَبْدَ مِنَ الدُّنْيَا عَلٰى مَعَاصِيْهِ مَايُحِبُّ فَاِنَّمَا هُوَ اسْتِدْرَاجٌ " ②

''اگر تم دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اس کی نافرمانیوں کے باوجود دنیا کی دولت سے مالا مال فرماتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل (تدبیر کی ایک صورت) ہے''

اسماعیل بن رافع کا قول ہے:

''اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے بے خوفی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بندہ گناہوں میں دُھت ہے،اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا متمنی ہے۔''

وقولہ :قال اللّٰہ تعالیٰ: وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖ ....

اس آیت کریمہ کو ذکر کر کے مؤلف رحمہ اللہ نے خوف ورجاء کو جمع کرنے کی ضرورت واہمیت کو واضح فرمایا ہے؛ کیونکہ جس بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہے وہ اسکی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ عملِ صالح کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار رہے گا،جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ ③

① (الحجر: ٥٦) ③ (البقرۃ: ٢١٨)

② حسن : مسنداحمد (١٧٣١٣/٦) ابن جریر رحمہ اللہ (١٢٤/٧) اسے علامہ عراقی اور امام مناوی نے حسن کہا ہے۔

....

....

....

....

''البتہ ایمان لانے والے، ہجرت کرنے والے، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہی رحمت الٰہی کے امیدوار ہیں، اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بہت مہربانی کرنے والا ہے''

اس آیتِ کریمہ میں بڑی صراحت کے ساتھ یہ حقیقت مذکور ہے کہ نیک اور صالح لوگ اعمالِ صالحہ کی انجام دہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید لگاتے ہیں، لیکن جو شخص گناہوں پر اصرار کرتا ہے، اور رحمت کا امیدوار بھی ہے تو اسے شیطان نے مبتلائے غرور کر رکھا ہے۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ''وَمَنْ يَّقْنَطُ ......'' درحقیقت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے قول کی حکایت ہے، جب ملائکہ نے انہیں اسحٰق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی تو انہوں نے فرمایا:

''بڑھاپا آجانے کے بعد تم مجھے خوشخبری دے رہے ہو ؟''

دراصل ان کا یہ فرمان اس امر پر محمول ہے کہ جب آدمی اور اسکی بیوی بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں تو عادۃً بچہ کا پیدا ہونا ناممکن ہوتا ہے۔

مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ بَشَّرْنَاكَ بِالْحَقِّ ﴾ ①

''ہم تمہیں حق کے ساتھ خوشخبری دے رہے ہیں''

اگرچہ عادۃً ایسا نہیں ہوتا، مگر ہمارے لئے یہ معاملہ انتہائی آسان ہے، لھذا آپ مایوس نہ ہوں، تب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ ﴾ ②

''اللہ تعالیٰ کی رحمت سے تو گمراہ لوگ مایوس ہوتے ہیں''

لھذا وہ ہرگز مایوس نہیں ہیں، بلکہ باوجودیکہ وہ اور اس کی بیوی بڑھاپے کا شکار ہو چکے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت اس سے بھی بڑے کرشمے اور معجزے دکھانے پر قادر ہے۔

....

① (الحجر: ٥٥)

② (الحجر: ٥٦)

قال :عن عبدالله بن عباس رضی الله عنهما: اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ سُئِلَ عَنِ الْكَبَائِرِ ؟ فَقَالَ: "اَلشِّرْكُ بِاللّٰهِ ، وَالْيَأْسُ مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ وَالْأَمْنُ مِنْ مَكْرِ اللّٰهِ " ①

مسند احمد بزاز اور طبرانی وغیرہ میں بسند حسن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث مروی ہے: رسول اللہ ﷺ سے کبیرہ گناہوں کی بابت پوچھا گیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کیساتھ شرک کرنا، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا، اور اللہ تعالیٰ کے مکر و تدبیر سے بے خوف ہو جانا، کبیرہ گناہ ہیں''

اللہ تعالیٰ کے مکر و تدبیر سے بے خوف ہونا اور اس کی رحمت سے مایوس ہونا کبیرہ گناہ ہے

اس حدیث میں تین کبیرہ گناہوں کا ذکر ہے۔

(۱) شرک، جو اکبر الکبائر ہے، کیونکہ شرک ایک ایسا ظلم عظیم ہے جو اللہ تعالیٰ جو خالق، مالک اور الٰہ برحق ہے، کیساتھ انتہائی درجہ تنقیص شمار ہوتا ہے یہ سب سے بڑا ظلم ہے، اور سب سے بڑی قباحت ہے، ایک ایسا گناہ ہے جو بلا توبہ معاف نہیں ہوتا، جبکہ بقیہ گناہ تحت مشیت اللہ ہیں چاہے تو معاف فرما دے اور چاہے تو مواخذہ فرمالے۔

(۲) دوسرا کبیرہ گناہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا ہے، جس کا معنی اپنے امور کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے امیدیں کاٹ لینا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تَيْأَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَيْأَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ ﴾ ②

''اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ یقیناً رب کی رحمت سے ناامید وہی ہوتے ہیں جو کافر ہوتے ہیں''

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا، اللہ تعالیٰ کے کرم، رحمت، سخاوت اور مغفرت وغیرہ میں سُوءِ ظن کے مترادف ہے۔

(۳) تیسرا کبیرہ گناہ، اللہ تعالیٰ کے مکر و تدبیر سے بے خوف ہونا ہے، اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ ڈھیل ہے جو اپنے کچھ بندوں کو دیتا ہے، اس سے بے خوف ہونا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی قدرتِ کاملہ سے عدمِ واقفیت اور اپنی ذات پر اعتماد و عُجب کی نشانی ہے۔

=

① حسن: امام ہیثمی نے مجمع الزوائد (۱/ ۱۰۴) میں بزار اور طبرانی کی طرف نسبت کرکے اسکے راویوں کو ثقہ کہا ہے۔ ابن کثیر (۱/ ۴۸۴)
② (یوسف: ۸۷)

قال :وعن عبد الله بن مسعود ﷺ قال:"اَكْبَرُ الْكَبَائِرِ الْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَالْاَمْنُ مِنْ مَكْرِ اللّٰهِ وَالْيَأْسُ مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ" (رواه عبد الرزاق) ①

سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷺ فرماتے ہیں: ''بڑے گناہوں میں بھی مزید بڑے گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے بے خوف رہنا، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا ہے''

=

واضح ہو کہ اس حدیث میں کبائر کا حصر مقصود نہیں کیونکہ کبائر تو بہت زیادہ ہیں، البتہ ایسے گناہوں کا ذکر مقصود ہے جو کبائر کے اندر مزید بڑے گناہ شمار ہوتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس ﷺ کا قول ہے: کبیرہ گناہ ستر کے قریب ہیں، ایک قول میں سات سو کی تعداد بھی مذکور ہے، اور ساتھ ساتھ ان کا یہ فرمان بھی مذکور ہے: بڑے گناہ سے توبہ کر لینے سے وہ کبیرہ نہیں رہتا، اور چھوٹے گناہ کو بار بار دہرانے سے وہ صغیرہ نہیں رہتا (بلکہ خوفناک ہو جاتا ہے)۔

وقوله :وعن عبد الله بن مسعود ﷺ قال:"اَكْبَرُ الْكَبَائِرِ......

سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷺ کے اس اثر کی سند کو حافظ ابن کثیر ﷫ نے صحیح قرار دیا ہے، اس اثر کے مطابق اکبر الکبائر میں سرِ فہرست شرک ہے خواہ وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں ہو یا الوہیت میں۔ شرک کے اکبر الکبائر ہونے پر اُمت کا اجماع قائم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا بھی کبائر میں داخل ہے، یہاں لفظِ ''القنوط'' استعمال ہوا ہے، جو مایوسی کے معنی میں ہے، جبکہ گذشتہ حدیث میں اس کی جگہ ''الیأس'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، قرآنی استعمال سے واضح ہوتا ہے کہ ''الیأس'' میں ''القنوط'' کی بنسبت زیادہ شدت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل ''القنوط'' پر ضلالت کا، جبکہ اہل ''الیأس'' پر کفر کا حکم لگایا ہے۔

بہرحال ان دلائل سے واضح ہوا کہ ایک بندۂ مؤمن کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر خوف و رجاء کی دونوں حقیقتیں مجتمع رکھے، اور اپنے اوپر محض ایسا خوف طاری نہ کر لے جو اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس کر دے۔ سلفِ صالحین عالم صحت میں خوف، اور عالم مرض میں رجاء کی کیفیت کے غلبہ کو پسند کرتے تھے، البتہ بقول ابی سلیمان: دل میں خوف کا غلبہ رہنا چاہیئے، اگر رجاء غالب آ گئی تو دل فاسد ہو جائے گا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں اس کی خشیت کا سوال کرتے ہیں، بلاشبہ وہ ہر چیز پہ قادر ہے۔

---

① مصنف عبد الرزاق : (۱۰/۴۵۹، ۴۶۰) ابن جریر (۵/۲۶) طبرانی کبیر (۸۷۸۳، ۸۷۸۵) امام ہیثمی ﷫ نے اسے صحیح کہا ہے۔

اس باب کے مسائل

(۱) سورۃ الاعراف کی آیت کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) سورۃ الحجر کی آیت کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی ڈھیل اور دیگر تدبیروں سے بے خوف رہنے والا شدید ترین وعید کا مستحق ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونے والا بھی شدید ترین وعید کا مستحق ہے۔



باب من الایمان باللہ الصبر علی أقدار اللہ

ایمان باللہ کا ایک اہم شعبہ اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر پر صبر کرنا ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم تر حکمت اور وسیع تر رحمت کے تحت نوعِ انسانی کو آزمانے اور اس کا امتحان لینے کا فیصلہ فرمایا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ امتحان اس کے اوامر ونواہی اور دیگران تمام مصائب کی صورت میں ہے جو بندوں کیلئے تقدیر میں لکھی ہوئی ہیں۔

کیونکہ ان ابتلاءات پر صبر ایک بہت ضروری ہتھیار ہے، لھذا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو صبر کا حکم دیا ہے اوران کی تسلی اور تقویت کیلئے صبر کو فرض قرار دے دیا، اور صبر کرنے والوں کے ساتھ بلا حساب اجر وثواب کا وعدہ فرمالیا۔ ارشاد ہے: ﴿ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ ①

''صبر کرنے والوں ہی کو ان کا پورا پورا بے شمار اجر دیا جاتا ہے''

صبر کی تین قسمیں

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ صبر کی تین قسمیں ہیں:

(۱) صبر علی المأمور (۲) صبر عن المحظور (۳) صبر علی المقدور

(۱) صبر علی المأمور: سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مامورات کو مکمل صبر کے ساتھ انجام دینا، خواہ اس سلسلہ میں کتنی تکلیف ہی سہنی پڑے۔

(۲) صبر عن المحظور: سے مراد اللہ تعالیٰ کے ممنوعہ امور کو مکمل صبر کے ساتھ ترک کرنا۔

(۳) صبر علی المقدور: سے مراد یہ ہے کہ جو مصائب وآلام انسان کو لاحق ہوتے ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہیں، انہیں مکمل صبر کے ساتھ برداشت کرنا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ ﴾ ②

''اور وہ جو اپنے رب کی رضا مندی کی طلب کیلئے صبر کرتے ہیں۔''

اور فرمان: ﴿ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴾ ③

''وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر ہی توکل کرتے ہیں''

مذکورہ آیات صبر کی ان تینوں اقسام کو جامع ہیں۔

---

① (الزمر: ۱۰) ② (الرعد: ۲۲) ③ (النحل: ۴۲)

....

....

صبر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، اور اس کے حکم کیلئے ہے: ﴿ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ﴾ ①
''آپ (ﷺ) صبر کریں، اور نہیں ہے آپ کا صبر مگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ''
﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ﴾ ②
''آپ اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر سے کام لیں''

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نوے (۹۰) مقامات پر صبر کا ذکر فرمایا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ'' ③
یعنی ''صبر تو روشنی اور نور ہے۔''

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا: ''وما أعطى احد عطاء خيرا وأوسع من الصبر'' ④
''کسی بندے کو صبر سے بہتر اور وسیع عطیہ نہیں دیا گیا''

ایک اور حدیث میں صبر کو نصف ایمان قرار دیا گیا ہے۔⑤

امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''صبر کے نتیجے میں ہمیں بہتر معیشت نصیب ہوئی۔'' ⑥

امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''صبر کا ایمان کے ساتھ وہی تعلق ہے جو سر کا بقیہ جسم کے ساتھ، اگر سر کاٹ دیا جائے تو جسم بے قیمت ہو جاتا ہے۔ پھر بلند آواز سے فرمایا: خبردار! اس شخص کا کوئی ایمان نہیں جس کے پاس صبر نہ ہو۔''

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''صبر میں رُکنے اور منع کرنے کا معنی پایا جاتا ہے، چنانچہ نفس کو جزع وفزع سے روکنا صبر ہے، زبان کو شکووں سے روکنا صبر ہے، اعضاء کو چہرہ پیٹنے اور نوچنے اور دامن کو پھاڑنے سے روکنا صبر ہے۔''

---

① (النحل: ١٢٧) ② (الطور: ٤٨)
③ (صحيح مسلم) ④ (بخاری ومسلم)
⑤ الحلية (٣٥/٤) العلل المتناهية (١٣٦٤) اسکی سند میں محمد بن خالد المخزومی، ضعیف راوی ہے، ابن حجر رحمہ اللہ الفتح (٤٨/١) میں فرماتے ہیں: یہ مرفوعاً ثابت نہیں۔ البتہ یہ حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً صحیح ثابت ہے۔
⑥ فتح الباری (٣٠٣/١١)

قال: وقوله: ﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ﴾ ①

''جو اللہ پر ایمان لائے اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے''

آیت ﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ﴾ کی تفسیر

یہ مکمل آیت اس طرح ہے: ﴿ وَمَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ﴾

''کوئی مصیبت اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نہیں پہنچ سکتی، جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ یہ خبر دے رہا ہے کہ کرۂ ارض یا نفوسِ انسانی میں رونما ہونے والی ہر مصیبت اللہ تعالیٰ کے امر اور اس کے قضاء وقدر سے ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''یہاں "بِاِذْنِ اللّٰهِ" "بِاَمْرِ اللّٰهِ" کے معنی میں ہے۔''

آگے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ﴾

''جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے''

اس سے مراد یہ ہے کہ جس شخص کو کوئی مصیبت یا پریشانی لاحق ہو اور اسے یہ بات معلوم ہو کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور امر سے ہے، تو وہ اللہ تعالیٰ کی قضاء کے سامنے سر تسلیم خم کر کے، صبر کا عظیم الشان مظاہرہ کر کے اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کا طالب بن جاتا ہے۔ جس کا صلہ اللہ تعالیٰ یہ عطا فرماتا ہے کہ "يَهْدِ قَلْبَهٗ" اس کے دل کو حق اور ہدایت پر استقامت عطا فر دیتا ہے، اور یہ بات معلوم ہے کہ ہدایت پر استقامت وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جو دنیا اور آخرت کی ہر خیر اور سعادت کی بنیاد ہے۔ بلکہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ دنیا میں دی ہوئی پریشانی پر صبر کرنے والوں کو اس سے بہتر نعم البدل عطا فرما دیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ. اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ. اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ ②

''اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجیے جنہیں، جب کبھی کوئی مصیبت آتی ہے تو کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم تو خود اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، ان پر ان کے رب کی نوازشیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں''

=

① (التغابن: ۱۱)

② (البقرة: ۱۵۵-- ۱۵۷)

قولہ :قال علقمة :هُوَ الرَّجُلُ تُصِيْبُهُ الْمُصِيْبَةُ يَعْلَمُ اَنَّهَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَيَرْضٰى وَيُسَلِّمُ . ①

علقمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مذکورہ آیت میں جس بندے کا ذکر ہے، وہ ہے جسے کوئی مصیبت لاحق ہوتو یہ سمجھ کر کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، راضی بقضاء اللہ ہو جاتا ہے، اور سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔''

=

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: یہاں دل کی ہدایت سے مراد یقین ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ یقین کی حد تک اس کے علم کو اس نکتہ پر استوار فرما دیتا ہے کہ جو کچھ ملا چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر سے ہے لھذا اس کا نا ملنا ممکن نہ تھا، اور جو چیز نہیں مل سکی اس کا نا ملنا چونکہ اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر سے تھا لہذا اس کا ملنا ممکن نہیں تھا۔

ایک صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "عَجَبًا لِلْمُؤْمِنِ لَا يَقْضِي اللّٰهُ قَضَاءً اِلَّا كَانَ خَيْرًا لَّهُ اِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ فَصَبَرَ كَانَ خَيْرًا لَهُ وَاِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ فَشَكَرَ كَانَ خَيْرًا لَهُ وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ" ②

''مؤمن کا معاملہ بڑا عجیب ہے، اس کے حق میں اللہ تعالیٰ کا ہر فیصلہ خیر و برکت ہوتا ہے، اگر اسے اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے جو اس کیلئے بہتر ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر سے خوشی لاحق ہوتی ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے جو اس کیلئے بہتر ہے، یہ خیر و برکت صرف ایک مؤمن بندے کیلئے ہی ہے۔''

وقوله :قال علقمة :هُوَ الرَّجُلُ تُصِيْبُهُ الْمُصِيْبَةُ ......

یہ علقمہ بن قیس بن عبداللہ النخعی الکوفی ہیں، نبی ﷺ کی زندگی میں پیدا ہو چکے تھے۔ ابو بکر، عمر، عثمان، علی، سعد، ابن مسعود اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سماع حدیث کیا، ان کا شمار کبار تابعین میں ہوتا ہے، بڑے پائے کے عالم اور ثقہ محدث تھے، ۶۰ھ کے بعد فوت ہوئے۔

ان کا یہ قول مذکورہ آیتِ کریمہ کی تفسیر ہے، یہ تفسیر باللازم کہلاتی ہے، کیونکہ جس شخص کے دل میں ایمان راسخ ہو وہ لازمی طور پر اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلہ پر راضی ہوگا۔

اسی سے ملتی جلتی تفسیر سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے وہ فرماتے ہیں:

" يَهْدِ قَلْبَهُ " کا معنی: "يسترجع" ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اسے مصیبت کے وقت "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" کہنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

=

① صحیح: امام بخاری نے اس اثر کو تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

② صحيح مسلم، كتاب الزهد والرقائق، الرقم: (۲۹۹۹).

قال:وفی صحیح مسلم عن ابی هريرة ﷺ قال:قال رسول الله ﷺ: "اِثْنَانِ هُمَا بِهِمْ كُفْرٌ ، اَلطَّعْنُ بِالنَّسبِ وَالنِّيَاحَةُ عَلَى الْمَيِّتِ " ①

صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرۃ ﷺ سے مروی ہے ،رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''لوگوں کے اندر دو چیزیں ایسی ہیں جو کفر ہیں،ایک نسب میں طعن زنی،دوسری میت پر نوحہ خوانی''

=

اس آیت سے بہت سے فوائد حاصل ہو رہے ہیں:

ایک یہ کہ صبر، ہدایتِ قلب کا سبب ہے۔

دوسرا یہ کہ بعض نیکیوں کا ثواب اللہ تعالیٰ اس طرح عطا فرماتا ہے کہ مزید نیکیوں کی توفیق عطا فرما دیتا ہے۔

تیسرا یہ کہ ایمان بھی ایک عمل ہے۔

اور چوتھا یہ کہ تقدیر پر ایمان حق اور ثابت ہے۔

دو کفریہ کام

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

'' یہ دو خصلتیں ایسا کفر ہیں جو اب تک لوگوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں خصلتیں کفار کے اعمال میں شامل تھیں جو آج تک موجود ہیں، جو شخص کفر کے کسی شعبہ پر قائم ہو، وہ مطلقاً کافر نہیں بن جاتا، جب تک کہ وہ حقیقتِ کفر کو نہ اپنا لے۔ یہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے کسی کافر کے اندر ایمان کا کوئی شعبہ یا خصلت موجود ہو تو اُس کی اس ایک خصلت کی وجہ سے وہ مؤمن نہیں کہلائے گا تا آنکہ وہ اصلِ ایمان پر قائم نہ ہو جائے۔ پھر نصوص کے اندر ''الف، لام'' کے ساتھ (یعنی :الکفر) اور بغیر الف لام (یعنی :کفر) کے استعمال کے فرق کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ ''الف، لام'' کے ساتھ (الکفر) کی مثال یہ حدیث ہے:

"لَيْسَ بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ أَوِالشِّرْكِ اِلَّا تَرْكُ الصَّلَاةِ"

جبکہ حدیثِ مذکور میں الف لام کے بغیر:"هُمَا بِهِمْ كُفْرٌ" استعمال ہوا ہے۔

حدیث میں جن دو گناہوں کا ذکر ہے، ان میں ایک طعن فی الانساب ہے، یعنی لوگوں کے نسب میں عیب نکالنا۔ اس کا ایک معنی یہ بھی کیا گیا ہے کہ ایک شخص جس کا نسب ثابت ہے، کے بارہ میں یوں کہنا کہ وہ فلاں کا بیٹا نہیں ہے، حالانکہ اس کا فلاں کا بیٹا ہونا ثابت ہے۔ =

① صحيح مسلم، كتاب الإيمان ، رقم: (٢٢٧)

قال ولهما عن ابن مسعود مرفوعا: "لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعٰى بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ" ①

صحیح بخاری ومسلم میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے رخسار پیٹے، اپنا دامن پھاڑا، اور جاہلیت کی پکار پکاری وہ ہم میں سے نہیں ہے''

=

دوسرا گناہ، میت پر نوحہ خوانی ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ میت کی خصائل وعادات کو ذکر کرکے بلند آواز سے رویا جائے، یہ کیفیت تقدیر سے ناراضگی، اور ایسی جزع فزع کہلاتی ہے جو صبر کے منافی ہے۔

یہ حدیث صبر کے واجب ہونے کی دلیل ہے کیونکہ نوحہ حرام ہے جو کہ صبر کے منافی ہے۔ جب صبر کے منافی چیز حرام ہوگئی تو صبر واجب ہوگیا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کچھ امور واعمال ایسے ہیں جن پر لفظِ کفر کا اطلاق ہوتا ہے لیکن وہ ملّتِ مسلمہ سے خروج کا سبب نہیں بنتے۔

چہرہ نوچنے اور گریبان پھاڑنے والے سے رسول اللہ ﷺ کا اظہارِ برأت

اس حدیث میں تین قسم کے افراد کے بارہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "لَيْسَ مِنَّا" ''وہ ہم میں سے نہیں''

یہ جملہ از قبیلِ نصوصِ وعید ہے۔ امام احمد وسفیان ثوری رحمہما اللہ اس جملہ کی تاویل کے قائل نہیں تھے، بلکہ اس جملہ کو اس کے ظاہری معنی کے ساتھ ہی ذکر کرتے، تاکہ وعید اور ڈانٹ کا یہ معاملہ پوری شد ومد کے ساتھ اثر انداز ہو۔ بعض لوگ "لَيْسَ مِنَّا" کا معنی یہ کرتے ہیں کہ وہ ہماری سنت اور طریقے پر نہیں ہے۔

بہر حال "لَيْسَ مِنَّا" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اسلام سے خارج ہے، بلکہ مراد ڈانٹنے ڈپٹنے میں مبالغہ ہے تاکہ لوگ اس قسم کے امور کے ارتکاب سے گریز کریں۔ یہ معاملہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک شخص اپنے بیٹے کو کسی نافرمانی کی بناء پر کہتا ہے: "لَسْتَ مِنِّيْ وَلَسْتُ مِنْكَ"

یعنی ''تو مجھ سے نہیں اور میں تجھ سے نہیں''

معنیٔ حدیث یوں ہوگا کہ جو شخص ان تین امورِ محرمہ کا ارتکاب کرے گا، وہ ان مؤمنین کے زمرے میں نہیں ہو سکے گا جو ان امور کے ارتکاب سے بچے ہوئے ہیں۔

---

① صحيح مسلم، كتاب الإيمان، رقم: (٢٨٥)

اس حدیث میں مذکور پہلا امرِ محرم " ضَرَبَ الْخُدُوْدَ "یعنی رخسار پیٹنا ہے۔ رخسار کا ذکر تغلیباً ہے کیونکہ اکثر لوگ مصیبت میں رخسار ہی پیٹتے ہیں جسم کے دوسرے حصوں، مثلاً: پیشانی یا سینہ وغیرہ کو پیٹنے کا بھی یہی حکم ہے۔

دوسرا امرِ محرم ''شَقَّ الْجُیُوْبَ ''یعنی دامن کو پھاڑنا ہے۔''جیوب'' جیب کی جمع ہے، اس سے مراد وہ کپڑا ہے جسے انسان اپنا سر داخل کر کے پہنتا ہے۔ جاہلیت میں لوگ صدمہ کی وجہ سے اپنے کپڑے پھاڑا کرتے تھے۔

تیسرا امرِ محرم ''دَعَا بِدَعْوَی الْجَاهِلِيَّةِ'' یعنی جاہلیت کی پکاریں پکارنا ہے۔

شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے اس کا معنی میت پر آہ و بکاء کرنا بیان فرمایا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد شدتِ صدمہ سے اپنی موت پکارنا ہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے اسکا معنی نوحہ خوانی سے کیا ہے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: '' جاہلیت کے دعاوی سے مراد وہ دعاوی ہیں جن میں اپنے قبیلے وغیرہ کی عصبیت پائی جاتی ہو۔ مذاہب، طوائف اور مشائخ کا تعصب بھی اسی قبیل سے ہے۔ برادری اور قومیت کے تعلق سے بعض کو بعض پر فوقیت دینا بھی دعویٰ جاہلیت ہے۔''

اسی طرح کسی خاص مذہب یا شخصیت سے منسلک ہو کر اُس کی دعوت دینا، اس کی بنیاد پر دوستی یا دشمنی قائم کرنا اور اسکی بنیاد پر لوگوں کو تولنا وغیرہ، سب دعاویٔ جاہلیت ہیں۔

مؤلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صحیح بات یہ ہے کہ (دعویٔ جاہلیت کی) یہ تمام تفسیریں صحیح ہیں۔

ایک حدیث میں ان لوگوں پر لعنت بھی وارد ہوئی ہے۔ جیسا کہ ابوامامۃ الباہلی رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث سنن ابن ماجہ میں ہے، جسے ابن حبان نے صحیح کہا ہے: رسول اللہ ﷺ نے چہرہ نوچنے والی، دامن کو پھاڑنے والی، اور اپنی موت اور بربادی کو پکارنے والی پر لعنت فرمائی ہے۔ ①

لعنت فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تمام امور کبائر میں سے ہیں، کیونکہ یہ تمام امور اللہ تعالیٰ سے ناراضگی، ترکِ صبر، اپنے چہرے کو مار کر اپنے آپ کو تکلیف دینے، کپڑے پھاڑ کر مال کا نقصان کرنے، میت کے ایسے خصائص ذکر کرنے، جو اُس میں موجود نہیں ہیں اور اپنی بربادی اور ہلاکت کی بددُعا کرنے پر منتج ہوتے ہیں۔

البتہ کسی عزیز کے فوت ہونے پر تھوڑے بہت الفاظ جو صدق پر قائم ہوں کے ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

مسند احمد میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا ② اور اپنا ہاتھ چہرے پہ رکھ کے فرمایا:"وَانَبِيَّاهْ، وَاخَلِيْلَاهْ، واصفاه." =

① حسن: سنن ابن ماجہ: (١٥٨٥) صحیح ابن حبان: (٧٣٧) طبرانی کبیر(٧٥٩١)

② صحیح بخاری (٤٤٥٣) مسند احمد (٢٠٢٦) سنن نسائی(١٨٣٩، ١٨٤٠)

قال:وعن أنس أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:" اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدِهِ الْخَيْرَ عَجَّلَ لَهُ الْعُقُوْبَةَ فِي الدُّنْيَا وَاِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدِهِ الشَّرَّ اَمْسَكَ عَنْهُ بِذَنْبِهِ حَتّٰى يُوَافِيَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ " ①

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے اس کے گناہوں کی سزا دنیا ہی میں دے کر اس کا معاملہ بے باک کر دیتا ہے، اور جب اپنے کسی بندے کے ساتھ شر کا فیصلہ فرما دیتا ہے تو اسے دنیا میں سزا دینے سے رک جاتا ہے، حتی کہ قیامت کے دن اسے پوری پوری سزا دے گا۔''

=

اسی طرح سیدہ فاطمہ بنت الرسول ﷺ نے آپ ﷺ کی وفات پر یوں کہا تھا:" یاابتاہ أجاب ربا دعاہ " ②
یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ یہ حدیث میت پر آنکھوں کے رونے سے نہیں روکتی، یہ رونا تو رحمت اور رقتِ قلبی کی دلیل ہے۔

شیخ الاسلام فرماتے ہیں: میت پر علی وجہ الرحمۃ رونا مستحب ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر سے راضی ہونے کے منافی نہیں ہے۔ البتہ میت سے وابستہ کسی مفاد سے ختم ہو جانے کی بناء پر رونا درست نہیں ہے۔

جب نبی ﷺ کا بیٹا ابراھیم فوت ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا:" تَدْمَعُ الْعَيْنُ وَيَحْزَنُ الْقَلْبُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا يَرْضٰى رَبُّنَا وَاللّٰهِ يَااِبْرَاهِيْمُ اِنَّابِكَ لَمَحْزُوْنُوْنَ " ③

''آنکھوں میں آنسو ہیں، دل غم ناک ہے، اور ہم اپنی زبان سے صرف وہی الفاظ استعمال کریں گے جن پر پروردگار کی رضاء ہے، اے ابراھیم (علیہ السلام)! اللہ کی قسم ہمیں تیری جدائی کا صدمہ بہت ہے''

صحیح بخاری ومسلم میں سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت سے نبی ﷺ کے نواسے کی موت کا واقعہ منقول ہے۔ نبی ﷺ اپنے نواسے کی کیفیت دیکھ کر رو پڑے، تو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یارسول اللہ (ﷺ) یہ کیا ہے؟ فرمایا: یہ رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے اُن بندوں پر رحم فرماتا ہے جو خود دوسروں پر رحمت وشفقت کا معاملہ کرتے ہیں۔

دنیا میں ہی غلطی کی سزا کا مل جانا رحمت الٰہی کی علامت ہے

''الجامع الصغیر '' کے شارح نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس بندے

① سنن الترمذی (۲۳۹۸) مسند احمد (۱۶۸۰۶/۵) صحیح ابن حبان (۲۴۵۵) مستدرك الحاكم (۳۴۹/۱) امام ہیثمی نے اسکی سند کو جید کہا ہے (۱۹۲/۱۰) سلسلة الأحاديث الصحيحة (۱۲۲۰)

② صحیح بخاری، کتاب المغازی (۴۴۶۲)۔ ③ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، رقم: (۱۳۰۳)

کے ساتھ بھلائی اور بہتری کا ارادہ فرمالے اسے اس کی بداعمالیوں کی سزا دنیا میں دے دیتا ہے، چنانچہ اسے مختلف تکلیفوں اور آزمائشوں میں مبتلا کردیتا ہے، چنانچہ جب وہ اس دنیائے فانی سے کوچ کرجاتا ہے تو اس کے ذمہ کوئی گناہ باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ ایک مؤمن کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے، یا ایک کاتب کا لکھتے لکھتے قلم ہاتھ سے چھوٹ جائے تو اُس کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بندۂ مؤمن کو اس کے جسم، مال، اور اولاد کے تعلق سے مبتلائے آزمائش رکھا جاتا ہے، حتی کہ وہ اپنے پروردگار سے اس طرح جاملتا ہے کہ اس کے ذمہ کوئی گناہ باقی نہیں رہتا۔ ①

ایک اور صحیح حدیث کے الفاظ اس طرح وارد ہیں:

''بندے پر تکلیفیں اور آزمائشیں مسلط رہتی ہیں حتی کہ ایک وقت آتا ہے کہ وہ زمین پر چل رہا ہوتا ہے اور اس کے ذمہ کوئی گناہ نہیں ہوتا۔'' ②

شیخ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''دنیا میں مشکلات ومصائب کا آنا ایک نعمت ہے، کیونکہ اس سے گناہ مٹ جاتے ہیں اور کیونکہ مصائب میں مبتلا شخص صبر کرتا ہے، جس کا علیحدہ ثواب ملتا ہے، اور کیونکہ مصائب کے ٹوٹنے پر بندۂ مؤمن کا اللہ تعالیٰ کی طرف انابت وتعلق بڑھ جاتا ہے، جو ایک گرانقدر نعمت ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی مصلحتیں پنہاں ہیں، لیکن اس سے بڑی مصلحت اور کیا ہوسکتی ہے کہ بندے کے گناہ جھڑ جائیں۔ آدمی کتنا ہی بدعمل ہو تکلیفوں کے آنے سے اس کے گناہوں میں کمی ہوجاتی ہے۔

البتہ جو شخص مصائب کے آنے پر بھی نہیں سنبھلتا بلکہ معاصی کے دروازے کھول دیتا ہے تو اس کے حق میں مصائب مزید موجبِ شر بن جاتے ہیں۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو جب فقر، مرض یا بھوک مسلط کرکے آزمایا جائے تو وہ صبر کی بجائے جزع فزع، اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے ناراضگی اور نفاق وغیرہ میں مبتلا ہوجاتے ہیں، بعض اوقات فعلِ محرمات یا واجبات اور فرائض کے ترک تک کے مرتکب ہوجاتے ہیں، بلکہ کفرِ ظاہر کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ یہ تمام امور ضرر فی الدین کے متقاضی ہیں، ایسے بندے کا مبتلائے مصائب ہونا اس کیلئے نقصاندہ ہے، جبکہ ان سے عافیت اس کیلئے بہتر ہوتی ہے، یہ اس لیئے نہیں کہ آزمائش شر ہے، بلکہ اس لیئے کہ اسکے حق میں آزمائش کا نتیجہ شر ہے۔ لیکن جو شخص مصائب کے لاحق ہونے پر صبر کرے اور اطاعت وانابت میں مزید پیش رفت اختیار کرلے، تو اس کے حق میں سراسر نعمت ورحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

① مسنداحمد: (۷۸٦٤/۳) سنن الترمذی (۲۳۹۹) صحیح ابن حبان (٦۹۷) مستدرك حاکم (۳٦/۱)

② یہ روایت صحیحین میں نہیں ہے، البتہ اس معنی کیلئے مذکورہ حدیثِ ابی ھریرۃ کا آخری فقرہ دیکھئے۔

﴿ اُولٰئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ وَاُولٰئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ ﴾ ①

''ان پر ان کے رب کی نوازشیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں''

چنانچہ ایسے بندوں کو گناہوں کی بخششیں، بلندیٔ درجات وغیرہ جیسی عظیم نعمتیں میسر آجاتی ہیں، جو سب سے بڑی نعمتیں ہیں، لہذا ہر مصیبت پر صبر واجب ہے، اور جو شخص صبرِ واجب اختیار کرلے گا اسے یہ صلہ ضرور حاصل ہوگا۔'' (انتھیٰ ملخصاً)

حدیثِ مذکور کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ جس بندے کے ساتھ اللہ تعالی شر کا فیصلہ فرمالے تو اس کے گناہوں کی سزا مؤخر فرمادیتا ہے، چنانچہ وہ شخص قیامت کے دن اپنے تمام تر گناہوں کے ساتھ آئے گا اور ان کی تمام تر سزا اور عقوبت پالے گا۔ اسی لیئے جو بندے دائمی صحت سے متمتع ہوتے ہیں انہیں یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ کہیں ہماری نیکیوں کا صلہ دنیا ہی میں تو نہیں دے دیا گیا؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو اپنے دشمنوں کی سزا کا گھر نہیں بنایا نہ ہی اسے اپنے اولیاء کے ثواب کا گھر بنایا ہے، بلکہ اولیاء اللہ کیلئے ثواب کی صورت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جوار میں رہیں اور اس کی رضا، رحمتوں اور نعمتوں سے متمتع ہوتے رہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِيۡ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ . فِيۡ مَقۡعَدِ صِدۡقٍ عِنۡدَ مَلِيۡكٍ مُّقۡتَدِرٍ ﴾ ②

''یقیناً متقین جنتوں اور نہروں میں ہیں۔ راستی اور عزت کی بیٹھک میں قدرت والے بادشاہ کے پاس''

سنن ابی داوٗد میں ہے ایک شخص نبی ﷺ کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا، آپ ﷺ نے بیماریوں کا ذکر فرمایا، اس نے کہا: یارسول اللہ ! بیماریاں کیا ہوتی ہیں؟ واللہ میں تو کبھی بیمار نہیں ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم یہاں سے اٹھ کر چلے جاؤ تم ہم میں سے نہیں ہو۔'' ③

اس حدیث سے بہت سے فوائد حاصل ہو رہے ہیں:

ایک یہ کہ مؤمن پر تکالیف ومصائب کا آنا علامتِ خیر ہے۔

دوسرا یہ کہ دائمی صحت کے علامتِ شر ہونے کا خوف رکھنا چاہیئے۔

تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر سے اگر آپ کو کوئی تکلیف لاحق ہو تو اس پر صبر کرکے اللہ تعالیٰ سے اچھی امید اور اسکے ساتھ اچھا گمان قائم کرنا چاہیئے۔

---

① (البقرۃ : ۱۵۷)

② (القمر : ۵۵،۵۴)

③ سنن ابی داؤد(۳۰۸۹)

قال المصنف: وقال النبی ﷺ: "إِنَّ عِظَمَ الْجزَاءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلاءِ وَإِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی إِذَا أَحَبَّ قَوْمًا اِبْتَلاھُمْ فَمَنْ رَضِیَ فَلَہُ الرِّضَا وَمَنْ سَخِطَ فَلَہُ السَّخَطُ ۔ "حسنه الترمذی ①

نبی ﷺ نے فرمایا: ''بڑا اجر وثواب کڑی آزمائشوں کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو انہیں آزماتا ہے، جو ان آزمائشوں پر راضی ہو ان کیلئے اللہ تعالیٰ کی رضاء ہے اور جو ناراض ہو ان کیلئے ناراضگی۔'' (اس حدیث کو ترمذی نے حسن کہا ہے)

یہ حدیث جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں بروایت انس بن مالک، بسندِ حسن مروی ہے۔

مسند احمد میں ایک حدیث محمد بن لبید سے، جس کے تمام رواۃ کو امام منذری نے ثقہ کہا ہے، مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو انہیں مبتلائے آزمائش کر دیتا ہے، جو صبر کر جائے اسے صبر وقرار کا بہترین ثمرہ ملتا ہے، اور جو جزع فزع کرتا ہے اس پر ہمیشہ کی جزع وفزع مسلط کر دی جاتی ہے۔'' ②

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بندے پر آزمائشوں کا آنا اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت ہے، نیز یہ کہ اجر و ثواب کی کیفیت ومقدار باعتبارِ آزمائش ہے، آزمائش جس قدر سخت اور شدید ہوگی، اسی قدر صبر کا مظاہرہ ہوگا، اور اسی قدر اجر وثواب مرتب ہوگا۔

یہ بات معلوم ہے کہ سب سے زیادہ اجر وثواب کے مستحق انبیاءِ کرام ہیں، جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ اور کٹھن امتحانات کے شدید مراحل سے گزارے جاتے ہیں۔

ہر شخص کا اس کے دین کے بقدر امتحان لیا جاتا ہے

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا: "أَيُّ النَّاسِ أَشَدُّ بَلاءً" سب سے سخت ابتلاء کن لوگوں کی ہوتی ہے؟ فرمایا: "اَلْاَنْبِیَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ ......"

''انبیاء کرام علیہم السلام کی، پھر ان لوگوں کی جو انبیاء کے بعد سب سے افضل ہیں، پھر ان لوگوں کی جو ان کے بعد سب سے افضل ہیں۔''

مزید فرمایا: "یُبْتَلَی الرَّجُلُ عَلٰی حَسْبِ دِیْنِهِ، فَإِنْ کَانَ فِیْ دِیْنِهِ صُلْبًا اِشْتَدَّ بَلَاؤُہٗ، وَإِنْ کَانَ

---

① سنن الترمذی (٣٣٩٦) امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔ سنن ابن ماجہ (٤٠٣١) مسند احمد (٢٣٦٩٥/٩)

② حسن: مسند احمد (٢٣٦٩٥/٩، ٢٣٧٠٢) امام ہیثمی نے المجمع (٢٩/٢) میں اور ابن حجر رحمہ اللہ نے الفتح (١٠٨/١٠) میں کہا ہے: ''اس کی سند کے تمام راوی ثقہ ہیں۔''

فِيْ دِيْنِهِ رِقَّةٌ اُبْتُلِيَ عَلٰى قَدْرِ دِيْنِهِ ، فَمَايَبْرَحُ الْبَلَاءُ بِالْعَبْدِ حَتّٰى يَتْرُكَهُ يَمْشِيْ عَلَى الْأَرْضِ وَمَاعَلَيْهِ خَطِيْئَةٌ " ①

''ہر شخص کا اس کے دین کے بقدر امتحان لیا جاتا ہے، اگر اس کا دین مضبوط ہے تو ابتلاء شدید ہوگی، اور اگر دین میں کمزوری ہے تو اس کمزوری کے بقدر آزمائش ہوگی۔ بندے پر مسلسل آزمائشیں ٹوٹتی رہتی ہیں حتی کہ مسلسل صبر کرتے کرتے ایک وقت آتا ہے کہ وہ زمین پر چل پھر رہا ہوتا ہے اور اس کے ذمہ کوئی گناہ نہیں ہوتا (یعنی وہ زندگی ہی میں گناہوں سے پاک صاف ہو چکا ہوتا ہے)''

اس حدیث سے بعض لوگوں نے یہ استدلال لیا ہے کہ مصائب یا بیماریوں سے صرف گناہ ہی نہیں جھڑتے بلکہ اجر وثواب بھی ملتا ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ وغیرہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے ''کہ مصائب وغیرہ اصلاً گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں لیکن اگر وہ کسی عملِ صالح کا سبب بن جائیں مثلاً: توبہ، استغفار اور صبر ورضا وغیرہ تو پھر تکفیرِ ذنوب کے ساتھ ساتھ اجر وثواب کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے، نبی ﷺ کا فرمان: " وَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اِذَا أَحَبَّ قَوْمًا اِبْتَلَاهُمْ " اس بات کی صریح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیاروں پر تکلیفیں اور آزمائشیں ضرور آتی ہیں، انبیاء کرام سب سے افضل ہیں، لہذا ان کی آزمائشیں بھی انتہائی سخت اور کڑی ہیں، اللہ تعالیٰ جس طرح انبیاء کرام کو آزماتا ہے کسی اور کو نہیں آزماتا، تاکہ وہ ثواب عظیم اور رضوانِ اکبر کے مستحق بن جائیں، تاکہ دوسرے لوگ آزمائش کی صورت میں انبیاء کے حالات سے تسلی حاصل کرلیں اور صبر ورضاء کے تعلق سے ان کی اقتداء کریں، اور تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ انبیاءِ کرام بشر ہیں۔ معبود نہیں، جنہیں باربار جھنجھوڑا جاتا ہو اور کڑے مراحل سے گزرنا پڑتا ہو بھلا وہ لائقِ عبادت کیسے ہو سکتے ہیں؟

نیک لوگوں کی آزمائش میں حکمتیں

ایک سوال: اگر آپ سوال کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیاروں کو کیوں آزماتا ہے؟

جواب: ہم کہیں گے، اس میں بہت سی ارفع حِکَم ومقاصد پنہاں ہیں، ایک یہ ہے کہ کوئی بندہ گناہوں سے پاک نہیں ہوتا، لہذا یہ آزمائشیں ان کیلئے تطہیر کا باعث بن جاتی ہیں۔

① صحیح: مسند احمد (١/١٤٩٤، ١٥٥٥) سنن الترمذی (٢٣٩٨) سنن ابن ماجه (٤٠٢٣) سنن الدرامی (٢/٣٢٠) مستدرك الحاكم (١/٤٠)

دوسری حکمت یہ کہ آزمائشیں بلندئ درجات کا باعث بن جاتی ہیں، کیونکہ آزمائشوں کی وجہ سے بندۂ مؤمن اعمالِ صالحہ کی راہ پر گامزن ہوجاتا ہے۔

تیسری حکمت یہ ہے کہ آزمائشوں کی کثرت بندے کو توبہ واستغفار کی دعوت دیتی ہے، اب جس کو اللہ تعالیٰ ان آزمائشوں کے سبب توبہ کی توفیق مرحمت فرمادے اُسے ایک نعمتِ عظمیٰ حاصل ہوگئی۔

ایک حکمت یہ بھی ہے کہ کثرتِ ابتلاءات کے نتیجہ میں بندہ دُعا، تضرع اور انابت الی اللہ کا راستہ اختیار کرتا ہے جو بہت بڑی نعمت ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ انتہائی قابلِ مذمت ٹھہرائے گئے جو آزمائشوں کے باوجود تضرع الی اللہ کا راستہ اختیار نہیں کرتے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ اَخَذْنَاهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ ﴾ ①

''اور ہم نے انہیں عذاب میں بھی پکڑا تاہم یہ لوگ نہ تو اپنے پروردگار کے سامنے جھکے اور نہ ہی تضرع (عاجزی) اختیار کی''

اس کے برعکس اگر ایک بندہ اپنے اہل وعیال پر ٹوٹنے والی آزمائشوں پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ جڑ جائے اور نورِ توحید اور توکل علی اللہ کے ذریعے اپنے دین کو سنوار لے، اور ہر ماسوی اللہ سے کٹ کر دعاءً وعبادۃً اللہ تعالیٰ کا ہوجائے۔ نیز فعلِ مامور اور ترکِ محظور کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کا مطیع اور متبع ہوجائے تو مصائب کا یہ نتیجہ بڑا ہی عظیم الشان ہے، اور اسکے مستحق تو وہی ہوسکتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کو پیار ہو، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیاروں کو آزماتا ہے'' (انتھی ملخصاً)

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے فرمان: ''فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَى'' کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی آزمائشوں پر راضی ہوجائے اس کیلئے اللہ تعالیٰ کی رضاء ہے، کیونکہ یہ آزمائشیں اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر سے ہیں، لہذا اس کا راضی ہوجانا اس کے انتہائی مضبوط اور مستحکم ایمان بالقدر کی دلیل ہوگی۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ''اللہ تعالیٰ نے رحمتوں اور مسرتوں کے خزانے یقین ورضاء میں ڈال دیئے ہیں، جبکہ شک اور ناراضگی کو تمام ھموم وغموم کا سرچشمہ بنادیا۔''

ابن عون فرمایا کرتے تھے: ''تنگی وآسانی کے اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے سے راضی ہوجا اس لئے کہ اس سے بڑا غم ہلکا اور آخرت کے درجاتِ عالی کی طلب آسان ہوجائے گی، اور یہ جان لو کہ کوئی بندہ اس وقت تک حقیقتِ رضا کو نہیں پاسکتا جب تک وہ تنگی وفقر سے اس طرح راضی نہ ہونے لگے جس طرح تونگری اور غناء سے

① (المؤمنون: ٧٦)

راضی ہوتا ہے، تم اپنے امور میں اللہ تعالیٰ سے فیصلہ طلب کرتے ہو اور جب دیکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تمہاری خواہش کے خلاف ہے تو ناراض ہو جاتے ہو؟ اور اس چیز پر مصر رہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فیصلہ تمہاری خواہش کے مطابق ہو؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تمہاری خواہش کے مطابق ہو جائے لیکن اس میں تمہاری تباہی اور بربادی کا سامان ہو؟ اگر تمہاری یہی کیفیت برقرار رہی تو تم نہ اپنے نفس کے ساتھ انصاف کر سکے نہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا مقام حاصل کر سکے۔''

ابن عون کا یہ قول حافظ ابن رجب نے نقل فرمانے کے بعد اسے انتہائی نفیس اور عمدہ قرار دیا ہے۔

حدیث مذکور کا آخری جملہ: "مَنْ سَخِطَ فَلَهُ السَّخَطُ" سے مراد یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی آزمائشوں پر راضی نہ ہو بلکہ ناراض ہو جائے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر سے ناراض ہے، تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو جاتا ہے، اور یہ ناراضگی سب سے بڑی سزا ہے، جس کا ایک نتیجہ اعمال کی بربادی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ ﴾ ①

''یہ اس بناء پر کہ یہ وہ راہ چلے جس سے انہوں نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیا، اور انہوں نے اس کی رضامندی کو بُرا جانا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے''

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آزمائشوں اور فیصلوں پر ناراض ہونا اکبر الکبائر میں سے ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر پر راضی ہونا واجباتِ دین میں سے ہے۔

البتہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم رحمہما اللہ عدمِ وجوب کے قائل ہیں۔

شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

''جس طرح "صبر على اقدار الله" کا امر وارد ہے، اسی طرح رضا کا امر وارد نہیں ہے، البتہ جو رضا کے مقام پر فائز ہیں، انہیں بہت زیادہ مدح وثناء کا مستحق قرار دیا گیا ہے، رضاء کے وجوب کے حوالے سے جو بعض احادیث روایت کی جاتی ہیں اُن میں ضُعف پایا جاتا ہے۔''

شیخ الاسلام مزید فرماتے ہیں:

''مصیبتوں پر رضا ایک بڑا قابلِ تعریف مقام ہے، لیکن اس سے بھی کہیں اعلیٰ مقام مصیبتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے، کیونکہ مصیبتوں پر صبر ورضا کا ثواب بہت عظیم ہے، اور یہ عظیم اجر وثواب شکر کا متقاضی ہے۔''

واضح ہو کہ بعض مصیبتیں بڑی تکلیف دہ ہوتی ہیں جن پر بندے کو باقاعدہ رونا آجاتا ہے، یا پھر گریہ وزاری

① (محمد: ۲۸)

پر مجبور ہو جاتا ہے، یہ چیزیں صبر و رضاء کے منافی نہیں ہیں، کیونکہ اللہ کے اوامر کو تسلیم کرنا اور صبر و رضا کا مقام تو بندے کا دل ہے۔

رضا اور صبر کے مابین فرق

رضاء اور صبر کے مابین فرق بیان کرتے ہوئے بعض علماء، جن میں عمر بن عبد العزیز، فضیل بن عیاض، ابو سلیمان اور عبد اللہ بن مبارک وغیرھم قابلِ ذکر ہیں، فرماتے ہیں: راضی بقضاء اللہ اس حالت کا متمنی رہتا ہے جس پر اُسے اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے، جبکہ صابر اس مصیبت کی تبدیلی کا متمنی ہوتا ہے۔

خواص کے کلام کے مطابق مقامِ صبر، مقامِ رضا سے کم ہے۔ رضاء، نزولِ مصیبت سے قبل ہوتی ہے، یعنی بندہ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی رہنے کا عزم کرتا ہے، جبکہ صبر، نزولِ مصیبت کے بعد ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ رضا کا معاملہ نزولِ مصیبت کے بعد بھی ہوتا ہے، چنانچہ نزولِ مصیبت سے قبل عزمِ رضا اور نزولِ مصیبت کے بعد عملِ رضا ہوتا ہے، اس لیئے رسول اللہ ﷺ کی ایک معروف دُعا میں یہ الفاظ وارد ہیں:

"وَأَسْأَلُكَ الرِّضَا بَعْدَ الْقَضَاءِ" ①

یعنی: ''اے اللہ! میں تجھ سے بُرے فیصلے کے بعد اس پر راضی رہنے کا سوال کرتا ہوں''

لہٰذا حقیقی معنی میں راضی بقضاء اللہ وہ ہے جو وقوعِ قضاء کے بعد بھی راضی رہے۔



① صحیح :سنن النسائی (٣/ ٥٤) مستدرك الحاكم (١/ ٥٢٤)

اس باب کے مسائل

(۱) سورۃ التغابن کی آیت کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) الصبر علی اقدار اللّٰہ کا ایمان باللہ میں سے ہونا معلوم ہوا۔

(۳) حسب ونسب میں طعن وعیب نکالنے کا حرام ہونا معلوم ہوا۔

(۴) مصیبت کے وقت رخسار پیٹنے دامن پھاڑنے، اور جاہلیت کی پکار پکارنے والے کے حق میں شرعی وعید معلوم ہوئی۔

(۵) اللہ تعالیٰ کے اپنے بندے کے ساتھ خیر کا معاملہ کرنے کی علامت معلوم ہوئی۔

(۶) نیز اللہ تعالیٰ کے ارادۂ شر کی علامت بھی بیان ہوئی۔

(۷) اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے سے محبت کی علامت معلوم ہوئی۔

(۸) اللہ تعالیٰ کے فیصلوں اور آزمائشوں پر ناراض ہونے کی حرمت بیان ہوئی۔

(۹) اللہ تعالیٰ کی ابتلاءات پر صبر ورضا کا ثواب معلوم ہوا۔



باب ماجاء فی الریاء

ریاءکاری پر وعید کا بیان

قال:قال اللہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ﴾ ①

''اے محمد ﷺ! کہہ دیجئے: میں تو تم ہی جیسا ایک انسان ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے پس جو اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ وہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے''

یادرہے کہ کسی بھی عمل کی قبولیت کیلئے یہ شرط ہے کہ وہ عمل شرک اور ریاکاری سے پاک ہو کیونکہ شرک اور ریاکاری توحید کے بالکل منافی ہیں، لہذا مصنف رحمہ اللہ نے توحید کی حقیقت کو مزید نکھارنے کیلئے یہ باب قائم فرمایا ہے۔

ریاءکاری کا معنی

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''ریاء'' کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''لوگوں کو دکھانے اور ان کی تعریف حاصل کرنے کیلئے کوئی عبادت کرنا ریاء کہلاتا ہے۔''

قاضی ابوبکر رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''ریاء'' یہ ہے کہ لوگوں پر اپنی عبادت کا مقصد کچھ ظاہر کرے لیکن دل میں کوئی دوسرا مقصد پوشیدہ ہو۔

بہرحال شرعی نقطۂ نگاہ سے صرف وہی عمل کسی اہمیت یا ثواب کا مستحق قرار پاتا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کیلئے باخلاصِ نیت کیا جائے نیز یہ کہ اس عمل کے تعلق سے اخلاص کی ہمیشہ حفاظت بھی کی جاتی رہے، ایسا عمل جو اخلاص کے ساتھ کیا گیا ہو، لیکن بعد میں کسی بھی وقت اسے بنیت ریاکاری بیان کردیا جائے تو وہ بھی ریاکاری کے زمرے میں شامل ہوکر برباد ہو جائے گا۔

آیت ﴿ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ.... ﴾ کی تفسیر

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم ﷺ کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے اعلان کردیں کہ بشریت کے اعتبار سے وہ تم ہی جیسے ہیں، فرق ہے تو صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں رسالت کے منصب سے

---

① (الکھف: ۱۱۰)

مشرف فرمایا ہے جبکہ ربوبیت اور الوہیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہیں، آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی جس ملاقات کا ذکر ہے اس سے مراد آخرت میں دیدارِ الٰہی کی سعادت ہے اور یہ تفسیر بہت سے علماءِ سلف وخلف سے منقول ہے۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ملاقات کی امید رکھنے سے مراد آخرت میں اٹھائے جانے کا خوف ہے۔''

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے فرمایا:

''جس طرح وہ ایک الٰہ ہے، اور دوسرا کوئی الٰہ نہیں، اسی طرح عبادت کا مستحق بھی صرف وہی ہے، چنانچہ جو شانِ الوہیت میں یکتا وتنہا ہے ضروری ہے کہ شانِ معبودیت میں بھی اسے ہی یکتا وتنہا مانا جائے اور ہر قسم کی عبادت اس کیلئے خاص ہو، لہذا آیتِ بالا کی روشنی میں صرف وہی عمل قابلِ قبول ہے جس میں دو شرطیں پائی جائیں۔

(۱) ریا ونمود سے بالکل پاک ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴾ ①

''اور وہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے''

یعنی شرکِ جلی اور شرکِ خفی سے بالکل پاک ہو۔

(۲) اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ عمل سنتِ رسول ﷺ کے مطابق ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا ﴾ ①

''پس اسے چاہیئے کہ وہ نیک عمل کرے''

اور کوئی عمل اس وقت تک نیک ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق نہ ہو۔

اس آیتِ مبارکہ سے کئی باتیں ثابت ہوتی ہیں: جن میں شھادتین کی دلیل، توحیدِ الوہیت کا اثبات، نیز ریا کاری کا شرک ہونا قابلِ ذکر ہے۔

اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان لانے کی شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ ان لوگوں کی بھی اس آیت میں تردید ہے جو نیک لوگوں کا وسیلہ پکڑنے کے قائل ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہیں کرتے''

① (الکھف: ۱۱۰)

قَالَ: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ مَرفُوعًا :قَالَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی أَنَا أَغْنَی الشُّرَکَاءِ عَنِ الشِّرْكِ ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ مَعِی فِیْهِ غَیْرِی تَرَکْتُهُ وَشِرْکَهُ . ①

سیدنا ابوھریرۃ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''میں شرک کے معاملے میں شرکاء سے بے پرواہوں ، جس نے کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ غیر کو شریک کرلیا تو اس کو اور اسکے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔''

اللہ تعالیٰ کا مشرکوں اور ریا کاروں سے بے نیاز ہونا

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ نے ایسے عمل سے مطلق بے پرواہی اور بے نیازی کا اظہار فرمایا ہے ، جس میں غیر کو بھی شریک کرلیا جائے اور ریاء کرنے والے کی نیت چونکہ یہ ہوتی ہے کہ اس کے اس عمل کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے لوگ بھی دیکھیں لہذا اس نے اس عمل میں دوسرے کو اللہ کا شریک بنالیا اور جب یہ صورتِ حال ہو تو پھر بھلا وہ غنیٔ مطلق کہاں اس عمل کو قبول فرمائے گا؟ بلکہ ابن ماجہ کی ایک حدیث میں یوں بھی آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے عمل کی بابت فرماتا ہے:

''میں ایسے عمل سے بیزار ہوں اور یہ عمل اس کیلئے بن جاتا ہے جسے اس نے شریک کیا''

ابنِ رجب ؒ نے غیر اللہ کیلئے کئے جانے والے اعمال کی کئی اقسام بیان کی ہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) ایسا عمل جو کسی دنیوی منفعت کے حصول کی خاطر صرف لوگوں کو دکھانے کیلئے کیا جائے۔ جیسا کہ منافقین کی نمازوں کا حال ہے۔

﴿ وَإِذَا قَامُوْا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَاءُوْنَ النَّاسَ ﴾ ②

''اور نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو بڑی کاہلی کی حالت میں کھڑے ہوتے ہیں صرف لوگوں کو دکھاتے ہیں''

یہ ریاءِ محض کہلاتا ہے۔ اور اس کا صدور ایک مؤمن سے ممکن نہیں ، خاص کر فرائض میں ایسا عمل جس میں ریاء ہو برباد ہو جاتا ہے، بلکہ ایسا عمل کرنے والا شخص اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے۔

(۲) دوسری قسم ایسے اعمال کی ہے جو اللہ تعالیٰ کیلئے کئے جاتے ہیں لیکن ان میں ریا بھی شامل ہوتی ہے، صحیح دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ ایسا عمل بھی باطل ہے جس کی پہلی دلیل حدیثِ مذکور ہے، اور دوسری دلیل جنابِ شداد بن اوس ؓ کی حدیث ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

① رواہ مسلم فی کتاب الزھد، رقم: ٧٤٧٥ ② (النساء: ١٤١)

''دکھاوے کی نماز شرک ہے، دکھاوے کا روزہ شرک ہے، دکھاوے کا صدقہ شرک ہے، جس نے میرے ساتھ شرک کیا میں اس کے حق میں بہتر تقسیم کرنے والا ہوں، چنانچہ اس کا جسم اور اس کا عمل خواہ کم ہو یا زیادہ اس شریک کے حصہ میں دے دونگا جسے میرے ساتھ شریک کیا گیا میں اس سے مستغنی ہوں'' ①

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے:

''اے لوگو! اپنی نیکیاں اللہ عزوجل کیلئے خالص کرلو کیونکہ اللہ تعالیٰ صرف ان نیکیوں کو قبول فرماتا ہے جو اس کیلئے خالص ہوں'' ②

سیدنا ابوامامۃ الباہلی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں آتا ہے: ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! ایک شخص جہاد کرتا ہے، اجر پانے کیلئے اور شہرت حاصل کرنے کیلئے، اُسے کیا ملے گا؟ (اُس نے یہ سوال تین دفعہ دُہرایا، تینوں بار رسول اللہ ﷺ نے یہی جواب دیا)

"لَاشَیْءَ لَهٗ"

''اُسے کچھ بھی نہیں ملے گا''۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اِنَّ اللّٰهَ لَایَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ اِلَّا مَاکَانَ لَهٗ خَالِصًا وَابْتُغِیَ بِهٖ وَجْهُهٗ"

''اللہ تعالیٰ صرف اُس عمل کو قبول فرماتا ہے جو اس کیلئے خالص ہو اور اس میں صرف اسی کی رضا طلب کیجائے''

یہ حدیث ابوداوٗد اور نسائی میں صحیح سند سے مروی ہے: جس سے ثابت ہوا کہ ریاء کی وجہ سے جہاد کا اجر ضائع ہوجاتا ہے، البتہ اگر سفرِ جہاد میں ریاء کاری کے علاوہ کوئی اور نیت شامل ہو مثلاً: حصولِ اجرت، حصولِ غنیمت یا تجارت وغیرہ تو اس سے جہاد کا اجر کم ہوجائے گا، بالکل باطل نہیں ہوگا (واللہ اعلم)

بہر حال کتاب وسنت کے ان دلائل سے ثابت ہوگیا کہ ریاء والے عمل کا کوئی اجر نہیں ملتا، اور ریاء کرنے والا شدید ترین عذاب کا نشانہ بنتا ہے، صحیح مسلم کی وہ حدیث بھی پیشِ نظر رہنی چاہیئے جس میں تین قسم کے انسانوں کا سب سے پہلے جہنم میں جانے کا ذکر ہے:

(ا) اس نیت سے جہاد کرنے والا کہ لوگوں میں شجاعت کا چرچا ہو۔

=

① ضعیف: مسندالطیالسی (۱۱۲۰) مسنداحمد (۱۷۱۴۰ج٦) مستدرك الحاكم (٣٢٩/٤) اس کی سند میں شہر بن حوشب ضعیف راوی ہے۔ مجمع الزوائد (۲۲۱/۱۰).

② امام هيثمی مجمع الزوائد (۲۲۱/۱۰) میں فرماتے ہیں: ''اسے بزار نے روایت کیا ہے، اسکی سند میں ابراھیم بن محشر ہے جسکی ابن حبان وغیرہ نے توثیق کی ہے، لیکن اس میں ضعف ہے، جبکہ باقی رواۃ صحیح کے ہیں۔''

عَنْ اَبِی سَعِیْدٍ مَرْفُوْعاً :"أَلا أُخْبِرُکُمْ بِمَا هُوَأَخْوَفُ عَلَیْکُمْ عِنْدِیْ مِنَ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ؟ قَالُوْا: بَلٰی قَالَ:اَلشِّرْکُ الْخَفِیُّ یَقُوْمُ الرَّجُلُ فَیُصَلِّیْ فَیُزَیِّنُ صَلَاتَهُ لِمَا یَرٰی مِنْ نَظْرِ رَجُلٍ" ①

سیدنا ابوسعید خدری ﷛ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام ﷡ سے پوچھا (جب کہ صحابہ ﷡ دجال کے فتنے کا ذکر کر رہے تھے) ''کیا میں تمہیں ایسی چیز کے متعلق نہ بتاؤں جو تمہارے (ایمان وعمل کے) لئے دجال سے بھی زیادہ خطرناک اور خوفناک ہے؟'' صحابہ کرام ﷡ نے عرض کیا: کیوں نہیں۔تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''پوشیدہ شرک، کہ ایک آدمی نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے اور یہ دیکھ کر کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے اپنی نماز کو خوبصورتی سے ادا کرتا ہے''

=

(۲) علمی شہرت کی نیت سے پڑھنے اور پڑھانے والا۔

(۳) اس نیت سے صدقہ دینے والا کہ اس کی سخاوت کے تذکرے ہو۔

تینوں عمل انتہائی عظیم اور قابلِ قدر ہیں لیکن محض نیت کے فتور کے باعث نہ صرف وہ ضائع ہوگئے بلکہ وہ عمل کرنے والے سب سے پہلے جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے (اعاذنا اللہ من النار وما قرب الیها من قول او عمل)

رسول اللہ ﷺ کا اُمت کے بارے میں ریاء کاری سے خوف کھانا

وقوله:عَنْ اَبِی سَعِیْدٍ مَرْفُوْعاً :"أَلا أُخْبِرُکُمْ بِمَا هُوَأَخْوَفُ عَلَیْکُمْ ......

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ریاء کو شرکِ خفی قرار دیا ہے، یہ مخفی شرک اس لئے ہے کہ ریاء کار بظاہر وہ عمل اللہ تعالیٰ کیلئے کرتا ہے لیکن دل میں یہ بات پوشیدہ ہوتی ہے کہ یہ عمل غیر کیلئے ہے۔

اس کے علاوہ سیدنا شداد بن اوس ﷛ کی حدیث سے بھی یہی واضح ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں: ''ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ریاء کو شرکِ اصغر شمار کرتے تھے۔'' ②

یہ بھی واضح ہوگیا کہ ریاء کاری کے مفاسد ومہالک دجال کے فتنوں سے بھی زیادہ مضرت رساں ہیں، اس لیئے شریعت نے ہر نیکی کی بنیاد اخلاص قرار دی ہے جو کہ عین توحید ہے، جبکہ ریاء کاری عین شرک ہے۔ چنانچہ اخلاص کی بابت اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

① (مسند احمد ،الرقم: (۲۳۶۹۳) ابن ماجه کتاب الزهد، الرقم: (۴۲۰۴)

② حسن لغیره: مستدرك الحاکم (۳۲۹/۴) طبرانی کبیر (۷۱۶۰) امام حاکم نے صحیح اور امام ذھبی نے موافقت کی ہے۔

﴿ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ . أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ﴾ ①

''پس اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، خبردار اللہ تعالیٰ کیلئے خالص دین ہے''

نیز فرمایا: ﴿ قُلْ إِنِّيْ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴾ ②

''کہہ دیجئے مجھے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے''



① (الزمر: ۲، ۳) ② (الزمر: ۱۱)

اس باب کے مسائل

(۱) سورۂ کہف کی آیت ﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ....الایۃ ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) انتہائی اہم بات یہ معلوم ہوئی ہے کہ کسی بھی نیکی میں جب غیر اللہ کی رضا شامل ہو جائے تو وہ مردود ہو جاتی ہے۔

(۳) ریاکاری والے عمل کے ضائع ہونے کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کمالِ بے نیازی کی صفت سے متصف ہے، چنانچہ اسے ایسے عمل کی کیا پروا جس میں غیر کی رضا کا ذرہ برابر عنصر شامل ہو۔

(۴) ایک سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام شرکاء سے افضل اور برتر ہے۔

(۵) نبی کریم ﷺ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بھی ریاء کاری میں مبتلا ہونے کا خوف تھا (پھر ہماری کیا نسبت؟)

(۶) ریاء کی تفسیر رسول اللہ ﷺ نے اس مثال سے سمجھائی کہ انسان بظاہر اللہ تعالیٰ کیلئے نماز پڑھنے کھڑا ہو، پھر کسی شخص کے دیکھنے کی وجہ سے اپنی نماز کو خوب صورت اور لمبا کر کے پڑھنے لگے۔



باب من الشرك ارادة الانسان بعمله الدنيا

انسان کا محض دنیا کمانے کی خاطر نیک عمل کرنا شرک ہے۔

قال:قوله : ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَايُبْخَسُوْنَ . أُوْلٰئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَاصَنَعُوْا فِيْهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (1)

''جو شخص دنیا کی زندگی اور اس کی زینت پر فریفتہ ہوا جاتا ہو ہم ایسوں کو ان کے کل اعمال (کا بدلہ) یہیں بھرپور پہنچا دیتے ہیں اور یہاں انہیں کوئی کمی نہیں کی جاتی، ہاں یہی وہ لوگ ہیں جن کیلئے آخرت میں سوائے آگ کے اور کچھ نہیں اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہاں سب اکارت ہے، اور جو کچھ ان کے اعمال تھے سب برباد ہونے والا ہے''

بعض لوگ اس باب کو سابقہ باب (الریاء) کا حصہ سمجھتے ہیں، ان کے خیال میں باب الریاء کے بعد اس باب کا ذکر محض تکرار ہے، لیکن یہ بات غلط ہے۔ ان دونوں ابواب میں بہت فرق ہے، چنانچہ اس باب کا مقصود یہ بتانا ہے کہ کوئی شخص محض حصولِ دنیا اور طلب مال کی خاطر نیکی کرے، جیسے وہ مجاہد جو محض درہم و دینار یا کپڑے کے حصول کیلئے جہاد کرتا ہے، ایسے شخص کو رسول اللہ ﷺ نے ''مال و زر کا بندہ'' کہا ہے۔ جبکہ ریاء کار کا معاملہ اس سے مختلف ہے، وہ محض ذاتی شہرت، عزت اور مدح و ستائش کے حصول کیلئے نیکی کرتا ہے۔ لیکن نتیجہ اور انجام کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں، دونوں بوجہ ارتکابِ شرک خائب و خاسر اور عمل کے اجر و ثواب سے یکسر محروم ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کی، ہر اُس چیز سے پناہ طلب کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب اور عذابِ الیم کا موجب ہے۔

قوله:قوله تعالیٰ : مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ ....

ان آیات میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو دنیا ہی میں اپنے اعمال کے ثواب کے طالب و متمنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس طلب اور خواہش کے پیشِ نظر انہیں ان کی نیکیوں کا صلہ دنیا ہی میں بصورتِ صحت، یا اہل، مال و اولاد میں سرور کی شکل میں عطا فرما دیتا ہے۔ چنانچہ یہاں انہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی، مگر آخرت کا معاملہ نہایت خطرناک ہوگا۔

---

(1) (هود: ۱۵، ۱۶)

﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ﴾ ①

''یہی لوگ ہیں جن کیلئے آخرت میں سوائے آگ کے کچھ نہیں''

واضح ہو کہ بعض مفسرین نے ان آیات کا مصداق کفار کو قرار دیا ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ ان کیلئے آخرت میں صرف جہنم کی آگ کی سزا مذکور ہوئی ہے، اور یہ وعید کفار کیلئے مختص ہے۔

لیکن دیگر مفسرین مثلاً ضحاک وغیرہ کا قول ہے کہ ''اس سے مراد وہ اہلِ ایمان ہیں جو اخلاص وتقویٰ کے بغیر نیک عمل کرتے رہے۔''

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے بھی اسی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے۔ لیکن اس تفسیر پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ پھر تو بعض مؤمنین کیلئے بھی جہنم کا دائمی عذاب ہے، مثلاً: وہ مؤمن جو محض حصولِ دنیا کی خاطر نیک اعمال انجام دیتا ہے حالانکہ جہنم کا دائمی عذاب تو صرف کفار ومشرکین کیلئے ہے؟

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: (جس کا خلاصہ یہ ہے کہ)

''ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا انجام ذکر فرمایا ہے جو محض دنیا کی خاطر نیک اعمال کرتے ہیں، اور وہ انجام جہنم کا عذاب ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر بھی دے دی کہ انکے تمام اعمال باطل، ضائع اور رائیگاں ہیں۔ اب نجات تو اعمال کی بنیاد پر ہوگی جو ضائع ہو چکے ہیں، تو پھر ان کا جہنم سے نکلنا کیونکر ممکن ہوگا؟ البتہ پھر بھی دیکھا جائے گا کہ اس بندے کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو اسے جہنم سے نکال سکے؟ اس کے ایمان پر نظر کی جائے گی، اگر اسکے پاس ایسا ایمان ہوا جس کا مقصد دنیا کا حصول نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کا حصول تھا تو یہ ایمان اسے جہنم میں ہمیشہ رہنے سے بچالے گا۔ کیونکہ حدیث میں آتا ہے:

''جہنم سے بالآخر اس شخص کو بھی نکال لیا جائے گا، جس کے پاس رائی کے ایک دانے کی مقدار ایمان ہوگا''

لیکن اگر اس کا ایمان بھی، اس کے عمل کی طرح محض حصولِ دنیا کی خاطر تھا تو پھر ایسے ایمان کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، ایسا ایمان لانے والے میں اور کافر میں کوئی فرق نہیں ہے، لھذا ایسے شخص کو باوجودِ ایمان کے جہنم میں ہمیشہ رہنا پڑے گا''

اس تقریر سے تین طرح کے لوگ سامنے آرہے ہیں:

ایک: وہ جن کا ایمان لانا اور عملِ صالح کرنا محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر تھا، تو ان کے ایمان وعمل کی شان یہ ہے کہ یہ لوگ دخولِ جہنم سے یکسر محفوظ رہیں گے۔

① (ھود:١٦)

دوسرے: وہ جن کے اعمالِ صالحہ محض حصولِ دنیا کیلئے تھے،مگر ایمان اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی نیت سے تھا،انہیں ان کے اعمالِ صالحہ کا صلہ دنیا میں مل جائے گا،اور آخرت میں جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے،مگر چونکہ ان کا ایمان،اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر تھا،تو اس کی برکت سے بالآخر جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔

تیسرے: وہ لوگ جن کا ایمان وعمل سب کچھ حصولِ دنیا،طلبِ منصب وجاہ اور تلاشِ سیم وزر کی خاطر تھا تو انہیں دنیا میں یہ سب کچھ مل جائے گا،اور آخرت میں دائمی عذابِ جہنم کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔(نعوذ باللہ من النار وماقرب الیھا من قول وفعل)

مختلف نیتوں سے عمل کرنے والوں کی چند اقسام

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس ضمن میں مختلف نیتوں سے عمل کرنے والے لوگوں کی چند اقسام ذکر فرمائی ہیں جو حکماً اس آیت کے تحت آتی ہیں،ہم ان اقسام کا خلاصہ بیان کرتے ہیں:

(۱) ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو نیک اعمال،صدقہ،احسان اور ترکِ ذنوب وغیرہ انجام دیتے ہیں کیونکہ ان کا مقصد ثوابِ آخرت کا حصول نہیں بلکہ دنیا کے چند فوائد کی طلب ہوتا ہے،مثلاً مال واولاد میں ترقی واضافہ،اور ان کی حفاظت وغیرہ۔ان کی کوشش انہی فوائد کے حصول پر مرکوز ہے جنت کی طلب یا جہنم کے بچاؤ کی ان کے اندر سوچ ہی نہیں۔ایسے لوگوں کو ان کے اعمال کا صلہ دنیا میں دیکر فارغ کردیا جائے گا اور آخرت میں کچھ نہیں ملے گا۔اس قسم کے لوگوں کا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر فرمایا ہے۔

(۲) دوسری قسم جو پہلی قسم سے زیادہ سنگین اور خوفناک ہے،ان لوگوں کی ہے جو صرف لوگوں کو دکھاوے کی خاطر نیک اعمال کرتے ہیں،جو ثوابِ آخرت کی طلب اور فکر سے بالکل عاری ہوتے ہیں،امام مجاہد رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ ان آیات کا نزول ہی ریاء کاروں کے بارہ میں ہوا ہے۔

(۳) تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جنکے اعمالِ صالحہ کا مقصود صرف دنیا ہے،مثلاً حج یا عمرہ کرنے جاتے ہیں صرف مال یا تجارت کی خاطر،ہجرت کرتے ہیں محض دنیا کی خاطر یا کسی عورت سے نکاح کی غرض سے،جہاد کرتے ہیں صرف مالِ غنیمت کے حصول کیلئے،تعلیم وتعلم سے ناطہ جوڑتے ہیں محض حصولِ منصب ووظیفہ کی خاطر۔

یہ لوگ دوسری قسم کے لوگوں سے زیادہ سمجھدار ہیں کیونکہ یہ لوگ کم ازکم کسی دنیوی مصلحت کو پالیتے ہیں،لیکن دوسری قسم کے لوگ (ریاءکار) نرے احمق ہیں کہ ان کا مقصود صرف مدح وستائش کا حصول ہوتا ہے،حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔

(۴) چوتھی قسم ان لوگوں کی ہے جو اعمالِ صالحہ تو بڑے اخلاص کے ساتھ انجام دے رہے ہوتے ہیں لیکن اسکے ساتھ ساتھ وہ کسی ایسے سنگین عمل پر قائم ہیں جو انہیں ملتِ اسلامیہ سے خارج کر دیتا ہے، جیسے یہود و نصاریٰ۔

نیز بہت سے کلمہ گو مسلمان بھی ایسے ہیں جو بڑے اخلاص کے ساتھ اعمالِ صالحہ میں منہمک اور مشغول ہیں اوران کا مقصد بھی دارِ آخرت کا ثواب ہوتا ہے، مگر وہ شرک و بدعت کے ایسے اعمال پر قائم ہوتے ہیں جو انہیں اسلام سے خارج کر دیتے ہیں، اوران کی نیکیوں کی قبولیت میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ (والعیاذ باللہ)

اس نوع کے لوگوں کا ذکر انس بن مالک ﷛ نے فرمایا ہے:

''سلفِ صالحین اس نوع کے تباہ کن اور ہلاکت خیز فتنہ سے ڈرے اور گھبرائے رہتے تھے۔''

علماءِ سلف میں سے کسی کا قول ہے: ''اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے میرا صرف ایک سجدہ قبول فرما لیا ہے تو میں موت کی تمنا کرونگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ ①

''اللہ تعالیٰ تو صرف متقین کی نیکیاں قبول فرماتا ہے''

بہرحال تقویٰ و اخلاص ہی قبولِ عمل کا معیار ہے۔

اب ان لوگوں کا تذکرہ باقی رہ گیا جو اعمالِ صالحہ مثلاً نمازیں، زکوٰۃ، روزے اور حج وغیرہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور ثوابِ آخرت کی خاطر انجام دیتے ہیں، پھر کچھ نیکیاں حصولِ دنیا کی خاطر بھی کرتے ہیں تو انہیں ان کے عمل سے وہی کچھ ملے گا جو نیت ہوگی۔

قرآن مجید نے یا تو خالص اہلِ جنت کا ذکر فرمایا یا خالص اہلِ جہنم کا، لیکن ان لوگوں کے ذکر سے خاموش ہے جن کے بعض اعمال تو رضائے الٰہی کی خاطر ہیں جبکہ بعض اعمال میں طلبِ دنیا کا شائبہ ہے، سو ان کا اور ان جیسوں کا یہی حکم ہے جو ہم نے بیان کر دیا۔ (انتہیٰ کلام شیخ الاسلام ملخصاً)

واضح ہو کہ اس آیتِ کریمہ سے بہت سے فوائد حاصل ہو رہے ہیں، مثلاً: (۱) شرک تمام اعمال کو ضائع کر دیتا ہے۔ (۲) عمل صالح میں دنیا اور اس کی زیب و زینت کے حصول کی نیت کرنا بھی شرک ہے اور اس عملِ صالح کے ثواب کو باطل کر دینے والی ہیں۔ (۳) اللہ تعالیٰ کافروں کی نیکیوں کا صلہ دنیا میں عطاء فرما دیتا ہے۔ (۴) اس طرح جو مسلمان طالبِ دنیا ہے اسے بھی اس کا صلہ دنیا میں مل جاتا ہے لیکن آخرت میں بالکل تہی دست و تہی دامن آئے گا۔ اس قسم کی نیت رکھنے والا شدید ترین وعید کا مستحق ہے جو اعمال کی بربادی اور دائمی عذابِ جہنم ہے۔ (والعیاذ باللہ)

① (المائدۃ: ۲۷)

قال:فی الصحیح عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ: "تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَتَعِسَ عَبْدُ الدِّرْھَمِ وَتَعِسَ عَبْدُ الْخَمِیْصَۃِ تَعِسَ عَبْدُ الْخَمِیْلَۃِ إِنْ أُعْطِیَ رَضِیَ وَإِنْ لَمْ یُعْطَ سَخِطَ ، تَعِسَ وَانْتَکَسَ ، وَإِذَا شِیْكَ فَلَا انْتُقِشَ ، طُوْبٰی لِعَبْدٍ آخِذٍ بِعِنَانِ فَرَسِہٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ أَشْعَثَ رَأْسُہُ ، مُغْبَرَّۃٌ قَدَمَاہُ إِنْ کَانَ فِی الْحَرَاسَۃِ کَانَ فِی الْحَرَاسَۃِ وَإِنْ کَانَ فِی السَّاقَۃِ کَانَ فِی السَّاقَۃِ ، إِنِ اسْتَأْذَنَ لَمْ یُؤْذَنْ لَہٗ ، وَإِنْ شَفَعَ لَمْ یُشَفَّعْ " ①

امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں سیدنا ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''روپے پیسے اور کپڑے لتے کا پجاری ہلاک ہو جائے۔ اگر اسے کچھ دیا جائے تو خوش ہو جاتا ہے اور نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتا ہے۔ وہ ہلاک اور نامراد ہو جائے، اور اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو کوئی اس مصیبت سے خلاصی دلانے والا نہ پائے۔ خوشخبری ہے اس بندے کیلئے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں گھوڑے کی لگام تھامے نکلتا ہے سر کے بال بکھرے ہوئے اور پاؤں غبار آلود، اگر اسے لشکر کی چوکیداری کیلئے کھڑا کر دیا جائے تو وہیں کھڑا رہتا ہے اور اگر اسے لشکر کے پچھلے دستے میں مقرر کر دیا جائے تو وہیں رہ جاتا ہے (گویا گمنامی سے بھی نہیں گھبراتا بلکہ جو جگہ اس کیلئے مقرر کر دی گئی وہیں قائم ہے) اگر (امراء پر داخلہ کی) اجازت مانگتا ہے تو اسے (صاحبِ جاہ یا عہدیدار نہ ہونے کی وجہ سے) اجازت نہیں دی جاتی، اور اگر وہ کسی کی سفارش کرتا ہے تو اس کی سفارش قبول نہیں کی جاتی'' (محض اس بناء پر کہ وہ کسی منصب اور عہدے پر فائز نہیں اور شانِ فقیری و بے نیازی کا مالک ہے)

محض دنیا کے طالب وحریص کی مذمت

یہ حدیث اس شخص کی خوب مذمت و شناعت پر مشتمل ہے جو محض دنیا کا طالب و حریص ہوتا ہے، جس کا ملنا جلنا، حتی کہ نیک اعمال بجالانا محض دنیا کی خاطر ہوتا ہے۔

مذمت کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے ہلاکت اور بربادی کی بددعائیں دی ہیں، بلکہ یہاں تک فرمایا: ''اگر اس کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جائے تو نہ وہ خود اسے نکال سکے، نہ نکالنے کیلئے کوئی مددگار پا سکے۔'' یعنی بالکل بے یار و مددگار اس کانٹے کی تکلیف سے تڑپتا رہے اور بالآخر ہلاک ہو جائے۔

① صحیح بخاری ،الرقم: (۲۸۸۷)

گویا بقول امام طیبی رحمہ اللہ یہ شخص کسی رحم یا ترس کھائے جانے کا مستحق نہیں ؛ کیونکہ اگر کوئی اس پر ترس کھائے گا تو اس کی تکلیف کچھ آسان ہو جائے گی ، جو خلافِ مقصود ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''نبی ﷺ کا اس انداز سے اس کی بربادی کی بدعا فرمانے میں یہ نکتہ پنہاں ہے کہ اس کی طلبِ مال وزر کی نیت پوری نہ ہو سکے ، پھر حصولِ دنیا کیلئے بھاگ دوڑ کیسے کر سکے گا؟''

واضح ہو کہ طالبِ دنیا کی مذمت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے ''عَبْدُ الدِّیْنَارِ ، عَبْدُ الدِّرْهَمِ ، عَبْدُ الْخَمِیْصَةِ ، عَبْدُ الْخَمِیْلَةِ '' جیسے انتہائی ذلیل اور بھیانک القاب سے نوازا ، یعنی روپے پیسے اور کپڑے لتے کا غلام ، بندہ اور پجاری ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ہر عمل وسعی میں طلبِ دنیا کی نیت کارفرما ہوتی ہے ، حتی کہ اس کی دوستی اور دشمنی ، رضا اور ناراضگی محض دولتِ دنیا کی خاطر بن جاتی ہے ، تو پھر اسے مال و دولت کا غلام اور پجاری ہی کہا جائے گا۔

قرآن مقدس میں منافقین کا شیوہ کچھ اس انداز سے بیان فرمایا گیا ہے:

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴾ ①

''ان میں وہ بھی ہیں جو خیراتی مال کی تقسیم کے بارہ میں آپ پر عیب رکھتے ہیں ، اگر انہیں اس میں سے مل جائے تو خوش ہیں اور اگر اس میں سے نہ ملا تو فوراً ہی بگڑ کھڑے ہوتے ہیں۔''

گویا ان کی رضا بھی غیر اللہ کیلئے اور ناراضگی بھی غیر اللہ کیلئے ہے ، مال وزر کی محبت ان کے دلوں میں پیوست ہو چکی ہے ۔ غلامی بھی اسی چیز کا نام ہے۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے طلبِ دنیا (اور اس کی محبت) کے حوالے سے دو صورتیں ذکر فرمائی ہیں:

ایک یہ کہ: بندہ ایسی اشیاء کی طلب میں کوشاں وسرگرداں رہے جن کا وہ محتاج ہے ، تو ایسے امور کا وہ اللہ تعالیٰ سے سوال کرے اور اسی کی طرف راغب ہو ، یہ مال اس کے پاس برائے استعمال موجود ہو ، جیسا کہ وہ اپنی سواری یا بستر کو اس پر سوار ہونے یا بیٹھنے کیلئے استعمال کرتا ہے ، مقصد یہ کہ اس مال کی محبت کو دل میں نہ بسا لے ، فقط ضروریات واحتیاجات میں استعمال کیلئے رکھے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ: ایسا مال جس کا بندہ محتاج نہیں ، تو ایسے مال سے قلبی لو لگا لینا درست نہیں ، کیونکہ اس کا مطلب یہی ہوگا کہ وہ اس مال کی غلامی کرنے پر آمادہ ہے ، یہ اعتماد علی غیر اللہ ہے ، جس کی موجودگی سے

① (التوبة : ٥٨)

بندہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی عبودیت اور اس پر حقیقی توکل سے محروم ہو جاتا ہے، بلکہ اسکے اندر غیر اللہ کی عبادت اور توکل کا ایک شعبہ پیدا ہو جاتا ہے، نتیجۃً یہ شخص رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان یا بددُعاء کا مصداق بن جاتا ہے۔

اب یہ بندہ ان چیزوں کا ایسا غلام اور پجاری بن چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بھی مانگتا ہے تو ملنے پر خوش ہو جاتا ہے، نہ ملنے پر ناراض ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا تقاضا تو یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات سے راضی ہو، اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرمالے وہ بھی اسے ناپسند قرار دیدے، ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کا متلاشی ہو، جو چیز اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے وہ بھی اسے ناپسندیدہ ہی سمجھے، اولیاء اللہ سے دوستی قائم کرے اور اعداء اللہ سے عداوت۔ ایسا بندہ یقیناً کامل الایمان ہے۔

حدیثِ مذکور کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے ایک خوش نصیب بندے کو بشارت اور خوشخبری کا مستحق قرار دیا۔ فرمایا: ''طُوْبٰی لِعَبْدٍ ......''

طوبیٰ کیا ہے؟

طوبیٰ کیا ہے؟ سیدنا ابو سعید خدری ؓ کی روایت کے مطابق ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، طوبیٰ کیا ہے؟ فرمایا:

''جنت کا ایک درخت ہے، اتنا بڑا کہ اس کے سائے تلے سو سال پوری برق رفتاری کے ساتھ سفر کیا جا سکے، اہل جنت کے لباس اسکی کونپلوں سے تیار ہونگے۔'' ①

یہ اس بندے کو عطاء ہوگا جو دنیا کا حریص و متکلب بننے یا دنیا کے مناصب وعہدوں کا طالب ہونے کے بجائے راہِ جہاد کا متلاشی ہو، ہمیشہ گھوڑے کی لگامیں تھامے رکھے اور کثرتِ جہاد کی وجہ سے اس کا سر اور پاؤں غبار سے اٹے رہتے ہوں، اطاعتِ امیر کے رنگ میں ایسا رنگا ہو کہ اسے حفاظتِ جیش جیسی اہم ڈیوٹی پر سب سے آگے کھڑا کر دیا جائے تو کسی خوف یا کمی کوتاہی کے بغیر اپنی ذمہ داری نبھائے گا، اور اگر لشکر کے پیچھے کسی چوکیداری پر مامور کر دیا جائے تو بخوشی تیار ہو جائے گا، اسے گمنامی والا عمل سمجھ کر ٹھکرانے کی کوشش نہیں کرے گا، کیونکہ اسے خودنمائی کا کوئی شوق نہیں ہے، وہ ہر رنگ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت تصور

① مسند احمد (١١٦٧٣/٤) صحیح ابن حبان (٢٦٢٥) اس کی سند میں ابو السمح دراج بن سمعان ضعیف راوی ہے، لیکن اس معنی کی صحیح حدیث، صحیح بخاری "کتاب الرقاق": (٦٥٥٢) "بدء الخلق" (٣٢٥٢) میں موجود ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ''جنت میں ایک درخت ہے، جسکے سائے میں ایک سوار سو سال تک چلتا رہے گا۔'' نیز دیکھئے: (صحیح مسلم: ٢٨٢٧)

کر کے قبول کر لیتا ہے۔ دنیا داروں کی نگاہ میں اس کا کوئی مقام نہیں، چنانچہ نہ تو اسے کوئی اپنے پاس داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے کیونکہ وہ صاحبِ جاہ یا صاحبِ مال نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اس کی سفارش قبول کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی وجیہ شفیع ہے۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''کتنے ہی در در کے ٹھکرائے ہوئے، پراگندہ حال لوگ ایسے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر کوئی قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کی لاج رکھ لیتا ہے اور اس قسم کو ضرور پورا فرما دیتا ہے۔'' ①



① (صحیح مسلم)

اس باب کے مسائل

(۱) یہ بات معلوم ہوئی کہ انسان کا اعمالِ آخرت کو دنیا کے حصول کی خاطر بجالانا شرک ہے۔

(۲) سورۂ ھود کی آیت کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۳) دنیا کے مال کی حرص وطمع کس قدر بدترین معاملہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کو عَبْدُالدِّینَارِ، عَبْدُالدِّرْھَمِ اور عَبْدُ الْخَمِیْصَةِ جیسے القاب دیئے۔

(۴) اس کا ''عَبْدُالدِّ یْنَارِ'' اور ''عَبْدُ الدِّرْھَمِ'' ہونا اس لئے ہے کہ اس کی رضا اور ناراضگی کی بنیاد مال ہے، چنانچہ کچھ دے دیں تو خوش اور نہ دیں تو ناراض۔

(۵) یہ بات معلوم ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ نے طالبِ دنیا کی بربادی کی بددُعا فرمائی ہے۔

(۶) طالبِ دنیا کسی رحم یا ترس کا مستحق نہیں، حتی کہ اگر اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو اسے کوئی نہ نکالے تاکہ وہ چلنے پھرنے اور دنیا کمانے کے قابل ہی نہ رہے۔

(۷) مجاہد، جو حدیث میں مذکور صفات کا حامل ہے انتہائی تعریف وثناء کا مستحق ہے۔



باب

مَنْ أَطَاعَ الْعُلَمَاءَ وَالْاُمَرَاءَ فِي تَحْرِيمِ مَا أَحَلَّ اللهُ أَوْ تَحْلِيلِ مَا حَرَّمَ اللهُ فَقَدِ اتَّخَذَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللهِ

جس نے علماء اور حکام کی اطاعت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیز کو حرام، یا اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کو حلال سمجھ لیا، تو اس نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان علماء اور حکام کو اپنا رب جان لیا

حلال وحرام میں مخلوق کی اطاعت شرک ہے

چونکہ اطاعت، عبادت ہی کی ایک قسم ہے بلکہ عین عبادت ہے، کیونکہ عبادت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے جو احکام صادر فرمائے ہیں ان کی اطاعت کی جائے، لھذا مؤلف رحمہ اللہ نے اس باب میں یہ واضح فرمایا ہے کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں، سوائے یہ کہ مخلوق کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تابع ہو، اور اگر تابع نہ ہو تو پھر یہ اطاعت نا جائز ہے، بلکہ اگر مخلوق کی اطاعت سے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حلال وحرام میں کسی قسم کا خلل واقع ہوتا ہے یا حکمِ شرعی کی مخالفت ہوتی ہے تو یہ اطاعت شرک ہے اور اطاعت کرنے والا مشرک۔ اس کی دلیل قرآنِ کریم کی یہ آیت ہے:

﴿ اِتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوْا اِلاَّ لِيَعْبُدُوْا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَا اِلٰهَ اِلاَّ هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ ①

''ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنالیا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انہیں صرف ایک اکیلے اللہ ہی کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا، جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ پاک ہے ان کے شریک مقرر کرنے سے۔''

اس آیت کی مفصل تشریح تو آئندہ صفحات میں آئیگی یہاں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے منقول تفسیر کے مطابق اس آیت میں علماء اور حکام کو رب بنانے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے

① (التوبة: ٣١)

اللہ تعالیٰ کے بجائے علماء کی اطاعت کی، چنانچہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرمودات پر اپنے علماء کے اقوال وآراء کو مقدم کیا اور نتیجۃً وہ مشرک قرار پائے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ صرف رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ صرف وحی کے مطابق بولتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ . إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ﴾ ①

''اور وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے وہ تو صرف وحی (کے مطابق بولتے ہیں) جو ان کی طرف کی جاتی ہے''

لھذا رسول اللہ ﷺ کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، فرمایا:

﴿ مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ﴾ ②

''اور جو رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری کرے گا اس نے درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی''

اگر یہاں یہ سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ایک مقام پر اولوالأمر کی اطاعت کا حکم دیا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ﴾ ③

''اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو، اور اولی الامر کی اطاعت کرو''

أولی الأمر سے کون مراد ہے

اولی الامر سے مراد علماء ہیں، اور ایک قول یہ ہے کہ اولی الامر سے مراد حکام ہیں، اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

''تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اولی الامر کا مصداق علماء بھی ہیں اور حکام بھی''

تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ حکام اور علماء کی اطاعت کا بھی حکم دیا گیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اطاعت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص نہیں ہے؟

اس کا جواب نہایت سہل اور واضح ہے کہ علماء و حکام کی اطاعت ہم پر واجب ہے لیکن اس وقت جب ان کی بات اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے فرمان کے مطابق ہو، چنانچہ جب علماء، اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کا پیغام پہنچائیں اور حکام، اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کا حکم نافذ کریں تو پھر ان کی اطاعت واجب ہوگی، =

① (النجم: ٣،٤) ② (النساء: ٨٠) ③ (النساء: ٥٩)

قَالَ:وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ "يُوْشِكُ أَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ حِجَارَةٌ مِنَ السَّمَاءِ أَقُوْلُ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَتَقُوْلُوْنَ :قَالَ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ".

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''قریب ہے کہ تم پر آسمان سے پتھر برسیں میں کہتا ہوں رسول اللہ ﷺ نے (یوں) فرمایا اور تم (اس کے مقابلے میں) کہتے ہو کہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے (یوں) کہا ہے۔''

=

اور یہ اطاعت بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ ہاں اگر علماء اور حکام کی اطاعت اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کے دائرہ سے خارج ہو اور ان کی اطاعت سے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی نافرمانی لازم آرہی ہو تو پھر ان کی اطاعت ہرگز نہ کی جائے گی۔ اسکی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:" لَاطَاعَةَ فِي الْمَعْصِيَةِ إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ " ①

''اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت ناجائز ہے۔ مخلوق کی اطاعت تو صرف اس وقت ہے جب (کتاب وسنت کے مطابق) نیکی کا حکم دیں''

ایک اور حدیث میں ہے:

"عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ مَالَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ فَإِذَا أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَاسَمْعَ وَلَاطَاعَةَ" ②

''ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ (اپنے حاکم کی) بات سنے اور اسکی پیروی کرے بشرطیکہ وہ کسی نافرمانی کا حکم نہ دے، اور اگر وہ کسی نافرمانی کا حکم دے تو پھر نہ بات سننا ہے اور نہ پیروی کرنی ہے''

لھذا ''سورۃ النساء'' کی اس آیت میں اور سورۂ توبہ کی مذکورہ آیت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

قَوله: وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ "يُوْشِكُ أَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ حِجَارَةٌ مِنَ السَّمَاءِ......

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بات ان لوگوں سے کہی تھی جنہوں نے حج تمتع کے متعلق آپ سے مناظرہ کیا تھا چنانچہ جب سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حج تمتع کی مشروعیت نبی ﷺ سے ثابت فرمائی تو آپ کے مناظر نے کہا: سیدنا ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے اس سے روکا ہے تو اس پر آپ غضبناک ہو گئے اور یہ عظیم الشان قول ارشاد فرمایا۔

=

① صحیح بخاری (٧٢٥٧) صحیح مسلم (الامارة، ١٨٤٠).

② صحیح بخاری، کتاب الاحکام (٧١٤٤) صحیح مسلم، کتاب الامارة (١٨٣٩).

وقال احمد بن حنبل رحمہ اللہ :"عَجِبْتُ لِقَوْمٍ عَرَفُوْا الْاِسْنَادَ وَصِحَّتَهٗ يَذْهَبُوْنَ اِلٰى رَأْيِ سُفْيَانَ، وَاللّٰهُ تَعَالٰى يَقُوْلُ : ﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ أَمْرِهٖ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (النساء:٦٥) أَتَدْرِيْ مَا الْفِتْنَةُ ؟ اَلْفِتْنَةُ الشِّرْكُ لَعَلَّهٗ إِذَا رَدَّ بَعْضَ قَوْلِهٖ أَنْ يَقَعَ فِيْ قَلْبِهٖ شَيْءٌ مِنَ الزَّيْغِ فَيُهْلِكَ ."

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا: "مجھے ان لوگوں پر بڑا تعجب ہے، جو صحیح حدیث کو پہچان لینے کے باوجود (اس کے مقابلے میں) سفیان ثوری رحمہ اللہ (یا کسی اور کے) قول کو قبول کر لیتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انہیں فتنہ کے پہنچنے یا دردناک عذاب کے پہنچنے سے ڈرتے رہنا چاہئے۔"

کیا تم جانتے ہو کہ فتنہ کیا ہے؟ فتنہ شرک ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی حدیث کی مخالفت سے اس کا دل ٹیڑھا ہو جائے اور پھر یہی ٹیڑھ پن اسے تباہ و برباد کر دے۔"

=

یہ قول انکی حرارتِ ایمانی کا آئینہ دار اور جذبۂ اتباعِ رسول ﷺ کا بہترین عکاس ہے، اس قول کا سب سے واضح سبق یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہی قابلِ اتباع ہے چاہے اسکے مقابلے میں کسی کا قول و کردار آ جائے۔

رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے فرمان کو پیش کرنے والے کو صحابی رسول ﷺ نے کتنی زبردست تنبیہ فرمائی؟ حالانکہ ان دونوں کے مقام تک امت کا کوئی فرد نہیں پہنچ سکتا، تو جو لوگ آج رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے مقابلے میں اپنے امام کے قول کو ترجیح دیتے ہیں بلکہ قولِ امام کو اصل اور معیار قرار دیکر قرآنِ کریم اور حدیثِ مصطفیٰ ﷺ کو اس پر پیش کرتے ہیں، چنانچہ قرآن و حدیث کی جو بات قولِ امام کے موافق ہو اسے قبول کر لیتے ہیں اور جو مخالف ہو اس میں تاویل کی کوشش کرتے ہیں یا اسے رد ہی کر دیتے ہیں، ایسے لوگوں کے متعلق سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا کیا رویہ اور کیا موقف ہوتا؟ قابلِ غور ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے: "أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلٰى أَنَّ مَنِ اسْتَبَانَتْ لَهٗ سُنَّةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لَمْ يَكُنْ لَهٗ أَنْ يَدَعَهَا لِقَوْلِ أَحَدٍ"

"تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ جس شخص پر رسول اللہ ﷺ کی سنت واضح ہو جائے تو کسی کے قول کی وجہ سے اس کا سنت کو چھوڑ دینا ناجائز ہے"

وقولہ: وقال احمد بن حنبل رحمہ اللہ: "عَجِبْتُ لِقَوْمٍ عَرَفُوْا الْاِسْنَادَ ...... =

=

امام احمد بن حنبل ؒ کا یہ قول ان کے شاگردوں ''فضل بن زیاد اور ابو طالب'' نے ان سے روایت کیا ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ نے یہ قول اپنی تالیفات میں ذکر فرمایا ہے۔

اس قول کا مفہوم و مصداق یہ ہے کہ وہ لوگ جن تک رسول اللہ ﷺ کی حدیث پہنچ جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے پھر وہ اس کے مقابلے میں اپنے مذہب کے امام کا قول پیش کریں اور حدیث کو چھوڑ دیں، انتہائی قابلِ تعجب ہیں اور ان کی یہ روش قابلِ انکار و رد ہے۔ پھر ایسے لوگ اپنے اس مؤقف پر قائم رہنے کیلئے انتہائی نامعقول عذر اور بے حد کمزور قسم کے بہانے تراشتے ہیں، کسی کا بہانہ یہ ہوتا ہے کہ براہِ راست حدیث سے مسائل لینا اجتہاد ہے اور اجتہاد تو کافی عرصہ کا ختم ہو چکا ہے۔ کسی کا عذر یہ ہوتا ہے کہ جس امام کی تقلید کرتا ہوں وہ مجھ سے بڑا عالم ہے، اسکے پاس بھی تو یہ حدیث پہنچی ہوگی لھذا اس نے اس حدیث کو کسی واضح علم اور حجت کی وجہ سے چھوڑ دیا ہوگا۔ اور اسی قسم کے دیگر کئی عذر ہیں۔

لیکن ایک مؤمن کا فریضہ اور اس کے ایمان کی شان یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی کوئی دلیل اس تک پہنچے اور وہ اس کا معنی بھی جان لے تو وہ فوراً اس پر عمل کرنے لگ جاتا ہے، خواہ اس کے مقابلے میں کسی کا بھی قول آ جائے۔ یہی بات کتاب و سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ ①

''جو کچھ چیز تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے، اس کی پیروی کرو اس کے علاوہ دوسرے رفیقوں کی پیروی نہ کرو تم کم ہی نصیحت قبول کرتے ہو''

کتاب و سنت کا حکم معلوم ہوتے ہی اس کی تعظیم کرنا فرض ہے

اور اس مسئلہ پر اہلِ علم کا اجماع بھی ہے کہ کتاب و سنت کا حکم معلوم ہوتے ہی اس کی تعظیم کرنا فرض ہے اور اسکے مقابلے میں کسی دوسرے کی رائے کو پیش نہیں کرنا چاہیئے، اس اجماع کو صرف جاہل اور جامد قسم کے مقلدین نے توڑا ہے، کیونکہ مقلد عالم نہیں ہوتا جیسا کہ حافظ ابن عبد البر ؒ وغیرہ نے اس پر بھی علماء کا اجماع نقل کیا ہے، لھذا انکا اس اجماع کو توڑنا کوئی نقصان دہ نہیں ہے۔

① الاعراف ۳

ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا سبب اتباعِ رسول ﷺ ہی کو قرار دیا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴾ ①

''اور اگر تم رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو گے تو تم ہدایت پر ہو اور رسول (ﷺ) پر تو صرف صاف صاف (احکامِ خداوندی) کو پہنچانا ہے''

کتنا متضاد نظریہ ہے؟ اللہ تعالیٰ تو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت پر ہدایت کی ضمانت وشہادت دے رہا ہے اور جامد قسم کے مقلدین کا نظریہ یہ ہے کہ رسول ﷺ کی اتباع کرنے والا ہدایت پر نہیں، بلکہ ہدایت پر وہ ہے جو اپنے امام کی پیروی کرے، خواہ اس کی پیروی سے رسول ﷺ کی مخالفت ہی کیوں نہ لازم آرہی ہو۔ اور انتہائی افسوس ناک اور تلخ حقیقت یہ ہے کہ تقلید کے اس جال میں جاہلوں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی پھنسے ہوئے ہیں جو صاحبِ علم ومعرفت ہیں، جن کی حدیث وسنن پر علمی تصانیف ہیں لیکن وہ اس کے باوجود کسی ایک مذہب کی تقلید پر سختی سے قائم ہیں اور اس سے خروج کبیرہ گناہ سمجھتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے قول سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ دلیل پہنچنے سے پہلے کسی بڑے عالم کی بات لے لینا کوئی معیوب نہیں بلکہ عیب کی بات یہ ہے کہ دلیل پہنچنے کے بعد کسی کی رائے کو اس پر فوقیت وترجیح دے دی جائے۔ لیکن اس کا یہ معنی بھی نہیں ہے کہ دلیل جاننے کی کوشش ہی نہ کی جائے، جیسا کہ آج کل دیکھنے میں آتا ہے کہ کتاب وسنت کی تعلیم سرسری اور عبوری نوعیت کی ہے اور وہ بھی تبرک کی نیت سے، تسلیم کی نیت سے نہیں۔ اسکے برعکس ساری توجہ اور عمر کا بیشتر حصہ اپنے فقہی مذہب کی تعلیم وتعلم میں صرف کردیا جاتا ہے، کچھ لوگ تو ''صحیح بخاری'' تبرکا پڑھتے ہیں، جبکہ کچھ لوگ اس نیت سے پڑھتے ہیں کہ کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی، تحصیلِ شریعت کسی کا مطمعِ نظر نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کہیں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے زمرہ میں تو نہیں آتے؟

﴿ وَقَدْ آتَيْنَاكَ مِنْ لَدُنَّا ذِكْرًا. مَنْ أَعْرَضَ عَنْهُ فَإِنَّهُ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وِزْرًا خَالِدِينَ فِيهَا وَسَاءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِمْلًا ﴾ ②

''اور ہم نے تمہیں اپنے پاس سے ذکر (قرآن وحدیث) عطا فرمایا جس نے اس سے اعراض کیا وہ قیامت کے دن بوجھ اٹھائے گا، ایسے لوگ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہیں گے اور یہ بوجھ قیامت کے دن ان کیلئے بُرا ہوگا'' (اعاذنا اللہ من النار وماقرب الیہا من قول وعمل)

① (النور: ٥٤) ② (طٰہٰ: ٩٩تا١٠١)

کتبِ فقہ کے پڑھنے کے جواز اور عدمِ جواز پر بحث

ایک سوال: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذاہب اربعہ کی فقہ کی کتابیں پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: کتبِ فقہ پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ نظریہ یہ ہو کہ ان سے کتاب وسنت کے فہم میں مدد ملے گی اور مسائل کی صحیح تصویر سامنے آئے گی۔ لیکن فقہ کی کتابوں کو قرآن وحدیث پر مقدم کر لینا اور لوگوں کے امور اور خاص طور پر مختلف فیہ مسائل میں کتبِ فقہ کے ذریعے فیصلہ کرنا یا اللہ تعالیٰ اور رسولِ کریم ﷺ کی بجائے کتبِ فقہ سے فیصلے حاصل کرنے کی دعوت دینا بلاشبہ ایمان کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴾ ①

''اے محمد (ﷺ) قسم ہے تمہارے پروردگار کی جب تک یہ لوگ اپنے تنازعات میں تمہیں منصف اور حاکم نہ بنائیں پھر تمہارے فیصلوں سے اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ بخوشی اسے تسلیم کر لیں اس وقت تک یہ لوگ مؤمن نہیں ہو سکتے''

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے سب سے بڑی قسم بیان کر کے یہ دوٹوک فیصلہ صادر فرما دیا کہ اختلافات کے وقت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلے کے بجائے کسی غیر کے فیصلے پر اکتفاء کر لینا، چاہے کوئی عالم ہو یا اسکی لکھی ہوئی کتاب ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے فیصلہ کو سن کر انکار تو بڑی بات ہے صرف دل میں تنگی، زلیغ وحرج محسوس کر لینا ایمان سے محروم کر دیتا ہے۔ اتنی سخت وعید کے باجود مقلدین کی روش بڑی حیران کن ہے، اللہ تعالیٰ صحیح فہم عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

ائمہ اربعہ سے تقلید کی ممانعت

اور پھر عجب تماشہ یہ ہے کہ جن ائمہ کی تقلید کی جاتی ہے ان ائمہ نے بذاتِ خود تقلید سے روکا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

''رسول اللہ ﷺ کی حدیث سر آنکھوں پر، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا فرمان سر آنکھوں پر، لیکن تابعین رحمہم اللہ کی طرف سے کوئی چیز آئی (تو وہ قابلِ تحقیق ہے) کیونکہ ہم بھی رجال ہیں اور وہ بھی رجال ہیں۔''

''روضة العلماء'' میں ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ آپ کوئی بات ارشاد فرمائیں اور

① (النساء: ٦٥)

قرآنِ کریم کی آیت اسکے مخالف ہو تو ہم کیا کریں؟ فرمایا: کتاب اللہ کے مقابلے میں میری بات چھوڑ دو۔ پوچھا گیا: اگر آپ کی بات رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے مخالف ہو تو؟ فرمایا: رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے سامنے میری بات چھوڑ دو۔ پوچھا گیا: آپ کے قول کے خلاف اگر صحابہ ؓ کا قول ہو؟ فرمایا: صحابہ ؓ کے قول کی وجہ سے میری بات چھوڑ دو۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے اس فرمان میں کتنی عمدگی کے ساتھ یہ اعتراف فرمایا ہے کہ انکا قول بتقاضۂ بشریت یا بوجہ عدمِ علم، قرآنِ کریم، حدیثِ رسول ﷺ یا تعاملِ صحابہ ؓ کے خلاف ہو سکتا ہے۔
یہاں میں خاص طور پر ان مقلدین کو دعوتِ فکر دونگا جو امام صاحب سے کسی بھی قسم کی غلطی کے امکان کی نفی کرتے ہیں، کیونکہ اس طرح انہوں نے امام صاحب کو مقامِ معصومیت پر لا کھڑا کیا جو صرف نبوت کا خاصہ ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس کلام میں فرمایا: ﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ . اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ﴾ ①

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا:
''میرے کسی بھی قول کے برخلاف نبی پاک ﷺ کی حدیث آجائے تو نبی ﷺ کی حدیث ہی قابلِ قبول اور قابلِ عمل ہے، لہذا میری تقلید نہ کرنا۔''
نیز فرمایا: ''میری کسی کتاب میں کوئی چیز خلافِ سنت پاؤ تو میری بات چھوڑ دینا اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کو اختیار کر لینا۔''
ان کا یہ قول بھی تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ: ''جب صحیح حدیث (میرے قول کے خلاف) ہو تو میرے قول کو دیوار پر دے مارنا۔''

امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:
''رسول اللہ ﷺ کے سوا ہر شخص کی باتوں میں غلطی کا امکان موجود ہے۔''
امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے اقوال تو اس باب میں بے شمار ہیں۔ قولِ زیرِ بحث انہی کا ہے لھذا اس پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

مقصدِ بیان یہ ہے کہ ان اقوال میں أئمہ کرام رحمہم اللہ نے اپنے اقوال کے ساتھ ساتھ کتاب وسنت کے مطالعہ کی دعوت دی ہے تا کہ کسی قسم کی خطا کا کوئی امکان باقی نہ رہے، لیکن مقلدین کی روش کتنی افسوس ناک ہے کہ انہوں نے صرف اپنے اپنے مذہب کی کتابوں پر تکیہ کر لیا اور ان کی ہر بات قبول کر لی خواہ وہ درست ہو یا غلط۔ حالانکہ أئمہ کی طرف منسوب بہت سے اقوال ایسے ہیں جو ان سے ثابت ہی نہیں۔

① (النجم: ۳،٤)

ہماری اس گفتگو سے ائمہ کرام کی کسی قسم کی توہین یا تنقیصِ شان کا کوئی پہلو نہیں نکلتا، وہ ان شاء اللہ ہدایت پر ہیں وہ ایمان بالرسول ﷺ اور اتباعِ رسول ﷺ کے فریضہ سے بطریقِ احسن عہدہ براء ہوئے، ان کی خدمات قابلِ قدر ہیں لیکن بہرحال وہ معصوم تو نہیں ہیں، معصوم تو صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے جن کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى . اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾ ①

''اور وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے وہ تو صرف وحی (کے مطابق بولتے ہیں) جو ان کی طرف کی جاتی ہے''

قابلِ غور بات صرف یہی ہے کہ جن لوگوں نے ذاتِ معصوم اور ناطقِ وحی ﷺ کی اتباع چھوڑ کر کسی غیر معصوم اور امتی کی تقلید اختیار کر لی ان کے پاس قیامت کے دن کیا عذر ہوگا؟ اور کیا وہ اپنی اس روش کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی توہین اور تنقیصِ شان کے مرتکب نہیں ہوئے؟

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے اس زیرِ بحث قول سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کو ٹھکرانے سے دلوں میں کجی اور ٹیڑھ پن آجاتا ہے اور یہی ٹیڑھ پن انسان کی دنیوی اور اخروی ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی اور سوءِ ادب تمام تر اعمال کی بربادی کا باعث بن جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴾ ②

''اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی ﷺ کی آواز سے اوپر نہ کرو اور نہ اس سے اونچی آواز سے بات کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں (ایسا نہ ہو کہ) تمہارے اعمال اکارت جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو''

آپ ﷺ کے ساتھ تو ''سوءِ ادب'' نیکیوں کو برباد کر دیتا ہے اور آپ ﷺ کے فرمان کے مقابلے میں آپ ﷺ ہی کے کسی امتی کے قول کو مقدم کرنا جو سب سے بڑی گستاخی ہے کس قدر تباہ کن ہوگا؟ اس سے بڑی بے ادبی اور گستاخی اور کیا ہو سکتی ہے بلکہ یہ تو سوءِ ادب سے بھی بڑی ضلالت ہے۔ اور آیتِ کریمہ: ﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ ③ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ آپ کے فرمان کی مخالفت ''کفر و شرک'' میں ملوث ہونے اور ''عذابِ الیم'' میں گرفتار ہونے کا پیش خیمہ ہے۔ (اعاذنا الله من مخالفة امره ﷺ وجعلنا ممن يهتدون بهديه ويتمسكون بسنته ويعضون عليها بالنواجذ)

① (النجم: ٣،٤) ② (الحجرات: ٢) ③ (النساء: ٦٥)

قَالَ: عَنْ عَدِیِّ بْنِ حَاتِمٍ أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِیَّ ﷺ یَقْرَأُ هٰذِهِ الْآیَةَ: ﴿ اِتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللهِ ﴾ (التوبة:٣١) فَقُلْتُ لَهُ إِنَّا لَسْنَا نَعْبُدُهُمْ قَالَ: أَلَیْسَ یُحَرِّمُوْنَ مَا أَحَلَّ اللهُ فَتُحَرِّمُوْنَهُ، وَیُحِلُّوْنَ مَا حَرَّمَ اللهُ فَتَحِلُّوْنَهُ۔ فَقُلْتُ بَلٰی قَالَ: فَتِلْكَ عِبَادَتُهُمْ ۔ (رواه أحمد والترمذی وحسنه) ①

سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے رسول ﷺ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا:

''انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ اور مسیح ابن مریم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے سوا رب بنالیا حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ الٰہ واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اسکے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے''

سیدنا عدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے یہ آیت سن کر عرض کیا: ہم تو انکی عبادت نہیں کرتے تھے؟ تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''کیا ایسا نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ اشیاء کو وہ حرام کردیتے ہیں اور تم بھی انہیں حرام سمجھتے ہو اور اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ اشیاء کو وہ حلال کردیتے ہیں تو تم بھی انہیں حلال سمجھنے لگتے ہو۔''

سیدنا عدی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا جی ہاں! یہ تو ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہی تو ان کی عبادت ہے۔''

آیت ﴿ اِتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ..... ﴾ پر علمی مکالمہ

اس حدیث میں رسول اکرم ﷺ نے یہ صراحت فرمادی ہے کہ سورۂ توبہ کی آیتِ مبارکہ میں علماء و مشائخ کی جس عبادت کا ذکر ہے وہ درحقیقت ان کی اطاعت ہے، چنانچہ یہود و نصاریٰ نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی مخالفت کی اور اسکے مقابلہ میں علماء اور مشائخ کے اقوال کو قبول کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فعل کو ان کی عبادت سے تعبیر فرمایا، اور ظاہر ہے غیر اللہ کی عبادت شرک ہے، یہی نکتہ حافظ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے واضح فرمایا ہے کہ ایک شخص کو معلوم ہو جائے کہ میرے عالم کا بیان کردہ مسئلہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے خلاف ہے پھر وہ اس قول کو قبول کرلے اور نبی ﷺ کے فرمان سے روگردانی کرے تو ایسا شخص مبتلائے شرک ہوگیا۔ ②

حالانکہ علماءِ امت کا اجماعی فیصلہ ہے کہ ایک شخص کے پاس حق پہنچ جائے تو اس کے برخلاف کسی کی تقلید کرنا

---

① سنن الترمذی (٣٠٩٥) ابن جریر الطبری (١٦٦٣٦ عن حذیفة رضی اللہ عنہ موقوفًا)

② افسوس کہ آج کی تقلید میں بوجہ تعصب مذہبی یہ مرض بدرجہ اتم موجود ہے۔

ناجائز ہے، علماء کے اس اجماع کو سامنے رکھتے ہوئے سوچنا چاہیئے کہ کیا کتاب وسنت حق نہیں ہیں؟ اور کیا کتاب وسنت اپنی اصل صورت میں تمام لوگوں کے پاس نہیں پہنچے؟ دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں ہے، قرآنِ کریم اور حدیث ہی کیلئے علی الاطلاق صداقت وحقانیت ہے اور قرآن وحدیث تمام لوگوں کے پاس ان کی زبان میں جمع شدہ پہنچ چکا ہے، حجت قائم ہو چکی ہے، اس کے باوجود قرآن وحدیث کو چھوڑ کر اپنی مرضی کی راہ کا انتخاب کر لینا انتہائی قابلِ افسوس اور قابلِ ملامت ہے اور آج انتشار اور افتراق کی اصل جڑ یہی ہے جبکہ وحدتِ امت اور اتحاد بین المسلمین کی ضمانت قرآن وحدیث پر مجتمع ہو جانے میں ہے۔

﴿ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا ﴾ ①

''اور اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے رہو اور آپس میں اختلاف مت کرو''

﴿ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ﴾ ②

''پھر اگر کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف لوٹاؤ''



① (الانفال:٤٦) ② (النساء:٥٩)

اس باب کے مسائل

(۱) ''سورۂ نور'' کی آیت ﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ...الآية ﴾ کی تفسیر۔

(۲) ''سورۂ التوبہ'' کی آیت ﴿ اِتَّخَذُوٓا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ ....الآية ﴾ کی تفسیر۔

(۳) ''سورۂ التوبہ'' کی مذکورہ آیت میں عبادت کے صحیح مفہوم ومطلب کی حدیث کی روشنی میں وضاحت۔ یہ مفہوم سیدنا عدی رضی اللہ عنہ نہیں سمجھ سکے تھے، رسول اللہ ﷺ کے سمجھانے سے سمجھے تھے۔

(۴) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بطورِ مثال ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے نام پیش کرنا، اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا بطورِ مثال سفیان ثوری رحمہ اللہ کا نام پیش کرنا۔ (خوب قابلِ غور ہے)

(۵) حالات میں کس حد تک انقلاب آچکا ہے کہ مشائخ کی عبادت بیشتر لوگوں کا محبوب مشغلہ بن چکا ہے اور اسے ولایت کا نام دیتے ہیں، اور جبکہ علماء کی عبادت (یعنی کہ ان کی اتباع) کو علم وفقہ کا نام دیا جاتا ہے اور اب تو حالات اس درجہ بدل چکے ہیں کہ بدکاروں اور بدمعاشوں کو پیر سمجھ کر ان کی عبادت کی جارہی ہے، اور جاہلوں کی بھی بصورتِ اطاعت وتقلید عبادت کی جارہی ہے۔



باب
طواغیت کی عدالت سے فیصلہ کرانے کا حکم

قولہ تعالیٰ: ﴿ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا. وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا. فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ﴾ ①

''کیا آپ ﷺ نے انہیں نہیں دیکھا؟ جن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ جو کچھ آپ ﷺ پر اور جو کچھ آپ ﷺ سے پہلے اتارا گیا ہے اس پر ان کا ایمان ہے، لیکن وہ اپنے فیصلے غیر اللہ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ شیطان کا انکار کریں، شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ انہیں بہکا کر دور ڈال دے۔ ان سے جب بھی کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کلام اور رسول ﷺ کی طرف آؤ تو آپ ﷺ دیکھ لینگے کہ یہ منافق آپ ﷺ سے منہ پھیر کر رک جاتے ہیں۔ پھر کیا بات ہے کہ جب ان پر ان کے کرتوت کے باعث کوئی مصیبت آ پڑتی ہے تو پھر یہ آپ ﷺ کے پاس آ کر اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمارا ارادہ تو صرف بھلائی اور میل ملاپ ہی کا تھا''

شرعی دلائل کی روشنی میں یہ امر طے شدہ ہے کہ "لاالٰہ الا اللہ" کا اقرار ایمان بالرسول اور اتباعِ رسول کو بھی مستلزم ہے، گویا عقیدہ توحید کی تکمیل شہادتین (دو گواہیوں) سے ہوتی ہے۔

اوّل: اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت۔

دوم: رسول اکرم ﷺ کی رسالت کی شہادت۔

یہی وجہ ہے کہ جس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی پانچ بنیادوں کا ذکر فرمایا اس میں پہلی بنیاد کے تذکرہ میں ان دونوں شہادتوں کو ایک ہی رکن کے طور پر پیش فرمایا، جس کی وجہ واضح ہے کہ عقیدہ توحید کی تکمیل وتوثیق کیلئے دونوں گواھیاں ایک دوسرے کو لازم وملزوم ہیں، اسی حقیقت کو یہاں انتہائی ٹھوس دلائل کے ساتھ مؤلف رحمہ اللہ نے واضح فرمایا ہے، کہ اختلافی امور میں صرف رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارک کو منصف

① (النساء: ٦٠تا٦٢)

اور حاکم تسلیم کرنا عقیدۂ توحید کا جزوِ لاینفک اور ایک انتہائی لازمی حصہ ہے اور اس تحکیم کے بغیر "لاالٰـــہ الا اللّٰہ" کی گواہی کا تقاضہ پورا نہیں ہوسکتا، کیونکہ "لاالٰـــہ الا اللّٰہ" کا اقرار کرنے والا اور اس حکم کے مفہوم کو سمجھنے والا بخوبی جانتا ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کی اتباع مجھ پر فرض ہے، اور اللہ تعالیٰ کے تمام احکام ہم تک کس ذریعہ سے پہنچے؟ ظاہر ہے جنابِ رسول اللہ ﷺ ہی واحد ذات ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام احکام واوامر ہم تک پہنچائے، لھذا رسول اللہ ﷺ کی پیروی ضروری ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی پیروی حاصل ہو اور تاکہ اللہ تعالیٰ کی پیروی کے ذریعے "لاالٰـــہ الا اللّٰہ" کی شہادت کا تقاضہ اور ذمہ داری پوری ہو جائے، اب جو شخص "لاالٰہ الا اللّٰہ" کی شہادت دینے کا دعویٰ کرے لیکن اختلافی امور میں رسول اللہ ﷺ کی بجائے کسی دوسرے کے فیصلے کو تسلیم کرے، وہ اپنی اس شہادت میں جھوٹا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی ذات ہی منصبِ رسالت پر فائز ہے، آپ ہی اللہ تعالیٰ کے مبلغ وداعی ہیں، اور اختلافی امور میں آپ ﷺ ہی منصف اور فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں، لھذا ضروری ہے کہ آپ ﷺ کی ہی پیروی کی جائے اور اختلاف کے وقت آپ ہی کی طرف رجوع کیا جائے اور منافقین کی روش قطعاً اختیار نہ کی جائے، جو زبان سے تو آپ ﷺ پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے تھے لیکن تنازعات کا فیصلہ کسی دوسرے سے کرانے چل نکلتے تھے، ہمیں اپنی سعادتِ دنیوی واخروی کی اس راہ کو خوب سمجھنا چاہیئے، جو کمالِ توحید یعنی "لا الٰـہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ" کے اقرار واعتراف ہی میں مضمر ہے، اور یہ اقرار واعتراف اتباع کے بغیر ادھورا ہی رہ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴾ ①

''کیا آپ ﷺ نے انہیں نہیں دیکھا؟ جن کا دعویٰ تو یہ ہے جو کچھ آپ پر اور جو کچھ آپ سے پہلے اتارا گیا ہے اس پر ان کا ایمان ہے، لیکن وہ اپنے فیصلے غیر اللہ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ شیطان کا انکار کریں، شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ انہیں بہکا کر دور ڈال دے۔''

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی سخت مذمت اور مخالفت فرمائی ہے جو آسمانی وحی پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنے کے باوجود اپنے اختلافات کا فیصلہ قرآن وحدیث سے نہیں کراتے بلکہ طاغوت سے کراتے ہیں۔

① (النساء: ٦٠)

....

....

....

....

....

طاغوت کا معنی

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ ''طاغوت'' کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''طاغوت'' طغیان سے بنا ہے جس کا معنی ہے حد سے تجاوز کرنا، لھذا کسی شئی کو اس کی مقرر کردہ حد سے بڑھا دینا اسے طاغوت بنا دینا ہے۔''

چنانچہ اختلافی امور میں کتاب وسنت کی بجائے کسی دوسری شئی کو منصف اور حاکم سمجھنا اسے طاغوت بنا دینے کے مترادف ہے کیونکہ منصف تو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی ذات ہے، ﴿ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ﴾ کسی غیر کو منصف مان کر اس کی طرف رجوع کرنا اسے اس کی متعین حد سے بڑھا دینا ہے اور یہی طاغوت ہے۔

کوئی شخص اگر اللہ تعالیٰ کے بجائے کسی غیر کی عبادت کرے تو کیا اس نے طاغوت کی عبادت نہیں کی؟ یقیناً اس نے طاغوت کی عبادت کی ہے کیونکہ اس نے اس غیر کی عبادت کر کے اسے وہ مقام دیا ہے جسکا وہ قطعاً اہل نہ تھا، کہ عبادت تو صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اسی طرح کتاب وسنت کی تحکیم کی طرف بلانے کی بجائے کسی دوسرے سے فیصلہ کرانے کی دعوت دینے والا طاغوت کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ اور خود غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ''یزعمون'' (وہ ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں) لفظ استعمال کر کے کس عمدگی سے ان کے اس دعوئ ایمان کو باطل فرمایا اور یہ واضح کر دیا کہ اگر یہ اپنے دعوئ ایمان میں سچے ہوتے تو کتاب وسنت کو چھوڑ کر دوسروں کے فیصلوں کو قبول کرنے کی دعوت نہ دیتے۔

پھر اس آیت میں یہ نکتہ بھی موجود ہے کہ اس وقت تک ایمان درست نہیں ہوسکتا جب تک طاغوت کے حاکم ومنصف ہونے کے اعتقاد کو اپنے دل سے کلیۃً ختم نہ کر دے۔ نیز یہ بھی واضح ہوگیا کہ کتاب وسنت کو حاکم ومنصف تسلیم کرنے کے باوجود کسی دوسرے کے حاکم ہونے کو تسلیم کرنا اور ان سے عملاً فیصلے کرانا شیطان کی پیروی کرنا ہے۔ (اِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا)

قوله تعالیٰ: ﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا ۔ فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ﴾ ①

''ان سے جب بھی کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ کلام اور رسول (ﷺ) کی طرف آؤ۔ تو آپ (ﷺ) دیکھ لینگے کہ یہ منافق آپ (ﷺ) سے منہ پھیر کر رک جاتے ہیں۔ پھر کیا ہے کہ جب ان پر ان کے کرتوت کے باعث کوئی مصیبت آ پڑتی ہے تو پھر یہ آپ کے پاس آ کر اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمارا ارادہ تو صرف بھلائی اور میل ملاپ ہی کا تھا''

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اس آیت کی روشنی میں جو شخص (اختلافی امور) میں قرآن وحدیث سے فیصلہ کرانے کو قبول نہیں کرتا بلکہ ان کی تحکیم کا انکار کرتا ہے تو وہ منافقین میں سے ہے۔''

اور یہ حکم تو اس شخص کا ہے جو خود کتاب وسنت کی تحکیم کو قبول نہیں کرتا لیکن اس شخص پر کیا حکم لگایا جائے گا جو نہ صرف یہ کہ خود قبول نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو بھی قبول کرنے سے روکتا ہے، عملاً بھی اور تقاریر وتصانیف کے ذریعے بھی اور پھر اپنے اس مشن کو احسان وتوفیق شمار کرتا ہے، اور افسوس یہ ہے کہ ہمارے آج کے دور میں بہت سے مدعیانِ علم وایمان اس روش میں گرفتار ہیں اور اگر انہیں کتاب وسنت کی دعوت دی جائے تو اول تو سنتے ہی نہیں اور اگر سن لیں تو یہ عذر تراشتے ہیں کہ کتاب وسنت کا فہم وادراک ہماری عقلوں سے بالاتر ہے۔ (لاحول ولاقوۃ الا باللہ)

ان آیات میں ایک اور نکتہ قابلِ غور ہے جس سے ہمارے معاشرے کی تصویر کھل کر سامنے آ جائے گی، منافقین اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے بجائے کسی دوسرے سے فیصلہ کرانے جاتے اور پھر ان کی شامتِ اعمال انہیں کسی مصیبت میں پھنسا دیتی تو پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے اور آ کر کہتے کہ ہم کسی دوسرے کے پاس کسی بُرے ارادے کے تحت فیصلہ کرانے نہیں گئے تھے بلکہ اچھے ارادے سے گئے تھے اور وہ یہ کہ آپ ﷺ کے اور اس طاغوت کے فیصلہ کے درمیان موافقت ومطابقت پیدا کرنا مقصود تھا۔

آج کل بعض تحریف وتاویل کرنے والوں کی حالت بھی یہی ہے، وہ منطق وفلسفہ اور علمِ کلام پڑھتے ہیں پھر ان کے قواعد کو ''قواطعِ عقلیہ'' کا نام دیتے ہیں، پھر شرعی دلائل اور اپنے قواطعِ عقلیہ کے درمیان تطبیق وموافقت پیدا کرنے میں عمریں صرف کر دیتے ہیں اور اکثر وبیشتر یہی ہوتا ہے کہ اپنے قواطعِ عقلیہ یعنی منطق

① (النساء: ٦١)

وفلسفہ کی روشنی میں کتاب وسنت میں ایسی بعید قسم کی تاویلیں گھڑیں گے کہ جن سے آیت یا حدیث کا انکار لازم آتا ہے یا کم از کم ان کی حقیقی روح ہی مسخ ہوکر رہ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے لوگوں سے بچنے کی نصیحت فرمائی، چنانچہ اگلی آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴾ ①

''ان لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے اور تم ان کی باتوں کا کچھ خیال نہ کرو، اور انہیں نصیحت کرو اور ان سے ایسی باتیں کہو جو ان کے دلوں میں اثر کر جائیں''

کتاب وسنت کی حاکمیت کا انکار کرنے والوں کی بابت تین نصیحتیں

اس آیت میں کتاب وسنت کی تحکیم (حاکمیت) کو قبول کرنے سے انکار کرنے والوں کی بابت اللہ تعالیٰ نے ہمیں تین نصیحتیں فرمائی ہیں:

(۱) ان سے اعراض کیا جائے، اور اس سے مراد یہ ہے کہ محض انہیں حقیر وذلیل کرنے کی خاطر اعراض کیا جائے یہ مراد نہیں کہ انہیں چھوڑ دیا جائے۔

(۲) انہیں نصیحت کی جائے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی، غصے اور عذاب سے ڈرایا جائے۔

(۳) ان سے ایسی بات کی جائے جس کا اثر ان کے دلوں تک پہنچے، ایسی نرم بات نہ ہو کہ جس کا وہ اثر ہی قبول نہ کریں، بلکہ قولِ بلیغ ہو، اور قولِ بلیغ میں بھی تین چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے:

(۱) عظیم الشان الفاظ ہوں۔ (۲) عظیم الشان معنی ہو۔ (۳) اسے پیش کرنے والے کا انداز انتہائی خوب صورت اور مؤثر ہو۔

اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیجنے کی غرض وغایت بیان فرمائی:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ﴾ ②

''اور ہم نے جو پیغمبر بھیجا ہے اس لیئے بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق اسکا حکم مانا جائے''

تو گویا منصبِ رسالت یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اپنی امتوں کے مطاع ہوتے ہیں، انکی اطاعت کرنا امت کیلئے فرض ہوتا ہے نہ کہ کسی غیر کی، اور رسول اللہ ﷺ بھی ان انبیاء میں سے ایک نبی ہیں لھذا ان کی اطاعت بھی فرض ہے، اور ان کی اطاعت سے خروج کر کے کسی غیر کی اطاعت کرنا ناجائز ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام، یا ان کی

① (النساء: ٦٣) ② (النساء: ٦٤)

تعلیم کے ہوتے ہوئے اگر کسی دوسرے کی اطاعت کی جائے یا کسی دوسرے سے اختلاف کا حل طلب کیا جائے تو انبیاء کی بعثت کا کوئی فائدہ نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کی اطاعت سے خروج کر کے خواہشاتِ نفس کی اتباع کو ظلم سے تعبیر فرمایا ہے اور ایسا ظلم کسی سے سرزد ہو جائے اور وہ اسکے احساس ہو جانے پر اسکا ازالہ کرنا چاہے تو اس کا طریقہ بھی اللہ تعالیٰ نے اگلی آیات میں واضح فرما دیا ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوْا اللهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوْا اللهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴾ ①

''اور یہ لوگ جب اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھتے تھے اگر تمہارے پاس آتے اور اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے اور رسول ﷺ بھی ان کیلئے بخشش طلب کرتے تو یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے''

گویا اس ظلم کے ازالے کیلئے دو طریقے بیان فرمائے گئے ہیں:

(۱) وہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اس گناہ پر معافی طلب کریں۔

(۲) رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر اپنے ظلم کا اعتراف کریں اور جذبۂ انقیاد و اطاعت کا یقین دلائیں تو رسول اللہ ﷺ ان کیلئے بخشش طلب کریں۔ (ظاہر ہے یہ دوسرا طریقہ نبی ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں ممکن تھا)

آیت ﴿ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوْكَ..... ﴾ سے غلط استدلال اور اس کا رد

لیکن بعض لوگ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد ان کی قبر پر بغرضِ استغفار جانا چاہیے، لیکن اس آیت سے یہ استدلال قطعاً غلط اور واضح البطلان ہے؛ کیونکہ آیتِ کریمہ میں تو نبی ﷺ کے پاس جانے کا ذکر ہے نہ کہ ان کی قبر پر، پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو کتاب وسنت کے سب سے بڑے عالم تھے وہ اس نکتہ کو کیوں نہ سمجھ سکے؟ چنانچہ کسی صحابی سے بغرضِ استشفاع نبی ﷺ کی قبر پر جانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اور عتبی کی روایت جو ایک مجہول بدوی سے منقول ہے وہ بے سند اور بے اصل ہے اسے بطور دلیل پیش کرنا اپنی جہالت کا ثبوت مہیا کرنا ہے۔

مدارِ نجات قرآن وحدیث کی روشنی میں

آیئے! آپ کو قرآن کی روشنی میں بتائیں کہ مدارِ نجات کیا ہے؟ دنیا وآخرت کی سعادت کا حصول کیسے ممکن ہے؟ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

① (النساء: ٦٤)

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۔ وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ أَوِ اخْرُجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِّنْهُمْ وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيتًا ۔ وَإِذًا لَّآتَيْنَاهُمْ مِّنْ لَّدُنَّا أَجْرًا عَظِيمًا ۔ وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۔ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيقًا ﴾ (1)

''اے محمد ﷺ قسم ہے تمہارے پروردگار کی جب تک یہ لوگ اپنے تنازعات میں تمہیں منصف اور حاکم نہ بنائیں پھر تمہارے فیصلوں سے اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ بخوشی اسے تسلیم کرلیں اس وقت تک یہ لوگ مؤمن نہیں ہوسکتے۔ اور اگر ہم انہیں حکم دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کرڈالو یا اپنے گھر چھوڑ کر نکل جاؤ تو ان میں سے بہت تھوڑے ہی ایسا کرتے۔ اور اگر یہ اس نصیحت پر کاربند ہوتے جو انہیں کی جاتی ہے تو ان کے حق میں بہتر اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا اور ہم انہیں اپنی طرف سے اجرِ عظیم بھی عطاء کرتے اور سیدھا راستہ بھی دکھاتے۔ اور جو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں وہ (قیامت کے دن) ان لوگوں کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ تعالیٰ نے بڑا فضل کیا ہے یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور نیک لوگ، اور ان لوگوں کی رفاقت بہت ہی خوب ہے''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے سب سے بڑی قسم یعنی اپنی ذات کی قسم بیان کرکے ان لوگوں کے ایمان کی نفی فرمادی جو اختلافی اموراور نزاعی مسائل میں رسول اللہ ﷺ کو حاکم تو مانتے ہیں لیکن آپ ﷺ کے فیصلے کو سن کر دل میں کچھ تنگی، ضیق اور حرج محسوس کرتے ہیں۔ جبکہ صحیح اور کامل مؤمن کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ شرحِ صدر اور اعلیٰ درجہ کی رضا وقبول کا مظاہرہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے ہر فیصلہ اور ہر حکم کو بلا چون وچرا اس قبول کرلے، نہ یہ دیکھے کہ اس حکم کے مقابلے میں میری خواہش کیا ہے؟ اور نہ ہی یہ دیکھے کہ اس کے مقابلے میں میرے بڑے یا میرے عالم یا میرے امام کی خواہش کیا ہے؟ اگر یہ صادق جذبہ اور حقیقی طلب پیدا ہوجائے اور ہر اس نصیحت پر کاربند ہوجائے جو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف سے عطاء ہوتی ہے خواہ اس کا تعلق امتثالِ خیرات سے ہو یا ترکِ منکرات سے، تو اللہ تعالیٰ نے لامتناہی اور لازوال بشارتوں اور نعمتوں سے ایسے خوش نصیب انسان کا دامن بھر دیا ہے۔ چنانچہ ان آیات میں جن نعمتوں کا ذکر ہے ان کی فہرست کچھ یوں ہے:

(۱) دنیا وآخرت کی ہر بھلائی۔

(۲) حق پر پختگی، عزیمت اور دشمن کے مقابلے میں ثابت قدمی۔

(1) (النساء: ٦٥تا٦٩)

(۳) صرف اجر نہیں بلکہ بہت بڑے اجر کا وعدہ۔

(۴) سیدھے راستے کی ضمانت۔

(۵) قیامت کے دن ان برگزیدہ ہستیوں کی رفاقت اور معیت کے حصول کی سعادت جنہیں اللہ تعالیٰ نے عظیم الشان انعامات سے نواز دیا، وہ برگزیدہ ہستیاں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی ہیں۔

سبحان اللہ! یہ کتنی بہترین رفاقت ہے۔ بھلا اس رفاقت کے بغیر کامیابی کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا یہ رفاقت رسول اللہ ﷺ کی اطاعت، آپ ﷺ کی احادیث اور سنن کی معرفت کے بغیر ممکن ہو سکتی ہے؟ ان تمام سوالات پر باخلاصِ قلب غور کر لیا جائے تو نتیجہ خود بخود واضح ہو جائے گا۔

آیت ﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى .... ﴾ کا شانِ نزول

غور و خوض کرتے ہوئے اس آیتِ کریمہ کے شانِ نزول کو بھی مدِ نظر رکھا جائے تاکہ حقیقت پوری طرح کھل جائے، چنانچہ امام المحدثین امام بخاری رحمہ اللہ اپنی صحیح میں روایت لائے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک انصاری صحابی نے زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے پانی کی ایک نالی کے تعلق سے جھگڑا کیا، نکتۂ اختلاف صرف یہ تھا کہ پانی کی یہ نالی پہلے کس کے باغ کو سیراب کرے، انصاری کا موقف یہ تھا کہ پہلے میرے باغ کو پانی پہنچنا چاہیے جبکہ زبیر رضی اللہ عنہ اس بات پر مصر تھے کہ پہلے میرا باغ سیراب ہوگا۔ نبی ﷺ کی خدمت میں فیصلہ پہنچا تو آپ ﷺ نے جائے وقوع کا معائنہ فرما کر یہ فیصلہ صادر فرمایا: ''اے زبیر رضی اللہ عنہ! پہلے تم اپنے باغ کو پانی دو پھر اپنے پڑوسی کے باغ کی طرف تمام پانی چھوڑ دو'' اس فیصلہ کو سن کر اس انصاری کے رویہ سے کچھ ضیق اور تنگی محسوس کرنے کے آثار ظاہر ہوئے بلکہ اس نے یہ بھی کہہ ڈالا کہ زبیر تو آپ ﷺ کی پھوپھی کا بیٹا ہے، جس پر آیتِ کریمہ: ﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ....الآية ﴾ نازل ہوئی۔

تو مقامِ غور ہے کہ محض پانی کی ایک نالی کے حوالے سے نبی ﷺ کے فیصلے سے راضی نہ ہونے والے شخص کے ایمان کی نفی کر دی گئی تو ان لوگوں کے ایمان کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے گی جو اصول و فروعِ دین میں آپ ﷺ کے احکام اور فیصلوں سے راضی نہیں ہوتے، بلکہ اگر انہیں ان فیصلوں کو قبول کرنے کی دعوت دی جائے تو اعراض کرتے ہیں، بلکہ اپنی تحریروں اور تقریروں سے دوسرے لوگوں کو بھی روکنے کی کوشش کرتے ہیں، بلکہ خالص اتباع کرنے والوں اور نبی ﷺ کے ہر فیصلے کو قبول کرنے والوں پر گمراہ ہونے اور بعض اوقات مبتلائے کفر ہونے تک کے فتوے صادر کر جاتے ہیں۔ (واللہ المستعان)

قال :قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ ①

''اور زمین میں اصلاح کے بعد خرابی نہ کرنا، اور اللہ تعالیٰ سے خوف کرتے ہوئے اور امید رکھ کر دعائیں مانگتے رہنا بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت نیکی کرنے والوں سے قریب ہے''

قال :وقولہ :﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴾ ②

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ ڈالو تو کہتے ہیں کہ ہم اصلاح کرنے والے ہیں۔''

آیت ﴿ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا..... ﴾ کی تفسیر

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جب کہ زمین میں اصلاح ہو چکی لھذا اصلاح کے بعد تم فساد برپا نہ کرنا۔ اس کا مطلب واضح کرتے ہوئے حافظ ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کی بعثت کے ذریعے زمین میں اصلاح فرمائی۔ لھذا آپ کی پیروی ہی اصلاح کا راستہ ہے جبکہ آپ کے حکم کی خلاف ورزی فساد کا راستہ ہے اور ایسا شخص مفسد کہلائے گا۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے بھی اکثر مفسرین سے اسی قسم کی تفسیر نقل فرمائی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل علیہم السلام کو مبعوث فرمایا اور انہیں ذاتِ حق کی عبادت و اطاعت کی طرف دعوت دینے کا فریضہ تفویض فرمایا اور اس کو زمین و اہلِ زمین کی اصلاح کا مدار و محور قرار دیا، چنانچہ کسی قطعۂ ارض پر اگر اصلاح و خیر کا مادہ موجود ہے تو اس کا سبب صرف یہ ہوگا کہ وہاں کے رہنے والے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں بہت مخلص ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے خروج و بغاوت، ہر فتنہ، فساد، مصیبت، قحط اور غلبۂ اعداء کو جنم دیتا ہے۔

وقولہ :قولہ تعالیٰ : وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ....

آیتِ کریمہ میں منافقین کو جس فساد سے باز رہنے کو کہا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی نافرمانی کا فساد تھا۔ تو گویا اس آیت سے بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی نافرمانی موجب فساد ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت ہر قسم کی اصلاح اور درستگی کی ضامن ہے۔

=

① (الاعراف:٥٦)   ② (البقرۃ:١١)

قال:وقوله تعالیٰ: ﴿ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوْقِنُونَ ﴾ ①

''کیا یہ زمانہ جاہلیت کے حکم کے خواہش مند ہیں اور جو یقین رکھتے ہیں ان کیلئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اچھا حکم کس کا ہوسکتا ہے''

=

آیتِ کریمہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ منافقین نے اللہ تعالیٰ کے فرمان کو قبول کرنے کے مقابلے میں اپنے اقدام کو اصلاح سے تعبیر کیا۔ (یعنی ہم جو کررہے ہیں وہی درست ہے) اور ان کی یہی سوچ ان کی گمراہی کا پروانہ ثابت ہوئی، تو پھر کیوں نہ اپنی ہر سوچ کو اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مقابلہ میں کالعدم قرار دیا جائے۔ کتنا قابلِ ملامت ہے ان لوگوں کا کردار جو اپنے خلافِ شریعت اقدام کو اصلاح قرار دیتے ہیں نیز مصلحت کا عذر تلاش کرنا جائز، بلکہ مستحسن سمجھتے ہیں۔ (اعاذنا اللہ من اتباع آراءِ الرجال واھواء انفسنا ووفقنا لمافیه حبه ورضاه)

وقوله:قوله تعالیٰ: أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ ....

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر ان لوگوں کی مذمت فرمائی ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں دوسروں کی آراء، اصطلاحات اور خواہشات کو قبول کرلیتے ہیں اور یہ بھی واضح فرمادیا کہ شرعی دلیل کے بغیر ہر شخص کی کوئی بھی بات اور کوئی بھی نظریہ ''حکم جاہلیت'' کا درجہ رکھتا ہے جو صرف گمراہی وخرافات کا مجموعہ ہے۔

چنگیز خان اور اس کے پیروکار تاتاریوں کا کردار بھی یہی تھا، چنگیز خان نے شریعت الٰہیہ سمیت مختلف شریعتوں کے افکار اور اپنی خودساختہ آراء پر مبنی ایک مجموعہ تیار کررکھا تھا، جو اس کی اولاد واتباع کیلئے قانونی دستاویز کی حیثیت رکھتا تھا، جسے وہ کتاب وسنت سے بھی زیادہ مقدم سمجھتے تھے۔ یہ حرکت موجب کفر ہے اور قرآنِ کریم کی اس آیت نے یہ نشان دہی کردی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے حکم کو چھوڑ کر دوسروں کی رائے کا متلاشی اور خواہش مند ''حکمِ جاہلیت'' پر کاربند ہے خواہ وہ کوئی بھی ہو اور خواہ وہ کسی کے حکم کو کتاب وسنت کے مقابلہ میں اہمیت دے۔

---

① (المائدة: ٤٩)

قَالَ: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ ﷺ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ. قَالَ النَّوَوِيُّ: حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ رَوَيْنَاهُ فِيْ كِتَابِ "الْحُجَّةِ" بِإِسْنَادٍ صَحِيْحٍ. ①

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی تمام خواہشات میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں''

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو حافظ نصر بن ابراھیم المقدسی نے اپنی کتاب "الحجة علی تارك المحجة" میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

حدیث "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ" کی تشریح

دیگر ائمہ سے بھی اس حدیث کی صحت منصوص ہے، لیکن بعض علماء کے نزدیک اس کی صحت محلِ نظر ہے، تاہم اُن کا یہ قول (بشرطِ تسلیم) نفسِ مسئلہ کیلئے قطعاً مضر نہیں ہے کیونکہ اس مسئلہ کا اصل بالکل اسی معنی میں قرآن سے ثابت ہے:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ ②

''اے محمد ﷺ قسم ہے تمہارے پروردگار کی جب تک یہ لوگ اپنے تنازعات میں تمہیں منصف اور حاکم نہ بنائیں پھر تمہارے فیصلوں سے اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ بخوشی اسے تسلیم کرلیں اس وقت تک یہ لوگ مؤمن نہیں ہوسکتے۔''

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ﴾ ③

''اور کسی مؤمن مرد اور مؤمن عورت کو حق نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ کوئی امر مقرر کردیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں''

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ اس حدیث کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: انسان اس وقت تک کامل الایمان مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی محبت رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کے تابع نہ ہوجائے، چنانچہ فرمودات و مامورات سے محبت اور منکرات ومنہیات سے کراہت اس کا شعار ہونا چاہیئے۔

① السنة لابن ابی عاصم: ص ۱۵ البیهقی (۷۳/۲) شرح السنة (۲۱۲/۱)۔
② (النساء: ٦٥)
③ (الاحزاب: ٣٦)

قرآنِ کریم نے اسی جذبہ کو اپنانے کی بار بار تاکید کی ہے (کما تقدم) جب کہ وہ شخص انتہائی مذمت وملامت کا نشانہ بنا ہے جو کتاب وسنت کے ساتھ مخالفانہ ومعاندانہ رویہ رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴾ ①

''یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز نازل کی اسے انہوں نے ناپسند کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے''

نیز فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴾ ②

''یہ اس لئے کہ جس چیز سے اللہ تعالیٰ ناخوش ہے یہ اس کے پیچھے چلے اور اسکی خوشنودی کو اچھا نہ سمجھے تو اس نے بھی اس کے عملوں کو برباد کر دیا''

لھذا ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ ہر اس چیز سے محبت کرے کہ جس سے اللہ تعالیٰ نے محبت کی ہے، یہی محبت ان کیلئے فرائض کی پابندی کا راستہ ہموار کر دے گی، بلکہ اس محبت میں جتنا اضافہ ہوتا جائے گا، انسان کا جذبۂ اطاعت بڑھتا جائے گا پھر وہ فرائض کی تکمیل کیساتھ ساتھ مستحبات ومندوبات کو بھی اختیار کرنے لگے گا، اور یہ اقدام اللہ تعالیٰ کی رحمت وفضل کا متقاضی ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی فرض ہے کہ وہ ہر اس چیز سے نفرت کرے جسے اللہ تعالیٰ نے ناپسند فرمایا ہے یہی نفرت اسے حرام کردہ اشیاء سے دور لے جانے کا سبب بنے گی بلکہ محرمات کے ساتھ ساتھ مکروہ اشیاء سے بھی اجتناب کا عادی بنا دے گی اور یہ بات بھی اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان کی متقاضی ہے، لیکن اگر کبھی خلافِ شریعت امر کا ارتکاب کر بیٹھے تو سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت میں کمی واقع ہوگئی ہے ایسی صورت میں فوراً توبہ کرنی چاہیئے اور تکمیلِ محبت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے کیونکہ تکمیلِ محبت کے بغیر تکمیلِ ایمان کی صورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ﴾ ③

''پھر اگر یہ تمہاری بات قبول نہ کریں تو جان لو کہ یہ صرف اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے پیچھے چلے''

=

① (محمد: ۹) ② (محمد: ۲۸) ③ (قصص: ۵۰)

قال المصنف: وَقَالَ الشَّعْبِیُّ: کَانَ بَیْنَ رَجُلٍ مِنَ الْمُنَافِقِیْنَ وَرَجُلٍ مِنَ الْیَھُوْدِ خُصُوْمَۃٌ. فَقَالَ الْیَھُوْدِیُّ: نَتَحَاکَمُ إِلٰی مُحَمَّدٍ عَرَفَ أَنَّہُ لَا یَأْخُذُ الرِّشْوَۃَ. وَقَالَ الْمُنَافِقُ: نَتَحَاکَمُ إِلَی الْیَھُوْدِ لِعِلْمِہٖ أَنَّھُمْ یَأْخُذُوْنَ الرِّشْوَۃَ فَاتَّفَقَا عَلٰی أَنْ یَأْتِیَا کَاھِنًا فِیْ جُھَیْنَۃَ فَیَتَحَاکَمَا إِلَیْہِ فَنَزَلَتْ ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ .... الآیۃ ﴾ ①

اس آیت کا شانِ نزول بیان کرتے ہوئے امام شعبی رحمہ اللہ نے فرمایا: ایک منافق اور ایک یہودی کے درمیان کسی معاملہ میں تنازعہ ہوگیا۔ یہودی نے کہا: ہم محمد ﷺ سے فیصلہ کراتے ہیں، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آپ ﷺ رشوت نہیں لیتے۔ لیکن منافق نے کہا: ہم یہودیوں سے ہی فیصلہ کرا لیتے ہیں کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہودی رشوت قبول کر لیتے تھے۔ چنانچہ وہ دونوں اس بات پر رضامند ہوگئے کہ قبیلہ بنی جہینہ کے فلاں کاہن سے فیصلہ کرا لیتے ہیں اس پر یہ آیتِ کریمہ: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ.... الآیۃ ﴾ نازل ہوئی۔

قال المصنف: وَقِیْلَ: نَزَلَتْ فِیْ رَجُلَیْنِ اِخْتَصَمَا فَقَالَ أَحَدُھُمَا: نَتَرَافَعُ إِلَی النَّبِیِّ ﷺ وَقَالَ الْاٰخَرُ: إِلٰی کَعْبِ بْنِ الْأَشْرَفِ، ثُمَّ تَرَافَعَا إِلٰی عُمَرَ فَذَکَرَ لَہٗ أَحَدُھُمَا الْقِصَّۃَ: فَقَالَ لِلَّذِیْ لَمْ یَرْضَ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ أَکَذٰلِکَ؟ قَالَ: نَعَمْ، فَضَرَبَہٗ بِالسَّیْفِ فَقَتَلَہٗ. ②

=

اس حدیث کو اس باب کے تحت ذکر کرنے کا مقصد واضح ہے کہ چونکہ انسان اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنی تمام خواہشات رسول اللہ ﷺ کے تابع نہ کردے، تو ظاہر ہے کہ اختلافی امور میں فیصلہ بھی آپ کی لائی ہوئی شریعت کی روشنی میں ہونا ضروری ہے اور آپ کے فیصلہ کو آخری معیار سمجھنا ضروری ہے، جس سے کوئی مفر نہ ہو، اور نہ ہی اس کے مقابلے میں اپنے اختیار یا اپنی رائے کو ظاہر کرتا پھرے۔

وقولہ: وَقَالَ الشَّعْبِیُّ: کَانَ بَیْنَ رَجُلٍ مِنَ الْمُنَافِقِیْنَ ......

یہ قصہ مختلف الفاظ اور مختلف اسانید سے مروی ہے بروایت ثعلبی عن ابن عباس رضی اللہ عنہ اس قصے کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

....

① ضعیف: ابن جریر (۹۷/۵) صحیح سند سے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابو بردۃ کاہن شخص تھا، یہودی اپنے اختلافات میں اس سے فیصلہ کراتے تھے چنانچہ بعض مسلمان بھی اس کے پاس فیصلہ کیلئے گئے تو یہ آیت اُتری۔ طبرانی کبیر (۱۲۰۴۵) مزید دیکھئے: مجمع الزوائد (۶/۷) شانِ نزول کے متعلق مصنف کی بیان کردہ کوئی بھی روایت ثابت نہیں۔

② موضوع: تفسیر کلبی، اسباب النزول، للواحدی: ص ۱۰۷، ۱۹۸۔ تفسیر بغوی (۵۵۲/۱) اس کی سند میں الکلبی کذاب اور ابوصالح ضعیف ہے، نیز ابوصالح کا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں۔

اس آیت کے شانِ نزول میں ایک قول یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ''دو آدمیوں میں کوئی تنازعہ تھا۔ ایک نے کہا: ہم اپنا قضیہ (فیصلہ) نبی ﷺ کے پاس لے جاتے ہیں، دوسرے نے کہا، نہیں کعب بن اشرف کے پاس لے جاتے ہیں، پھر وہ معاملہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے، چنانچہ ایک شخص نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو پوری بات بتا دی، تو عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے جس نے نبی ﷺ کے پاس جانا ناپسند کیا تھا پوچھا کہ کیا ایسا ہی ہے؟ اس نے کہا۔ ہاں۔ تو عمر رضی اللہ عنہ نے تلوار کے وار سے اسے قتل کر دیا۔''

ایک منافق جس کا نام ''بشر'' تھا اس کا کسی یہودی سے کوئی تنازعہ ہو گیا (چنانچہ منافق بظاہر کلمہ گو تھا) لھذا یہودی نے اسے نبی ﷺ سے فیصلہ کرانے کی دعوت دی لیکن منافق نے کعب بن اشرف سے فیصلہ کرانے کو ترجیح دی، پھر بہر حال وہ نبی ﷺ کے پاس چلے گئے اور آپ ﷺ نے دونوں کا مؤقف سن کر یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ منافق کو یہ فیصلہ پسند نہ آیا، چنانچہ اس نے کہا: آؤ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس چلیں۔ (چنانچہ دونوں چلے گئے) تو یہودی نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: رسول اللہ ﷺ اس تنازعہ کا فیصلہ کر چکے ہیں لیکن اسے وہ فیصلہ پسند نہیں آیا۔ تو آپ نے فرمایا: میرے آنے تک یہیں بیٹھو، چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ گھر میں داخل ہوئے اور تلوار لیکر وہاں پہنچ گئے اور اس منافق کی گردن پر زبردست وار کیا حتی کہ وہ ٹھنڈا پڑ گیا پھر آپ نے فرمایا:

"هٰكَذَا أَقْضِي لِمَنْ لَمْ يَرْضَ بِقَضَاءِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ"

''جسے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کا فیصلہ پسند نہیں ہے اس کیلئے میں اسی طرح فیصلہ صادر کیا کرتا ہوں۔''

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ اس قتل پر نبی ﷺ نے فرمایا: میں نہیں سمجھتا تھا کہ عمر (رضی اللہ عنہ) ایک مسلمان کو اس طرح قتل کر دے گا، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ....الآية ﴾ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بری کر دیا گیا اور اس کا خون معاف کر دیا۔

ایک روایت میں اس طرح بھی ہے کہ اس قتل کے بعد جبرئیل امین علیہ السلام نبی ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو قتل کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے عمر رضی اللہ عنہ کے اس فعل کے ذریعے حق و باطل میں تفریق پیدا کر دی ہے، چنانچہ آپ کو ''الفاروق'' کا لقب دیا گیا۔

بہر حال اس قصہ سے بہت کچھ عبرت کا سامان ہے اور بہت سے نکتے بھی حاصل ہوتے ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے سوا کسی دوسرے سے فیصلہ کرانے کی دعوت دینا منافقین کا شیوہ ہے وہ دوسرا خواہ کتنا بڑا امام کیوں نہ ہو (عمر رضی اللہ عنہ کی عظمت و رفعت پر کسے شک ہو سکتا ہے)

(۲) اللہ تعالیٰ کی راہ میں غضب ناک ہونا اور اسکے حکم میں سختی اور شدت اختیار کرنا جیسا کہ سیدنا عمرؓ نے اختیار کی (بہت بڑی عزیمت وسعادت ہے)

(۳) یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں طعن کرنے والا اس منافق کی طرح قتل کا مستحق ہے۔

(۴) حاکمِ وقت کی اجازت کے بغیر برائی کو ہاتھ کے زور سے مٹانے سے فتنہ وفساد کا اندیشہ ہوتو پھر ہاتھ کے استعمال میں احتیاط لازم ہے۔

(۵) یہ بھی ثابت ہوا کہ عمل اور مکمل اطاعت ایمان کے لئے شرط ہے صرف معرفتِ حق کافی نہیں ہے، چنانچہ یہودی کے کردار سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں آپ ﷺ کا رسول ہونا معلوم تھا، بلکہ وہ آپ ﷺ سے مختلف فیصلے کرایا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود بھی وہ کافر ہی رہے۔



اس باب کے مسائل

(۱) ''سورۃ النساء'' کی آیت ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ....الآیة﴾ کی تفسیر اور خاص طور پر وہ مقام جہاں سے طاغوت کا معنی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

(۲) ''سورۃ البقرۃ'' کی آیت: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ....﴾ کی تفسیر۔

(۳) ''سورۃ الاعراف'' کی آیت: ﴿وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا..﴾ کی تفسیر۔

(۴) اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان: ﴿ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ....﴾ کی تفسیر۔

(۵) پہلی آیت ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ....﴾ کا شانِ نزول بروایت شعبی رحمہ اللہ۔

(۶) سچے اور جھوٹے ایمان کی تشریح (قرآنی آیات اور حدیثِ رسول اللہ ﷺ: "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ......الخ" کی روشنی میں۔

(۷) سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اس منافق (جس نے نبی ﷺ کے فیصلہ کو ٹھکرایا تھا) کے ساتھ غیرتِ ایمان سے لبریز سلوک۔

(۸) کسی بھی شخص کو اس وقت تک ایمان کی دولت حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کی تمام خواہشات رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں۔



باب من جحد شيئا من أسماء الله وصفاته

اللہ تعالیٰ کے کسی نام یا صفت کا انکار کرنے والے کا حکم

قال :وقوله تعالیٰ: ﴿ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمٰنِ ﴾ ①

''اور یہ اللہ رحمٰن کے منکر ہیں''

یہاں حکم سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے کسی نام یا صفت مبارکہ کا انکار کردے تو اس کی نجات کا کوئی امکان ہے یا نہیں؟ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر، اور اس کے اسماء وصفات پر ایمان لائے بغیر توحید کا حصول ناممکن ومحال ہے، لہذا مصنف رحمہ اللہ ، اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر وجوبِ ایمان کے اہم ترین نکتہ پر تنبیہ فرمارہے ہیں۔

یہ بات معلوم ہے کہ توحید کی تین قسمیں ہیں: (۱) توحیدِ ربوبیت، (۲) توحیدِ اسماء وصفات اور (۳) توحیدِ عبادت۔

اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ پہلی دونوں اقسام، تیسری قسم کا وسیلہ ہیں، جبکہ یہ قسم (توحیدِ عبادت) اصل غایت اور مقصود ہے اور یہ بات بھی بیان ہو چکی کہ یہ تینوں اقسام آپس میں لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس تمام اہمیت کی وجہ سے مؤلف رحمہ اللہ نے توحید اسماء وصفات کا الگ ذکر فرمایا:

قوله :وقوله تعالیٰ: وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمٰنِ۔

یہاں (کفر بالرحمٰن) سے مراد اللہ تعالیٰ کا انکار نہیں، بلکہ صفتِ ''الرحمٰن'' کا انکار ہے، کیونکہ مشرکین مکہ اللہ تعالیٰ کا اقرار تو کرتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللهُ ﴾ ②

''اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا، کہیں گے اللہ تعالیٰ نے''

لیکن وہ سب کے سب یا ان کا ایک گروہ، عناداً یا جہلاً صفت ''الرحمٰن'' کا انکاری تھا۔

یہی وجہ ہے کہ جب صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے جنابِ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو "بسم الله الرحمن الرحيم" لکھنے کا حکم دیا تو انہوں نے کہا کہ ہم ''الرحمٰن'' یا ''الرحیم'' کو نہیں جانتے۔③

بعض روایات میں یوں بھی آیا کہ انہوں نے کہا: ''ہم رحمٰنِ یمامہ کے علاوہ اور کسی رحمٰن کو نہیں جانتے'' ④ =

---

① (الرعد: ٣٠) ② (الزخرف: ٧٨) ③ (بخاری، الرقم: ٢٧٣١. ٢٧٣٢)

④ مرسل: ابن ابی حاتم، عن عطاء مرسلا۔ دیکھیئے الدر المنثور (٥/٧٥)۔

وقولہ: ﴿ قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ ﴾ ①

''آپ کہہ دیجئے کہ میرا پالنے والا تو وہی (اللہ) ہے اس کے سوا درحقیقت کوئی بھی لائقِ عبادت نہیں، اسی کے اوپر میرا بھروسہ ہے اور اسی کے جانب میرا رجوع ہے''

=

رحمٰنِ یمامہ سے ان کی مراد مسیلمہ کذاب تھا؛ کیونکہ مسیلمہ کذاب اپنے آپ کو رحمٰن نام کے ساتھ موسوم کرتا تھا (قبحه الله ولعنه)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی ﴿ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَٰنِ ﴾ کی تفسیر میں یہی فرمایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ ''الرحمٰن'' کے منکر تھے، اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے کسی بھی نام کے انکار کا حکم واضح ہوگیا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی نام کے انکار کو کفر کہا ہے چنانچہ جو بھی شخص یا گروہ اللہ تعالیٰ کے کسی ایک نام کا انکار کرے گا وہ کافر قرار پائے گا۔

گمراہ فرقے فلاسفہ، جہمیہ اور معتزلہ اپنے اپنے انکار کے بقدر کفر کا حصہ سمیٹے بیٹھے ہیں، گو وہ بعض اسماء وصفات کا اقرار کرتے ہیں لیکن ان کے مذہب کا اگر بنظرِ عمیق مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ وہ اسماء وصفات کا بالکل اقرار نہیں کرتے؛ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء کو محض ایسے نام قرار دیتے ہیں جو صفات سے خالی ہیں، تو یہ عقیدہ بھی صفتِ رحمٰن کا انکار کرنے والے مشرکینِ مکہ کے کفر کا کم از کم نصف تو ہوگا۔

وقوله :قوله تعالیٰ: قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ....

یہاں اللہ تعالیٰ ان کفار کو جو اللہ تعالیٰ کی صفتِ ''رحمٰن'' کے منکر تھے یہ کہہ کر رد فرما رہا ہے کہ اے پیغمبر کہہ دو! تم جس رحمٰن کے منکر ہو اس کے سوا کوئی میرا معبود ہے ہی نہیں، اس پر میرا توکل ہے اور اسی کی طرف مجھے لوٹنا ہے (یعنی بصورتِ توبہ رجوع کرنا ہے)

حافظ ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت سے معلوم ہوا کہ توکل اور توبہ دونوں عبادتیں ہیں، لہذا یہ دونوں چیزیں غیر اللہ کیلئے قطعاً روا نہیں ہوسکتیں، لہذا غیر اللہ سے توبہ کرنے والا مشرک ہے

نبی ﷺ نے ایک چور کا جب ہاتھ کاٹا، تو اس نے اس موقع پر کہا یا اللہ! میں تیری طرف توبہ کرتا ہوں، محمد ﷺ کی طرف نہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس نے حق والے کا حق پہچان لیا ہے۔ ②

① (الرعد: ۳۰)

② ضعیف: مسند احمد (۱۵۵۸۷/۵) مستدرك حاكم (۲۵۵/٤) حسن بصری کے عنعنہ کی وجہ سے اس سند پر کلام ہے، نیز محمد بن مصعب اگرچہ صدوق ہے مگر کثیر الغلط ہے، دیکھیے: مجمع الزوائد (۱۹۹/۱۰)۔

قال وفی الصحیح البخاری :قَالَ عَلِیٌّ :"حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا یَعْرِفُوْنَہُ أَتُرِیْدُوْنَ أَنْ یُکَذَّبَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہُ"

صحیح بخاری میں ہے، علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے :''لوگوں سے ان کی سمجھ بوجھ کے مطابق بات کیا کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کو جھٹلایا جائے۔''

عامۃ الناس کے سامنے متشابہات کا ذکر مناسب نہیں

امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول صحیح بخاری میں مسنداً ومعلقاً مروی ہے، اسی قول کو آدم بن ابی ایاس نے بھی اپنی کتاب ''العلم'' میں روایت کیا ہے، اور اس میں یہ جملہ زائد مذکور ہے:

" وَدَعُوْا مَا یُنْکِرُوْنَ " یعنی ''لوگوں کے سامنے ایسی باتوں کا ذکر نہ کرو جو انہیں اشتباہ میں ڈال دیں''...... یہ قول اس بات کی دلیل ہے کہ عامۃ الناس کے سامنے متشابھات کا ذکر مناسب نہیں۔

اسی جیسا ایک قول سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

''اگر تم لوگوں سے ایسی گفتگو کرو گے جو ان کی ذہنی سطح سے بلند ہو تو وہ انہیں مبتلائے فتنہ کر سکتی ہے۔'' ①

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ لوگوں کے سامنے ایسی احادیث کی روایت سے روکا کرتے تھے جنہیں سن کر وہ حکام سے بغاوت پر آمادہ ہو جائیں۔ سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ، سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور حسن بصری رحمہ اللہ وغیرہم سے بھی ایسے اقوال ملتے ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ ایسے مسائل کے بیان سے گریز کرنا چاہیئے جن سے عامۃ الناس کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہو۔

واضح ہو کہ امام مالک رحمہ اللہ کی طرف ایک قول منسوب ہے کہ وہ عوام الناس کے سامنے ان احادیث کے بیان سے روکا کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی صفات پر مشتمل ہیں لیکن امام مالک سے اس قول کی نسبت ثابت نہیں ہے اور یہ ممکن بھی نہیں کہ وہ اس قسم کی بات کہیں، کیونکہ احادیثِ صفات سے تو کہیں زیادہ قرآنی آیات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفات پر مشتمل ہیں، بلکہ صحتِ ایمانی کیلئے اللہ تعالیٰ اور اس کی تمام صفات جو کمال ہیں پر ایمان لانا شرط ہے، اور صفات باری تعالیٰ کے بارہ میں اپنے دل میں تنگی محسوس کرنے والا منافق ہے۔

معاملہ دراصل یہ ہے کہ گمراہ فرقہ جہمیہ منکرین صفات باری تعالیٰ نے جب دیکھا کہ احادیثِ صفات ان کے مذہب کا کھلم کھلا بطلان کر رہی ہیں، نیز ان کی بدعات وخرافات پر ضرب کاری لگا رہی ہیں، تو انہوں نے =

① (صحیح مسلم)

قَالَ :وَرَوَى عَبْدُ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ عَنِ ابْنِ طَاوُسٍ عَنْ أَبِيهِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ:" أَنَّهُ رَأَى رَجُلًا انْتَفَضَ لِمَا سَمِعَ حَدِيْثًا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فِي الصِّفَاتِ اسْتِنْكَارًا لِذٰلِكَ۔ فَقَالَ : " مَافَرْقُ هٰؤُلَاءِ يَجِدُوْنَ رِقَّةً عِنْدَ مُحْكَمِهِ وَيَهْلِكُوْنَ عِنْدَ مُتَشَابِهِهِ" ①

عبدالرزاق الصنعانی ،معمر بن راشد سے ،وہ عبداللہ بن طاؤس سے ،وہ اپنے والد طاؤس بن کیسان سے اور وہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ''عبداللہ بن عباس نے ایک شخص کو نبی ﷺ کی ایک حدیث جو اللہ تعالیٰ کی صفات پر مشتمل تھی کو سن کر کانپتے ہوئے دیکھا ،اس کا یہ کانپنا ،اس حدیث کے انکار کو ظاہر کر رہا تھا ،جس پر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''احادیثِ صفات کو سن کر ان لوگوں کے اس قدر خوف اور انکار کا کیا جواز ہے؟ یہ لوگ محکم آیات کو تو کس قدر جلدی قبول کر لیتے ہیں ،اور متشابہ آیات کا (فوراً انکار) کر کے ہلاک ہو جاتے ہیں''

=

عوام الناس مؤمنین سے انہیں چھپائے رکھنے کی ہانک لگا دی تا کہ ان کے باطل مذہب کی ضلالت اور فاسد عقیدے کا فساد لوگوں پر عیاں نہ ہو جائے۔

بہر حال سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مذکورہ اثر سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اگر کسی مسئلہ کے بیان سے ،کسی شخص کے ضرر کا اندیشہ ہو تو اس کے سامنے اس کا ذکر نہ کیا جائے۔

لیکن یہ قول مطلق طور پر تمام احکام پر فٹ نہیں ہوتا ،دین کی بہت سی باتیں ،اور رسول اللہ ﷺ کی بہت سی سنتیں ایسی ہیں جو عامۃ الناس کے علم میں نہیں ہوتیں ،اور جب انہیں بتائی جائیں تو وہ انہیں گراں محسوس کرتے ہیں (لیکن بالآخر مان لیتے ہیں) لہذا ایک عالمِ دین بڑی ذمہ داری اور حکمتِ عملی کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے۔ (واللہ اعلم)

وقوله :وَرَوَى عَبْدُ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ عَنِ ابْنِ طَاوُسٍ ......

جس شخص کا یہ واقعہ ہے اس کا نام مذکور نہیں ہے ،صفاتِ باری تعالیٰ پر مشتمل حدیث کو سن کر کانپ اٹھنا ،اور اس حدیث کا انکار کر دینا یا تو اس بناء پر ہو سکتا ہے کہ اس کی عقل اس حدیث کی متحمل نہ ہو سکی ،یا پھر ممکن ہے کہ وہ اس صفت کے اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت نہ ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ خوف و انکار قطعی بے جواز اور بے بنیاد ہے ،بندے کا کام تو یہ ہے کہ

① صحیح : اسے ابن ابی عاصم نے "السنة" (٤٨٥) میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے جو کچھ ثابت ہو وہ فوری اسی پر سرِ تسلیم خم کردے اور بالآخر ایمان لے آئے، خواہ وہ بات اس کی محدود سی عقل میں سمائے یا نہ سمائے۔

اسی لئے امام شافعی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

''میں اللہ تعالیٰ، اور جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے سب پر، اللہ تعالیٰ کی مراد کے مطابق ایمان لاتا ہوں، اسی طرح رسول اللہ ﷺ اور جو کچھ آپ کی طرف سے آیا ہے سب پر، آپ ﷺ کی مراد کے مطابق ایمان لاتا ہوں''

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اپنے مذکورۃ الصدر قول کے ذریعہ ان لوگوں پر اظہارِ برہمی و ناراضگی فرمارہے ہیں جو محکمات کو تو فوری مان لیتے ہیں لیکن متشابہات کا عدمِ فہم کی بناء پر انکار کرکے بربادی کا شکار ہوجاتے ہیں: فرماتے ہیں: ''مَا فَرْقُ هٰؤُلَاءِ......'' یہ لوگ حق وباطل میں فرق کرنے سے قاصر ہیں بلکہ صحیح اور مکمل حق کی معرفت سے عاری ہیں۔

یہاں ہم متشابہات کی کچھ وضاحت کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ جہمیہ جو صفاتِ باری تعالیٰ کے منکر ہیں ان آیات واحادیث کو متشابہ قرار دینے کی مذموم سعی کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفات پر مشتمل ہیں۔ متشابہات سے مراد وہ نصوص ہیں جن کا فہم بعض لوگوں کیلئے (سب کیلئے نہیں) مشتبہ ومشکل بن جائے، اس لحاظ سے متشابہات کا معاملہ نسبی ہے کلی نہیں یعنی ممکن ہے کوئی نص ایسی آجائے جس کا فہم کچھ لوگوں کیلئے باعثِ اشتباہ ہو، مگر وہی نص دوسروں کیلئے بالکل واضح اور جلی ہوتی ہے۔

نبی ﷺ نے کچھ لوگوں کو کسی نصِ قرآنی پر جھگڑتے اور اختلاف کرتے دیکھا تو شدید غضب کے عالم میں فرمایا:

''سابقہ قومیں اسی وجہ سے گمراہی کا شکار ہوئی تھیں، انہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی باتوں پر اختلاف کرنا شروع کردیا، اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ پر پیش کرکے مرضی کے مفہوم نکالنے شروع کردیئے، (اچھی طرح جان لو کہ) قرآن اس لئے نہیں اترا کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو جھٹلائے، بلکہ اس لئے نازل ہوا کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تصدیق کرے، لہذا جس چیز کو تم صحیح سمجھ لو اس پر عمل کرو، اور جو چیز تم پر مشتبہ ہو اس پر ایمان لے آؤ'' (1)

معلوم ہوا کہ قرآن یا حدیث کی کوئی نص کسی فرد یا افراد پر مشتبہ ہوسکتی ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ

(1) حسن: طبقات ابن سعد (۱۹۲/۴) مسند احمد (۶۷۱۴/۲) خلق افعال العباد للبخاری (ص ۶۱) سنن ابن ماجه (۸۵).

سب کیلئے مشتبہ ہو، اب جس پر مشتبہ ہو جائے اس کا کام یہ نہیں ہے کہ عدمِ فہم کی بناء پر اس کا انکار کر دے، بلکہ ضروری ہے کہ وہ ایمان لے آئے، کیونکہ قصور نص کا نہیں بلکہ اسکی اپنی کج فہمی کا ہے، البتہ وہ اس مشتبہ چیز کو سمجھنے کی کوشش کرے، جسکا طریقہ یہ ہے کہ اسے محکم نصوص پر پیش کرے یا پھر راسخین فی العلم سے رجوع کرے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ درج ذیل آیتِ قرآنی کا مفہوم کیا ہوگا؟ کیونکہ اس آیت میں تو کچھ نصوص کو محکم اور کچھ کو متشابہ بتایا گیا ہے۔

﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ آیَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ﴾ ①

''وہی اللہ تعالیٰ ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری جس میں واضح مضبوط آیتیں ہیں جو اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ آیتیں ہیں''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ، اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''یہاں اللہ تعالیٰ یہ خبر دے رہا ہے کہ قرآنِ حکیم میں کچھ آیات محکم ہیں، جو بالکل بیّن اور واضح ہیں، جن میں کسی کو کوئی التباس و پریشانی نہیں۔ جبکہ کچھ آیات متشابہ ہیں، جن کی دلالت بہت سے یا کچھ لوگوں پر مشتبہ ہو جاتی ہے، ایسی صورت میں جو شخص مشتبہ کو محکم پر پیش کر کے ثانی الذکر (یعنی محکم) کو اول الذکر (مشتبہ) پر حاکم بنالے وہ ہدایت یافتہ ہے، اور جو اس سے برعکس راہ پر چلا وہ ہدایت کے برعکس یعنی گمراہی پر قائم ہو جائے گا۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے (محکمات کو) ام الکتاب کہا ہے یعنی محکمات، اصلِ کتاب ہیں، جن کی طرف عند الاشتباہ لوٹنا ضروری ہے، اور جو متشابھات ہیں، ان کے اشتباہ کو زائل کرنے کیلئے محکمات کی موافقت ضروری ہے۔ متشابھات کے اندر پایا جانے والا اشتباہ باحتمال لفظ اور ظاہری ترکیب کے اعتبار سے ہوتا ہے، معنی اور مراد کے اعتبار سے نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ ﴾ ②

''پس جن کے دلوں میں کجی ہے''

یعنی جن کے دلوں میں کجی اور گمراہی ہے اور وہ حق کو چھوڑ کر باطل کو اپنانے پر مصر ہیں وہ متشابھات کی پیروی کرتے ہیں، یعنی ہمیشہ متشابہ نصوص کے درپے نظر آتے ہیں، کیونکہ ان میں انہیں تحریف کا چور دروازہ مل جاتا ہے جس کی مدد سے ان نصوص کو اپنے مقاصدِ فاسدہ اور اھواءِ باطلہ کی طرف پھیرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ محکم نصوص میں ایسا کچھ نہیں کر پاتے، بلکہ محکم نصوص تو ان کے خلاف حجت بن کر ان کی

① (آل عمران: ۷) ② (آل عمران: ۷)

خواہشات و مقاصد پر ضرب کاری بنے ہوتے ہیں۔ متشابہات کو اس انداز سے اپنانے سے انکا مقصود کیا ہے؟ ''اِبْتِغَاءُ الْفِتْنَةِ'' فتنہ پیدا کرنا اور اپنے پیروکاروں کو مزید گمراہ کرنا، کیونکہ وہ ان پر یہ تأثر قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ ہم تو اپنے معتقدات (جو درحقیقت بدعات ہیں) کیلئے قرآنی نصوص سے استدلال کر رہے ہیں حالانکہ اگر حقیقتِ حال دیکھی جائے تو وہ نصوص ان کیلئے نہیں بلکہ ان کے خلاف حجت ہیں''

(انتہی کلام الحافظ ابن کثیر)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ایسے لوگوں کو شکوک وشبہات میں گھرا ہوا قرار دیتے ہیں جو محکمات کو متشابہات پر، اور متشابہات کو محکمات پر پیش کر کے، حق و باطل کو خلط ملط کر کے تلبیس پیدا کرتے ہیں۔ مزید فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ التباس کا شکار بنائے رکھتا ہے اور انہیں نصوص کے صحیح معانی تک پہنچنے ہی نہیں دیتا۔

اس قول سے یہ بات بھی مترشح ہو رہی ہے کہ مشتبہات کے صحیح علم سے صرف وہ لوگ محروم رکھے جاتے ہیں جو ان کے معانی کے تعلق سے الحاد کا شکار ہیں، لیکن علماءِ راسخین جو منہجِ حق و اعتدال پر قائم ہیں انہیں ان کے صحیح معانی کی معرفت کی توفیق عطا فرما دی جاتی ہے۔ البتہ کچھ علماء کا کہنا ہے کہ مشتبہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، ہم عرض کرتے ہیں کہ یہ دونوں موقف درست ہیں، لیکن ذرا سی تفصیل کے محتاج ہیں، جو اس طرح ہے کہ اسی سلسلہ میں ہمارے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلاَّ اللهُ ..... ﴾ کا معنی و مطلب

﴿ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلاَّ اللهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ ﴾

جن علماء نے لفظ الجلالۃ (اللہ) پر وقف تام قرار دیا ہے اور "وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ" کو کلامِ مستأنفہ قرار دیا ہے، ان کے نزدیک آیت سے مراد یہی ہوگی کہ متشابہات کا معنی صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے......اور جن علماء نے "الْعِلْمِ" پر وقف کر کے "وَالرَّاسِخُونَ" کی ''واو'' کو عاطفہ قرار دے کر ''الرَّاسِخُونَ'' کو معطوف اور لفظ الجلالۃ (اللہ) کو معطوف علیہ کہا ہے، ان کے نزدیک معنی یہ ہوگا کہ متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، اور راسخین فی العلم کو بھی۔

اب سوال یہ ہے کہ دونوں میں سے کونسا معنی صحیح ہے؟

جواب یہ ہے کہ دونوں صحیح ہیں، لیکن ایک الگ الگ مطلب کی روشنی میں۔

....

....

....

دوسرا معنی یعنی اللہ تعالیٰ اور راسخین فی العلم کا متشابہات کا معنی جاننے کا معنی یہ ہے کہ متشابہات کا ظاہری معنی اور صحیح تفسیر، اللہ تعالیٰ بھی جانتا ہے اور اس نے راسخین فی العلم کو بھی اس کا صحیح فہم عطا فرمایا ہوا ہے، مثلاً: آیاتِ صفاتِ باری تعالیٰ کا ظاہری صحیح معنی اور تفسیر کا فہم اللہ تعالیٰ نے راسخین فی العلم کو عطا فرمایا ہوا ہے۔ اسی طرح مثال کے طور پر امورِ آخرت: حساب، میزان، صراط وغیرہ جنت کی نعمتوں اور جہنم کے عذاب کے بیان پر مشتمل نصوص کا ظاہری اور صحیح معنی کا فہم اللہ تعالیٰ نے راسخین فی العلم کو عطا فرمایا ہوا ہے۔

البتہ جن کے دلوں میں کجی اور الحاد ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اتباعِ اھواء کی وجہ سے شکوک وشبھات کی وادیوں میں دھکیل دیا ہے، جہاں وہ اپنی مطلب پرستی کیلئے ملحدانہ تاویلوں میں مصروف ہو کر لوگوں کی گمراہی کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔

دوسرے معنی یعنی متشابہات کی تاویل صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے سے مراد یہ ہے کہ ایک شئی کے ظاہری معنی وتفسیر جس کا علم راسخین کو ہے کے بعد اس شئی کے حقائق یا کیفیات صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کی صفات کے نصوص کا ظاہری اور صحیح معنی راسخین فی العلم کو معلوم ہے مگر صفات کی کیفیت کا قطعا کوئی علم نہیں۔ اس معنی کی روشنی میں متشابہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

اسی طرح امورِ آخرت حساب، میزان اور صراط وغیرہ یا جنت کی نعمتوں اور جہنم کے عذاب کے نصوص کا ظاہری اور صحیح معنی راسخین فی العلم جانتے ہیں، لیکن حساب، میزان، پل صراط، جنت کی نعمتوں اور جہنم کے عذاب کی حقیقت وکیفیت کا قطعا کوئی فہم یا ادراک نہیں رکھتے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

''جنت کی جو نعمتیں دنیا کے اندر موجود ہیں وہ صرف نام کی حد تک ہیں'' ①

اس معنی کے اعتبار سے متشابہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، باقی اگر کوئی شخص نصوصِ صفات کے معنی وتفسیر کو متشابہات میں سے قرار دے جیسا کہ ''معطلہ'' اور بعض دیگر ملحدین کا مذہب ہے تو یہ بہت بڑا باطل ہے اور اس مذہب کے حامل پرلے درجے کے گمراہ ہیں۔

---

① صحیح : "الفصل لابن حزم"(٢/١٠٨) دیکھئے : الترغیب للمنذری (٤/٥٦٠).

قَالَ: وَلَمَّا سَمِعَتْ قُرَيْشٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَذْكُرُ الرَّحْمٰنَ أَنْكَرُوْا ذٰلِكَ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ ﴿وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ﴾

''جب قریش نے رسول اللہ ﷺ کی زبان سے ''الرحمٰن'' کا ذکر سنا تو انہوں نے اس صفت کا انکار کر دیا، جس پر اللہ تعالیٰ نے آیت ﴿وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ﴾ نازل فرمائی۔''

مؤلف رحمہ اللہ نے اس اثر کو اسی طرح بالمعنی روایت کیا ہے، جس کی تفصیل مشہور تابعی ابن جریج رحمہ اللہ سے اس طرح منقول ہے:

''جب رسول اللہ ﷺ قریش کے ساتھ حدیبیہ کے موقع پر صلح کا شرائط نامہ تحریر کرا رہے تھے، تو رسول اللہ نے شروع میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھوا دیا، تو انہوں نے کہا: ہم ''الرحمٰن'' نہیں لکھیں گے، کیونکہ ہم ''الرحمٰن'' کو جانتے ہی نہیں، ہم تو صرف "باسمك اللهم" لکھیں گے، جس پر اللہ تعالیٰ نے آیت:

﴿وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ﴾ کو نازل فرمایا۔ ①

اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی کسی ایک صفت کا انکار کرنے والا، کفار قریش کی طرح ہلاک ہونے والوں میں سے ہے۔ تو پھر ان لوگوں یا گروہوں کا ٹھکانہ کیا ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی تمام یا بہت سی صفات کے منکر ہیں؟

بندے پر فرض ہے کہ اسے فہم حاصل ہو یا نہ ہو، اس کی عقل قبول کرے یا نہ کرے، تمام صفات پر ایمان لے آئے، خواہ ان کا تذکرہ قرآن مجید میں ہو یا رسول اللہ ﷺ کی سنت میں، راسخین فی العلم کی نشانی یہی ہے ﴿يَقُوْلُوْنَ آمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ....﴾ یعنی وہ کہتے ہیں: ''چونکہ یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے لہذا ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔'' (اللهم اجعلنا منهم)

---

① مرسل، ضعیف: ابن جریر (۱۰۱/۱۳) نیز ابن جریج مدلس ہے۔

اس باب کے مسائل

(۱) اسماء وصفات میں سے کسی ایک پر ایمان نہ لانا موجب کفر ہے۔

(۲) سورۃ الرعد کی آیت کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۳) اگر سامع سے کسی چیز کے عدمِ فہم کا اندیشہ ہوتو اسے بیان نہ کرنا بہتر ہے۔

(۴) اس کی علت یہ بیان ہوئی کہ یہ چیز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تکذیب کا باعث ہوسکتی ہے، خواہ اس شخص کا تکذیب کا ارادہ نہ بھی ہو۔

(۵) اللہ تعالیٰ کی صفات پر مشتمل حدیثِ رسول ﷺ کو سن کر انکار کرنے والے شخص کے بارہ میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا کلام معلوم ہوا، ان کے قول سے یہ بات واضح ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا انکار کرنا، یا انکار کرنے جیسا رویہ اپنا لینا انتہائی مہلک ہے۔



باب

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کفر ہے

قول اللہ تعالیٰ ﴿ يَعْرِفُونَ نِعْمَةَ اللهِ ثُمَّ يُنكِرُونَهَا ﴾ ①

اس باب کے انعقاد سے مؤلف رحمہ اللہ کا مقصود یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقامِ ربوبیت کے ساتھ حسنِ ادب کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ ایسے الفاظ کے استعمال سے یکسر گریز کیا جائے جو شرکِ خفی کے زمرے میں آتے ہیں اسکی ایک مثال اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرنا ہے، یہ عمل شرکِ خفی کا ایک باب شار ہوتا ہے جسکی ضد شکر ہے، جو توحید کا ایک اہم باب ہے۔

صحیح ابن حبان میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس شخص کے ساتھ کوئی نیکی کی جائے اور وہ نیکی کرنے والے کو سوائے اچھی تعریف کے کوئی بدلہ نہ دے سکے، تو یہ (تعریف) بھی اس کا بہترین شکریہ شمار ہوتا ہے، اور جس شخص نے اچھی تعریف بھی نہ کی اس نے ناشکری کی'' ②

اس معنی کی ایک روایت ابوداؤد میں بسند جید مذکور ہے، جس کے الفاظ اس طرح ہیں:

''جس شخص کے ساتھ کوئی بھلائی کی جائے تو (کم از کم) اس کا ذکر کر دینا ہی اس کا شکریہ شمار ہوتا ہے، اور جو ذکر بھی نہ کرے وہ ناشکرا ہے'' ③

یہ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ نیکی کرنے کا معاملہ ہے، جس کے ذکر و تعریف کو شکریہ شمار کیا گیا ہے، حالانکہ انسان کو بھلائی کرنے کی قدرت و توفیق اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ جو منعمِ حقیقی ہے وہ اپنے احسانات و انعامات پر کس قدر شکریہ ادا کیے جانے کا مستحق ہوگا اور اس کا شکریہ ادا کرنا کس قدر ضروری ہوگا؟

---

① (النحل: ٨٣)

② یہ شواہد اور دیگر طرق کی بناء پر حسن ہے، الادب المفرد، للبخاری: (٢١٥) سنن ابی داؤد: (٤٨١٣) صحیح ابن حبان: (٢٠٧٣)

③ اس کی سند جید ہے، سنن ابی داؤد: (٤٨٠٤) امام منذری نے اسے جید کہا ہے۔ امام مناوی نے اسکے رواۃ کو ثقہ کہا ہے۔

قَالَ المصنف :قَالَ مُجَاهِدٌ: وَمَعْنَاهُ: هُوَ قَوْلُ الرَّجُلِ هٰذَا مَالِي وَرِثْتُهُ عَنْ آبَائِي وَقَالَ عَوْنُ ابْنُ عَبْدِ اللّٰهِ :يَقُوْلُوْنَ لَوْلَا فُلَانٌ لَمْ يَكُنْ كَذَا ، وَقَالَ ابْنُ قُتَيْبَةَ :يَقُوْلُوْنَ هٰذَا بِشَفَاعَةِ آلِهَتِنَا .

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَةَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے انکار سے مراد یہ کہنا ہے: یہ تو میرا اپنا مال ہے جو مجھے اپنے باپ دادا سے ورثہ میں ملا۔ عون بن عبد اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: اس سے مراد ان کا یوں کہنا ہے کہ اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو یہ کام کبھی نہ ہوتا۔ ابن قتیبہ فرماتے ہیں: اس سے مراد ان کا یوں کہنا ہے: یہ سب کچھ ہمیں اپنے معبودوں کی سفارش سے ملا ہے۔''

آیت ﴿ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَةَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا ﴾ کی تفسیر میں تین اقوال

ترجمۃ الباب میں مذکور آیت کریمہ ﴿ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَةَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا ﴾ (جس کا ترجمہ یوں ہے: یہ ''کفار'' اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو پہچاننے کے باوجود ان کا انکار کرتے ہیں'') کی تفسیر میں مصنف رحمہ اللہ نے تین علماء کے اقوال پیش فرمائے ہیں:

(۱) پہلا قول مشہور مفسر امام مجاہد رحمہ اللہ کا ہے جو فرماتے ہیں: کہ کفار کے پاس گھر، مویشی، لوہے اور کپڑوں کی صورت میں جو بھی نعمتیں ہیں وہ ان کے من جانب اللہ ہونے کو خوب جانتے اور پہچانتے ہیں، لیکن پھر انکار کر دیتے ہیں، انکار کرنے سے مراد یہ ہے کہ یہ کہہ دیتے ہیں: یہ سارا مال واسباب تو ہمیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملا ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے مشرکین کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''ان کا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرنا، اللہ تعالیٰ کے انعام کے انکار کے مترادف ہے، اس قسم کی بات کہنے والا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا منکر ہی کہلائے گا''...... (مزید فرماتے ہیں) ''حالانکہ اگر وہ نعمتیں انہیں آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہیں تو اور زیادہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ جس نے انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو ان نعمتوں سے نوازا۔''

(۲) عون بن عبد اللہ فرماتے ہیں، اس سے مراد ان کفار کا یوں کہنا ہے: ''اگر فلاں نہ ہوتا تو مجھے یہ نقصان ہو جاتا، یا مجھے فلاں چیز نہ مل پاتی۔''

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس قسم کے قول کو بڑا خطرناک قرار دیا ہے، کیونکہ اس قول میں انعامات کی نسبت

....

....

....

اس منعمِ حقیقی، پروردگار سے کہ جو اگر نہ ہوتا تو کچھ نہ مل پاتا سے قطع کر کے ان لوگوں کی طرف کر دی گئی ہے جن کو دوسروں کیلئے تو کجا، اپنے نفس کیلئے بھی کسی نفع وضرر کا کوئی اختیار نہیں (عافانا الله من الشرك وأهله)

(۳) ابنِ قتیبہ فرماتے ہیں:

''اس آیتِ کریمہ سے مراد ان کفار کا یوں کہنا ہے ہمیں یہ تمام نعمتیں اپنے معبودوں کی سفارش کی بدولت ملی ہیں۔''

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اس بدترین قول میں شرک کی نحوست بھی ہے، اور انتہائی نا اہل افراد کی طرف اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو منسوب کرنا بھی ہے، کیونکہ جن معبودوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا جاتا ہے ان کا معاملہ اس بات سے کہیں زیادہ کمتر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارش کر سکیں، جبکہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب ومقرب ہستی بھی سفارش نہیں کر سکتی، اور جب اللہ تعالیٰ کا اذن پا کر سفارش کرے گی تو صرف ان کی سفارش کر سکے گی جن کی سفارش اللہ تعالیٰ کو پسند ہوگی۔

شفاعت کے سلسلہ میں شفیع کا تعین اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اس شفیع کی شفاعت قبول کرنا بھی اس کی ایک نعمت ہے، مشفوع لہ (جس کی شفاعت کی جارہی ہے) کو شفاعت کا اہل قرار دینا بھی اس کی ایک نعمت ہے تو پھر اسکے سوا منعمِ حقیقی کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللهِ ﴾ ①

''تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے من جانب اللہ ہے......''

کوئی بندہ کسی بھی وقت ایک پلک جھپکنے کے برابر بھی اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتا، نہ دنیا میں نہ آخرت میں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو مذمت ووعید کا نشان بنا دیا جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو پا کر کہہ اٹھا ﴿ اِنَّمَا اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ﴾ ''یہ ساری دولت میری قابلیت اور مہارت کی بناء پر میرے پاس آئی ہے''

① (النحل: ۵۳)

قال المصنف :وَقَالَ اَبُو الْعَبَّاسِ بَعْدَ حَدِيْثِ زَيْدِ بْنِ خَالِدِ الَّذِیْ فِيْهِ :أَنَّ اللّٰه تَعَالٰى قَالَ: "أَصْبَحَ مِنْ عِبَادِیْ مُؤْمِنٌ بِیْ وَكَافِرٌ" (الحديث) وَقَدْ تَقَدَّمَ ، وَهٰذَا كَثِيْرٌ فِی الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ ، يَذُمُّ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى مَنْ يُضِيفُ اَنْعَامَهُ اِلٰى غَيْرِهٖ وَيُشْرِكُ بِهٖ .

قَالَ بَعْضُ السَّلَفِ :هُوَ كَقَوْلِهِمْ :كَانَتِ الرِّيْحُ طَيِّبَةً وَ الْمَلَّاحُ حَاذِقًا ، وَنَحْوُ ذٰلِكَ بِمَا هُوَ جَارٍ عَلٰى أَلْسِنَةٍ كَثِيْرَةٍ .

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ زید بن خالد رضی اللہ عنہ کی حدیث جس میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مذکور ہے ''آج صبح میرے کچھ بندے مؤمن ہو گئے اور کچھ نے کفر اختیار کیا'' پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کتاب وسنت میں اس کے بہت سے نظائر مل سکتے ہیں، یہاں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مذمت فرما رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو غیر اللہ کی طرف منسوب کر کے مشرک بن جاتے ہیں۔

بعض علماءِ سلف اس کی مثال یوں دیتے ہیں: لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں، جب وہ کشتی اللہ تعالیٰ کے حکم سے منزلِ مقصود پر پہنچ کر کنارے جا لگتی ہے تو مسافر اتر کر یوں کہنے لگتے ہیں، ہوا بہت سازگار تھی، اور ملاح بھی انتہائی سمجھدار تھا جس کی وجہ سے ہم بحفاظت کنارے جا لگے، یا اس قسم کے اور جملے جو بہت سے لوگوں کی زبانوں پر جاری رہتے ہیں۔

قوله :وَقَالَ اَبُو الْعَبَّاسِ بَعْدَ حَدِيْثِ زَيْدِ بْنِ خَالِدِ ......

یعنی وہ محفوظ پار لگنے کو ہوا کی سازگاری اور ملاح کی سمجھداری کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بھلا دیتے ہیں جس کے امر سے ہوا سازگار رہوئی، جس کی توفیق سے ملاح سمجھدار رہا اور جس کی رحمت سے بیڑا پار لگا:

﴿ رَبُّكُمُ الَّذِیْ يُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴾ ①

''تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے لیئے دریا میں کشتیاں چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو، وہ تمہارے اوپر بہت ہی مہربان ہے''

مقامِ غور ہے کہ کشتی پار لگنے کی نعمت کو ہوا اور ملاح کی طرف منسوب کرنے کا معاملہ بالکل ان لوگوں جیسا نہیں ہے جنہوں نے بارش کو ستاروں کی طرف منسوب کر دیا تھا اور جنہیں اسی وجہ سے کافر قرار دیا گیا تھا، خواہ

① (الاسراء: ٦٦)

اس قسم کی بات کہنے والا اعتقادی اعتبار سے ہوا اور ملاح کو فاعلِ حقیقی نہ بھی مانتا ہو، بلکہ سبب قرار دیتا ہو۔ لیکن سبب کا خالق بھی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے لھذا اسبابِ نعمت کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف ہی منسوب کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کہ جس کے امر سے سبب حاصل ہوا، اپنے امر سے اس کی سببیت چھین بھی سکتا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ دنیا و آخرت کی ہر نعمت کا عطا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے: ﴿ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ﴾

اس حقیقت کا ذکر، اقرار و اعتراف بطورِ شکرِ نعمت ہے، اور عدمِ اقرار، اور اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت نہ کرنا انکار و ناشکری ہے۔

واضح ہو کہ اگر آپ کو کسی شخص کی بھلائی کی وجہ سے کوئی نعمت حاصل ہوئی ہو تو وہ ایک سبب ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے مہیا فرمایا لیکن اس شخص کو اس بھلائی کا بدلہ دینا یا اس کیلئے دعا کرنا مقامِ شکر باری تعالیٰ کے منافی نہیں ہے۔



اس باب کے مسائل

(۱) نعمت کی تعریف اور نعمت کے انکار کی حقیقت واضح ہوئی۔

(۲) یہ بات معلوم ہوئی کہ انکارِ نعمت کی یہ صورتِ حال بے شمار لوگوں کی زبانوں پر جاری وساری ہے۔

(۳) باب میں مذکور بعض جملے مثلاً: اللہ تعالیٰ کی مدد سے کشتی کا صحیح سالم سفر کرنے والا کہتا ہے: ہوا سازگار تھی اور ملاح سمجھدار تھا، اس لئے بیڑا پار لگ گیا وغیرہ انکارِ نعمت شمار ہوتے ہیں۔

(۴) یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک دل میں دو متضاد چیزیں اکٹھی ہو سکتی ہیں۔



باب
شرک کی بعض مخفی صورتیں

قول اللہ تعالیٰ ﴿ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَّأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ ①

قال المصنف: قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فِي الْآيَةِ: اَلْأَنْدَادُ هُوَ الشِّرْكُ أَخْفٰى مِنْ دَبِيْبِ النَّمْلِ مَعَ صِفَاتِهِ سَوْدَاءَ فِيْ ظُلْمَةِ اللَّيْلِ وَهُوَ أَنْ تَقُوْلَ وَاللّٰهِ وَحَيَاتِكَ يَافُلَانَةُ، وَحَيَاتِيْ، وَتَقُوْلُ لَوْلَا كُلَيْبَةُ هٰذَا لَأَتَانَا اللُّصُوْصُ، وَلَوْلَا الْبَطُّ فِي الدَّارِ لَأَتَى اللُّصُوْصُ، وَقَوْلُ الرَّجُلِ لِصَاحِبِهِ: مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ، وَقَوْلُ الرَّجُلِ: لَوْلَا اللّٰهُ وَفُلَانٌ ـ لَا تَجْعَلْ فِيْهَا فُلَانًا هٰذَا كُلُّهُ بِهِ شِرْكٌ. ②

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے: ''انداد'' سے مراد شرک ہے جو رات کے اندھیرے میں سیاہ پتھر پر چیونٹی کے چلنے سے بھی زیادہ مخفی ہے مثلاً یوں کہنا: ''مجھے اللہ کی قسم اور فلاں عورت کی زندگی کی قسم، مجھے اپنی جان یا زندگی کی قسم، اگر گھر میں کتیا نہ ہوتی تو ہمیں چور آ لیتے اگر گھر میں بطخ نہ ہوتی تو چور داخل ہو جاتا۔'' یا کسی سے یہ کہنا ''جو اللہ تعالیٰ چاہے اور آپ چاہیں'' اور آدمی کا یوں کہنا ''اگر اللہ تعالیٰ اور فلاں نہ ہوتے'' (تو میرا یہ نقصان ہو جاتا) اس قسم کی باتیں شرک ہیں، تم ان امور میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ (رواہ ابن ابی حاتم)

اس باب کو سابقہ باب کا ملاحقہ اور تتمہ قرار دیا جائے سابقہ باب کی طرح یہاں بھی مؤلف رحمہ اللہ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ حقیقتِ توحید تک پہنچنے کیلئے ضروری ہے کہ ایسے الفاظ کے استعمال سے مکمل احتراز اور اجتناب کیا جائے جن میں کسی نوع میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک پایا جاتا ہو، خواہ ان الفاظ میں پایا جانے والا شرک، متکلم کا مقصود نہ بھی ہو، بلکہ بعض اوقات نادانستہ اور بلا قصد وہ الفاظ زبان پر آ جاتے ہوں، پھر بھی ان کا استعمال ناجائز ہے۔

شرک چیونٹی کی آہٹ سے بھی زیادہ مخفی ہے

قولہ: قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فِي الْآيَةِ: اَلْأَنْدَادُ هُوَ الشِّرْكُ ......

یہاں مؤلف رحمہ اللہ نے سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک اثر نقل فرمایا ہے، جسے امام ابن ابی حاتم نے بسند جید روایت کیا ہے، یہ اثر درحقیقت اللہ تعالیٰ کے فرمان:

---

① (البقرۃ:۲۲)

② اس کی سند حسن ہے: اسے امام ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔ دیکھئے: ابن کثیر (۱/۵۷)۔

﴿ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَّأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾

''یعنی تم اللہ تعالیٰ کے انداد مقرر نہ کرو اور تم جانتے ہی ہو'' میں لفظ ''انداد'' کی تشریح کے سلسلہ میں ہے۔ یعنی وہ بتانا چاہتے ہیں کہ انسان باتوں ہی باتوں میں کس طرح اللہ تعالیٰ کا ند (یعنی ہم مثل) وشریک مقرر کر جاتا ہے۔ پہلے بطورِ تمہید شرک کا انتہائی مخفی ہونا واضح کیا، چنانچہ یہ بتایا کہ شرک اس سیاہ رنگ کی چیونٹی سے بھی زیادہ خفیہ طریقے سے انسان میں داخل ہوتا ہے جو سیاہ رات کی تاریکی میں سیاہ چٹان پر چل رہی ہو۔ اکثر لوگوں کو کیونکہ حقیقتِ توحید کی کماحقہ معرفت نہیں ہوتی لھذا وہ شرک کے وار کو محسوس ہی نہیں کر پاتے، بہت کم لوگوں کو اللہ تعالیٰ شرک کے حملوں سے محفوظ رہنے کی توفیق دیتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے شرک کے اس قدر مخفی ہونے کو نبی ﷺ کی اس حدیث سے لیا ہے

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ایک دن رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

''اے لوگو! اس شرک سے بچو اور چوکنے ہو کر رہو کہ جو شرک چیونٹی کی آہٹ سے بھی زیادہ مخفی ہے۔''

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! جب یہ چیونٹی سے بھی زیادہ مخفی ہے تو پھر ہم کس طرح بچیں؟

فرمایا: یوں دعا کیا کرو:

" أَللّٰهُمَّ إِنَّا نَعُوْذُ بِكَ أَنْ نُشْرِكَ بِكَ شَيْئًا نَعْلَمُهُ وَنَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا نَعْلَمُهُ " ①

''اے اللہ! ہم جانتے بوجھتے شرک کرنے سے تیری پناہ چاہتے ہیں، اور جو شرک ہم سے نادانستہ ہو جائے اس سے توبہ واستغفار کرتے ہیں......'' (مسند احمد، طبرانی)

چھ جملے جن میں شرک پایا جاتا ہے ......

اس کے بعد سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بطور مثال چھ جملے ذکر فرمائے ہیں، جن میں واضح طور پر شرک پایا جاتا ہے، مگر ان کا استعمال لوگوں کی زبانوں پر عام ہے۔

(۱) " وَاللّٰهِ وَحَيَاتِكَ يَا فُلَانَةُ " مجھے اللہ کی قسم، اور فلاں عورت مثلاً: (ماں، بہن، بیٹی یا دیگر) کی جان یا زندگی کی قسم۔

(۲) " وَحَيَاتِيْ " مجھے اپنی جان یا اپنی زندگی کی قسم۔

① طرق وشواہد کی بناء پر حسن ہے: مسند احمد: (۱۹۶۲۵/۷) طبرانی اوسط وکبیر، مجمع الزوائد: (۲۲۳/۱۰) الادب المفرد للبخاری (۷۱۶)۔

ان دونوں جملوں میں غیر اللہ کی قسم کھائی گئی ہے، غیر اللہ کی قسم شرک ہے اس کا تفصیلی بیان اگلے صفحات میں ایک مستقل باب کے تحت آئے گا۔

(۳) " لَوْلَا كُلَيْبَةُ هٰذَا لَأَ تَانَا اللُّصُوْصُ "اگر گھر میں کتیا نہ ہوتی تو چور ہمیں لوٹ کر برباد کر جاتے ......اس مثال میں ایک شخص کے چوروں سے محفوظ رہنے کی نسبت کتیا کی طرف ہے، جو چوروں کو دیکھ کر بھونکی، جس سے گھر والوں کی آنکھ کھل گئی، جنہیں دیکھ کر چور بھاگ گئے۔

ابن ابی الدنیا نے ''کتاب الصمت'' سیدنا میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کو ان الفاظ سے روایت کیا ہے: تم لوگ شرک کرتے ہو، حتی کہ اپنے کتے کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا دیتے ہو، یعنی یوں کہتے ہو: اگر کتا نہ ہوتا تو رات ہم چوروں کے ہاتھوں لٹ جاتے۔

(۴) ''چوتھا قول بھی اس سے ملتا جلتا ہے "لَوْلَا الْبطُّ فِی الدَّارِ لَأَ تَی اللُّصُوْصُ'' اگر گھر میں بطخ نہ ہوتی تو چور داخل ہو جاتے۔

بطخ گھروں کا پاک پالتو جانور ہے، جو کسی اجنبی کو دیکھ کر چیختا اور شور مچاتا ہے، لوگ چوری سے بچانے کی نسبت بطخ کی طرف کر دیتے ہیں، (پچھلی مثال میں نسبت کتے کی طرف کر دی گئی)

اس قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے غافل ہیں:

﴿ قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ ①

''ان سے پوچھیئے کہ رحمٰن سے، دن اور رات تمہاری حفاظت کون کرتا ہے؟ بات یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے رب کے ذکر سے پھرے ہوئے ہیں''

(۵) آدمی کا اپنے دوست سے یوں کہنا: "مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ" یعنی جو اللہ تعالیٰ چاہے اور آپ چاہیں۔ گویا دوست کو باعتبار مشیت اللہ تعالیٰ کا شریک بنا دیا گیا......اس جملے کے تعلق سے اگلے صفحات میں تفصیلی کلام آرہا ہے۔ ان شاء اللہ

(٦) آدمی کا یوں کہنا "لَوْلَا اللّٰهُ وَفُلَانٌ" یعنی اگر اللہ تعالیٰ اور فلاں نہ ہوتے (تو میرا یہ نقصان ہو جاتا) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اس جملے میں لفظ ''فلاں'' مت رکھو، کیونکہ اس طرح تم اس ''فلاں'' کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا دو گے، بلکہ صرف یوں کہو ''لَوْلَا اللّٰهُ وَحْدَهُ'' یعنی اگر اللہ تعالیٰ نہ ہوتا، یا اس کی مدد و توفیق نہ ہوتی، وغیرہ۔ =

① (الانبیاء: ٤٢)

قال:وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ كَفَرَ أَوْأَشْرَكَ " (رواه الترمذی وحسنه وصححه الحاكم) ①

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے کفر کیا'' (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن کہا ہے جب کہ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے)

=

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: یہ جملے اور اس قسم کے دیگر جملے شرک کے مخفی الفاظ پر مشتمل ہیں، ان الفاظ کا استعمال اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک شمار ہوتا ہے۔

غیر اللہ کی قسم کھانا شرک ہے

وقوله:وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "مَنْ حَلَفَ ......

مستدرک حاکم کی ایک اور حدیث میں یہ الفاظ ہیں: ''غیر اللہ کی ہر قسم شرک ہے''

اور بھی بہت سی احادیث غیر اللہ کی قسم کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً صحیح بخاری و مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" أَلا إِنَّ اللّٰهَ يَنْهَاكُمْ أَنْ تَحْلِفُوْا بِاٰبَائِكُمْ مَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللّٰهِ أَوْلِيَصْمُتْ " ②

''خبردار اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے آباء واجداد کی قسمیں کھانے سے منع فرماتا ہے، جو بھی شخص قسم کھانا چاہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے''

سنن ابی داؤد میں سیدنا بریدۃ الاسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے امانت کی قسم کھائی وہ ہم میں سے نہیں ہے'' ③

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول (جو مذکور ہوا) بھی اس پر دلیل ہے۔اس کے علاوہ امت کے تمام علماء کا اتفاق ہے کہ قسم صرف اللہ تعالیٰ کے ذاتی یا صفاتی ناموں پر ہوسکتی ہے۔

حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے بھی غیر اللہ کی قسم کے ناجائز ہونے پر اجماع امت ذکر کیا ہے۔بعض متاخرین کا

---

① اسناده صحيح: مسنداحمد: (٦٠٧٩/٢) سنن ابی داؤد: (٣٢٥١) سنن الترمذی: (١٥٣٥) سنن الكبرىٰ، للبيهقی: (٢٩/١٠) صحيح ابن حبان: (١١٧٧)

② (صحيح بخاری وصحيح مسلم)

③ حسن: مسند احمد: (٢٣٠٤١/٩) مستدرك الحاكم: (٢٩٨/٤) امام حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔

غیر اللہ کی قسم کو محض کراہت تنزیہی پر محمول کرنا انتہائی حیرت ناک ہے، کیونکہ جس چیز کو نبی ﷺ نے شرک اور کفر سے تعبیر فرمایا ہے وہ مکروہ نہیں بلکہ علی الاطلاق حرام ہوا کرتی ہے۔ لھذا بعض متأخرین کا کراہت پر مبنی یہ قول باطل ہوا، اور اس اجماع کی صحت پر کوئی اثر انداز نہ ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ غیر اللہ کی سچی قسم کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ گویا حلف بغیر اللہ جھوٹ سے بھی بڑا گناہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا مخلوق کی قسم کھانے کا جواب

ایک سوال: اللہ تعالیٰ نے بھی تو کلام پاک میں مخلوقات کی قسمیں بیان فرمائی ہیں؟

جواب: یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے کہ وہ اپنی قدرت کاملہ، وحدانیت، الوہیت، علم وحکمت اور دیگر صفاتِ کمال کے پیشِ نظر اپنی مخلوق میں سے کسی کی بھی قسم کا ذکر کرسکتا ہے، لیکن مخلوق کیلئے صرف خالق ہی کی قسم فرض اور معین ومتعین ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غیر اللہ کی قسم سے روک دیا ہے، لھذا ہمارا اس حکم کے سامنے سرِ خم تسلیم کرنا ہی باعثِ سعادت ہے۔

مطرف بن عبداللہ کا قول ہے: اللہ تعالیٰ نے بعض چیزوں کی قسم کھائی تاکہ مخلوق کے سامنے ان کی منزلت واضح ہوجائے، پھر چونکہ ان اشیاء کا مقام ومرتبہ لوگوں کی نگاہوں میں بلند ہوتا ہے لھذا اللہ تعالیٰ انکی قسم کے ذریعے اپنی قدرت کا اظہار فرماتا ہے اور یہ بھی مقصود ہوتا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ان تمام اشیاء کا خالق ہے۔ (ابن جریر)

نبی ﷺ کا غیر اللہ کی قسم کھانا اور اس کی حقیقت

ایک اور سوال: بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ نبی ﷺ نے بھی غیر اللہ کی قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ مثلاً وہ دیہاتی جس نے آپ سے امورِ اسلام کی بابت دریافت کیا تھا، اور آپ نے اسے جواب دیا اور آخر میں فرمایا: "أَفْلَحَ وَأَبِيْهِ إِنْ صَدَقَ"

''مجھے اس کے باپ کی قسم! اگر یہ سچ بول رہا ہے تو ضرور کامیاب ہوگا''

جوابات:

اس سوال کا پہلا جواب: بقولِ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ یہ ہے کہ ''وابیہ'' کا لفظ غیر محفوظ ہے۔ کیونکہ اس لفظ کو راوی اسماعیل بن جعفر سے اس کے بعض تلامذہ نے ''أَفْلَحَ وَاللّٰهِ إِنْ صَدَقَ'' بھی روایت کیا ہے۔ اور بہتر یہی ہے۔ کیونکہ "أَفْلَحَ وَأَبِيْهِ" کے الفاظ کو صحیح حدیث نے بڑی صراحت سے رد کیا ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کی روایت میں تو اصلاً یہ الفاظ موجود ہی نہیں۔

دوسرا جواب: بعض علماء نے اسکا جواب یوں دیا ہے کہ اس قسم کے الفاظ اہلِ عرب کی زبانوں پر جاری ہو جایا کرتے تھے، جس سے ان کا ارادہ قسم کا بالکل نہیں ہوا کرتا تھا۔ لیکن یہ جواب اتنا پسندیدہ نہیں ہے، کیونکہ شریعت نے غیر اللہ کی قسم سے مطلقاً روکا ہے، خواہ قسم کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔ اور اگر بلا ارادہ قسم غیر اللہ کی قسم جائز ہے تو اس کیلئے ایک مستقل دلیل چاہیئے، جو قطعاً نہیں مل سکتی۔

تیسرا جواب: بعض علماء نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ اہلِ عرب اس قسم کے الفاظ برائے تاکید ادا کرتے تھے، برائے تعظیم نہیں۔ لیکن یہ جواب بھی کوئی خاص معقولیت نہیں رکھتا، چونکہ شریعت نے غیر اللہ کی قسم سے بغیر کسی قید کے منع کر دیا ہے، تاکید یا تعظیم کی تفریق کسی حدیث سے ثابت نہیں۔ ومن ادعی فعلیه بیان اور پھر قسم میں محلوف علیہ کی تاکید سے اس کی تعظیم بھی تو ہو ہی جاتی ہے۔

چوتھا جواب: ایک جواب یہ بھی ہے کہ غیر اللہ کی قسم کا جائز ہونا شروع اسلام میں تھا، پھر منسوخ ہو گیا تھا۔ لھذا جواز کی تمام احادیث نسخ سے پہلے پر محمول کی جائے گی۔ اس جواب کو بہت سے شارحین نے پسند کیا ہے، اور بہت سی احادیث کے مطالعہ سے بھی اس جواب کی تائید ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ زیرِ بحث حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کی قسم کفر اور شرک ہے۔ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے بعض علماء نے یہ کہد یا کہ غیر اللہ کی قسم کھانے والا کافر اور مشرک ہو جاتا ہے، لھذا ایسے شخص کو جس نے غیر اللہ کی قسم اٹھالی دوبارہ کلمہ پڑھ کر تجدید اسلام کی ضرورت ہے، کیونکہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ لات وعزی کی قسم اٹھا بیٹھے، تو نبی ﷺ نے فوراً "لاالٰہ الااللہ" پڑھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ فرمایا: "لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریك له" پڑھو، پھر اپنی بائیں طرف تین مرتبہ تھوکو، اور اللہ تعالی کی پناہ چاہو اور آئندہ ایسے ہرگز نہ کرنا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی قسم کفرِ صریح ہے، جو ملتِ اسلامیہ سے خارج کر دیتی ہے۔

جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ غیر اللہ کی قسم کو اگر چہ کفر اور شرک سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن یہ ایسا کفر نہیں جو ملتِ اسلامیہ سے خارج کر دے، بلکہ یہ شرکِ اصغر ہے۔ جیسا کہ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے۔ اور نبی ﷺ کا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو لات وعزی کی قسم کھانے پر "لاالٰہ الا اللہ" پڑھنے کا حکم دینا تجدیدِ اسلام نہیں تھا، بلکہ غیر اللہ کی قسم کا کفارہ ادا کرنے کیلئے تھا۔

=

قَالَ : قَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ ﷺ لَأَنْ أَحْلِفَ بِاللّٰهِ كَاذِبًا أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَحْلِفَ بِغَيْرِهِ صَادِقًا . ①

سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷺ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم کھانا میرے نزدیک غیر اللہ کی سچی قسم کھانے سے بہتر ہے۔''

قال:وعن حذيفة عن النبي ﷺ قال:"لا تَقُوْلُوْا مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ فُلَانٌ وَلٰكِنْ قُوْلُوْا مَاشَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ شَاءَ فُلَانٌ "(رواه ابو داؤد بسند صحيح)

سیدنا حذیفہ بن یمان ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس طرح نہ کہو: کہ جو اللہ تعالیٰ چاہے اور فلاں چاہے، بلکہ اس طرح کہہ سکتے ہو کہ جو اللہ تعالیٰ چاہے اور اس کے بعد جو فلاں چاہے'' (اس حدیث کو ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

=

قبر پرستوں کا ایک شرکِ اکبر

البتہ قبر پرستوں کی ایک عجیب روش دیکھنے میں آئی ہے جو یقیناً شرکِ اکبر ہے، وہ روش یہ ہے کہ جب ان سے کسی بات پر اللہ تعالیٰ کی قسم مانگی جائے تو وہ فوراً اٹھانے کو تیار ہو جاتے ہیں، خواہ وہ قسم سچی ہو یا جھوٹی، لیکن اگر اُن سے اُن کے شیخ یا پیر یا اس کی قبر کی قسم طلب کی جائے تو پھر سوچ میں پڑ جاتے ہیں، اور جھوٹے ہونے کی صورت میں قسم دینے سے ڈرتے ہیں، تو اس کا معنی یہ ہوا کہ ان کے دلوں میں اپنے پیر یا شیخ کا رعب وجلال اللہ تعالیٰ کے خوف سے بھی زیادہ ہے۔ یہ بلاشبہ شرکِ اکبر ہے۔

حدیثِ زیرِ بحث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی قسم کا کوئی کفارہ یا تعزیر وغیرہ نہیں ہے، البتہ کلمۂ توحید کا اقرار اور اپنے اس فعل پر استغفار کر لینا ضروری ہے، جو ادائیگی کفارہ کے مترادف ہے۔

وقوله : قَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ ﷺ لَأَنْ أَحْلِفَ بِاللّٰهِ كَاذِبًا أَحَبُّ إِلَيَّ ......

سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷺ اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم کو غیر اللہ کی سچی قسم پر ترجیح دی، وجہِ ترجیح واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قسم توحید ہے اور غیر اللہ کی قسم شرک ہے۔ توحید اور صدق یا شرک اور کذب کا موازنہ کیا جائے تو ظاہر ہے کہ توحید کا ثواب، صدق کے ثواب سے زیادہ ہے، اور کذب کا گناہ شرک کے گناہ سے ہلکا ہے۔ گویا ان کے قول میں اس بات کی دلیل ہے کہ غیر اللہ کی سچی قسم اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم سے زیادہ خطرناک ہے۔

① صحيح : عبدالرزاق : (٤٦٩/٨) طبرانی کبیر : (٨٩٠٢) دیکھئے : المجمع الزوائد : (١٧٧/٤) ۔

قَالَ: وَجَاءَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ النَّخْعِيْ أَنَّهُ يَكْرَهُ أَنْ يَقُوْلَ الرَّجُلُ :أَعُوْذُ بِاللّٰهِ وَبِكَ . وَيَجُوْزُ أَنْ يَقُوْلَ: بِاللّٰهِ ثُمَّ بِكَ ۔قَالَ:وَيَقُوْلُ لَوْلَا اللّٰه ثُمَّ فُلَانٌ ، وَلَا تَقُوْلُ: لَوْلَا اللّٰهُ وَفُلَانٌ .

(عبدالرزاق ، ابن ابی الدنیا)

ابراھیم النخعی رحمہ اللہ کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی آدمی کے یوں کہنے کو مکروہ گردانتے ہیں کہ ''میں اللہ تعالیٰ کی اور آپ کی پناہ چاہتا ہوں'' البتہ یوں کہنا جائز سمجھتے تھے کہ ''میں پہلے اللہ تعالیٰ کی اور پھر آپ کی پناہ کا طالب ہوں'' اسی طرح یوں کہنا درست ہے کہ '' اگر اللہ تعالیٰ اور پھر (اس کے بعد) فلاں شخص نہ ہوتا تو ......'' لیکن یوں نہ کہو'' اگر اللہ تعالیٰ اور فلاں نہ ہوتا تو ......۔

وقوله : وَجَاءَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ النَّخْعِيْ أَنَّهُ يَكْرَهُ ......

اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ''واو'' چونکہ مطلق جمع کا معنی دیتی ہے، لھذا اس میں اللہ تعالیٰ اور غیر اللہ کے درمیان جمع کا مفہوم متوہم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ اور اپنے نام کو ایک ضمیر میں جمع کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور اس کے برعکس ثم ترتیب اور تأخر کا معنی دیتا ہے، لھذا اس کے استعمال میں کوئی مانع نہیں ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے فرمان کے مطابق ان تمام آثار اور احادیث کو یہاں ذکر کرنے کا مقصد واضح ہے، اور وہ ہے شرکِ اصغر کے شائبہ سے بھی اجتناب کرنے کی تلقین و ہدایت۔

نوٹ: حدیث حذیفہ رضی اللہ عنہ پر مفصل بحث باب ''ماشاء اللہ وشئت'' میں ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ



اس باب کے مسائل

(۱) سورۃ التوبہ کی آیت:﴿ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا..... ﴾ کی تفسیر معلوم ہوئی۔ اور خاص طور پر لفظ انداد کی تشریح۔

(۲) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شرکِ اکبر کے بارہ میں نازل ہونے والی آیت کو شرکِ اصغر پر بھی محمول فرمالیا کرتے تھے۔ (سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول دیکھیئے)

(۳) غیر اللہ کی قسم شرک ہے۔

(۴) غیر اللہ کی سچی قسم اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم سے زیادہ خطرناک اور قبیح ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم میں صرف جھوٹ بولنے کا گناہ ملے گا جبکہ غیر اللہ کی قسم میں شرک کی چھاپ لگ جائے گی۔

(۵) واؤ (برائے جمع) اور "ثُمَّ" (برائے ترتیب) کا لفظی و معنوی فرق واضح ہوگیا۔ چنانچہ عبارت میں "واو" اور "ثم" کے استعمال سے کلام کی معنویت میں بہت بڑی تبدیلی آچکی ہے کما تقدم۔



باب ماجاء فی من لم یقنع بالحلف باللہ

جو شخص اللہ تعالیٰ کی قسم کے بعد بھی راضی نہ ہو

قال:عن ابن عمر أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:" لَا تَحْلِفُوْا بِآبَائِكُمْ ، مَنْ حَلَفَ بِاللّٰهِ فَلْيَصْدُقْ ، وَمَنْ حُلِفَ لَهُ بِاللّٰهِ فَلْيَرْضَ ، وَمَنْ لَمْ يَرْضَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ " ①

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اپنے آباء واجداد کی قسمیں نہ کھاؤ، جو شخص اللہ تعالیٰ کی قسم کھائے تو وہ سچ کہے، اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی قسم دی جائے تو وہ اُس پر مطمئن اور راضی ہو جائے، جو راضی نہ ہو اُس کا اللہ تعالیٰ سے کوئی واسطہ نہیں۔" (ابنِ ماجہ)

اس باب میں اس شخص کی وعید مذکور ہے جو اپنے بھائی کے قسم کھا لینے کے باوجود مطمئن اور راضی نہ ہو، کیونکہ اُس نے تو اللہ تعالیٰ کی قسم کھالی، لیکن اس شخص کا راضی نہ ہونا اُس کے جنابِ ربوبیت میں قلتِ تعظیم پر دلالت کرتا ہے، جو دل اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلالت اور عزت وکبریائی سے لبریز ہو وہ ایسا ہرگز نہیں کرسکتا۔

آباء واجداد کی قسم کھانے کی ممانعت

واضح ہو کہ حدیث کے یہ الفاظ سنن ابنِ ماجہ کے ہیں، جس کی سند امام مسلم کی شرط پر ہے، جبکہ اس حدیث کی اصل بخاری ومسلم میں موجود ہے۔

اس حدیث میں باپ دادا (یعنی ہر غیر اللہ) کی قسم کی نہی اور ممانعت وارد ہے، جس کا حکم گزشتہ باب میں ذکر ہو چکا ہے۔

اس حدیث نے اس امر کو بھی متعین اور فرض کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی سچی قسم کھانی چاہیئے، سچ بولنا تو ویسے بھی واجب ہے خواہ قسم نہ بھی کھائی جائے، قسم کھانے کے بعد تو سچ بولنا اور زیادہ ضروری اور مؤکد ہو جائے گا، یا یوں کہہ لیں کہ قسم کھائے بغیر بھی جھوٹ بولنا حرام ہے، لیکن قسم کھا کر جھوٹ بولنے کی حرمت وشناعت مزید بڑھ جائے گی۔

اس حدیث سے اس بات کا وجوب بھی ثابت ہوا کہ جس شخص سے قسم طلب کی جائے اور وہ قسم کھا لے، تو اس پر راضی ہونا ضروری ہے، جو شخص اس قسم پر راضی نہیں ہوگا وہ حدیث میں مذکور وعیدِ شدید کا نشانہ بنے گا، وہ وعید حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ کے قول کے مطابق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے برأت ولاتعلقی فرمالے گا۔

---

① حسن: سنن ابن ماجه: (٢١٠١) اسے امام ذھبی نے "المغنی" میں (٥٨١٦) اور امام ابن حجر رحمہ اللہ نے "فتح الباری" (٥٣٦/١١) میں حسن کہا ہے۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ایک چھوٹا سا واقعہ

صحیح بخاری میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا ایک چھوٹا سا واقعہ منقول ہے: ''انہوں نے ایک شخص کو چوری کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: تم نے چوری کی ہے؟ اس شخص نے کہا: "كَلَّا ، وَاللّٰهِ الَّذِیْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ" یعنی: ''بالکل نہیں، اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔'' تو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَكَذَّبْتُ عَيْنِيْ" یعنی: ''میں اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہوں اور اپنی آنکھوں کو جھوٹا قرار دیتا ہوں۔'' ①

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے اس فرمان کی کئی توجیہات کی گئی ہیں، سب سے عمدہ توجیہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کی قرار دی گئی ہے، وہ فرماتے ہیں:

'' سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے دل میں اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا مقام تھا کہ وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم کھالے، اب معاملہ بایں جا رسید کہ یا تو قسم کھانے والے کو متہم قرار دیتے، یا اپنی نگاہوں کو متہم قرار دیتے، لیکن چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے دل میں اللہ رب العزت کا انتہائی اونچا اور اعلیٰ مقام جاگزیں تھا، لھذا اس شخص کہ جسے چوری کرتے ہوئے آپ نے خود دیکھا، کی قسم سن کر اس کی تکذیب نہ کر سکے، بلکہ اپنی آنکھوں کو جھٹلا دیا۔ یہ معاملہ آدم علیہ السلام کے واقعہ سے ملتا جلتا ہے، جنہوں نے ابلیس کی جھوٹی قسم کو سچ تسلیم کرلیا۔'' (یہ اللہ رب العزت کی جناب میں حُسنِ ادب و تعظیم کا عظیم الشان مظاہرہ ہے)



① (صحیح بخاری، کتاب أحادیث الانبیاء، الرقم: ٣٤٤٤) صحیح مسلم، کتاب الفضائل، الرقم: ٢٣٦٨)

اس باب کے مسائل

(۱) اس حدیث سے آباء واجداد کی قسم کھانے کی ممانعت ثابت ہوئی۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی قسم لینے والے کو چاہیئے کہ وہ اس قسم کو تسلیم کرلے، اور معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے۔

(۳) اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی قسم لینے کے بعد بھی راضی نہ ہو، اس کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں۔



باب قول : مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ

جو اللہ تعالیٰ چاہے اور تو (ﷺ) چاہے، کہنے کا حکم

قال:عَنْ قُتَيْلَةَ أَنَّ يَهُودِيًّا أَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ:"إِنَّكُمْ تُشْرِكُونَ تَقُولُونَ: مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ، وَتَقُولُونَ :وَالْكَعْبَةِ فَأَمَرَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا أَرَادُوْا أَنْ يَحْلِفُوا أَنْ يَقُولُوا: وَرَبِّ الْكَعْبَةِ وَأَنْ يَقُولُوا: مَاشَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ شِئْتَ" (رواه النسائي وصححه) ①

سیدہ قتیلہ (بنت صیفی الجہنیة) رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: ایک یہودی نبی ﷺ کے پاس آیا اور کہا: ''تم (مسلمان) بھی شرک کرتے ہو؛ کیونکہ تم یوں کہتے ہو: جو اللہ چاہے اور تم چاہو اور یوں بھی کہتے ہو: کعبہ کی قسم۔ تو نبی ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا: ''کہ جب وہ قسم کھانے کا ارادہ کریں تو یوں کہا کریں: کعبہ کے رب کی قسم، اور یوں کہا کریں: جو اللہ تعالیٰ چاہے (اسکے بعد) پھر جو آپ چاہیں''
(اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے)

اس باب میں یہ بتایا جائے گا کہ کیا اس طرح کہنا جائز ہے؟ اگر جائز نہیں تو کیا اس پر شرک کا اطلاق ہوسکتا ہے؟

''ماشاء اللہ وشئت'' کہنا اور کعبۃ اللہ کی قسم کھانا شرک ہے

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ (مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ یعنی ''جو اللہ تعالیٰ چاہے اور تو چاہے'' کہنا شرک ہے۔ کیونکہ اس یہودی نے نبی ﷺ کے سامنے ان الفاظ کے استعمال پر شرک کا حکم لگایا اور نبی ﷺ نے اس کی تردید نہیں فرمائی بلکہ ان الفاظ کا شرک ہونا تسلیم کرلیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان الفاظ کے استعمال سے منع فرمایا، اور اسکے عوض میں دوسرے الفاظ کی طرف رہنمائی فرمائی جو شرک سے بعید ہیں۔

یہ حدیث بہت سے فوائد کی حامل ہے۔ بنیادی اور انتہائی قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ یہودیوں کو شرکِ اصغر کی بھی کتنی معرفت تھی جبکہ آج کل اسلام کے بعض دعویدار ''شرکِ اکبر'' کے مفہوم سے بھی نابلد ہیں، غیر اللہ کو پکارتے ہیں، ان کے نام کا ذبح کرتے ہیں، نذر و نیاز دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ عین توحید ہے۔ تو ایسی صورت میں کیا یہ یہودی ان نام نہاد مسلمانوں سے بہتر نہیں ہے؟

=

① صحیح: مسند احمد: (۲۷۱۶۱/۱۰) سنن النسائی، کتاب الأیمان والنذور (۶/۷)۔

قَالَ: وله أيضا عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ: مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ۔ قَالَ: "أَجَعَلْتَنِي لِلّٰهِ نِدًّا، مَاشَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ" ①

امام نسائی نے "عمل الیوم واللیلة" میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت بھی ذکر کی ہے کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ سے کہا: جو اللہ چاہے اور آپ بھی چاہیں۔ تو اس پر نبی ﷺ نے فرمایا: "کیا تم نے مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا دیا ہے؟ جو ایک اللہ چاہے (وہی ہوتا ہے)" (ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ کیا تم نے مجھے اللہ تعالیٰ کے برابر درجہ دے دیا)

=

یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ صرف حق کی معرفت کافی نہیں جب تک ایمان اور عمل کی دولت حاصل نہ ہو جائے ورنہ یہودی کو حق کی معرفت تھی لیکن عدمِ قبولِ حق اور عدمِ عمل کی بناء پر وہ کافر ہی رہا۔ اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی حل ہوا کہ غیر اللہ کی قسم شرک ہے اور اس کی بحث گزشتہ ابواب میں گزر چکی ہے۔

وقوله: وله أيضا عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ: ......

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ "جو اللہ تعالیٰ چاہے اور تو چاہے" کہنا لفظی اعتبار سے شرک کرنا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بندے کیلئے کچھ مشیت ثابت کی ہے۔ فرمایا: ﴿ لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ ﴾ ②

"اس کیلئے جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلنا چاہے"

عام استعمال ہونے والے بعض شرکیہ جملے

اب آج کل استعمال ہونے والے کچھ جملے ملاحظہ ہوں:

☆ میں اللہ تعالیٰ پر اور آپ پر بھروسہ کرتا ہوں۔

☆ میرے لئے اللہ تعالیٰ اور آپ کے سوا کوئی نہیں۔

☆ یہ نعمت اللہ تعالیٰ اور آپ کی طرف سے ملی ہے۔

☆ یہ چیز اللہ تعالیٰ اور آپ کی برکت سے حاصل ہوئی ہے۔

---

① حسن: النسائی، فی عمل الیوم واللیلة. مسنداحمد (۱/۱۸۳۹) سنن ابن ماجه (۲۱۱۷) الادب المفرد، للبخاری (۷۸۳)

② (التکویر: ۲۸)

....

....

....

....

☆ آسمان میں میرے لئے اللہ تعالیٰ ہے اور زمین پر آپ ہیں۔

☆ یہ نذر اللہ تعالیٰ کیلئے اور آپ کیلئے ہے۔ وغیرہ

اب ذرا ان جملوں میں اور اس شخص کے کہے ہوئے الفاظ ''جو اللہ تعالیٰ چاہے اور جو تو چاہے'' میں موازنہ کریں، اور دیکھ لیں، ظاہر ہے کہ یہ جملے اس شخص کے قول کی بہ نسبت زیادہ فحش اور توحید کے منافی ہیں۔ پھر یہ بھی غور کیجئے کہ اس شخص نے یہ جملہ فخرِ کائنات رسول اکرم ﷺ کے متعلق کہا تھا، جبکہ دوسرے جملے لوگ پیروں اور قبر والوں کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ تو خود رسول اللہ ﷺ کیلئے استعمال ہونے والے جملے پر آپ کا ردِ عمل کتنا شدید تھا: ''کیا تم نے مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک اور ہمسر بنا دیا ہے۔'' تو پھر آج کل کے استعمال ہونے والے جملوں پر کیا حکم لگایا جائے گا، جو استعمال بھی پیروں اور مشائخ کیلئے ہوتے ہیں، جہاں یہ بھی امکان ہے کہ وہ پیر جھوٹا ہو اور بظاہر پرہیزگار نظر آنے والا شیخ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا دشمن ہو۔

(انتہیٰ کلامہ ملخصا)

مزید غور کا مقام ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ''مَاشَاءَ اللّٰہُ وَشِئْتَ'' کہنے والے کو اتنی زبردست وعید فرمائی، تو صریح قسم کے شرکیہ اقوال و افعال انجام دینے والوں کا کیا انجام ہوگا؟

مثلاً ایک عربی شاعر کا شعر ہے:

''یہ دنیا و مافیہا آپ ﷺ ہی کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے، اور لوح و قلم کا سارا علم آپ ﷺ کے خزینۂ علوم میں شامل ہے۔''

ایک شاعر نے یوں بھی کہا:

''یہ میری بیماری ہے اور تو (ﷺ) میرا طبیب ہے، تجھ سے ہماری کوئی بیماری مخفی نہیں۔''

(لاحول ولاقوۃ الاباللہ)

قَالَ:وَلِابْنِ مَاجَةَ عَنِ الطُّفَيْلِ أَخِي عَائِشَةَ لِأُمِّهَا قَالَ:رَأَيْتُ كَأَنِّي أَتَيْتُ عَلٰى نَفَرٍ مِنَ الْيَهُوْدِ . قُلْتُ:إِنَّكُمْ لَأَنْتُمُ الْقَوْمُ لَوْلَا أَنَّكُمْ تَقُوْلُوْنَ :عَزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ. قَالُوْا:وَإِنَّكُمْ لَأَنْتُمُ الْقَوْمُ لَوْلَا أَنَّكُمْ تَقُوْلُوْنَ :مَاشَاءَ اللّٰهُ ، وَشَاءَ مُحَمَّدٌ-ثُمَّ مَرَرْتُ بِنَفَرٍ مِنَ النَّصَارٰى فَقُلْتُ :إِنَّكُمْ لَأَنْتُمُ الْقَوْمُ لَوْلَا أَنَّكُمْ تَقُوْلُوْنَ: أَلْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ، قَالُوْا وَإِنَّكُمْ لَأَنْتُمُ الْقَوْمُ لَوْلَا أَنَّكُمْ تَقُوْلُوْنَ :مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ مُحَمَّدٌ- فَلَمَّا أَصْبَحْتُ أَخْبَرْتُ بِهَا مَنْ أَخْبَرْتُ ثُمَّ أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَأَخْبَرْتُهُ ، قَالَ"هَلْ أَخْبَرْتَ بِهَا أَحَدًا؟ قُلْتُ: نَعَمْ . قَالَ: فَحَمِدَ اللّٰهَ وَأَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ: أَمَّا بَعْدُ . فَإِنَّ طُفَيْلًا رَأٰى رُؤْيَا أَخْبَرَبِهَا مَنْ أَخْبَرَمِنْكُمْ وَإِنَّكُمْ قُلْتُمْ كَلِمَةً كَانَ يَمْنَعُنِي كَذَا وَكَذَا أَنْ أَنْهَاكُمْ عَنْهَا فَلَا تَقُوْلُوْا:مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ مُحَمَّدٌ وَلٰكِنْ قُوْلُوْا:مَاشَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ" ①

ابن ماجہ میں طفیل (بن سخبرۃ) جو کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ماں کی طرف سے بھائی ہیں، فرماتے ہیں: میں نے خواب میں دیکھا کہ میرا یہودیوں کی جماعت پر گزر ہوا تو میں نے کہا: تم بہترین قوم ہو اگر تم عزیر علیہ السلام کو ''ابن اللہ'' (اللہ کا بیٹا) نہ کہو، تو یہودیوں نے جواب دیا: تم بھی بہترین قوم ہو اگر تم یوں نہ کہو: ''جو اللہ تعالیٰ چاہے اور جو محمد ﷺ چاہے۔'' پھر میں عیسائیوں کی ایک جماعت کے پاس سے گزرا تو میں نے کہا: اگر تم مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا نہ کہو تو تم بہترین قوم ہو۔ تو عیسائیوں نے جواب دیا: تم اگر یوں نہ کہو ''جو اللہ تعالیٰ چاہے اور محمد ﷺ چاہے۔'' تو تم بھی بہترین قوم ہو۔ چنانچہ جب صبح ہوئی تو میں نے بعض لوگوں کو یہ خواب سنایا، پھر نبی ﷺ کے پاس آیا اور انہیں بھی پورے قصہ سے باخبر کیا۔'' آپ ﷺ نے پوچھا: کیا کسی اور کو بھی بتایا ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان فرمائی اور پھر فرمایا: حمد و ثناء کے بعد! طفیل نے ایک خواب دیکھا ہے جو تم میں سے بعض کو بیان بھی کر چکا ہے، تم لوگ یہ الفاظ "مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ مُحَمَّدٌ" کہا کرتے ہو، میں حیاء کی وجہ سے تمہیں نہیں روک سکا (لیکن اب روک رہا ہوں) چنانچہ اب یوں نہ کہنا ''مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ مُحَمَّدٌ'' بلکہ یوں کہا کرو: ''مَاشَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ'' (جو صرف ایک اللہ تعالیٰ چاہے)''

وقوله: وَلِابْنِ مَاجَةَ عَنِ الطُّفَيْلِ أَخِي عَائِشَةَ لِأُمِّهَا قَالَ: ......

① صحیح: ابن ماجه (۲۱۱۸) مسند احمد(۲۰۷۱۹/۷) سنن الدارمی (۲۹۵/۲) -

اس حدیث کی دلالت واضح ہے، اور وہ یہ کہ ''جو اللہ تعالیٰ اور فلاں چاہے'' الفاظ چونکہ شرکیہ ہیں اس لئے ان کو ادا کرنا ناجائز ہے۔

نبی ﷺ کے بہت سے اخلاقِ حمیدہ کا بھی علم ہوتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض احکام کی مشروعیت اللہ تعالیٰ نے نیک خوابوں کے ذریعہ فرمائی۔ کما بھذا الحدیث وکما فی مشروعیة الاذان



اس باب کے مسائل

(۱) یہودیوں کا شرک اصغر سے آگاہ ہونا۔

(۲) غلبۂ خواہشات کی بناء پر انسانی فہم کی حقیقت (چنانچہ یہودی حق شناس ہونے کے باوجود اپنی خواہشات کی اتباع کی وجہ سے اس کے منکر ہیں۔)

(۳) نبی ﷺ نے اس شخص کو جس نے "مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ" کہا تھا، ڈانٹتے ہوئے فرمایا تھا کہ تم نے مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک بنادیا، تو اس شخص کا انجام کیا ہوگا جو نبی ﷺ کو مخاطب کر کے یوں کہتا ہے: "مَالِیْ مَنْ أَعُوْذُ بِهٖ سِوَاكَ" آپ کے علاوہ میرے لئے کوئی جائے پناہ نہیں۔

(۴) "مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ" کے الفاظ، محض الفاظ کی حد تک شرکِ اکبر نہیں ہیں کیونکہ اگر شرک اکبر ہوتے تو نبی ﷺ بلاشرم فوراً روک دیتے۔ (لیکن اگر کوئی شخص اعتقاداً، اللہ تعالیٰ کی صفت مشیت میں کسی کو شریک سمجھتا ہے تو وہ شرکِ اکبر کا مرتکب ہے۔)

(۵) نیک خواب وحی کی ایک قسم ہے۔

(۶) نیک خواب کبھی کبھی کسی حکم کی مشروعیت کا سبب بنتا ہے۔



باب من سب الدهر فقد أذى الله

زمانے کو بُرا کہنے والا اللہ تعالیٰ کو اذیت پہنچاتا ہے

قال :وقول الله تعالیٰ: ﴿ وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴾ ①

''انہوں نے کہا کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا کی زندگی ہی ہے، ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں صرف زمانہ ہی مار ڈالتا ہے (دراصل) انہیں اس کا کچھ علم ہی نہیں یہ تو صرف (قیاس اور) اٹکل سے ہی کام لے رہے ہیں''

اگلے صفحات میں واضح کیا جائے گا کہ زمانے کو بُرا کہنا متضمنِ شرک اور کمالِ توحید کے منافی ہے۔ تو چونکہ اس موضوع کا تعلق توحید وشرک سے ہے، لہذا مؤلف رحمہ اللہ ''کتاب التوحید'' میں مستقل باب کے تحت یہ بحث لا رہے ہیں۔

اذیت پہنچانے سے مراد یہ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان کرتے ہیں، کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ﴾ ②

''کفر میں آگے بڑھنے والے لوگ تجھے غمناک نہ کریں، یقین مانو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے''

البتہ مقصد یہ ہے کہ زمانے کو بُرا کہنے والے اللہ تعالیٰ کو اذیت پہنچاتے ہیں، اور اس کے غیظ وغضب کو دعوت دیتے ہیں، کیونکہ زمانے کو پھیرنے والا اور مختلف امور میں تصرف کرنے والا صرف اللہ رب العزت ہی ہے۔

قوله :وقول الله تعالیٰ: وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا ....

آیتِ کریمہ میں دہریہ قسم کے کفار اور ان کی موافقت کرنے والے مشرکینِ عرب کے کچھ معتقدات کا ذکر ہے، چنانچہ ایک تو وہ آخرت کا انکار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ زندگی صرف دنیا ہی کی ہے، اس کے علاوہ دوسری کوئی زندگی نہیں۔ بعض فلاسفہ کا بھی یہی عقیدہ ہے اور کچھ فلسفی تو یہاں تک کہہ گئے کہ ہر (۳۶۰۰۰ سال) بعد ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹ آتی ہے اور یہی سلسلہ لامتناہی اور نہ ختم ہونے والا ہے۔

=

---

① (الجاثية: ٢٤) ② (آل عمران: ١٧٦)

قال: فی الصحیح عن أبی هریرة ﷺ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ:قَالَ اللّٰه تَعَالیٰ:"یُؤْذِیْنِی ابْنُ آدَمَ یَسُبُّ الدَّهْرَ وَأَنَا الدَّهْرُ أُقَلِّبُ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ" وفی روایة "لَا تَسُبُّوْا الدَّهْرَ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ"

صحیح بخاری میں سیدنا ابوھریرۃ ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''آدم کا بیٹا زمانے کو گالی دیکر مجھے اذیت پہنچاتا ہے، کیونکہ زمانہ، میں ہوں، رات اور دن کا نظام میں چلاتا ہوں'' اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''زمانے کو گالی نہ دو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی زمانہ ہے''(صحیح مسلم)

=

مشرکین کا دوسرا عقیدہ یہ ذکر ہوا ہے کہ: وہ اپنی موت وفناء کا سبب اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بجائے زمانہ کی گردش کو قرار دیتے تھے، اور اسی بناء پر وہ زمانے کو بُرا کہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام نظریات ومعتقدات کو محض توہمات وتخیلات قرار دیا۔ آج اگر کوئی زمانہ کو بُرا کہے گا وہ دہریہ تو نہیں بن جائے گا، لیکن زمانہ کو بُرا کہنے میں دہریہ کے ساتھ شریک ضرور ہو جائے گا۔

زمانے کو گالی دینا اللہ تعالیٰ کو ایذاء رسانی کے مترادف ہے

وقوله: فی الصحیح عن أبی هریرة ﷺ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ:قَالَ اللّٰه تَعَالیٰ:"یُؤْذِیْنِی ......

امام شافعی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''کسی بھی مصیبت کے وقت زمانے کو بُرا بھلا کہنا اہلِ عرب کی عادت بن چکا تھا، چنانچہ وہ ہر مصیبت اور دُکھ کا منبع زمانے ہی کو قرار دیتے تھے، اور یہی ان کا عقیدہ بن چکا تھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ بناء بریں کہ ہر مصیبت کا محرک وسبب زمانہ ہے تم زمانے کو گالی مت دیا کرو، کیونکہ فاعلِ حقیقی اور مسببِ حقیقی تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ تو گویا تمہارا زمانے کو بُرا کہنا، اللہ تعالیٰ کو بُرا کہنے کے مترادف ہے'' (انتہی ملخصا)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مشرکین کی دو قسمیں تھیں:

ایک وہ مشرکین جو زمانے ہی کو فاعلِ حقیقی تصور کرتے تھے، اور اسی بناء پر کسی نقصان کے لاحق ہونے پر زمانے کو گالیاں دیتے تھے۔ یہ دہریہ ہیں۔

دوسرے وہ مشرک جو مدبر اور مسبب تو اللہ تعالیٰ ہی کو جانتے تھے، لیکن زمانے کو بُرا اس لئے کہتے تھے کہ زمانہ میں رہتے ہوئے ان پر مصائب وآلام نازل ہوتے ہیں۔

بہرحال حدیث شریف نے علی الاطلاق زمانہ کو بُرا کہنے سے منع کر دیا، خواہ دونوں میں سے کچھ بھی عقیدہ ہو۔

زمانے کو بُرا کہنے کی تین خرابیاں

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: زمانے کو بُرا کہنے میں تین خرابیاں ہیں:

(۱) بلا وجہ اور بلا قصور زمانے کو گالیاں دینا، کیونکہ زمانہ تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے جو اس کے احکام کے تابع ہے تو چونکہ زمانہ اس گالی کا مستحق نہیں ہے، لہذا گالی دینے والا ہی اس گالی کا صحیح مستحق ٹھہرے گا۔

(۲) زمانہ کو بُرا کہنا متضمن شرک ہے، کیونکہ کسی تکلیف کے موقع پر زمانہ کو بُرا کہنے والے کا یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ زمانہ ہی اس تکلیف کا خالق ہے، حالانکہ نفع ونقصان صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

(۳) زمانے کو بُرا کہنا، اللہ تعالیٰ کو بُرا کہنے کے مترادف ہے، کیونکہ زمانہ کے اختیار میں تو کوئی چیز نہیں، اصل مسبب ومختار تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اسی وجہ سے احادیث میں زمانہ کو بُرا کہنا اللہ تعالیٰ کو ایذاء پہنچانے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

بہر حال زمانہ کو بُرا کہنے والا ان دو مہالک میں سے کسی ایک کی زد میں ضرور ہے، یا تو وہ اللہ تعالیٰ کو گالی دے رہا ہے، یا وہ اس کے ساتھ شرک کر رہا ہے، کیونکہ اگر اس کا عقیدہ یہ ہے کہ مجھے پہنچنے والے مصائب کا فاعل زمانہ ہے تو یہ شرک ہے، اور ایسا عقیدہ رکھنے والا مشرک ہے، اور اگر اس کا عقیدہ یہ ہے کہ ان مصائب کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور پھر وہ ان مصائب کے مسبب کو گالی دے تو یہ اللہ تعالیٰ کو گالی دینا ہوا (والعیاذباللہ)

اس حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ نے " وَأَنَا الدَّهْرُ " فرمایا جس کا معنی ہے کہ زمانہ کا مالک میں ہوں اور جن امور کو وہ زمانہ کی طرف منسوب کرتے ہیں ان کا مدبّر ومسبب میں ہوں، لہذا جس کسی نے زمانہ کو اس بناء پر گالی دی کہ وہ ان امور کا خالق ہے تو اس کی گالی اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ جائے گی، کیونکہ فاعل اور خالق تو اسی کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو زمانہ کو صرف ان امور کا محل اور مقام بنایا ہے، اسی لئے ایک حدیث میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا:-

''میں زمانہ ہوں رات اور دن کو میں پھیرتا ہوں''

مسند احمد کی ایک حدیث میں یہ فرمان بھی منقول ہے: ''تم زمانہ کو گالی نہ دو کیونکہ زمانہ تو اللہ تعالیٰ ہے، راتوں اور دنوں کو میں ہی پھیرتا ہوں، اور ایک بادشاہ کے بعد دوسرا بادشاہ میں ہی لاتا ہوں'' ①

اس تقریر سے واضح ہوا کہ "الدھر" اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے نہیں ہے۔ حافظ ابن حزم رحمہ اللہ نے "الدھر" کو اللہ تعالیٰ کا نام شمار کر کے غلطی کی ہے۔

① مسند احمد: (۱۰۳۷۱/۳، ۱۰۴۸۴) امام ہیثمی فرماتے ہیں: حدیث کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ مجمع الزوائد (۷۱/۸).

اس باب کے مسائل

(۱) زمانہ کو بُرا بھلا کہنے کی ممانعت۔

(۲) زمانہ کو گالی دینا، اللہ تعالیٰ کو ایذاء پہنچانا ہے۔

(۳) نبی ﷺ کے فرمان: "فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ" پر غور وفکر کرنا۔ (جس کا مفہوم لکھ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی زمانہ کا مالک ومختار اور متصرف ہے، لہذا زمانہ کو کسی چیز کا سبب قرار دیکر گالی دینا اللہ تعالیٰ کو ایذاء دینے کے مترادف ہے، کیونکہ فاعلِ حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔)

(۴) بعض اوقات انسان اگرچہ گالی دینے کے ارادے سے بُرے کلمات نہیں کہتا لیکن اس کے باوجود وہ گالی دینے والا ہی شمار ہوتا ہے۔ (اس کی توجیہ گزشتہ صفحات میں ملاحظہ فرمالیجئے)



باب التسمی بقاضی القضاۃ ونحوہ

''قاضی القضاۃ'' یا اس قسم کے دیگر القاب کا حکم

قال:فی الصحیح عن أبی هریرة ﷺ عن النبی ﷺ قال: "إِنَّ أَخْنَعَ اسْمٍ عِنْدَ اللّٰهِ رَجُلٌ تُسَمَّى مَلِكُ الْأَمْلَاكِ" (وزاد ابن أبی شیبة فی روایته) "لَامَالِكَ إِلَّا اللّٰه (عَزَّوَجَلَّ) قَالَ سُفْيَانُ: مِثْلُ شَاهَانِ شَاهَ ـ وَفِي رِوَايَةٍ "أَغْيَظُ رَجُلٍ عَلَى اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَخْبَثُهُ"

صحیح بخاری و مسلم میں سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''نام کے اعتبار سے وہ شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی ذلیل ترین ہے جو اپنا نام (یا لقب) ''ملک الاملاک'' رکھ لیتا ہے (یعنی بادشاہوں کا بادشاہ) کیونکہ بادشاہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔'' سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مثلاً کوئی شخص شہنشاہ کہلانے لگ جائے۔'' اور (مسلم شریف کی) ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں: ''کہ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی مبغوض اور خبیث ہے۔''

بعض اسماء یا القاب ایسے ہیں جنہیں اپنے لئے یا کسی دوسرے کیلئے اختیار کر لینا عام ہو چکا ہے، مثلاً: ''قاضی القضاۃ'' تمام قاضیوں کا قاضی، یا ''حاکم الحکام'' تمام بادشاہوں کا بادشاہ، یا ''سید الناس'' تمام لوگوں کا سردار۔

اس باب کو مؤلف رحمہ اللہ نے یہ بتانے کیلئے تجویز فرمایا ہے کہ ایسے القاب یا اسماء استعمال کرنا شرعاً ناجائز ہے دلیل ملاحظہ ہو:

قوله:فی الصحیح عن أبی هریرة ﷺ عن النبی ﷺ قال: "إِنَّ أَخْنَعَ ......

اپنے آپ کو شہنشاہ کہلوانے کی ممانعت (حدیثِ ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ)

''أَخْنَعُ'' کا معنی ذلیل ترین شخص ہے، اس سے واضح ہوا کہ یہ نام اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت ذلیل اور حقیر ہے، اور ظاہر ہے کہ اس قسم کا نام رکھ لینے والا شخص اور بھی زیادہ ذلت وحقارت کا مستحق ہے اس کی وجہ نبی ﷺ نے حدیث ہی میں واضح فرما دی ہے: ''لَا مَالِكَ إِلَّا اللّٰه'' یعنی حقیقت میں مالک تو صرف ایک اللہ کی ذات ہے، لہذا اس قسم کے نام کذب وفجور اور کفر وغلو کے علاوہ کچھ نہیں، تاریخ نے بعض سلاطین کا اس قسم کے القاب پر فخر کرنا نقل کیا ہے، اور معلوم ہے کہ ان کا انجام ان کی ذلت و بربادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے بہت زیادہ مروجہ لقب ''شہنشاہ'' کی مثال دیکر یہ امر بھی سمجھایا ہے کہ حدیث میں مذکور لقب '' ملك الاملاك ''ہی صرف مذمت کا باعث نہیں ہے، بلکہ ہر وہ لقب استعمال کرنا حرام ہے جو ''ملك الاملاك'' کا مفہوم ادا کرے۔ مثلا: ملك الملوك، سلطان السلاطین اور حاكم الحكام وغیرہ۔ اسی طرح ''قاضی القضاۃ'' کا لقب بھی ممنوع ہے، کیونکہ ''قاضی القضاۃ'' صرف وہ ذات ہوسکتی ہے جو علی الاطلاق حق کا فیصلہ کرے اور سب سے بہترین فیصلہ کرے اور یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اسی طرح سید الناس اور سید الکل کا لقب اختیار کرنا بھی درست نہیں ہے کیونکہ یہ لقب رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے، آپ کا فرمانِ مبارک ہے: ''أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ'' ①

''میں اولادِ آدم کا سردار ہوں''

واضح ہو کہ کسی مخصوص زمانے یا مخصوص شہر وغیرہ کی نسبت سے کسی کو بڑا قاضی کہا جا سکتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارہ میں فرمایا:

''أَقْضَاكُمْ عَلِيٌّ'' ''تم میں سے سب سے بڑا قاضی سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہے۔'' ②



① (صحیح بخاری، کتاب التفسیر، الرقم (٤٧١٤) صحیح مسلم، کتاب الفضائل، الرقم (٢٢٧٨)

② مرسل: رواہ عبد الرزاق عن معمر عن قتادة عن النبی ﷺ مرسلا۔ البتہ صحیح بخاری (٤٤٨١) میں عمر رضی اللہ عنہ سے موقوفا مروی ہے، ''أَقْرَؤُنَا أُبَيٌّ وَأَقْضَانَا عَلِيٌّ ......'' یعنی ''ہمارے سب سے بڑے قاری ابی اور سب سے بڑے قاضی سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہیں۔''

اس باب کے مسائل

(۱) ملك الاملاك (شھنشاہ) نام رکھنے کی ممانعت۔

(۲) اسی طرح ہر وہ نام یا لقب جو ملک الاملاک کے معنی میں ہو تو وہ بھی ناجائز ہے۔ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کے قول کا مصداق بھی یہی ہے۔

(۳) خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اس لقب اور اس قسم کے دیگر القاب میں وارد ہونے والی شرعی وعید اس شخص کیلئے بھی ہے جو ملک الاملاک کا لقب رکھ کر یقین سے یہ کہتا ہے کہ میرے دل میں اس کا اصل معنی مقصود نہیں ہے۔

(۴) یہ بات بھی بخوبی سمجھ لینی چاہیئے کہ یہ شدید ترین شرعی وعید اللہ تعالیٰ کے مقام اور اسکے عظمت وجلال کے پیشِ نظر وارد ہوئی ہے۔



باب احترام أسماء الله تعالیٰ وتغییر الاسم لأجل ذلك

اللہ تعالیٰ کے ناموں کے احترام کا بیان

اور اس احترام کی خاطر ناموں کو تبدیل کرنے کا بیان

قال:عَنْ أَبِي شُرَيْحٍ أَنَّهُ كَانَ يُسَمَّى أَبَا الْحَكَمِ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ:" إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَكَمُ ، وَإِلَيْهِ الْحُكْمُ [فَلِمَ تُكْنَى أَبَا الْحَكَمِ؟]" فَقَالَ:إِنَّ قَوْمِي إِذَا اخْتَلَفُوْا فِي شَيْءٍ أَتَوْنِي فَحَكَمْتُ بَيْنَهُمْ فَرَضِيَ كِلَا الْفَرِيْقَيْنِ فَقَالَ: [رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ] :"مَاأَحْسَنَ هٰذَا ، فَمَالَكَ مِنَ الْوَلَدِ؟"[قَالَ لِي]: شُرَيْحٌ ، وَمُسْلِمٌ ، وَعَبْدُاللّٰهِ ، قَالَ:"فَمَنْ أَكْبَرُهُمْ؟" [قَالَ]قُلْتُ :شُرَيْحٌ قَالَ:"فَأَنْتَ أَبُوالشُّرَيْحِ" ①

ابوشریح ؓ فرماتے ہیں: کہ میں ابوالحکم کے نام سے پکارا جاتا تھا، تو نبی ﷺ نے (مجھے بلاکر) فرمایا: ''بے شک حَکَم تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اسی کو فیصلہ کا اختیار ہے (تو تم نے ابوالحکم کی کنیت کیوں اختیار کی)''؟ میں نے عرض کیا: میری قوم میں جب کوئی اختلاف ہو جاتا ہے، تو وہ فیصلہ کیلئے میری پاس آتی ہے، میں فیصلہ کردیتا ہوں اور دونوں فریق اس فیصلہ کو قبول کرلیتے ہیں، تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے، اچھا یہ بتاؤ کہ آپ کے کتنے بیٹے ہیں؟'' میں نے کہا: شریح، مسلم اور عبداللہ (تین بیٹے ہیں) فرمایا: ''ان میں سے بڑا کون ہے؟'' میں نے کہا: شریح، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اب سے تمہاری کنیت ابوشریح ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے 'اسماء حسنیٰ'' کا احترام فرض ہے، اور اس احترام کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ہر وہ نام یا صفت جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے اُسے اپنے لئے اختیار نہ کیا جائے، اور اگر لاعلمی میں کوئی ایسا نام اختیار کرہی لیا جائے تو علم ہوتے ہی اُسے فوراً تبدیل کردینا چاہئے، توحید کی تعظیم وتکمیل کیلئے اس نکتہ کی معرفت اور تعمیل ضروری ہے۔

قوله :عَنْ أَبِي شُرَيْحٍ أَنَّهُ كَانَ يُسَمَّى أَبَا الْحَكَمِ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ:......

ابوشریح ؓ کی کنیت کی تبدیلی کا یہ قصہ ان کے اسلام کے فوراً بعد کا ہے چنانچہ جب وہ اپنی قوم کا ایک وفد

① حسن : ابوداؤد (٤٩٤٥) التاریخ الکبیر (٢٨١٨) سنن النسائی (٢٢٦/٨) سنن الکبریٰ ،للبیھقی (١٤٥/١٠) ابن سعد (٤٩/١٦)

نبی ﷺ کے پاس لائے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ ان کی قوم انہیں ابوالحکم کی کنیت سے پکارتی ہے، اس پر آپ ﷺ نے انہیں بلایا اور مسئلے کی صحیح صورت سمجھ کر کنیت کو تبدیل کر دیا۔ تبدیلی کی وجہ حدیث میں بیان ہو چکی ہے کہ ''حَکَم تو اللہ تعالیٰ کا نام ہے'' چنانچہ اسماء حسنیٰ میں یہ نام موجود ہے۔

امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حَکَم کا معنی یہ ہے کہ وہ حاکم جس کا فیصلہ حتمی اور ناقابلِ تردید ہو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ منصب صرف اللہ تعالیٰ کا ہی ہے، اور کسی کا نہیں۔ فرمایا:

﴿ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ ﴾ ①

''نہیں ہے فیصلہ مگر اللہ تعالیٰ کا، وہی حق بیان کرتا ہے، اور وہی سب سے بہترین فیصلہ کرنے والا ہے''

جو نام اللہ تعالیٰ کیلئے مخصوص ہو اسے اپنے لئے اختیار کرنا منع ہے

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جو نام اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہو اُسے اپنے لئے اختیار نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اگر کسی نام میں عدمِ احترام کا شائبہ بھی ہو تو اسے فوراً تبدیل کر دینا چاہئے۔



① (الانعام:۵۷)

اس باب کے مسائل

(۱) اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء وصفات کا احترام کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس کے کسی نام یا صفت کو اپنے حق میں استعمال نہیں کرنا چاہیے، خواہ استعمال کے وقت اس کا معنی مقصود نہ بھی ہو۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے اسماء کے احترام کی وجہ سے ایسا نام فوراً تبدیل کر لینا چاہیے (جس میں عدمِ احترام کا شائبہ بھی ہو۔)

(۳) اپنی کنیت کیلئے سب سے بڑے بیٹے کے نام کو اختیار کرنا چاہیے۔



باب من هزل بشئ فيه ذكر الله اوالقرآن اوالرسول

اللہ تعالیٰ کے ذکر یا قرآن پاک یا رسول اللہ ﷺ کا مضحکہ اڑانے والے کا حکم

قال:قول الله تعالىٰ : ﴿ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِءُونَ ﴾ ①

''اگر ان (منافقین) سے آپ پوچھیں (کہ تم کیا گفتگو کر رہے تھے) تو فوراً کہیں گے کہ ہم تو محض مذاق اور دل لگی کر رہے تھے، آپ ان سے کہیئے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ دل لگی کر رہے تھے؟''

اس باب میں واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر، قرآن مجید یا رسول اکرم ﷺ کے ساتھ مذاق واستہزاء کرنا مستلزم کفر ہے، کیونکہ اولاً: یہ مضحکہ مقامِ ربوبیت اور مقامِ رسالت کو گھٹانے کا موجب ہے۔ ثانیاً: یہ توحید کے بھی سراسر منافی ہے۔ اس لئے علماءِ امت نے بالاجماع ایسے شخص کو کافر قرار دیا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ، اس کی کتاب، اس کے رسول یا اس کے دین کے ساتھ استہزاء کرتا ہے، حتیٰ کہ اگر وہ مذاقاً اور بلا قصدِ حقیقت ہی استہزاء کرے تب بھی اس کی یہ حرکت موجب کفر ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مذاق اُڑانے پر منافقین کو وعید شدید

اس آیتِ کریمہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ منافقین نے اپنے کفر اور تکذیب پر مشتمل کلمات جو اکثر ان کی زبانوں سے جاری ہوا کرتے تھے، کیلئے ایک عذر تراشا کہ یہ کلمات تو ہم صرف دل لگی اور محض کھیل وتماشہ کیلئے کہتے ہیں، حقیقتِ استہزاء مقصود نہیں ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عذر کو باطل قرار دیا اور اگلی ہی آیت میں ان کی اس حرکت کو کفر سے تعبیر فرمایا:

﴿ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ﴾ ②

''کوئی عذر نہ تراشو، یقیناً تم نے ایمان قبول کرنے کے بعد کفر کیا ہے''

اس سے یہ بات خوب ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور رسول اکرم ﷺ کے ساتھ استہزاء کرنے والا کافر ہے اگر چہ وہ اپنے اس عمل کو کفر نہ سمجھتا ہو، کیونکہ منافقین اس استہزاء کو کفر نہیں سمجھتے تھے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ =

---

① (التوبة: ٦٥) ② (التوبة: ٦٨)

قَالَ: عَنِ ابْنِ عُمَرَ، وَمُحَمَّدِ بْنِ كَعْبٍ، وَزَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ، وَقَتَادَةَ (دَخَلَ حَدِيثُ بَعْضِهِمْ فِي بَعْضٍ) أَنَّهُ قَالَ رَجُلٌ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ: مَارَأَيْنَا مِثْلَ قُرَّائِنَا هٰؤُلَاءِ أَرْغَبُ بُطُونًا، وَلَا أَكْذَبُ أَلْسِنًا، وَلَا أَجْبَنُ عِنْدَاللِّقَاءِ - يَعْنِي رَسُولَ اللهِ ﷺ وَأَصْحَابَهُ الْقُرَّاءَ، فَقَالَ لَهُ عَوْفُ بْنُ مَالِكٍ: كَذَبْتَ، وَلٰكِنَّكَ مُنَافِقٌ، لَأُخْبِرَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ، فَذَهَبَ عَوْفٌ إِلَى رَسُولِ اللهِ لِيُخْبِرَهُ فَوَجَدَ الْقُرْآنَ قَدْ سَبَقَهُ، فَجَاءَ ذٰلِكَ الرَّجُلُ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ، وَقَدِ ارْتَحَلَ وَرَكِبَ نَاقَتَهُ - فَقَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَتَحَدَّثُ حَدِيثَ الرُّكْبِ، نَقْطَعُ بِهِ عَنَّا الطَّرِيقَ، قَالَ ابْنُ عُمَرَ: كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَيْهِ مُتَعَلِّقًا بِنِسْعَةِ نَاقَةِ رَسُولِ اللهِ، وَأَنَّ الْحِجَارَةَ تَنْكِبُ رِجْلَيْهِ، وَهُوَ يَقُولُ: (إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ) فَيَقُولُ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ: (أَبِاللهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِؤُنَ)، مَا يَلْتَفِتُ إِلَيْهِ وَمَا يَزِيدُهُ عَلَيْهِ. ①

سیدنا عبداللہ بن عمر، محمد بن کعب، زید بن اسلم اور قتادہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، اور ان کی یہ حدیث آپس میں ملتی جلتی ہے، (لھذا ایک ہی متن کے ساتھ ذکر کر دی گئی ہے) فرماتے ہیں: ایک آدمی نے غزوۂ تبوک کے موقعہ پر کہا: اپنے ان قراء جیسا ہم نے کوئی نہیں دیکھا، ان کے بڑے بڑے پیٹ، انتہائی جھوٹی زبانیں اور جنگ کے وقت بہت زیادہ بزدلی کا مظاہرہ کرنے والے ہیں۔ قراء سے اسکی

=

انہوں نے اپنے ادا کردہ کلمۂ کفر سے بظاہر بریٔ الذمہ ہونے کیلئے استہزاء اور مذاق کا عذر تراشا مگر اللہ تعالیٰ نے اس عذر سے کوئی تعرض نہیں فرمایا اور اس عذر کو لاشئی قرار دیتے ہوئے ان کی اس حرکت کو صریح کفر قرار دیا۔

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر انسان کسی ایسے کفر کا ارتکاب کرے جس کا کفر ہونا اسے معلوم نہ ہو تو اس عدمِ علم پر اسے معذور قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس پر کفر ہی کا حکم لگایا جائے گا، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کو گالی دینے والا بطریق اولیٰ کافر ہے۔''

بعض اوقات انسان صرف ایک بات کہنے یا ایک عمل کرنے سے کافر ہو جاتا ہے

اس حدیث کا سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایک بات کہنے سے یا ایک عمل کرنے سے کافر

① (حسن: رواہ ابن جریر: (۱۰/۱۱۹)

مراد، رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ تو عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: تم نے جھوٹ بولا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تم منافق ہو، میں ابھی رسول اللہ ﷺ کو بتا تا ہوں، چنانچہ جب عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے پاس پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ قرآن نے ان سے بھی پہلے نبی ﷺ کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس عذر خواہی کیلئے آیا، اس وقت نبی ﷺ اونٹنی پر سوار ہو چکے تھے، اس نے کہا: اے اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ! ہم نے تو یہ بات محض دل لگی اور ہنسی مذاق میں کہہ دی ہے، بالکل عام سواروں کی طرح سفر کاٹنے کیلئے ہم یہ گفتگو کر رہے تھے۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اس وقت کا منظر ابھی تک میرے سامنے ہے جب کہ وہ آدمی اونٹنی کے کجاوے کی رسی کے ساتھ چمٹا ہوا تھا، اور کنکریاں اس کے پاؤں کو زخمی کر رہی تھیں، اور وہ مسلسل یہ کہتا جا رہا تھا: ہم تو محض دل لگی کر رہے تھے، اور رسول اللہ ﷺ یہ فرما رہے تھے: کیا تم اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ دل لگی کر رہے تھے؟ آپ ﷺ نہ تو اس کی طرف التفات فرما رہے تھے، اور نہ ہی اس سے زیادہ کوئی بات فرما رہے تھے۔

ہو جاتا ہے، بلکہ قول وعمل سے بھی زیادہ خطرناک چیز دلوں کے ارادے ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں ہوتی، اس کے علاوہ نفاق سے بھی ڈرتے رہنا چاہیئے، کیونکہ آیت سے واضح ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ایمان لانے کے بعد یہ مذاق واستہزاء کیا تھا جس کی بناء پر منافق اور کافر قرار پائے، اسی لئے ابن ابی ملیکۃ فرمایا کرتے تھے، کہ میں نے تقریباً تیس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے متعلق نفاق سے ڈرا کرتے تھے۔ (نسأل اللہ السلامۃ والعفو والعافیۃ فی الدنیا والاخرۃ)



اس باب کے مسائل

(۱) انتہائی اہم مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ، اسکے رسول ﷺ اور اس کی کتاب کے ساتھ مذاق کرنے والا کافر ہے۔

(۲) مذاق کرنے والا کوئی بھی ہو وہ اس حکمِ کفر کا مستحق ہے، چنانچہ سورۃ التوبہ کی مذکورہ آیت کی تفسیر سے یہی واضح ہوتا ہے۔

(۳) چغلی اور اللہ تعالیٰ و اسکے رسول ﷺ کیلئے خیر خواہی کرنے کے درمیان بہت فرق ہے، چنانچہ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے جب منافق سے کہا: کہ تمہاری اس بات سے نبی ﷺ کو باخبر کرتا ہوں تو یہ چغلی کے ارادے سے نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کیلئے سچی خیر خواہی کا جذبہ مخفی و پنہاں تھا۔

(۴) وہ عفو و درگزر جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اس میں اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں پر سختی کرنے کی الگ الگ حیثیت اور مقام ہے۔

(۵) بعض عذر ایسے بھی ہوتے ہیں، جنہیں قبول نہیں کرنا چاہئے۔



باب
اللہ تعالیٰ کے شکر کی حقیقت

قول اللہ تعالیٰ: ﴿ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْ بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ هَٰذَا لِي وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِنْ رُّجِعْتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي عِنْدَهُ لَلْحُسْنَىٰ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴾ ①

قَالَ مُجَاهِدٌ: هَذَا بِعَمَلِيْ وَأَنَا مَحْقُوْقٌ بِهِ، وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ يُرِيْدُ مِنْ عِنْدِيْ (قَالَ إِنَّمَا أُوْتِيْتُهُ عَلَى عِلْمٍ عِنْدِيْ) قَالَ قَتَادَةُ: عَلَى عِلْمٍ مِنِّيْ بِوُجُوْهِ الْمَكَاسِبِ، وَقَالَ آخَرُوْنَ، عَلَى عِلْمٍ مِنَ اللّٰهِ أَنِّيْ لَهُ أَهْلٌ، وَهَذَا مَعْنَى قَوْلِ مُجَاهِدٍ، أُوْتِيْتُهُ عَلَى شَرَفٍ.

''اور اگر ہم اسے اپنی طرف سے رحمت چکھا دیں اس تکلیف کے بعد جو اسے لگ گئی تھی، تو ضرور یہ کہے گا کہ یہ تو میرے لئے ہے اور میں نہیں گمان کرتا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے، اور اگر میں بالفرض اپنے رب کی طرف لوٹا بھی دیا گیا تو بے شک میرے واسطے اس کے پاس بھلائی ہی بھلائی ہے، پس ہم ضرور کافروں کو ان کی بدعملی کی خبریں دیں گے اور ضرور ان کو گاڑھے قسم کے عذاب کا مزہ چکھائیں گے''

امام مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا: (وہ یوں کہتا ہے) ''یہ نعمت میری محنت کا نتیجہ ہے اور میں اس کا مستحق تھا۔''

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ نعمت میری ہی ہے۔''

اس آیت کی تفسیر میں قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وہ اپنے مال کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرنے کی بجائے یہ کہتا ہے: ''یہ مال مجھے اس لئے ملا کہ میں کمانے کے طریقے خوب جانتا ہوں۔''

دیگر مفسرین فرماتے ہیں: وہ یوں کہتا ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں اس مال کا مستحق ہوں۔''

وقوله: قَالَ مُجَاهِدٌ: هَذَا بِعَمَلِيْ وَأَنَا مَحْقُوْقٌ بِهِ ......

امام مجاہد رحمہ اللہ کی یہ تفسیر کہ ''یہ مال مجھے اپنے بلند مرتبہ کی وجہ سے ملا ہے'' کا مصداق بھی یہی ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی نعمت پر اس کا شکر ادا نہیں کیا۔ بلکہ اس قسم کی گفتگو کی کہ جس سے صریحاً شرک کا پہلو نکلتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا ہی میں سزا دے دی، اس سے پہلے وہ اس سے بڑے بڑوں کو سزا دے چکا ہے، چنانچہ قارون کا عبرتناک واقعہ قرآنِ حکیم کی زبانی ملاحظہ کیجئے:

① (فصلت: ۵۰)

قارون کا عبرتناک واقعہ قرآنِ حکیم کی زبانی

﴿ إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ○ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ○ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي ۚ أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِن قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَأَكْثَرُ جَمْعًا ۚ وَلَا يُسْأَلُ عَن ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ ○ فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ ۖ قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا يَا لَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ○ وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ ○ فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُ مِن فِئَةٍ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنتَصِرِينَ ﴾ (1)

’’قارون تھا تو قومِ موسیٰ سے، لیکن ان پر ظلم کرنے لگا تھا ہم نے اسے (اس قدر) خزانے دے رکھے تھے کہ کئی کئی طاقت ور لوگ بہ مشکل اس کی کنجیاں اٹھا سکتے تھے، ایک بار اس کی قوم نے اس سے کہا: اترا مت! اللہ تعالیٰ اترانے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔ اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تجھے دے رکھا ہے اس سے آخرت کے گھر کی تلاش بھی جاری رکھ اور اپنے دنیوی حصے کو بھی نہ بھول اور جیسے اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی سلوک کر اور ملک میں فساد کا خواہاں نہ ہو، یقین مان کہ اللہ مفسدوں کو ناپسند رکھتا ہے۔ قارون نے کہا: یہ سب کچھ مجھے میری اپنی سمجھ داری کی بناء پر دیا گیا ہے۔ کیا اسے اب تک یہ نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے بہت سے بستی والوں کو غارت کر دیا جو اس سے بہت زیادہ قوت والے اور بہت بڑی جمع پونجی والے تھے؟ اور گنہگاروں سے ان کے گناہوں کی باز پرس ایسے وقت نہیں کی جاتی۔ پس قارون پوری آرائش کے ساتھ اپنی قوم کے مجمع میں نکلا، تو زندگانیٔ دنیا کے متوالے کہنے لگے: کاش ہمیں بھی کسی طرح وہ مل جاتا جو قارون کو دیا گیا ہے، یہ تو بڑا قسمت کا دھنی ہے۔ ذی علم لوگ انہیں سمجھانے لگے کہ افسوس! بہتر چیز تو وہ ہے جو بطورِ ثواب انہیں ملے گی جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں، یہ بات انہی کے دل میں ڈالی جاتی ہے جو صبر و سہار والے ہوں۔ آخر کار ہم نے اسے اس کے محل سمیت زمین میں دھنسا دیا اور اللہ کے سوا کوئی جماعت اس کی مدد کیلئے تیار نہ ہوئی نہ وہ خود اپنے بچانے والوں میں سے ہو سکا۔‘‘

(۱) (القصص: ۷۶ تا ۸۱)

قارون کا عبرتناک واقعہ قرآنِ حکیم کی زبانی

﴿ إِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْقَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ٥ وَابْتَغِ فِيْمَا اٰتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ إِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ٥ قَالَ إِنَّمَا أُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ مِّنْ عِنْدِيْ أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّأَكْثَرُ جَمْعًا وَلَايُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ٥ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوْتِيَ قَارُوْنُ إِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ٥ وَقَالَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَايُلَقّٰهَا إِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ٥ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴾ (١)

’’قارون تھا تو قومِ موسیٰ سے، لیکن ان پر ظلم کرنے لگا تھا ہم نے اسے (اس قدر) خزانے دے رکھے تھے کہ کئی کئی طاقت ور لوگ بہ مشکل اس کی کنجیاں اٹھا سکتے تھے، ایک بار اس کی قوم نے اس سے کہا: اترا مت! اللہ تعالیٰ اترانے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔ اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تجھے دے رکھا ہے اس سے آخرت کے گھر کی تلاش بھی جاری رکھ اور اپنے دنیوی حصے کو بھی نہ بھول اور جیسے اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی سلوک کر اور ملک میں فساد کا خواہاں نہ ہو، یقین مان کہ اللہ مفسدوں کو ناپسند رکھتا ہے۔ قارون نے کہا: یہ سب کچھ مجھے میری اپنی سمجھ داری کی بناء پر دیا گیا ہے۔ کیا اسے اب تک یہ نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے بہت سے بستی والوں کو غارت کر دیا جو اس سے بہت زیادہ قوت والے اور بہت بڑی جمع پونجی والے تھے؟ اور گنہگاروں سے ان کے گناہوں کی باز پرس ایسے وقت نہیں کی جاتی۔ پس قارون پوری آرائش کے ساتھ اپنی قوم کے مجمع میں نکلا، تو زندگانیٔ دنیا کے متوالے کہنے لگے: کاش ہمیں بھی کسی طرح وہ مل جاتا جو قارون کو دیا گیا ہے، یہ تو بڑا قسمت کا دھنی ہے۔ ذی علم لوگ انہیں سمجھانے لگے کہ افسوس! بہتر چیز تو وہ ہے جو بطور ثواب انہیں ملے گی جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں، یہ بات انہی کے دل میں ڈالی جاتی ہے جو صبر و سہار والے ہوں۔ آخر کار ہم نے اسے اس کے محل سمیت زمین میں دھنسا دیا اور اللہ کے سوا کوئی جماعت اس کی مدد کیلئے تیار نہ ہوئی نہ وہ خود اپنے بچانے والوں میں سے ہو سکا۔‘‘

(١) (القصص: ٧٦ تا ٨١)

وَعَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ ﷺ، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ:" إِنَّ ثَلاثَةً مِّنْ بَنِی إِسْرَائِيْلَ، أَبْرَصَ وَأَقْرَعَ وَأَعْمٰى. فَأَرَادَ اللّٰهُ أَنْ يَبْتَلِيَهُمْ، فَبَعَثَ إِلَيْهِمْ مَلَكًا، فَأَتَى الْأَبْرَصَ، فَقَالَ: أَيُّ شَيْءٍ أَحَبُّ إِلَيْكَ، قَالَ: لَوْنٌ حَسَنٌ وَجِلْدٌ حَسَنٌ، وَيَذْهَبُ عَنِّی الَّذِی قَدْ قَذِرَنِی النَّاسُ بِهِ، قَالَ: فَمَسَحَهُ، فَذَهَبَ عَنْهُ قَذَرُهُ، فَأُعْطِىَ لَوْنًا حَسَنًا، وَجِلْدًا حَسَنًا، قَالَ: فَأَیُّ الْمَالِ أَحَبُّ إِلَيْكَ. قَالَ: اَلْإِبِلُ أَوِ الْبَقَرُ۔شَكَّ إِسْحَاقُ. فَأُعْطِىَ نَاقَةً عُشَرَاءَ وَقَالَ: بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِيْهَا۔قَالَ: فَأَتَى الْأَقْرَعَ، فَقَالَ: أَیُّ شَیْءٍ أَحَبُّ إِلَيْكَ، قَالَ: شَعْرٌ حَسَنٌ وَيَذْهَبُ عَنِّی الَّذِی قَذِرَنِیَ النَّاسُ بِهِ، فَمَسَحَهُ، فَذَهَبَ عَنْهُ وَأُعْطِىَ شَعْرًا حَسَنًا، فَقَالَ: أَیُّ الْمَالِ أَحَبُّ إِلَيْكَ، قَالَ: الْبَقَرُ أَوِ الْإِبِلُ. فَأُعْطِىَ بَقَرَةً حَامِلًا، قَالَ بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِيْهَا. فَأَتَى الْأَعْمٰى، فَقَالَ: أَیُّ شَیْءٍ أَحَبُّ إِلَيْكَ، قَالَ: أَنْ يَّرُدَّ اللّٰهُ إِلَیَّ بَصَرِی فَأُبْصِرُ بِهِ النَّاسَ، فَمَسَحَهُ، فَرَدَّ اللّٰهُ إِلَيْهِ بَصَرَهُ، قَالَ: فَأَیُّ الْمَالِ أَحَبُّ إِلَيْكَ، قَالَ: اَلْغَنَمُ، فَأُعْطِىَ شَاةً وَالِدًا، فَأُنْتِجَ هٰذَانِ وَوَلَّدَ هٰذَا، فَكَانَ لِهٰذَا وَادٍ مِنَ الْإِبِلِ، وَلِهٰذَا وَادٍ مِنَ الْبَقَرِ، وَلِهٰذَا وَادٍ مِنَ الْغَنَمِ. قَالَ: ثُمَّ أَتَى الْأَبْرَصَ فِی صُوْرَتِهِ وَهَيْئَتِهِ، فَقَالَ: رَجُلٌ مِسْكِيْنٌ قَدِ انْقَطَعَتْ بِیَ الْحِبَالُ فِی سَفَرِی، فَلَا بَلَاغَ لِیَ الْيَوْمَ إِلَّا بِاللّٰهِ ثُمَّ بِكَ، أَسْأَلُكَ بِالَّذِی أَعْطَاكَ اللَّوْنَ الْحَسَنَ وَالْجِلْدَ الْحَسَنَ وَالْمَالَ بَعِيْرًا أَتَبَلَّغُ عَلَيْهِ فِی سَفَرِی، فَقَالَ: اَلْحُقُوْقُ كَثِيْرَةٌ، فَقَالَ لَهُ كَأَنِّی أَعْرِفُكَ، أَلَمْ تَكُنْ أَبْرَصَ يَقْذَرُكَ النَّاسُ، فَقِيْرًا فَأَعْطَاكَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ الْمَالَ، فَقَالَ: إِنَّمَا وَرِثْتُ هٰذَا الْمَالَ كَابِرًا عَنْ كَابِرٍ، فَقَالَ: إِنْ كُنْتَ كَاذِبًا فَصَيَّرَكَ اللّٰهُ إِلٰى مَا كُنْتَ. قَالَ: وَأَتَى الْأَقْرَعَ فِی صُوْرَتِهِ، فَقَالَ لَهُ مِثْلَ مَا قَالَ لِهٰذَا، وَرَدَّ عَلَيْهِ مِثْلَ مَا رَدَّعَلَيْهِ هٰذَا، فَقَالَ: إِنْ كُنْتَ كَاذِبًا فَصَيَّرَكَ اللّٰهُ إِلٰى مَا كُنْتَ، قَالَ: وَأَتَى الْأَعْمٰى فِی صُوْرَتِهِ فَقَالَ: رَجُلٌ مِسْكِيْنٌ وَابْنُ سَبِيْلٍ، قَدِ انْقَطَعَتْ بِیَ الْحِبَالُ فِی سَفَرِی، فَلَا بَلَاغَ لِیَ الْيَوْمَ إِلَّا بِاللّٰهِ ثُمَّ بِكَ، أَسْأَلُكَ بِالَّذِی رَدَّ عَلَيْكَ بَصَرَكَ، شَاةً أَتَبَلَّغُ بِهَا فِی سَفَرِی، فَقَالَ: قَدْ كُنْتُ أَعْمٰى فَرَدَّ اللّٰهُ إِلَیَّ بَصَرِی، فَخُذْ مَاشِئْتَ وَدَعْ مَا شِئْتَ، فَوَاللّٰهِ لَا أَجْهَدُكَ الْيَوْمَ بِشَیْءٍ أَخَذْتَهُ لِلّٰهِ، فَقَالَ: أَمْسِكْ مَالَكَ، فَإِنَّمَا ابْتُلِيْتُمْ، فَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْكَ، وَسَخِطَ عَلٰى صَاحِبَيْكَ." ①

---

① (صحیح بخاری،الانبیاء،الرقم: (٣٤٦٤) صحیح مسلم، الزهد و الرقائق،الرقم: (٢٩٦٤)

سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے جناب رسول اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''بنی اسرائیل میں تین آدمی کوڑھی، گنجا اور نابینا تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمانے کا ارادہ فرمالیا، چنانچہ ایک فرشتہ ان کے پاس بھیجا پہلے وہ کوڑھی کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کہ تمہیں سب سے زیادہ کون سی چیز پسند ہے؟ اس نے کہا: اچھا رنگ، خوبصورت جلد اور اس بیماری کا خاتمہ جس کی وجہ سے لوگ مجھے ناپسند کرتے ہیں۔ فرشتے نے اس کے بدن پر اپنا ہاتھ پھیرا جس سے اس کا مرض ختم ہوگیا، اور اسے اچھا رنگ اور اچھی جلد دے دی گئی، پھر فرشتے نے پوچھا، تمہیں مال کون سا پسند ہے؟ اس نے جواب دیا: اونٹ یا گائے (حدیث کے راوی کو شک ہے) چنانچہ فرشتے نے اسے ایک حاملہ اونٹنی دے دی، اور کہا: اللہ تعالیٰ اس میں خوب برکت دے۔ پھر یہی فرشتہ گنجے کے پاس آیا اور پوچھا: تمہیں سب سے زیادہ کون سی چیز مرغوب (پسند) ہے، اس نے کہا: عمدہ بال اور اس گنج کا خاتمہ جس کی وجہ سے لوگ مجھے ناپسند کرتے ہیں، فرشتے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا چنانچہ گنج دور ہوگیا، اور اسے عمدہ بال عطا کردیئے گئے، پھر فرشتے نے پوچھا: تمہیں مال کونسا پسند ہے؟ اس نے کہا گائے (یا اونٹ) چنانچہ فرشتے نے اسے ایک حاملہ گائے دے دی، اور کہا اللہ تعالیٰ اس میں زیادہ سے زیادہ برکت دے، پھر یہی فرشتہ نابینا کے پاس آیا اور پوچھا: تمہیں کونسی چیز زیادہ پسند ہے؟ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ مجھے میری آنکھیں لوٹا دے تاکہ میں لوگوں کو دیکھ سکوں، فرشتے نے آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور اللہ تعالیٰ نے اسے بینائی عطا فرمادی، فرشتہ نے پوچھا: تمہیں مال کون سا پسند ہے؟ اس نے جواب دیا: بکریاں۔ تو فرشتے نے اسے حاملہ بکری دے دی۔ چنانچہ (اونٹی، گائے اور بکری) تینوں نے بچے دیئے اور کچھ ہی عرصے میں ایک کی وادی اونٹوں سے بھر گئی، دوسرے کی گائے سے اور تیسرے کے پاس بکریوں سے میدان بھر گئے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: پھر وہی فرشتہ کوڑھی کے پاس اپنی سابقہ صورت اور ہیئت میں آیا اور کہا: میں ایک مسکین آدمی ہوں سفر کا خرچ ختم ہو چکا ہے، آج اللہ تعالیٰ کی ذات اور پھر آپ کے علاوہ گھر تک پہنچنے کا کوئی سہارا نہیں ہے، آپ سے اس ذات کا واسطہ دیکر سوال کرتا ہوں جس نے آپ کو عمدہ رنگ، اور نفیس جلد اور یہ بے شمار مال عطا کیا ہے کہ ایک اونٹ دے دیجئے جس کے ذریعے میں اپنے بقیہ سفر کو طے کرلوں، اس نے کہا: میرے ذمے بہت سے حقوق ہیں۔ تو فرشتے نے کہا: میرا خیال ہے میں تمہیں پہچانتا ہوں کیا تم پہلے کوڑھی نہ تھے کہ لوگ تم سے نفرت کرتے

تھے، اور کیا تم فقیر نہ تھے؟ چنانچہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے یہ مال عطا فرمایا، اس نے کہا نہیں، مجھے تو یہ مال ماں باپ، دادوں کی طرف سے ورثہ میں ملا ہے، فرشتے نے کہا: اگر تم جھوٹے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں پہلے والے حال پر لوٹا دے۔ پھر یہی فرشتہ گنجے کے پاس اپنی سابقہ صورت میں آیا، اور اس سے وہی گفتگو کی جو کوڑھی سے کی تھی، اور گنجے نے بھی بالکل وہی جواب دیا جو کوڑھی نے دیا تھا، چنانچہ فرشتے نے کہا: اگر تم جھوٹے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں پہلے والے حال پر دوبارہ لے آئے نبی ﷺ نے فرمایا: پھر یہی فرشتہ نابینا کے پاس اپنی سابقہ صورت میں گیا، اور کہا: میں ایک مسکین اور مسافر آدمی ہوں، مسائلِ سفر معدوم ہو چکے ہیں، منزل تک پہنچنے کیلئے آج اللہ تعالیٰ کی ذات اور پھر آپ کے علاوہ کوئی سہارا نہیں، اس ذات کے نام سے کہ جس نے آپ کی بینائی لوٹائی ایک بکری کا سوال کرتا ہوں جس کے ذریعے اپنا بقیہ سفر طے کرسکوں اس شخص نے کہا: میں واقعی نابینا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے بینائی عطا فرمائی لہذا جو چاہو لے لو اور جو چاہو چھوڑ جاؤ، اللہ کی قسم! تم اللہ کے نام پر جو کچھ لوگے میں اس پر کوئی تعرض نہیں کرونگا۔ فرشتے نے کہا: تم اپنا مال سنبھال رکھو، اصل حقیقت یہ ہے کہ تم تینوں آزمائشوں میں مبتلا کیئے گئے تھے (اور اس آزمائش کا نتیجہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہو گیا اور تمہارے دونوں ساتھیوں سے ناراض ہو گیا۔''

شکر کے تین ارکان

اس حدیث میں بہت کچھ عبرت کا سامان ہے، پہلے دو انسانوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار کیا، چنانچہ نہ تو انہوں نے اس نعمت کو منعمِ حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا اور نہ ہی اس میں سے اللہ تعالیٰ کا حق ادا کیا اور نتیجۃً اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لے لی، البتہ نابینا نے اعترافِ نعمت بھی کیا اور اس کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت بھی کی اور اس میں سے اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کیا اور نتیجۃً اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا مستحق قرار پایا۔

اس حدیث کا واضح ترین درس یہ ہے کہ ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے جو نہایت ضروری ہے، شکر کے تین ارکان ہیں جنہیں اپنائے بغیر حقِ شکر ادا نہیں ہوسکتا۔

(۱) اعترافِ نعمت (۲) اس نعمت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا (۳) اس نعمت کو نیک کاموں میں صرف کرنا۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کے قول کا خلاصہ بھی یہی ہے۔

اس باب کے مسائل

(۱) (سورۂ فصلت کی) آیت کی تفسیر۔

(۲) آیتِ کریمہ: ﴿ لَيَقُولَنَّ هٰذَا لِيْ.... ﴾ کا مفہوم۔

(۳) آیتِ کریمہ: ﴿ اِنَّمَا اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ.... ﴾ کا مفہوم۔

(۴) اس عجیب غریب قصہ میں بڑی بڑی نصیحتیں موجود ہیں۔



باب

نام رکھنے یا اولاد نہ ملنے پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا

قول اللّٰه تعالیٰ: ﴿ فَلَمَّآ اٰتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِیْمَآ اٰتَاهُمَا فَتَعَالَی اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴾ ①

''پس جب اللہ تعالیٰ نے انہیں صحیح وسالم بیٹا عطا فرمایا تو وہ اس کی عطاو بخشش میں دوسروں کو شریک ٹھہرا بیٹھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مشرکانہ روش سے بلند وبالا تر ہے''

قَالَ ابْنُ حَزْمٍ :"اِتَّفَقُوْا عَلَى تَحْرِيْمِ كُلِّ اسْمٍ مُعَبَّدٍ لِغَيْرِ اللّٰهِ ، كَعَبْدِ عَمْرٍو ، وَعَبْدِ الْكَعْبَةِ ، وَمَا أَشْبَهُ ذٰلِكَ ، حَاشَا عَبْدِ الْمُطَّلِبِ .

حافظ ابن حزم رحمہ اللہ نے فرمایا:'' ہر اس نام کے حرام ہونے میں علماء کا اجماع ہے کہ جس میں غیر اللہ کی عبدیت کا اظہار ہو رہا ہو، مثلاً: عبد عمرو، اور عبد الکعبۃ وغیرہ۔ ماسوائے عبد المطلب کے۔ (کہ اس نام کے بارہ میں اختلاف ہے۔)''

یہ باب ہر ایسے نام کی حرمت وممانعت پر مشتمل ہے جس میں غیر اللہ کی عبدیت کا اظہار ہوتا ہو۔

آیتِ کریمہ کی تفسیر اور اس میں بیان کردہ واقعہ کا ذکر اگلے صفحات میں سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں آئے گا۔

ہر وہ نام حرام ہے جس میں غیر اللہ کی عبدیت کا اظہار ہو رہا ہو

وقوله :قال ابْنُ حَزَمٍ :"اِتَّفَقُوْا عَلَى تَحْرِيْمِ كُلِّ اسْمٍ مُعَبَّدٍ لِغَيْرِ اللّٰهِ ......

یہی بات حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے لکھی ہے، فرماتے ہیں:''عبد العلی ، عبدالحسین اور عبد الکعبة وغیرہ نام رکھنا ناجائز ہے۔''

بلکہ ابن ابی شیبہ کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ کے پاس ایک وفد آیا جس میں شامل ایک شخص کا نام عبد الحجر تھا۔ نبی ﷺ نے اسے تبدیل کر کے اس کا نام عبد اللہ رکھ دیا۔ ②

اس کے علاوہ بعض صحابہ جن کا جاہلی نام عبد شمس تھا اسے نبی ﷺ نے تبدیل کر کے عبد اللہ رکھ دیا۔ (تراجم صحابہ کا مطالعہ کرنے سے ایسے کئی حوالے مل جائیں گے۔)

① (الاعراف: ۱۹۰)

② اسناده جید: الادب المفرد: (۸۱۱)

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک حدیث میں نبی ﷺ نے دنیا کے پجاری کو عبد الدینار اور عبد الدرھم کہا ہے، حالانکہ اس قسم کے نام تو ممنوع ہیں؟ لیکن یہ سوال قطعاً باعثِ اشکال نہیں کیونکہ نبی ﷺ کا مقصود نام رکھنا نہیں، بلکہ اس شخص کی حالت کی انتہائی ذلت وحقارت کے ساتھ عکاسی مقصود ہے، جو اللہ تعالیٰ کی عبدیت کے بجائے درہم ودینار کی عبدیت قبول کر لیتا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ بعض احادیث میں ایک صحابی کا نام عبدِ یزید ابورکانہ ملتا ہے، جس میں غیر اللہ کی عبدیت کا اظہار ہو رہا ہے۔

امام ذھبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صحیح تحقیق یہ ہے کہ اس صحابی کا نام رکانہ تھا اور یزید اسکے بیٹے کا نام تھا، تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ''سنن ابی داؤد۔''

عبد المطلب نام پر بحث

حافظ ابن حزم رحمہ اللہ کے مذکورہ قول سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ عبد المطلب نام کے رکھنے کے جواز یا عدمِ جواز میں علماء کا اختلاف ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نام رکھنا بھی درست نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب عبد النبی، عبد الرسول اور عبد المسیح نام وغیرہ رکھنے کی ممانعت ہے جو عبد المطلب کی بنسبت کہیں زیادہ اولویت رکھتے ہیں تو پھر عبد المطلب کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ لیکن یہاں ایک اور اشکال وارد ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ "أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ" ①

''میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں''

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عبد المطلب نام جائز ہے، کیونکہ اگر ناجائز ہوتا تو نبی ﷺ یہ نام اپنی زبانِ مبارک پر کیوں لاتے؟ اور شاید اسی وجہ سے بعض علماء اس نام کے جواز کے قائل ہیں۔ جیسا کہ حافظ ابن حزم رحمہ اللہ کے قول سے بھی یہی واضح ہوتا ہے۔ لیکن اس میں از سرِ نو یہ نام رکھنے کا پہلو کہاں سے نکلتا ہے؟ یہ تو ایک پہلے سے رکھے ہوئے نام کی خبر دینا ہے اور ظاہر ہے کہ جس کا جو نام ہوگا اسے اسی کے ذکر سے پہچانا جائے گا۔ اور یہ ممنوع نہیں ہے، ممنوع تو یہ ہے کہ کوئی شخص اب اس نام کو اپنے لئے اختیار کرے۔

ایک حدیث میں نبی ﷺ نے یہ فرمایا: "اِنَّمَا بَنُوْهَاشِمٍ وَبَنُوْعَبْدِمُنَافٍ شَیْءٌ وَاحِدٌ"

''بنو ہاشم اور بنو عبد مناف ایک ہی چیز ہیں''

① (صحیح بخاری، الجهاد، الرقم: (٢٨٦٤) صحیح مسلم، الجهاد والسير، الرقم: (١٧٧٦)

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِی الْآیَةِ قَالَ: لَمَّا تَغَشَّاهَا آدَمُ حَمَلَتْ فَأَتَاهُمَا إِبْلِیْسُ فَقَالَ: إِنِّی صَاحِبُکُمَا الَّذِی أَخْرَجْتُکُمَا مِنَ الْجَنَّةِ، لَتُطِیْعُنِی أَوْ لَأَجْعَلَنَّ لَهُ قَرْنَیْ أَیِّلٍ فَیَخْرُجُ مِنْ بَطْنِكِ فَیَشُقُّهُ وَلَأَفْعَلَنَّ وَلَأَفْعَلَنَّ یُخَوِّفُهُمَا، سَمِّیَاهُ عَبْدَ الْحَارِثِ، فَأَبَیَا أَنْ یُطِیْعَاهُ، فَخَرَجَ مَیِّتًا ثُمَّ حَمَلَتْ فَأَتَاهُمَا فَذَکَرَ لَهُمَا فَأَدْرَکَهُمَا حُبُّ الْوَلَدِ، فَسَمَّیَاهُ عَبْدَالْحَارِثِ، فَذَلِكَ قَوْلُهُ: ﴿ جَعَلَا لَهُ شُرَکَاءَ فِیمَا آتَاهُمَا ﴾ (رواہ ابن ابی حاتم)

وَلَهُ بِسَنَدٍ صَحِیْحٍ عَنْ قَتَادَةَ قَالَ: "شُرَکَاءُ فِی طَاعَتِهِ وَلَمْ یَکُنْ فِی عِبَادَتِهِ"

وَلَهُ بِسَنَدٍ صَحِیْحٍ عَنْ مُجَاهِدٍ فِی قَوْلِهِ: ﴿ لَئِنْ آتَیْتَنَا صَالِحًا ﴾ قَالَ: أَشْفَقَا أَنْ لَا یَکُوْنَ إِنْسَانًا. وَذَکَرَ مَعْنَاهُ عَنِ الْحَسَنِ وَسَعِیْدٍ وَغَیْرِهِمَا.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما مذکورہ آیت: ﴿ فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا..... ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: آدم علیہ السلام نے جب اپنی بیوی حوا علیہا السلام سے صحبت کی تو وہ حاملہ ہوگئی، تو ان کے پاس ابلیس آیا اور کہنے لگا: میں تمہارا وہی ساتھی ہوں جس نے تمہیں جنت سے نکلوایا تھا، اب تمہیں میری اطاعت کرنی ہوگی ورنہ میں بچے کے سر پر بارہ سینگے جیسے سینگ لگادونگا، جو پیٹ پھاڑ کر نکلے گا، اور میں ایسے کرونگا اور ایسے کرونگا...... لہٰذا (اگر میرے شر سے بچنا چاہتے ہو تو) اس بچے کا نام عبدالحارث رکھ دو۔ لیکن آدم و حوا علیہما السلام نے اس کی اطاعت کرنے سے انکار کردیا اور بچہ مردہ پیدا ہوا۔ پھر جب (حوا علیہا السلام) دوبارہ حاملہ ہوئیں، تو پھر ابلیس مردود آ گیا اور وہی بات دہرائی، اور ان دونوں نے پھر اس کی اطاعت سے انکار کردیا، اور بچہ پھر مردہ پیدا ہوا۔ اور حوا علیہا السلام جب تیسری مرتبہ حاملہ ہوئیں تو ابلیس نے آکر پھر وہی بات ذکر کی، اب کی دفعہ بچے کی محبت ان پر غالب آچکی تھی، اور انہوں نے ابلیس کی بات مان لی اور بچے کا نام عبدالحارث رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ جَعَلَا لَهُ شُرَکَاءَ فِیمَا آتَاهُمَا ﴾ کا یہی معنی ہے۔

=

اس حدیث سے یہ معنی نہیں نکلتا کہ عبد مناف نام بھی ٹھیک ہے، لہٰذا اگر سابقہ حدیث سے عبدالمطلب نام کا جواز نکل سکتا ہے تو اس حدیث سے عبد مناف کا جواز بھی نکل سکتا ہے (وھو لا یجوز)

امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے ایک صحابی کا نام عبدالمطلب ذکر کیا ہے۔ تو اس میں بھی صحیح تحقیق یہی ہے کہ اس کا نام مطلب بن ربیعۃ تھا۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ عبدالمطلب نام بھی نہیں رکھنا چاہیے۔

ابن ابی حاتم نے بسندِ صحیح قتادہ کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے کہ آیت میں ذکر کردہ شرک اس کی بات ماننے میں تھا، عبادت کرنے میں نہیں تھا۔ اور ابن ابی حاتم نے ہی بسندِ صحیح مجاہد کا یہ قول نقل کیا ہے: انہوں نے ﴿ لَئِنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا ﴾ اس لئے کہا کہ انہیں بچے کے غیر انسانی صورت میں پیدا ہونے کا ڈر تھا۔

وقوله: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي الْآيَةِ قَالَ: لَمَّا تَغَشَّاهَا آدَمُ حَمَلَتْ ......

تمام علماءِ سلف نے اس آیت کی تفسیر میں یہی قصہ ذکر کیا ہے۔ البتہ بعض علماء اس قصہ کا انکار کرتے ہیں اور ان کا انکار تعجب خیز ہے، اور ثابت شدہ اس قصہ سے انکار کے بعد اس آیت کی تفسیر میں انہوں نے عجیب وغریب قسم کے تکلفات کا سہارا لیا ہے۔ شاید ان کیلئے اشکال کا باعث یہ رہا ہو کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام کو کیسے ورغلایا؟ لیکن کیا وہ یہ بھول گئے کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام کو پہلی مرتبہ ورغلا کر جنت سے نکلوایا تھا؟ اور اس قصہ کا محذور پہلے قصہ کے محذور سے بڑا تو نہیں ہے اور پھر نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ: [خَدَعَهُمَا مَرَّتَيْنِ] ''شیطان نے آدم وحوا علیہما السلام کو دو مرتبہ دھوکا دیا۔'' اس حدیث کے راوی عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں: ایک مرتبہ جنت میں اور دوسری مرتبہ زمین پر دھوکا دیا۔ ①

اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ کے امتحان کے بہت سے مظاہر ہیں، چنانچہ پہلی دو مرتبہ بچے کو مردہ پیدا کرنا اور تیسری مرتبہ ان کے دلوں کو بچے کی محبت سے لبریز کردینا، اسی آزمائش کا نتیجہ ہے۔

آدم وحوا علیہما السلام نے جو ابلیس کا پیش کردہ نام مان کر بچے کا نام عبد الحارث رکھ لیا تو ان کا مقصود صرف یہ تھا کہ حوا سے شیطان کے شر کو رفع کردیں یا پھر بچے کو موت سے بچانے کیلئے یہ نام رکھا۔

آدم وحوا علیہما السلام نے شیطان کی عبادت نہیں کی نہ ہی اس عبادت کا قصد کیا، بلکہ صرف بچے کا نام عبد الحارث رکھنے میں شیطان کی بات مان لی، جس کی وجوہات بیان ہو چکی ہیں، اسی لئے بہت سے علماء نے ان کی اس شراکت کو از روئے اطاعت قرار دیا ہے۔



---

① ابن ابی حاتم وابن جریر۔ معضل ضعیف : ابن جریر: (۱۰۲/۹) عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم تابعی اور ضعیف ہے۔

اس باب کے مسائل

(۱) ہر وہ نام جس میں غیر اللہ کی عبودیت کا اظہار ہو، اسے اختیار کرنا حرام ہے۔

(۲) آیتِ کریمہ: ﴿ فَلَمَّا اٰتَاهُمَا صَالِحًا ﴾ کی تفسیر۔

(۳) مذکورہ واقعہ میں جس شرک کا ذکر ہے وہ صرف نام رکھنے کی حد تک تھا، حقیقتِ شرک مقصود نہ تھی۔

(۴) اللہ تعالیٰ کا کسی شخص کو صحیح سالم لڑکی عطا کرنا اس کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ ورنہ وہ قادر ہے کہ لڑکی بھی نہ دے کچھ اور ہی چیز پیدا کر دے جو انسانی صورت پر ہی نہ ہو، یا مردہ بچہ ہی پیدا کر دے......

(۵) سلف کے ذکر کردہ اقوال سے ''شرک فی الطاعۃ'' اور ''شرک فی العبادۃ'' میں فرق کا پہلو نمایاں ہے۔

باب
اسماءِ حسنیٰ کا بیان

قول اللہ تعالیٰ: ﴿ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَاۗىِٕهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ ①

''اور اللہ تعالیٰ کیلئے اچھے نام ہیں، لہٰذا انہی کے ساتھ اسے پکارو، اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں کے بارہ میں کج روی کا شکار ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کا انہیں عنقریب بدلہ دیا جائے گا۔''

آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ناموں کی خبر دی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ میرے تمام نام انتہائی اچھے ہیں۔ انتہائی اچھے ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس کے تمام نام اس کی صفاتِ کمال کے مظہر اور ہر قسم کے نقص کے شائبہ سے بالاتر ہیں۔ لہٰذا کوئی دوسرا نام اس کے کسی نام کے قائم مقام نہیں ہوسکتا۔ جو نام اس نے اپنی ذات کیلئے چن لیا اس سے عدول کر کے کوئی دوسرا نام تلاش کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو اپنی صفات بیان فرما دیں اس سے تجاوز کر کے دوسری صفات اختیار کرنا بھی درست نہیں ہے۔

چنانچہ ''عَلِيْمٌ'' کے بجائے ''عَالِمٌ'' یا ''سَمِيْعٌ'' اور ''بَصِيْرٌ'' کی بجائے ''سَامِعٌ'' اور ''بَاصِرٌ'' نہیں کہنا چاہیے۔ ''عَلِيْمٌ''، ''سَمِيْعٌ'' اور ''بَصِيْرٌ'' اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں اور ''عَالِمٌ''، ''سَامِعٌ'' اور ''بَاصِرٌ'' سے زیادہ اچھے ہیں اور ہر اعتبار سے مکمل ہیں اور ہر قسم کے نقص کے شائبہ سے پاک ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے متعلق عافیت کی راہ

لہٰذا عافیت اور سعادت کی راہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اسماء وصفات اپنی ذات کیلئے بیان فرمائے ہیں انہی پر اکتفاء کیا جائے، اور اس کا کوئی ایسا نام یا صفت بیان نہ کی جائے جو اس نے بیان نہیں فرمائی، الّا یہ کہ کوئی ایسی صفت مل جائے جو اس کے بیان کردہ اسماء وصفات سے معنوی مطابقت رکھتی ہو، اس میں بھی احتیاط کا پہلو ملحوظ رکھا جائے گا اور لفظ کی بجائے معنی ہی مستعمل ہوگا۔ اور اگر وہ وصف مجمل ہو یا قابلِ انقسام ہو (یعنی مدح وذم دونوں کیلئے مستعمل ہو) یا کسی غیر پر بھی اس کا اطلاق ہوسکتا ہو تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ پر اس کا اطلاق، اطلاقِ مقید ہوگا۔ قرآن وسنت میں اس کے کافی نظائر مل جائیں گے۔ مثلاً:

﴿ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴾ ②

---

① (الاعراف: ۱۸۰) ② (البروج: ۱٦)

''وہ کرنے والا ہے جو چاہتا ہے''

﴿ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ ﴾ ①

''اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے''

﴿ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ ②

''یہ ہے صنعت اللہ تعالیٰ کی جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا''

آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ:﴿ فَادْعُوْهُ بِهَا ﴾ ان ناموں کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرو، چنانچہ سب سے بہترین اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب وسیلہ اسکے اسماء وصفات کا وسیلہ ہے۔

مسند احمد اور جامع ترمذی کی حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" أَلِظُّوْا بِيَاذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ " ③

''اپنی حاجات کے حصول کیلئے اللہ تعالیٰ کو یا ''ذا الجلال والا کرام'' کا واسطہ دے دیکر اصرار کیا کرو''

ترمذی ہی کی ایک حدیث ہے، نبی ﷺ نے ایک شخص کو یوں دعا کرتے ہوئے سنا:

" اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ بِأَنِّيْ أَشْهَدُ أَنَّكَ أَنْتَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِيْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ "

''اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کیونکہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو اللہ ہے، تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، تو یکتا اور بے نیاز ہے، جس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ کوئی باپ اور نہ ہی کوئی ہمسر و مثل ہے''

تو نبی ﷺ نے فرمایا: "وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَقَدْ سَأَلَ اللّٰهَ بِإِسْمِهِ الْأَعْظَمِ الَّذِيْ إِذَا دُعِيَ بِهِ أَجَابَ وَإِذَا سُئِلَ بِهِ أَعْطٰى " ④

''مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس نے اللہ تعالیٰ سے اس کے اسمِ اعظم کے واسطے سے سوال کیا ہے جب اس اسمِ اعظم کے واسطے سے دُعا کی جائے تو وہ ضرور قبول فرماتا ہے اور جب کوئی چیز مانگی جائے تو وہ ضرور عطا فرماتا ہے''

① (ابراهيم: ٢٧) ② (النمل: ٨٨)

③ اسناده صحيح: (مسند احمد: ١٧٦٠٧/٦) التاريخ الكبير: (٩٦٢) مستدرك الحاكم: (٤٩٨/١) امام حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے، اور امام ذھبی نے موافقت کی ہے۔

④ مسند احمد: (٣٣٣١٣/٩) سنن ابی داؤد: (١٤٩٣) سنن ترمذی: (٣٤٧٥) سنن ابن ماجه: (٣٨٥٧) الترغيب والترهيب: (٤٨٥/٢)

خود نبی ﷺ بھی اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے وسیلہ سے دعا کیا کرتے تھے، چنانچہ صحیح مسلم شریف میں آپ ﷺ کی یہ دعا مذکور ہے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ ، وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ ، وَبِكَ مِنْكَ لَا أُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ"

''اے اللہ! میں تیری رضا کے ساتھ تیری ناراضگی سے اور تیری عفو و درگزر کے ساتھ تیری سزا سے پناہ چاہتا ہوں اور تیری (ہی رحمت) کے ساتھ تیرے (ہی غصے) سے پناہ چاہتا ہوں۔ جس طرح تو نے اپنی خود تعریف بیان کی اس طرح تیری تعریف کرنے کی ہمیں قدرت نہیں ہے''

اللہ تعالیٰ کے ''ننانوے'' ناموں کے احصاء کی فضیلت اور احصاء کے معانی

صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے:

"إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ إِسْمًا مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ"

''بے شک اللہ تعالیٰ کے ۹۹ (ننانوے) نام ہیں جس نے ان ناموں کا احصاء کیا وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

واضح ہو کہ احصاء کی تین صورتیں ہیں:

(۱) ان تمام ناموں کو پڑھنا۔

(۲) ان کے معانی کو سمجھنا۔

(۳) ان ناموں کے واسطہ سے دعا کرنا اور دعا کی دو صورتیں ہیں:

الف: حمد و ثناء اور عبادت پر مشتمل دعا۔

ب: طلب اور سوال پر مشتمل دعا۔

چنانچہ کسی بھی قسم کی دعا ہو اس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کے ذریعہ اس کی ثناء بیان کرنی چاہیئے، اور جس قسم کی حاجت ہو اسی قسم کی صفت ربانی استعمال کرنی چاہیئے، مثلاً اگر گناہوں کی بخشش مطلوب ہو تو اس کی صفت ''غفور'' یا ''رحیم'' یا ''غفار'' کا واسطہ دینا چاہیئے (وعلی هذا القیاس)

چونکہ ان مبارک ناموں کی شرعی اعتبار سے بڑی اہمیت ہے، ان کا احصاء دخول جنت کا باعث ہے، لہذا ان (۹۹) ناموں کا ذکر کیا جاتا ہے، ان میں سے اکثر نام قرآن حکیم میں جابجا مذکور ہیں، بعض بلفظہ تو نہیں لیکن معنوی طور پر موجود ہیں، ویسے نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث میں یہ تمام (۹۹) نام مذکور ہیں۔

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے، اور اس کی سند میں غرابت ہے، اور جس راوی پر سند کا مدار ہے وہ صفوان بن صالح ہے جو کہ محدثین کے نزدیک ثقہ ہے، لہذا اس کا تفرد قبول ہے۔

اسماء الحسنی درج ذیل ہیں:

اَللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ،

اَلرَّحْمٰنُ (نہایت مہربان)
اَلرَّحِیْمُ (بے حد رحم کرنے والا)
اَلْمَلِكُ (شہنشاہ)
اَلْقُدُّوْسُ (ہر عیب سے پاک)
اَلسَّلَامُ (سلامتی عطا کرنے والا)
اَلْمُؤْمِنُ (امن دینے والا)
اَلْمُهَیْمِنُ (نگہبان اور محافظ)
اَلْعَزِیْزُ (ہر چیز پر غالب)
اَلْجَبَّارُ (زبردست)
اَلْمُتَكَبِّرُ (شانِ کبریائی والا)
اَلْخَالِقُ (پیدا کرنے والا)
اَلْبَارِئُ (ہر مخلوق کو اس کا وجود دینے والا)
اَلْمُصَوِّرُ (صورت عطا کرنے والا)
اَلْغَفَّارُ (بخشنے والا)
اَلْقَهَّارُ (بڑا زبردست)
اَلْوَهَّابُ (بہت زیادہ دینے والا)
اَلرَّزَّاقُ (روزی دینے والا)
اَلْفَتَّاحُ (کھولنے والا)
اَلْعَلِیْمُ (بڑا جاننے والا)
اَلْقَابِضُ (تنگی پیدا کرنے والا)
اَلْبَاسِطُ (کشادگی پیدا کرنے والا)
اَلْخَافِضُ (جھکا دینے والا)
اَلْمُعِزُّ (عزت دینے والا)
اَلْمُذِلُّ (ذلت دینے والا)
اَلسَّمِیْعُ (سننے والا)
اَلْبَصِیْرُ (دیکھنے والا)
اَلْحَكَمُ (فیصلہ کرنے والا)
اَلْعَدْلُ (انصاف کرنے والا)
اَللَّطِیْفُ (نرمی کرنے والا)
اَلْخَبِیْرُ (ہر چیز سے خبردار)
اَلْحَلِیْمُ (بردبار)
اَلْعَظِیْمُ (سب سے بڑا)
اَلْغَفُوْرُ (بخشنے والا)
اَلشَّكُوْرُ (قدردان)
اَلْعَلِیُّ (بلند)
اَلْكَبِیْرُ (سب سے بڑا)
اَلْحَفِیْظُ (حفاظت کرنے والا)
اَلْمُقِیْتُ (روزی دینے والا)
اَلْحَسِیْبُ (حساب لینے والا
اَلْجَلِیْلُ (عزت والا)

اَلْكَرِيْمُ (بزرگی والا)
اَلرَّقِيْبُ (نگہبان)
اَلْمُجِيْبُ (دعا قبول کرنے والا)
اَلْوَاسِعُ (کشادہ اور وسیع)
اَلْحَكِيْمُ (حکمت والا، دانا)
اَلْوَدُوْدُ (دوست، بھلائی چاہنے والا)
اَلْمَجِيْدُ (بڑی بزرگی والا)
اَلْبَاعِثُ (مخلوق کو قبروں سے اٹھانے والا)
اَلشَّهِيْدُ (گواہ)
اَلْحَقُّ (سچ اور ثابت)
اَلْوَكِيْلُ (کارساز)
اَلْقَوِيُّ (زور آور)
اَلْمَتِيْنُ (زبردست، قوت والا)
اَلْوَلِيُّ (دوست، مددگار)
اَلْحَمِيْدُ (تعریف کیا ہوا)
اَلْمُحْصِي (شمار کرنے والا)
اَلْمُبْدِئُ (ابتداء سے پیدا کرنے والا)
اَلْمُعِيْدُ (دوبارہ لوٹانے والا)
اَلْمُحْيِيْ (زندہ کرنے والا)
اَلْمُمِيْتُ (مارنے والا)
اَلْحَيُّ (زندہ)
اَلْقَيُّوْمُ (ہمیشہ قائم رہنے والا)
اَلْوَاجِدُ (پالینے والا)
اَلْمَاجِدُ (بزرگی والا)
اَلْوَاحِدُ (یکتا، یگانہ، اکیلا)
اَلْاَحَدُ (ایک، اکیلا)
اَلصَّمَدُ (بے نیاز، داتا)
اَلْقَادِرُ (قدرت رکھنے والا)
اَلْمُقْتَدِرُ (مکمل قدرت رکھنے والا)
اَلْمُقَدِّمُ (آگے کرنے والا)
اَلْمُؤَخِّرُ (پیچھے کرنے والا)
اَلْاَوَّلُ (سب سے پہلے)
اَلْآخِرُ (سب سے آخر)
اَلظَّاهِرُ (سب سے ظاہر)
اَلْبَاطِنُ (سب سے پوشیدہ)
اَلْمُتَعَالُ (انتہائی بلند)
اَلْبَرُّ (احسان کرنے والا)
اَلتَّوَّابُ (توبہ قبول کرنے والا)
اَلْمُنْعِمُ (انعام کرنے والا)
اَلْمُنْتَقِمُ (انتقام لینے والا)
اَلْعَفُوُّ (معاف کرنے والا)
اَلرَّؤُوْفُ (شفقت کرنے والا)
مَالِكُ الْمُلْكِ (بادشاہوں کا بادشاہ)
ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ (بزرگی اور عزت والا)
اَلْمُقْسِطُ (انتہائی انصاف کرنے والا)
اَلْجَامِعُ (جمع کرنے والا)
اَلْغَنِيُّ (بے پرواہ)
اَلْمُغْنِيُ (غنی کرنے والا)

اَلْمَانِعُ (روکنے والا)	اَلضَّارُ (نقصان دینے والا)
اَلنَّافِعُ (نفع دینے والا)	اَلنُّوْرُ (نور)
اَلْهَادِیُ (ہدایت دینے والا)	اَلْبَدِیْعُ (انوکھے طریقے سے تخلیق کرنے والا)
اَلْبَاقِیُ (باقی رہنے والا)	اَلْوَارِثُ (حقیقی وارث)
اَلرَّشِیْدُ (رہنمائی کرنے والا)	اَلصَّبُوْرُ (بہت زیادہ صبر کرنے والا)

یہ بات بخوبی معلوم ہونی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے صرف ننانوے نام نہیں ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے اسماء بے شمار اور لامحدود ہیں، اور ان مکمل اسماء کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ مسند احمد کی ایک صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی دعا کے یہ الفاظ ملتے ہیں:

"أَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ أَوْأَنْزَلْتَهُ فِيْ كِتَابِكَ أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ أَوِاسْتَأْثَرْتَ بِهِ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ" ①

''اے اللہ! میں آپ کے ہر نام کے واسطے سے تجھ سے سوال کرتا ہوں، ہر وہ نام جو آپ نے اپنی ذات کیلئے پسند فرمایا، یا اپنی کتاب میں نازل فرمایا، یا اپنی مخلوقات میں سے کسی کو سکھادیا یا اسے اپنے خزانۂ غیب میں مخفی رکھا''

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے اسماء الحسنی کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ نام جو کتاب میں تو نازل نہیں فرمائے، لیکن اپنی خاص یا انتہائی مقرب مخلوق مثلاً: فرشتوں وغیرہ کو سکھادیئے۔

(۲) وہ نام جو اپنی کتاب میں نازل فرما کر تمام بندوں کو سکھادیئے۔

(۳) وہ نام جو اپنے خزینۂ غیب میں مخفی رکھے اور مخلوقات میں سے کسی پر ظاہر نہیں فرمائے۔

اس کے علاوہ حدیثِ شفاعت جس میں نبی ﷺ کا فرمان ہے:

''اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی حمد وثناء کے ایسے دروازے کھولے گا، جنہیں میں نہیں جانتا'' سے بھی واضح ہوتا کہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات بے شمار ہیں۔

اس معنی کی ایک حدیث صحیح مسلم کے حوالے سے اس باب میں گزرچکی ہے۔

① حسن: مسنداحمد: (۲/۴۳۱۸) صحیح ابن حبان: (۲۳۷۲) طبرانی کبیر: (۱۰۳۵۲) مستدرك حاکم: (۵۰۹۱) امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ: يُلْحِدُوْنَ فِيْ أَسْمَائِهِ يُشْرِكُوْنَ، وَعَنْهُ سَمُّوْا اللَّاتَ مِنَ الْإِلٰهِ وَالْعُزَّى مِنَ الْعَزِيْزِ . وَعَنِ الْأَعْمَشِ: يُدْخِلُوْنَ فِيْهَا مَالَيْسَ مِنْهَا .

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد کا معنی یہ ہے کہ وہ شرک کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے ''اللات'' کو ''اله'' سے اور ''العزی'' کو ''العزیز'' سے بنایا۔

اعمش رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ الحاد کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں ایسی چیزیں داخل کرتے ہیں جو ان میں نہیں۔

مذکورۃ الصدر آیت میں اللہ تعالیٰ نے دوسرا حکم یہ ارشاد فرمایا:

﴿ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَائِهٖ ﴾ ①

''یعنی ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد کرتے ہیں''

الحاد کے بارے میں علماءِ سلف کے اقوال

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''الحاد سے مراد یہ ہے کہ ان ناموں میں اور ان کے معانی وحقائق میں حق کو چھوڑ کر باطل کو اختیار کر لینا۔''

''الحاد'' کی تفسیر میں مؤلف رحمہ اللہ نے سلف سے بعض اقوال نقل فرمائے ہیں: اس الحاد کے مختلف طریقے استعمال کیئے گئے۔

مشرکینِ مکہ نے اللہ تعالیٰ کے ناموں کو اپنے بتوں پر استعمال کرلیا تھا، مثلاً ایک بت کا ''اللات'' نام تھا، جو ''اله'' سے ماخوذ تھا۔ دوسرے بت کا نام ''العزی'' تھا جو ''العزیز'' کے نام سے ماخوذ تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہر بت کو الٰہ کہتے تھے۔

الحاد کا ایک طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ایسے نام رکھ دیئے جو اس کی شان کے لائق ہی نہیں، مثلاً: عیسائیوں نے اللہ تعالیٰ کو ''اب'' یعنی باپ کہنا شروع کر دیا۔ فلاسفہ نے اللہ تعالیٰ کا نام ''موجب بذاته'' یا ''علة فاعلة بالطبع'' رکھ دیا۔

الحاد کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ایسے نقائص منسوب کیئے گئے جن سے اس کی ذات منزہ اور مبرا ہے۔ مثلاً: خبیث قسم کے یہودیوں نے اللہ تعالیٰ کو فقیر کہا۔ اور بعض نے کہا: اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بند ہو چکے ہیں۔ (نعوذباللہ ثم نعوذباللہ)

① (الاعراف: ۱۸۰)

الحاد کا ایک طریقہ یہ بھی اپنایا گیا کہ اسماء الحسنیٰ کو ان کے معانی سے خالی سمجھ لیا گیا، اور انکے حقائق و خصائص کا انکار کر دیا گیا۔ مثلاً: جہمیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات محض الفاظ ہیں یہ کسی معنی یا حقیقت پر دلالت نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ اس کا سمیع اور بصیر ہونا تو مانتے ہیں، لیکن صفتِ سمع و بصر کا انکار کرتے ہیں۔

الحاد کی ایک صورت یہ بھی اختیار کی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوقات کی صفات سے تشبیہ دی گئی۔ ان لوگوں کو مُشَبِّہَہ کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر قسم کے الحاد سے بلند و بالا ہے۔ اور اس کا یہ عظیم احسان ہے کہ اس نے اپنے رسول ﷺ کے سچے پیروکاروں اور فدائیانِ سنت کو ہر قسم کے الحاد سے پاک وصاف رکھا۔ چنانچہ ان کا یہ انتہائی پاکیزہ اور نفیس ترین عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جو صفت جس طرح بیان فرمادی وہ اس صفت کا اسی طرح ہی مستحق ہے کہ یہی جنابِ ربوبیت کے لائق ہے۔ وہ نہ تو کسی صفت کا انکار کرتے ہیں اور نہ ہی کسی صفت کو مخلوقات کی صفت سے تشبیہ دیتے ہیں اور نہ ہی کسی صفت کی لفظی ومعنوی شرعی غرض سے انحراف کرتے ہیں۔ اور ان کا اللہ تعالیٰ سے کسی صفتِ نقص کی نفی کرنا تعطیل و انکار کے شائبہ سے پاک ہے۔ وہ نہ تو مشبہ ہیں جو کسی صنم کی پوجا کریں اور نہ ہی معطلہ ہیں جو عدم کو پوجیں، بلکہ وہ اہل السنۃ اور موحدین ہیں جو تمام امتوں اور ملتوں میں وسط ہیں اور ایک الٰہ کے پجاری ہیں۔



اس باب کے مسائل

(۱) اللہ تعالیٰ کے اسماء کا اثبات۔

(۲) ان اسماء کا سب سے بہترین ہونا۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے واسطہ سے دُعا مانگنے کا حکم۔

(۴) اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں الحاد کرنے والوں سے قطعِ تعلق کا حکم۔

(۵) اسماء الحسنیٰ میں الحاد کرنے کا مفہوم (جس کی کئی صورتیں بیان ہوئیں)

(۶) الحاد کرنے والے کیلئے شرعی وعید۔



باب لا یقال السلام علی اللہ

''اَلسَّلامُ عَلَی اللہ'' کہنے کی ممانعت

قال: فی الصحیح عن ابن مسعود ﷛ قَالَ: كُنَّا اِذَا كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِی الصَّلٰوةِ قُلْنَا: اَلسَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ عِبَادِهِ ، اَلسَّلَامُ عَلٰى فُلَانٍ ، فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ :"لَا تَقُوْلُوْا اَلسَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ ، فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَالسَّلَامُ"

صحیح (بخاری و مسلم) میں سیدنا عبد اللہ بن مسعود ﷛ کی روایت ہے، کہتے ہیں: جب ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہوتے تو یوں کہتے: بندوں کی طرف سے اللہ تعالیٰ پر سلام ہو اور اس کے علاوہ فلاں پر سلام ہو، تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''یہ مت کہا کرو کہ اللہ تعالیٰ پر سلام ہو کیونکہ بے شک اللہ تعالیٰ خود "السلام" ہے۔''

لفظ سَلام کا اصل معنی: سلامتی، براءت اور ہر قسم کے عیب اور تکلیف سے خلاصی و نجات پانا ہے۔ چنانچہ جب ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" کہتا ہے تو گویا وہ اسے سلامتی کی، اور ہر قسم کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا دیتا ہے تو پھر "اَلسَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ" کہنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تو ہر ایک کو سلامتی مطلوب ہے وہ کسی کی طرف سے سلامتی کی دعا کا طالب نہیں ہے، وہ خود سلام ہے اور اس سے ہر قسم کی سلامتی اور عافیت صادر ہوتی ہے اور ہر بندہ سلامتی کے حصول کیلئے اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے:

﴿ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ﴾ ①

''تو کہہ دے کہ تمام تعریف اللہ ہی کیلئے ہے اور اس کے برگزیدہ بندوں پر سلام ہے''

نیز فرمایا: ﴿ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ ②

''پیغمبروں پر سلام ہے''

اور فرمایا: ﴿ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ﴾ ③

''جس دن یہ (اللہ سے) ملاقات کریں گے ان کا تحفہ سلام ہوگا''

لہذا وہ خود سلام ہے اور اس کی طرف سے ہر قسم کی سلامتی ہے۔

① (النمل: ٥٩)
② (الصافات: ١٨١)
③ (الاحزاب: ٤٤)

قوله : فی الصحیح عن ابن مسعود ﷺ قَالَ: كُنَّا اِذَا كُنَّا مَعَ ......

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم "السلام علی اللّٰہ" کے الفاظ آخری تشہد میں کہا کرتے تھے اور یہ اس وقت کی بات ہے جب تشہد کے مشروع کلمات فرض نہیں ہوئے تھے، تو نبی ﷺ نے اس سے روک کر اس کی جگہ "التحیات ......" کی تعلیم دی، اور اس کی وجہ حدیث میں خود ہی واضح کر دی کہ ہر قسم کی سلامتی کا مالک اور عطا کنندہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، لہٰذا سلامتی کا احتیاج بندوں کو ہے سلامتی کے مالک ومتصرف کو نہیں، اسی لئے تشہد میں "اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِاللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ" کہہ کر اپنے اور تمام نیک بندوں کیلئے سلامتی کی دعا کی جاتی ہے، اس حدیث میں نبی ﷺ نے حقیقت توحید کا پہلو کس عمدگی سے اُجاگر کر دیا یعنی اللہ تعالیٰ جن اسماء وصفات کا مستحق ہے ان کی معرفت ہونی چاہیئے اس کے علاوہ اس کی بندگی کا طور وطریقہ بھی خوب معلوم ہونا چاہیئے۔

واضح ہو کہ "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" جو اہلِ اسلام کا آپس میں تحیہ وتحفہ ہے کے معنی کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' السلام علیکم سے مقصود دو چیزیں ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کا ذکر، کیونکہ ''السلام'' اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے اور اسکے ذکر ہونے پر دلیل عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث ہے: ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرا اور سلام کہا۔ آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا، بلکہ ایک دیوار کے پاس آکر تیمم کیا، پھر سلام کا جواب دیا اور فرمایا: ''میں صرف حالتِ طہارت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہوں'' ①

تو گویا ''السلام علیکم'' اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

دوسرا مقصود اپنے بھائی جسے سلام کہا جا رہا ہے کو سلامتی کی دعا دینا ہے (انتہیٰ ملخصا)



① سنن ابی داؤد : (٣٢٦) مسند احمد : (٧/ ١٩٠٥٦) سنن النسائی : (١/ ٣٧) سنن ابن ماجه : (٣٥٠)
صحیح ابن خزیمه : (٢٠٦)

اس باب کے مسائل

(۱) ''السلام'' کی تفسیر۔

(۲) ''سلام'' نیک خواہشات اور ہر قسم کی تکلیف سے بچے رہنے کی دعا پر مبنی ایک تحفہ ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کو سلام نہیں کہنا چاہیئے۔

(۴) اس کی ایک وجہ حدیث میں واضح ہو گئی کہ وہ خود سلامتی کا مالک ہے۔

(۵) تشہد کی حالت میں ''السلام علی اللہ '' کی بجائے دوسرے مناسب کلمات ''التحیات للہ والصلوات......'' پڑھنے کی تعلیم دینا۔



باب قول: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ اِنْ شِئْتَ

دعا کرتے ہوئے ''اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے معاف کر دے'' نہیں کہنا چاہیئے

قال: فی الصحیح عن ابی ھریرۃ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: "لَا یَقُوْلَنَّ أَحَدُکُمْ: أَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ إِنْ شِئْتَ، أَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ إِنْ شِئْتَ، لِیَعْزِمِ الْمَسْأَلَۃَ، فَإِنَّ اللّٰہَ لَا مُکْرِہَ لَہٗ"

ولمسلم "وَلْیُعَظِّمِ الرَّغْبَۃَ فَإِنَّ اللّٰہَ لَا یَتَعَاظَمُہٗ شَیْءٌ أَعْطَاہُ"

صحیح (بخاری ومسلم) میں سیدنا ابوھریرۃ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی بھی شخص (دعا مانگتے ہوئے) یوں نہ کہے: اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے معاف فرمادے (اور) اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم فرما، بلکہ پرعزم ہو کر سوال کرنا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا'' اور صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں: ''کہ (اللہ تعالیٰ کی بخشش ورحمت کی) خوب تر رغبت ہونی چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز بڑی نہیں ہے''

بندہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت سے پلک جھپکنے کے برابر بھی مستغنی وبے پرواہ نہیں ہو سکتا، بندہ تو فقیرِ محض ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ''غنی محض'' ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ یَا أَیُّھَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴾ ①

''اے لوگو! تم سب اللہ تعالیٰ کی طرف فقیر اور محتاج ہو اور اللہ تعالیٰ بے پرواہ اور لائق حمد وثناء ہے''

لہذا اگر بندے نے "أَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ إِنْ شِئْتَ" یعنی (اے اللہ! اگر تو چاہے تو معاف کر دے) کہہ دیا تو اس میں رحمت اور مغفرت سے استغناء اور بے پرواہی کا پہلو نکل سکتا ہے اور یہ چیز توحید کے سراسر منافی ہے۔

قولہ: فی الصحیح عن ابی ھریرۃ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: ......

امام قرطبی ؒ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے دعا میں اس قسم کے الفاظ کہنے سے اس لئے منع فرمایا کہ یہ الفاظ قلتِ رغبت کے ساتھ مغفرت ورحمت کی اہمیت کی قلت کا بھی مظہر ہیں، گویا کہنے والا یہ باور کروا رہا ہے کہ اگر مغفرت ورحمت

① (فاطر: ۱۵)

حاصل ہو گی تو ٹھیک ورنہ کوئی پروا نہیں، پھر اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے والے کا محتاج وافتقار بھی سامنے نہیں آتا، حالانکہ اپنی حاجت مندی اور فقر کو ظاہر کرنا دعا کی روح ہے، اس کے علاوہ ایسے شخص کو دعا کی قبولیت کا یقین بھی نہیں ہوتا اور ایسی دعا کی قبولیت کی کوئی صورت نہیں کیونکہ نبی ﷺ کی حدیث ہے:

''اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا کرو گویا تمہیں قبولیتِ دعا کا یقین ہے، اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ قلبِ غافل کی دعا قبول نہیں فرماتا'' ①



① سنن الترمذی: (٣٤٧٩) مستدرك الحاكم: (٤٩٣/١) اس حدیث میں ضعف ہے۔ کیونکہ صالح المری ضعیف راوی ہے۔

اس باب کے مسائل

(۱) دعا میں ''اگر تو چاہے'' کہنے کی ممانعت۔

(۲) اس کا سبب بھی بیان ہو گیا۔

(۳) نبی ﷺ کا فرمان: ''پورے عزم، اتقان اور وثوق سے دعا کرنی چاہیئے۔'' (یہ خوب قابلِ غور ہے)

(۴) دعا کرتے وقت رغبت اور خواہش زیادہ سے زیادہ ہونی چاہیئے۔

(۵) زیادہ سے زیادہ رغبت کے ہونے کی وجہ واضح ہوئی، یعنی اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز بڑی نہیں ہے، بلکہ بڑی سے بڑی رغبت اس کے سامنے معمولی ترین ہے۔



باب لایقول : عبدی و أمتی

اپنے غلام کو "عَبدِی" یا "اَمتِی" نہیں کہنا چاہیئے

قال: فی الصحیح عن ابی هریرة أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ :"لَا یَقُلْ أَحَدُکُمْ:أَطْعِمْ رَبَّکَ ، وَضِّیٔ رَبَّکَ وَلْیَقُلْ سَیِّدِیْ وَمَوْلَایْ وَلَایَقُلْ أَحَدُکُمْ:عَبْدِیْ وَأَمَتِیْ وَلْیَقُلْ فَتَایَ وَفَتَاتِیْ وَغُلَامِیْ" ①

صحیح (بخاری ومسلم) میں سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص کسی غلام سے (اس کے آقا کے متعلق) یوں نہ کہے کہ اپنے رب کو کھانا کھلاؤ، اپنے رب (آقا) کو وضوء کراؤ بلکہ "سیدی ومولای" یعنی اپنا آقا کہنا چاہیئے، اسی طرح اپنے غلام کو "عبدی" (میرا بندہ) یا "أَمَتِیْ" (میری لونڈی) نہیں کہنا چاہیئے، بلکہ اپنا لڑکا، لڑکی یا اپنا غلام کہنا چاہیئے"

کیونکہ "عَبْدٌ" اور "أَمَةٌ" اگرچہ غلام اور لونڈی کے معنی میں مستعمل ہیں لیکن یہ دونوں لفظ بندہ اور بندی کے معنی میں بھی استعمال کیئے جاتے ہیں لہذا اس میں ربوبیت میں مشارکت کا شبہ پیدا ہوتا ہے، لہذا جنابِ ربوبیت کے ساتھ حسنِ ادب اور عقیدۂ توحید کی حمایت کے پیش نظر اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے کی شرعی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

قوله : فی الصحیح عن ابی هریرة أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ :"لَا یَقُلْ ......

اس حدیث سے واضح ہوا کہ آقا کو رب کہنا ناجائز ہے۔

اس ممانعت کا سبب

اس کا سبب بیان کرتے ہوئے امام خطابی رحمہ اللہ نے فرمایا: "چونکہ انسان اللہ تعالیٰ کیلئے خالص توحید اپنانے اور ہر قسم کے شرک سے احتراز کرنے پر مامور ومکلف ہے، لہذا ایسے نام نہیں اختیار کرنے چاہئیں جو اللہ تعالیٰ سے مشابہت کی بناء پر شرک کے شائبہ کی زد میں آجائیں اور اس مسئلے میں آزاد اور غلام کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے" ......الخ

آقا کو سید کہنے کا جواز نیز "سید" اور "رب" میں فرق

اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اپنے آقا کو رب کی بجائے سید (آقا) کہنا چاہیئے رب اور سید

---

① بخاری : الرقم:(٢٥٥٢)

میں فرق یہ ہے کہ رب بالاتفاق اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے جب کہ سید کے اسماء حسنیٰ میں سے ہونے میں اختلاف ہے بہرصورت قرآنِ حکیم میں لفظ سید اللہ تعالیٰ کے نام کے طور پر استعمال نہیں ہوا اور ایسی صورت میں دونوں کا فرق واضح ہے۔

اور عبداللہ بن شخیر ﷛ کی ایک حدیث میں اللہ تعالیٰ کو ''السیـــــد'' کہا گیا ہے اس صورت میں بھی فرق حاصل ہوسکتا ہے اور وہ اس طرح کہ لفظِ سید کا اسماءِ حسنیٰ میں سے ہونا اس قدر مشہور و مستعمل نہیں جس قدر لفظِ رب ہے، اس کے علاوہ لغوی اعتبار سے لفظِ سید کے استعمال کے جائز ہونے کا پہلو نکلتا ہے، کیونکہ سیـد، ''سـؤدد'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی تقدم (آگے ہونا ہے) اور بلاشبہ آقا اپنے غلام سے آگے ہی ہوتا ہے، پھر عبداللہ بن شخیر ﷛ کی حدیث میں لفظِ سید کے غیر اللہ پر استعمال کی ممانعت تو وارد نہیں ہوئی، جبکہ صحیحین کی زیرِ بحث روایت میں اس لفظ کے غیر اللہ پر استعمال کرنے کا جواز انتہائی صراحت سے ثابت ہے۔

حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ آقا کو ''مولای'' بھی نہیں کہنا چاہیئے اس لئے کہ تم سب کا مولیٰ اللہ ہے۔ ان دونوں حدیثوں میں اگرچہ بظاہر تعارض ہے لیکن تطبیق کی صورت ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ غیر اللہ کیلئے مولی کا لفظ استعمال کرنا جائز ہے، لیکن بدلیل حدیث بخاری و مسلم بہتر یہ ہے کہ استعمال نہ کیا جائے

(بدلیل حدیث مسلم شریف) جس طرح غلام کو چاہیئے کہ وہ اپنے آقا کو رب نہ کہے اسی طرح آقا کو چاہیئے کہ وہ اپنے غلام کو اپنا بندہ یا اپنی بندی نہ کہے کیونکہ عبودیت اور بندگی کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے پھر کسی کو اپنا بندہ کہنے میں جو اپنی تعظیم نکلتی ہے وہ تعظیم مخلوق کے لائق نہیں۔

ابوداؤد میں بسندِ صحیح سیدنا ابوھریرۃ ﷛ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کوئی آقا اپنے غلام کو اپنا بندہ یا بندی نہ کہے اور کوئی غلام اپنے آقا کو اپنا رب نہ کہے، بلکہ آقا کو چاہیئے کہ وہ اپنے غلام کو اپنا لڑکا یا لڑکی کہے اور غلام کو چاہیئے کہ وہ اپنے مالک کو سید یا سیدۃ کہے کیونکہ تم سب مملوک ہو اور رب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے'' ①

ابوجعفر النحاس کا قول ہے کہ علماء کا اس بارہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کسی مخلوق کو ''مـولای'' نہیں کہنا چاہیئے نہ ہی کسی غلام کو "عبـدك" یا "عبـدی'' کہنا چاہیئے نبی ﷺ نے جب غلاموں کو ''مـولای'' کہنے سے روکا تو یہ ممانعت احتراز کیلئے کتنی قابل توجہ ہوگی؟

① حسن: مسنداحمد: (۳/۹۴۷۵، ۹۹۷۱، ۱۰۲۸۵) الادب المفرد، للبخاری: (۲۱۰) سنن ابی داؤد: (۴۹۶۵)

اس باب کے مسائل

(۱) اپنے غلاموں کو اپنا بندہ یا بندی کہنے کی ممانعت۔

(۲) غلام اپنے آقا کو اپنا رب نہ کہے اور نہ ہی غلام سے یوں کہا جائے کہ اپنے رب کو کھانا کھلاؤ......

(۳) آقا کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اپنے غلام کو اپنا بندہ کہنے کی بجائے اپنا لڑکا یا لڑکی یا غلام کہے۔

(۴) اور غلام کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اپنے مالک کو اپنا رب کہنے کی بجائے اپنا سید یا مولیٰ کہے۔

(۵) ان احادیث میں اصل مقصود کی نشاندھی کر دی گئی کہ ظاہری الفاظ کے استعمال میں بھی توحید کے تقاضوں کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔



باب لا یرد من سأل باللہ

اللہ تعالیٰ کے نام پر سوال کرنے والے کو خالی ہاتھ نہ لوٹایا جائے

قال: عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما قال: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "مَنِ اسْتَعَاذَ بِاللّٰہِ فَأَعِیْذُوْہُ وَمَنْ سَأَلَ بِاللّٰہِ فَأَعْطُوْہُ وَمَنْ دَعَاکُمْ فَأَجِیْبُوْہُ وَمَنْ صَنَعَ إِلَیْکُمْ مَعْرُوْفًا فَکَافِئُوْہُ فَإِنْ لَمْ تَجِدُوْہُ مَاتُکَافِئُوْہُ، فَادْعُوْا لَہٗ حَتّٰی تَرَوْا أَنَّکُمْ قَدْ کَافَأْتُمُوْہُ" (رواہ ابوداؤ والنسائی بسند صحیح) ①

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اللہ کے نام کی پناہ مانگی اسے پناہ دو اور جس نے اللہ تعالیٰ کے نام پر سوال کیا اسے دے دو، اور جس نے تمہیں دعوت دی اسکی دعوت قبول کرو اور جس نے تمہارے ساتھ کوئی نیکی کی اسے اس کا بدلہ دو اگر بدلہ دینے کیلئے کچھ نہ پاؤ تو اس کیلئے خوب دعا کرو حتی کہ تمہیں یقین ہو جائے کہ بدلہ کا حق ادا ہو گیا'' (اسے ابوداؤد اور نسائی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سوال کرنے والے نے چونکہ اللہ تعالیٰ کا نام لیا ہے لہذا اس عظیم اور مبارک نام کی تعظیم وتکریم کے پیشِ نظر سائل کو ضرور کچھ نہ کچھ دینا چاہیئے، دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ سائل نے اپنی ضروریات پوری کرنے اور احتیاج کی وجہ سے ہی سوال کیا ہے لہذا اسکی ضرورت پوری کرنے کیلئے اسکی مدد ضروری ہے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے کسی کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قسم کو پورا کردینے کا حکم دیا ہے، اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی ذات کی تکریم وتعظیم کا نکتہ پنہاں ہے، بہت سے علماء نے اس امر کو وجوب پر محمول کیا ہے جبکہ بعض استحباب کے قائل ہیں۔

حدیث (مَنِ اسْتَعَاذَ بِاللّٰہِ فَأَعِیْذُوْہُ......) سے ماخوذ چار اہم احکام

(ا) پہلا مسئلہ: پناہ کے طالب کو پناہ دینا، جس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام سے اگر کوئی شخص تم سے یا تمہارے کسی غیر کے شر سے نجات حاصل کرنے کا طالب ہو، مثلاً: یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے مجھے اپنے یا فلاں کے شر سے باز رکھیئے تو اس عظیم اور مبارک نام کی تعظیم کا تقاضہ یہ ہے کہ اس شر کا ازالہ کر دینا چاہیئے، اس لئے

---

① اسنادہ صحیح: سنن ابی داؤد: (١٦٦٩) سنن النسائی: (٥/٨٢) مسند احمد: (٢/٦١١٤) الادب المفرد، للبخاری: (٢١٦) ریاض الصالحین: (١٧٢٥).

جب ''الجونیۃ'' نے آپ ﷺ سے کہا: ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْکَ'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو نے عظیم ذات کی پناہ مانگی، لہذا اپنے اہل کی طرف لوٹ جاؤ، یہ کہہ کر طلاق دے دی۔

(۲) دوسرا مسئلہ: اللہ تعالیٰ کے نام سے مانگنے والے کو دینا، مثلاً کوئی شخص یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے میرا فلاں کام کر دیجئے یا مجھے فلاں چیز دے دیجئے تو ایسے شخص کی حاجت پوری کرنا چاہیئے کیونکہ حدیث کا ظاہری مفہوم وجوب پر ہی دلالت کرتا ہے بشرطیکہ اس کا سوال ہر قسم کے گناہ کے پہلو سے پاک ہو۔

رسول اللہ ﷺ کی اس معنی میں چند مزید احادیث قابل غور ہیں:

(۱) سیدنا ابوموسی الاشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نام پر لوگوں سے مانگنے والا ملعون ہے اور وہ شخص بھی ملعون ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ کے نام پر مانگا جائے اور وہ منع کر دے'' (بشرطیکہ کوئی گناہ کا سوال نہ ہو)

اس حدیث کو امام طبرانی نے بسند صحیح روایت کیا ہے، صرف طبرانی کے استاد یحیی بن عثمان بن صالح پر کچھ کلام ہے لیکن اکثر محدثین سے اس کی توثیق ہی منقول ہے، بہر حال یہ حدیث احتجاج کے درجہ کو پہنچتی ہے (کیونکہ اس کے مفہوم پر اور بھی احادیث ہیں) اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر مانگنے والے کو رد کر دینا گناہ کبیرہ ہے۔

(۲) ابن حبان و ترمذی میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بسندِ صحیح موجود ہے: ''کیا میں تمہیں سب سے بُرے آدمی کے متعلق نہ بتاؤں؟ وہ شخص جس سے اللہ تعالیٰ کے نام پر سوال کیا جائے اور وہ نہ دے'' ①

(۲) سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تمہیں تمام مخلوقات میں سے سب سے بُرے شخص کے متعلق نہ بتاؤں؟ صحابہ نے عرض کیا: جی ہاں یا رسول اللہ! تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ وہ شخص ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے نام سے سوال کیا جائے اور وہ نہ دے'' ②

ان تمام احادیث سے وجوب کا پہلو نکلتا ہے اگرچہ فقہاء نے اسے استحباب پر محمول کیا ہے لیکن بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر سوال کرنے والے کو دینا واجب ہے۔

① صحیح: مسند احمد: (۲۱۱۶/۱، ۲۹۳۰) سنن الترمذی: (۱۶۵۲) سنن النسائی: (۸۳/۵) سنن الدارمی: (۲۰۱/۲).

② مسند احمد: (۹۱۵۳/۳) اس کی سند میں ابووھب ضعیف راوی ہے۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کے نام سے کوئی معمولی چیز طلب نہیں کرنی چاہیئے بلکہ انتہائی اعلیٰ چیزوں کا سوال کرنا چاہیئے۔

تیسرا مسئلہ: اس حدیث میں مذکورہ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان بھائی کی دعوت کو قبول کرنا چاہئے ، بلکہ اگر دعوتِ ولیمہ ہو اور اسے قبول کرنے کے تمام مواقع میسر ہوں تو دعوت قبول کرنا واجب ہے، تفصیلی شروط کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

چوتھا مسئلہ: یہ ہے کہ احسان کرنے والے کو اس کے احسان کا بدلہ دینا چاہیئے ، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے فرمایا: ''کیونکہ احسان کرنے والے سے طبعی طور پر دل میں محبت پیدا ہو جاتی ہے لہذا احسان کرنے والے کے ساتھ مکافات نہ کی جائے تو دل میں اضطراب اور بے چینی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا ازالہ مکافات سے ہی ممکن ہے......''

بعض علماء نے لکھا ہے کہ مکافات کی مشروعیت کی وجہ یہ ہے کہ دل مخلوق کے احسان سے پاک ہو جائے اور حق تعالیٰ کے ساتھ متعلق ہو جائے۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر بدلہ دینے کیلئے پاس کچھ نہ ہو تو پھر احسان کرنے والے کے حق میں خوب دعا کرنی چاہیئے یعنی اسے اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ بہترین بدلہ دینے والا ہے، ترمذی اور نسائی کی ایک حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ "جزاك الله خيرا" کہنا بہترین ثناء و دعا ہے۔



اس باب کے مسائل

(۱) اللہ تعالیٰ کے نام پر پناہ مانگنے والے کو پناہ دینا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے نام پر سوال کرنے والے کا سوال پورا کرنا۔

(۳) اپنے بھائی کی دعوت قبول کرنا۔

(۴) احسان کا بدلہ دینا۔

(۵) بدلہ دینے کی توفیق اور استطاعت نہ ہو تو دعا بہترین مکافات ہے۔

(۶) دعا اتنی کثرت سے کرنی چاہیئے کہ یقین ہو جائے کہ مکافات کا حق ادا ہو چکا ہے۔





باب لایسأل بوجه الله الا الجنة

اللہ تعالیٰ کی صفتِ "الوجہ" (چہرہ) کے واسطے سے صرف جنت ہی کا سوال کرنا چاہیئے

قال: عن جابر بن عبدالله رضی الله عنهما قال: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَا يُسْأَلُ بِوَجْهِ اللّٰهِ اِلَّا الْجَنَّةُ" (رواہ ابو داؤد ایضا) ①

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کی صفت "الوجہ" (چہرہ مبارک) کے واسطہ سے صرف جنت کا سوال کیا جائے" (اس حدیث کو ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے)

اللہ تعالیٰ کے مبارک "الوجہ" کی تعظیم اور اکرام وجلال کا تقاضہ یہی ہے کہ اس کے واسطے سے اللہ تعالیٰ سے وہ چیز طلب کی جائے جو "غایت المطالب" کے درجہ پر فائز ہے اور ظاہر ہے کہ سب سے اعلیٰ اور عظیم چیز صرف جنت ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت "الوجہ" قرآنِ حکیم کی اس آیتِ کریمہ سے ثابت ہو رہی ہے:

﴿ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ﴾ ②

اللہ تعالیٰ کیلئے صفت "الوجہ" (چہرہ) کا اثبات اور اس کے متعلق اہل سنت کا منہج

قوله: عن جابر بن عبدالله رضی الله عنهما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ......

اس حدیث سے اللہ تعالیٰ کی صفتِ "الوجہ" ثابت ہو رہی ہے، اھل السنۃ نے اس صفت کو بقیہ صفاتِ باری تعالیٰ کی طرح قبول کیا ہے، چنانچہ یہ صفت اللہ تعالیٰ کے ساتھ اسی طرح ثابت ہے جس طرح اس کے جلال وکبریائی کے لائق ہے بلا تکییف وتحدید اور بلا تمثیل وتعطیل۔

جہمیہ اس صفت کے منکر ہیں اور "الوجہ" بمعنی ذات قرار دیتے ہوئے اس میں تاویل کے مرتکب ہوئے ہیں جو کہ باطل مذہب ہے۔ (واللہ المستعان)

---

① سنن ابی داؤد: (١١٦٨) سنن الکبریٰ للبیهقی: (٤/١٩٩) اسکی سند میں سلیمان بن قرم بن معاذ ضعیف راوی ہے۔
② (الرحمن: ٢٧)

اس حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت "الـوجـہ" کا واسطہ دے کر صرف جنت ہی طلب کرنی چاہیئے ، یوں کہنا چاہیئے "أَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْأَلُكَ بِوَجْهِكَ الْكَرِيْمِ أَنْ تُدْخِلَنِي الْجَنَّةَ" "اے اللہ! تجھے تیرے مبارک چہرے کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ مجھے جنت کا داخلہ عطا فرما دے"

بعض علماء نے اس حدیث کا یہ مفہوم لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس عظیم صفت کا واسطہ دے کر لوگوں سے کچھ نہیں مانگنا چاہیئے ، اور یہ دونوں معنی درست ہیں۔

امام عراقی فرماتے ہیں: جنت کا ذکر برائے تخصیص نہیں بلکہ جنت کے ذکر میں یہ اشارہ پنہاں ہے کہ اس مبارک صفت کے واسطے سے بڑی عظیم شے طلب کرنی چاہیئے ، نہ کہ معمولی چیز۔

بہر حال جنت اور ہر وہ چیز جو جنت میں پہنچانے کا ذریعہ بن سکتی ہے طلب کر سکتے ہیں ، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے غضب یا عذابِ جہنم سے پناہ بھی طلب کر سکتے ہیں ، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ ﴾ ① نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: "أَعُوْذُ بِوَجْهِكَ" الحدیث۔ ②



① (الانعام:٦٥) ② (بخاری ، التوحید ، الرقم:(٧٤٠٦)

اس باب کے مسائل

(۱) اللہ تعالیٰ کا نام لے کر انتہائی اعلیٰ اور قیمتی چیز مانگنی چاہیئے (اور سب سے قیمتی چیز جنت ہے)

(۲) اللہ تعالیٰ کیلئے صفت "الــوجــه" کا اثبات (اس صفت کو اسی طرح قبول کر لینا چاہیئے جس طرح وارد ہوئی، جہمیہ وغیرہ کی طرح صفت "الوجه" کو بمعنی ''ذات'' کرنے کی تاویل قطعاً غلط ہے بحمد اللہ سلف کا عقیدہ رکھنے والے اس صفت کو بقیہ صفات کی طرح قبول کرتے ہیں، بلا تکییف وتحدید اور بلا تمثیل وتعطیل۔



باب ماجاء فی اللو

''لو'' (اگر) کہنے کا بیان

قال: وقول اللہ تعالیٰ: ﴿ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا ﴾ ①

''یہ (منافقین) کہتے ہیں کہ اگر معاملہ کچھ بھی ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم یہاں مارے نہ جاتے''

قواعد شرعیہ کی روشنی میں یہ بات مسلم ہے کہ تقدیر کو تسلیم کیئے بغیر توحید کو کمال حاصل نہیں ہوتا۔ کوئی بھی مصیبت پہنچے اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کر قبول کر لینا چاہیئے اور ایسے موقع پر راضی برضائے مولیٰ ہو کر صبر و تحمل اور رجوع الی اللہ کا عملی مظاہرہ کرنا چاہیئے اور لفظ ''اگر'' کے استعمال سے بچنا چاہیئے۔ (مثلاً اس قسم کے جملے استعمال نہ کرے کہ اگر میں یوں کر لیتا تو یہ تکلیف نہ پہنچتی یا اگر فلاں موجود ہوتا تو یہ تکلیف نہ پہنچتی ......)

کیونکہ لفظ ''اگر'' غم و حسرت کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ کسی حد تک تقدیر سے عداوت اور عدمِ تسلیم کا مظہر ہے، اور ظاہر ہے یہ روش توحید کے سراسر منافی ہے لہذا توحید کی حقیقت نکھارنے کیلیئے مؤلف رحمہ اللہ نے یہ باب قائم فرمایا۔

آیت ﴿ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ ..... ﴾ کی تفسیر

یہ گفتگو منافقین نے جنگِ احد کے موقع پر کی تھی چنانچہ ابن اسحاق اپنی سند سے یہ حدیث لائے ہیں:

عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''میدانِ بدر میں جب ہمارا خوف بڑھ گیا تو اللہ تعالیٰ نے برائے سکون و اطمینان ہم پر نیند طاری کر دی، چنانچہ ہم میں سے ہر شخص کی ٹھوڑی اس کے سینے پر ٹکی ہوئی تھی اس وقت معتب بن قشیر کچھ گفتگو کر رہا تھا اور میں خواب کی سی کیفیت میں اس کی باتیں سن رہا تھا وہ کہہ رہا تھا: اگر بات ہمارے بس میں ہوتی تو ہم یہاں یوں قتل ہو جانے والے نہ ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بات سے بذریعہ وحی رسول اللہ ﷺ کو آگاہ فرما دیا اور فرمایا ان منافقین سے کہہ دو: ''اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو جن کی موت لکھی جا چکی ہے وہ خود بخود اپنی قتل گاہوں کی جانب بھاگ نکلتے۔'' ②

لہذا یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر ہے اور حتمی حکم ہے جس سے فرار و انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ تقدیر میں طے شدہ امور میں ''اگر'' کا لفظ استعمال کرنا منافقین کا شیوہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس روش کی تردید فرمائی کہ تقدیر میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ تو لامحالہ پہنچتا ہے لہذا ایسے
=

① (آل عمران: ١٥٤)
② حسن: ابن اسحاق (١/٤١٨) ابن جریر: (٤/٩٢)۔

قال:وقول اللہ تعالیٰ: ﴿ اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِہِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَاقُتِلُوْا ﴾ ①

"یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے خود تو جنگ میں شرکت نہیں کی لیکن شرکت کرنے والے (مسلمانوں) کے متعلق کہتے تھے کہ اگر یہ ہماری اطاعت کرتے تو یہ نہ مارے جاتے"

=

موقعہ پر اگر یا کاش وغیرہ کے الفاظ استعمال کرنا صرف حسرت وندامت میں اضافہ کرتا ہے جب کہ توحید کی پختگی اور رسوخ کیلئے ضروری ہے کہ ایسی حالت میں ایمان باللہ، صبر وتحمل اور اس تکلیف پر اچھے ثواب کی امید رکھنے کا مظاہرہ کیا جائے یہی دنیا وآخرت میں کامیاب ہونے کی ضمانت ہے اور اس عادت کے اپنانے سے خوف کی جگہ امن اور حزن وملال کی جگہ مسرت وفرحت کا حصول یقینی ہو جاتا ہے۔

عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کیا خوب فرمایا کرتے تھے:

"اب میرے لئے خوش رہنے کا کوئی موقعہ نہیں الاّ یہ کہ تقدیر میں لکھے گئے مصائب ومشاق کے پہنچنے پر خوش ہو لیتا ہوں"

آیت ﴿ اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِہِمْ وَقَعَدُوْا..... ﴾ کی تفسیر

یہ جنگِ اُحد کا ذکر ہے جب رسول اللہ ﷺ ایک ہزار کا لشکر لے کر میدانِ اُحد میں پہنچے تو عبد اللہ بن ابی (منافقین کا سردار) اپنے تین سو آدمی لے کر میدانِ جنگ سے باہر آ گیا چنانچہ جب ستر (۷۰) مسلمان شہید ہوئے تو منافقین اور خاص طور پر عبد اللہ بن ابی یہ کہتا پھر رہا تھا کہ اگر یہ مسلمان ہمارے مشورے پر عمل کرتے تو اس طرح نہ مارے جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اے محمد! ان سے یہ کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو اپنے آپ سے کلیۃً موت کو رفع کر کے دکھاؤ"

یعنی اگر جنگ میں شرکت نہ کرنا موت کے پنجوں سے بچا لیتا ہے تو تم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے موت سے بچ کر دکھاؤ اور ایسا ناممکن ہے موت نے بہرحال آنا ہے خواہ تم اپنے آپ کو مضبوط محلات میں مقید کر لو۔

بہرحال یہاں بھی منافقین نے لفظ "اگر" کا استعمال کیا جو فی الواقع بے محل اور غیر مفید ہے اس لفظ میں حسرت وندامت کا سامان تو پوشیدہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ تقدیر کے ٹل جانے کی بھی کوئی صورت نہیں ہے تو پھر اس سے بہتر ہے کہ صبر واستقامت کا مظاہرہ کیا جائے اور راضی برضائے الٰہی ہو کر اضافۂ حسنات کی سعادت حاصل کی جائے، موت تو اللہ تعالیٰ کے امرِ مقدر سے اپنے وقت پر آتی ہے خواہ کوئی شخص وسطِ معرکہ میں ہو یا اپنے مضبوط ترین قلعہ میں بند ہو۔

---

① (آل عمران: ۱۶۸)

قال فی الصحیح :عن ابی ھریرۃ ؓ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:" إِحْرِصْ عَلٰی مَایَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجِزْ وَإِنْ أَصَابَكَ شَیْءٌ ، فَلَا تَقُلْ :لَوْ أَنِّیْ فَعَلْتُ لَكَانَ كَذَا وَكَذَا وَلٰكِنْ قُلْ: قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَاشَاءَ فَعَلَ ، فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّیْطَانِ " ①

صحیح مسلم میں سیدنا ابوھریرۃ ؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''نفع بخش کاموں کی حرص رکھا کرو، اور اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کیا کرو، اور عاجز بن کر مت رہو اور اگر کوئی تکلیف پہنچے تو یوں نہ کہنا شروع کر دیا کرو: اگر میں یوں کر لیتا تو اس طرح، اس طرح ہو جاتا، البتہ یہ کہا کرو: یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر ہے اور جو وہ چاہتا ہے وہی کچھ کرتا ہے بلا شبہ لفظِ ''اگر'' شیطانی کاموں کا دروازہ کھولتا ہے۔''

حدیث "إِحْرِصْ عَلٰی مَایَنْفَعُكَ......" کی تفسیر

اس حدیث کو مؤلف ؒ نے مختصراً ذکر فرمایا ہے حدیث کے شروع میں یہ الفاظ بھی ہیں:

"اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ وَأَحَبُّ إِلَی اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ وَفِیْ كُلٍّ خَیْرٌ......"

''یعنی طاقتور مؤمن اللہ تعالیٰ کے نزدیک کمزور مؤمن سے زیادہ بہتر اور پسندیدہ ہے ویسے دونوں میں بہتری ہے۔''

یعنی طاقتور و کمزور دونوں بہتر ہیں کیونکہ ایمان اور عملِ صالح کے زیور سے دونوں آراستہ ہیں۔ طاقت سے مراد محض بدنی طاقت نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کو سختی سے اپنانا اور ان کی تنفیذ کرنا، نیک کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں ملنے والی تکلیفوں کو صبر و تحمل سے برداشت کرنا یہ امتیازات اور اس قسم کی دیگر وجوہ مؤمنِ قوی کی فوقیت و برتری کا باعث ہیں۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے انبیاءِ کرام کی مدح وستائش فرمائی، ارشاد ہے:

﴿ وَاذْكُرْ عِبَادَنَا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ ﴾ ②

''ہمارے بندوں ابراھیم، اسحٰق، اور یعقوب علیہم السلام کا بھی لوگوں سے ذکر کرو جو ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے''

نیز فرمایا:﴿ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُودَ ذَا الْأَيْدِ إِنَّهُ أَوَّابٌ ﴾ ③

''ہمارے بندے داؤد کو یاد کریں جو بڑی قوت والا تھا، یقیناً وہ بہت رجوع کرنے والا تھا''

---

① (صحیح مسلم ، القدر ، الرقم:(٢٦٦٤)

② (ص:٤٥) ③ (ص:١٧)

اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ دین و دنیا کیلئے نفع بخش کاموں کی حرص اور خواہش رکھنا اور پھر عملاً ایسے کاموں کو اختیار کرنا کمالِ ایمان کی نشانی ہے نیز یہ حرص اور عمل اللہ تعالیٰ کی توفیق اور معرفت کے بغیر ممکن نہیں ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا: "وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ" یعنی نفع بخش کاموں کے حصول کیلئے صرف اللہ تعالیٰ سے مدد اور توفیق طلب کیا کرو، کسی غیر کے در پر دستک دینا محض عبث اور بے کار ہے اور خوف ناک قسم کے انجام کا پیش خیمہ ہے اس لئے نماز میں: ﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴾ کہنے کی تعلیم دی گئی اور اسی لئے نبی پاک ﷺ اپنے خطبہ میں "أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ" کے الفاظ فرمایا کرتے تھے۔ اور دعاءِ قنوت میں: "اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْتَعِينُكَ" کے الفاظ مروی ہیں۔ ①

اسکے علاوہ آپ ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ نماز کے بعد یہ کلمات ضرور کہا کرو:

"اَللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ" ②

''اے اللہ! تو میری مدد فرما کہ میں تیرا ذکر کر سکوں، تیرا شکر ادا کر سکوں اور تیری اچھی عبادت کر سکوں''

گویا ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی توفیق اور معونت کا طلب گار رہنا چاہیئے اس کے بغیر مقامِ توحید کے حصول کا تصور قطعاً غیر معقول ہے۔ نبی ﷺ نے اس حدیث میں یہ تعلیم بھی ارشاد فرمائی ہے کہ'' عاجز بن کر مت رہا کرو'' مقصد یہ ہے کہ اپنے دین اور دنیاوی مقاصد اور نفع بخش امور کی طلب میں کسی عجز اور کوتاہی کا مظاہرہ نہ کیا کرو، مثلاً یہ سوچ کر کہ جو تقدیر میں لکھا ہے مل جائے گا بیٹھے رہو، اور محنت و جستجو ترک کر دو، یہ سوچ غلط ہے اور درست راستہ یہ ہے کہ مقاصد کے حصول کی خواہش بھی خوب ہو اس کیلئے کوشش اور محنت بھی اعلیٰ درجہ کی ہو اور ان سب کے ساتھ ساتھ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ سے مدد کی طلب بھی ہو اور اس کی ذات پر کامل توکل بھی ہو، ان دونوں راہوں پر چلنے والا دونوں جہانوں کی خیر و سعادت کا مستحق بن جاتا ہے۔

حدیث کا آخری حصہ " فَإِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ " اس باب سے متعلق ہے، اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ تکلیف پہنچنے پر ایک مؤمن کا کردار کیا ہونا چاہیئے، چنانچہ کسی بھی نقصان کے حاصل ہونے پر انسان کی دو حالتوں میں سے کوئی ایک حالت بن جاتی ہے، یا تو عاجزی کی حالت اور یہ حالت درحقیقت شیطانی عمل کی چابی ہے جو انسان کو'' اگر'' کہنے پر مجبور کر دیتی ہے جب کہ یہاں'' اگر'' کہنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں کیونکہ اس سے تأسف اور حسرت میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔

① مصنف ابن ابی شیبۃ: (۳۱٤/۲) سنن الکبریٰ، للبیھقی: (۱۲۲/۲) یہ روایت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوفاً صحیح سند سے مروی ہے۔

② مسند احمد: (۲۲۱۸۰/۸) سنن ابی داؤد: (۱۵۱۹) سنن الترمذی: (۳۵۵۱) امام ترمذی نے اسے'' حسن صحیح'' کہا ہے۔

دوسری حالت یہ ہے کہ اس نقصان کو انسان نوشتۂ تقدیر جان کر قبول کر لے اور کسی قسم کے افسوس کا اظہار نہ کرے۔

ان دونوں حالتوں میں سے پہلی حالت کے اپنانے سے شریعت نے روک دیا ہے اور اس کی علت یہ بتائی ہے کہ یہ شیطانی عمل کی چابی ہونے کے ساتھ ساتھ حسرت و یاس میں اضافہ کا موجب بنتی ہے۔ جب کہ دوسری حالت انتہائی اطمینان بخش ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کے اضافۂ حسنات اور بلندی درجات کی ضامن ہے۔



اس باب کے مسائل

(۱) سورۂ آل عمران کی دونوں (مذکورہ) آیات کی تفسیر۔

(۲) کسی مصیبت میں گرفتار ہونے پر ''اگر یوں کرتا تو یہ نہ ہوتا'' وغیرہ کہنے کی صریح ممانعت وارد ہوئی ہے۔

(۳) لفظِ ''اگر'' استعمال کرنے کی ممانعت اس لئے وارد ہوئی کہ یہ لفظ شیطانی عمل کے دروازے کھولتا ہے۔

(۴) ایسے موقعہ پر اچھی گفتگو کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔

(۵) نفع بخش کاموں کی حرص وخواہش رکھنے اور پھران کاموں کے حصول کیلئے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

(۶) اوراس کی ضد یعنی عجز اور تکاسل اختیار کرنے سے روک دیا گیا۔



باب النهى عن سب الريح

ہوا کو گالی دینے کی ممانعت

قَالَ:عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ ﷺ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ:" لَا تَسُبُّوا الرِّيْحَ ، فَإِذَا رَأَيْتُمْ مَاتَكْرَهُوْنَ؛ فَقُوْلُوْا:أَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ خَيْرَ هَذِهِ الرِّيْحِ ، وَخَيْرَمَا فِيْهَا وَخَيْرَمَاأُمِرَتْ بِهِ ، وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَذِهِ الرِّيْحِ وَشَرِّمَا فِيْهَا وَ شَرِّ مَاأُمِرَتْ بِهِ" (صحححه الترمذی) ①

ابی بن کعب ﷺ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہوا کو گالی نہ دو، ہوا کے چلنے سے کوئی ناپسندیدہ معاملہ بن جائے تو یوں کہا کرو: اے اللہ! ہم تجھ سے اس ہوا کی خیر کا سوال کرتے ہیں اور جو خیر اس ہوا کے اندر ہے اور جس خیر کا اسے حکم دیا گیا ہے کا سوال کرتے ہیں، اور ہم اس ہوا کے شر سے تیری پناہ مانگتے ہیں اور اس شر سے جو اس ہوا کے اندر موجود ہے اور جس شر کا تو نے اسے حکم دیا ہے، سے بھی تیری پناہ طلب کرتے ہیں'' (اس حدیث کو ترمذی نے صحیح کہا ہے)

ہوا کو گالی دینے کی ممانعت کی وجہ

ہوا کو گالی دینے کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے امر کے تابع ہے اور اس کی جو بھی تاثیر ہے اپنی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے۔ گزشتہ صفحات میں زمانے کو گالی دینے کی ممانعت وحرمت مذکور ہوئی، ہوا کا معاملہ بھی ویسا ہی ہے۔

قوله :عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ ﷺ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ: لَا تَسُبُّوا الرِّيْحَ ......

یہ حدیث سیدنا ابی بن کعب ﷺ سے مروی ہے، جو کہ قبیلۂ بنوخزرج کے انصاری صحابی تھے، ابوالمنذر کنیت تھی، معرکۂ بدر میں شریک ہوئے، ان کے مناقب خاصے معروف ہیں، ان کی تاریخِ وفات میں مختلف اقوال ملتے ہیں، ھیثم بن عدی نے ۱۹ھ، جبکہ خلیفہ بن خیار نے ۳۲ھ بتلایا ہے، ایک قول یہ بھی ہے کہ امیر المؤمنین عمر بن الخطاب ﷺ کے عہدِ خلافت میں فوت ہوئے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا چلنے سے اگر آپ کو کوئی ضرر لاحق ہوتا ہے تو ہوا کو سبّ وشتم یا لعنت نہیں دینی چاہیئے؛ کیونکہ ہوا تو اللہ تعالیٰ کے امر وقہر کے تابع ہے، لہذا اسے گالی دینے کے بجائے اپنی بداعمالیوں سے توبہ کرنی چاہیئے، کیونکہ ہوا سے کسی قسم کا نقصان پہنچنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو

① مسنداحمد: (۲۱۱۹۶/۸) سنن الترمذی: (۲۲۵۲) امام ترمذی نے اسے "حسن صحیح" کہا ہے۔

تأدیب وتنبیہ ہے، اور بندے اگر اس نکتہ کو سمجھ جائیں تو یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی رحمت قرار پائے گی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گا کہ ہوا کا عذاب لیکر آنا رحمت ہونے کے خلاف نہیں ہے۔

مسند احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ میں سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ہوا اللہ تعالیٰ کی پھونک سے ہے، جو رحمت بھی لیکر آتی ہے عذاب بھی، لہذا ہوا کو گالی نہ دو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے اس کی خیر کا سوال کرو اور اس کے شر سے پناہ مانگو۔'' ①

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے ہوا کو گالی دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہوا کو گالی نہ دو وہ تو اللہ تعالیٰ کی مامور ہے، جس شخص نے کسی ایسی شئی کو گالی دی جس کی وہ اھل نہیں تو وہ گالی اس شخص پر لوٹ آئے گی۔'' ②

ہوا کو گالی دینے کی ممانعت کے متعلق علماء کے اقوال

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: '' ہوا کو گالی دینا قطعی نامناسب ہے، کیونکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزار مخلوق ہے، اللہ تعالیٰ کا ایک لشکر ہے، اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اسے اپنے امر سے رحمت بنا دیتا ہے اور جب چاہتا ہے اپنا انتقام اور عذاب بنا دیتا ہے۔''

مطرف کا قول ہے: ''اگر اللہ تعالیٰ ہوا روک لے تو آسمان وزمین کے مابین بدبو بھر جائے۔''

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ہوا چلنے سے کسی بھی ناپسندیدہ صورتحال (مثلاً، ہوا گرم ہے، یا انتہائی سرد ہے، یا اتنی قوی اور شدید ہے کہ کسی حادثہ کا باعث بن جاتی ہے) پر دعا کرنے اور اللہ تعالیٰ کی طرف انابت اور رجوع اختیار کرنے کی تعلیم فرمائی، کیونکہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور اس کی قضاء سے صادر ہوتے ہیں، حصولِ نعمت اور جلبِ خیر کا سب سے سہل راستہ اس کی اطاعت وشکر بجالانا ہے، جبکہ دفعِ شر اور ازالۂ نِقَم کا سب سے محکم راستہ اس کی طرف التجاء اور اس کی پناہ میں آجانا ہے۔

آندھی کے وقت کی مسنون دعا

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب ہوا کے جھکڑ چلتے تو رسول اللہ ﷺ فرماتے:

---

① حسن: مسنداحمد: (۳/۹۳۱۰) الادب المفرد، للبخاری: (۷۲۰) سنن ابن ماجه: (۳۷۲۷).

② اسناده صحیح: سنن ابی داؤد: (۴۹۰۸) سنن الترمذی: (۱۹۷۸) صحیح ابن حبان: (۱۹۸۸) دیکھئے: الآداب الشرعية، لابن مفلح (۱۱/۱).

" أَللّٰهُمَّ إِنِّى أَسْئَلُكَ خَيْرَهَا وَخَيْرَمَا فِيْهَا وَخَيْرَ مَا أَرْسَلْتَ بِهِ ، وَأَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَافِيْهَا وَشَرِّمَاأَرْسَلْتَ بِهِ "

''اے اللہ! میں اس کی ہر خیر کا طالب ہوں، نیز جو بھلائیاں اس کے اندر پوشیدہ ہیں، اور جن بھلائیوں کے ساتھ تو نے اس کو بھیجا ہے اور چلا رہا ہے ان تمام کا سوال کرتا ہوں، اور اس کے ہر شر سے پناہ کا طالب ہوں، نیز جو شر اس کے اندر موجود ہے یا جس شر کے ساتھ تو نے اسے چلایا ہے اس سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

جب آسمان پر بادل نمودار ہوتے تو آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک کا رنگ تبدیل ہو جاتا، آپ ﷺ کبھی اندر جاتے تو کبھی باہر، کبھی آگے آتے، کبھی پیچھے، جب بارش برسنا شروع ہوتی تو آپ ﷺ کی یہ کیفیت ختم ہوتی، عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس کیفیت کو بھانپ چکی تھیں، ایک دفعہ نبی ﷺ سے اس کی بابت پوچھ ہی لیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں ڈرتا ہوں کہ کہیں قومِ عاد والا معاملہ نہ بن جائے جنہوں نے اپنی بستی کی جانب بادل آتا دیکھا تو کہا یہ بادل ہمیں بارش دیں گے'' ①

آندھی چلنے، یا دیگر کسی مشکل گھڑی میں نبی ﷺ کی یہ کیفیت ہوا کرتی تھی، ایسے موقع پر آپ ﷺ کس طرح اللہ تعالیٰ سے التجاء وتعوذ فرمایا کرتے تھے، مگر اس شخص کا کردار آپ ﷺ کے اس پاکیزہ منہج سے کس قدر دور اور بھیانک ہے جو پریشانیوں کے ازالہ کیلئے طواغیت واموات کو پکارنے جیسی بدترین روش پر قائم ہے۔

(واللہ المستعان)



① (بخاری ،التفسیر،الرقم: (٤٨٢٩) مسلم ،صلاۃ الاستسقاء ،الرقم: ١٥/٨٨٩)

اس باب کے مسائل

(۱) باب میں مذکور حدیث سے معلوم ہوا کہ ہوا کو گالی دینا ناجائز ہے۔
(۲) اس حدیث میں یہ تعلیم بھی موجود ہے کہ کسی ناپسندیدہ چیز کو دیکھ کر اس کے خیر کی دعا کرنی چاہیئے۔
(۳) یہ بھی معلوم ہوا کہ ہوا از خود نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے امر سے چلتی ہے۔
(۴) یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہوا کو کبھی تو خیر کا حکم دیتا ہے اور کبھی شر کا۔



باب

اللہ تعالیٰ کے بارہ میں بدگمانی کی ممانعت

﴿ يَظُنُّونَ بِاللهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُونَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهُ لِلّٰهِ يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلٰى مَضَاجِعِهِمْ وَلِيَبْتَلِيَ اللهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَاللهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴾ ①

''وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ناحق جہالت بھری بدگمانیاں کر رہے تھے اور کہتے تھے کیا ہمیں بھی کسی چیز کا اختیار ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ کام کُل کا کُل اللہ کے اختیار میں ہے، یہ لوگ اپنے دلوں کے بھید آپ کو نہیں بتاتے، کہتے ہیں کہ اگر ہمیں کچھ بھی اختیار رہتا تو یہاں قتل نہ کیئے جاتے۔ آپ کہہ دیجئے کہ گو تم اپنے گھروں میں ہوتے پھر بھی جن کی قسمت میں قتل ہونا تھا وہ تو مقتل کی طرف چل کھڑے ہوتے، اللہ تعالیٰ کو تمہارے سینوں کی اندر کی چیز کا آزمانا اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو پاک کرنا تھا، اور اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید سے آگاہ ہے''

مؤلف رحمہ اللہ کا اس باب کو قائم کرنے کا مقصود یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھا گمان رکھنا ضروری ہے، بلکہ واجباتِ توحید میں سے ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی ایک نہائی مذموم فعل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھا گمان اس لیئے ضروری اور قابلِ تعریف ہے کہ یہ بندے کے اللہ تعالیٰ کی رحمت، احسان، عزت وقدرت اور کارسازی پر علم ویقین کا مظہر ہے، جب بندے کو ان امور کا علم ہوگا تو اس کا ثمرہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے ساتھ حُسنِ ظنی ہی قرار پائے گا، اس کے علاوہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے معانی کے حقائق کی معرفت رکھتا ہے تو ہر نام اور ہر صفت کی مناسبت سے حُسنِ ظنی بڑھتی جائیگی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت، عبودیتِ خاصہ پر مشتمل ہوتی ہے، جبکہ حُسنِ ظنی ہر صفت کے اس خاص معنیٰ پر ایمان وایقان کا مظہر ہے۔

ایک حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ایک فرمان اس طرح وارد ہوا ہے:

"أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ وَأَنَا مَعَهُ حِيْنَ يَذْكُرُنِيْ" ②

① (آل عمران: ۱۵٤)　② (بخاری، التوحید، الرقم: ۷٤۰۵) مسلم، العلم، الرقم: ۱٦۷۵)

''میں اپنے بندے کے اس گمان کے ساتھ ہوں جو وہ میرے بارہ میں قائم کرتا ہے، اور میرا بندہ جب میرا ذکر کررہا ہوتا ہے میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں''

صحیح مسلم میں بروایت سیدنا جابر رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات سے تین دن قبل فرمایا تھا:

"لَا یَمُوْتَنَّ أَحَدُکُمْ إِلَّا وَهُوَ یُحْسِنُ بِاللّٰهِ الظَّنَّ " ①

''تم میں سے ہر شخص کی موت اس طرح آنی چاہیئے کہ اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھا گمان ہو''

قوله : قول الله تعالىٰ: يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ....

یہ آیتِ کریمہ منافقین کے تذکرہ کے ضمن میں ہے، اس میں منافقین کے اللہ رب العزت کے ساتھ ظنِ سُوء قائم کرنے کا ذکر ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بہت سے مفسرین کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''یہاں اُن کے جس ظنِ باطل کا ذکر ہے وہ ان کا تقدیر کی تکذیب کرنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے جنگِ اُحد میں پہنچنے والے مسلمانوں کے نقصان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر معاملہ ہمارے ہاتھوں میں ہوتا اور نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ ہماری سن لیتے تو اتنے لوگ شہید نہ ہوتے، بلکہ پوری نصرت اور ظفر مندی مسلمانوں کے حصے میں آتی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس ظنِ باطل کو ظنِ جاہلیت قرار دیکر اُن کی تکذیب فرمائی، اور یہ واضح فرمایا کہ اس قسم کی باتیں کرنا اہلِ جاہلیت کا شیوہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے کسی قضاء وقدر کی تنفیذ کے بعد یہ دعوے کرتے ہیں کہ اگر یہ معاملہ ہمیں سونپا جاتا تو ہم یہ نقصان نہ ہونے دیتے، گویا وہ یہ دعویٰ کررہے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو ٹالنے پر قادر ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر اُن کی تردید فرمائی: ﴿ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلّٰهِ ﴾

''کہہ دو سارا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے''

لہذا صرف وہی کچھ ہوگا جس کا فیصلہ ایک مدتِ دراز سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں ہو چکا ہے اور جس فیصلے پر اللہ تعالیٰ کی قلم چل چکی ہے، جو اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ ہو کر رہے گا، لوگ چاہیں یا نہ چاہیں اور جو اللہ تعالیٰ نے نہ چاہا وہ کبھی نہ ہوگا، خواہ تمام لوگ اُس کے ہونے کو چاہنے لگیں، چنانچہ جنگِ اُحد میں پہنچنے والا نقصان، اللہ تعالیٰ کے امرِ کونی کے مطابق ہے، یہ نقصان پہنچ کر رہنا تھا جسے ٹالنے کی کسی کو طاقت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے جس شخص کے قتل کا فیصلہ فرمالیا ہے اُسے قتل ہونا ہے، خواہ وہ اپنے گھر میں کیوں نہ بیٹھا ہو، اللہ تعالیٰ کی تقدیر اُسے اس کے گھر سے اس کے مقامِ قتل تک کھینچ کر لائے گی، خواہ وہ شخص اپنے معاشرے میں بااختیار ہو یا بے اختیار۔''

=

① صحيح مسلم، كتاب الفتن، رقم: (٧٢٢٩)

قال وقوله: ﴿ اَلظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ﴾ ①

''اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانیاں رکھنے والے ہیں، (دراصل) انہیں پر بُرائی کا پھیرا ہے''

=

یہ آیتِ کریمہ منکرینِ تقدیر کے خلاف بھی زبردست حجت ہے، اور ان کے اس عقیدے کو باطل کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف بھی کچھ کام رونما ہو جاتے ہیں اور یہ کہ کچھ کاموں کا ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہوتا ہے، مگر وہ کام رونما نہیں ہوتے (تعالىٰ اللّٰه عن ذلك علوا كبيرا)

اس آیتِ کریمہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اس قتل وہزیمت کی دو حکمتیں بیان فرمائیں جو جنگِ اُحد میں مسلمانوں کو لاحق ہوئیں

(۱) پہلی حکمت یہ کہ سینوں میں چھپی ہوئی چیز کھل کر سامنے آجائے، چنانچہ مسلمانوں کا ایمان وتسلیم بڑھ گیا اور منافقین کا نفاق اُبھر کر سامنے آگیا۔

(۲) دوسری حکمت، تمحیص ہے، جس سے مراد مسلمانوں کے دلوں کی مزید تہذیب، تطہیر، تخلیص اور صفائی ہے؛ کیونکہ دلوں پر بعض اوقات شہواتِ نفس اور وساوسِ شیطان کا غلبہ ہو جاتا ہے جس سے غفلت کے پردے چڑھنا شروع ہو جاتے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ کے اس قسم کے امتحانات وابتلاءات سے وہ پردے چھٹ جاتے ہیں اور یہ چیز دلوں کی تمحیص وتطہیر کا باعث بن جاتی ہے، یہ اللہ رب العزت کی عظیم الشان حکمت ہے۔

وقوله: وقوله تعالىٰ : اَلظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ....

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اس آیت میں مذکوران کی بدگمانی کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ اور حکم کے بارہ میں بدگمانی کا شکار تھے، اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے بارہ میں بھی سُوءِ ظنی کا یہ کہہ کر مظاہرہ کیا کہ جہاد وقتال کی جس راہ پر یہ چل رہے ہیں اس کے نتیجہ میں سب قتل ہو جائیں گے اور کوئی باقی نہیں بچے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بدگمانی پر انہیں اپنے غضب، لعنت اور آخرت کے شدید ترین عذاب کا مستحق قرار دیا، فرمایا:

﴿ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴾ ①

''دراصل انہیں پر برائی کا پھیرا ہے، اللہ تعالیٰ ان پر ناراض ہوا، انہیں لعنت کی اور ان کیلئے دوزخ تیار کی اور وہ بہت بُری لوٹنے کی جگہ ہے''

---

① (الفتح: ٦)

قال ابن القیم فی الایۃ الاولیٰ ....

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ پہلی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اس آیتِ کریمہ میں منافقین کی جس بدگمانی کا ذکر ہے اس کے بہت سے معانی ہیں، ایک معنیٰ تو یہ ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کی مدد نہیں فرمائے گا، نتیجتاً آپ ﷺ کی دعوتِ دین کا معاملہ عنقریب اضمحلال اور اختتام کا شکار ہو جائے گا۔

دوسری بدگمانی یہ تھی کہ جنگِ اُحد میں مسلمانوں کو جو ہزیمت اٹھانی پڑی وہ اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر اور حکمت کے تحت نہ تھی (بلکہ مجرد مشیت تھی) گویا ان کی بدگمانی اللہ تعالیٰ کی حکمت کے انکار، تقدیر کے انکار، رسول اللہ ﷺ کے معاملۂ رسالت کی تکمیل کے انکار اور آپ ﷺ کے دین کے تمام ادیان پر غالب آنے کے انکار پر مشتمل ومنتج تھی۔ یہی وہ ظنِ سُوء ہے جس میں مشرکین ومنافقین مبتلا تھے، جس کا سورۂ الفتح کی آیت میں بھی ذکر موجود ہے۔ ان کے اس گمان کو بُرا گمان اس لیئے کہا گیا کہ اس قسم کا گمان اللہ تعالیٰ کی شان کے قطعاً لائق نہیں ہے، نیز یہ گمان اللہ تعالیٰ کی حکمت، حمد وتعریف اور سچے وعدوں کے بالکل منافی ہے۔

جو شخص یہ گمان کر بیٹھے کہ اللہ تعالیٰ باطل کو حق پر غلبہ اور فتح دیدے گا اور حق کا معاملہ مضمحل ہو کر رہ جائے گا، یا یہ گمان کہ جو کچھ ہوا وہ اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر سے نہیں ہوا، یا یہ گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر قضاء میں حکمتِ بالغہ پنہاں نہیں ہوتی بلکہ کچھ فیصلے خالی چاہت یا مشیتِ مجردہ پر محمول ہوتے ہیں، تو اس شخص پر واضح ہو کہ یہ تمام گمانات کافروں کے ہیں اور کافروں کیلئے بالآخر جہنم کی آگ سے تباہی وبربادی کی سزا ہے۔

بہت سے لوگ اپنے یا دوسروں کے بعض امور ومعاملات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی کے مرض میں مبتلا ہیں، بدگمانی سے بچنے کی توفیق اس کو میسر آتی ہے جسے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اسماء وصفات کی کما حقہ معرفت حاصل ہو، نیز وہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور ہر معاملے میں سزاوارِ حمد وثناء ہونے کو جانتا ہو۔ ایک سمجھدار آدمی اپنے طور پر اس اعتقادی امر کا خوب اہتمام کرے اور اگر کسی معاملے میں اپنے پروردگار کے ساتھ بدگمانی کا شکار رہا ہو تو اس پر فوراً توبہ واستغفار کرلے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ سُوءِ ظن میں مبتلا افراد کے معاملے کو اگر آپ بنگاہِ دقیق دیکھیں اور پرکھیں تو

آپ پر واضح ہوگا کہ وہ بدگمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے انکار اور تقدیر کو کوسنے اور ملامت کرنے کے مرض میں مبتلا ہیں، کچھ کم ہیں اور کچھ زیادہ......لیکن آپ اپنے آپ کو دیکھیں کہ آپ پوری طرح بچے ہوئے ہیں کہ نہیں۔

فَإِنْ تَنْجُ مِنْهَا تَنْجُ مِنْ ذِیْ عَظِیْمَةٍ وَإِلَّا فَإِنِّیْ لَا إِخَالُكَ نَاجِیًا

اگر آپ اس مرض سے بچ گئے تو یقیناً آپ ایک انتہائی خطرناک محظور سے بچ گئے۔ اور اگر نہیں بچ سکے تو پھر میرے خیال میں آپ کبھی نجات نہیں پائیں گے۔''

وقوله: قال ابن القیم فی الایۃ الاولیٰ ......

واضح ہو کہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کی یہ تفسیر، دیگر بہت سے مفسرین مثلاً قتادۃ، سعدی اور ابن جریر رحمہم اللہ وغیرہ سے بھی منقول ہے۔

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

''انکی وہ بدگمانی جسے اللہ تعالیٰ نے ناحق اور ظنِ جاہلیت قرار دیا ہے سے مراد ان کا تقدیر کا انکار کرنا ہے۔''

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کا اپنے مذکورہ قول میں یہ فرمانا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حکمت کا بھی انکار کیا، اگرچہ علماءِ سلف میں سے کسی کی تفسیر سے منقول نہیں، مگر یہ بات درست ہے کیونکہ جنگ اُحد میں پہنچنے والی ھزیمت کی اللہ تعالیٰ نے بہت سی حکمتیں بیان فرمائی ہیں (کما تقدم) تو انہوں نے اصلِ قضاء کا انکار کر کے اس میں پنہاں اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا بھی انکار کر دیا۔ ہمارا تو یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ آسمانوں، زمینوں اور ان کے مابین ظاہر ہونے والی کوئی حرکت یا سکون خالی از حکمت نہیں ہے، اور ان تمام حکمتوں پر مستحقِ حمد صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، تو پھر اتنا اہم واقعہ خالی از حکمت کیسے ہوسکتا ہے؟ اس سلسلہ میں سورۂ آل عمران میں ذکر شدہ اس قصہ کو بار بار پڑھیں تا کہ اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر اور اس میں پوشیدہ حکمتیں خوب آشکارا ہو جائیں اور ایمان مستحکم ہو جائے، کیونکہ منافقین کے اس انکار کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے بارہ میں بدگمانی قرار دیا ہے۔

پھر ان منافقین ومشرکین کا یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ باطل کو حق پر مستقل غلبہ دے گا اور آگے چل کر حق اضمحلال کا شکار ہو جائے گا، بھی ایک بہت بڑی بدگمانی ہے جو اللہ تعالیٰ کے جلال وکمال کے منافی ہے۔ یہ بات ناممکن ہے کہ مشرکین ومعاندین تو فتح مند ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی جماعت مقہور ومغلوب ہو جائے، ایسی سوچ رکھنے

والا اللہ تعالیٰ کے ساتھ سُوءِ ظن کا مرتکب ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے اسماء وصفات سے قطعی نابلد و ناآشنا ہے۔

بندوں کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی کی صورتیں

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے ایک اور مقام پر بندوں کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی کی بہت سی صورتیں بیان فرمائی ہیں۔خلاصۂ کلام یہ ہے کہ:

جو شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہے وہ اللہ تعالیٰ کے بارہ میں بدگمانی کا شکار ہے۔

جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کو ان کے اخلاص واحسان کے باوجود مبتلائے عذاب کرے گا اور یہ کہ وہ اپنے اولیاء اور اپنے اعداء کے ساتھ برابر سلوک کرے گا، تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے بارہ میں ظنِ سُوء کا شکار ہے۔

جو شخص یہ سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو کسی امر و نہی کے بغیر، محض بیکار چھوڑ دیا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے بارہ میں بدگمانی کا شکار ہے۔

جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کی موت کے بعد ثواب وعقاب دینے کیلئے اکٹھا نہیں فرمائے گا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ سُوءِ ظنی کا شکار ہے۔

جو شخص اپنے اس عمل کو ضائع اور نامقبول سمجھ بیٹھے جو اُس نے مکمل اخلاص اور سنتِ رسول کے مطابق کیا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے بارہ میں بدگمانی کا شکار ہے۔

مزید فرماتے ہیں:

جو شخص اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا انکار کرتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ سُوءِ ظنی کے مرض میں مبتلاء ہے۔

اسی طرح جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ملک میں ایسے امور بھی ظاہر ہو سکتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے نہ تو ارادہ فرمایا ہو اور نہ ہی ان کے ایجاد و تکوین پر اللہ تعالیٰ کو قدرت حاصل ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے بارہ میں بدگمانی کا شکار ہے۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کو بذاتہ اپنے عرش پر مستوی اور اپنی خلق سے جدا نہیں مانتا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے بارہ میں بدگمانی کا شکار ہے......

اسی طرح اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کیلئے اولاد، شریک یا بلا اذن شافع ہونے کا قائل ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی کا شکار ہے۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے درمیان وسائط اور شفعاء مقرر کرے اور یہ سمجھے کہ وہ ہماری حوائج وضروریات اللہ تعالیٰ تک پہنچاتے ہیں تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی کا شکار ہے......الخ

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کا یہ فرمان کہ لوگوں کی اکثریت اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی کا شکار ہے، بالکل درست ہے، چنانچہ عوام وخواص کی زبانوں پر ایسی ایسی باتیں رواں ہیں جو خلافِ عقیدہ ہیں اور اللہ رب العزت کے ساتھ بدگمانی ہیں۔ حافظ ابنِ عقیل نے "الفنون" میں اس کی ایک مثال یہ بھی نقل کی ہے کہ کچھ لوگ شریعت کے حق ہونے کو اس پیمانے میں تولتے ہیں کہ ہر نیک اور صالح انسان کو مالدار اور ہر نافرمان یا عاصی کو فقیر ہونا چاہیئے۔ ایک متقی انسان کے فقیر ہونے اور کافر یا نافرمان کے مالدار ہونے کو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی تصور کیا جاتا ہے۔ (والعیاذ باللہ)

حافظ ابن الجوزی فرماتے ہیں: اس قسم کے شبہ میں جہال کے ساتھ ساتھ کچھ علماء بھی گرفتار ہیں، پھر اس کی کچھ مثالیں ذکر فرمائیں۔

اس لیئے حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنے مذکورہ انتہائی نفیس کلام کے آخر میں فرمایا کہ آپ اپنے نفس کو ٹٹولیں اور اچھی طرح جائزہ لیں کہ آپ خالقِ کائنات کے ساتھ کسی قسم کی بدگمانی کا شکار تو نہیں، اگر کوئی ایسا محذور ہو تو توبہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے اسماء وصفات پر ایسا ایمان وایقان پیدا کرلیں جو اس کے شایانِ شان ہے۔ اس کی ذات کیلئے کمالِ مطلق اور اس کی صفات وافعال کیلئے حکمتِ بالغہ اور مصلحتِ تامہ ہے۔ (انتھی ملخصاً)



اس باب کے مسائل

(۱) سورۂ آل عمران کی آیت کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۲) سورۂ الفتح کی آیت کی تفسیر معلوم ہوئی۔

(۳) اللہ رب العزت کے ساتھ بدگمانی کی بے شمار صورتیں بن سکتی ہیں۔(جن میں سے بعض صورتیں بیان کی گئیں)

(۴) اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی کرنے سے وہی شخص بچ سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی معرفت کے ساتھ ساتھ اپنے نفس کی پہچان بھی ہو۔



باب ماجاء فی منکری القدر

منکرینِ قدر کے متعلق وعید کا بیان

قدر (دال کی زبر یا جزم کے ساتھ) یا تقدیر سے مراد ہر چیز کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کی مقدار ہے۔ تقدیر پر ایمان لانے کی اہمیت یہ ہے کہ یہ توحید کا اہم ترین شعبہ ہے، بلکہ توحیدِ ربوبیت پر ایمان کی تکمیل، ایمان بالقدر کے بغیر ممکن نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے تقدیر بنانے کا معنی

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر ہم یوں کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کی تقدیر بنائی ہے تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کو ان تمام اشیاء کے وجود وظہور میں لانے سے قبل ہی ان کی مقدار، احوال اور ازمان کا علم تھا (چنانچہ وہ لکھ دیا) پھر اس علمِ سابق (لکھے ہوئے) کے مطابق ان اشیاء کی خلق اور ایجاد فرمائی، لہذا عالمِ علوی وسفلی میں حاصل ہونے والا تمام خلق وایجاد، اور رونما ہونے والا تمام تغیر وتبدل اللہ تعالیٰ کے امر سے ہے، اور اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت اور ارادے سے صادر ہورہا ہے۔ یہی چیز سلفِ صالحین کے عقیدے سے ثابت ہوئی ہے، اور کتاب وسنت کے دلائل وبراھین کا مدلول بھی یہی ہے۔''

مؤلف رحمہ اللہ نے تقدیر کے منکرین کی وعید بیان کرکے یہ ثابت فرمایا ہے کہ تقدیر پر ایمان لانا فرض ہے۔

تقدیر پر ایمان ارکانِ ایمان میں سے ہے

رسول اللہ ﷺ نے تقدیر پر ایمان کو ارکانِ ایمان میں شمار فرمایا ہے، چنانچہ حدیث جبرئیل میں ہے، جب آپ ﷺ سے ایمان کی بابت سوال ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ" ①

''تم اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، روزِ آخرت اور تقدیر خواہ اچھی ہو یا بُری پر ایمان لاؤ'' اس پر جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا: آپ (ﷺ) نے سچ کہا۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

① (بخاری، الإیمان، الرقم: (٥٠) مسلم، الإیمان، الرقم: (٨)

" كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ ، قَالَ: وَعَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ" ①

''اللہ تعالیٰ نے تمام خلائق کی تقدیر، آسمان وزمین کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل لکھ دی، اس وقت اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا''

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

" كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعَجْزُ وَالْكَيْسُ " ②

''ہر شئی تقدیر کے ساتھ ہے، حتی کہ عجز اور کیس (دانائی) بھی''

امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِأَرْبَعٍ :يَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَإِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ بَعَثَنِي بِالْحَقِّ ، وَيُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ ، وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ ، وَيُؤْمِنُ بِالْقَدَرِ " ③

''کوئی بندہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ چار چیزوں پر ایمان نہ لائے، ① گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ حق نہیں، اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، مجھے اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ ② موت پر ایمان لانا۔ ③ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان لانا۔ ④ تقدیر پر ایمان لانا۔''

اس موضوع پر بیشمار احادیث موجود ہیں، جنہیں علماءِ کرام نے مستقل تصانیف میں جمع فرمایا ہے

امام بغوی ''شرح السنة'' میں فرماتے ہیں: تقدیر پر ایمان لانا فرض اور لازم ہے۔ اس ایمان کی حقیت یہ ہے کہ یہ اعتقادِ جازم رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام اعمال خواہ وہ خیر ہوں یا شر، کا خالق ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے بندوں کی تخلیق سے قبل ہی لوحِ محفوظ میں لکھ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ﴾ ④

''اللہ تعالیٰ تمہارا اور تم جو کچھ کرتے ہو کا خالق ہے''

---

① (صحيح مسلم، القدر، الرقم: ٢٦٥٣).

② (صحيح مسلم، الرقم: (٦٧٥١).

③ اسناده صحيح: مسند احمد: (٧٩٨/١) سنن الترمذی: (٢١٤٥) سنن ابن ماجه، مستدرك الحاكم: (٣٣،٣٢/١) امام حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے اور امام ذھبی رحمہ اللہ نے اس کی موافقت کی ہے۔

④ (الصافات: ٩٦)

لہذا ایمان اور کفر کے فیصلے ہو چکے ہیں، اللہ تعالیٰ کو بندوں کا ایمان و طاعت پسند ہے جس پر ثواب کے وعدے ہیں، جبکہ کفر و معصیت ناپسند ہے جن پر عذاب کی وعیدیں بیان فرمائی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ ﴾ ①

''اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو بہکا دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے''

امام بغوی رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں: تقدیر اللہ تعالیٰ کے اسرار میں سے ایک سِر (بھید) ہے، جس پر اس نے نہ تو کسی نبی مرسل کو، اور نہ ہی کسی ملکِ مقرب کو مطلع فرمایا۔ تقدیر پر اپنی عقل سے غور و خوض اور بحث و تمحیص جائز نہیں ہے۔ بس اتنا عقیدہ رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کا خالق ہے اور اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم فرما دیا ہے: ایک دائیں ہاتھ والے، جنہیں اُس نے اپنے کمالِ فضل سے جنت کیلئے پیدا فرمایا، دوسرے بائیں ہاتھ والے، جنہیں اپنے کمالِ عدل سے جہنم کیلئے پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْراً مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ﴾ ②

''اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کیلئے پیدا کیئے ہیں''

ایک شخص نے امیر المؤمنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: مجھے تقدیر کے متعلق بتائیے، فرمایا: یہ ایک تاریک راستہ ہے، اس پر مت چلو۔

اس نے دوبارہ سوال کیا، تو فرمایا: یہ ایک گہرا سمندر ہے اس میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرو۔

اس نے پھر پوچھا: تو فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا مخفی بھید ہے، اس کے افشاء کا مطالبہ نہ کرو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''تقدیر کے بارہ میں اہل السنۃ کا مذہب وہی ہے جو قرآن و حدیث میں موجود و مذکور ہے، جس پر سابقینِ اولین انصار و مہاجرین صحابہ اور ان کے اتباع قائم تھے، اور وہ مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی کا خالق، مالک اور رب ہے، اس میں تمام اعیان و ذوات، ان کی صفات، جملہ افعال اور دیگر تمام امور داخل ہو گئے، اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، اور جو نہیں چاہتا وہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ لہذا عالمِ وجود کی ہر شئی اس کی مشیئت اور قدرت کے ساتھ ہے، جس چیز کا ہونا وہ چاہتا ہے وہ اس پر ممتنع نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ہر ''ما کان وما یکون'' کا علم ہے، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جو چیز نہیں ہے، اگر وہ ہوتی تو کیسی ہوتی؟

① (ابراھیم: ۲۷)
② (الاعراف: ۱۷۹)

....

....

بندوں کے علاوہ دیگر مخلوقات کے افعال وامور بھی اس میں داخل ہیں، اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی تخلیق سے قبل ان کی مقادیر مقرر ومقدر فرمادیں، چنانچہ ان کی روزی، زندگی اور جملہ اعمال کا فیصلہ فرمادیا، اسے تحریر بھی فرمادیا، یہ بھی لکھ دیا کہ کون شخص اہلِ سعادت میں سے اور کون اہلِ شقاوت میں سے ہوگا۔

چنانچہ اہل السنۃ کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے، ہر چیز پر قادر ہے، ہر موجود چیز اس کی مشیت کے تحت ہے، ہر چیز پیدا ہونے سے قبل اس کے علم میں تھی، لہذا اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تقدیر بنادی اور اُسے لکھ دیا۔

غلاۃِ قدریہ اللہ تعالیٰ کے اس علمِ سابق اور اُسے لوحِ محفوظ میں لکھنے کے منکر ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دین امر ونہی کا نام ہے، اور اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کون بندہ اطاعت کرے گا اور کون نافرمانی، وہ اس معاملے کو مستأنف یعنی نیا قرار دیتے ہیں۔ (یعنی جو بندہ جب نافرمانی کرے گا یا اطاعت کرے گا تو اللہ تعالیٰ جانے گا) (نعوذ باللہ)

یہ گمراہ ٹولہ، خلفاءِ راشدین اور سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کے دورِ خلافت کے بعد زمانۂ فتنہ (جو بنواُمیہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے مابین دور تھا) میں ظاہر ہوا...... یہ عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا آخری دور تھا۔ اس فتنہ کا اول بانی مبانی بصرہ میں معبد الجہنی قرار پاتا ہے۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کے اس عقیدۂ فاسدہ کا علم ہوا تو انہوں نے شدید نکیر بھی فرمائی اور اس سے اظہارِ برأت بھی کیا...... ''

(انتھیٰ ملخصاً)

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے تقدیر پر ایمان لانے کے چار مراتب بیان فرمائے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کو ہر شئ کا اس کے وجود میں آنے سے قبل ہی علم تھا۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اسے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق سے قبل ہی اپنے پاس لکھ لیا۔

(۳) ہر موجود چیز (جو اس علمِ سابق کے مطابق ظاہر ہو رہی ہے) اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ ہے، جس طرح کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علم سے باہر نہیں، اسی طرح کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی مشیت سے باہر نہیں۔

(۴) ہر چیز اللہ تعالیٰ کے بنانے اور پیدا فرمانے سے بنتی اور پیدا ہوتی ہے، لہذا اللہ تعالیٰ اکیلا خالق ہے اور اس کے سوا ہر چیز اس کی مخلوق ہے۔

قال:وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ ﷺ: "وَالَّذِیْ نَفْسُ ابْنِ عُمَرَ بِیَدِهٖ لَوْکَانَ لِأَحَدِهِمْ مِثْلُ أُحُدٍ ذَهَبًا ثُمَّ أَنْفَقَهُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَا قَبِلَهُ اللّٰهُ مِنْهُ حَتّٰی یُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ." ثُمَّ اسْتَدَلَّ بِقَوْلِ النَّبِیِّ ﷺ "أَلْإِیْمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَیْرِهٖ وَشَرِّهٖ." ①

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی جان ہے، اگر (منکرینِ قدر میں سے) کسی شخص کے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہو، پھر وہ اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کردے، تو اللہ تعالیٰ اسے اس وقت تک قبول نہیں فرمائے گا، جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ لے آئے۔'' پھر سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مذکورہ حدیثِ جبرئیل علیہ السلام سے استدلال کیا، جس میں رسول اللہ ﷺ نے ایمان بالقدر کو ارکانِ ایمان میں شمار فرمایا: یعنی قولہ ﷺ ''تم اللہ تعالیٰ، اسکے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، اور روزِ آخرت اور تقدیر خواہ اچھی ہو یا بُری پر ایمان لاؤ''

سیدنا عبد اللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہم نے اپنا مذکورہ قول قدریہ (منکرینِ تقدیر) کے بارہ میں ارشاد فرمایا، جن کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو قبل از وقوع اشیاء کا علم نہیں ہوتا، بلکہ بعد از وقوع ہوتا ہے۔ (والعیاذ باللہ)

منکرین قدر کا عقیدہ کفر ہے

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جس شخص کا یہ عقیدہ ہو اس کے کفر میں کوئی شک نہیں، کیونکہ یہ تو شریعت کا کھلم کھلا انکار ہے، یہی وجہ ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان سے اظہارِ برأت فرمایا اور ان کے اعمال ونفقات کے عدمِ قبولیت کا فتویٰ دیا۔

واضح ہو کہ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا مذکورہ کلام اور فتویٰ مکمل قصہ کے ساتھ صحیح مسلم میں مروی ہے۔

''یحییٰ بن یعمر فرماتے ہیں: تقدیر کے انکار کی بابت سب سے پہلے معبد الجہنی نے بصرہ میں کلام کیا، چنانچہ میں اور حمید بن عبد الرحمٰن الحمیری حج یا عمرہ کی غرض سے مکہ مکرمہ آئے، ہم نے سوچا: اگر ہماری رسول اللہ ﷺ کے کسی صحابی سے ملاقات ہو جائے تو ہم اس سے قدریہ کی اس گفتگو کے حوالے سے استفسار کرلیں۔ پھر

① (صحیح مسلم)

ہمیں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جو مسجد میں تشریف لا رہے تھے، سے ملاقات کی توفیق میسر آ گئی، چنانچہ میں نے اور میرے ساتھی نے انہیں گھیر لیا، ایک دائیں اور دوسرا ان کے بائیں طرف ہوگیا، پھر میں نے یہ سوچ کر کہ میرا ساتھی مجھ سے گفتگو کرنے کو کہے گا (وقت ضائع کیئے بغیر) گفتگو شروع کر دی۔ میں نے کہا: اے ابو عبد الرحمٰن! ہمارے علاقے (بصرہ) میں کچھ لوگ ظاہر ہوئے ہیں، جو کثرت سے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، اور طلبِ علم کے بڑے حریص بھی ہیں...... مگر وہ تقدیر کو نہیں مانتے، اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ معاملہ مستأنف ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کو قبل از وقوع کسی چیز کا علم نہیں ہوتا، بلکہ بعد از وقوع علم ہوتا ہے) تو عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

''جب تم بصرہ لوٹو، اور اُن سے تمہاری ملاقات ہو تو ان سے کہہ دینا کہ میں تم سے اور تم مجھ سے بری اور لاتعلق ہو، اور مجھے اس ذات کی قسم جس ذات کی عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہمیشہ قسم کھاتا ہے، اگر ان میں سے کسی شخص کے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سُونا ہو اور وہ اُسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دے، تو اللہ تعالیٰ اسے اس وقت تک قبول نہیں فرمائے گا جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ لے آئے۔'' پھر عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے والد عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ جبرئیل کا حوالہ دیا......، جس میں رسول اللہ ﷺ نے واضح فرمایا: تقدیر خواہ خیر ہو یا شر، پر ایمان لانا ارکانِ ایمان اور واجباتِ دین میں سے ہے۔''

خیر و شر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی تقدیر سے قبل ہی ہر خیر و شر مقدور فرما دیا تھا، اب پوری کائنات اپنے ہر خیر و شر سمیت اللہ تعالیٰ کے قضاء و قدر اور ارادہ و مشیت کے تابع ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ﴾ ①

''اور ہر چیز کو اس نے پیدا کر کے ایک مناسب اندازہ ٹھہرا دیا ہے''

نیز فرمایا: ﴿ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ﴾ ②

''بے شک ہم نے ہر چیز کو ایک (مقررہ) اندازے پر پیدا کیا ہے''

یہاں ایک اعتراض وارد ہو رہا ہے کہ حدیثِ جبرئیل علیہ السلام سے واضح ہو رہا ہے کہ ہر خیر و شر اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہے، جب کہ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ''

یعنی ''اے اللہ! شر تیری طرف نہیں ہے''

جواب یہ ہے کہ قضاء و قدر میں شر کا اثبات بندے کے تعلق سے ہے نا کہ خالق کے تعلق سے۔ یعنی بندہ =

① (الفرقان: ۲) ② (القمر: ۴۹)

قَالَ: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ أَنَّهُ قَالَ لِابْنِهِ: يَابُنَيَّ إِنَّكَ لَا تَجِدُ طَعْمَ الْإِيمَانِ حَتَّى تَعْلَمَ أَنَّ مَا أَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَمَا أَخْطَأَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَكَ. سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ، يَقُولُ: "إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ، فَقَالَ لَهُ: اُكْتُبْ فَقَالَ: رَبِّ وَمَاذَا أَكْتُبُ. قَالَ: اُكْتُبْ مَقَادِيرَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ" يَابُنَيَّ! سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ "مَنْ مَاتَ عَلَى غَيْرِ هٰذَا فَلَيْسَ مِنِّي." ①

=

اپنے کسی گناہ، ظلم یا جہل کی بناء پر اس شر کا مستحق بن گیا، گویا اسے وہ شر اس کی معصیت کی سزا کے طور پر لاحق ہوا، لہذا وہ بندے کے حق میں شر ہے۔ جبکہ بندے کے ساتھ شر کا وہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے امر سے نافذ ہوا، جو پوری طرح حکمت و خیر سے پُر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی ذات، صفات اور افعال کی طرف شر کی کسی صورت نسبت نہ کی جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات تو صفاتِ کمال وجلال کی مستحق ہے جن میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں ہے کوئی نام ایسا نہیں ہے جو شر، مذمت یا عیب کے معنی پر مشتمل ہو۔

حاصلِ جواب یہ ہے کہ شر کی نسبت اللہ تعالیٰ کے مفعولات کی طرف ہے نہ کہ ذات وصفات کی طرف۔

ہم اس نکتہ کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں: (اور اللہ تعالیٰ کیلئے انتہائی اعلیٰ مثالیں ہیں) ایک بادشاہ جو عدل وانصاف پر قائم ہوتے ہوئے مخالفین ومفسدین کی سرکوبی کرتا ہے، اسی طرح مجرموں پر شرعی حدود وتعزیرات نافذ کرتا ہے، تو یہ ایسا معاملہ ہے جس پر وہ شکریہ اور تعریف کا مستحق ہے، جو اس بادشاہ کے حق میں خیرِ محض ہے۔ لیکن جن پر وہ حدود اور تعزیرات نافذ کی گئیں ان کیلئے شر ہی شر ہے، جس کا وہ اپنے گناہوں کی بناء پر مستحق بنے۔ تو اللہ رب العالمین جس کیلئے ہر طرح سے کمالِ مطلق ہے، اس امر کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کے ہر امر کو مبنی برخیر وحکمت قرار دیا جائے ...... البتہ اس امر کو معرضِ شر میں ذکر کرنا بندوں کے تعلق سے ہے، تا کہ اس شر سے خیر کا راستہ مزید واضح ہو جائے؛ کیونکہ ہر شئی اپنی ضد کے ساتھ مزید نکھر جاتی ہے، جیسے روشنی کی ضد اندھیرا، خیر کی ضد شر۔ (واللہ اعلم)

وقولہ: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ أَنَّهُ قَالَ لِابْنِهِ: يَابُنَيَّ ......

سیدنا عبادۃ بن الصامت ﷛ کے اس بیٹے کا نام ترمذی کی ایک حدیث میں ولید بن عبادۃ مذکور ہے۔

اس حدیث سے پتا چلتا ہے کہ ایمان کی ایک لذت وحلاوت ہے، جسے وہ نصیب ہو جائے وہ دنیا ومافیھا

① اسنادہ صحیح: سنن ابی داؤد: (٤٦٨٦)

عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے سے کہا: میرے بیٹے! تم اس وقت تک ایمان کی حقیقت ولذت کو نہیں پاسکتے جب تک تمہارا یہ عقیدہ نہ ہو جائے کہ جو چیز تمہیں حاصل ہو گئی ہے، اس کا نہ ملنا ممکن نہ تھا، اور جو چیز نہیں مل سکی اس کا ملنا ممکن نہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم پیدا فرمائی پھر اسے حکم دیا: لکھ، قلم نے کہا: اے میرے رب! کیا لکھوں۔ فرمایا: قیامت کے قائم ہونے تک ہر شیٔ کی تقدیر لکھ۔'' اے میرے بیٹے! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے بھی سنا ہے ''جو شخص اس عقیدے کے خلاف مر جائے تو وہ مجھ سے نہیں ہے۔''

سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ نبی ﷺ کی ایک معروف حدیث "ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ" سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی ایک لذت وحلاوت ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ لذت وحلاوت اس شخص کو میسر آتی ہے جو کما حقہ تقدیر پر ایمان لے آئے، جبکہ تقدیر کا انکار کرنے والا لذتِ ایمان سے محرومی کے ساتھ ساتھ کافر قرار پاتا ہے۔ اس حدیث میں تقدیر پر ایمان لانے کی ایک کیفیت مذکور ہے، اور وہ یہ ہے کہ بندہ کو دل کی گہرائیوں سے یہ بات معلوم ہو کہ جو چیز اسے مل چکی ہے (وہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے امر سے ملی ہے لہذا) اس کے نہ ملنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (خواہ پوری کائنات اس کے ملنے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دے)۔ اسی طرح جو چیز نہیں مل سکی (اُس کے حصول کیلئے خواہ دنیا کی تمام طاقتیں کوشاں ہوں) اس کا ملنا ناممکن تھا (کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں اس کا نہ ملنا لکھا گیا ہے)

یہی بات سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع حدیث میں مذکور ہے:

"لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ حَتّٰى إِنَّمَا أَصَابَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَهُ وَمَا أَخْطَأَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَهُ" ①

اس علم کی اساس بندے کا یہ ایمان ہے کہ کسی چیز کا ملنا یا نہ ملنا اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی وجہ سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ ﴾ ②

=

① یہ روایت سنداً ضعیف ہے لیکن معناً صحیح ہے۔ سنن الترمذی: (٢١٤٤) مسند احمد: (٦/٤١١)

② (الحدید: ٢٢)

قَالَ: وَفِي رِوَايَةٍ لِابْنِ وَهْبٍ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "فَمَنْ لَمْ يُؤْمِنْ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ أَحْرَقَهُ اللّٰهُ بِالنَّارِ. ①

ابنِ وھب کی روایت میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی مذکور ہے: ''جو شخص اچھی اور بُری تقدیر پر ایمان نہیں لائے گا، اللہ تعالیٰ اسے ضرور جہنم کی آگ میں جلائے گا۔''

=

''نہ کوئی مصیبت دنیا میں آتی ہے نہ (خاص) تمہاری جانوں میں، مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے''

واضح ہو کہ سیدنا عبادۃ بن الصامت ؓ کی مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا۔ جمہور علماء کی رائے ہے کہ قلم کی تخلیق سے قبل عرش موجود تھا۔ یہ قول زیادہ راجح اور صحیح ہے اس کی دلیل صحیح مسلم میں مروی عبداللہ بن عمرو بن العاص کی یہ حدیث ہے، وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيْرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ، قَالَ: وَعَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ"

''اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق سے پچاس ہزار سال قبل تمام خلائق کی تقدیر لکھ دی، اور اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا''

اس حدیث سے بصراحت معلوم ہو رہا ہے کہ کتابتِ مقادیر، تخلیقِ عرش کے بعد ہے۔
قلم کو اول المخلوقات قرار دینے والی حدیث کو اس عالَم کی مخلوقات کے ذکر پر محمول کیا جائے تو تطبیق کی وجہ بن جائے گی۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص تقدیر کا یعنی اللہ تعالیٰ کے علمِ سابق کا انکار کرے گا وہ کافر ہے، اور یہ بات بہت سے علماءِ سلف سے بھی منقول ہے۔

ابن وھب سے مراد مشہور محدث امام عبداللہ بن وھب بن مسلم القریشی ہیں، انتہائی ثقہ محدث تھے، بہت بڑے عابد بھی تھے، ۱۹۷ھ میں ۷۲ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تقدیر کا منکر چونکہ کافر ہے لہٰذا وہ ضرور واصلِ جہنم ہوگا۔ اور ایک شخص اگر اللہ تعالیٰ کے علمِ سابق کو تو مانتا ہے مگر افعالِ عباد کے مخلوق ہونے کا منکر ہے تو وہ بدعتی ہے اور بدعتی کا انجام بھی ''اصحاب الکبائر'' کی طرح بلکہ ان سے کہیں زیادہ خطرناک اور بھیانک ہے۔

① (حسن: ابن ابی عاصم فی السنة (۱۱۱) الآجری فی الشریعة: (ص: ۱۸۶، ۱۷۷)

قَالَ:وَفِی الْمُسْنَدِ وَالسُّنَنِ عَنِ ابْنِ الدَّیْلَمِیِّ قَالَ: أَتَیْتُ أُبَیَّ بْنَ کَعْبٍ۔ فَقُلْتُ: فِی نَفْسِی شَیْءٌ مِنَ الْقَدَرِ فَحَدِّثْنِی بِشَیْءٍ لَعَلَّ اللّٰہَ یُذْهِبُهُ مِنْ قَلْبِی، فَقَالَ:لَوْأَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی عَذَّبَ أَهْلَ سَمٰوَاتِهِ وَأَهْلَ أَرْضِهِ عَذَّبَهُمْ وَهُوَ غَیْرُ ظَالِمٍ لَهُمْ وَلَوْ رَحِمَهُمْ کَانَتْ رَحْمَتُهُ خَیْراً لَهُمْ مِنْ أَعْمَالِهِمْ وَلَوْ أَنْفَقْتَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَاقَبِلَهُ اللّٰہُ مِنْكَ حَتّٰی تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ، وَتَعْلَمَ أَنَّ مَا أَصَابَكَ لَمْ یَكُنْ لِیُخْطِئَكَ، وَمَا أَخْطَأَكَ لَمْ یَكُنْ لِیُصِیْبَكَ، وَلَوْ مُتَّ عَلٰی غَیْرِ هٰذَا لَدَخَلْتَ النَّارَ، قَالَ:فَأَتَیْتُ عَبْدَ اللّٰہِ بْنَ مَسْعُوْدٍ وَحُذَیْفَةَ بْنَ الْیَمَانِ وَزَیْدَ بْنَ ثَابِتٍ، فَكُلُّهُمْ حَدَّثَنِی بِمِثْلِ ذٰلِكَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ. (حدیث صحیح رواہ الحاکم فی صحیحه) ①

مسند احمد اور کتبِ سنن میں مروی ہے، ابو الدیلمی کہتے ہیں: میں صحابی رسول سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، عرض کیا: تقدیر کے حوالے سے میرے دل میں کچھ اشکال ہے، مجھے کوئی ایسی حدیث سنائیے کہ اللہ تعالیٰ اس حدیث کی برکت سے اس اشکال کو ختم فرما دے۔

فرمایا: ''اگر اللہ تعالیٰ تمام آسمان اور زمین والوں کو مبتلائے عذاب کردے تو وہ ظالم نہیں ہوگا۔ اور اگر رحمت فرمادے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے بہتر ہوگی، اور اگر تم اُحد پہاڑ کے برابر، اللہ تعالیٰ کی راہ میں سونا خرچ کردو تو اللہ تعالیٰ اس وقت تک قبول نہیں فرمائے گا جب تک تم تقدیر پر ایمان نہ لے آؤ، اور تمہیں یہ بات اچھی طرح معلوم نہ ہوجائے کہ جو چیز تمہیں مل گئی اس کا نہ ملنا ممکن نہ تھا اور جو چیز نہیں مل سکی اس کا ملنا ممکن نہ تھا۔ اور اگر تم اس عقیدے کے خلاف مر گئے تو جہنم میں جاؤ گے۔''

ابو الدیلمی فرماتے ہیں: پھر میں سیدنا عبد اللہ بن مسعود، سیدنا حذیفۃ بن الیمان اور سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے پاس گیا سب نے مجھے نبی ﷺ سے اسی طرح کی حدیث سنائی۔

ابو الدیلمی کا نام عبد اللہ بن فیروز الدیلمی ہے، جن کا کبار اور ثقات تابعین میں شمار ہوتا ہے، بعض علماء نے انہیں صحابی قرار دیا ہے، انکے والد فیروز نے کذاب نبی اسود عنسی کو قتل کیا تھا۔

حدیث کی دلالت بالکل واضح ہے، چنانچہ جو شخص تمام امور کو خواہ وہ خیر ہوں یا شر، میٹھے ہوں یا کڑوے، نافع ہوں یا مضر، قلیل ہوں یا کثیر، کبیر ہوں یا صغیر، اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر، ارادہ و مشیت اور امر کے تابع تسلیم نہیں کرے گا، اس کی کوئی نیکی حتی کہ اُحد پہاڑ کے برابر سونے کی خیرات بھی اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرمائے گا۔

① حسن: مسند احمد: (٢١٦٦٧/٨، ٢١٧١٠) سنن ابی داؤد (٤٦٨٥) صحیح ابن حبان: (١٨١٧) دیکھیے مجمع الزوائد: (١٩٨/٧)

اس باب کے مسائل

(۱) تقدیر پر ایمان لانے کی فرضیت بیان ہوئی۔

(۲) ایمان کی حقیقت اور کیفیت واضح ہوئی۔ (اور یہ کہ وہ تقدیر کو مانے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔)

(۳) یہ بات واضح ہوئی کہ تقدیر پر ایمان نہ لانے والے کے تمام اعمال باطل ہیں۔

(۴) یہ بات معلوم ہوئی کہ کوئی شخص اس وقت تک لذتِ ایمان سے ہمکنار نہیں ہو سکتا جب تک تقدیر پر ایمان نہ لے آئے۔

(۵) یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کیا پیدا کیا۔

(۶) اللہ تعالیٰ نے قلم کے پیدا فرماتے ہی تا قیامِ قیامت تمام مقادیر لکھ دیں۔

(۷) رسول اللہ ﷺ کا اس شخص سے اظہارِ برأت کرنا معلوم ہوا جو تقدیر پر ایمان نہیں لایا تھا۔

(۸) سلفِ صالحین اگر کسی مسئلہ کے تعلق سے کسی شبہ میں گرفتار ہو جاتے تو وہ اس کے ازالہ کیلئے علماءِ راسخین سے سوال کیا کرتے تھے۔

(۹) پھر علماءِ راسخین ایسا جواب دیتے جس سے وہ شبہ مکمل طور پہ زائل ہو جاتا، اور وہ اس طرح کہ وہ اپنے جواب کی دلیل صرف رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے دیا کرتے تھے۔



نوٹ:

شارح ''کتاب التوحید'' شیخ سلیمان بن عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی شرح کا یہ عظیم الشان عمل یہاں تک پہنچا تھا کہ پیامِ اجل آ گیا اور شیخ رحمہ اللہ دارالفناء سے دارالبقاء کی طرف کوچ کر گئے۔ (رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ)

یہاں سے آخرِ کتاب تک بقیہ سات ابواب ''کتاب التوحید'' کی دوسری شرح ''فتح المجید'' لشیخ عبدالرحمٰن بن حسن آل الشیخ سے لیکر ہم نے اس سفر کی بتوفیق اللہ تکمیل کر دی ہے۔ واضح ہو کہ ''فتح المجید'' درحقیقت ''تیسیر العزیز الحمید'' کی تلخیص ہی ہے۔

باب ماجاء فی المصورین

تصویر کشی کرنے والوں کا انجام

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:" وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذَهَبَ یَخْلُقُ کَخَلْقِیْ فَلْیَخْلُقُوا ذَرَّةً أَوْ لِیَخْلُقُوْا حَبَّةً أَوْ لِیَخْلُقُوْا شَعِیْرَةً " (اخرجاه)

سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اس سے بڑا ظالم کون ہے جو میری تخلیق جیسی تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے لوگ ایک ذرہ، ایک دانہ یا ایک جَو ہی بنا کر دکھلائیں۔'' (بخاری و مسلم)

ولهما عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:" أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا یَوْمَ الْقِیَامَةِ الَّذِیْنَ یُضَاهِئُوْنَ بِخَلْقِ اللّٰهِ"

صحیحین میں ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے زیادہ عذاب قیامت کے دن ان لوگوں کو ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی مشابہت کرتے ہیں''

وَلَهُمَا عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ:"کُلُّ مُصَوِّرٍ فِی النَّارِ یَجْعَلُ لَهُ بِکُلِّ صُوْرَةٍ صَوَّرَهَا نَفْسٌ یُعَذَّبُ بِهَا فِیْ جَهَنَّمَ "

صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''ہر مصور جہنم میں جائے گا، اس کی بنائی ہوئی ہر تصویر کے بدلے میں ایک جان بنائی جائے گی جس کے ذریعے سے اس مصور کو جہنم میں عذاب دیا جائے گا''

وَلَهُمَاعَنْهُ مَرْفُوْعاً:"مَنْ صَوَّرَ صُوْرَةً فِی الدُّنْیَا کُلِّفَ أَنْ یَنْفُخَ فِیْهَا الرَّوْحَ وَلَیْسَ بِنَافِخٍ"

صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے دنیا میں کوئی تصویر بنائی ہوگی، اسے قیامت کے دن اس تصویر میں روح پھونکنے کا مکلّف کیا جائے گا مگر وہ اس میں ہرگز روح نہ پھونک سکے گا''

مصورین کے متعلق سخت ترین عذاب کی وعید کا سبب

اس باب کے انعقاد کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ تصویر بنانے اور بنوانے والے کس سزا اور عذاب کے مستحق ہیں۔

نبی ﷺ نے مصورین کیلئے سخت ترین عذاب کا ذکر فرمایا اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ وہ اپنے عملِ تصویر سے اللہ تعالیٰ کی صفت خلق (پیدا کرنا) سے مشابہت اختیار کرتے ہیں حالانکہ پوری کائنات کا خلق وامر اللہ تعالیٰ کیلئے ہے، وہی ہر شئی کا رب اور مالک ہے اور وہی تمام مخلوقات کی تصویر بناتا اور ان میں روح پیدا فرما کر زندگی بخش دیتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ ۝ ﴾ ①

''جس نے نہایت خوب بنائی جو چیز بھی بنائی۔ اور انسان کی بناوٹ مٹی سے شروع کی۔ پھر اس کی نسل ایک بے وقعت پانی کے نچوڑ سے چلائی۔ جسے ٹھیک ٹھاک کر کے اس میں اپنی روح پھونکی، اسی نے تمہارے کان، آنکھیں اور دل بنائے (اس پر بھی) تم بہت ہی تھوڑا احسان مانتے ہو''

چنانچہ مصور جب اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ کسی ذی روح چیز مثلاً: انسان یا چوپائے وغیرہ کی اس شکل پر تصویر بناتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی خلق سے مشابہت اپنانے والا بن جاتا ہے۔

اب وہ تصویر ہی روزِ قیامت اس کیلئے عذاب بن جائیگی کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کی بنائی ہوئی تصویر اسے تھما دے گا اور اس میں روح ڈالنے کا حکم دے گا، جو وہ قطعی طور پر کبھی بھی نہیں ڈال سکے گا......لہذا مصور کا عذاب روزِ قیامت سب سے شدید ہوگا، کیونکہ اس کا گناہ سب سے بڑے گناہوں کی فہرست میں آتا ہے۔

اب یہاں ایک لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی کسی ذی روح خلق کی مثل تصویر بنانے والا اس قدر شدید عذاب میں جھونک دیا جائے گا تو اس شخص کے عذاب کا کیا عالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی کسی مخلوق کو رب العالمین کے برابر ہی قرار دے دیتا ہے، اور اس کی ذات یا صفات کو مخلوق کی ذات یا صفات سے تشبیہ دیتا ہے، نیز مخلوقات کیلئے باقاعدہ مختلف عبادات بجالاتا ہے، حالانکہ ہمہ قسم کی عبادات تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے۔ روئے زمین پر سب سے بڑا گناہ یہی ہے، جس سے ڈرانے اور روکنے کیلئے بے شمار انبیاء ومرسلین علیہم السلام مبعوث کئے گئے اور کتابیں اتاری گئیں اور اللہ تعالیٰ کے تمام انواعِ عبادت کے مستحق ہونے کی تعلیم وتلقین کی گئی۔ یہ واشگاف اعلان کر دیا گیا کہ توحید کی اساس پر انبیاء کا مطیعِ فرمان ہی درحقیقت مستحقِ نجات ہے، جبکہ توحید کا منکر ومعاند اور شرک کا مرتکب ومصر تباہ وبرباد ہو جائے گا تو پھر یہ کتنا بڑا گناہ ہوا۔

=

① (السجدہ: ۷تا۹)

ولـمسلم عن ابی الھیاج قال: قَالَ لِیْ عَلِیٌّ رضی اللہ عنہ: "أَلا أَبْعَثُكَ عَلٰی مَا بَعَثَنِیْ عَلَیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ لا تَدَعَ صُوْرَةً إِلَّا طَمَسْتَهَا وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا إِلَّا سَوَّیْتَهُ" ①

صحیح مسلم میں ابوالھیاج الاسدی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ مجھے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کیا میں تجھے اس کام پر نہ بھیجوں جس پر مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا تھا؟ وہ یہ کہ تم کسی تصویر کو مٹائے بغیر اور کسی بلند قبر کو زمین کے برابر کیئے بغیر نہ چھوڑنا۔''

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ أَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَاءُ ﴾ ②

''یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ شرک کیئے جانے کو نہیں بخشتا اور اسکے سوا جسے چاہے بخش دیتا ہے''

نیز فرمایا: ﴿ وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّیْرُ أَوْ تَهْوِیْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ مَكَانٍ سَحِیْقٍ ﴾ ③

''سنو! اللہ کے ساتھ شرک کرنے والا گویا آسمان سے گر پڑا اب یا تو اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا کسی دور دراز کی جگہ پھینک دے گی''

حدیثِ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر بحث

امیر المؤمنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث صحیح مسلم کے حوالے سے مروی ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں دو کاموں کیلئے بھیجا، ایک ہر تصویر کو مسخ کرنے اور مٹا ڈالنے کیلئے، دوسرا ہر اونچی قبر کو مسمار کر کے سطحِ زمین کے برابر کر دینے کیلئے۔ مضمونِ حدیث سے واضح ہو رہا ہے کہ کوئی تصویر مٹائے بغیر، اور کوئی قبر برابر کیئے بغیر نہ چھوڑی جائے، تصویروں کو مٹانے کا حکم اس لئے دیا کہ ان میں خلق اللہ سے مشابہت پائی جاتی ہے، اور قبروں کو ڈھا دینے کا حکم اس لئے کہ ان کی اونچائی، قبر والوں کے ساتھ فتنہ اور تعظیم کو موجب ہے اور یہ چیزیں شرک کے ذرائع و وسائل میں شمار ہوتی ہیں، لہذا تصویروں اور قبروں کے تعلق سے اس اہم کام کی انجام دہی جس پر کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مامور کیا گیا تھا، دین کے مصالح، مقاصد اور واجبات میں شامل ہے، لیکن اس سلسلہ میں جوں جوں تساہل آتا گیا، فتنۂ شرک بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ اونچی قبروں اور قبوں کی وجہ سے لوگ اصحابِ قبور کی تعظیم کرنے لگے اور یوں یہ قبریں مبتلائے فتنہ لوگوں کا مرکز بننے لگیں، اس قماش کے لوگ دور دراز سے سفر کر کے ان قبروں تک آنے لگے، اور عبادت کی بیشتر اقسام مثلاً: دعا، استغاثہ، تضرع، ذبح اور نذر وغیرہ کی انجام دہی شروع کر دی۔

---

① (مسلم، الجنائز، (۹۶۹) ② (النساء: ۴۸) ③ (الحج: ۳۱)

قبروں کے متعلق احادیث اور معاشرہ کی صورتِ حال

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو شخص قبروں کے تعلق سے رسول اللہ ﷺ کے اوامر ونواہی پر مشتمل احادیث کو جمع کرے، اور پھر آج لوگوں کی اکثریت کا قبروں کی بابت رویہ ملاحظہ کرے تو اسے ہر مسئلہ میں مکمل تناقض وتضاد دکھائی دے گا۔ مثلاً:

(۱) رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے سے روکا، یہ لوگ قبروں کی طرف، بلکہ قبروں کے پاس نماز ادا کرتے ہیں۔

(۲) رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر مساجد بنانے سے منع فرمایا، یہ لوگ مساجد بناتے ہیں اور انہیں مشاہد کا نام دیتے ہیں، ان کے ان مشاہد کی اللہ تعالیٰ کے گھروں سے کس قدر مماثلت ہے؟

(۳) رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر چراغاں کرنے سے منع فرمایا، یہ لوگ نہ صرف یہ کہ چراغاں کرتے ہیں بلکہ چراغاں کرنے کیلئے باقاعدہ اوقاف کی صورت میں فراہمی رقوم کا انتظام کرتے ہیں۔

(۴) رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو میلہ گاہ بنانے سے روکا، یہ لوگ قبروں کو میلہ گاہ اور عبادت گاہ بناتے ہیں اور مختلف مناسبتوں سے قبروں پر ایسے اجتماع کا انعقاد کرتے ہیں کہ بالکل میلے کا سماں بن جاتا ہے۔

(۵) رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو برابر کرنے کا حکم دیا اور یہ لوگ اس امر کی اتنی شدید مخالفت کرتے ہیں کہ قبروں کو اونچا بناتے ہیں حتی کہ بعض قبروں کو دیکھ کر باقاعدہ کسی گھر کا گمان ہوتا ہے، نیز قبروں پر قبے بھی بناتے ہیں۔

(۶) رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں قبروں کو پختہ کرنے، اور ان پر بیٹھنے اور عمارت بنانے سے منع فرمایا، یہ لوگ قبروں کو پختہ بھی کرتے ہیں، ان پر کافی دیر بیٹھتے بھی ہیں اور عمارتیں اور قبے بھی تعمیر کرتے ہیں۔

(۷) رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر لکھنے سے منع فرمایا ①

یہ لوگ مختلف الواح بنواتے ہیں اور ان پر قرآنی آیات یا کچھ اور لکھوا کر قبروں پر نصب کردیتے ہیں۔

(۸) رسول اللہ ﷺ نے قبر پر مٹی کے علاوہ کچھ اور چیز ڈالنے سے منع فرمایا، یہ لوگ پختہ اینٹیں اور سنگِ مرمر کو بھی مٹی کے ساتھ شامل کرلیتے ہیں۔

(پھر زیارتِ قبور کی ایک حکمت اہلِ قبور کیلئے دعا کرنا ہے، یہ لوگ اہلِ قبور کیلئے دعا کرنے کی بجائے ان سے حاجتیں اور مرادیں مانگتے ہیں یا پھر ان کے وسیلے سے دعا کرتے ہیں)

① اسنادہ صحیح: سنن ترمذی: (۱۰۵۲)۔

الغرض آج قبروں کے تعلق سے لوگوں کی اکثریت کا رویہ اور عقیدہ رسول اللہ ﷺ کے فرامین کے سراسر مخالف ومتناقض ہے ‘‘ (انتهى كلام ابن القيم رحمه الله بتغير يسير)

علامہ ابو محمد المقدسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’ اگر قبروں پر چراغاں کرنا جائز ہوتا تو چراغاں کرنے والوں پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت کیوں برسائی ؟ پھر چراغاں میں بلا فائدہ مال کا ضیاع بھی ہے، نیز حدِ واجب سے بڑھکر قبروں کی تعظیم بھی ہے یہ تعظیم تو اس تعظیم کے مشابہ ہے جو مشرکین اپنے بتوں کیلئے روا رکھتے تھے۔

(مزید فرماتے ہیں) رسول اللہ ﷺ کی حدیث ’’اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مساجد بنالیا‘‘ کی روشنی میں قبروں پر مساجد بنانا حرام ہے، نیز قبروں کو پختہ کرنا بھی ناجائز ہے، اور یہ عمل مشرکین کے تعظیمِ اصنام کے عمل سے مشابہ ہے۔ روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ عبادتِ اصنام کی ابتداء مُردوں کی تعظیم، تصویر، ان کو چھونے اور ان کے پاس نماز پڑھنے سے ہوئی۔‘‘ (انتہی)

اب تو معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ مشرکین نے بعض قبروں پر حج کو مشروع قرار دے دیا ہے، گویا ان قبروں کو بیت الحرام کے مثل ومشابہ بنا دیا گیا، کسی غالی مشرک نے تو ’’مناسك حج المشاهد‘‘ کے نام سے کتاب بھی لکھ دی۔ یہ تو دینِ اسلام سے مکمل بغاوت اور دینِ عُبادِ اَصنام میں دخول کے مترادف ہے۔

قبروں کی غیر شرعی تعظیم واہتمام کے مفاسد

واضح ہو کہ قبروں کی اس انداز سے تعظیم واہتمام کے اتنے مفاسد ہیں کہ انہیں شمار کرنا ناممکن ہے۔

ایک مفسدہ: فتنۂ شرک میں مبتلا ہونے کی حد تک تعظیم ہے۔

دوسرا: میلوں کا انعقاد۔

تیسرا: قبروں اور مزاروں کی طرف لمبے سفر کر کے جانا۔

چوتھا: بت پرستوں کی مشابہت کہ وہ بھی اپنے بتوں کی مجاورت کرتے ہیں، اور عبادِ قبور تو قبروں کے پاس مجاورت کو مسجد حرام کی مجاورت پر ترجیح دیتے ہیں۔

پانچواں: قبروں اور ان کے مجاروں کیلئے نذریں ماننا۔

چھٹا: یہ اعتقاد رکھنا کہ ان قبروں کے ذریعے بلائیں ٹلتی ہیں، دشمن پر غلبہ حاصل ہوتا ہے، آسمان سے بارش برستی ہے، حاجتیں پوری ہوتی ہیں اور مظلوم وخائف کو پناہ ملتی ہے وغیرہ۔

ساتواں: قبروں پر مساجد کی تعمیر سے نیز چراغاں کرنے سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے لعنت کا مستحق قرار پانا۔

آٹھواں: شرکِ اکبر کا ارتکاب۔

نواں: شرکیہ اعمال کے ارتکاب سے اھلِ قبور کو ایذاء پہنچانا، چنانچہ ان عبادِ قبور کا انبیاء واولیاء کی قبروں پر کھڑے ہو کر شرک کا ارتکاب کرنا ان کیلئے باعثِ ایذاء ہے، قیامت کے دن وہ اس سے تکلیف وکراھت کا اظہار بھی کریں گے اور ان کے اعمال سے براءت ولاتعلقی کا اعلان بھی، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ملاحظہ ہو:

﴿ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ فَيَقُولُ أَأَنْتُمْ أَضْلَلْتُمْ عِبَادِي هٰؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ ٥ قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنْبَغِي لَنَا أَنْ نَتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ وَلٰكِنْ مَتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا ﴾ ①

''اور جس دن اللہ تعالیٰ انہیں اور سوائے اللہ کے جنہیں یہ پوجتے رہے، انہیں جمع کر کے پوچھے گا کہ کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا یا یہ خود ہی راہ سے گم ہو گئے۔ وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ذات ہے خود ہمیں یہ زیبا نہ تھا کہ تیرے سوا اوروں کو اپنا کارساز بناتے، بات یہ ہے کہ تو نے انہیں اور ان کے باپ دادوں کو آسودگیاں عطا فرمائی یہاں تک کہ وہ نصیحت بھلا بیٹھے، یہ لوگ تھے ہی ہلاک ہونے والے''

نیز عیسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ملاحظہ ہو:

﴿ وَإِذْ قَالَ اللهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللهِ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ﴾ ②

''اور وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے جب کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام)! کیا تم نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی علاوہ اللہ کے معبود قرار دے لو! عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے کہ میں تو تجھ کو منزہ سمجھتا ہوں مجھ کو کسی طرح زیبا نہ تھا کہ میں ایسی بات کہتا کہ جس کے کہنے کا مجھ کو کوئی حق نہیں''

دسواں: بہت سی سنتوں کا ترک اور ان کے مقابلے میں بہت سی بدعات کا ایجاد واحیاء۔

گیارھواں: قبروں کو مساجد سے افضل قرار دینا، حالانکہ اللہ کے نزدیک زمین کی سب سے پسندیدہ جگہ مساجد ہیں، چنانچہ عبادِ قبور کے دلوں میں قبروں کی جو تعظیم واحترام ہے، وہ مساجد کی نہیں، اور قبروں پر جس طرح رقتِ قلبی اور تضرع کا اظہار کرتے ہیں وہ مساجد میں نہیں کرتے۔

① (الفرقان: ١٧ تا ١٨) ② (المائدة: ١١٦)۔

بارھواں: رسول اللہ ﷺ نے تو زیارت قبور کی حکمت یہ بیان فرمائی کہ تمہیں اس زیارت سے آخرت یاد آجائے، نیز تم قبر والوں کیلئے دعا کرکے ان پر احسان کرو یوں زیارت کرنے والا اپنے آپ پر بھی اور قبر والے پر بھی احسان کررہا ہے، لیکن ان لوگوں نے معاملہ بالکل الٹا کردیا، چنانچہ اب زیارت قبور کا مقصود شرک کرنا ہوگیا ہے، قبروں پر کھڑے ہوکر قبر والوں سے دعا کرنا یا ان کے وسیلے سے دعا کرنا ایک عام معمول بن گیا ہے لہذا اس طرح وہ احسان کے بجائے اپنے آپ پر بھی ظلم کررہے ہیں اور اھلِ قبور کو بھی ایذاء پہنچارہے ہیں (ولاحول ولاقوۃ الاباللہ)



اس باب کے مسائل

(۱) تصویر بنانے اور بنوانے والوں کیلئے جو شدید ترین وعید وارد ہوئی ہے اس کا علم ہوا۔

(۲) اس شدید ترین وعید کی وجہ بھی معلوم ہوئی جو یہ ہے کہ تصویر بنانے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ادب کا پہلو یکسر ختم ہو جاتا ہے کیونکہ تصویر بنانے والا اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق سے تشبہ اپنا رہا ہے، اور اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہے۔

(۳) یہ بات معلوم ہوئی کہ قادرِ مطلق تو صرف اللہ تعالیٰ ہے اور بندے (بالخصوص تصویر بنانے والے) محض عاجز ہیں یہ نکتہ حدیث کے الفاظ سے عیاں ہے " فَلْيَخْلُقُوْا ذَرَّةً أَوْحَبَّةً أَوْشَعِيْرَةً "

(۴) یہ بات بصراحت معلوم ہوئی کہ مصورین کا شمار ان لوگوں میں ہے جنہیں روزِ قیامت سب سے شدید عذاب کا نشانہ بننا پڑے گا۔

(۵) یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہر تصویر کی جگہ ایک نفس پیدا کرے گا، جس کے ذریعے مصور کو جہنم میں عذاب دیا جائے گا۔

(۶) وہ عذاب یہ ہے کہ اسے اس بات پر مکلف و مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنی بنائی ہوئی تصویروں میں جان ڈالے۔ (جو کبھی نہیں ڈال سکے گا)

(۷) تصویر جہاں بھی ملے اسے مسخ کرنے کا حکم بیان ہوا۔ (حدیثِ سیدنا علی رضی اللہ عنہ)



باب ماجاء فی کثرۃ الحلف

زیادہ قسمیں کھانے کی ممانعت اور وعید

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاحْفَظُوْا اَيْمَانَكُمْ ﴾ ①

''اور تم اپنی قسموں کی حفاظت کرو''

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "اَلْحَلْفُ مُنْفِقَةٌ لِلسِّلْعَةِ مُمْحِقَةٌ لِلْكَسْبِ" ②

سیدنا ابوھریرۃ ﷺ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''قسم، اشیاء کی فروخت کا ذریعہ تو ہے مگر اس سے برکت اٹھ جاتی ہے'' (بخاری و مسلم)

اس باب میں یہ بتلایا گیا ہے کہ خرید وفروخت یا دیگر معاملات میں زیادہ قسمیں کھانا منع ہے، نیز زیادہ قسمیں کھانے پر بندے کو سزا کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ واضح ہو کہ جھوٹی قسم کبائر میں سے ہے۔ آیتِ کریمہ: ﴿ وَاحْفَظُوْا اَيْمَانَكُمْ ﴾ کی تفسیر میں ابنِ جریر فرماتے ہیں:

''قسم توڑنے کی صورت میں کفارہ ضرور ادا کرو۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس ﷺ نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے:

''اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ زیادہ قسمیں نہ کھاؤ۔''

بعض علماء نے قسموں کی حفاظت کرنے کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ قسم کھا کر اسے توڑ کر حانث نہ بنو۔

اس باب میں مؤلف ﷫ کا مقصود وہ معنی ہے جو عبداللہ بن عباس ﷺ سے نقل کیا گیا ہے، ان کے نقل شدہ دونوں قول آپس میں متلازم ہیں کیونکہ زیادہ قسمیں کھانے والے کا زیادہ حانث ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کے منافی ہے اور نتیجۂ کمالِ توحید کے بھی منافی ہے۔

تجارت میں جھوٹی قسموں کے نقصانات

حدیثِ سیدنا ابوھریرۃ ﷺ کا مضمون یہ ہے کہ خرید وفروخت میں جھوٹی قسمیں کھانے والا سزا کا مستحق ہے جھوٹی قسم کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً: وہ مشتری سے کہے: یہ چیز میری اتنی کی خرید ہے، یا قسم کھا کر یوں کہے =

① (المائدۃ: ۸۹) ② (بخاری، البیوع (۲۰۸۷) مسلم، المساقات (۱۶۰۶)

وَعَنْ سَلْمَانَ ﷺ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:" ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ. أُشَيْمِطٌ زَانٍ، وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ، وَرَجُلٌ جَعَلَ اللّٰهَ بِضَاعَتَهُ لَا يَشْتَرِيْ إِلَّا بِيَمِيْنِهِ وَلَا يَبِيْعُ إِلَّا بِيَمِيْنِهِ " (رواه الطبراني بسند صحيح) ①

سیدنا سلمان ﷺ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تین قسم کے لوگوں سے (قیامت کے دن) بات نہیں کرے گا اور نہ انہیں (گناہوں سے) پاک کرے گا اور ان کیلئے دردناک عذاب ہوگا: بوڑھا زانی، متکبر فقیر اور وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کو اپنی تجارت کا سامان سمجھا ہوا ہے کہ اس کی قسم ہی سے خریدتا ہے اور اس کی قسم ہی سے بیچتا ہے'' (اسے امام طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

=

کہ ایک خریدار مجھے اس چیز کی اتنی قیمت دے رہا ہے۔ چنانچہ مشتری اس کی قسم کا اعتماد کرکے اسے سچا قرار دیکر زیادہ قیمت ادا کرکے وہ سودا خرید لیتا ہے، حالانکہ بائع کذاب ہے، اور زیادہ مال کی لالچ میں جھوٹی قسمیں کھا رہا ہے۔ یوں وہ اللہ تعالیٰ کا نافرمان ٹھہرا نیز اللہ تعالیٰ اس کے سودے کی برکت ختم کردے گا، برکت ختم ہونے سے اسے جھوٹی قسم سے حاصل ہونے والے مغانم کی بنسبت زیادہ نقصان برداشت کرنا پڑے گا، بلکہ ممکن ہے کہ اس کا مال سرے سے ہی تلف ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی بابرکت روزی اس کی اطاعت سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ جھوٹی قسمیں کھانے والے نافرمان شخص کو وقتی طور پر معمولی سی چمک دمک جو دکھائی دیتی ہے، اس کا انجام انتہائی تکلیف دہ اور کرب ناک ہوتا ہے۔

وقوله: وَعَنْ سَلْمَانَ ﷺ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:" ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ ......

سیدنا سلمان فارسی ﷺ کی حدیث میں ان تین افراد کا ذکر ہے جنہیں اللہ تعالیٰ روزِ قیامت تین سب سے بڑی سزائیں دے گا۔ ایک سزا یہ کہ ان سے کلام نہیں فرمائے گا، دوسری یہ کہ انہیں پاک نہیں کرے گا، اور تیسری یہ کہ انہیں دردناک عذاب میں ڈال دے گا۔

اس حدیث سے ایک اہم اعتقادی مسئلہ ثابت ہو رہا ہے، اور وہ یہ کہ کلام فرمانا، اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ کیونکہ نافرمانوں سے اس کے کلام کی نفی، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اطاعت گزار

① صحیح: طبرانی کبیر: (٦١١١) معجم طبرانی صغیر: (٢/٢١) مجمع الزوائد میں ہے کہ اسکے تمام رواۃ صحیح کے راوی ہیں (٤/٨٧).

....

....

....

....

....

بندوں سے کلام فرمائے گا۔ اھل السنۃ کا یہی مذہب ہے، اور اس پر قرآن وحدیث کے بے شمار دلائل ہیں۔ کلام فرمانا، باعتبارِ نوع اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے، جبکہ آحادِ کلام کے لحاظ سے فعلی صفت ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ جب اور جو کلام فرمانا چاہتا ہے فرماتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴾ ①

''وہ جب کبھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے اتنا فرما دینا (کافی ہے) کہ ہو جا، وہ اسی وقت ہو جاتی ہے''

وہ تین افراد جن کیلئے مذکورہ خطرناک وعید بیان ہوئی، یہ ہیں:

(۱) ''اشیمط زان'' یعنی بوڑھا زانی۔ ''اشیمط'' کا لفظ صیغہ تصغیر کے ساتھ ہے جس سے اس کی مزید تحقیر مقصود ہے۔ بوڑھا زانی اتنی خطرناک وعید کا اس لئے مستحق قرار دیا گیا کہ وہ زنا کے دواعی ختم ہو جانے، اور بڑھاپے کی وجہ سے کمزور پڑ جانے کے باوجود اس معصیت کا ارتکاب کرتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ زنا کی محبت اس کی طبیعت میں رچ بس چکی ہے نیز اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا کوئی خوف موجود نہیں ہے۔

(۲) دوسرا شخص وہ فقیر ہے جو تکبر کرے۔ اس کے اتنی شدید وعید کے متحمل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تکبر کا محرک یا باعث تو کثرتِ مال ہوتا ہے، لیکن یہ فقیر ہونے کے باوجود تکبر کیوں کر رہا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ تکبر کرنا اس کی طبیعت، فطرت اور عادت کا حصہ بن چکا ہے۔ جب کوئی گناہ بندے کی طبیعت میں رچ بس جائے تو اس کی سزا کی شدت وہیبت بڑھ جاتی ہے۔

(۳) تیسرا وہ شخص ہے جو تجارت میں قسم کھانے کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ مال خریدتا ہے تو قسم کھا کر، اور بیچتا ہے تو بھی قسم کھا کر۔ یہ روش ضعفِ توحید اور ضعفِ عمل کی دلیل ہے۔

---

① (یس: ۸۲)

وَفِي الصَّحِيحِ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ ﷛ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "خَيْرُ أُمَّتِي قَرْنِي ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ" قَالَ عِمْرَانُ: فَلَا أَدْرِي أَذَكَرَ بَعْدَ قَرْنِهِ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا؟ "ثُمَّ إِنَّ بَعْدَكُمْ قَوْمًا يَشْهَدُوْنَ وَلَا يُسْتَشْهَدُوْنَ وَيَخُوْنُوْنَ وَلَا يُؤْتَمَنُوْنَ وَيَنْذِرُوْنَ وَلَا يُوْفُوْنَ وَيَظْهَرُ فِيهِمُ السِّمَنُ"

وَفِيهِ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ ﷛ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: "خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ يَجِيءُ قَوْمٌ تَسْبِقُ شَهَادَةُ أَحَدِهِمْ يَمِيْنَهُ وَيَمِيْنُهُ شَهَادَتَهُ"

صحیح مسلم میں سیدنا عمران بن حصین ﷛ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میری اُمت کا سب سے بہتر زمانہ، میرا زمانہ ہے۔ پھر وہ جو اس کے بعد ہوگا، پھر وہ جو اسکے بعد ہوگا۔'' عمران ﷛ کہتے ہیں مجھے یاد نہیں پڑتا کہ آپ ﷺ نے اپنے زمانے کے بعد دو زمانوں کا ذکر کیا تھا یا تین کا؟ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر تمہارے بعد ایسے لوگ ہونگے جو بلا طلب گواہی دینگے، خائن ہونگے، امانت دار نہیں ہونگے، نذر مانیں گے تو پوری نہیں کرینگے اور ان میں موٹا پا ظاہر ہوگا''

صحیح مسلم میں سیدنا ابن مسعود ﷛ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''سب سے بہتر لوگ میرے زمانے کے ہیں، پھر وہ جو انکے بعد ہونگے، پھر وہ جو انکے بعد آئینگے، پھر ایسے لوگ آئینگے جن کی گواہی، قسم پر اور ان کی قسم، گواہی پر سبقت لے جائیگی''

وَقَالَ إِبْرَاهِيمُ: "كَانُوْا يَضْرِبُوْنَنَا عَلَى الشَّهَادَةِ وَالْعَهْدِ وَنَحْنُ صِغَارٌ"

ابراھیم نخعی ﷫ فرماتے ہیں: ''ہمارے بچپن میں ہمارے بزرگ گواہی اور عھد پر قائم رہنے کی تربیت کی خاطر ہمیں سزائیں دیا کرتے تھے۔''

حدیث ''خَيْرُ أُمَّتِي قَرْنِي'' کی وضاحت

سیدنا عمران بن حصین ﷛ کی حدیث جو مذکورہ الفاظ کے ساتھ صحیح مسلم میں مروی ہے، میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانے کو مطلقاً تمام زمانوں سے بہتر قرار دیا ہے جس کی وجہ صحابہ کرام ﷡ کا علم، ایمان اور عملِ صالح میں رسوخ تھا۔ اس دور میں اعمالِ صالحہ میں تنافس اور تفاضل کی روش قائم تھی، خیر اور اہلِ خیر زیادہ اور شر اور اہلِ شر نہایت ہی کم تھے۔ یہ علم اور اہلِ علم کا دور تھا جس میں اسلام کو خوب عزت ملی۔ اسکے بعد

رسول اللہ ﷺ نے مزید ادوار کے خیر ہونے کا ذکر فرمایا۔ اس حدیث میں راوی (عمران بن حصین رضی اللہ عنہ) کو شک ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانے کے بعد دو ادوار کا ذکر فرمایا ہے یا تین کا۔ مگر دوسری بہت سی روایات میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے بعد تین قرونِ مفضلہ کا ذکر ملتا ہے۔ یہ تینوں دور بھی تھوڑے بہت فرق اور تفاوت کے ساتھ اچھے دور قرار دیئے گئے، گو کہ ان ادوار میں بہت سے مبتدعین مثلاً: خوارج، روافض اور قدریہ وغیرہ نے سر اٹھایا، مگر پھر بھی اہل علم کی ایک بڑی جماعت موجود تھی جنہوں نے ان مبتدعین اور ان کی بدعات کی بیخ کنی کی، اسلام غالب رہا اور جہاد فی سبیل اللہ قائم رہا۔

البتہ ان تین ادوار کے بعد بے شمار بدعات ظہور میں آ گئیں اور خاص طور پر وہ امور ظاہر ہو گئے جن کا رسول اللہ ﷺ نے ذکر فرمایا:

(۱) شہادت (گواہی) کے معاملے کو اس قدر ہلکا سمجھ لیا گیا، اور قلتِ دین کی وجہ سے سچی گواہی کا سلسلہ اس قدر ناپید ہو گیا کہ لوگ بلا مطالبہ گواہی دینے میں پیش پیش ہونے لگے۔

(۲) خیانت کا معاملہ بڑھ گیا اور امانت دلوں سے رخصت ہو گئی۔

(۳) نذریں مان کر انہیں پورا نہ کرنا یعنی واجبات کو صحیح طور ادا نہ کرنا، جو ضعفِ دین وایمان کی دلیل ہے۔

(۴) دنیا کی محبت، شہوات کی فروانی، ناز ونعم میں پروردگی اور دارِ آخرت سے غفلت کی وجہ سے موٹاپے کا غلبہ۔

واضح ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بہترین زمانے کے بعد تین مزید بہترین زمانوں کا ذکر کیا، اس کے بعد ظہورِ فتن ومعاصی کی خبر دی، یہ شر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا ہے اور مزید بڑھتا جائے گا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "لَا يَأْتِي زَمَانٌ إِلَّا وَالَّذِيْ بَعْدَهُ شَرٌّ مِنْهُ حَتّٰى تَلْقَوْا رَبَّكُمْ" ①

"لوگوں پر جو زمانہ آتا ہے، اس کے بعد آنے والا زمانہ پہلے زمانے سے بدتر ہوگا اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا حتی کہ تم اپنے رب سے جا ملو گے"

سب سے بڑا شر اور فتنہ شرک وبدعت کا ظہور ہے جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے، حتی کہ بہت سے منتسبینِ علم بھی مبتلائے شرک وبدعت ہیں اور انکی تائید میں نظم ونثر میں کتابیں لکھ رہے ہیں۔

(والعیاذ باللّٰہ)



① (صحیح بخاری، الرقم:۷۰۶۸)

اس باب کے مسائل

(۱) قسموں کی حفاظت کی وصیت۔

(۲) یہ خبر کہ جھوٹی قسموں سے سودا تو فروخت ہو جاتا ہے مگر اس کی برکت ختم ہو جاتی ہے۔

(۳) اس شخص کی وعیدِ شدید معلوم ہوئی جو قسمیں کھا کھا کر مال خریدتا اور بیچتا ہے۔

(۴) یہ بات معلوم ہوئی کہ بندے میں جس گناہ کے دواعی ومحرکات نہ ہوں یا کم ہوں اس کے باوجود اگر وہ اس گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کی شدت وہیبت میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۵) وہ لوگ انتہائی قابلِ مذمت ہیں جو قسم طلب کیئے بغیر ہی قسم کھاتے رہتے ہیں۔

(۶) نبی ﷺ کا چار ادوار کی تعریف فرمانا اور اس کے بعد مختلف خرافات وبدعات کا ظاہر ہونے کی خبر دینا معلوم ہوا۔

(۷) وہ لوگ انتہائی قابلِ مذمت ہیں جو شہادت طلب کیئے بغیر ہی شہادت دینے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(۸) ابراھیم نخعی رحمہ اللہ کے قول سے معلوم ہوا کہ سلفِ صالحین شہادت اور عہد کے حوالے سے (برائے تربیت) بچوں کو مارتے تھے۔ (تاکہ ان دونوں مسئلوں میں وہ راہِ استقامت کے عادی ہو جائیں اور شہادت اور عہد کا حق ادا کر سکیں)

(اس سے سلفِ صالحین صحابہ وتابعین کی قوتِ ایمان اور معرفتِ رب العالمین، نیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جو افضل ترین جہاد ہے، کا وظیفہ ادا کرنے کا اندازہ ہوتا ہے۔) (ذلك فضل الله يوتيه من يشاء)



باب ماجاء فی ذمة الله وذمة نبیه

اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے ذمہ کا بیان

قوله تعالیٰ: ﴿ وَاَوْفُوا بِعَهْدِ اللهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا اِنَّ اللهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ ①

''اور جب تم اللہ تعالیٰ سے عہد کرو تو اس کو پورا کرو، اور قسمیں پختہ کرنے کے بعد ان کو مت توڑو، حالانکہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر ضامن بنا چکے ہو، اللہ تعالیٰ تمہارے تمام افعال سے باخبر ہے''

اس باب میں اللہ تعالیٰ کے ذمہ اور عہد و میثاق کی اہمیت کا ذکر ہے۔

آیتِ کریمہ: ﴿ وَاَوْفُوا بِعَهْدِ اللهِ ﴾ میں حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ کی تفسیر کے مطابق اللہ تعالیٰ عہد و میثاق پورا کرنے کا امر ارشاد فرما رہا ہے، نیز قسموں کی حفاظت کا ذکر بھی ہے اور یہ کہ مؤکد قسموں کو ہرگز نہ توڑا جائے۔ اس سے مراد وہ قسمیں ہیں جو عہد و میثاق کے موقع پر کھائی جاتی ہیں۔ گویا کسی عہد پر قسم کھا کر اللہ تعالیٰ کا ذمہ دے دیا گیا، لہذا اب اسے توڑنا جائز نہیں ہے، البتہ ایسی قسم جس کا تعلق عہد و میثاق کی بجائے دیگر امور سے ہے تو اسے توڑنے میں اگر کوئی بہتری اور بھلائی کا پہلو ہو تو اسے توڑا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا کفارہ ادا کر دیا جائے۔ اس کی دلیل صحیح بخاری و مسلم میں مروی رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

" اِنِّیْ وَاللهِ اِنْ شَاءَ اللهُ لَا اَحْلِفُ عَلَى يَمِيْنٍ فَأَرَى غَيْرَهَا خَيْرًا مِنْهَا اِلَّا أَتَيْتُ الَّذِیْ هُوَ خَيْرٌ مِنْهَا وَتَحَلَّلْتُهَا " وفی روایة " وَكَفَّرْتُ عَنْ يَمِيْنِیْ " ②

''اگر میں کسی چیز پر قسم کھا لوں پھر دوسری چیز اس سے بہتر پاؤں تو میں اس بہتر چیز کو اختیار کر لیتا ہوں اور قسم توڑنے کا کفارہ ادا کر دیتا ہوں''

آیتِ کریمہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ اِنَّ اللهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴾

یعنی: ''جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے''

ان لوگوں کیلئے ایک قسم کی تنبیہ، تھدید اور وعید ہے جو عہد و میثاق پر قسموں کی حفاظت کرنے کی بجائے انہیں توڑ ڈالتے ہیں۔

---

① (النحل: ۹۱)

② (بخاری، کفارات الأیمان (۶۷۱۸، ۶۷۱۹) مسلم الأیمان، (۱۶۴۹)

وَعَنْ بُرَيْدَةَ ﷺ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ :إِذَا أَمَّرَ أَمِيرًا عَلَى جَيْشٍ أَوْ سَرِيَّةٍ. أَوْصَاهُ بِتَقْوَى اللهِ وَمَنْ مَعَهُ مِنَ الْمُسْلِمِينَ خَيْرًا . فَقَالَ:" أُغْزُوْا بِسْمِ اللهِ، فِي سَبِيْلِ اللهِ، قَاتِلُوامَنْ كَفَرَ بِاللهِ. أُغْزُوْا فَلَا تَغُلُّوْا وَلَا تَغْدِرُوْا وَلَا تَمْثُلُوْا، وَلَا تَقْتُلُوْا وَلِيْدًا. وَإِذَا لَقِيْتَ عَدُوَّكَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَادْعُهُمْ إِلَى ثَلَاثَةِ خِصَالٍ أَوْ خِلَالٍ. فَأَيَّتُهُنَّ أَجَابُوْا لَكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ، وَكُفَّ عَنْهُمْ ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى الْإِسْلَامِ فَإِنْ أَجَابُوْالَكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ إِلَى دَارِ الْمُهَاجِرِيْنَ وَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ إِنْ فَعَلُوْا ذٰلِكَ فَلَهُمْ مَا لِلْمُهَاجِرِيْنَ وَعَلَيْهِمْ مَاعَلَى الْمُهَاجِرِيْنَ۔فَإِنْ أَبَوْا أَنْ يَتَحَوَّلُوْامِنْهَا فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ يَكُوْنُوْنَ كَأَعْرَابِ الْمُسْلِمِيْنَ يَجْرِيْ عَلَيْهِمْ حُكْمُ اللهِ تَعَالٰى وَلَايَكُوْنُ لَهُمْ فِي الْغَنِيْمَةِ وَالْفَيْءِ شَيْءٌ إِلَّا أَنْ يُجَاهِدُوْامَعَ الْمُسْلِمِيْنَ . فَإِنْ هُمْ أَبَوْا فَسَلْهُمُ الْجِزْيَةَ فَإِنْ هُمْ أَجَابُوْا لَكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ فَإِنْ هُمْ أَبَوْا فَاسْتَعِنْ بِاللهِ وَقَاتِلْهُمْ . وَإِذَا حَاصَرْتَ أَهْلَ حِصْنٍ فَأَرَادُوْكَ أَنْ تَجْعَلَ لَهُمْ ذِمَّةَ اللهِ وَذِمَّةَ نَبِيِّهِ فَلَا تَجْعَلْ لَهُمْ ذِمَّةَ اللهِ وَذِمَّةَ نَبِيِّهِ وَلٰكِنِ اجْعَلْ لَهُمْ ذِمَّتَكَ وَذِمَّةَ أَصْحَابِكَ فَإِنَّكُمْ أَنْ تُخْفِرُوْا ذِمَّتَكُمْ وَذِمَّةَ أَصْحَابِكُمْ أَهْوَنُ مِنْ أَنْ تُخْفِرُوْا ذِمَّةَ اللهِ وَذِمَّةَ نَبِيِّهِ وَإِذَا حَاصَرْتَ أَهْلَ حِصْنٍ فَأَرَادُوْكَ أَنْ تُنْزِلَهُمْ عَلَى حُكْمِ اللهِ فَلَا تُنْزِلْهُمْ وَلٰكِنْ أَنْزِلْهُمْ عَلَى حُكْمِكَ فَإِنَّكَ لَا تَدْرِيْ أَتُصِيْبُ فِيْهِمْ حُكْمَ اللهِ أَمْ لَا . "①

سیدنا بریدۃ ﷺ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی فوج یا دستے پر کسی کو امیر مقرر فرماتے تو اسے تقویٰ اور اپنے رفقاءِ سفر کے ساتھ حسنِ سلوک کی خصوصی طور پر وصیت کرتے اور فرماتے: ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس کا نام لیکر لڑائی کرنا اور ہر اس شخص سے لڑنا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔لڑائی کرنا اور خیانت نہ کرنا، بدعہدی نہ کرنا، مثلہ نہ کرنا، (یعنی کسی مقتول کے اعضاء نہ کاٹنا) اور نہ بچوں کو قتل کرنا۔ جب مشرک دشمن سے تمہارا سامنا ہو تو انہیں تین باتوں کی پیشکش کرنا، اگر وہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی مان لیں تو منظور کر لینا اور جنگ سے رک جانا:

① (صحیح مسلم، الرقم:٤٥٢٢)

(۱) سب سے پہلے اسلام کی دعوت دینا، اگر وہ اسے قبول کرلیں تو اسے منظور کرلینا اور انہیں علاقۂ کفر سے علاقۂ مہاجرین کی طرف ہجرت کی دعوت دینا۔ اور انہیں بتانا کہ اگر وہ ہجرت کرینگے تو انہیں وہ سب حقوق حاصل ہونگے جو مہاجرین کو حاصل ہیں، اور جو بار مہاجرین کو برداشت کرنا پڑتا ہے انہیں بھی برداشت کرنا ہوگا اور اگر وہ ہجرت کرنے سے انکار کریں تو انہیں بتلا دینا کہ وہ ان بدوی (دیہاتی) مسلمانوں کی طرح ہونگے جن پر اللہ تعالیٰ کا حکم جاری ہے۔ انہیں مالِ غنیمت اور مالِ فیٔ میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ الا یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہوں۔

(۲) اور اگر وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کردیں تو پھر ان سے جزیہ طلب کرنا اگر وہ جزیہ دینے پر راضی ہوجائیں تو قبول کرلینا اور جنگ سے رُک جانا۔

(۳) اگر وہ جزیہ دینے سے بھی انکار کردیں تو پھر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ کر ان سے لڑائی کرنا۔ اور جب تم قلعہ بند دشمن کا محاصرہ کرو پھر اگر دشمن چاہے کہ تم انہیں اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی امان اور تحفظ دے دو تو ایسا ہرگز نہ کرنا، بلکہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے امان اور تحفظ دینا، اس لئے کہ اگر تم (کسی صورت میں) اپنا یا اپنے ساتھیوں کا ذمہ (ضمانت) توڑ دو گے تو یہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے ذمہ کو توڑنے سے کمتر ہوگا، اور جب تم قلعہ میں بند کسی دشمن کا محاصرہ کرو اور وہ چاہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ دار پر اس سے صلح کرلو تو ایسا ہرگز نہ کرنا بلکہ تم اپنی ذمہ داری پر اس سے صلح کرنا کیونکہ معلوم نہیں کہ تم ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی مرضی اور فیصلے کو پا سکو یا نہیں؟

بریدۃ الاسلمی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ماخوذ اہم قواعد

سیدنا بریدۃ الاسلمی رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت بہت سے قواعد پر مشتمل ہے:

(۱) پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ کسی قافلے یا لشکر کو روانہ کرتے ہوئے اس پر امیر مقرر کرنا، اور بوقتِ روانگی اس امیر کو تقویٰ و دیگر امور کی وصیت کرنا مشروع ہے۔

سریہ اور جیش میں فرق بتاتے ہوئے امام حربی فرماتے ہیں: سریہ وہ لشکر ہے جس میں مجاہدین کی تعداد چار سو (۴۰۰) سے زائد نہ ہو، اگر چار سو (۴۰۰) سے زائد ہو جائے تو وہ لشکر، جیش کہلاتا ہے۔

(۲) لفظ تقویٰ چونکہ لغوی اعتبار سے بچنے کے معنی دیتا ہے، لہذا شرعی معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت

کر کے اس کے عذاب سے بچاؤ حاصل کرنا۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب اللہ تعالیٰ کے اوامر پر عمل کیا جائے اور نواہی کو ترک کر دیا جائے۔

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بوقتِ روانگی امیر کو لشکر کے ساتھ نرمی اور رفق کے برتاؤ کی وصیت کی جائے اور یہ کہ ہر قدم پر ان کے ساتھ اچھائی کا معاملہ کرے اور کسی مرحلہ پر بڑائی نہ جتائے۔

اہلِ کفر سے قتال کا جو حکم اس حدیث میں وارد ہوا ہے وہ تمام کفار کو شامل ہے، البتہ دیگر احادیث کی روشنی میں عورتیں، بچے، راہب اور وہ کافر مستثنیٰ ہیں جنہیں قتال نہ کرنے کا عہد و میثاق دے دیا جائے۔

یہ بات اسلام کے محاسن میں شامل ہے کہ وقتِ قتال تین چیزوں سے سختی سے منع کر دیا گیا ہے:

(۱) "غلول"، یعنی مالِ غنیمت میں سے تقسیم سے قبل کوئی چیز چرا لینا۔

(۲) "غدر"، یعنی عہد شکنی کرنا۔

(۳) "مثلة"، یعنی دشمن کی لاش کا کوئی عضو مثلاً ناک یا کان کاٹ کر بے حرمتی کرنا۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے دشمن کو اس وقت جب اس سے مڈبھیڑ ہونے کا وقت آجائے، تین امور کی دعوت دینے کا حکم دیا، چنانچہ سب سے پہلے اسلام کی دعوت دی جائے (کیونکہ جہاد کا مقصد خون ریزی نہیں بلکہ تنفیذِ اسلام اور اقامتِ دین ہے لہذا کوئی کافر اگر اسلام قبول کر لے تو اس سے قتال نہیں کیا جائے گا) بلکہ اسے اس کے وطن سے، دارالہجرۃ مدینہ منورہ منتقل ہونے کا حکم دو۔ اس سے ثابت ہوا کہ پہلے پہل اسلام قبول کرنے والوں کیلئے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنا فرض تھا۔ اور اگر وہ ہجرت کا امر قبول نہ کریں تو ان کا حکم اَعراب والا ہے، یعنی انہیں مالِ غنیمت یا مالِ فیٔ سے کوئی حصہ نہیں ملے گا (یہ اس صورت میں ہوگا جب وہ جہاد میں حصہ نہ لے، اور اگر جہاد میں شامل ہو تو پھر غنیمت کا مستحق ہوگا)

امام شافعی رحمہ اللہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کہ اَعرابی کیلئے "مالِ فیئ" میں کوئی حصہ نہیں ہے البتہ اسے اغنیاء سے لئے ہوئے مالِ زکوۃ میں سے کچھ دیا جا سکتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ یہ بھی فرماتے ہیں: جس طرح اَعرابی کا مجاہدین کے مال میں حصہ نہیں، اسی طرح مجاہدین کا مالِ زکوۃ پر حق نہیں بنتا۔ البتہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے برابری کا قول اختیار کیا ہے، اور کمزور کو ہر مال میں سے حصہ کا مستحق قرار دیا ہے۔

اگر وہ اسلام کی دعوت قبول نہ کریں تو انہیں جزیہ ادا کرنے کا حکم دیا جائے، جسے قبول کرنے کی صورت

میں ان سے قتال روا نہیں۔امام احمد بن حنبل کے قول کے مطابق کافر سے جزیہ وصول کیا جائے گا، اگرچہ اس بارے میں علماء سے مختلف آراء وارد ہوئیں ہیں لیکن ادلہ اس قول کی تائید کرتی ہیں۔

جزیہ کی مقدار میں اختلاف ہے، امام مالک رحمہ اللہ سونے والوں پر چار دینار، اور چاندی والوں پر چالیس درہم جزیہ کے قائل تھے۔امام شافعی رحمہ اللہ ہر غنی اور فقیر کیلئے ایک درہم کے قائل تھے۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ مالداروں کیلئے (۴۸) درہم، متوسط طبقہ کیلئے (۲۴)، اور فقراء کیلئے (۱۲) درہم کے قائل تھے۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے دشمن کے قلعہ بند ہونے کی صورت میں ان کا محاصرہ کرنے والے مسلمانوں کو آداب کی تلقین فرمائی، چنانچہ اگر دشمن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کا ذمہ اور عہد طلب کرے تو اسے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کا ذمہ نہ دیا جائے بلکہ اپنا ذمہ اور عہد دیا جائے، کیونکہ ممکن ہے اسلامی لشکر میں سے کوئی شخص وفائے عہد کی اہمیت کو نہ سمجھتے ہوئے اس ذمہ کو توڑ ڈالے، لہذا اگر اپنا عہد دوگے اور اسے کوئی مسلمان توڑ بیٹھے تو اس کا ٹوٹنا اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے عہد کے ٹوٹنے سے زیادہ آسان ہے، (حدیث کا یہی حصہ باب کے مناسب ہے، جو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے عہد کی اہمیت پر دال ہے) (واللہ اعلم)



اس باب کے مسائل

(۱) اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے ذمہ اور مسلمانوں کے ذمہ میں فرق واضح ہوا۔

(۲) دو خطرناک کاموں میں سے اس کام کے اختیار کرنے کی راہنمائی ملتی ہے جسکا خطرہ نسبتاً کم ہو

(۳) رسول اللہ ﷺ کے فرمان: "أُغْـزُوْا بِسْمِ اللّٰهِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کا مفہومِ لازم معلوم ہوا۔ (جو یہ ہے کہ قتال اللہ تعالیٰ کیلئے ہے، اور اسکے نام کے ساتھ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے استعانت اور اخلاصِ نیت پر قائم ہے۔)

(۴) رسول اللہ ﷺ کے فرمان: "قَـاتِلُوْا مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ" کا مفہوم واضح ہوا، اور یہ بات معلوم ہوئی کہ ہر کافر نشانۂ قتال نہیں بنتا، بلکہ کچھ کفار کو قتال سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

(۵) رسول اللہ ﷺ کے فرمان: "إِسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَقَاتِلْهُمْ" کے بموجب قتال و جہاد میں فتح کے حصول کیلئے ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی مدد کا سوال کرنا چاہیئے۔

(۶) اللہ تعالیٰ کے حکم اور علماء کے حکم میں فرق واضح ہوا۔

(۷) ایک صحابی کو اگر بوقتِ ضرورت کسی امر کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے تو اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق ہے یا نہیں؟ یہ نکتہ حدیثِ بریدۃ کی روشنی میں بڑی صراحت سے معلوم ہوا۔ (ہر مجتہد سے خطاء یا ثواب دونوں کا امکان ہے، لہذا دینِ اسلام میں اطاعت صرف اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کا حق ہے)



باب ماجاء فی الاقسام علی اللہ

اللہ تعالیٰ پر قسمیں کھانے کا بیان

عن جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ: رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ رَجُلٌ:" وَاللّٰهِ لَايَغْفِرُ اللّٰهُ لِفُلَانٍ . فَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى :مَنْ ذَالَّذِیْ يَتَأَلّٰى عَلَىَّ أَنْ لَا أَغْفِرَ لِفُلَانٍ إِنِّیْ قَدْ غَفَرْتُ لَهُ وَأَحْبَطْتُ عَمَلَكَ . ①

سیدنا جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک آدمی نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ فلاں شخص کی مغفرت نہیں کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ کون ہوتا ہے جو مجھ پر قسم کھا رہا ہے کہ میں فلاں کی مغفرت نہیں کرونگا۔ میں نے اس کی مغفرت کردی اور تیرے (یعنی قسم اٹھانے والے کے) اعمال ضائع کردیئے۔''

وَفِی حَدِیْثِ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ :"إِنَّ الْقَائِلَ رَجُلٌ عَابِدٌ "، قَالَ أَبُوْهُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ :"تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَوْبَقَتْ دُنْيَاهُ وَآخِرَتَهُ ." ②

سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے ''یہ بات کہنے والا عابد وزاہد آدمی تھا۔'' ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ''اس نے یہ ایک ایسی بات کہہ دی جس نے اسکی دنیا اور آخرت کو تباہ کرکے رکھ دیا۔''

مؤلف رحمہ اللہ نے اس باب میں سیدنا جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے، جس کا ترجمہ ذکر ہوا۔ اس قصہ سے متعلق سیدنا ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک حدیث موجود ہے، جس میں قدرِ تفصیل بھی ہے، چنانچہ امام بغوی رحمہ اللہ شرح السنۃ میں اپنی سند سے عکرمۃ بن عمار سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں: میں مدینہ منورہ کی مسجد میں داخل ہوا تو مجھے ایک بوڑھے شخص نے آواز دی اور کہا: اے یمامی! ادھر آؤ، میں اس بوڑھے کو پہچان نہ سکا، بہرحال اس نے مجھ سے کہا: کبھی کسی شخص سے یہ نہ کہنا کہ اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ تجھے معاف نہیں کرے گا، اور تجھے جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ میں نے پوچھا: اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے، آپ کون ہیں؟ فرمایا: ابوھریرۃ۔ عرض کیا: یہ بات تو آدمی غصے میں کہہ جاتا ہے کبھی اپنے بیٹے سے، کبھی بیوی اور کبھی خادم سے۔ فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے:

① (صحیح مسلم، البر والصلۃ (۲۶۲۱)

② حسن: مسند احمد: (۸۲۹۹/۳، ۸۷۵۷) سنن ابی داؤد: (۴۹۰۱) الزھد ابن المبارک: (۹۰۰)

بنی اسرائیل کے دو آدمیوں کا قصہ

''بنی اسرائیل میں دو شخص تھے جنہیں آپس میں بڑی محبت تھی، ایک بہت عبادت گذار، اور دوسرا بڑا گناہگار تھا۔ عبادت گذار شخص اسے گناہوں سے باز رہنے کی تلقین کرتا رہتا، وہ جواب میں یہی کہتا: تم اپنی نصیحت بند کرو، یہ میرا اور میرے رب کا معاملہ ہے۔ ایک دن عبادت گذار شخص نے اسے ایک بہت بڑا اور خطرناک گناہ کرتے ہوئے دیکھا تو کہا: باز آجا۔ اس نے جواب دیا: تم میرے اور میرے پروردگار کے معاملے کو چھوڑ دو، کیا تم مجھ پر نگراں مقرر کیے گئے ہو؟ اس شخص نے کہا، اللہ کی قسم! تجھے اللہ تعالیٰ نہ تو کبھی معاف فرمائے گا نہ جنت کا داخلہ عطا فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا فرشتہ بھیج کر دونوں کی روحیں قبض کرلیں اور دونوں کو اپنے پاس اکٹھا کھڑا کرلیا۔ گناہگار سے کہا: تم تو میری رحمت سے جنت میں چلے جاؤ۔ دوسرے شخص سے کہا: کیا تم میں اتنی طاقت ہے کہ تم میری رحمت میرے بندوں سے روک ڈالو۔ اس نے کہا: اے میرے پروردگار! نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا: اسے لے جاکر جہنم میں ڈال آؤ۔ ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس کے ایک ہی بول نے اس کی دنیا اور آخرت تباہ کرڈالی۔'' ①

زبان کا معاملہ انتہائی خطرناک ہے

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ زبان کا معاملہ انتہائی خطرناک ہے، بے مقصد اور خلاف شریعت گفتگو سے پرہیز کرنی چاہیئے، اور بالخصوص کسی پر ایسا فتویٰ لگانے سے یکسر گریز کرنا چاہیئے جیسا بنی اسرائیل کے عابد نے اپنے عاصی بھائی پر لگایا تھا، جس کی صورت یہ ہے کہ کسی فردِ معین کو مخاطب کرکے اسے جہنمی نہ کہا جائے نہ ہی یہ کہا جائے کہ تو بخشش کے قابل نہیں ہے، نیز امرِ غیب کے تعلق سے اللہ تعالیٰ پر قسم بھی نہ کھائی جائے۔

حدیثِ معاذ رضی اللہ عنہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لوگوں کو جہنم کی آگ میں زیادہ تر اوندھا پھینکنے والی چیز ان کی زبان ہے (واللہ اعلم)



① سنن ابی داؤد: (۴۹۰۱)

اس باب کے مسائل

(۱) اللہ تعالیٰ پر قسم کھانے کی وعیدِ شدید بیان ہوئی۔

(۲) جہنم کا جوتے کے تسمہ سے بھی زیادہ قریب ہونا معلوم ہوا۔ (چنانچہ زبان کا ایک ہی بول اس عابد شخص کو جہنم میں لے گیا)

(۳) جنت بھی اتنی ہی قریب ہے (جیسا کہ دوسرا شخص فوراً جنت کا مستحق قرار دے دیا گیا)

(۴) یہ واقعہ ایک اور حدیث: "ان الرجل لیتکلم بالکلمة......" کیلئے شاہد کی حیثیت رکھتا ہے اس حدیث کا مضمون یہ ہے کہ ایک شخص بے دھیانی میں زبان سے ایک بول بولتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر ایسا ناراض ہو جاتا ہے کہ قیامت کے قائم ہونے تک اس پر لعنتیں برساتا رہے گا۔

(۵) ان دونوں آدمیوں کے قصہ کو سامنے رکھ کر یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ایک شخص بعض اوقات ایک ایسے عمل کی بناء پر بخش دیا جاتا ہے جو اس کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور گراں ہوتا ہے۔ (اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ عَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ میں بھی اسی نکتہ کی تائید ہوتی ہے)



باب لایستشفع باللہ علی خلقہ

اللہ تعالیٰ کو اس کی خلق پر شافع نہ بنایا جائے

عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُعْطِمٍ ﷛ قَالَ: جَاءَ أَعْرَابِيٌّ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! نُهِكَتِ الْأَنْفُسُ، وَجَاعَ الْعِيَالُ وَهَلَكَتِ الْأَمْوَالُ. فَاسْتَسْقِ لَنَا رَبَّكَ فَإِنَّا نَسْتَشْفِعُ بِاللّٰهِ عَلَيْكَ وَبِكَ عَلَى اللّٰهِ. فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: "سُبْحَانَ اللّٰهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ فَمَازَالَ يُسَبِّحُ حَتّٰى عُرِفَ ذٰلِكَ فِيْ وُجُوْهِ أَصْحَابِهِ. ثُمَّ قَالَ: وَيْحَكَ أَتَدْرِيْ مَااللّٰهُ! إِنَّ شَأْنَ اللّٰهِ أَعْظَمُ مِنْ ذٰلِكَ إِنَّهُ لَايُسْتَشْفَعُ بِاللّٰهِ عَلٰى أَحَدٍ." ①

سیدنا جبیر بن مطعم ﷛ کہتے ہیں کہ ایک بدوی نے نبی ﷺ کی خدمت میں آکر شکایت کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! جانیں تلف ہوگئیں، بچے بھوک سے بلکنے لگے اور مویشی مرنے لگے ہیں۔ آپ ہمارے لئے اپنے رب سے بارش کی دعا فرمائیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کو آپ کے پاس اور آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور سفارشی کے طور پر پیش کرتے ہیں، "رسول اللہ ﷺ نے اس کی بات سن کر بار بار سبحان اللہ، سبحان اللہ پڑھا، یہاں تک کہ اس کا اثر صحابہ کرام کے چہروں پر ظاہر ہونے لگا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: تجھ پر افسوس! کیا تو جانتا ہے کہ اللہ کیا ہے؟ (یعنی اس کا کیا مقام اور کیا شان ہے؟) اللہ تعالیٰ کی شان اس سے کہیں بلند تر ہے۔ اسے کسی کے سامنے سفارشی کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔"

اس باب کا مقصود یہ ہے کہ مخلوقات میں سے کسی سے کوئی کام کروانے کیلئے اسے اللہ تعالیٰ کی شفاعت یا سفارش کرانا ناجائز ہے۔

اس حدیث میں یہ بیان ہوا ہے کہ جب اعرابی نے رسول اللہ ﷺ سے بارش کی دعا کرانی چاہی تو ساتھ ہی یہ الفاظ کہے: "إِنَّا نَسْتَشْفِعُ بِاللّٰهِ عَلَيْكَ وَبِكَ عَلَى اللّٰهِ" یعنی ہم اس مقصد کیلئے اللہ تعالیٰ کو آپ پر، اور آپ کو اللہ تعالیٰ پر شافع بناتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی سفارش آپ کو پیش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ دعا کردیں، اور آپ کی سفارش اللہ تعالیٰ کو پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دعاء قبول فرمالے۔

① ضعیف: تاریخ کبیر: (۲۲۷۷) سنن ابوداؤد (۴۷۲۶) طبرانی کبیر: (۱۵۴۷) امام ابن کثیر ﷫ نے اپنی تفسیر میں اسے غریب کہا ہے (۱/۳۱۰).

اعرابی کے اس جملے کو سنکر رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ مبارک متغیر ہوگیا اور تغیر کی اس کیفیت کو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے محسوس کیا، پھر آپ ﷺ نے اس کی اصلاح فرمائی کہ:[لا یستشفع باللہ علی أحد من خلقه] اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوقات پر شافع بنانا درست نہیں ہے؛ اللہ تعالیٰ تو ہر شئی کا رب اور مالک ہے، سارے خزانے اس کے ہاتھ میں ہیں، دینے یا نہ دینے کا وہی فیصلہ فرماتا ہے، اس کے فیصلے کو کائنات کی کوئی چیز نہیں ٹال سکتی، نہ ہی اسے کوئی چیز عاجز کر سکتی ہے۔

وہ ذات علیم وقدیر ہے، جب کسی شئی کا ارادہ فرماتا ہے تو ''کن'' کہہ کر بنالیتا ہے، پوری مخلوق اس کی مملوک ہے، وہ اپنی مخلوق کے اندر جس طرح چاہتا ہے تصرف فرمالیتا ہے، تو پھر کسی کیلئے اسکی سفارش پیش کرنے کا کیا معنی؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کی تنقیصِ شان ہے کیونکہ شافع تو مشفوع لہ سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو وہ ذات ہے جس کے دربار میں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت پیش کی جاتی ہے، جب کہ اعرابی نے کہا تھا ''وبك علی اللہ'' یعنی ہم آپ کی شفاعت، اللہ تعالیٰ کی طرف پیش کرتے ہیں، جس کا آپ نے انکار نہیں فرمایا تھا۔

کسی شخص سے اس کی زندگی میں دعا کرائی جاسکتی ہے

یہ بات ذہن نشین رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت پیش کرنے کا معنی آپکی دعا کا حصول وطلب ہے، جس کی منجانب اللہ قبولیت کی امید ہوتی ہے، اور یہ چیز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہر نیک شخص سے دعا کرائی جاسکتی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے جبکہ وہ عمرہ کیلئے جارہے تھے فرمایا تھا: ''اے میرے پیارے بھائی مجھے اپنی نیک دعا میں نہ بھولنا'' ①

دعا کروانے کا یہ سلسلہ زندگی تک محدود ہے، جب انسان فوت ہوجائے تو پھر اس کے حق میں دعا کرنی چاہیئے، جیسے اس کا جنازہ پڑھنا یا اس کی قبر پہ جا کے دعا کرنا وغیرہ۔

میت سے دعا کرنا، یا اس کے واسطے سے دعا کرنا ناجائز ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم جو نبی ﷺ سے ان کی زندگی میں دعائیں کروایا کرتے تھے، لیکن آپ ﷺ کے انتقال کے بعد کسی صحابی سے یہ ثابت نہیں کہ اس نے نبی ﷺ پر اپنی کوئی حاجت پیش کی ہو، یا آپ کو شافع یا وسیلہ بنایا ہو۔

چنانچہ امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب مدینہ منورہ میں قحط پڑا تو آپ استسقاء کیلئے لوگوں کو لیکر نکلے، نبی ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے لیا، اور ان سے استسقاء کی دعا کی درخواست کی، (یہ بھی فرمایا کہ

① مسند احمد: (۱/۱۹۵) سنن ابوداؤد (۱۴۹۸) سنن ترمذی: (۳۵۵۷) امام ترمذی نے اسے ''حسن صحیح'' کہا ہے۔ سنن ابن ماجہ: (۲۸۹۴)۔

پہلے ہم جب تک رسول ﷺ حیات تھے ان سے دعاءِ استسقاء کروایا کرتے تھے، اب آپ ﷺ انتقال فرما گئے تو ہم آپ ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ سے دعا کرواتے ہیں) ①

لہٰذا اگر وفات کے بعد کسی کے واسطے سے دعا کرنا جائز ہوتا تو عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر سابقینِ اولین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی ﷺ کو شافع و واسطہ بنا کر دعا کرتے، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہم سے کہیں زیادہ ہر خیر کے حریص و مستحق تھے۔

واضح ہو کہ حدیث جبیر بن معطم رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کی صفت ''علو'' (سب سے اوپر) بھی ثابت ہو رہی ہے، نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کا عرش آسمانوں کے اوپر ہے، نیز یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ استواء کی صحیح تفسیر ''علو'' سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ یہی صحابہ کرام، تابعین اور آئمہ سلف سے منقول ہے۔ بخلاف معطلہ، جہمیہ، معتزلہ اور ان کے اتباع مثلاً اشاعرہ کے، کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کو ان کی حقیقی وظاہری مراد سے پھیر کر بصورتِ تعطیل یا تاویل الحاد کا مظاہرہ کیا ہے (واللہ المستعان)



① (صحیح بخاری، الاستسقاء (۱۰۱۰)

اس باب کے مسائل

(۱) اعرابی کی اس بات کا کہ ''ہم اللہ تعالیٰ کو آپ پر شافع بناتے ہیں'' کا رسول اللہ ﷺ نے کتنی شدت سے انکار فرمایا۔

(۲) اس کی یہ بات سن کر رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر اتنی ناگواری اور کراہت کے آثار ظاہر ہوئے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس کیفیت کو بھانپ گئے۔

(۳) آپ ﷺ نے اعرابی کی اس بات کا انکار نہیں فرمایا کہ ہم آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف شافع بناتے ہیں، جس کا معنی یہ ہے کہ نیک لوگوں سے دعا کرائی جاسکتی ہے۔

(۴) اعرابی کی بات کو سن کر رسول اللہ ﷺ کا "سُبْحَانَ اللّٰہِ" کہنا بہت ہی قابلِ غور ہے (جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی بات جو اللہ تعالیٰ کی شان اور اسکے جلال وکمال کے منافی ہو، کو سن کر سبحان اللہ کہنا چاہیئے جس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات نقص اور عیب سے پاک ہیں)

(۵) مسلمان رسول اللہ ﷺ سے ان کی حیاتِ مبارکہ میں بارش کی دعا کرایا کرتے تھے (جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دعا کرائی جاسکتی ہے، نیز یہ کہ دعا کرانے کا سلسلہ زندگی تک محدود ہے، فوت ہو جانے کے بعد ان کی شفاعت یا وسیلہ کی طلب ناجائز ہے جیسا کہ امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں استسقاء کے واقعہ سے ثابت ہو رہا ہے)



باب

ما جاء فی حمایة النبی ﷺ حمی التوحید وسدہ طرق الشرک

رسول اللہ ﷺ کا توحید کی حفاظت فرمانا نیز شرک کے تمام راستے بند فرما دینا

توحید کی حفاظت وحمایت سے مراد، توحید کو ہر ایسے قول یا عمل سے بچانا ہے جس سے توحید کے مضمحل ہونے یا اس میں کسی قسم کا نقص پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، رسول اللہ ﷺ سے اس سلسلہ میں بہت سی احادیث ملتی ہیں جن میں حفاظت وحمایتِ توحید کا پہلو موجود ہے، مثلاً: آپ ﷺ کا فرمان: ”لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ إِنَّمَا أَنَا عَبْدٌ فَقُوْلُوْا عَبْدُاللّٰہِ وَرَسُوْلُہ“ ①

”مجھے میرے مقام سے مت بڑھاؤ، جیسا کہ عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو بڑھا دیا، میں تو ایک بندہ ہوں، لہذا مجھے اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول کہا کرو“

اسی طرح آپ ﷺ کا فرمان: ”لَا یُسْتَغَاثُ بِیْ وَإِنَّمَا یُسْتَغَاثُ بِاللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ“ ②

”مجھ سے نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ سے مدد یا بارش طلب کرو“

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بہت سی احادیث میں منہ پہ کسی کی تعریف کرنے سے روکا، ایک شخص نے کسی دوسرے شخص کی منہ پہ تعریف کر دی تو آپ ﷺ نے تین بار فرمایا: ”تم نے اپنے بھائی کی گردن کاٹ ڈالی“ ③

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے: ”اگر تم ایسے لوگوں سے ملو جو منہ پہ تمہاری تعریف کریں تو ان کو روکنے کیلئے ان کے منہ میں مٹی بھر دو“ ④

سامنے بیٹھ کر تعریف کرنے میں ممدوح اپنی عظمت اور بڑائی کا شکار ہو جاتا ہے، جو کمالِ توحید کے منافی ہے۔

---

① (بخاری، الانبیاء (٣٤٤٥))
② ضعیف: الطبرانی: دیکھیئے مجمع الزوائد: (١٠/١٥٩) اس حدیث کی سند میں ابن لھیعہ ضعیف راوی ہے۔
③ سنن ابی داؤد: (٤٨٠٥) صحیح بخاری: (٦١٦٢) صحیح مسلم: (٣٠٠٠)۔
④ صحیح مسلم، الرقم: (٣٠٠٢)۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الشِّخِّيْرِ رضی اللہ عنہ قَالَ اِنْطَلَقْتُ فِي وَفْدِ بَنِي عَامِرٍ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقُلْنَا: أَنْتَ سَيِّدُنَا. فَقَالَ: " أَلسَّيِّدُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى. قُلْنَا: وَأَفْضَلُنَا فَضْلًا وَأَعْظَمُنَا طَوْلًا. فَقَالَ: قُوْلُوْا بِقَوْلِكُمْ أَوْبَعْضِ قَوْلِكُمْ وَلَا يَسْتَجْرِيَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ" (رواہ ابو داؤد بسند جید) ①

سیدنا عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں بنو عامر کے ایک وفد کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم نے عرض کی: آپ ہمارے "سید" ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "السید" تو صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ پھر ہم نے کہا: مقام ومرتبہ کے لحاظ سے آپ ہم سب سے افضل، برتر اور بہت زیادہ احسان کرنے والے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ اور اس قسم کی جائز اور مناسب باتیں کہہ سکتے ہو۔ خیال رکھنا کہ کہیں شیطان تمہیں اپنے جال میں نہ پھنسا لے۔" (اسے ابوداؤد نے جید سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

وَعَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ نَاسًا قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! يَاخَيْرَنَا وَابْنَ خَيْرِنَا وَسَيِّدَنَا وَابْنَ سَيِّدِنَا. فقال: "أَيُّهَا النَّاسُ! قُوْلُوْا بِقَوْلِكُمْ وَلَا يَسْتَهْوِيَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ أَنَا مُحَمَّدٌ عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ مَاأُحِبُّ أَنْ تَرْفَعُوْنِي فَوْقَ مَنْزِلَتِي الَّتِي أَنْزَلَنِيَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ" ②

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: بعض لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم سب سے بہتر وافضل و برتر! اور سب سے بہتر کے فرزند اے ہمارے سردار! اور ہمارے سردار کے بیٹے! تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اے لوگو! اس قسم کے الفاظ کہہ لیا کرو۔ خیال رکھنا کہ کہیں شیطان تمہیں بہکا نہ دے۔ میں محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے میرے اس مقام ومرتبہ سے بڑھا دو جس پر مجھے اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے" (اسے نسائی نے جید سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

باب میں مذکور حدیث جو عبداللہ بن الشخیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے سنن ابی داؤد میں مذکور ہے، میں بھی حمایت وحفاظت توحید کی ایک عمدہ مثال موجود ہے، چنانچہ وفد بنو عامر نے رسول اللہ ﷺ کو "انت سیدنا" کہا، یعنی: آپ ﷺ ہمارے سید ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فوراً فرمایا: " اَلسَّيِّدُ اللّٰهُ تُبَارَكَ وَتَعَالٰى"

"سید تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔"

① اسنادہ صحیح: مسنداحمد: (۳/۹۴۷۵، ۹۹۷۱، ۱۰۲۸۵، ۱۰۳۷۲، ۱۰۴۴۱، ۱۰۶۰۸) الادب المفرد، للبخاری: (۲۱۱) سنن ابی داؤد: (۴۷۹۶) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ، فتح الباری: (۵/۱۷۹) میں فرماتے ہیں: اس حدیث کے تمام روات ثقہ ہیں۔

② اسنادہ صحیح: مسنداحمد: (۴/۱۳۵۲۹) النسائی فی عمل الیوم واللیلة، سنن ابی داؤد: (۴۷۹۶)

مخلوق کیلئے لفظ ’’سید‘‘ کے جواز اور عدمِ جواز پر بحث

یہ بات ذہن نشین رہے کہ بندے کو "السید" کہنے میں علماء کا اختلاف ہے، علامہ ابن القیم رحمہ اللہ "الفوائد" میں فرماتے ہیں: کسی انسان کو سید کہنے کے بارہ میں علماء کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے، کچھ نے منع کیا ہے، جبکہ کچھ جواز کے قائل ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ منع کے قائل تھے، ان کی دلیل عبداللہ بن الشخیر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو کہ جنہوں نے آپ کو سید کہا فرمایا: ’’سید تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہے‘‘

جو لوگ جواز کے قائل ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انصار صحابہ سے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے بارہ میں فرمایا تھا: "قُوْمُوْا إِلٰی سَیِّدِکُمْ" یہ حدیث عبداللہ بن الشخیر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مقابلہ میں زیادہ اَصح ہے، ان لوگوں کا کہنا ہے کہ انسان جس قبیلے سے متعلق ہو اس کی طرف نسبت کرکے اسے سید کہا جا سکتا ہے مطلقاً نہیں۔

(حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں) یہ تفصیل محلِ نظر ہے، کیونکہ جب "السیــــد" کا لفظ اللہ تعالیٰ کیلئے استعمال ہوگا تو وہ مالک، مولیٰ اور رب کے معنی میں ہوگا، اس وقت وہ معنی مراد نہیں ہوگا جو مخلوق کیلئے استعمال کرنے کی صورت میں ہوگا۔ ①



① یہ بات ذہن نشین رہے کہ بعض لوگ عبداللہ بن الشخیر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے یہ سمجھے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ’’سید‘‘ کہنے سے منع فرمایا ہے، پھر وہ ان حدیثوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں سید کا لفظ بندوں پر استعمال ہوا ہے، مثلاً: "أَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ" اور "قُوْمُوْا إِلٰی سَیِّدِکُمْ" اور "وَلْیَقُلْ سَیِّدِیْ وَمَوْلَایَ" ان حدیثوں کو وہ عبداللہ بن الشخیر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے متعارض قرار دے کر تطبیق کا راستہ نکالتے ہیں، چنانچہ تطبیق کی تین صورتیں ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) ایک یہ کہ نہی والی حدیث کراہت اور ادب پر محمول ہے جبکہ اباحت والی احادیث جواز پر محمول ہیں۔

(۲) دوسری یہ کہ نہی کی حدیث وہاں مراد ہوگی جہاں مفسدہ کا اندیشہ ہو، یعنی کہیں آہستہ آہستہ غلو کا راستہ نہ اپنالیا جائے، اور جہاں اس قسم کا اندیشہ نہ ہو وہاں جواز کی حدیث منطبق ہوگی۔

(۳) تیسری صورت یہ کہ نہی کی حدیث سے مراد یہ ہے کہ کسی کو مخاطب کرکے سید نہ کہا جائے، ہاں شخصِ غائب کو سید کہا جا سکتا ہے، مخاطب کو سید کہنے میں خرابی یہ ہے کہ وہ اپنی بڑائی کا شکار ہو سکتا ہے، جبکہ شخصِ غائب کے سلسلہ میں یہ محذور نہیں رہتا۔ =

اس باب کے مسائل

(۱) لوگوں کو غلو میں گرفتار ہونے سے ڈرانا اور بچانا۔

(۲) جس شخص کو "انت سیدنا" کہا جائے، اسے جواب میں کیا کہنا چاہیئے (مراد یہ ہے کہ وہ اس جملہ کے کہنے والے کو غلو سے بچنے اور شیطان کے غلبہ سے محفوظ رہنے کی نصیحت کرے)

(۳) رسول اللہ ﷺ کا فرمان: "لایستجرینکم الشیطان" یعنی تم پر شیطان غالب نہ آجائے، بہت ہی قابلِ غور ہے باوجود یکہ انہوں نے جو کچھ کہا وہ حق تھا۔

(۴) رسول اللہ ﷺ کا فرمان: "میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے میرے معاملے سے بڑھاؤ" میں حفاظتِ توحید اور شرک کے سدِ باب کی کتنی عمدہ دلیل اور مثال ہے۔



= شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک ان احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں سید کہنے سے نہیں روکا، بلکہ "قُوْلُوْا بِقَوْلِكُمْ" سے سید کہنے کی اجازت دی لیکن منع اس چیز سے فرمایا کہ اس طرح تم شیطان کو اپنے اوپر غالب نہ کر لینا کہ وہ تمہیں کسی غلو میں مبتلا کردے، کیونکہ سید مطلق تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، بناء بریں کسی شخص کو سیدنا یا کسی قبیلے کا سید (سردار) کہا جاسکتا ہے، البتہ ایک نکتہ اور پیشِ نظر رہنا چاہیئے اور وہ یہ کہ جس کو سید کہا جائے وہ اس کا اہل بھی ہو، کسی فاسق یا زندیق کو سید نہ کہا جائے چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے:

"منافقین کو سید نہ کہو، کیونکہ اگر وہ سید نہیں ہے تو تم انہیں سید کہہ کر اپنے رب کو ناراض کرلو گے" (مسند احمد: ۳۴۶/۵)

لہٰذا جو شخص سید کہلانے کا اھل ہو، اور غلو وغیرہ کا محذور بھی نہ ہو تو اسے سید کہا جاسکتا ہے، نااہل، یا جہاں کوئی محذور موجود ہو سید نہ کہا جائے، محذور سے مراد جہاں غلو کا خوف ہو۔

باب
اللہ تعالیٰ کی قدر و منزلت کا بیان

قول اللہ تعالیٰ: ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللهَ حَقَّ قَدْرِهِ وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهِ سُبْحٰنَهُ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ ①

''اور انہوں نے کما حقہ اللہ تعالیٰ کی قدر نہیں کی۔ قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور سارے آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہونگے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے شرک سے پاک اور بلند ہے''

مؤلف رحمہ اللہ کا یہ آخری باب قرآنِ کریم کی آیتِ کریمہ: ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللهَ حَقَّ قَدْرِهِ.... ﴾ پر قائم ہے، اس کے بعد مؤلف رحمہ اللہ نے چند آثار و احادیث نقل فرمائے ہیں جن سے اس آیتِ کریمہ کی توضیح ہوتی ہے۔

اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہاں اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی کوئی قدر نہ کی اور غیر اللہ کی عبادت کرتے رہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ تو وہ ذات عظیم ہے جس سے بڑا کوئی نہیں وہ ہر شئی پر قادر ہے اور ہر شئی کا مالک ہے ہر شئی اس کی مملوک و مقہور ہے۔''

امام مجاہد کا قول ہے: ''یہ آیت قریش کے بارہ میں نازل ہوئی۔''

امام سُدّی کہتے ہیں: ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللهَ حَقَّ قَدْرِهِ.... ﴾ کا معنی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کما حقہ تعظیم نہیں کی۔

محمد بن کعب فرماتے ہیں:

''اگر وہ اللہ تعالیٰ کی قدر اور تعظیم بجالاتے تو قطعاً اللہ تعالیٰ کی تکذیب نہ کرتے۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''یہاں دراصل ان کفار کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ کی اپنے اوپر قدرت کو نہیں مانتے جو اللہ تعالیٰ کو ہر شئی پر قادر مانتا ہے وہ اس کی کما حقہ قدر بجالائے گا اور جو نہیں مانتا وہ اس کی قدر و منزلت کی معرفت سے محروم ہوگا۔''

① (الزمر: ٦٧)

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ ﷺ قَالَ: جَاءَ حِبرٌ مِنَ الْأَحْبَارِ إِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: يَامُحَمَّدُ! إِنَّا نَجِدُ أَنَّ اللّٰهَ يَجْعَلُ السَّمٰوَاتِ عَلٰى إِصْبَعٍ وَالْأَرْضِيْنَ عَلٰى إِصْبَعٍ وَالشَّجَرَ عَلٰى إِصْبَعٍ وَالْمَاءَ عَلٰى إِصْبَعٍ وَالثَّرٰى عَلٰى إِصْبَعٍ وَسَائِرَ الْخَلْقِ عَلٰى إِصْبَعٍ فَيَقُوْلُ: أَنَا الْمَلِكُ. فَضَحِكَ النَّبِيُّ ﷺ حَتّٰى بَدَتْ نَوَاجِذُهُ تَصْدِيْقًا لِقَوْلِ الْحِبْرِ. ثُمَّ قَرَأَ: ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهِ وَالْأَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمٰوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِيْنِهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ ①

سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷺ فرماتے ہیں: ایک یہودی عالم رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے محمد ﷺ! ہماری کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) آسمانوں کو ایک انگلی پر، زمینوں کو ایک انگلی پر، درختوں کو ایک انگلی پر، پانی کو ایک انگلی پر، نمناک مٹی کو ایک انگلی پر اور باقی تمام مخلوقات کو ایک انگلی پر رکھ کر فرمائے گا: میں ہی بادشاہ ہوں۔ آپ ﷺ اس کی بات سن کر بطور تصدیق ہنس پڑے حتی کہ آپ ﷺ کی ڈاڑھیں نمایاں ہوگئیں۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿ وماقدروا الله حق قدره ....الخ ﴾

''اور انہوں نے کما حقہ اللہ تعالیٰ کی قدر نہیں کی۔ قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور سارے آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہونگے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے شرک سے پاک اور بلند ہے'' ②

اللہ تعالیٰ کا اپنے ہاتھ میں زمین وآسمان کو اٹھانے، نیز اپنی انگلیوں پر اپنی مخلوقات کو اٹھانے پر ایمان لانے کے طریقے کا بیان

واضح ہو کہ مذکورہ آیت کی توضیح پر مؤلف رحمہ اللہ نے جو احادیث پیش فرمائی ہیں جن میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا آسمانوں، زمینوں، درختوں، پانیوں، مٹی اور تمام مخلوقات کو اپنی ایک ایک انگلی پر رکھنے انہیں ہلانے اور یہ کہنے کا ذکر ہے کہ "أَنَا الْمَلِكُ" (میں بادشاہ ہوں) ان تمام احادیث پر بلاتکییف وتحریف ایمان لانا فرض ہے۔

یہ احادیث اور اسی مضمون کی دیگر احادیث اللہ تعالیٰ اور اسکی قدرتِ کاملہ کی عظمت پر مشتمل اور دال ہیں۔

① (الزمر: ٦٧)ؤ ② (صحيح بخاری،التفسير(٤٨١١)مسلم،صفات المنافقين(٢٧٨٦)

وفی روایة لمسلم :"وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ عَلٰی إِصْبَعٍ ثُمَّ یَهُزُّهُنَّ فَیَقُوْلُ: أَنَا الْمَلِكُ، أَنَا اللّٰهُ. وفی روایة للبخاری :"یَجْعَلُ السَّمٰوَاتِ عَلَی إِصْبَعٍ وَالْمَاءَ وَالثَّرَاءَ عَلٰی إِصْبَعٍ وَسَائِرَ الْخَلْقِ عَلٰی إِصْبَعٍ." ①

صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں :''(قیامت کے روز اللہ تعالیٰ) تمام پہاڑوں اور درختوں کوایک انگلی پر رکھے گا پھران (تمام مخلوقات) کو ہلا ہلا کر کہے گا: میں ہی بادشاہ ہوں اور میں ہی اللہ ہوں''

اور صحیح بخاری کی ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آسمانوں کوایک انگلی پر، پانی اورنمناک مٹی کوایک انگلی پراور باقی ساری مخلوقات کوایک انگلی پر رکھے گا۔''

ولمسلم . عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَامَرْفُوْعًا:" یَطْوِی اللّٰهُ السَّمَاوَاتِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ ثُمَّ یَأْخُذُهُنَّ بِیَدِهِ الْیُمْنٰی ثُمَّ یَقُوْلُ :أَنَاالْمَلِكُ، أَیْنَ الْجَبَّارُوْنَ؟ أَیْنَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ؟ ثُمَّ یَطْوِی الْأَرْضِیْنَ السَّبْعَ ثُمَّ یَأْخُذُهُنَّ بِشِمَالِهِ ثُمَّ یَقُوْلُ: أَیْنَ الْجَبَّارُوْنَ؟ أَیْنَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ؟"

صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آسمانوں کو لپیٹ کراپنے داہنے ہاتھ میں پکڑے گااور فرمائے گا: میں بادشاہ ہوں۔ کہاں ہیں جنھوں نے دنیا میں خودکوسرکش اورمتکبر سمجھا؟ پھر ساتوں زمینوں کو لپیٹ کر اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیگا اورفرمائے گا: میں بادشاہ ہوں۔ کہاں ہیں جنھوں نے دنیا میں خودکوسرکش اور متکبر سمجھا؟''

بندے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کواس کی انہی صفات اور عجائبِ مخلوقات کی ساتھ پہچانتے ہیں، یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے کمال کا مظہر ہیں اوراس بات کی مقتضی ہیں کہ وہی ذات وحدہ لاشریک ہے اس کی الوہیت اور ربوبیت میں کوئی شریک نہیں (مگران مشرکین نے غیراللہ کی عبادت کرکے اللہ تعالیٰ کی قدرومنزلت کوکھودیا)

واضح ہوکہ ہم اللہ تعالیٰ کیلئے ان تمام صفات کا بلاتمثیل وتعطیل اقرارواثبات کرتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح اللہ تعالیٰ کے جلال وکمال کے لائق ہے،نصوصِ کتاب وسنت سے یہی ثابت ہےاور ائمہ سلف کا یہی عقیدہ ہے۔

① (صحیح مسلم)

وروی عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: "مَاالسَّمَاءُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُوْنَ السَّبْعُ فِيْ كَفِّ الرَّحْمٰنِ إِلَّاكَخَرْدَلَةٍ فِيْ يَدِ أَحَدِكُمْ ." ①

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''قیامت کے دن ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں اللہ ربِ ذوالجلال کی مٹھی میں ایسی ہونگی جیسے تم میں سے کسی کے ہاتھ میں رائی کا دانہ''

وقال ابن جرير: حدثني يونس اخبرنا ابن وهب قال: قال ابن زيد . حدثني ابي قال : قال رسول الله ﷺ :"مَاالسَّمٰوَاتُ السَّبْعُ فِي الْكُرْسِيِّ إِلَّاكَدَرَاهِمَ سَبْعَةٍ أُلْقِيَتْ فِيْ تُرْسٍ" ②

ابن جریر رحمہ اللہ اپنی سند سے روایت کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی کرسی سے ساتوں آسمانوں کو یوں نسبت ہے جیسے سات درھم کسی ڈھال میں رکھے ہوں۔''

وقال :قال ابو ذر رضی اللہ عنہ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ:" مَاالْكُرْسِيُّ فِي الْعَرْشِ إِلَّاكَحَلْقَةٍ مِنْ حَدِيْدٍ أُلْقِيَتْ بَيْنَ ظَهْرِ فَلَاةٍ مِنَ الْأَرْضِ " ③

ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں: سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ کی کرسی اس کے عرش کے مقابلے میں یوں ہے جیسے لوہے کا چھلا کسی وسیع وعریض میدان میں رکھا ہو''

آپ ان احادیث پر غور کیجئے رسول اللہ ﷺ اپنے پروردگار کی کس طرح تعظیم بجالا رہے ہیں؟ چنانچہ اس کی صفاتِ کمال کا جیسا کہ اس کی عظمت وجلال کے لائق ہے ذکر فرما رہے ہیں، اور یہودی نے جو خبر دی اس کی تصدیق فرما رہے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کے علو اور عرش پر ہونے کا ذکر بھی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے کسی خبر کو سن کر یہ نہیں فرمایا کہ اس کا ظاہر غیر مراد ہے یا یہ تشبیہ بالمخلوقین پر دلالت کر رہی ہے اگر ان میں سے کوئی بات حق ہوتی تو آپ ﷺ ضرور ذکر فرماتے ......

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کی کتاب اول سے آخر تک، رسول اللہ ﷺ کی سنت، صحابہ وتابعین کا کلام اور تمام ائمہ سلف کے اقوال نصاً یا ظاہراً اس بات سے بھرے ہوئے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی کے اوپر ہے، اور وہ اپنے عرش پر

① ابن جرير: (١٧/٢٤) ② ابن جرير: (٨٠٧/٣)
③ ابن جرير: ابن ابی شيبة ،البيهقي في الاسماء والصفات، دیکھیئے تخريج فتح المجيد: (ص: ٦٢١)۔

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: "بَیْنَ السَّمَاءِ الدُّنْیَا وَالَّتِیْ تَلِیْهَا خَمْسُمِائَةِ عَامٍ، وَبَیْنَ كُلِّ سَمَاءٍ وَسَمَاءٍ خَمْسُمِائَةِ عَامٍ، وَبَیْنَ السَّمَاءِ السَّابِعَةِ وَالْكُرْسِیِّ خَمْسُمَائَةِ عَامٍ، وَبَیْنَ الْكُرْسِیِّ وَالْمَاءِ خَمْسُمِائَةِ عَامٍ، وَالْعَرْشُ فَوْقَ الْمَاءِ. وَاللّٰهُ فَوْقَ الْعَرْشِ لَا یَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ مِنْ أَعْمَالِكُمْ" اخرجه ابن مهدی عن حماد بن سلمة عن عاصم عن ذر عن عبدالله ورواه بنحوه المسعودی عن عاصم عن ابی وائل عن عبدالله . قاله الحافظ الذهبی رحمہ اللہ، قال: وله طرق . ①

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''آسمانِ دنیا سے دوسرے آسمان تک پانچ سو سال کی مسافت ہے، اور ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ اسی طرح ساتویں آسمان اور کرسی کے درمیان، کرسی اور پانی کے درمیان بھی پانچ پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ پانی کے اوپر اللہ تعالیٰ کا عرش ہے اور اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے۔ یاد رکھو! تمہارا کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں'' اس روایت کو ابن مہدی حماد بن سلمۃ سے وہ عاصم سے وہ ذر سے اور وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں۔ اور اسی طرح اسے مسعودی، عاصم سے وہ ابو وائل سے اور وہ عبداللہ بن مسعود سے بیان کرتے ہیں۔ یہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کا قول ہے وہ کہتے ہیں کہ اس کے اور بھی طرق ہیں۔

مستوی ہے، جو تمام آسمانوں کے اوپر ہے، (پھر قرآن حکیم کی وہ آیات ذکر فرمائیں جن سے صفت علو کا اثبات ہو رہا ہے)

واضح ہو کہ سلفِ صالحین کے کلام سے اللہ تعالیٰ کی صفت علو کے اقرار و اثبات کا ذکر ملتا ہے۔

امام ذہبی رحمہ اللہ نے ''کتاب العلو'' میں اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کا قول ذکر کیا ہے جو قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی ﴾ کی تفسیر میں فرماتی ہیں: ''اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا معلوم ہے، کیفیت نامعلوم ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور انکار کر دینا کفر ہے''

اللہ تعالیٰ کے استواء علی العرش کے متعلق امام مالک رحمہ اللہ اور ان کے استاد کا قول

ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن (امام مالک رحمہ اللہ کے استاد) سے جب اللہ تعالیٰ کے استواء علی العرش کی کیفیت کے بارہ میں سوال ہوا تو فرمایا:

① حسن: طبرانی کبیر: (۸۹۸۷) البیهقی فی الاسماء والصفات: (ص: ۴۰۱) امام ابن القیم رحمہ اللہ، اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، نیز دیکھیے: مجمع الزوائد: (۸۶/۱)

وعن العباس بن عبد المطلب ﷺ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :" هَلْ تَدْرُوْنَ كَمْ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ؟ "قُلْنَا:اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ . قَالَ:" بَيْنَهُمَا مَسِيْرَةُ خَمْسِمِائَةِ سَنَةٍ ، وَمِنْ كُلِّ سَمَاءٍ إِلٰى سَمَاءٍ مَسِيْرَةُ خَمْسِمِائَةِ سَنَةٍ . وَكَثْفُ كُلِّ سَمَاءٍ مَسِيْرَةُ خَمْسِمِائَةٍ . وَبَيْنَ السَّمَاءِ السَّابِعَةِ وَالْعَرْشِ بَحْرٌ بَيْنَ أَسْفَلِهِ وَأَعْلَاهُ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَاللّٰهُ تَعَالٰى فَوْقَ ذٰلِكَ . وَلَيْسَ يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ مِنْ أَعْمَالِ بَنِي آدَمَ . " (اخرجه ابوداؤد وغيره) ①

سیدنا عباس بن عبد المطلب ﷺ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیاتم جانتے ہو کہ زمین اور آسمان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟'' ہم نے کہا: اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا: ''انکے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ہر آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ہر آسمان کی موٹائی پانچ سو سال کی مسافت کے برابر ہے۔ساتویں آسمان اور عرشِ الٰہی کے درمیان ایک سمندر ہے اسکے نیچے اور اوپر والے حصوں کے درمیان بھی اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا زمین اور آسمان کے درمیان ہے اور اللہ تعالیٰ اسکے اوپر ہے۔ بنی آدم کے اعمال میں سے کوئی عمل اس سے پوشیدہ نہیں ہے''

''اللہ تعالیٰ کا استواء علی العرش معلوم ہے، کیفیت مجہول ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ پیغام دے دیا جو رسول اللہ ﷺ نے پہنچا دیا لہذا ہم پر اس کی تصدیق کرنا واجب ہے۔''

اس قسم کا قول امام مالک رحمہ اللہ سے بھی مروی اور مشہور ہے۔

امام ذھبی رحمہ اللہ ان اقوال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: '' دیکھیئے سلف صالحین کس طرح اللہ تعالیٰ کی صفتِ استواء علی العرش کو ثابت کر رہے ہیں، اور یہ بتلا رہے ہیں کہ استواء معلوم ہے جو کسی تفصیل کا محتاج نہیں البتہ کیفیتِ استواء غیر معلوم وغیر معقول ہے''

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "استوی" کا معنی ہے "علا علی العرش "یعنی عرش پر بلند ہوگیا۔''

اسحٰق بن راھویہ رحمہ اللہ بہت سارے مفسرین کے حوالے سے فرماتے ہیں: ''﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ میں "استوی "کا معنی ہے "ارتفع "، یعنی عرش پر بلند ہوگیا''

یہی تفسیر محمد بن جریر الطبری سے منقول ہے۔''

① مسنداحمد: (١/ ١٧٧٠) سنن ابی داؤد: (٤٧٠٨) سنن ابن ماجہ: (١٩٣) سنن الترمذی: (٣٣٢٠)۔

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہم جانتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ساتوں آسمانوں کے اوپر اپنے عرش پر ہے، اور اپنی خلق سے جدا ہے اور ہم جہمیہ کا قول نہیں مانتے۔''

ابو عمر الطلمنکی نے اللہ تعالیٰ کے بذاتہ عرش پر مستوی ہونے پر مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے۔ اور اس بات پر بھی اجماع نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا حقیقی ہے مجازی نہیں اور اس بات پر بھی اجماع نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ ﴾ میں معیت باعتبارِ علم ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ تو آسمانوں کے اوپر اپنے عرش پر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت ''علو'' اور ''استواء علی العرش'' کے پہلے منکر جعد بن درھم کا انجام

امام ذھبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کی صفت علو اور استواء علی العرش کا سب سے پہلا منکر جعد بن درھم تھا جسے خالد بن عبداللہ القسری گورنر عراق نے قتل کر دیا تھا، جعد بن درھم سے اس کے تمام نظریات جہم بن صفوان نے لے لئے اور پھر وہی طائفہ جہمیہ کا امام قرار پایا اس دور کے ائمہ کرام اوزاعی، ابوحنیفہ، مالک، لیث بن سعد، سفیان ثوری، حماد بن زید، حماد بن سلمۃ، عبداللہ بن مبارک اور دیگر ائمہ ھدیٰ رحمہم اللہ نے ان کے مذہب کا انکار اور رد فرمایا ہے۔''

امام شافعی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: ''اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات ثابت ہیں کسی کو رد کی گنجائش نہیں ہے، جس نے ثبوتِ حجت کے بعد بھی انکار کیا وہ کافر ہے، البتہ ثبوتِ حجت کے قبل جہل کی بناء پر مغفرت ہے۔ ہم ان تمام صفات کو اللہ رب العزت کیلئے ثابت کرتے ہیں، البتہ تشبیہ کی نفی کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴾ ①

''کوئی چیز اس کی مانند نہیں، اور وہ خوب سننے والا، دیکھنے والا ہے''

واضح ہو کہ حدیث عباس بن عبدالمطلب بھی اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلالتِ شان کا مظہر ہے، اس حدیث سے بھی اللہ تعالیٰ کا علو اور استواء علی العرش ثابت ہو رہا ہے، جس ذات کی پیدا کردہ اشیاء اتنی بڑی اور وسیع ہیں اس ذات کی اپنی عظمتِ شان کا کیا عالم ہوگا۔ پس وہی ذات معبودِ حقیقی ہے، اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔

① (الشوری: ۱۱)

اس باب کے مسائل

(۱) اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ﴾ کی تفسیر۔

(۲) یہ علوم (جن میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم بھی شامل ہے) رسول اللہ ﷺ کے دور میں یہودیوں کے پاس موجود تھا، انہوں نے نہ تو اس کا انکار کیا اور نہ کسی قسم کی تاویل کی۔ (لیکن افسوس اس امت کے بہت سے لوگ ایمان کے دعویٰ کے باوجود صفات کی تعطیل یا تشبیہ یا تاویل جیسے الحاد کے مرتکب ہو رہے ہیں)۔

(۳) یہودی عالم نے جب رسول اللہ ﷺ سے اس علم کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے اس کی تصدیق فرمائی۔ (جو آپ ﷺ کے اخلاص کی دلیل ہے) پھر قرآن کی آیت بھی نازل ہوئی جس نے اس خبر کا اثبات کیا۔

(۴) یہودی عالم نے جب اس عظیم الشان علم کی نبی ﷺ کو خبر دی تو آپ نبی ﷺ کا ہنسنا (یہی یہودی کی خبر سے راضی ہونے کی دلیل ہے)

(۵) احادیث سے یہ صراحت بھی سامنے آئی کہ اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ ہیں، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آسمان اللہ تعالیٰ کے دائیں ہاتھ میں اور زمینیں دوسرے ہاتھ میں ہوں گی۔

(۶) اللہ تعالیٰ کا بایاں ہاتھ ہونے کی صراحت بھی سامنے آئی۔ ①

---

① واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کے بائیں ہاتھ کا ذکر صحیح مسلم کی اس حدیث میں ہے، جسے روایت کرنے میں عمر بن حمزہ العمری متفرد ہے۔

امام بیہقی اپنی کتاب "الاسماء والصفات" میں فرماتے ہیں: شمال یعنی بائیں ہاتھ کے ذکر میں عمر بن حمزۃ عن سالم متفرد ہے، جبکہ اس حدیث کو نافع اور عبید اللہ بن محسن نے عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے، جس میں شمال کا ذکر نہیں ہے۔ (امام بیہقی مزید فرماتے ہیں) شمال والی روایت کیسے صحیح ہو سکتی ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھوں کو دایاں ذکر فرمایا ہے۔؟

امام قرطبی نے " التذکرہ " میں مذکورہ روایت کی تضعیف کی طرف اشارہ فرمایا ہے، نیز فرماتے ہیں: صحیح بخاری کی حدیث جو سیدنا ابوھریرۃ ﷺ سے مروی ہے، اس حدیث کا رد کرتی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "يَقْبِضُ اللّٰهُ وَيَطْوِي السَّمٰوَاتِ بِيَمِيْنِهٖ ثُمَّ يَقُوْلُ: أَنَا الْمَلِكُ أَيْنَ مُلُوْكُ الْأَرْضِ ......" نیز مذکورہ حدیث، صحیح مسلم کی ایک دوسری روایت، جو عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کے خلاف ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "إِنَّ الْمُقْسِطِيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ عَلٰى مَنَابِرَ مِنَ النُّوْرِ عِنْدَ يَمِيْنِ الرَّحْمٰنِ عَزَّوَجَلَّ وَكِلْتَا يَدَيْهِ يَمِيْنٌ ......" (واللہ تعالیٰ اعلم)

(۷) اللہ تعالیٰ (جب ان تمام اشیاء کو اپنے ہاتھوں میں لے لیگا تو) جبارین اور متکبرین کا ذکر فرمائے گا (جس میں یہ نکتہ پنہاں ہے کہ جبارین ومتکبرین کے پاس اگر ابھی تکبر وتجبر ہے تو کھڑے ہوں اور میرے سامنے آئیں)

(۸) رسول اللہ ﷺ کے فرمان: "کَخَرْدَلَةٍ فِی کَفِّ أَحَدِکُمْ" کا علم ہوا۔ (یعنی ساتوں آسمان اور زمینیں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں یوں ہونگے جیسے تمہاری ہتھیلی پر رائی کا دانہ)

(۹) آسمانوں کے مقابلے میں کرسی کی عظمت معلوم ہوئی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: کرسی کے مقابلے میں ساتوں آسمان اس طرح ہیں جیسے کسی ڈھال میں سات درہم پڑے ہوں۔

(۱۰) کرسی کے سامنے عرش کی عظمت کا علم ہوا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ عرش کے سامنے کرسی اس طرح ہے کہ جیسے کسی میدان میں ایک چھلہ رکھا ہو۔

(۱۱) ثابت ہوا کہ عرش، کرسی اور پانی کے علاوہ ایک چیز ہے، (شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میرے علم کے مطابق کسی نے پانی کو عرش نہیں کہا، البتہ بعض لوگوں نے بر بناءِ وہم کرسی کو عرش قرار دیا ہے اسی طرح بعض لوگوں نے کرسی کی تاویل علم کے ساتھ کی ہے، اس سلسلہ میں صحیح بات یہ ہے کہ کرسی اللہ تعالیٰ کے دوقدم رکھنے کی جگہ ہے، جبکہ عرش پر اللہ تعالیٰ مستوی ہے، اور علم اللہ تعالیٰ کی وہ صفت ہے جس کے ساتھ وہ ہر شیٔ کا ادراک فرماتا ہے۔)

(۱۲) یہ بات معلوم ہوئی کہ آسمان سے دوسرے آسمان تک کتنا فاصلہ ہے (۵۰۰ سال)

(۱۳) ساتویں آسمان اور کرسی کے مابین فاصلہ معلوم ہوا (۵۰۰ سال)

(۱۴) کرسی اور پانی کے مابین فاصلہ کا علم ہوا۔ (۵۰۰ سال)

(۱۵) یہ بات معلوم ہوئی کہ عرش پانی کے اوپر ہے۔

(۱۶) یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے۔

(۱۷) آسمان اور زمین کا درمیانی فاصلہ معلوم ہوا۔ (۵۰۰ سال)

(۱۸) یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ہر آسمان کی کثافت (موٹائی) ۵۰۰ سال کی مسافت کے بقدر ہے۔

(۱۹) یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ آسمانوں کے اوپر جو سمندر ہے اس کی اوپر کی سطح اور نیچے کی گہرائی بھی ۵۰۰ سال کی مسافت کے بقدر ہے۔